تلاش
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
حصّہ اوّل
SECRET
WWW.PAKSOCIETY.COM

"تلاش" میرا ایک ایسا ناول ہے جسے میں نے قلم سے نہیں، دل سے لکھا ہے۔ اس کہانی کی تخلیق میں میرے بیسیوں رت جگے شامل ہیں۔ مقام شکر ہے کہ میری بیشتر تحریریں آج تک پسند ہی کی گئی ہیں۔ لیکن مجھے خود اپنی بہت کم کہانیوں پر فخر ہے۔

"تلاش" انہی کم کہانیوں میں سے ایک ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ آپ کو بھی پسند آئے گی۔ بہت سے انسان ایسے ہوتے ہیں، جنہیں زندگی میں عزت، ذلت، دولت، محبت، وفا اور جفا، دشمن و دلدار، پستی و بلندی سبھی کچھ دیکھنے کو ملتا ہے، مگر ایک تشنگی ہمیشہ ساتھ چلتی ہے اور روزِ آخر تک ساتھ رہتی ہے۔ یہ تشنگی شاید روزِ اول سے انسان کا مقدر ہے اور ابد تک ساتھ رہے گی۔ مگر بہت کم انسانوں کو اس کا احساس ہو پاتا ہے۔ کچھ پر بے حسی غالب آجاتی ہے اور کچھ اسے دوسری مصروفیات اور تفکرات کے انبار تلے دبا لیتے ہیں۔

"تلاش" درحقیقت اسی تشنگی کی کہانی ہے مگر اس میں زندگی کے سارے ہی رنگ موجود ہیں۔

پڑھیے اور دعاؤں میں یاد رکھیے!

آپ کا

محمود احمد مودی

ISBN 969-38-0393-0

تلاش

1

محمود احمد مودی

مکتبہ القریش، سرکلر روڈ، اُردو بازار لاہور

تیرے نام!

کسی کو کچھ بھی یہاں حسب آرزو نہ ملا
کسی کو ہم نہ ملے ' اور ہم کو تو نہ ملا

* * *

آپ نے کہانیاں، داستانیں اور آپ بیتیاں تو ہزاروں ہی پڑھی ہوں گی۔ کچھ جھوٹی، کچھ سچی اور کچھ نیم سچی۔ ان میں سے کچھ آپ کے ذہن میں نقش ہوں گی۔ کچھ محو ہو چکی ہوں گی اور کچھ کبھی کبھی یوں ذہن میں ابھر آتی ہوں گی جیسے کوئی بھولا بسرا خواب یاد آ جائے یا تصور کی پریاں اڑتے اڑتے کسی اور دیس میں جا پہنچیں۔

ایک زمانہ تھا جب میں بھی کہانیاں پڑھتا تھا اور میری بھی یہی کیفیت ہوتی تھی۔ پھر یوں ہوا کہ میں خود ایک طویل کہانی کا کردار بن گیا۔ مجھ پر جو کچھ بیتی اس نے قصے کہانیوں کو میرے ذہن سے محو کر دیا۔

آج میں کتاب زندگی کا ورق ورق جوڑنے بیٹھا ہوں تو آنکھیں دھندلا گئی ہیں۔ کچھ میں نہیں آتا واقعات کی ڈور کو کہاں سے تھاموں اور یہ مجھے کہاں لے جائے گی۔ سینے پر بوجھ بہت بڑھ گیا ہے۔ سوچتا ہوں زندگی نے تجربات و حوادث کی شکل میں جو کچھ مجھے دیا ہے زمانے کو لوٹا دوں۔ گو کہ یہ امانت نہیں، محض میرے شب و روز کا حساب ہے جس میں محبت کی جھلملاتی خوشیاں بھی ہیں اور مظلومیت کی سسکیاں بھی۔ جبر و قہر کا دبدبہ بھی ہے اور انتقام کی ہیبت بھی۔ جذبات کی نرم آنچیں بھی ہیں اور بہتے لہو کی حرارتیں بھی۔ وفاداری کی سحرکاریاں بھی ہیں اور غداریوں کے شاخسانے بھی۔ دوستی کا درد بھی ہے اور دشمنی کی ہولناکی بھی۔

میں یہ سب کچھ اس لئے بھی کسی کو سنانا چاہتا ہوں کہ شاید جسے میں کشمکش حیات کی آخر سمجھ کر قدرے مطمئن ہو بیٹھا ہوں، درحقیقت یہ آخری دم ہو، محض سستانے کی مہلت ہو۔ موت کا ہاتھ آج بھی میری گردن میں ہے۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ ہاں، اندھیرے کی موت سے ڈرتا ہوں، زندگی سے تو میں نے اپنا خراج وصول کر لیا ہے۔ اب ایک ہی خواہش ہے کہ موت آئے تو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آئے۔ سانپ کی طرح چھپ کر کسی اندھیرے گوشے سے حملہ آور نہ ہو۔

زندگی کی کہانی کا آغاز عام طور پر بچپنا سے کیا جاتا ہے مگر مجھے اپنا بچپن کبھی اتنا دلکش محسوس نہیں ہوا کہ اسے یاد رکھتا۔ البتہ کچھ یادیں ہیں جو ان گرد آلود کھلونوں کی طرح ذہن کے منتشر خانوں میں بکھری پڑی ہیں۔ جنہیں آپ گھر کی آرائش کرتے وقت پھینکنے کے لئے اٹھاتے ہیں' مگر پھر بچپن کی یادگاریں سمجھ کر کھوئے کھوئے سے انداز میں ذرا مسکرا کر وہیں چھوڑ دیتے ہیں۔

مجھے یاد ہے جب میں نے ہوش سنبھالا تو میں ایک چھوٹے سے صاف ستھرے مکان میں ایک ادھیڑ عمر عورت کے ساتھ رہتا تھا جو روزانہ مجھے ایک مخصوص وقت پر جگاتی' نہلاتی' کپڑے بدلتی' مخصوص چیزیں کھانے میں دیتی۔ شام کو مجھے پڑھاتی اور پھر مخصوص وقت پر ہی سلا دیتی۔ کیونکہ میں نے باہر کی دنیا نہیں دیکھی تھی۔ اس لئے مجھے نہیں معلوم تھا کہ دوسرے لوگ کس طرح زندگی گزارتے ہیں۔ پھر بھی اپنی تمام تر کمسنی کے باوجود نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں ایک مشین ہوں جس کے مختلف پرزے مختلف اوقات میں وہ عورت دبا دیتی ہے۔ تاکہ میں اپنا کام انجام دے سکوں۔

اسی عورت نے مجھے باتیں کرنا سکھائی تھیں اور اسی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ میری گورنس تھی۔ تقریباً" ہر ہفتے ایک دراز قامت اور انتہائی خوبصورت عورت شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد ہمارے ہاں آتی اور آتے ہی بڑی بے قراری سے مجھے سینے کے ساتھ چمٹا لیتی جیسے میں اس کا کوئی گمشدہ کھلونا تھا جو مدت کے بعد اسے ملا تھا۔

وہ مجھے بیٹا کہہ کر پکارتی' بے تحاشا چومتی اور کبھی کبھی تو مجھے چومتے وقت اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے۔ میں جب بہت چھوٹا تھا تو مجھے معلوم نہیں تھا کہ بیٹا کسے کہتے ہیں۔ لیکن جب گورنس کی تعلیم و تربیت اور عمر میں اضافے کے ساتھ ساتھ مجھے دنیا کی بہت سی باتوں کا علم ہونے لگا تو میرے دل میں اس عورت کی محبت جاگ اٹھی۔ اب وہ مجھے سینے سے لگاتی تو جیسے مجھے بے پناہ سکون مل جاتا۔

میں بے قراری سے اس کا انتظار کیا کرتا اور ہفتے کے دن تو صبح ہی سے میری آنکھیں گیٹ پر لگی رہتیں۔ حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ دن میں کبھی نہیں آتی۔ گورنس کی تربیت کے علاوہ میری جبلت نے بھی مجھے بتا دیا تھا کہ ماں کیا ہوتی ہے۔ ورنہ پہلے تو میں اسے صرف دور دیس میں بسنے والی کوئی پری ہی سمجھتا تھا جس کی کہانیاں ...... کبھی کبھار مجھے گورنس سنایا کرتی تھی۔

جب مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ ماں کسے کہتے ہیں تو میرا دل بھی اس سے ملنے کو مچلنے لگا۔ مجھے یاد نہیں کہ اس وقت میری عمر کیا تھی' جب میں نے پہلی مرتبہ اس کے گلے میں باہیں ڈال کر کہا تھا۔ "ممی! آپ مجھے اپنے ساتھ کیوں نہیں لے جاتیں۔ کیا میں آپ کو اچھا نہیں لگتا جو آپ مجھے اپنے ساتھ نہیں رکھتیں؟"

اس وقت مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری بات سن کر میری ماں کے حلق سے جو آواز نکلی تھی اسے سسکی کہتے ہیں۔ اس نے معمول سے کہیں زیادہ جوش کے ساتھ مجھے سینے سے چمٹا لیا۔ آنسو اس کی نیلی نیلی بلوریں آنکھوں سے یوں ابل پڑے تھے جیسے مدتوں سے زیر زمین چھپا ہوا کوئی چشمہ کسی گوشے کو کمزور پا کر پھوٹ پڑا ہو۔ میں نے ممی کو اس بری طرح روتے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں ڈر گیا کہ شاید میں نے کوئی ایسی نامناسب بات کہہ دی ہے جس سے ممی کو صدمہ ہوا ہے۔

"آئی ایم سوری ممی!" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ممی جو ہلکی سی سفید ریشمی چادر پورے جسم پر لپیٹ کر آیا کرتی تھیں۔ اس کے پلو سے انہوں نے اپنے آنسو خشک کئے اور مجھے سینے سے چمٹا کر بولیں۔ "ابھی وقت نہیں آیا بیٹے۔ تمہیں کیا پتا کہ تمہاری ممی تم سے دور رہ کر کس طرح زندگی گزار رہی ہے۔ لیکن ابھی وقت نہیں آیا ...... وقت نہیں آیا ......"

آخر میں ان کا لہجہ خود کلامی کا سا ہو گیا تھا اور آواز گویا ان کے حلق میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔ ان کی نظریں میرے چہرے پر نہیں تھیں اور ان کی لمبی لمبی پلکیں یوں ساکت ہو گئی تھیں گویا وہ کوئی وحشت ناک خواب دیکھ رہی ہوں۔

پھر انہوں نے چونک کر گھڑی دیکھی' چادر اپنے جسم پر اس طرح احتیاط سے لپیٹی کہ ان کے لمبے' گھنیرے سیاہ بال اور گورا چہرہ بھی اس میں چھپ گیا اور وہ جانے کے لئے تیار ہو گئیں۔

ان کے جاتے وقت گورنس شیلا مجھے کمرے ہی میں روک لیتی تھی' لیکن اس روز وہ شاید کچن میں تھی۔ چنانچہ جب ممی مجھے پیار کر کے باہر چلی گئیں تو میں بھی چپکے چپکے ان کے پیچھے چل دیا۔ برآمدے سے اتر کر میں گیٹ کے قریب پہنچا تو میں نے دیکھا' وہ سرمئی رنگ کی ایک بڑی سی کار میں بیٹھ رہی تھیں جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی ٹوپی والا آدمی بیٹھا تھا۔

"چلو ڈرائیور!" میں نے ممی کی آواز سنی۔ میرا جی چاہا کہ دوڑ کر میں بھی ممی کے ساتھ بیٹھ جاؤں' اگر وہ مجھے نہ بٹھائیں تو میں کار کی کھڑکی میں لٹک جاؤں' پھر تو آخر ترس کھا کر وہ مجھے اپنے ساتھ بٹھا ہی لیں گی۔ لیکن عین اس وقت بابا چندن کی نظر مجھ پر پڑ گئی جو ممی کے جانے کے بعد گیٹ بند کر رہا تھا۔

وہ یوں جھپٹ کر میری طرف لپکا جیسے میں کسی گڑھے کے دہانے پر آ پہنچا تھا اور اب میں گرنے ہی والا تھا۔ اس نے مجھے گود میں اٹھایا اور اندر کو دوڑا۔ اندر سے گورنس شیلا میری تلاش ہی میں نکلی ادھر آ رہی تھی۔ بابا چندن نے مجھے اس کے حوالے کیا اور اسے ڈانٹا کہ وہ میرا خیال نہیں رکھتی۔

یہ بابا چندن کوئی بوڑھا آدمی نہیں تھا۔ اس کے سر میں چند ہی سفید بال تھے۔ لیکن اسے نہ جانے کیوں بابا کہا جاتا تھا۔ حالانکہ وہ اونچا لمبا تڑنگا اور طاقتور آدمی تھا کہ کئی بار میں نے اسے باغ میں کام کرتے وقت درختوں کی کئی موٹی موٹی غیر ضروری شاخوں کو ایک ہاتھ سے یوں توڑ موڑ کر درخت سے جدا کرتے دیکھا تھا جیسے وہ محض جھاڑو کے تنکے ہوں۔

مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ بابا چندن کون تھا اور اس گھر میں کب سے رہ رہا تھا۔ اور اس کا حقیقی نام کیا تھا؟ کبھی وہ باغ کو سجاتا سنوارتا نظر آتا تھا۔ کبھی مکان میں مرمت وغیرہ کی ضرورت پیش آتی تو وہ بھی اس کے ہاتھوں ہوتی۔ بازار سے سودا سلف بھی وہی لاتا اور ایک بار تو میں نے اسے باغ کے وسط میں گڑھا کھود کر ایک چھوٹا تالاب بھی بناتے دیکھا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے دنیا کا ہر کام آتا تھا۔ فارغ وقت میں وہ گیٹ کے قریب دیوار کی آڑ میں ایک گدے دار کرسی پر بیٹھا رہتا تھا۔ عام طور پر وہ صرف دھوتی اور واسکٹ پہنے رہتا تھا۔ واسکٹ کے بٹن اکثر کھلے ہی رہتے تھے اور بالوں سے بھرا اس کا چوڑا چکلا سیاہ سینہ دیکھ کر مجھے اس ریچھ کا خیال آتا تھا جس کی تصویر میں نے اپنی ایک انگریزی کی کتاب میں دیکھی تھی۔

بابا چندن کا سب سے بڑا فریضہ شاید مجھے گھر سے باہر جانے سے روکنا تھا۔ میں باہر جانے کے لئے بہت ہی ضد کرتا تو کبھی کبھی وہ مجھے اپنے ساتھ شام کے اندھیرے میں فٹ پاتھ پر چہل قدمی کرانے لے جاتا یا پھر اس پارک میں گھمانے لے جاتا جو گھر سے کچھ ہی فاصلے پر واقع تھا۔

اس طرح میں اپنے گردوپیش سے کسی حد تک شناسا ہونے میں کامیاب ہو سکا۔ میں نے دیکھا کہ ہمارے اردگرد بھی مکانوں کی قطاریں تھیں جو ویسے تو ہمارے ہی مکان کی طرح مختصر تھے لیکن تقریباً سب ہی مکانوں میں طویل و عریض لان یا باغ تھے۔ ان گھروں میں رہنے والوں کو اپنے گردوپیش سے قطعاً دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے کبھی وہاں زیادہ چہل پہل نہیں دیکھی۔

اس انداز پرورش کا نتیجہ تھا کہ جب پانچ سال کی عمر میں مجھے سکول میں داخل کرانے کے لئے لے جایا گیا تو مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ ہم کونسے شہر میں رہتے ہیں۔ البتہ پرنسپل کی ہدایت پر ایک ٹیچر نے میرا زبانی یا تحریری جو امتحان لیا اس میں میں نے فرفر جواب دیئے یا چند منٹوں کے اندر اندر لکھ دیئے۔ کیونکہ یہ سب کچھ گورنس شیلا مجھے بڑی اچھی طرح پڑھا چکی تھی۔ پرنسپل نے بہ خوشی مجھے داخل کر لیا اور میری زندگی گویا ایک انقلاب سے روشناس ہو گئی۔

مجھے دوسرے بچوں کے ساتھ بولنے، کھیلنے، کودنے اور پڑھنے کا موقع ملا تو میں بڑا خوش رہنے لگا۔ لیکن گورنس شیلا کی مجھے سختی سے ہدایت تھی کہ میں کلاس میں کسی لڑکی یا لڑکے سے زیادہ دوستی نہ بڑھاؤں۔ اور گھر پر تو کسی کو ہرگز مدعو نہ کروں اور نہ ہی کسی کی دعوت پر اس کے گھر جاؤں۔ بابا چندن ایک چھوٹی سی کار میں مجھے سکول چھوڑ کر جاتا اور چھٹی کے وقت لینے آتا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ وہ کار چلانا بھی جانتا تھا اور یہ کار اب گھر پر ہی رہتی تھی۔ ممی نے سکول میں میرے داخلے سے چند دن پہلے یہ بھجوائی تھی۔

اب ممی جب بھی اپنے معمول کے مطابق مجھ سے ملنے آتیں تو گورنس شیلا سے یہ رپورٹ ضرور لیتیں کہ سکول میں میری تعلیمی کیفیت کیسی جا رہی ہے۔ اور یہ سن کر بڑی خوش ہوتیں کہ میں ہر ٹیسٹ میں اول آ رہا ہوں۔ دراصل گورنس شیلا مجھے اتنی اچھی طرح پڑھا چکی تھی کہ سکول میں تو مجھے پڑھائی پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔

انہی معمولات کے ساتھ زندگی گزارتے ہوئے میں عمر کے آٹھویں برس میں پہنچا تو مجھ پر کچھ اور مشقتوں کا بوجھ آن پڑا۔ بابا چندن نے باغ کے ایک ایسے گوشے میں جو اونچے درختوں سے گھرا ہوا تھا۔ ایک اکھاڑہ کھود رکھا تھا جس میں وہ صبح شام عجیب و غریب ورزشیں اور اچھل کود کیا کرتا تھا۔

مجھے حکم ملا کہ دونوں وقت میں بھی لنگوٹ کس کر اکھاڑے میں اس کے سامنے حاضری دیا کروں۔ شروع شروع میں مجھے بڑی کوفت ہوئی اور ایک مرتبہ میں نے ممی سے شکایت بھی کی کہ مجھے صبح شام مٹی میں لوٹ لگانا اور ہاتھا پائی کرنا بالکل پسند نہیں۔ مگر ممی نے مجھے چومتے ہوئے بڑے پیار سے سمجھایا۔ "حمزہ! وہ تمہارے بھلے کے لئے سب کچھ کر رہا ہے۔ وہ تمہیں پہلوانی، یوگا اور کبڈی سکھائے گا۔ تم خوب لمبے تڑنگے اور طاقتور بن جاؤ گے۔ اس کے علاوہ بھی تمہیں زندگی میں بہت کچھ سیکھنا ہے۔ تمہیں نہیں معلوم بیٹا کہ اس دنیا میں کمزوری اور عزت ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ کمزور قوموں کا عزت کے ساتھ زندگی گزارنا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ یہ اصول تو فطرت ہی نے بنا دیا ہے کہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگل جاتی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم طاقتور ہو۔ بڑی مچھلی ہو تاکہ تمہیں کوئی نہ نگلے۔"

ممی کا لیکچر تو میری سمجھ میں نہیں آیا تھا لیکن یہ ضرور ہے کہ تھوڑے عرصے بعد مجھے خود اس تربیت میں بڑا لطف آنے لگا تھا۔ اکھاڑے کی مٹی سوندھی سوندھی خوشبو کے ساتھ جب میرے پسینے کی بو سے ہم آہنگ ہوتی تو مجھ پر ایک سرور طاری ہو جاتا۔ بابا چندن سے روز نت نئے کرتب سیکھنے میں مجھے اتنا ہی لطف آتا جتنا سکول میں ہر روز کسی بادشاہ کا لیکچر سننے میں آتا تھا۔ بابا چندن صبح سویرے مجھے یوگا کی مشقیں کراتا، شام کو ورزشیں اور داؤ پیچ سکھاتا۔ میری خوراک بھی اسی کی ہدایت کے مطابق تیار کی جاتی تھی۔

میں دس سال کی عمر میں پہنچا تو مجھے اپنے جسم میں خاصی تبدیلیوں کا احساس ہوا۔ پنڈی کا کینٹونمنٹ سکول جہاں میں زیر تعلیم تھا۔ اس دور کا سب سے اونچا سکول تھا اور اس میں ساہو کاروں اور بڑے بڑے سرکاری افسروں کے بچے پڑھتے تھے اور اکا دکا بچوں کو چھوڑ کر سب ہی صحت مند اور تندرست و توانا ہوتے تھے۔ لیکن اب مجھے خود بھی احساس ہوتا تھا کہ میں اپنے ہم جماعتوں میں سب سے نمایاں اور مضبوط نظر آتا تھا۔ تاہم ابھی مجھے صحیح طور پر اندازہ نہیں تھا کہ میں ان سے طاقتور بھی ہوں۔ لیکن ایک واقعہ نے مجھے یہ احساس دلایا۔

ویسے تو کینٹونمنٹ سکول اپنی ایک الگ ہی کائنات تھی۔ جہاں بچوں کو صرف جدید خطوط پر تعلیم ہی نہیں دی جاتی تھی۔ بلکہ انہیں مجلس کے آداب، گفتگو کا سلیقہ اور مہذب معاشرت کے تمام طور طریقے سکھائے جاتے تھے۔ پانچویں کلاس تک پہنچتے پہنچتے یہاں کے بچے بڑوں سے بھی زیادہ مہذب اور سلیقہ مند ہو چکے ہوتے تھے۔ لیکن یہ بھی شاید فطرت ہی کا اصول ہے کہ جہاں بہت سی اچھائیاں جمع ہوں وہاں ایک آدھ خباثت بھی جنم لے لیتی ہے۔ ہماری کلاس کی خباثت کیلاش تھا۔

وہ نائب تحصیلدار کا بیٹا تھا اور ایک آنکھ سے بھینگا تھا۔ ہمیں سبق دیا گیا تھا کہ کسی کے جسمانی نقص کا مذاق اڑانا گناہ ہے۔ اس لئے اسے کبھی کسی نے بھینگا کہہ کر نہیں چھیڑا تھا۔ لیکن خود اس میں شاید ایک رگ زیادہ ہی تھی۔ وہ ہر ایک کے ساتھ کوئی نہ کوئی شرارت کرتا رہتا تھا۔ تاہم کلاس روم میں وہ سنجیدہ ہی رہتا تھا۔ البتہ پلے گراؤنڈ میں وہ اپنی نیکیوں کا مظاہرہ کرتا تھا۔ کسی کا لنچ بکس چھین لیتا، کسی کی ٹائی کی گرہ کس دیتا، چپکے سے بلیڈ کے ساتھ کسی کا کوٹ کاٹ ڈالتا اور اس قسم کی بہت سی حرکتیں اس کا معمول تھیں۔ اس کی شکایتیں بھی اکثر مس اوشا کو پہنچتی رہتی تھیں۔ جو ہماری کلاس ٹیچر بھی تھیں۔ کیلاش کو اکثر فائن کیا جاتا، اس کے والدین کو شکایتیں جاتیں اور جواب میں اس کے باپ کا معذرتی خط آ جاتا۔

اس روز کیلاش کا دست خباثت میری طرف بھی بڑھا اور اس نے پلے گراؤنڈ میں میرے قریب سے گزرتے وقت فاؤنٹین پین سے مجھ پر سیاہی چھڑک دی۔ میری سفید قمیص پر بڑے بڑے نیلے دھبے پڑ گئے۔ ان کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا جہاں مجھے نمی کا احساس ہوا تھا۔ میرا ہاتھ بھی سیاہی میں لتھڑ گیا۔ یعنی سیاہی میرے چہرے پر بھی کافی لگی تھی۔ یہ ایک عجیب سی بات تھی جس کا مجھے پہلے بھی کئی مرتبہ تجربہ ہو چکا تھا کہ میں اپنے چہرے کے بارے میں بڑا حساس تھا۔ اور اس پر کسی قسم کی بے توقیری برداشت نہیں کرتا تھا۔ اور پھر اس وقت تو کلاس کی لڑکیاں اور لڑکے میری ہیئت کذائی دیکھ کر تمام آداب کو بالائے طاق رکھ کر ہنس رہے تھے۔

کیلاش صحن کی طرف پشت کئے بڑے اطمینان سے جا رہا تھا جیسے اس نے کچھ کیا ہی نہیں۔ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔ اسے کالر سے پکڑ کر میں نے اپنی طرف کھینچا اور اس کے منہ پر ایک گھونسا رسید کیا۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر چیختا ہوا الٹ کر گھاس پر جا گرا۔ میں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ جھک کر اسے گریبان اور بیلٹ سے پکڑ کر اٹھایا اور سر سے اونچا کر کے گھاس پر پٹخ دیا۔

وہ وہیں ساکت ہو گیا جہاں میں نے اسے پٹخا تھا۔ مس کرسٹینا جو ایک انگریز خاتون تھیں، ہماری انگریزی کی کلاس لیتی تھیں۔ گراؤنڈ کے قریب سے گزرتے وقت یہ منظر دیکھ رہی تھیں۔ وہ بوکھلائی ہوئی دوڑی دوڑی آئیں۔ پہلے تو انہوں نے حیرت اور خوف سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھا، جیسے میں لڑکا نہیں کوئی عجوبہ تھا۔

"اتنے موٹے لڑکے کو تم نے یوں اٹھا کر پٹخ دیا!" انہوں نے انگریزی میں کہا۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ یہ ان کا غصے کا اظہار تھا یا حیرت کا۔

"نہیں میڈم!" میں نے جواب دیا اور اپنے چہرے اور قمیص کی طرف اشارہ کیا۔ "ذرا دیکھیں اس نے کیا حرکت کی تھی۔"

"تمہیں مس اوشا سے شکایت کرنی چاہئے تھی۔" وہ اب بھی مجھے سر تا پا گھور رہی تھیں۔

"اس سے پہلے بھی کتنے لڑکوں فیروز اور جونیئرز نے اس کی شکایتیں کی ہیں۔ مگر یہ کبھی باز نہیں آیا تھا۔ اب شاید آ جائے۔" مجھے خود بھی حیرت تھی کہ میرے منہ سے ایسا ترکی بہ ترکی جواب کس طرح نکلا۔

مس کرسٹینا جھک کر اس کی نبض دیکھنے لگی اور میں وہاں سے کلاس روم میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد میں نے ایمبولینس کی آواز سنی اور اس کے چند لمحے بعد ہی کلاس شروع ہونے کی گھنٹی بج گئی۔ سب بچے کلاس میں آ گئے۔ سب کے سب چپ سے تھے اور عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ مس اوشا کلاس روم میں آئیں اور انہوں نے مجھے حکم دیا کہ فی الفور میں اپنا بیگ اٹھا کر لے جاؤں اور پرنسپل کے دفتر میں بیٹھوں۔ جب پرنسپل مجھے اجازت دیں گے تو تبھی دوبارہ کلاس روم میں آ سکتا ہوں۔

میں پرنسپل کے دفتر میں پہنچا تو انہوں نے عینک کے موٹے موٹے شیشوں کے عقب سے مجھے دیکھا اور ایک کونے میں کھڑے ہونے کا حکم دے کر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ میں کافی دیر بت بنا کونے میں کھڑا رہا۔ بالآخر ٹیلیفون کی گھنٹی نے کمرے کا سکوت توڑا۔ پرنسپل چند لمحے دوسری طرف سے بات سنتے رہے پھر بولے۔ "اچھا۔۔۔ بہرحال یہ تو یقین ہے کہ تین چار دن بعد وہ ٹھیک ہو جائے گا؟ فکر کی تو کوئی بات نہیں ہے نا؟" مزید چند لمحے دوسری طرف سے کچھ سننے کے بعد انہوں نے ریسیور رکھ دیا اور ایک گہرا سانس لے

ر بولے۔ "ٹھیک ہے۔ تم کلاس روم میں جاؤ۔"

کیلاش اس واقعے کے تین دن بعد سکول آیا اور پہلے ہی دن اس نے میرے سامنے ایک لڑکے کے ساتھ کوئی شرارت کرنے کی کوشش کی تو وہ جلدی سے بولا۔ "کیا میں منصور سے درخواست کروں کہ وہ ایک بار پھر تمہیں اسی طرح اٹھا کر پھینکے؟" کیلاش نے کھسیانی نظروں سے میری طرف دیکھا اور وہاں سے کھسک گیا۔ اس کے بعد میں نے کبھی اسے شرارت کرتے نہیں دیکھا۔ کم از کم اپنے سامنے۔

گھر پر بابا چندن کی زیر تربیت میری پہلوانی اور یوگا کی مشقیں جاری تھیں۔ میں گیارہویں سال میں پہنچا تو بابا چندن نے مجھے گتکا بھی سکھانا شروع کر دیا۔ ہمارے سکول میں بھی اسپورٹس کے بڑے عمدہ مقابلے منعقد ہوا کرتے تھے۔ لیکن جو کچھ مجھے بابا چندن سکھا رہا تھا اس کی مناسبت سے وہ مجھے آٹے بھلی سے زیادہ مشکل نہیں لگتے تھے۔ اور چھٹی جماعت تک گھڑ سواری، سوئمنگ اور جمناسٹک کے تمام مقابلات میں جیت چکا تھا۔ بلکہ سوئمنگ گالا میں تو میں نے ساری قسم کی تیراکی کا مظاہرہ کیا تھا۔ افسوس کہ تمام بچوں کے والدین یہ مقابلے دیکھنے آتے تھے لیکن میری ممی کبھی نہیں آئیں، تاہم وہ جب بھی گھر پر مجھ سے ملنے آتیں تو میرے کمرے میں ٹرافیوں اور کپوں کی تعداد میں اضافہ دیکھ کر خوشی سے پھولی نہ سماتی تھیں۔ اور میں ان کی یہ خوشی دیکھ کر ہی مطمئن ہو جاتا تھا۔

اب مجھ پر پابندیاں کسی حد تک نرم ہو چکی تھیں۔ بابا چندن کبھی کبھار مجھے گھمانے پھرانے لے جاتا تھا۔ ایک بار وہ مجھے بچوں کی ایک فلم بھی دکھا کر لایا تھا۔ تاہم اس کا یہ حکم اب بھی برقرار تھا کہ میں اکیلا کبھی کہیں نہ جاؤں اور نہ کسی اجنبی سے کبھی گھلنے ملنے کی کوشش کروں۔ اور نہ ہی کسی کو اپنے متعلق کچھ بتاؤں۔ لیکن مجھے معلوم ہی کیا تھا جو میں بتاتا۔

دفعتاً گیٹ کی طرف سے ہارن سنائی دیا۔ بابا چندن مجھے سکول سے گھر لا کر چھوڑنے کے بعد دوپہری سے کسی کام سے گیا ہوا تھا۔ وہ بہت لیٹ تھا اور آج کچھ زیادہ ہی جلدی میں معلوم ہوتا تھا کیونکہ اس نے گاڑی گیٹ سے تقریباً" لگا دی تھی۔ میں کھڑکی سے دیکھ رہا تھا کہ گاڑی کی نمبر پلیٹ گیٹ کے نچلے حصے میں لگی ہوئی سلاخوں سے آ لگی تھی اور ہیڈ لائٹس کے درمیان سیاہ پلیٹ پر سفید ہندسے یوں معلوم ہو رہے تھے گویا کوئی سیاہ رو انسان بتیسی چمکاتے جیلر سلاخوں کے درمیان سے جھانک رہا ہو۔

دوسرے کمرے سے شیلا کی آواز سنائی دی۔ "منصور! میں باتھ روم میں ہوں۔ ذرا جا کر گیٹ کھول دو۔"

اس دوران دوبارہ ہارن بجا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے بابا چندن بہت بے تاب اور مزید ناتیر ہونے پر گیٹ توڑ کر اندر آ جائے گا۔ یہ انداز بابا چندن کی فطرت کے خلاف تھا۔ وہ

اکثر کہا کرتا تھا۔ "جلد بازوں کو موت بھی جلد آ جاتی ہے۔" میں نے اسے کبھی پریشانی اضطراب یا عجلت میں نہیں دیکھا تھا۔

میں پنسل میز پر رکھ کر اٹھا اور باہر آیا جیسے ہی میں نے گیٹ کھولا اور ایک طرف کو ہٹا چھوٹی سی سفید ہیلیا اس جھٹکے مارے خرگوش کی طرح جس کے پیچھے شکاری کتے لگے ہوں، لڑاتی ہوئی کمپاؤنڈ میں داخل ہوئی۔ اور ایک جھٹکے کے ساتھ اس عالم میں رکی کہ اس کے دو پہیے پختہ روش سے لان پر اترے ہوئے تھے۔ میں نے جب گیٹ بند کر کے مڑ کے دیکھا تو بابا چندن گاڑی سے اتر چکا تھا مگر اس نے دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ پسلیوں پر رکھے عجیب سے انداز میں برآمدے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ قدم رکھتا کہیں تھا پڑتا کہیں تھا۔ میں اس کے قریب پہنچا تو اس نے ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ "مجھے سہارا دو بیٹا۔"

برآمدے کے بلب کی زرد سی روشنی میں میں نے دیکھا کہ اس کا ہاتھ خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ میں نے ٹھٹک کر اس کی طرف دیکھا۔ پسلیوں سے لے کر نیچے تک اس کا کرتہ، پاجامہ اور واسکٹ خون میں تر تھی اور ایک ہاتھ اس نے تاب اب بھی پسلیوں پر اسی زخم پر رکھا ہوا تھا جس سے یہ خون بہہ رہا تھا۔

"ڈرو نہیں بیٹا۔" وہ مضمحل سے انداز میں مسکرایا۔

"یہ انسانی خون ہے اور دنیا میں بہت ارزاں ہے۔" وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر برآمدے کی طرف گھسٹنے لگا۔

"ہوا کیا ہے بابا؟" میں نے اسے سہارا دے کر برآمدے کی سیڑھیوں پر چڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"تقریباً ایک فٹ کی ایک چھری میرے پہلو میں اتر گئی تھی۔" اس نے ایک اکھڑی اکھڑی سانس لے کر کہا۔

"کس نے اتاری تھی؟ کیوں اتاری تھی؟" میں نے اسے اس کے کمرے کی طرف لے جاتے ہوئے پوچھا۔

"میرے ماضی نے یہ چھری میرے پہلو میں اتاری تھی بیٹا! اور اس لئے اتاری تھی کہ ماضی ان لوگوں کو کبھی معاف نہیں کرتا جو اس سے ناتا توڑ کر فرار ہو جاتے ہیں۔ ماضی ان کے تعاقب میں رہتا ہے اور ایک نہ ایک دن انہیں ڈھونڈ نکالتا ہے۔ اور انتقام کی لمبی چھری ان کے سینے میں گھونپ دیتا ہے۔"

"بابا تم اکثر ایسی باتیں کرتے ہو جو میری سمجھ میں نہیں آتیں۔" میں نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔ "یہ ماضی کون ہے۔ اس سے تمہاری کیا دشمنی تھی؟"

"بہت گہری دشمنی تھی بیٹا! میں نے اسے ٹھوکریں مار مار کر اپنی زندگی سے نکال دیا

تھا۔ کیونکہ وہ بہت کڑا تھا۔ آج اس نے اپنی ذلت کا انتقام لے لیا۔" وہ بستر پر لیٹ گیا۔ اس دوران شیلا باتھ روم سے نکل آئی تھی اور بھاری آوازیں سن کر بابا چندن ہی کے کمرے میں آ گئی تھی۔ اسے خون میں لت پت دیکھ کر شیلا کا چہرہ سفید پڑ گیا اور اس کے ہاتھ سے وہ تولیہ گر گیا جس سے وہ لمبے آدھے سفید اور آدھے سیاہ بالوں کو خشک کر رہی تھی۔

"یہ کیا ـــــ؟" بمشکل اس کے ہونٹوں نے حرکت کی۔
"کوئی سوال کر کے وقت ضائع نہ کرو شیلا! فوراً کوئی ٹیکسی پکڑو اور خانم کو بلا لاؤ۔" بابا چندن نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ اس کی آنکھیں بار بار یوں بند ہو رہی تھیں جیسے اسے نیند آ رہی ہو۔ مگر وہ اس طرح بعد کوشش انہیں کھلی رکھنے کی کوشش کر رہا تھا جیسے کوئی بہت ضروری کام ہو۔
"لیکن خانم تو شاید آج بھی ـــــ" شیلا نے کہنا چاہا۔
"نہیں۔" بابا چندن نے بے تابی سے اس کی بات کاٹ کر کہا۔
"ابھی وہ یہیں ہیں۔"
شیلا بغیر ایک لفظ کہے مڑی اور دوڑتی ہوئی باہر چلی گئی۔ "وہ تولیہ اٹھا لاؤ۔" بابا چندن نے نقاہت زدہ لہجے میں کہا اور میں فرش پر پڑا وہ تولیہ اٹھا لایا جو شیلا کے ہاتھ سے گرا تھا۔ "میری الماری کھولو۔" بابا نے مزید کہا۔ "اس میں ایک چھوٹی شیشی رکھی ہوئی جس میں سفید پاؤڈر سا بھرا ہوا ہے وہ شیشی نکال لاؤ اور پاؤڈر میرے زخم پر اچھی طرح چھڑک دو اور پھر تولیہ کسی چیز سے میرے سینے پر خوب اچھی طرح کس کر باندھ دو۔"
میں خاصی مستعدی سے اس کی ہدایت پر عمل کرنے لگا اور اسی دوران میں نے پوچھا۔ "تم یہاں آنے کے بجائے پہلے سیدھے ڈاکٹر کے پاس کیوں نہیں چلے گئے بابا؟"
وہی مضمحل سی مسکراہٹ دوبارہ اس کے ہونٹوں پر رینگ آئی۔ "اس نے علاج بعد میں اور تفتیش پہلے کرنی تھی۔ پھر اسے پولیس کیس قرار دیتے ہوئے پہلے مجھے پولیس سرجن کے پاس جانے کا مشورہ دینا تھا اور پولیس سرجن کی رپورٹ تیار ہونے تک تو میری موت واقع ہو چکی ہوتی۔ اس لئے میں نے سوچا کہ جب مرنا ہی ہے تو کیوں نہ اپنی محسنہ سے چند ضروری باتیں کر کے مروں۔"

میں اس کے گہرے گھاؤ پر وہ سفید سا سفوف چھڑک کر تولیہ اس کے سینے پر باندھ چکا تو اس نے پہلے سے کہیں زیادہ نحیف آواز میں کہا۔ "بیٹا! میں جو کچھ تمہیں سکھانا چاہتا تھا وہ سکھا چکا ہوں، اب اس کی مشق اور ورزشیں تمام عمر ترک نہ کرنا۔ تم کبھی بوڑھے نہیں ہو سکے۔ کم از کم اس طرح بوڑھے نہیں ہو گے جس طرح عام لوگ ہوتے ہیں۔ اگر

تم نے میری ہدایت پر عمل نہ کیا تو خانم ـــــ تمہاری ممی تم سے ناراض ہو جائیں گی۔ وہ تمہیں اس کے علاوہ بھی بہت سے جدید فنون سکھانا چاہتی ہیں۔ جس کے انہوں نے انتظامات کر رکھے ہیں۔ تم کبھی ان کے حکم کے خلاف کوئی کام نہ کرنا۔ انہوں نے تمہارے لئے بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ وہ تمہیں بداخلاقی کے ساتھ ساتھ جو کچھ بھی سکھانا چاہیں پوری دلچسپی سے سیکھنا۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔ وہ تمہیں ہیرا بنا دیں گی۔ ہیرا! جو قیمتی بھی بڑا ہوتا ہے اور کبھی ٹوٹتا بھی نہیں۔"

میں بہت دھیان سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کی آواز کا تیشہ میرے ذہن کی لوح پر ایک ایک لفظ کندہ کرتا جا رہا تھا۔ "بیٹو" اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر سسکی سی لی۔ گھر میں داخل ہونے کے بعد سے اب تک وہ پہلی بار کراہا تھا۔ چند لمحے بعد اس نے بمشکل آنکھیں کھولیں۔ "میری باتوں پر عمل کرو گے بیٹا؟" اس نے سرگوشی سی کی۔ اس کی آواز ڈوبتی جا رہی تھی۔

"آپ کے اور ممی کے حکم کے خلاف تو میں کچھ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔" میں نے بابا کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "آپ دونوں کے سوا دنیا میں مجھے نظر ہی کون آتا ہے ـــــ میں کس کا ہاتھ تھام کر چل سکتا ہوں۔"
"میرا ہاتھ تو کچھ تمہارے ہاتھ سے چھوٹ گیا بیٹا! لیکن اپنی ممی کا ہاتھ کبھی نہ چھوڑنا ـــــ" اس کی آواز بالکل ہی بیٹھ گئی اور اس بار وہ کوشش کے باوجود آنکھیں نہ کھول سکا۔ سانس کی مدھم سی خرخراہٹ کے سوا اس کے وجود میں زندگی کی کوئی علامت نہیں تھی۔

میں چودہ سال کا ایک ناسمجھ لڑکا سائیں سائیں کرتے اس مکان میں خون میں لت پت ایک جاں بلب انسان کے سرہانے بیٹھا ـــــ اپنی ماں کا انتظار کر رہا تھا۔ ماں جو نجانے کہاں رہتی تھی۔

میرا انتظار زیادہ طویل ثابت نہ ہوا۔ آدھے گھنٹے بعد ممی شیلا اور ان کے پیچھے پیچھے دو آدمی کمرے میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں سیاہ بیگ تھا۔ ممی نے میرا ماتھا چوما اور مجھے ایک طرف ہٹنے کو کہا۔ سیاہ بیگ والا آدمی جھک کر بابا چندن کا معائنہ کرنے لگا۔ بابا چندن اب بالکل بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اس کی سانس کی مدھم خرخراہٹ بھی کچھ دیر پہلے معدوم ہو چکی تھی۔ سیاہ بیگ والا آدمی جس کے گلے میں اسٹیتھو سکوپ نہیں تھا مگر جو غالباً ڈاکٹر تھا کچھ دیر تک بابا چندن کا معائنہ کرنے کے بعد سیدھا کھڑا ہوا اور اس نے ممی کی طرف دیکھ کر نفی میں سر ہلایا۔ ممی نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا۔ انہوں نے ایک گہری سانس لی۔ ایک لمحے کے لئے ان کے چہرے پر تلاطم کے آثار

ابھرے' پھر وہ گویا خود پر جبر کر کے پتھر کی طرح پرسکون ہو گئیں۔

"لاش کو اٹھا کر گاڑی میں ڈالو۔" انہوں نے اپنے ساتھ آئے ہوئے دوسرے آدمی کو حکم دیا۔ اس نے بابا چمن کی گردن اور ٹانگوں کے نیچے ہاتھ ڈال کر انہیں اٹھانے کی کوشش کی مگر اس سے اٹھایا نہ گیا۔

"ممی! میں اٹھاؤں؟" میں نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

"تم اٹھا لو گے؟" ممی نے بے یقینی سے کہا۔

"کیوں نہیں۔ میں اکھاڑے میں کئی مرتبہ انہیں کمر پر لاد چکا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ پھر میں کچھ ہچکچایا۔ "لیکن اس وقت یہ خون میں لتھڑے ہوئے ہیں ......"

"تم صرف بازوؤں میں ہاتھ ڈال کر اٹھا لو۔ ٹانگیں رشید پکڑ لے گا۔" ممی نے دوسرے آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ ہم دونوں لاش کو ڈنڈا ڈولی کر کے باہر لائے۔ کمپاؤنڈ میں ممی کی سلور گرے شیورلیٹ کھڑی تھی۔ ہم نے پچھلے دروازے سے لاش کو بمشکل اندر ٹھونسا۔ مجھے بابا چمن کی لاش کے ساتھ یہ سلوک اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ کیونکہ وہ میرے استاد تھے اور انتہائی شفقت اور لگن سے انہوں نے میری جو تربیت کی تھی اس کی اہمیت اب مجھے معلوم ہو چکی تھی۔ اب میں اتنا ناسمجھ نہیں رہا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ اگر بابا چمن نے میری خوراک کی نگرانی نہ رکھی ہوتی' مجھے صبح شام ورزشیں نہ کرائی ہوتیں' اور آنڈلی کے تمام گر نہ سکھائے ہوتے تو آج چودہ سال کی عمر میں میرا سینہ اتنا چوڑا' بازو اتنے مضبوط اور رانوں کی مچھلیاں اتنی ٹھوس نہ ہوتیں۔ میں عام لڑکوں ہی جیسا ایک لڑکا ہوتا جو کچھ گھنٹا ٹیبل ٹینس کھیل کر سمجھتے ہیں کہ انہوں نے بڑا پہاڑ سر کر لیا ہے۔

گاڑی کا دروازہ بند کر کے ممی نے ایک بار پھر میرے ماتھے پر بوسہ دیا۔ وہ ایک دراز قامت عورت تھیں لیکن میرا قد ان سے نکلتا ہوا تھا۔ "بابا چمن نے مرنے سے پہلے کیا باتیں کی تھیں بیٹا؟" انہوں نے سرگوشی میں پوچھا۔

میں نے اپنے انداز میں بابا چمن کی تمام گفتگو لفظ بہ لفظ دہرانے کی حتی الامکان کوشش کی۔ ممی نے سب کچھ سن کر پرخیال انداز میں سر ہلایا اور میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولیں۔ "ایک دو دن میں دوسرا ڈرائیور آ جائے گا۔ تب تک تم ٹیکسی میں سکول چلے جایا کرنا۔ اور ہاں ___ تم کسی قسم کی گھبراہٹ تو محسوس نہیں کرو گے؟"

"گھبراہٹ کیسی ممی؟ بابا چمن کہا کرتے تھے کہ انسان کو اگر چاروں طرف سے کئی خونخوار شیر گھیر لیں تب بھی گھبرانا نہیں چاہئے۔ بلکہ یہ سوچنا چاہئے کہ ان کا گھیرا کیسے توڑا جا سکتا ہے۔" میں نے بابا چمن کی نصیحتوں میں سے ایک نصیحت دہرائی۔ "پھر میری آواز میں

خود بخود ایک ہچکی سی آواز نکل آئی۔ "البتہ ان کے بغیر اب تنہائی تنہائی محسوس ہو گی۔ وہ بہت اچھی باتیں کرتے تھے۔ اور ہر وقت مجھے مصروف رکھتے تھے۔ میں ان کے ساتھ کبھی بور نہیں ہوا۔"

"مصروفیت تو تمہیں اب بھی اسی طرح رہے گی بیٹا! اگلے مہینے سے تمہیں شام کو ایک خاص کلاس اٹینڈ کرنے کے لئے ایک جگہ جانا پڑے گا۔ مجھے ایک شخص کا انتظار ہے جو جاپان سے آنے والا ہے۔ امید ہے اگلے ماہ کی پہلی تاریخ تک وہ آ جائے گا۔ اس کے آتے ہی تمہاری مصروفیت اور بڑھ جائے گی۔" ممی نے کہا۔

"اس سے مجھے کیا سیکھنا ہو گا ممی؟" میں نے پوچھا۔

"مارشل آرٹس!" ممی نے کہا۔ "اور یہ کیا ہوتے ہیں۔ یہ تمہیں وہی بتائے گا۔ ہندوستان میں ابھی مارشل آرٹس اچھی طرح متعارف نہیں ہوئے۔ ان کے اکا دکا سنٹرز کام کر رہے ہیں۔ لیکن جس شخص کا میں ذکر کر رہی ہوں وہ مارشل آرٹس کا نامی گرامی ماہر ہے۔ ماسٹر شاؤلی تن کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا ٹریننگ سنٹر تو یہاں کھل چکا ہے۔ یکم تک وہ خود بھی پہنچ جائے گا۔ اس کے ہاں صرف سولہ لڑکوں نے داخلہ لیا ہے۔ اور ان میں تم واحد ہندوستانی ہو گے ...... اچھا خیر چھوڑو ...... یہ باتیں تو بعد میں ہوتی رہیں گی۔ تم جا کر آرام کرو۔ کسی قسم کی فکر نہ کرنا اور اس بات کا کسی سے تذکرہ نہ کرنا۔" انہوں نے اگلا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"مجھے گھر کی باتیں باہر کرنے کی عادت ہی نہیں پڑی ممی! اور پھر میرا کوئی دوست ہی نہیں ہے۔ مجھے سب لڑکے اپنے سے بہت چھوٹے اور احمق لگتے ہیں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ ممی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ ڈاکٹر ان کے برابر بیٹھا تھا اور دوسرا آدمی پیچھے بابا چمن کی لاش کے ساتھ پھنس پھنسا کر بیٹھ گیا تھا۔ کھڑکیوں پر پردے کھینچ دیئے گئے تھے۔

"ویسے بائی دا وے ممی!" میں نے دروازے پر جھکتے ہوئے کہا۔ "آپ بابا چمن کی لاش کو کہاں لے جا رہی ہیں؟"

"جس طرح زندہ انسانوں کے کچھ گھر ہوتے ہیں ......" ممی نے ہاتھ بڑھا کر میرا گال تھپکتے ہوئے کہا۔ "اسی طرح لاشوں کے بھی کچھ گھر ہوتے ہیں۔ میں اسے اس کے گھر لے جا رہی ہوں۔"

گاڑی اسٹارٹ ہوئی۔ میں نے دروازہ بند کیا اور پیچھے ہٹ گیا۔ گاڑی گیٹ سے نکل گئی تو میں دیر تک گیٹ پر کھڑا اسی طرف دیکھتا رہا جدھر وہ گئی تھی۔ حالانکہ اس کی سرخ عقبی بتیاں موڑ پر کب کی میری نظروں سے اوجھل ہو چکی تھیں۔ ایک گہری سانس لے کر میں

نے اپنے دونوں ہاتھ چٹان پر رگڑ کر صاف کیے اور گیٹ بند کر کے واپس آ گیا۔ گورنس شیلا برآمدے میں کھڑی تھی۔ اس کے بال اب بھی بکھرے ہوئے تھے۔ جنہیں کنگھی کرنے کا اسے موقع نہیں ملا تھا۔ اس کا چہرہ اب بھی زرد تھا۔

"تمہیں ڈر نہیں لگ رہا جیسوز؟" اس نے سر تا پا میرا جائزہ لیتے ہوئے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

"کس بات کا ڈر؟" میں نے قدرے حیرت سے پوچھا کیونکہ مجھے آج تک بتایا ہی نہیں گیا تھا کہ ایسے موقعوں پر خوف زدہ ہوا جاتا ہے۔ بابا چٹان کہا کرتے تھے ڈر صرف عورتوں کی عادت ہوتی ہے۔ آج بابا چٹان مر چکے تھے تو مجھے ان کی ایک ایک بات یاد آ رہی تھی۔

"بابا چٹان ......!" مسز شیلا نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ اور دور فضا کی تاریکی میں نہ جانے کس غیر مرئی چیز کو گھورتے ہوئے کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ "وہ ایک بے حد عجیب انسان تھے۔ ایک احسان کا بدلہ چکانے میں اس نے جس طرح عمر گزار دی' وہ انہی کا کام تھا۔"

"وہ احسان کیا تھا آنٹی شیلا؟ اور کس نے کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ جو کبھی تمہاری ممی تمہیں سنائیں گی۔ اب تم کپڑے بدلو اور سو جاؤ۔" اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "آج تمہیں بیڈ پر جانے میں ایک گھنٹہ کی تاخیر ہو گئی ہے۔"

میں خاموشی سے اپنے کمرے میں چلا گیا اور کپڑے بدل کر سو گیا۔ دوسرے دن میں ٹیکسی میں سکول گیا۔ تیسرے دن ایک ڈرائیور آ گیا اور زندگی ایک بار پھر اسی یکسانیت اور سکون سے گزرنے لگی۔ بابا چٹان کی ناگہانی موت کا واقعہ اب یوں ہی یاد رہ گیا تھا گویا کسی پرسکون جھیل میں ایک کنکر گرا تھا' چند لہروں کے دائرے نمودار ہوئے تھے اور معدوم ہو گئے تھے۔

نیا ڈرائیور بس نرا ڈرائیور ہی تھا۔ یہ ایک بوڑھا سا عیسائی تھا۔ نام تو اس کا جوزف تھا لیکن جب تک اسے باقاعدہ مسٹر جوزف کہہ کر نہ پکارا جاتا' وہ کسی بات کا جواب نہیں دیتا تھا۔ بقول اس کے اسے اس کے لڑکوں کی آوارگی نے تباہ کر دیا تھا۔ ورنہ وہ ایک صاحب جائیداد اور متمول آدمی تھا اور کسی زمانے میں بمبئی کے اونچے طبقوں کی پارٹیاں اس کے بغیر مکمل نہ ہوتی تھیں۔ جوزف میں بابا چٹان جیسی کوئی بھی بات نہ تھی۔ وہ نہ تو بابا چٹان کی طرح سلاخیں موڑ سکتا تھا اور نہ ہی ان کی طرح گدر گھما سکتا تھا بلکہ جب روز صبح و شام مجھے اکھاڑے میں ورزش کرتے دیکھ کر وہ بے حد پریشان ہوا کرتا تھا۔

"ارے بابا! تم یہ سب کس لئے کرتا ہے؟" وہ تشویش زدہ لہجے میں کہا کرتا۔ "اتنی چھوٹی عمر میں تم اتنا مشقت کرتا۔ اپنی جان کو اتنا تکلیف دیتا۔ اتنا مضبوط بنتا لیکن جب تم مر جائے گا تو مٹی میں اتنا شاندار جسم کو کیڑا مکوڑا کھا جائیں گا۔ میں ٹھیک بولتا ہوں نا؟ تم کوئی خاندانی پہلوان تو نہیں ہو نا؟ تم ایک ڈم فرسٹ کلاس سکول میں پڑھتا ہے۔ پڑھ لکھ کر بیرسٹر بنے گا' انجینئر بنے گا' ڈاکٹر بنے گا مگر پہلوان تو نہیں بنے گا نا؟ پھر یہ پہلوانی کس لیے کرتا ہے؟ ابھی زیادہ عمر تک ایسے کرے گا تو تمہارا دماغ ایک دم موٹا ہو جائے گا' باریک باریک بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گا۔"

"مجھے سمجھنے کی ضرورت ہی کیا ہے مسٹر جوزف!" میں جواب دیتا۔ "میں صرف یہ جانتا ہوں کہ یہ میری ممی کا حکم ہے اور اب تو مجھے اتنی عادت ہو گئی ہے کہ ایک دن ورزش پوری نہ کروں اور ایک آدھ مشق چھوڑ دوں تو جسم ٹوٹنے لگتا ہے اور حرارت سی ہونے لگتی ہے۔ بالکل ویسی ہی حالت ہو جاتی ہے جیسی تمہاری اس دن ہوتی ہے جب تمہیں وہائٹ ہارس دستیاب نہ ملے' اور جہاں تک دماغ موٹا ہونے کا تعلق ہے تو معاملہ ابھی تک ٹھیک جا رہا ہے۔ تمہیں شاید علم نہیں کہ میں سکول میں ہر ٹیسٹ میں فرسٹ آتا رہا ہوں۔"

معلوم نہیں میری بات جوزف کی سمجھ میں آئی یا نہیں' لیکن بوتل کا ذکر سن کر وہ ایک ٹھنڈی سانس ضرور لیتا۔ پھر وہ اپنے کوٹ کی جیب سے وہائٹ ہارس کا ایک چپٹا ادھا نکالتا اور ایک گھونٹ بھر کے بوتل کو پر خیال نظروں سے گھورتا ہوا کہتا۔ "اس کمبخت نے ہمارا فیملی تباہ کر دیا۔ ہم گھر میں پیتا تھا۔ ہم کو دیکھ کر ہمارا سب بیٹا بھی پینے لگا۔" ہم ہندوستانی لوگ میں یہی عادت بری ہے کہ ہم اگر پیتا ہے تو پھر آہستہ آہستہ اتنی پینے لگ جاتا ہے کہ سمندر کا سمندر خالی کر جاتا ہے۔ ہم ڈیم فول!"

پھر وہ انگریزی میں اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو موٹی موٹی گالیاں دینے لگتا۔ جوں جوں گالیاں سنگین ہوتی جاتیں توں توں اس کے پینے کی رفتار بھی تیز ہو جاتی۔ کبھی کبھی بوتل خالی کر کے وہ غصے میں زمین پر پٹخ دیتا اور سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے کہتا۔

"ہاں بابا! تم کبھی مت پینا ورنہ ہم تمہارے دانت توڑ دے گا۔"

وہ میرے دانت توڑنے کی بات کرتا تو اس کے اختلاجی ہاتھ دیکھ کر مجھے ہنسی آ جاتی جسے بمشکل ضبط کرتے ہوئے میں کہتا۔ "میرے استاد بابا چٹان نے مجھے قسم دے رکھی ہے کہ میں کوئی ایسی چیز نہ کھاؤں پیوں جس کا کوئی فائدہ نہ ہو۔"

"بابا چٹان کون تھا۔ کوئی ریسلر تھا؟" اس نے کئی مرتبہ میرے منہ سے بابا چٹان کا

ذکر سننے کے بعد ایک بار پوچھا اور میں نے اسے تفصیل سے بتایا کہ وہ کون تھا اور کس قسم کا آدمی تھا۔

"پھر وہ کدھر گیا؟" آخر میں جوزف نے پوچھا۔

"ایک رات وہ ـــــ" میں روانی میں بتانے ہی لگا تھا۔ کہ ایک رات وہ کس طرح قتل کر دیا گیا تھا لیکن بروقت مجھے ممی کی ہدایت یاد آ گئی اور میں نے جلدی سے کہا "ایک رات وہ ہم سے ناراض ہو کر چلا گیا اور پھر لوٹ کر نہیں آیا۔"

شب و روز یونہی گزرتے رہے۔ ممی حسب معمول ہر جمعرات کی شام کو آتی تھیں اور چند گھنٹے میرے پاس گزار کر چلی جاتی تھیں۔ اب میں اتنا سمجھدار ضرور ہو چکا تھا کہ ممی سے اصرار کر کے پوچھ سکوں کہ آخر وہ مجھے اپنے ساتھ کیوں نہیں لے جاتیں۔ جبکہ وہ مجھے اتنا پیار بھی کرتی ہیں اور میرا بھی ہر وقت ان کے قریب رہنے کو جی چاہتا ہے۔ انہوں نے سمجھایا کہ وہ ایک قصبہ نما شہر میں ملازمت کرتی ہیں اور چونکہ وہاں کوئی اچھا سکول یا کالج نہیں ہے اس لئے وہ مجھے وہاں رکھنا نہیں چاہتیں کیونکہ ان کی خواہش ہے کہ میں نہایت شاندار درسگاہوں میں تعلیم حاصل کروں اور بہت بڑا آدمی بنوں۔

ملازمت وہ اس لئے چھوڑنا نہیں چاہتی تھیں کہ وہ کوئی معمولی ملازمت نہیں تھی اور انہیں بہت بھاری تنخواہ ملتی تھی۔ جس سے وہ اپنا اور میرا اعلیٰ معیار زندگی قائم رکھ سکتی تھیں۔ اور پھر چونکہ میرے والد کا میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا اس لئے ہمارا کوئی اور ذریعہ گزر اوقات بھی نہیں تھا۔ چنانچہ وہ ملازمت کرنے پر مجبور تھیں۔

"جب تم پڑھ لکھ کر بڑے آدمی بن جاؤ گے ناں۔" ممی نے گویا چشم تصور سے مستقبل میں جھانکتے ہوئے کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہا۔ "اور مجھ سے بھی زیادہ کمانے لگو گے تو میں ملازمت ہی نہیں، دنیا کی ہر مصروفیت ترک کر دوں گی۔ بس پھر مرتے دم تک اپنے بیٹے کے پاس رہوں گی۔ ایک لمحے کے لئے بھی تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گی۔"

ان کی شفاف نیگوں آنکھوں پر لمبی پلکوں کی جھالریں ساکت تھیں۔ اور وہ ہوا میں نہ جانے کس غیر مرئی چیز کو گھور رہی تھیں۔ سفید چادر کے ہالے میں گھرا ہوا ان کا ملکوتی چہرہ آخر شب کے چاند کی طرح روشن مگر کچھ زرد سا تھا۔ کبھی کبھی وہ یونہی تھکی تھکی سی نظر آنے لگتی تھیں۔ اور اب مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ ان کی یہ تھکن یہ پژمردگی بے سبب نہیں ہوتی تھی۔ ملازمت میں انہیں نہ جانے کتنی محنت کرنی پڑتی تھی اور پھر ہر ہفتے وہ خاصا طویل سفر کر کے مجھ سے ملنے آتی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ قصبہ یہاں سے تقریباً سو

میل دور تھا جہاں وہ رہتی تھیں اور کار میں وہاں سے ملنے آتی تھیں۔

بابا چوہان کے قتل کو تقریباً ڈیڑھ ماہ گزر چکا تھا جب ایک شام جوزف نے بتایا کہ مجھے اس کے ساتھ ایک جگہ چلنا ہے۔ اسے ممی سے کچھ ہدایات ملی تھیں۔ میں تیار ہو کر اپنے کمرے سے نکلا تو وہ ایک بریف کیس اٹھائے برآمدے میں کھڑا تھا۔ بریف کیس اس نے کار میں پچھلی سیٹ پر رکھا اور ہم ایک انجانی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ "ہم کہاں جا رہے ہیں مسٹر جوزف؟"

"ماسٹر شیطان کے پاس۔" اس نے جواب دیا۔ "کل سے تم پر ایک اور بوجھ پڑنے والا ہے۔ تمہیں جوڈو کی کلاس اٹینڈ کرنے جانا ہوا کرے گا اور پھر کراٹے سیکھنا ہو گا۔ ہم تو حیران ہے کہ تمہارا ممی تم کو کیا بنانا مانگتا ہے؟"

"وہ مجھ کو بہت بڑا آدمی بنانا مانگتا۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ میں سمجھ گیا کہ ماسٹر شیطان سے جوزف کی مراد دراصل ماسٹر شانگ تن ہے، جس کا ممی نے مجھ سے ذکر کیا تھا۔

"ہو...... ہو ہو......" جوزف نے ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔ "تمہارا ممی تم کو آدمی سے شی بنانا مانگتا۔"

O

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد ہماری کار ایک ایسی کوٹھی کے پورچ میں داخل ہوئی جس کی چار دیواری کاسنی کے پھولوں سے لدی بیلوں سے ڈھکی ہوئی تھی اور ان بیلوں کے درمیان ایک جگہ سے ایک چھوٹا سا سائن بورڈ جھانک رہا تھا جس پر صرف "مارشل آرٹس" لکھا ہوا تھا۔ پورچ میں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ کوٹھی کا لان غیر معمولی طور پر طویل و عریض اور سرسبز تھا اور باہر سے نظر نہیں آتا تھا۔

برآمدے میں پہنچ کر جوزف نے ایک جالی دار دروازے پر لگا ہوا کال بیل کا موٹا سا سفید بٹن دبایا اور چند لمحے بعد دروازہ تھوڑا سا کھل گیا۔ چپٹی ناک والے ایک زرد رو اور پستہ قد نوکر نے باہر قدم رکھے بغیر سوالیہ نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔

جوزف نے جیب سے ایک تہہ شدہ کاغذ نکال کر اس کی طرف بڑھایا اور انگریزی میں کہا۔ "یہ ماسٹر شیطان کو دے دو۔" نام کا تلفظ اس نے اب بھی درست نہیں کیا تھا۔ پستہ قد نوکر ہو نہ ہو جاپانی تھا اور جس کی عمر کا اندازہ لگانا خاصا مشکل تھا۔ ایک طرف کو ہٹ گیا اور اس کے سامنے سے گزر کر ہم اندر پہنچے تو اپنے آپ کو ایک وسیع مگر سادہ سی نشست گاہ میں پایا۔ پستہ قد جاپانی نے قدیم طرز کے گدے دار ٹکوری کرسیوں کی طرف اشارہ کیا اور خود اندر چلا گیا۔

ماسٹر شالی تن کے متعلق میرا اندازہ تھا کہ وہ بھی چپٹی ناک والا کوئی پستہ قد جاپانی ہو گا مگر جب تقریباً 6 فٹ قد کے ایک وجیہہ نوجوان نے نشست گاہ میں آ کر ہم سے ہاتھ ملاتے ہوئے ماسٹر شالی تن کے نام سے اپنا تعارف کرایا تو کم از کم میں تو بے حد حیران ہوا کیونکہ نہ صرف اس کا قد چھ فٹ سے اوپر تھا بلکہ اس کی ناک بھی ستواں تھی۔ اپنے لب ولہجے کے علاوہ کسی اعتبار سے جاپانی نہیں لگتا تھا۔

"منظم نے مجھ سے فون پر بات کی تھی۔" اس نے انگریزی میں کہا۔ "میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ اگر وہ دوسرے سب لوگوں سے الگ تھلگ اپنے بیٹے کو خصوصی تربیت دلوانا چاہتی ہے تو اس کی علیحدہ فیس ہو گی اور وہ بھی ایک سال کی ایڈوانس۔" اس نے ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے ایک گہری سانس لی۔ "میں شاید پیسے کے معاملے پر اتنا زور نہ دیتا لیکن مجھے دراصل اس فن کو ہندوستان میں متعارف کرانے کے لئے پیسے کی ضرورت

ہے کیونکہ میں اپنے کام کو بنی نوع انسان کی خدمت سمجھ کر انجام دینا چاہتا ہوں لیکن اس کے لئے بھی دنیا کے کچھ تقاضے پورے کرنے پڑتے ہیں۔ پبلسٹی پر خرچ کرنا پڑتا ہے۔ خصوصاً مجھے تو بہت محنت کرنا پڑے گی کیونکہ ہندوستان میں ابھی یہ فن صحیح طور پر متعارف نہیں ہوا تاہم مجھے یقین ہے کہ چند سال بعد ایشیا کے تمام پسماندہ ملکوں کا بچہ بچہ اگر جوڈو کراٹے کا ماہر نہیں تو اس سے آشنا ضرور ہو گا۔"

جوزف نے معافی لے کر ماسٹر شالی تن کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں رقم لے کر آیا ہوں مسٹر شیطان ——— شالی تن!" اس نے بریف کیس ماسٹر شالی تن کی طرف بڑھا دیا۔ شالی تن نے اسے گھٹنوں پر رکھ کر کھولا۔ میں نے اس میں نوٹوں کی کچھ گڈیاں دیکھیں۔ شالی تن نے رقم گنے بغیر بریف کیس بند کر کے قالین پر رکھ دیا اس کے چہرے پر اب بشاشت آ گئی تھی۔

"یہ ہے لڑکا" جوزف نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "اس کا نام منصور ہے۔ آپ اسے بتا دیں کہ یہ کس روز سے اور کس وقت آنا شروع کر دے۔"

"اوہ ......" شالی تن نے اب بغور میرا سر تا پا جائزہ لیا اور گرم جوشی سے مصافحے کے لئے میری طرف ہاتھ بڑھایا وہ میرے مقابل خاصے فاصلے پر بیٹھا تھا اور بیٹھے بیٹھے ہی اس کا ہاتھ مجھ تک پہنچ گیا تھا۔ اس کا بازو عام انسانوں کی نسبت لمبا تھا اور جب میں نے اس سے مصافحہ کیا تو یوں محسوس ہوا جیسے ہاتھ اچانک کسی لوہے کے آہنی شکنجے نے اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ جس میں کسی مکینزم کے تحت جان پڑ گئی ہو۔

"منصور! تمہارا جسم بتاتا ہے کہ تم نے دیسی ورزشیں بہت کی ہیں۔ کیا میرا اندازہ درست ہے؟" شالی تن نے پوچھا۔

"جی ہاں ———" میں نے جواب دیا۔ "میں نے تقریباً پانچ سال پہلوانی وغیرہ کی تربیت حاصل کی ہے۔"

"بہت خوب"۔ شالی تن نے چٹکی بجائی۔ "یہ تمہارے بہت کام آئے گی۔ دیسی ورزشوں سے جسم میں بہت زیادہ قوت برداشت اور لچک پیدا ہو جاتی ہے جو کہ جوڈو کراٹے کے لئے بہت ضروری ہے۔ میرا خیال ہے مجھے تم پر زیادہ محنت نہیں کرنا پڑے گی۔" پھر وہ ایک لمحے کے لئے کچھ سوچ کر بولا۔ "تم ایسا کرو کل شام سے باقاعدگی کے ساتھ 6 بجے آنا شروع کر دو تمہیں یہاں تقریباً دو گھنٹے لگا کریں گے۔"

"ٹھیک ہے جناب!" میرے بجائے جوزف نے جواب دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "اب اجازت ...... کل سے منصور آیا کرے گا۔"

باہر آ کر کار میں بیٹھتے وقت جوزف نے میرا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ "مو بھئی! تمہیں شیطان کی شاگردی مبارک ہو۔"

"شکریہ مسٹر جوزف!" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "تم اب میرے استاد ہو چکے ہیں۔ اب تم ان کا نام صحیح طریقے سے لیا کرو۔"

جوزف نے اپنے مخصوص انداز میں ایک بلند قہقہہ لگایا اور کار اسٹارٹ کر دی۔

اگلے روز میں ٹھیک 5 بجے شاؤ لن کی کوٹھی پہنچا تو وہ میرا منتظر ہی تھا۔ پہلے دن اس نے مجھے ایک ڈھیلی ڈھالی سفید شرٹ اور ایسا ہی ڈھیلا ڈھالا پاجامہ دیا اور بڑے اہتمام کے ساتھ مجھ سے چند خاص خاص باتوں کا عہد لیا تھا۔ یہ کہ اگر میں نے دلچسپی کے ساتھ جوڈو اور کراٹے کے فن پر عبور حاصل کر لیا تو اسے تخریبی مقاصد کے لئے استعمال نہیں کروں گا۔ اپنے سے کمزور پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا' اپنی طاقت کو کسی لالچ کے تحت استعمال نہیں کروں گا' کسی کا آلہ کار نہیں بنوں گا وغیرہ وغیرہ۔

اس کے بعد شاؤ لن نے مجھے ایک طویل لیکچر دیا جس کا مقصد مجھے جوڈو اور کراٹے کی تعریف سمجھانا تھا۔ اس کا لب لباب یہ تھا کہ یہ دراصل کوئی لڑنے بھڑنے یا لڑائی جھگڑے کا ہنر نہیں بلکہ باقاعدہ ایک علم ہے جس کا تعلق جسم کے ساتھ ساتھ روح' ذہن اور قوت ارادی سے بھی ہے اس کے بعد اس نے مجھے استاد اور شاگرد کی باہمی تعظیم اور اکھاڑے کے آداب سکھائے جو اس فن میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔

یہ سب کچھ ذہن نشین کرانے کے بعد اس نے مجھ سے سوال و جواب کر کے ایک طرح سے میرا ٹیسٹ لیا اور مطمئن ہو کر مجھے چھٹی دے دی۔ اگلے دن سے میری باقاعدہ تربیت شروع ہوئی یہ ایک دلچسپ فن تھا اور اسے سیکھتے ہوئے میری دلچسپی روز بروز بڑھتی گئی۔

انسان ماضی پر نظر ڈالے تو ہر بات' ہر واقعہ' ہر یاد خواب و خیال لگتی ہے۔ ماہ و سال' لمحوں سے بھی مختصر لگتے ہیں۔ چین میں مجھے اپنی تعلیم و تربیت کا دور اس وقت بہت سست رفتار اور طویل محسوس ہوتا تھا لیکن اب سوچتا ہوں تو ایسا لگتا ہے گویا میں پلک جھپکتے میں عمر کے سولہویں سال میں پہنچ گیا تھا اور یہ وہ وقت تھا جب شاؤ لن نے مجھے بلیک بیلٹ دینے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت تک اس کا کام خاصا پھیل چکا تھا اور اس کے یہاں 27 شاگرد تربیت کے آخری مراحل میں تھے۔ جن میں ایک انگریز لڑکی بھی شامل تھی۔ آزمائشی مقابلوں میں' میں ان سب کو شکست دے چکا تھا۔

بلیک بیلٹ حاصل کرنے کے لئے مجھے ماسٹر شاؤ لن سے مقابلہ کرنا تھا' محض نمائشی یا آزمائشی مقابلہ نہیں بلکہ بھرپور اور فیصلہ کن حقیقی مقابلہ ...... شاؤ لن نے فیصلہ دے دیا تھا کہ یہ مقابلہ ضرور منعقد ہو گا اور نہایت زور و شور سے اس کی تیاریاں شروع کر دی گئی تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ یہ مقابلہ ایک باقاعدہ شو کی طرح منعقد کیا جائے اور شہر کی چیدہ چیدہ ہستیوں اور اخباری نمائندوں وغیرہ کو بھی مدعو کیا جائے۔ اس مقابلے کی تیاریوں کو

آخری شکل دینے کے بعد شاؤ لن نے شانتا رام آڈیٹوریم کرائے پر لے کر مقابلہ کی تاریخ کا اعلان کر دیا۔

میں مقابلے کے لئے تو تیار تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرے دل کے ایک گوشے میں ابھی شاؤ لن کی دہشت اور دبدبہ برقرار تھا۔ بلاشبہ اس نے اپنا فن مکمل طور پر مجھ میں سمو دیا تھا اور اسے میری ذات پر بے پناہ فخر تھا۔ لیکن اس کی تمام تر دیانتداری کے باوجود مجھے اندیشہ تھا کہ بلی کی طرح تمام داؤ شیر کو سکھانے کے بعد بھی اس نے ایک آدھ داؤ محفوظ نہ رکھا ہو۔ دوسرے یہ کہ اسے پبلک کے سامنے اپنے فن کے مظاہرے کا طویل تجربہ تھا جبکہ میں پہلی مرتبہ اس قسم کے مرحلے سے گزرنے والا تھا۔

ان سب باتوں سے قطع نظر بحیثیت شاگرد ہی نہیں بحیثیت حریف بھی میں شاؤ لن سے مرعوب تھا۔ وہ اس قدر عجیب و غریب صلاحیتوں کا مالک تھا کہ کبھی کبھی تو مجھے اس پر کسی مافوق الفطرت مخلوق کا شبہ ہونے لگتا تھا۔ کراٹے کے جس وار سے میں ماربل کے تختے کے ٹکڑے کر دیتا تھا۔ انہیں شاؤ لن اس طرح برداشت کر جاتا تھا کہ اس کے حلق سے ہلکی سی کراہ بھی نہیں نکلتی تھی اور نہ ہی اس کی کوئی ہڈی اپنی جگہ سے کھسکتی تھی۔ قوت برداشت اور وار کو زائل کرنے کی صلاحیت تو مجھ میں بھی اب آ چکی تھی لیکن میں وار کرنے کے معاملے میں اپنے آپ کو شاؤ لن سے کسی قدر کمتر محسوس کرتا تھا جبکہ شاؤ لن کا کہنا تھا کہ یہ میرا وہم ہے۔ شاؤ لن جب ہوا میں ہاتھ یا لات گھماتا تو شائیں کی سی آواز پیدا ہوتی تھی جیسے ہوا میں کوڑا گھمایا گیا ہو۔

وہ جب پوری طرح ایکشن میں ہوتا تھا تو اس کے ہاتھ پیروں پر نظر نہیں ٹھہرتی تھی کراٹے کا اس سے بڑا حیرت انگیز مظاہرہ وہ تھا جس میں اس نے تقریباً دس بارہ فٹ لمبے اور ایک فٹ کی گولائی کے اکھڑے کو ہاتھ سے ایک وار سے دو ٹکڑے کر دیا تھا۔ یہ مظاہرہ ایک بار محفل میں بھی کر چکا تھا گویا اب ہر لحاظ سے میں اپنے استاد کا مد مقابل تھا اس کے باوجود نہ جانے کیوں دل پر ہلکی سی مرعوبیت طاری تھی۔ بہرحال اس کا فیصلہ بھی اب آخری مقابلے میں ہو جانا تھا کہ یہ مرعوبیت میرے دل پر ہمیشہ مسلط رہے گی یا ختم ہو جائے گی۔

مقررہ تاریخ پر ہم صبح ہی شانتا رام آڈیٹوریم پہنچ گئے تھے اور خالی ہال کے سامنے اسٹیج پر اپنے مظاہروں کی ریہرسل کر رہے تھے۔ مقابلہ دیکھنے کے لئے شام کو ہی لوگ آنے والے تھے۔ دوپہر کو میں نے شاؤ لن اور اس کے دیگر شاگردوں کے ساتھ ہلکا پھلکا کھانا کھایا اور ہم ریٹائرنگ روم میں ستانے لگے۔ شاؤ لن ایک کاؤچ پر نیم دراز عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"منصور! تمہاری عمر صرف 16 سال ہے۔" چند لمحے بعد اس نے کہا۔ "اگر مقابلے

میں تم نے مجھے شکست دے دی تو اس کشتی میں تمہیں بلیک بیلٹ مل جائے گا اور جوڈو کراٹے کی تاریخ میں بلاشبہ یہ ایک ریکارڈ ہو گا لیکن یہ مت بھولنا کہ اس مقابلے میں میں تمہارے ساتھ کوئی رعایت نہیں کروں گا اور اس کوتاہی پر ہم دونوں میں سے کسی کی موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔ جس کے لئے ہم ایک اقرار نامے پر بھی دستخط کر چکے ہیں۔"

"مجھے سب یاد ہے ماسٹر شاؤ" میں نے آہستگی سے کہا اور اپنے دونوں ہاتھوں کو گھورنے لگا۔ میری آنکھوں میں ممی کا چہرا ابھر آیا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ ان کی نظروں میں سرخرو ہونے کی فکر تھی۔ اپنی جان کی مجھے کوئی خاص پروا نہیں تھی۔ دنیا میں صرف ایک ہی ہستی تھی جس کی توقعات پر پورا اترنے اور جس کی خوشنودی حاصل کرنے کی مجھے لگن تھی اور وہ ہستی میری ماں تھی۔ اس کے علاوہ دنیا کے کسی فرد کی میری نظر میں اتنی اہمیت نہ تھی کہ میں اپنے واسطے میں اس کی رائے کی فکر کرتا۔

ٹھیک نو بجے تیز روشنیوں کے سیلاب میں وسیع اسٹیج کا پردہ اٹھا۔ ہال میں حاضرین کی تعداد زیادہ نہیں تھی کیونکہ عام لوگوں کو مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ اسٹیج کنڈکٹر کی مختصر تعارفی تقریر کے بعد ایک گھنٹے تک شاؤ تن کے 18 شاگردوں نے جوڈو کراٹے کے نمائشی مقابلے پیش کئے اور آخر میں شاؤ تن اور میں اسٹیج کے بیچ بچھی فرش پر بچھے ہوئے رنگ میں اترے۔ ہال میں روشنی بہت مدھم تھی۔ اس لئے میں حاضرین میں ممی کا چہرہ تو نہ دیکھ سکا البتہ ان کی ریشمی سفید چادر کی جھلک میں نے اگلی قطار میں دیکھ لی تھی اور میرا دل دھڑک اٹھا تھا۔

حاضرین کو سلام کرنے کے بعد میں اور شاؤ تن ایک دوسرے کے مقابل آ گئے۔ ہم نے تقریباً رکوع کی سی حالت میں جھک کر ایک دوسرے کو تعظیم دی اور پھر پیچھے ہٹ گئے۔ اسٹیج کے عقب سے ڈھائی ڈھائی فٹ لمبی دو ٹھوس چھریاں ہماری طرف اچھالی گئیں۔ یہ چھریاں ہم دونوں نے اس طرح لپک لیں کہ ہمارے ہاتھوں میں آتے ہی یہ پنکھے کے پروں کی طرح تیزی سے گردش کرنے لگیں۔ اس دوران ہم ایک دوسرے کے سامنے چکر کاٹ کر نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے کو تولتے رہے۔ "وتہ" ہوا میں شائیں کی سی آواز پیدا ہوئی اور میں اچھل کر ایک طرف کو ہٹ گیا۔ نہ جانے کب شاؤ تن کی چھری گردش میں آئی تھی اور کب اس نے وار کیا تھا۔ لیکن بہرحال مجھے اتنا اندازہ ہے کہ اگر چھری کی یہ ضرب میری کھوپڑی پر پڑی ہوتی تو اس طرح سر کے پرخچے اڑ جاتے جس طرح کسی وزنی گرز سے وار کیا گیا ہو اور یوں مقابلہ شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جاتا کیونکہ چھری کے یہ کرتب تو درحقیقت صرف خون گرمانے کے لئے ابتداء میں دکھائے جاتے ہیں۔

میں نے بائیں طرف جھکتے ہی اپنی چھری سے شاؤ تن کی پسلیوں پر وار کیا۔ شاؤ تن نے نہ صرف میرا وار خالی کر دیا بلکہ اس نے چھری پر ہاتھ بھی اچھال دیا اور وہ میرے ہاتھ

سے نکل گئی لیکن ساتھ ہی میں نے اس کی کلائی پر کراٹے کا داؤ "کوری گریں" آزمایا اور چھری اس کے ہاتھ سے بھی نکل گئی۔ شاؤ تن ایڑی کے بل گھوما اور الٹے رخ اس کی ٹانگ ہوا میں بلند ہوئی۔ میں پیچھے ہٹ چکا تھا ورنہ یہ وار جسے "ہیاکی" کہا جاتا ہے، میرے نرخرے کو بھی مٹی کے کھلونے کی طرح پچکا کر رکھ دیتا۔

اس سے پہلے کہ شاؤ تن کا چہرہ میری طرف ہوتا میں نے "سپ چار" کو آزمایا۔ یہ ایک سائیڈ کک تھی جس نے شاؤ تن کو فضا میں اچھال دیا۔ وہ ہاتھوں کے بل چھپی فرش پر گرا اور اس سے پہلے کہ میں کوئی وار کر سکتا وہ اسپرنگ والے گڈے کی طرح سیدھا ہوا اور دونوں ہاتھ پھیلا کر میری طرف جھپٹا۔ کراٹے کا وار کرنے سے پہلے اس نے میری ٹھوڑی پر ٹھوکر رسید کرنے کی کوشش کی جو میں نے ناکام بنا دی۔ لیکن بائیں کندھے پر پڑنے والے کراٹے کے ہاتھ سے میں اپنے آپ کو نہ بچا سکا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے محسوس ہوا کہ جیسے ہنسلی کی ہڈی اتر گئی ہے۔ لیکن اپنے آپ کو دوسرے وار سے بچاتے ہوئے میں نے جسم کو جھٹکا دیا اور دائیں ہاتھ سے "یان شان کوت" نامی داؤ مارا۔

تکلیف کے باعث شاؤ تن کے پتلے پتلے ہونٹ کھنچ گئے اور آنکھیں گویا ابل پڑیں۔ پھر حلق سے ایک مخصوص آواز نکال کر وہ ہوا میں اچھلا۔ اس کی ایک ٹانگ نے مجھے گھما دیا اور دوسری ایڑی پشت پر پڑی۔ یہ وار اچٹا ہوا پڑا تھا پھر بھی میری ریڑھ کی ہڈی کڑکڑا کر رہ گئی۔ میں نے ایک بار سانپ کی طرح جسم کو لہرا دے کر توازن قائم رکھنے کے ایک طریقے "ہوئیسہ کیلی" کی مدد سے اپنے آپ کو بچایا۔

اب میں نے فیصلہ کن وار کرنے کی ٹھانی۔ "اٹ" کی ایک زوردار چیخ کے ساتھ میں فضا میں بلند ہوا اور میرے چاروں ہاتھوں پیروں نے بیک وقت حرکت کی۔ لیکن میرا یہ وار مکمل نہ ہو سکا۔ شاؤ تن کی ایڑی میری بغل سے ٹکرائی اور میں چت گرتے گرتے بچا۔ اپنے جسم کو کمان کی طرح موڑ کر میں ہاتھ پیروں کے بل گرا اور سیدھا ہوتے ہوئے لات گھمائی اور میری ایڑی کی ضرب شاؤ تن کے سینے پر پڑی۔ میرے لئے یہ اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ اس کی کئی پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ مگر بلاشبہ وہ غضب کا آدمی تھا۔ سینے پر ہاتھ رکھ کر صرف ایک لمحے کے لئے جھکا پھر فوراً ہی سیدھا ہو کر اس نے میرے کندھے پر کراٹے کا ہاتھ مارا۔ اس کے وار میں اب طاقت نہیں تھی۔ میری مدافعانہ کوشش کی وجہ سے یہ ہاتھ اچٹتا ہوا میری پیشانی سے رگڑ کھاتا گزرا اور وہیں سے میری کھال پھٹ گئی۔ خون کی سرخ تہہ نے ایک لمحے کے لئے میری آنکھوں کو ڈھانپ لیا۔ اگر شاؤ تن کی پسلیاں نہ ٹوٹ چکی ہوتیں تو اس لمحے وہ میرا کام تمام کر چکا ہوتا۔

میں نے بائیں ہاتھ سے خون پونچھا اور شاؤ تن کی گردن پر کراٹے کا ہاتھ رسید کیا۔ کراٹے کے کسی معمولی کھلاڑی کی گردن اس وار سے ٹوٹ جاتی لیکن میرا مقابلہ اپنے ہی

استاد شاؤ تن سے تھا۔ جس کا جسم فولاد سے کم نہیں تھا۔ تاہم وہ گر ضرور گیا اور اس بار وہ پہلے کی سی پھرتی سے نہیں اٹھ سکا۔

میں نے اس کے نرخرے پر اس خاص انداز سے پاؤں رکھ دیا کہ اگر وہ ذرا بھی حرکت کرتا تو اس کا نرخرہ کچلا جا سکتا تھا۔ اس نے چٹائی فرش پر ہاتھ مار کر مخصوص اشارہ کیا جس کا مطلب تھا کہ اس نے شکست تسلیم کر لی ہے۔ میں نے پاؤں اس کی گردن سے اٹھا لیا اور اس کا ہاتھ تھام کر اسے سیدھا کھڑا کیا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو تعظیم دی۔

شاؤ تن کا ایک ہاتھ سینے پر تھا مگر اس غیر معمولی انسان کے ہونٹوں پر اب بھی مسکراہٹ تھی۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر بلند کیا اور اکھڑی اکھڑی سی سانسوں کے ساتھ اعلان کیا کہ اس کا شاگرد بلیک بیلٹ کا مستحق ہو چکا ہے۔

اس نے اپنے سفید لبادے پر سے بلیک بیلٹ اتار کر میرے گلے میں ہار کی طرح ڈال دی۔ تالیوں کے شور میں پھر گرا تو شاؤ تن میرے کندھے کا سہارا لے کر ڈک کی طرف بڑھا۔ باہر ایمبولینس تیار کھڑی تھی۔ ایمبولینس کے عملے نے آگے بڑھ کر شاؤ تن کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن اس نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں ہٹا دیا۔ پھر وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ "پسلیاں صرف ٹوٹی ہیں۔ سمجھنے میں نہیں آیا کہیں ..... وار کیا تھا۔"

"ممکن ہے بھی تو دیکھیں ماسٹر شاؤ کہ میں نے کس پوزیشن میں وار کیا تھا۔" میں نے مدافعانہ لہجے میں کہا۔ "بہرحال اب آپ ہسپتال چلیں۔ داؤ پیچ کی باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی۔"

ہم اسے تھام کر برآمدے میں کھڑی ایمبولینس کی طرف لے جا رہے تھے۔ جب سیڑھیوں کے قریب میں نے ممی کو کھڑے دیکھا۔ انہوں نے لپک کر مجھے سینے سے لگایا اور بے تحاشا چومنے لگیں۔ برآمدے میں بڑے بڑے گلوب روشن تھے جن کی روشنی میں ممی کا چہرہ معمول سے کہیں زیادہ شگفتہ نظر آ رہا تھا۔ گو کہ اب عمر کے ساتھ ساتھ ان کے بالوں میں کہیں کہیں چاندی کے تار جھلملانے لگے تھے اور روشن چہرے پر ایک آدھ شکن نمودار ہو چلی تھی۔ مگر ان تبدیلیوں سے ان کے چہرے کے تقدس، وقار اور متانت میں نمایاں اضافہ ہو گیا تھا۔

"ممی آپ گھر چلیں، میں ماسٹر شاؤ تن کو ہسپتال پہنچا کر ابھی واپس آتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"تم اطمینان سے سب کام کرو۔" انہوں نے میرا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ "میں تو اب واپس جا رہی ہوں۔ صرف اس مقابلے کے لئے وقت نکال کر آئی تھی۔ آج کا دن بلاشبہ میرے لئے ایک ناقابل فراموش خوشی کا دن ہے۔ ایک طویل مدت کے بعد ایسی خوشی

نصیب ہوئی ہے۔ میرا دل تو چاہتا ہے کہ تمہیں کم از کم آج کی رات تو نظروں سے اوجھل نہ کروں، لیکن مجبوری ہے ...... ملازمت کی مجبوری ...... میرے کام کی نوعیت ایسی ہے کہ کسی دن بھی چھٹی نہیں ملتی۔ بہرحال جمعرات کو آؤں گی تو پھر باتیں ہوں گی۔ اب تم جاؤ شاباش ......"

میں بادل نخواستہ ایمبولینس کی طرف بڑھا۔ ماسٹر شاؤ تن اسٹریچر پر لیٹ کر جانے کے بجائے ہسپتال کے عملے کے دو آدمیوں کا سہارا لے کر اپنے پاؤں پر چل کر ایمبولینس کے قریب پہنچا تھا۔ اسٹریچر ایمبولینس میں رکھ دیا گیا تھا اور جب میں گاڑی تک پہنچا تو شاؤ تن اسٹریچر پر لیٹ چکا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور اب وہ واقعی نڈھال نظر آ رہا تھا۔ میں اس کے ساتھ بیٹھنا چاہتا تھا لیکن ایک اٹینڈنٹ نے مجھے منع کر دیا۔

میں نے پارکنگ لاٹ سے اپنی موٹر کار نکالی اور ایمبولینس کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گیا۔ میرا ذہن ان گنت الجھے الجھے خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اور ان خیالات کا محور و مرکز شاؤ تن ہی تھا۔ اسے ایمبولینس میں منتقل ہوتے دیکھ کر مجھے واقعی تکلیف ہوئی تھی اور ساتھ ہی میرا جی چاہا تھا کہ اس کی پیشہ ورانہ عظمت کو سلام کرنے کے لئے اس کے ہاتھوں کو بوسہ دوں۔ وہ چاہتا تو آج کا مقابلہ فی الفور شکست کے ساتھ ختم کر سکتا تھا جو ہار جیت کے نظریہ سے ضرور نتائج کے ساتھ ختم ہو جاتا یا وہ چاہتا تو تربیت کے دوران اپنا فن اور مہارت مکمل طور پر میری ذات میں منتقل نہ کرتا اور آج صرف چار منٹ اور چھ سیکنڈ کے اس مقابلے میں میری ہڈیاں علیحدہ کر کے رکھ دیتا لیکن اس نے پوری دیانتداری سے میری تربیت کی تکمیل کی تھی۔ اور اسی دیانتداری کے ساتھ میرا امتحان لیا تھا۔ اور اسی کے لئے اپنی جان پر کھیلنے سے بھی دریغ نہیں کیا تھا اگر اس نے کسی بھی مرحلے پر بے ایمانی سے کام لیا ہوتا تو شاید اس کی جگہ میں ایمبولینس میں ہسپتال یا سیدھا گاڑی میں قبرستان جا رہا ہوتا یا پھر وہ جھوٹ موٹ مجھ سے مقابلہ ہار سکتا تھا۔

سٹی ہسپتال سے میری واپسی رات کے تقریباً گیارہ بجے ہوئی۔ ماسٹر شاؤ تن کو خصوصی توجہ کے وارڈ میں رکھا گیا تھا۔ اگلی صبح 9 بجے اس کا آپریشن ہونا تھا۔ ایکسرے رپورٹ سے پتا چلا تھا کہ اس کی تین پسلیاں ٹوٹی تھیں جن میں ایک اس طرح مڑی ہوئی تھی کہ دائیں پھیپھڑے پر بری طرح دباؤ پڑ رہا تھا اور اسے سانس لینے میں بڑی دشواری پیش آ رہی تھی جس وقت میں ہسپتال سے چلا تھا، اس وقت وہ بے ہوشی کی دواؤں کے اثر میں تھا۔

پونا کی سڑکیں ان دنوں 8 بجے ہی سنسان ہو جایا کرتی تھیں اور جس وقت میں ہسپتال سے نکلا، اس وقت تو بالکل ہو کا عالم طاری تھا جب میں آزاد روڈ پر پہنچا تو چاند بادلوں کے عقب سے نکل آیا تھا۔ آزاد روڈ کے دونوں طرف ہلکا دھندلکا پھیلا ہوا تھا۔ یہ

پونا کے خوشحال ترین لوگوں کی عظیم الشان کوٹھیوں اور بنگلوں پر مشتمل بستی تھی۔ ان بڑے بڑے سیٹھوں اور ساہو کاروں میں سے کئی کے کاروبار دہلی بمبئی یا کلکتہ جیسے بڑے بڑے شہروں میں پھیلے ہوئے تھے اور وہ یہاں رہتے بھی نہیں تھے۔ سال میں مہینے یا دو مہینے کے لئے آتے تھے اور آرام و عیاشی کر کے چلے جاتے تھے۔ ان کی کوٹھیاں عموماً خالی پڑی رہتی تھیں۔

میں اپنے خیالات میں گم درمیانی رفتار سے جا رہا تھا۔ دفعتاً ایک کار تیز رفتاری سے میرے قریب سے نکلی اور کچھ آگے جا کر یوں ترچھی ہو کر رک گئی کہ میرے لئے گاڑی نکالنے کا راستہ نہ رہا۔ سڑک کے دونوں طرف سفیدے کے درختوں کی قطاریں تھیں جنہوں نے خاصی جگہ گھیر رکھی تھی۔ میں نے اس کار سے کوئی فاصلے پر ہی اپنی گاڑی روک لی۔

وہ گہرے رنگ کی ایک نئی سی اوپل تھی جس کے ایک دروازے پر پیلے رنگ کا بڑا سا دائرہ بنا ہوا تھا جو خاصا کھب رہا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے کار کے دروازے کھلتے دیکھے۔ چار افراد کار سے کود کر نکلے وہ تیزی سے میری طرف بڑھے تو میں نے دیکھا کہ ان میں سے ایک دراز قامت لڑکی تھی جس کے تراشیدہ بال ایک لمحے کے لئے اس کے کندھوں پر لہرائے تھے۔ وہ چست، سفید ریشمی بلاؤز اور سیاہ برجس پہنے ہوئے تھی۔ پنڈلیوں میں فل بوٹ تھے۔ عام طور پر بڑے سیٹھوں کی بیٹیاں اس حلیے میں شکار پر نکلتی تھیں۔ چاندنی میں اس کا ریشمی بلاؤز چمک رہا تھا۔ تینوں آدمی ڈھیلی ڈھالی سی پتلونوں اور ان سے مختلف رنگوں کے کوٹوں میں ملبوس تھے۔

میں اس وقت بھی اسٹیئرنگ پر ہاتھ رکھے بیٹھا تھا جب وہ میری گاڑی کے قریب پہنچے۔ لڑکی اور ایک مرد ڈرائیونگ سیٹ والی کھڑکی کی طرف تھے اور دو مرد دوسری کھڑکی پر تھے۔ لڑکی میرے قریب کھڑکی پر جھک گئی اور تب میں نے دیکھا کہ وہ کم عمر ہے پھر حسین تھی، موٹی موٹی سیاہ آنکھیں، اونچی ستواں ناک اور بھرے بھرے ہونٹ...... اسے دیکھ کر کسی ایسے رسیلے پھل کا خیال آتا تھا جو وقت سے پہلے پک گیا ہو۔ سر سے پاؤں تک وہ کسی ماہر سنگتراش کا مجسمہ تھی۔

لڑکی کی قومیت کا اندازہ لگانا مشکل تھا بظاہر وہ یوریشین معلوم ہوتی تھی۔ لیکن جب وہ بولی تو اس کا لب و لہجہ خالصتاً ہندوستانی تھا۔

"مسٹر منصور!" اس نے بڑی شائستگی سے کہا۔ "ہم آپ کو ایک چھوٹی سی زحمت دینا چاہتے ہیں۔ یہاں سے چند قدم کے فاصلے پر ایک کوٹھی ہے۔ آپ کو وہاں تک چلنا ہو گا صرف دس منٹ لگیں گے۔"

"مگر تم لوگ مجھے لوٹنے کا ارادہ رکھتے ہو۔" میں نے لڑکی کے ساتھیوں کے چہرے پر نظر ڈال کر سرسری سے لہجے میں کہا۔ "تو میرا مخلصانہ دیانتدارانہ اور دوستانہ مشورہ ہے کہ کوئی اور آسامی تلاش کر لو۔ میرے پاس اس وقت کوئی خاص رقم موجود نہیں ہے اور نہ ہی میں کوئی امیر زادہ ہوں۔"

لڑکی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "ہم اتنے معمولی قسم کے اچکے نہیں کہ چند سو یا چند ہزار کی رقموں کے لئے یوں لوگوں کو راستے میں روکتے پھریں یا ان کے تعاقب میں چار چار پانچ پانچ گھنٹے ضائع کرتے پھریں۔"

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہے؟" میں نے سیٹ پر پہلو بدل کر اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"آج شام شاہنا رام آڈیٹوریم میں تمہارا مقابلہ دیکھنے کے لئے ہم بھی موجود تھے۔" لڑکی کا لہجہ اب قطعی دوستانہ سا ہو گیا تھا۔

"تب میں جاننا چاہوں گا کہ تم لوگوں کو مجھ سے کیا کام ہے اور کیا اس کے لئے میرا تمہارے ساتھ اس کوٹھی میں جانا ضروری ہے جس کا تم نے ذکر کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کام ہمیں نہیں ہمارے سیٹھ کو ہے جو بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہا ہو گا۔ تمہارا مقابلہ دیکھنے کے لئے ہم اسی کے ساتھ گئے تھے اور مقابلہ ختم ہوتے ہی اس نے ہمیں ہدایت کی تھی کہ ہم تمہیں اس سے ملنے کی دعوت دیں لیکن اس وقت تم بہت زیادہ لوگوں میں مصروف تھے۔ میرا خیال ہے اب ہمیں یوں سڑک پر کھڑے ہو کر باتوں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔" لڑکی نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "کوئی ادھر آ نکلا تو راستہ بند دیکھ کر خواہ مخواہ تجسس میں مبتلا ہو گا۔"

"تجسس میں تو میں بھی مبتلا ہو گیا ہوں۔" میں نے اپنے بے ترتیب بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ "مگر آخر تمہارے سیٹھ کو مجھ سے کیا کام ہے؟"

"کوئی خاص کام نہیں......" لڑکی اپنے ساتھی کی طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ "دراصل ہمارا سیٹھ بہت لحیم و شحیم آدمی ہے نا...... شاید اسی لئے اسے ہر طاقتور اور خطرناک آدمی سے ملنے کا بڑا اشتیاق رہتا ہے۔"

"ہوں۔" میں نے غیر ارادی طور پر تھوڑی کھجائی۔

"فرض کرو کہ میں یہ کہوں کہ میں بہت تھکا ہوا ہوں اور اس وقت صرف اپنے گھر جانا چاہتا ہوں کسی اور کے نہیں تو پھر کیا ہو گا۔"

"پھر یہ ہو گا مسٹر منصور......" دوسری کھڑکی کی طرف سے لڑکی کے ایک ساتھی کی آواز آئی اور میں نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا اس نے ایک بھدے سے ریوالور کی لمبی نال کھلی کھڑکی پر ٹکا دی تھی۔

"میں دروازہ کھول کر تمہارے برابر بیٹھوں گا اور پھر تم اطمینان سے چلو گے کیونکہ

اس ریوالور کی گولی جلد یا کراسے کے کسی بھی دلتو سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔"

صورتحال میں نے بغور اس کی طرف دیکھا۔ اس کی رنگت سیاہی مائل، چھوٹا چہرہ اور ہونٹ غیر معمولی طور پر موٹے تھے۔ اس کے رخساروں پر کئی دن کی بڑھی ہوئی شیو اور آنکھوں میں شاید شب بیداری کی سرخی تھی۔ اس کے چہرے پر زخم کا کوئی نشان نہیں تھا مگر نجانے کیوں اسے دیکھ کر خیال آتا تھا کہ وہ زندگی میں بارہا لڑا ہو گا اور اس نے بہت چوٹیں کھائی ہوں گی۔

"مائی ڈیئر لوگ ــــــ ہر قیمت پر مجھے سیٹھ کے پاس لے جانے کا تہیہ کر کے آئے ہو؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"مجھے افسوس ہے پارٹنر شاید تمہیں یہ بات بری لگی ہو کیونکہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ میری تربیت نے شاید طرف کا عنصر میری جبلت سے ہی نکال پھینکا تھا۔" اس نے انتہائی بیزار لہجے میں کہا۔ "اگر تم اب بہت ہو چکے ہو اب چلو سیٹھ ہمیں جو حکم دے، ہم اس کی تعمیل کیے بغیر اس کے سامنے جانے کے عادی نہیں ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ ڈالا۔

میں اسی لمحے میرے بائیں ہاتھ نے نظروں کو دھوکا دینے والی تیزی سے حرکت کی اور اس کی ہلکی سی ضرب ریوالور کی نال پر پڑی جس کا بیشتر حصہ کھڑکی کے اندر تھا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے نکلا اور نیم دائرے میں گھوم کر کار کے فرش پر یوں آگرا گویا کھڑکی کے راستے کسی سیاہ شعلے نے کار میں چھلانگ لگا دی ہو۔ لیکن میری اس حرکت سے صورتحال میں کوئی خاص فرق نہ پڑا۔ دائیں طرف سے لڑکی اور بائیں طرف سے اس کا ایک اور ساتھی انتہائی پھرتی سے پچھلے دروازے کھول کر پچھلی نشست پر آ بیٹھے تھے اور اب ایک دوسرے ریوالور کی نال میری گدی سے آ لگی تھی۔

"ہماری خواہش تھی کہ ہم دوستانہ انداز میں چلتے۔" عقب سے لڑکی کی مترنم اور پرسکون آواز سنائی دی۔ "لیکن اب مجبوری آن پڑی ہے تو یوں ہی سہی ــــــ"

"اور یہ خیال رکھنا۔" اس کے قریب سے اس کے ساتھی کی پھٹی پھٹی سی آواز سنائی دی۔ "کہ میرے ہاتھ سے ریوالور اتنی آسانی سے نہیں نکل سکتا جتنی آسانی سے جیکب کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔"

جیکب ہی اگلا دروازہ کھول کر میرے برابر آ بیٹھا اور اس نے فرش سے اپنا ریوالور اٹھا کر میری پسلیوں سے لگا دیا۔ پچھلی سیٹ پر موجود لڑکی کے ساتھی نے اپنی بات جاری رکھی۔ "اور یہ بھی یاد رکھنا کہ میرے برابر میں جو لڑکی بیٹھی ہے یہ صرف نظروں کے تیر چلانا ہی نہیں جانتی، زہر میں بجھا ہوا خنجر بھی بڑی عمدگی سے چلاتی ہے اور وہ خنجر اتفاق سے اس وقت تمہاری گردن سے صرف ایک موت کے فاصلے پر ہے اور یہ فاصلہ اس لئے رکھا گیا ہے کہ بعض اوقات اس خنجر کی محض نوک چھو جانے ہی سے انسان کے جسم میں زہر پھیل جاتا ہے اور شگفتہ تم جیسے کم سن، حسین اور توانا لڑکے کو کم از کم زہری موت مارنا پسند نہیں کرے گی۔ بشرطیکہ کوئی کڑی مجبوری نہ آن پڑے۔" وہ عقب سے انداز میں ہنسا اس کی ہنسی بھی اس کی آواز کی طرح گھٹی گھٹی سی تھی۔

"ویری ــــــ ویری" میں نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔ "تمہارا انداز گفتگو نہایت نستعلیق ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آغا حشر کاشمیری کے زمانے کا کوئی بھولا بسرا جنم لے کر آ گیا ہے۔"

میں نے ونڈ سکرین کے اوپر لگے ہوئے عقب نما آئینے میں اس کے چہرے کی دھندلی سی جھلک دیکھی۔ اس کے چہرے کے عضلات کھنچے کھنچے سے تھے اور پتلے پتلے ہونٹ چوڑے جبڑوں پر کچھ زیادہ ہی پتلے معلوم ہو رہے تھے۔ کار کی چھت پر لگی ہوئی چھوٹی سی لائٹ آن تھی مگر روشنی چونکہ اوپر سے اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی، اس لئے اس کے بالوں کے سائے میں اس کی آنکھیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔

"اب تو مجھے مجبوری سے زیادہ تجسس ہو چلا ہے کہ تمہارے سیٹھ سے مل ہی لیا جائے۔" میں نے آہستگی سے گیئر لگاتے ہوئے کہا۔ ان کا چوتھا ساتھی مطمئن ہو کر دوڑتا ہوا اپنی کار کی طرف چلا گیا۔

اگلی کار اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھی تو میں نے اپنی کار اس کے پیچھے لگا دی۔ اسی سڑک پر تقریباً آدھ فرلانگ چل کر اگلی کار بائیں طرف مڑ گئی۔ چند سیکنڈ بعد ہم ایک اور پتلی سی سڑک پر جا رہے تھے جو شارع عام نہیں تھی بلکہ سیدھی لوہے کے ایک بلند و بالا سیاہ گیٹ کی طرف جا رہی تھی۔ یہ گیٹ جس کوٹھی کا تھا، وہ دوسری کوٹھیوں کی قطار سے بہت پیچھے ہٹ کر بنی ہوئی تھی۔ کوٹھی کیا تھی، ایک اچھا بھلا قلعہ تھا۔ مغلوں سے مستعار لئے ہوئے قدیم انگریزی طرز تعمیر کے مطابق ــــــ دور سے یہ کسی پہاڑ کو تراش کر بنایا گیا ایک کوہ پیکر شاہی محل معلوم ہوتی تھی۔

صنوبر کے بلند و بالا درختوں نے تقریباً چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا مگر اس کی گول برجیاں اور غلام گردشوں کے گنبد دور سے ہی سر اٹھائے ہوئے نظر آتے تھے۔

گیٹ کے سامنے پہنچ کر دونوں کاریں آگے پیچھے رکیں تو میں نے دیکھا کہ کوٹھی کی دور تک پھیلی ہوئی چار دیواری سنگ بستہ کی تھی۔ آٹھ دس فٹ بلند اس دیوار پر مزید چار پانچ فٹ کی بلندی تک خاردار تاروں کا جال بچھا ہوا تھا اور یہ خاردار تار عام لوہے کے نہیں تھے۔ چاندنی میں المونیم کی طرح چمک رہے تھے۔ اگلی کار والے نے ہارن پر شاید ہلکا سا ہاتھ مارا تھا۔ سناٹے میں "پپ" کی مختصر سی آواز ابھری۔ دوسرے ہی لمحے گیٹ یوں ہموار اور بے آواز طریقے سے کھلا چلا گیا گویا کسی مشینی نظام کے تحت کام کرتا ہو یا پھر

سناٹے اور نیم تاریکی میں لپٹی ہوئی اس پرشکوہ عمارت میں بسیرا رکھنے والی کچھ روحوں نے انہیں کھلنے کا اشارہ دیا ہو۔

اگلی کار بجری روش پر چند گز آگے جا کر رک گئی۔ مجھے بھی گاڑی روکنا پڑی۔ میں نے دائیں بائیں نظر ڈالی۔ پھولوں سے لدی کیاریوں اور سرسبز گھاس کے ہموار قطعوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ بجری روش کے دونوں طرف بلوط کے درخت ایستادہ تھے جن کی بلندی میں بھی ایک ترتیب تھی۔ یعنی گیٹ کے قریب درخت چھوٹے تھے اور اصل عمارت کے برآمدے کی طرف بتدریج بلند ہوتے چلے گئے تھے۔ گیٹ کے قریب ہی اندر کی طرف دیوار کے ساتھ ہٹ کر ایک چھوٹا سا گیسٹ ہاؤس بھی تھا جیسا کہ عام طور پر بڑی بڑی اہم سرکاری عمارتوں میں ہوتا ہے جہاں آنے والوں کو حفاظت کے لئے روکا جاتا ہے۔

کاروں کے رکتے ہی دونوں طرف سے دو باوردی محافظ لپکے ان کے ہاتھوں میں رائفلیں اور ٹارچیں تھیں۔ میری کار کی کھڑکیوں پر جھک کر انہوں نے ٹارچوں سے ہم سب کے چہروں پر روشنی ڈالی' معنی خیز انداز میں مسکرائے اور پیچھے ہٹ گئے۔ وہ دونوں ہی مریخی معلوم ہوتے تھے اور اونچے اونچے شملوں کے ساتھ ان کے قد سات فٹ سے بھی نکلتے دکھائی دے رہے تھے۔ دونوں کی شکلیں تو مختلف تھیں لیکن ایک ہی جیسی موٹی موٹی خمیدہ ڈکیلی مونچھوں کی وجہ سے ان میں بڑی مشابہت نظر آتی تھی وہ دونوں پلٹ کر دوبارہ گیٹ کے قریب جا کھڑے ہوئے جو اب بند ہو چکا تھا۔

اگلی کار کے تعاقب میں چلتے ہوئے ہم پورچ میں پہنچ گئے جہاں کم از کم بیس کاریں کھڑی کرنے کی گنجائش تھی۔ انجن بند کر کے میں مکتلا اور اس کے دونوں ساتھیوں کے گھیرے میں کار سے اتر آیا۔ اب میرا دھیان ان لوگوں کی طرف کم اور کوٹھی کی طرف زیادہ تھا جو یقیناً واقعی کسی تجمل پرست کے خوابوں کا مسکن معلوم ہوتی تھی۔ سنگ مرمر کی چند سیڑھیاں عبور کر کے ہم برآمدے میں پہنچے۔ مکتلا کا وہ ساتھی جسے جیکب کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا سب سے آگے تھا۔ ساگوان کے اونچے منقش اور محرابی دروازے کے قریب ہی ایک سرخ ریشمی ڈوری ہوا میں جھول رہی تھی جیکب نے اس کا خوبصورت پھندنا پکڑ کر اسے ہلکا سا جھٹکا دیا اور اندر کہیں ہلکی سی مترنم گھنٹی گونج اٹھی۔

چند سیکنڈ بعد ایک باوردی ملازم نے دروازہ کھولا اور تب میں نے دیکھا کہ ساگوان کے اس بھاری بھرکم دروازے کی موٹائی کسی قلعے کے دروازے سے کم نہ تھی۔ جیکب کو دیکھ کر ملازم نے جھک کر تعظیم دی اور ایک طرف ہٹ گیا۔

ہم جس کمرے میں داخل ہوئے وہ ایک طویل و عریض نشست گاہ تھی۔ فرش پر بچھے قالین میں پاؤں دھنسے جا رہے تھے۔ اور چھت میں آویزاں بھاری بھاری فانوسوں کی جگمگاہٹ سے آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ ہمارے عقب میں باوردی ملازم نے بھاری بھرکم

دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا اور وہ کلک کی مدھم سی آواز کے ساتھ بند ہو گیا۔ ملازم نے دروازے کے ہینڈل سے لمبی سی خوبصورت طلائی چابی نکال کر جیب میں ڈالی اور مڑ کر [illegible]" میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ مکتلا نے اب اپنا خنجر اپنے فل بوٹ میں بنی ہوئی کسی خفیہ نیام میں رکھ لیا تھا۔ جیکب اور دوسرے آدمی نے ریوالور جیب میں رکھ لئے تھے۔ شاید اس لئے کہ باہر جانے کا دروازہ مقفل ہو چکا تھا۔

جیکب نے باوردی ملازم کو کوئی اشارہ کیا اور وہ ایک دروازہ کھول کر کسی متصل کمرے میں چلا گیا۔ چند لمحے بعد اس دروازے کے عقب سے جو شخص نمودار ہوا' اسے دیکھ کر ایک لمحے کے لئے مجھے گمان گزرا کہ شاید وہ کسی سرکس کا مسخرہ ہے جو اس وقت سوٹ بوٹ پہن کر سامنے آ گیا ہے۔ اس کا قد بمشکل پانچ فٹ رہا ہو گا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ایمیزون کے جنگلات میں رہنے والے بعض قدیم قبائل اپنے دشمنوں کو ہلاک کرنے کے بعد ان کی کھوپڑیوں کو کسی کیمیائی عمل سے چھوٹا کر کے اپنی فتح کی نشانیوں کے طور پر محفوظ کر لیتے تھے۔

اس شخص کا چہرہ ایسی ہی کسی کھوپڑی کی زندہ مثال تھا۔ نہایت مختصر سا چہرہ اور سر پر چھوٹے چھوٹے بال جو گلہری کی دم کے بالوں کی طرح سیدھے کھڑے تھے۔ اس کی آنکھیں چہرے ہی کی مناسبت سے چھوٹی چھوٹی اور زرد تھیں لیکن ان میں ایک حیرت انگیز چمک تھی اور ان آنکھوں پر شاید پلکیں تھیں ہی نہیں' اس کے جسم پر سلک کا سیاہ سوٹ تھا جو کئی دن سے پہنا ہوا لگتا تھا یا پھر اس پر اچھی طرح استری نہیں کی گئی تھی' سفید قمیض کے چھوٹے چھوٹے کالر اوپر کو اٹھے ہوئے تھے اور ان کے درمیان ایک چوڑی سی ٹائی جھول رہی تھی۔ اس کا پتلا ہونٹ کسی اعصابی مریض کی طرح ایک لمحے کے بعد پھڑک اٹھتا تھا اور اس کی نہایت باریک تراشی ہوئی مونچھیں یوں دکھائی دیتی تھیں گویا کسی بچے نے ہلکی روشنائی سے ٹیڑھی میڑھی لکیر لگا دی ہو۔

اس شخص کو دیکھ کر مجھے اتنی حیرت نہیں ہوئی تھی جتنی یہ دیکھ کر ہوئی کہ مکتلا اور اس کے تینوں ساتھی اس کے احترام میں تقریباً رکوع کی سی حالت میں جھک گئے تھے۔ کئی لمحے بعد انہوں نے سر اٹھایا اور مجھ سے کافی پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔

"احسان مرزا تمہیں اپنے گھر میں خوش آمدید کہتا ہے نوجوان!" اس شخص کی آواز نے مجھے ایک لمحے کے لئے مزید حیران کر دیا کیونکہ اس کے مختصر وجود کی مناسبت سے مجھے توقع تھی کہ اس کے حلق سے نہایت باریک اور منمناتی ہوئی سی آواز برآمد ہو گی لیکن اس کے برعکس اس کی آواز نہایت پاٹ دار' گونجیلی تھی' چونکا دینے والی اور مرعوب کر دینے والی آواز ——

"شکریہ" میں نے خشک لہجے میں کہا "لیکن میں اس بلاوے کا مقصد جاننا چاہتا

ہوں۔"

"مقصد بھی معلوم ہو جائے گا۔" اس نے اپنی سیاہ چمک دار آنکھیں جھپکائے بغیر سر تا پا میرا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ میں ابھی تک اسی ڈھیلے ڈھالے سلیپنگ لباس میں تھا جو میں نے مقابلے کے وقت پہنا تھا۔ "بیٹھو تو سہی۔" اس نے وکٹورین اسٹائل کے ایک شاندار صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ پھر اپنے گرگوں سے مخاطب ہوا۔ "تم لوگ اب جاؤ۔"

وہ چاروں باہر جانے کے بجائے وہی دروازہ کھول کر اس کے عقب میں غائب ہو گئے جدھر سے احسان مرزا آیا تھا۔ احسان مرزا کے دوبارہ کہنے پر میں صوفے پر بیٹھ گیا بلکہ یوں کہیے کہ دھنس گیا اور وہ بھی محض "تحمل" نہیں جھیجھکا"...... احسان مرزا میرے مقابل بیٹھا تھا ہمارے درمیان شیشے کی ایک چوڑی تپائی تھی جس پر کرسٹل کی ایک چھوٹی سی ایش ٹرے رکھی تھی جس کے پیندے پر موٹے موٹے حروف میں "فرانس" لکھا تھا۔ فانوسوں کی جھلملاتی روشنی میں یہ ایش ٹرے ایک بڑے سے ہیرے کی طرح جگمگا رہی تھی۔

قریب ہی ایک منقش سگار بکس پڑا تھا۔ احسان مرزا نے اس بکس میں سے ایک موٹا سا سگار اور ننھی سی چمکیلی چھری نکالی۔ سگار کا ایک سرا تراشا اور اسے سلگا کر ایک کش لیتے ہوئے کہا۔

"بات یہ ہے مسٹر!" اس کا لہجہ ایسا ہی تھا جیسے وہ میرا بہت پرانا شناسا ہو۔ "کہ مجھے انمول چیزیں جمع کرنے کا بہت شوق ہے جن میں زندہ انمول چیزیں بھی شامل ہیں۔ میرا مطلب ہے انسان ......" وہ سگار کا ایک اور گہرا کش لے کر مسکرایا۔ میں ہونٹ بھینچے خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چھوٹے سے چہرے کے ساتھ بڑا سا سگار نہایت عجیب لگ رہا تھا۔

"بعض لوگ اپنے کمالات کی بنا پر انمول ہوتے ہیں۔" اس نے مزید کہا اور ناک سے یوں سوں سوں کی آواز نکالی گویا اسے پرانا زکام ہو۔ "اور تم بھی انہی میں سے ایک ہو۔ اس کشتی میں تمہارے جیسی شہ زوری میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ حالانکہ مجھے اکثر و بیشتر ایسی چیزیں دیکھنے کا اتفاق ہوتا رہتا ہے جنہیں عام لوگ کم ہی دیکھ پاتے ہیں ...... ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اپنے کمال فن کی بناء پر تم بھی ایک انمول انسان ہو اور میں اس دنیا میں انمول انسانوں کا سب سے بڑا قدر دان ہوں۔"

"میں کم عمر اور دنیاوی معاملات میں خاصا ناتجربہ کار ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن جہاں تک میرا خیال ہے ہر انسان انمول ہوتا ہے۔"

"ایسا نہیں ہے۔" اس نے ایک بار پھر ناک سے سوں کی آواز نکالی۔ "اس دنیا میں کثرت ایسے انسانوں کی ہے جن کا متبادل نہایت آسانی سے مل جاتا ہے۔ وہ مر جائے تو کوئی اس کی جگہ سنبھال لیتا ہے اور کہیں چلا جائے تو کوئی اور اس کا کام انجام دے سکتا ہے۔ انمول وہ ہوتا ہے جس کا ثانی یا تو موجود ہی نہ ہو اور اگر ہو تو بڑی مشکل سے ملے۔"

مجھے اس کی باتوں سے اکتاہٹ ہونے لگی تھی اور پھر اس کی سوں سوں بھی مجھے اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ "دلچسپ" اس نے کوٹ کی جیب سے ایک نہایت سستا سا رومال نکالا اور اس سے ناک رگڑنے لگا۔ کمرے میں چنبیلی کی بوجھل خوشبو پھیل گئی۔ غالباً رومال پر خاصی مقدار میں چنبیلی کا عطر لگا ہوا تھا۔ اب تک میں نے اس کمرے میں جو بھی چیز دیکھی تھی وہ نہایت اعلیٰ اور نفیس ذوق کی مظہر تھی لیکن مسٹر احسان مرزا کے لباس، رومال اور اس سے پھوٹتی ہوئی خوشبو کے بوجھل پن نے مجھے بڑا مایوس کیا تھا۔ چنبیلی کی خوشبو استعمال کرنے کا اگر کسی کو اتنا شوق ہی ہو تو اسے کم از کم اتنا تو معلوم ہونا ہی چاہیے کہ یہ خوشبو ہلکی بھی ہو تو اتنی ہی بھلی لگتی ہے۔ شاید احسان مرزا کے زکام کی وجہ بھی اس خوشبو کی کثرت تھی۔

"کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ دنیا کی صرف دو ہی چیزیں ایسی ہیں جن پر ابھی تک میرا اختیار نہیں۔" اس نے رومال کوٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"ایک تو میری بڑھتی ہوئی عمر اور دوسرے میرا کام۔ میری زندگی کے ستر برس سمندر میں گزرے ہیں لیکن اس دوران مجھے ایک مرتبہ بھی زکام نہیں ہوا۔ گیارہ سال کی عمر میں تین روپے مہینے پر ایک لانچ پر ملازم ہوا تھا اور اس کے بعد ستر سال تک میری زندگی کے شب و روز سمندر میں گزرے ۔۔۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو ۔۔۔ یہ بتاؤ کیا پیو گے؟ اس گھر میں دنیا کا تقریباً ہر مشروب مل سکتا ہے۔"

"میں یہاں مشروب پینے نہیں آیا۔" میں نے پہلے سے زیادہ اکھڑے اکھڑے لہجے میں کہا۔ "میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ مجھے یہاں کیوں بلایا گیا ہے اور جس انداز سے مجھے یہاں لایا گیا ہے اس میں تمہارے کسی آدمی کی جان بھی جا سکتی تھی۔ اگر میں نے ذرا چاہتا تو ۔۔۔"

"مجھے یقین ہے۔" اس نے تائید میں سر ہلایا۔ "لیکن اس میں میرے آدمیوں کا کوئی قصور نہیں۔ میں نے انہیں حکم دیا تھا کہ میں ہر حال میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"اب کسی جھگڑے اور قصے کے بغیر اگر اصل بات ہو جائے تو بہتر ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے کافی دیر پہلے گھر پہنچ جانا چاہیے تھا۔"

"صاف اور سیدھی بات یہ ہے کہ میں تم کو ایک پیش کش کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے اپنا چھوٹا سا سر صوفے کی پشت پر ٹکاتے ہوئے کہا۔ "تم ایک طرح سے ملازمت کر سکتے ہو لیکن تمہیں اتنی عزت اور اتنا پیسہ ملے گا جتنا ملازموں کو تو کیا اکثر مالکوں کو بھی نہیں ملتا ۔۔۔ بیس ہزار روپے ماہانہ۔"

بیس ہزار روپے فی زمانہ اتنی بڑی رقم تھی کہ یہ پیش کش سن کر ایک لمحے کے لئے مجھ جیسے بے نیاز انسان کا منہ بھی حیرت سے کھل سکتا تھا لیکن صورت یہ مجھے مذاق ہی لگا تھا۔ اس لئے میں نے فوری طور پر کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا بلکہ بات کی تہہ تک پہنچنے کے لئے پوچھا۔ "اور میرا کام کیا ہو گا؟"

"بیس ہزار روپے ماہانہ اتنی معقول رقم ہے کہ اس کے بعد کام کے سلسلے میں سوالات کی گنجائش نہیں رہنی چاہیے۔" اس نے پھڑپھڑاتے ہونٹوں سے سگار نکال کر کہا۔ "لیکن تمہاری تسلی کے لئے بتا دوں کہ کسی بھی کام کے لئے تمہاری ضرورت پڑ سکتی ہے تاہم تمہارا بنیادی کام میری حفاظت کرنا ہو گا۔"

"کیا ان بلند و بالا مضبوط دیواروں اور مسلح محافظوں کے درمیان رہ کر بھی تمہیں خوف اور جان کا خطرہ محسوس ہوتا ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"دیواریں جتنی بلند ہوتی جاتی ہیں، خوف و خطرات اتنے ہی بڑھتے جاتے ہیں۔ تم نے کبھی کسی جھونپڑی کے دروازے پر دربان نہیں دیکھے ہوں گے۔" اس نے اپنے ریشمی رومال سے اپنی پتلون پر سے کوئی غیر مرئی گرد جھاڑی۔ "جتنا بڑا انسان ہوتا

حفاظت کرتے ہیں۔ بڑے بڑے سرکاری افسر مجھے کسنے والے خطرات سے قبل از وقت آگاہ کرتے ہیں۔ اس شہر کے ہی نہیں اور بھی بڑے بڑے شہروں کے نامی گرامی بدمعاشوں اور خطرناک ترین گروہوں کا میرے ہاں سے وظیفہ بندھا ہوا ہے اور ضرورت پڑنے پر ان میں سے کوئی بھی میرے ایک اشارے پر دوڑا چلا آتا ہے۔ بڑے بڑے سیاست دان رات کے اندھیرے میں میری چوکھٹ پر پیشانی رگڑنے آتے ہیں ۔۔۔ اور اپنی لیڈری چمکانے کے لئے انہوں نے جو مہم شروع کر رکھی ہوتی ہے۔ ان کے سلسلے میں مجھ سے مدد مانگتے ہیں، ان گنت لوگ مجھ سے ڈرتے ہیں، میرا نام سن کر کانپتے ہیں ۔۔۔ پھر بھی مجھے نہ جانے کس بات کا خوف رہتا ہے۔ تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میں اندھیرے میں نہیں سو سکتا۔ تیز روشنی میں سوتا ہوں۔ کھانا کھانے لگتا ہوں تو پہلے ہر چیز کا ایک ایک نوالہ کسی خادمہ کو کھلا کر دیکھتا ہوں۔ مجھے اب بھی اپنی حفاظت کرنے والوں کی تعداد کم لگتی ہے۔ مجھے الگ قسم کی طاقتیں رکھنے والے جرات مندوں کی تلاش رہتی ہے۔ آج میں نے تمہارا مقابلہ دیکھا ۔۔۔ اور یہ اتفاق ہی تھا کہ میں اس مقابلے میں چلا گیا بہرحال وہاں تمہاری طاقت اور پھرتی کا مظاہرہ دیکھ کر مجھے ایک عجیب سی خوشی محسوس ہوئی اور تم پر نہ جانے کیوں مجھے پیار سا آ گیا جیسے تم میرے بچھڑے ہوئے بیٹے ہو حالانکہ میں نے کبھی شادی ہی نہیں کی اور مجھے اندیشہ ہے کہ اگر میں نے شادی کی تو میری اولاد بھی میری طرح مفقود الوجود اور مشکوک نہ ہو۔ مختصراً بات اتنی ہے کہ میں تمہیں اپنے خاص الخاص آدمیوں میں سرفہرست دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہاری تنخواہ اور مرتبہ میرے تمام آدمیوں سے بلند ہو گا۔ بولو کیا کہتے ہو؟"

اگر اس محل نما گھر کے بجائے وہ مجھے کہیں اور ملا ہوتا تو شاید اس کی باتیں مجھے دیوانے کی بڑ معلوم ہوتیں۔ اس کے لہجے کی صداقت سے زیادہ یہ ماحول کا اثر تھا کہ وہ مجھے سچا لگ رہا تھا لیکن میرے لئے ان باتوں میں کوئی خاص کشش نہ تھی۔ اگر میں عملی زندگی میں آ چکا ہوتا اپنی ضروریات کی ذمے داری مجھ پر ہوتی تو شاید یہ ترغیب اور روپے پیسے کی کشش میرے لئے کوئی اہمیت رکھتی۔

"مسٹر احسان مرزا۔" میں نے بے تکے انداز میں کہا۔ "بڑی عجیب سی بات ہے کہ ہمارے درمیان اتنی باتیں ہو چکی ہیں مگر مجھے ابھی تک صحیح طور پر یہ معلوم نہیں ہے کہ تم کون ہو اور کیا کرتے ہو؟"

"کیا ۔۔۔؟" وہ بندر کی طرح اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ "کیا تم احسان مرزا کو نہیں جانتے جسے پورا ہندوستان جانتا ہے؟ کونسے تہہ خانے میں زندگی گزاری ہے تم نے؟" وہ بے چینی سے ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ اس کے ہڈیالے ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پیوست تھیں۔

"دراصل مجھے کبھی غیر ضروری باتوں پر توجہ دینے کی مہلت نہیں مل سکی۔" میں نے سکون سے کہا۔ "اپنی پڑھائی اور چند ایک فنون کی تربیت حاصل کرنے کے علاوہ میرا دھیان کسی طرف نہیں رہا۔"

"ہوں!" اس نے میری طرف دیکھ کر گہری سانس لی اور دھم سے میرے مقابل دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا اور چند لمحے کی خاموشی کے بعد بولا۔ "ہاں تو پھر میری پیش کش کے سلسلے میں تمہارا کیا جواب ہے؟ یہ بھی یاد رکھنا کہ تنخواہ کے علاوہ دنیا کی ہر آسائش بھی تمہیں میرے ہاں میسر ہوگی۔"

"مجھے افسوس ہے کہ فی الحال میں یہ پیش کش قبول نہیں کر سکتا۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ "اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مجھے آگے پڑھنا ہے۔ دوسرے میرا خیال ہے کہ میری ماں بھی مجھے اس عجیب و غریب قسم کی نوکری کی اجازت نہیں دیں گی۔ ان کا حکم ہے کہ فی الحال میں اپنی پڑھائی اور جسمانی تربیت میں کمال حاصل کرنے کے علاوہ کسی چیز کے بارے میں نہ سوچوں۔"

"ماں کا حکم مانتے ہو ماں کا؟" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "میرا اندازہ ہے کہ ماں کا حکم ماننے میں بھی ایک عجیب سی مسرت پنہاں ہوتی ہوگی کیونکہ میں اس مسرت سے ناآشنا ہوں کیونکہ میری ماں دسمبر کی ایک یخ بستہ رات کو بمبئی کے فٹ پاتھ پر مجھے جنم دیتے ہوئے مر گئی تھی۔" تھوڑے توقف کے بعد اس نے چونک کر پوچھا۔ "کس قسم کی ہے تمہاری ماں؟ کیسی طبیعت پائی ہے اس نے؟"

"فرشتوں جیسی۔" میں نے جواب دیا۔

"پھر اس سے اجازت مت مانگنا کیونکہ فرشتے احسان مرزا کو کچھ زیادہ پسند نہیں کرتے۔ سوائے موت کے فرشتے کے۔" اس نے رومال سے ناک رگڑی اور ایک لمحے کے توقف کے بعد بولا۔ "اس بات کو یہیں ختم سمجھو اور کسی سے اس بات کا تذکرہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ جب تم خود مختار ہو جاؤ اور میں اس وقت زندہ رہوں تو ایک بار مجھ سے ضرور ملنا یا اس سے پہلے بھی تمہیں میری ضرورت پڑے تو مجھے ضرور یاد کر لینا۔ میرے گھر کے دروازے تمہارے لئے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔"

وہ گویا بات ختم کر کے اٹھ کھڑا ہوا ــــ میں بھی اس کے ساتھ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ اس لمحے وہی باوردی ملازم کمرے میں آ گیا ہم سے پہلے آگے بڑھ کر اس نے نقرئی کلی سے دروازے کا پٹ کھولا اور ایک پٹ وا کر کے مؤدبانہ انداز میں ایک طرف کو ہٹ گیا۔ دروازے پر پہنچ کر احسان مرزا نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ میری چوڑی ہتھیلی اور مضبوط انگلیوں کے درمیان اس کا ہاتھ کسی معصوم سی چڑیا کی طرح نرم و نازک ہرگز نہیں تھا۔ وہ لکڑی کا کوئی تراشیدہ ٹکڑا معلوم ہوتا تھا۔

میں برآمدے میں نکل آیا اور اس پراسرار کائنات کا دروازہ میرے عقب میں کلک کی ہلکی سی آواز کے ساتھ بند ہو گیا۔ پورچ میں آ کر میں اپنی کار کی طرف جا رہا تھا تو میں نے سیڑھیوں کے بائیں طرف المونیم کے رنگ کی ایک رولز رائس کھڑی دیکھی۔ انڈیا میں رولز رائس آج بھی شاید چند ہی لوگوں کے پاس ہے۔ اس وقت تو وہ شاذ و نادر ہی نظر آتی تھی۔ رولز رائس کی ساخت بھی عام گاڑیوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوتی تھی لیکن اس کا ماتھا کچھ بڑا ہوتا تھا اور نہ جانے کیوں وہ سب سے الگ تھلگ سی نظر آتی تھی۔

اسے دیکھ کر ایک عجیب سے دبدبے کا احساس ہوتا تھا۔ میں نے شہر میں ایسی دو تین گاڑیاں دیکھی تھیں۔ مجھے اور کسی بھی چیز کا کوئی خاص شوق نہیں رہا تھا لیکن نجانے کیوں رولز رائس دیکھ کر میں مبہوت ہو جاتا اور اکثر سوچا کرتا تھا کہ جب بھی میرے پاس پیسہ آیا سب سے پہلے ایک رولز رائس خریدوں گا۔ اس وقت مدھم روشنی میں جھلملاتی اس گاڑی کو دیکھ کر ایک لمحے کے لئے میرا دل چاہا کہ دوبارہ اندر جاؤں اور احسان مرزا سے پوچھوں کہ بے شک مجھے اس کی مستقل ملازمت والی پیش کش قبول نہیں لیکن کیا وہ کسی چھوٹے موٹے کام کے عوض ایک عدد رولز رائس میری خدمت میں پیش نہیں کر سکتا؟ اپنے اس خیال پر میں خود ہی ہولے سے ہنس دیا اور اپنی مورس کی طرف بڑھ گیا۔

ابھی میں نے انجن اسٹارٹ نہیں کیا تھا کہ پچھلی سیٹ سے ایک میٹھی سی آواز سنائی دی۔ "ٹھہر جاؤ۔ جان من! ایسی بھی کیا جلدی ہے؟"

میں چونک کر مڑا تو پچھلی سیٹ پر شگفتہ ایک ہاتھ سر کے نیچے اور جسم پر ٹانگ رکھے لیٹی نظر آئی۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور وہ پھرتی سے اٹھ بیٹھی۔ میرے کندھے کے قریب سیٹ کے پیچھے پر دونوں بازو رکھ کر اور ان پر ٹھوڑی ٹکا کر اس نے سرگوشی سی کی۔ "کچھ بات بنی؟"

"کیسی بات ــــ؟" میں نے گردن ترچھی کر کے اسے گھورا۔

"اس نے تمہیں ملازمت کی پیش کش کی ہوگی۔ کتنی تنخواہ کی تھی اس نے؟ اور تم نے کیا جواب دیا؟" اس نے ایک ہی سانس میں کہا اب وہ انگریزی میں باتیں کر رہی تھی۔

"تیس ہزار روپیہ ماہانہ" میں نے بتایا۔ "اور میں نے انکار کر دیا۔"

"تیس ہزار روپیہ ماہانہ؟" اس کی گویا اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ گئی۔ "اتنی قیمت تو اس نے میری صلاحیتوں کی بھی نہیں لگائی تم نے انکار کیوں کر دیا؟"

"فی الحال مجھے ملازمت کی ضرورت نہیں۔" میں نے مختصراً کہا۔

"اوہ ــــ" اس نے سر اٹھا کر ایک گہری سانس لی اور اپنے تراشیدہ ریشمی بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ "یہ ضرورت اور عدم ضرورت بھی کیا چیز ہے۔ ضرورت بعض اوقات

انسان کو وہ وقت کی روٹی کے عوض بکنے پر مجبور کر دیتی ہے اور عدم ضرورت کبھی کبھی ایک ہزار روپے ماہانہ کو بھی خاطر میں نہیں لاتی ——— خیر یہ بتاؤ کہ اس نے تمہارا انکار صبر و سکون سے سن لیا اور تمہیں یوں آسانی سے جانے دیا؟"

"تو اور وہ کیا کر سکتا تھا؟" میں نے پہلو بدل کر اسے گھورا۔

"اوہ ابھی تم اتنے کم سن اور کم علم ہو کہ تمہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ احسان مرزا کسی کے منہ سے انکار سننے کے بعد کیا کر سکتا ہے۔"

اس نے شاطرانہ شرارت سے میرے رخسار پر انگلی پھیری اور میں نے چہرہ پیچھے ہٹا لیا۔ میرے کانوں کی لویں گرم سی ہو گئیں ——— مجھے بدکتے دیکھ کر وہ ملی جلی آواز میں ہنس پڑی' پھر تیکھی ہوتے ہوئے ایک گہری سانس لی اور بولی۔ "ویسے آ ہی جاتے تو اچھا تھا کم از کم یہاں ایک تر و تازہ چہرہ تو دیکھنے کو ملتا۔ میں تو وہی پرانے' بے ڈھنگم اور سڑے بسے چہرے دیکھ کر بیزار ہو چکی ہوں اور ان میں سب سے ناقابل برداشت چہرہ احسان مرزا کا ہے۔"

"پھر تم چلی کیوں نہیں جاتیں؟" میں نے سادگی سے کہا ——— لیکن اس سادگی میں خاصی حد تک ہمدردی کو دخل تھا۔

"ہائے بھولے بادشاہ!" اس نے سر کو خفیف سا جھٹکا دیا۔ "اچھا ہی ہوا تم نے ان بھول بھلیوں میں قدم نہیں رکھا۔ تم تو بہت ہی معصوم ہو۔"

"مجھے بتاؤ تو سہی آخر یہ چکر کیا ہے؟ احسان مرزا کون ہے اور کیا کرتا ہے' تم کس طرح یہاں آئی تھیں اور اتنی بیزاری کے باوجود یہاں سے کیوں نہیں جاتیں؟" میں نے تجسس سے پوچھا لیکن اس نے میرے تجسس کو ہلکی سی ہنسی میں اڑا دیا۔

"یہ بڑی لمبی کہانی ہے پیارے شہزادے! وقت تمہیں رفتہ رفتہ خود ہی ساری کہانیاں سنا دے گا' ساری گتھیاں کھول دے گا۔ دھیرے دھیرے اپنے سب عقدے خود بخود تمہاری سمجھ میں آنے لگیں گے۔" اس نے میرے رخسار پر تھپکی دی۔ "اب تم جاؤ اس سے پہلے کہ گھر کا راستہ بھول جاؤ' خدا حافظ۔" اس نے با آواز طریقے سے کار کا دروازہ کھولا اور کھلا پیچھے کھسک گئی۔

میں نے اسے پورچ کے دوسرے سرے کی طرف جاتے دیکھا پھر یک بیک وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گئی۔ گاڑی میں ابھی تک اس کے وجود کی مدھم سی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ایک لمحے کے لئے میں ونڈ اسکرین پر نظریں جمائے ساکت بیٹھا رہا۔ پھر میں نے چونک کر ہلکی سی جھرجھری لی اور ہر طرح کے خیال کو ذہن سے جھٹک کر گاڑی اسٹارٹ کر کے گیٹ کی طرف نکال دی۔

میں رات تک بچتے بچتے میں فیصلہ کر چکا تھا کہ احسان مرزا سے میری ملاقات، پہلی

ایک بے معنی خواب تھی اور مجھے کسی سے تذکرہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ میری طبیعت بھی کچھ اس قسم کی تھی۔ جب میں کسی بات کو ذہن سے جھٹک دینے اور فراموش کر دینے کا فیصلہ کر لیتا تھا تو پھر وہ واقعی میری سوچوں کی کائنات سے نکل جاتی تھی ——— مجھے پریشان نہیں کرتی تھی۔

میں نے ممی سے بھی اس واقعہ کا تذکرہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ میرا میٹرک کا رزلٹ آیا تو میں نے کالج میں داخلہ لے لیا۔ ممی نے میرے لئے والڈیا کالج کا انتخاب کیا تھا ——— انہی دنوں تقسیم ہند کا اعلان ہو گیا اور ہندوستان کے بیشتر علاقوں میں مسلم کش فسادات کا ایک لرزہ خیز سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہمارا علاقہ فسادات سے تقریباً محفوظ ہی رہا۔ لیکن ہجرت کر کے جانے والوں کے قتل عام اور بربادی کی خبریں سن سن کر دل خون کے آنسو روتا تھا۔ قیام پاکستان کے اعلان سے ایک روز قبل ممی سے میری ملاقات ہوئی اور میں نے ان سے پوچھا تھا کہ ہمیں یہیں رہنا ہو گا یا پاکستان جانا ہو گا۔

"ہمارا یہیں رہنا ضروری ہے بیٹا!" انہوں نے جواب دیا تھا۔

"یہاں ہمارے بہت سے ضروری کام باقی ہیں جنہیں نمٹائے بغیر ہم نہیں جا سکتے' ہمیں چار پانچ سال اور لگیں گے اس وقت تک تم بی اے بھی کر لو گے۔ تمہاری گریجویشن تک میں کوئی قدم اٹھانا نہیں چاہتی۔ اس وقت تک تم اطمینان اور سکون سے سر جھکائے وقت گزارو اور کسی سے بھی الجھنے سے گریز کرو۔ گریجویشن کے بعد تمہیں مزید تعلیم حاصل کرنی ہے۔ لیکن اس وقت تک میرے تفکرات کچھ کم ہو چکے ہوں گے ——— اور تم بتدریج وہ اہم کام شروع کر دو گے جو میں تمہیں بتاؤں گی لیکن سر دست میں نہیں چاہتی کہ جو پروگرام میں نے ذہن میں مرتب کر رکھا ہے اس میں کوئی خلل پڑے۔"

"جیسے آپ کا حکم۔" میں نے کہا۔

تقسیم ہند کے بعد تقریباً چھ سات ماہ تک صحیح معنوں میں زندگی معمول پر نہیں آئی۔ کالج تو تقریباً ایک ماہ بعد ہی کھل گئے تھے لیکن ماحول میں بڑی تبدیلی آ چکی تھی۔ تغیرات نے برسوں کا فاصلہ دنوں میں طے کر لیا تھا۔ والڈیا کالج میں بیشتر طلباء و طالبات اور اساتذہ سلجھے ہوئے انسان تھے لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہو چکی تھی۔ بہرحال وقت قدرے ہمواری میں گزر رہا تھا۔

فورتھ ایئر میں آنے تک میری زندگی میں کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا۔ کالج کے چھوٹے موٹے ہنگامے' تقریبات اور میرے ذاتی معمولات کے تحت زندگی گزر رہی تھی۔ کالج کی ہر ایک تقریبات میں میرے بے حد اصرار پر ممی نے بھی شرکت کی تھی اور میرے کلاس فیلو لڑکے اور لڑکیاں ان سے مل کر بے حد متاثر ہوئے تھے۔ لڑکیاں تو مجھ سے بھی کئی متاثر ہوئی تھیں اور کئی ہاتھ میری طرف بڑھے بھی تھے۔ لیکن نہ جانے کیا بات تھی

کہ کوئی نظروں میں جچا ہی نہیں تھا۔

کوئی لڑکی مجھے بے وقت بے ہنگم اور نا سمجھ سی بچی لگتی تھی اور کوئی بے مقصد بینٹنگ پر لگی ہوئی شکارن لگتی تھی' کوئی محض انسانوں ذہن کی متلاشی لگتی تھی۔ کوئی ڈال ڈال پر اڑنے والی تتلی لگتی تھی اور کوئی اپنی ہی ذات کے خول میں بند سی ہوئی ہوئی ...... کسی کی صورت ذہن کو نہیں بھاتی تھی اور کسی کی عادت' میں کوشش بھی کرتا تو کسی سے محض دل نہ پاتا۔ چند دن کسی سے گفتگو رہتی اور پھر یک لخت وہ دل سے اتر جاتی۔ کبھی کبھی مجھے خود پر غصہ آتا کہ میں بھی دوسروں کی طرح تعلیم کے ساتھ ساتھ ماحول کی دلکشی سے مستفید کیوں نہیں ہوتا۔

میرے خیالات کی اپنی ہی ایک الگ دنیا تھی جس میں ایک بے عنوان سا سناٹا چھایا تھا۔ کبھی کبھی سوچوں کی پگڈنڈی پر دھندلا سا ہیولا لہراتا اور کوئی ان دیکھی سی پائل چھنکا کر غائب ہو جاتا۔ کبھی اس کی بانہوں کی چاندنی' کبھی اس کے بالوں کے سائے' کبھی اس کی آنکھوں کی جھلملاہٹ' کبھی اس کے رخساروں کی تپش' کبھی اس کے سانسوں کی خوشبو اور کبھی اس کے لہجے کی کھنک میرے حواس پر دستک سی دیتی تھی۔ لیکن اس کی صورت کبھی مکمل نہ ہونے پاتی۔ نہ جانے وہ کون تھی' کیسی تھی' کہاں تھی لیکن مجھے اتنا احساس تھا کہ کوئی ایسی ہستی ہے ضرور جس کا مجھے انتظار ہے اور کبھی نہ کبھی آئے گی۔

اسی روز میں نے کلاس روم میں تیکھی والی سامنے پر ایک اسٹیک پر ایک نئے چہرے کا اضافہ دیکھا اور میرے ذہن میں چھناکا سا ہوا۔ کلاس ابھی شروع ہوئی تھی اور انگلش کے پروفیسر منوہر لال کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے انہوں نے مسکرا کر نوارد لڑکی کی طرف دیکھا اور مسکرائے۔ گویا اسے پہلے سے جانتے ہوں۔

"ویر از اے بلو کرت۔" انہوں نے لیکچر شروع کرنے کے بجائے کہا۔ "مس ماہتاب"۔ انہوں نے اپنے اسخوانی ہاتھ سے نوارد لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ "رسم کے مطابق مس ماہتاب روسٹرم پر آ کر اپنا تعارف خود کرائیں گی۔"

لڑکے لڑکیوں نے تالیاں بجا دیں' جب وہ پر سکون انداز میں اپنی اسٹیک سے اٹھی اور روسٹرم کی طرف بڑھی تو گویا سب کے دلوں کی دھڑکنیں رک گئیں ...... اس کا قد کم از کم پانچ فٹ دس انچ تھا اور اس کی چال میں ایک ایسا الوکھا پن تھا گویا وہ کسی جھیل میں کھلے ہوئے کنول کے پھولوں پر قدم رکھتی آگے بڑھ رہی ہو اور اس کا وزن کسی کے ایک پھول سے بھی کم ہو۔

اس نے یونیفارم پر ایک لمبا سا ریشمی گاؤن پہن رکھا تھا اور بالوں پر نیلا اسکارف باندھ رکھا تھا۔ تاہم اس کے لمبے سنہری بال اسکارف کے نیچے تک جھول رہے تھے اور اس کی ہر تجلی قدم کے ساتھ یوں ہلکورے لے رہے تھے گویا پگھلے ہوئے سونے کے کسی

آبشار میں ہوا کی لہروں سے لہریے پڑ رہے ہوں۔

روسٹرم پر پہنچ کر جب اس نے کلاس کی طرف رخ کیا تو میں نے صحیح طور پر اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ واقعی ماہتاب تھی۔ اس کی غزالی آنکھوں میں مصری عورتوں کی طرح قدرتی طور پر کاجل لگا ہوا تھا۔ عام طور پر اسپانوی لڑکیوں میں سے جن کے بال سنہری ہوں' ان کی آنکھیں نیلی یا بھوری ہوتی ہیں مگر اس کی آنکھیں گہری سیاہ تھیں اور یہ ایک عجیب امتزاج تھا ...... اس کی پیشانی محرابی' ناک ستواں اور ہونٹ ایسے ہی تھے جیسے اوس میں بھیگی گلاب کی کسی کلی نے صبح دم سورج کی پہلی کرن کے ساتھ کھلنا شروع کیا ہو۔"

وہ ذرا بھی نروس نہیں تھی۔ اس نے پوری کلاس پر طائرانہ نظر دوڑائی۔ کہنیاں روسٹرم پر ٹکائیں اور مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کے ہونٹوں نے جنبش کی۔ "نام تو میرا آپ کو معلوم ہو ہی گیا ہے۔" میرے خوابوں کے ویران معبدوں میں گھنٹیاں سی بج اٹھیں۔ اس کے لہجے کی کھنک تو میرے لئے مانوس تھی۔ "میری عمر اکیس سال ہے۔ میں کانپور میں پڑھتی تھی لیکن حال ہی میں ڈیڈی کی یہاں منتقل ہو گئی ہے اس لئے میں نے اس کالج میں داخلہ لے لیا ہے اور تو مجھے کچھ کہنے میں نہیں آتا کہ آپ لوگوں کو اپنے متعلق کیا بتاؤں ...... آپ پوچھنا چاہیں تو پوچھ لیجئے۔" وہ ایک بار پھر مسکرائی اور کلاس روم میں اجالا سا پھیل گیا۔

"مس ماہتاب! آپ کا اتنا مناسب نام کس نے رکھا تھا؟" من موہن نے پوچھا۔ یہ ایک صحت مند اور خوش شکل لڑکا تھا۔

"میرے والد نے" وہ ایک جوہری ہیں اور انہیں ہیروں کی بڑی پرکھ ہے ......"

ایک اجتماعی قہقہہ گونجا جس میں میرے علاوہ سب کی آواز شامل تھی۔

"ماہتاب جی! آپ نے یہ لمبا سا گاؤن کیوں پہن رکھا ہے؟"

یہ سوال پدما نے کیا تھا جو ایک بنگالی بخند موسیقار کی بیٹی تھی وہ طالبہ کم ایکٹریس زیادہ لگتی تھی۔

"بعض انسانوں کی آنکھوں میں بھیڑیئے چھپے ہوتے ہیں ان سے بچنے کے لئے۔" ماہتاب نے جواب دیا۔ اس کے ہونٹوں پر اب بھی مسکراہٹ تھی۔

"آپ کا قد کتنا ہے؟" یہ سوال رتیش نے کھڑے ہو کر کیا تھا جو اتنا پست قد تھا کہ کھڑا ہو کر بھی لگتا تھا کہ کوئی بیٹھا ہوا ہے۔

"آپ کے قد سے دوگنا ...... پانچ فٹ دس انچ۔"

ماہتاب نے جواب دیا ...... اور کلاس میں ایک بار پھر قہقہہ گونج اٹھا ...... رتیش خود بھی اس قہقہے میں شریک تھا۔

"آپ پڑھ کر کیا بنیں گی؟" یہ سوال جوار نے کیا تھا جو بڑا ترقی پسند بنا تھا ......

اور حال ہی میں اس نے نہ صرف کھدر کے کپڑے پہننے شروع کر دیئے تھے بلکہ عینک بھی
لگانے لگا تھا حالانکہ اس کی نظر کمزور نہیں تھی۔
"اس کا زیادہ انحصار اس بات پر ہے کہ میرے ڈیڈی میرے لئے کتنی بڑی سفارش
اچھوڑ کر لا سکیں گے۔" ماہتاب نے بلا تامل جواب دیا۔ سب لوگ ہنسنے لگے ۔۔۔ لیکن
جرار بڑی سنجیدگی سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "واہ واہ مس ماہتاب! معاشرے پر کیا خوب طنز
فرمایا ہے آپ نے ۔۔۔ آپ کے اس برجستہ جواب سے معاشرے کے استحصالی طبقوں
۔۔۔"
ممکن تھا کہ وہ باقاعدہ تقریر شروع کر دیتا مگر اوشا نے اس کی بات کاٹ دی۔ اس
نے اٹھ کے ماہتاب سے سوال کیا ۔۔۔ "آپ کے مشاغل کیا ہیں؟"
"مشغلے تو کوئی خاص نہیں ہیں۔ کافی عرصہ پہلے جب ہم کانپور میں رہتے تھے تو
کبھی کبھار میں اپنے والد اور چچا کے ساتھ شکار پر جایا کرتی تھی۔" اس بار ماہتاب نے
قدرے سنجیدگی سے جواب دیا۔
"آپ نے کبھی کچھ مارا بھی؟" اوشا نے فوراً پوچھا۔
"جی ہاں ۔۔۔ ایک دفعہ ایک جنگلی خرگوش مارا تھا لیکن خدا اس میں میرا کوئی قصور
نہیں ۔۔۔ وہ خود ہی میری بندوق کے سامنے آ گیا تھا۔" ماہتاب نے سنجیدگی سے کہا اور
کمرہ ایک بار پھر کشت زعفران بن گیا۔
ماہتاب سے ہر لڑکے اور لڑکی نے کوئی نہ کوئی سوال کیا ۔۔۔۔ سوائے میرے میں سب سے
پیچھے ایک ڈیسک پر خاموش اور ساکت بیٹھا تھا ۔۔۔ جب سب خاموش ہو گئے تو سب کے
چہروں سے ہوتی ہوئی ماہتاب کی نگاہ مجھ پر ایک لمحے کے لئے رک گئی اور وہ لمحہ گویا صدیوں
پر محیط ہو گیا۔ شاید وہ منتظر تھی کہ میں بھی کچھ پوچھوں لیکن میں بدستور بے حس و حرکت
بیٹھا رہا۔ میری آنکھیں تک ساکت تھیں پھر نگاہوں کا یہ ربط ٹوٹ گیا پروفیسر منوہر لال
نے سوال و جواب کا سلسلہ ختم کیا اور ماہتاب کے بیٹھ جانے کے بعد لیکچر شروع کر دیا اور
کلاس کی سنجیدگی ایک بار پھر لوٹ آئی۔
انٹرول کے دوران میں اسمبلی ہال کے نزدیک سے گزرا تو میں نے راہداری میں
ماہتاب کو کھڑے دیکھا۔ مدن موہن اور اس کے دو ساتھی لڑکوں نے اسے گھیر رکھا تھا
اور وہ ہنس ہنس کر ان سے باتیں کر رہی تھی۔ میں قریب سے گزرا تو ماہتاب نے میری
طرف دیکھا۔ ایک بار پھر ایک لمحے کے لئے ہماری نظریں ملیں ۔۔۔ میرا جی چاہا کہ رک
جاؤں اور ان کی گفتگو میں شریک ہو جاؤں لیکن نہ جانے کیوں نہیں رک سکا اور کینٹین
کی طرف چلا گیا۔
میں نے محسوس کیا کہ ماہتاب کا مدن موہن اور اس کے ساتھیوں کے درمیان

کھڑے ہونا اور ہنس ہنس کر باتیں کرنا مجھے اچھا نہیں لگا اور اس احساس سے مجھے اپنے
آپ پر خفیف سی حیرت بھی ہوئی ۔۔۔۔ لڑکیوں سے جلد بے تکلف ہونے میں مدن موہن
پہلے بھی مشہور تھا۔ وہ امارت تھا، خوش شکل تھا، بہت امیر باپ کا بیٹا تھا، کالج کی سرگرمیوں
میں پیش پیش رہتا تھا۔ لچھے دار گفتگو کرنے میں ماہر تھا۔ ہماری کلاس میں کئی مذاہب کی
لڑکیاں تھیں اور تقریباً سب ہی سے اس کی کسی نہ کسی حد تک شناسائی تھی ۔۔۔۔ لیکن
اس سے پہلے وہ کبھی مجھے برا نہیں لگا تھا۔ میری نظروں میں نہیں کھٹکا تھا بلکہ میں نے کبھی
اس کے وجود پر غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔
دوسرے تمام لڑکوں کی طرح وہ بھی میرے لئے قطعی غیر اہم رہا تھا لیکن نہ جانے کیوں
اچانک وہ کسی عفریت کی طرح چھلانگ لگا کر میرے خیالوں کی دنیا کو اتھل پتھل کرنے آ گیا
تھا۔
ماہتاب! میں نے لیمونیڈ کا گلاس انگلیوں میں گھماتے ہوئے ذہن ہی ذہن میں یہ نام
دہرایا اور غزالی آنکھیں میرے چشم تصور کے سامنے ساکت ہو گئیں ۔۔۔ پھر ان آنکھوں
کے گرد زلف اور لب و رخسار کا حلقہ مکمل ہوا اور یک لخت میرا دل کنپٹیوں میں آ کر
دھڑکنے لگ گیا تو وہ چہرہ تھا جو بار بار میرے خیالوں کی نیم اندھیری دنیا میں مجھے اپنی جھلک
دکھا کر غائب ہو چکا تھا۔ شفاف پانی کی لہروں میں بکھرے ہوئے عکس کی طرح میں کبھی
اسے واضح طور پر نہیں دیکھ سکا تھا لیکن وہ اپنے اچٹتے سے خدوخال میرے ذہن کے نہاں
خانوں میں چھوڑ گیا تھا۔
یک لخت گلاس پر میری گرفت اتنی سخت ہو گئی کہ اگر میں بیرے کی آواز پر بروقت
نہ چونکتا تو شاید وہ میرے ہاتھوں میں کرچی کرچی ہو جاتا۔ میں اسی لئے مجھے احساس ہوا کہ
میں چشم تصور سے جن غزالی آنکھوں کو اپنے سامنے ساکت دیکھ رہا تھا وہ حقیقتاً مجھ سے
کچھ فاصلے پر موجود تھیں۔ ماہتاب نہ جانے کب کینٹین میں آ گئی تھی۔ مدن موہن اور
اس کے دو ساتھی اب بھی اس کے ساتھ چپکے ہوئے تھے البتہ اب ان کی ٹولی میں اوشا کا
اضافہ ہو چکا تھا۔
ماہتاب کا رخ براہ راست میری طرف تھا۔ پہلے کی طرح ایک بار پھر ہماری نگاہیں
ملیں اور ایک لمحے کے لئے ساکت ہو گئیں لیکن دوسرے ہی لمحے نظروں کی یہ زنجیر ٹوٹ
گئی۔ نہ جانے ہمارے درمیان کونسی دیوار حائل تھی جو مجھے اس کے قریب جانے سے
روک رہی تھی۔ شاید یہ انا کی دیوار تھی۔ گو کہ اس سے پہلے میں بھی کسی سے زیادہ گھلتا
ملتا نہیں تھا لیکن مجھ میں اس حد تک خود اعتمادی ضرور تھی کہ اگر میں ملنے کا ارادہ کر لیتا تو
مجھے کوئی طاقت نہیں روک سکتی تھی اور ماہتاب سے بات کرنے میں تو حقیقتاً کوئی رکاوٹ
بھی نہیں تھی۔ وہ کلاس فیلو تھی ۔۔۔ نئی نئی آئی تھی ۔۔۔ ہمارے کالج میں بیشتر لڑکے

لڑکیاں آسودہ حال اور آزاد گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ کوئی بھی مسئلہ نہیں تھا' میں چاہتا تو اٹھ کر سیدھا اس کی میز پر جاتا اور ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے کہتا "مس ماہتاب میرا نام منصور مغل ہے اور میں اپنی کلاس میں آپ کو خوش آمدید کہتے ہوئے آپ کے اعزاز میں یہاں بیٹھے ہوئے تمام ساتھیوں سمیت آپ کو اپنی مرضی کی چیزیں منگوانے کی دعوت دیتا ہوں۔" پھر اس کی طرف جھک کر پوچھتا "فرمایئے! آپ کیا کھانا پسند کریں گی؟ یہ دعوت آپ کے اعزاز میں ہے۔"

لیکن مجھے حیرت تھی کہ میں اپنے اندر ان باتوں کی ہمت نہیں پا رہا تھا۔ میں اپنی جگہ خاموشی سے بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا اور جو کچھ میں سوچ رہا تھا' اس پر عمل شاید ملک موہن کر رہا تھا ـــــ ان کی میز پر بہت سی چیزیں لگی ہوئی تھیں ـــــ لیکن ماہتاب بہت تکلف سے ایک آدھ چیز کو ہی ہاتھ لگا رہی تھی اور چائے کی چسکیاں لے رہی تھی۔

میرا جی چاہا کہ اسے بازو سے پکڑ کر اٹھاؤں اور اپنے مقابل بٹھا کر کہوں۔ "تمہاری جگہ یہ ہے ـــــ وہ میں ہوں جس نے برسوں تمہارا انتظار کیا ہے اور تم ان عام اور گھٹیا لڑکوں میں گھری بیٹھی ہو۔" لیکن میں یہ بھی نہ کر سکا۔ بس میں تھا اور میرا سکوت ـــــ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہمارے درمیان انا کی یہ دیوار کیسے گرے گی۔

چھٹی کے وقت کلاس روم سے نکل کر اس میدان کی طرف جا رہا تھا جہاں کالج والے طلباء اپنی کاریں کھڑی کیا کرتے تھے میں نے دیکھا کہ ماہتاب گیٹ کی طرف جا رہی تھی ـــــ ہم متوازی چل رہے تھے مگر ہمارے درمیان چند گز کا ناقابل عبور فاصلہ تھا۔ پھر میں نے لڑکوں کی ایک ٹولی سے ملک موہن کو علیحدہ ہو کر اس کی طرف لپکتے دیکھا تھا۔

"آیئے میں آپ کو ڈراپ کر دوں گا۔" لڑکے لڑکیوں کی باتوں کی بھنبھناہٹ کے درمیان میں نے ملک موہن کی مدھم سی آواز سنی۔

"شکریہ!" ماہتاب کی آواز اس کی نسبت صاف اور واضح تھی۔ "ہماری گاڑی گیٹ پر آئی ہوئی ہو گی۔"

ملک نے پیچھے سے نیچی آواز میں کچھ کہا ـــــ ماہتاب نے نفی میں سر ہلایا اور ملک تھوڑی مایوسی سے ہاتھ ہلا کر واپس مڑ گیا۔ برآمدے کے آخری ستون کے پاس پہنچ کر ہماری سمتیں علیحدہ ہو گئیں۔ وہ گیٹ کی طرف چل دی اور میں میدان کی طرف۔ مڑنے سے پہلے اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا ـــــ اس کی گہری آنکھیں بے تاثر تھیں مگر میرے لئے یہی اہم تھا کہ اس نے مڑ کر دیکھا تھا۔

میں جب گاڑی نکال کر گیٹ کی طرف آیا تو میں نے دیکھا کہ ماہتاب ایک لمبی سی سیاہ فورڈ میں بیٹھ رہی تھی۔ ایک باوردی ڈرائیور اس کے لئے دروازہ کھولے کھڑا تھا ان کے قریب سے گزرتے وقت ایک لمحے کے لئے میں نے بریک لگایا۔ پھر تیزی سے آگے بڑھ

گیا۔

اس شام جسمانی مشقیں کرتے وقت میرے اعصاب پر ایک عجیب سا تناؤ طاری رہا ـــــ پھر یہ تناؤ دن بدن بڑھتا گیا۔ میں کالج میں ماہتاب کو دیکھتا' ہماری نظریں ملتیں اور میرے وائلن کے نغموں کی طرح تنے ہوئے اعصاب میں جھنجھناہٹ سی ہوتی اور معدوم ہو جاتی۔ عجیب بات تھی کہ کلاس میں میری سب سے کسی نہ کسی حد تک بات چیت ہوتی تھی سوائے ماہتاب اور ملک کے۔

چند دن بعد موسم بہار کے آغاز پر کالج میں سالانہ تقریبات کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ڈرامیٹک سوسائٹی کے انچارج پروفیسر گرو شنکر نے ایک روز مجھے اسٹاف روم میں بلا کر بتایا کہ وہ "قلوپطرہ" کے نام سے ایک انگریزی ڈرامے کی تیاری کر رہے ہیں جس میں قلوپطرہ کا رول کرنے کے لئے ماہتاب نے ہامی بھر لی ہے۔

"اور جولیس سیزر کے کردار میں میری نظر میں شکل و وجاہت اور جسمانی لحاظ سے تم سے زیادہ موزوں لڑکا پورے کالج میں نہیں ہے۔" پروفیسر گرو شنکر نے کہا۔ "اس لئے میں نے اس کردار کے لئے تمہارا نام پیش کر دیا ہے کل تم آ کر مجھ سے اسکرپٹ لے لینا۔ پرسوں سے ریہرسل شروع ہو رہی ہے۔"

ماہتاب کے روبرو بیٹھ کر ریہرسل کرنے اور اسٹیج پر اس کے مقابل کام کرنے کے تصور سے میرا دل دھڑک اٹھا ایک لمحے کے لئے میں نہ جانے کون سے رو میں جا نکلا۔ مگر پھر فوراً ہی میں نے سنبھل کر کہا "سر! آپ جانتے ہیں میں اداکاری کے میدان کا آدمی نہیں ہوں۔ تیراکی' گھڑ سواری' نشانہ بازی اور کشتیوں وغیرہ کے مقابلوں میں چیلنج کے ساتھ شریک ہو سکتا ہوں ...... لیکن اداکاری میرے بس کا روگ نہیں ـــــ میں معذرت چاہوں گا۔"

"اس ڈرامے میں اداکاری کی ضرورت کسے پڑے گی برخوردار!" پروفیسر صاحب نے ملائمت سے کہا۔ "یہ ایک گلیمرس پلے ہو گا' ہم نے صرف کاسٹیوم اور حسن کی مدد سے ناظرین کو مسحور کرنا ہے ـــــ اور کچھ بھی نہیں۔"

"کچھ بھی ہو سر ـــــ بہروپ بدلنا میرے بس کا کام ہی نہیں۔" میں نے مدھم سی آواز میں کہا۔ "میری معذرت قبول فرمایئے۔"

پروفیسر گرو شنکر اپنے شاگردوں کے منہ سے کسی معاملے میں انکار سننا پسند نہیں کرتے تھے ـــــ ان کے چہرے پر ایک لمحے کے لئے میں نے کبیدگی کے آثار دیکھے جنہیں وہ فوراً ہی چھپا گئے ـــــ اور اخبار کی طرف متوجہ ہو کر سپاٹ لہجے میں بولے۔ "تمہاری مرضی' اور کئی لڑکے یہ رول کرنے کے لئے تیار ہیں۔" میں شکریہ کہہ کے باہر آ گیا۔

تیسرے دن مجھے معلوم ہوا کہ ماہتاب نے بھی قلو پطرہ کا رول کرنے سے انکار کر دیا ہے' یہ خبر سن کر ایک لمحے کے لئے مجھے ایک خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ کیا اس نے یہ سننے کے بعد انکار کیا ہے کہ میں اس ڈرامے میں شریک نہیں؟ یا پہلے اس نے یہ سن کر حامی بھری تھی کہ جولیس سیزر کا کردار میرے سپرد کیا جا رہا ہے؟ میں نے اپنے آپ سے پوچھا ...... پھر فوراً ہی میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ یہ قطعاً "ضروری نہیں" اور مجھے کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے۔

میرے اعصاب پر تناؤ اب بھی برقرار تھا اور یہ دیکھ کر اس تناؤ میں اور اضافہ ہو جاتا تھا کہ من موہن ماہتاب سے خاصا بے تکلف ہو چکا تھا۔ خالی پیریڈ میں وہ اکثر کالج کے لان یا کینٹین میں اکٹھے بیٹھے پائے جاتے۔ میں دور دور سے انہیں دیکھتا اور میرے اعصاب کا سلگتا ہوا فتیلہ کچھ اور مختصر ہو جاتا۔ آگ دن بدن بارود کے نزدیک پہنچ رہی تھی۔

پھر ایک روز سب کچھ میرے بس سے باہر ہو گیا۔ میں لائبریری میں بیٹھا تھا لمبی سی میز کے گرد ...... لڑکے لڑکیاں بیٹھے مطالعہ میں مصروف تھے۔ لائبریری ایک طویل ہال میں تھی۔ مطالعہ کی میز کے تین اطراف میں دیواروں کے ساتھ کتابوں سے بھری ہوئی شیشے کے دروازوں والی اونچی اونچی الماریاں رکھی تھیں۔ میز سے کافی دور' ہال کے ایک گوشے میں لکڑی کا ایک اونچا سا کٹہرا تھا جس میں ایک ڈائس کے پیچھے لائبریرین' مسز کوپر بیٹھی تھیں جو ایک ادھیڑ عمر پارسی خاتون تھیں ...... مطالعہ کی میز سے کٹہرے کی طرف دیکھنے پر بمشکل ان کا سر نظر آ رہا تھا۔ جو عموماً ساکت رہتا تھا کیونکہ اکثر و بیشتر وہ خود بھی مطالعہ میں مصروف رہتی تھیں۔

اخبار کو دیکھتے دیکھتے میں اچانک چونک پڑا ...... ایک مانوس سی خوشبو نے مجھے چونکایا تھا ...... میں نے غیر محسوس طور پر گردن اٹھا کر کٹہرے کی طرف دیکھا ...... ماہتاب ہال کی طرف پشت کئے ہوئے کٹہرے کے قریب کھڑی تھی۔ گویا میری حساس قوت شامہ نے مجھے دھوکہ نہیں دیا تھا۔ ماہتاب کی موجودگی کا احساس مجھے اس کی طرف دیکھے بغیر ہی ہو جاتا تھا اس کی خوشبو سے۔

غالباً وہ کوئی خوشبو نہیں لگاتی تھی بلکہ اس کے وجود سے ہی ایک انوکھی خوشبو پھوٹتی تھی جو شاید مجھے ہی محسوس ہوتی تھی بعض اوقات میں کسی جگہ پہنچتا تو اسی خوشبو کی وجہ سے مجھے معلوم ہو جاتا تھا کہ کچھ دیر پہلے تک ماہتاب وہاں موجود تھی یا وہاں سے گزری تھی۔

چند لمحے بعد میں نے مسز کوپر کو کٹہرے کا دروازہ کھول کر نکلتے دیکھا۔ انہوں نے ایک الماری کا تالا کھول کر انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کی ایک جلد نکال کر ماہتاب کو دی اور واپس کٹہرے میں چلی گئی۔ چوڑی جلد والی یہ ضخیم کتاب اٹھائے ماہتاب مطالعہ کی میز کے قریب آئی ...... میرے سامنے کرسی خالی تھی وہ اس پر آ بیٹھی۔ میں نے اخبار سے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا لیکن اس نے میری طرف نہیں دیکھا۔ کتاب کے اوراق الٹ پلٹ کے چند لمحے وہ کچھ دیکھتی رہی پھر اس نے اپنی کالج فائل کھولی اور سر جھکا کر کتاب سے کچھ نقل کرنے میں مشغول ہو گئی۔

چند منٹ بعد نیا پیریڈ شروع ہونے کی گھنٹی بجی اور آہستہ آہستہ میرے اور ماہتاب کے علاوہ سب اٹھ کر چلے گئے۔ شاید یہ پیریڈ بھی خالی تھا۔ اس لئے ہم دونوں میں سے کوئی نہ اٹھا۔ ہمارے سروں پر لٹکے ہوئے دو پنکھے سست رفتاری سے گھوم رہے تھے ان کی مدھم سی سرسراہٹ کے علاوہ ہال میں کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ پھر پنکھے کی سرسراہٹ کے ساتھ گویا میرے خون کی گردش کی آواز بھی شامل ہو گئی۔ یہ آواز رفتہ رفتہ اتنی بڑھی کہ میری کنپٹیوں میں دھماکے سے ہونے لگے اور مجھے کچھ احساس نہ رہا کہ میں کہاں بیٹھا ہوں۔

مجھے اپنے سامنے صرف ماہتاب کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک پردے سے سیاہ کینوس پر سیال ہونے سے کوئی تصویر بنی ہو۔ ہلکے سکارف کی گرفت سے نکلی ہوئی بالوں کی ایک لٹ' جھکی ہوئی پلکیں' نیم وا ہونٹ جن میں گویا دنیا بھر کے گلابوں کا رس سمٹ آیا ہو۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں کتنی دیر تک اس کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ چند لمحوں یا شاید چند صدیوں تک ......

میرے خیال میں آج فیصلے کا لمحہ آن پہنچا تھا!

○

پھر میں اس کی طرف جھکا۔ "سنو" میں نے سرگوشی کی۔
اس کا سر بدستور جھکا رہا لیکن پلکوں کی جھالریں یوں اٹھ گئیں گویا کسی جوہری نے دو انمول اصلی ہیروں پر سے مخملیں غلاف ہٹا دیا ہو۔
"تم مدن سے بات نہ کرو۔" میری آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی بلکہ مجھے خود یوں لگ رہا تھا جیسے ہوا کی لہروں کو چیرتا کمان سے نکلا ہوا کوئی تیر اپنے ہدف کی طرف جا رہا ہو۔ میرے اچانک تخاطب سے اس کے چہرے پر حیرت کی کوئی لہر نہ ابھری اور نہ ہی اس نے یہ پوچھا "تم مجھے یہ حکم دینے والے کون ہوتے ہو" اس نے صرف ایک لمحے کے لئے مجھے دیکھا پھر دھیرے دھیرے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ طلوع ہوئی۔
"اگر میں یہ حکم ماننے سے انکار کر دوں تو؟" اس کی سرگوشی ابھری۔
"تو میں مدن کو قتل کر دوں گا۔" میں نے بلا تامل کہا۔
"اور اگر اس کے بعد میں کسی اور سے ملنے جلنے لگی؟" اس نے پوچھا۔
"تو میں اسے بھی قتل کر دوں گا۔" میرے الفاظ دیوانوں کے سے اور لہجہ ہوش مندوں کا سا تھا۔
اس کا جھکا ہوا سر اٹھا' قلم اس نے فائل کے درمیان رکھ دیا۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر اس نے گہری سانس لی۔ "تو تم میرے لئے اس حد تک جا سکتے ہو؟" اس کی آواز گویا اب میرے ہی وجود سے پھوٹ رہی تھی۔
"اس سے بھی آگے۔" میں نے کہا۔
اونچی پشت کی کرسی سے ٹیک لگا کر وہ ایک بار پھر مسکرائی۔
"یہ شاید دنیا کا سب سے انوکھا اظہار محبت ہے۔" اس کے ہونٹ تھرتھرائے۔
"یہ اظہار محبت نہیں' اظہار ملکیت ہے۔" میں نے کہا۔ "تم میرے ہی وجود کا ایک حصہ ہو جو شاید سیاروں کی گردش کے ساتھ کبھی علیحدہ ہو گیا تھا۔"
وہ ایک بار پھر مسکرائی اور ایک لمحے کے توقف کے بعد پہلے سے بھی زیادہ مدھم آواز میں بولی۔ "محسوس میں بھی یہی کر رہی تھی لیکن میں منتظر تھی کہ میرے وجود کا بچھڑا ہوا حصہ خود ہی مجھ سے آن ملے۔"

میں خاموش رہا۔ اب کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے پھیلی ہوئی دھند جس کے درمیان مجھے ماہتاب کا صرف چہرہ صاف نظر آ رہا تھا' دھیرے دھیرے چھٹنے لگی۔ خون کی گردش کے ساتھ کنپٹیوں میں گونجنے والے دھماکے معدوم ہو گئے۔ میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ "گویا اب تم مدن سے میل جول نہیں رکھو گی؟"
"کیا اب بھی یہ پوچھنے کی ضرورت باقی ہے؟" اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میرا سوال کتنا غیر ضروری تھا۔ اس کے بعد ہم کافی دیر تک خاموش بیٹھے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔
اگلے پیریڈ کا گھنٹہ بجا تو ماہتاب نے اٹھ کر انسائیکلوپیڈیا مسز کوپر کے حوالے کیا اور ہم لائبریری سے نکل کر اگلے کلاس روم میں آ گئے۔ سب نے حیرت سے ہماری طرف دیکھا۔ ہم اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے مدن موہن تو لیکچر کے دوران بھی مڑ مڑ کر میری طرف دیکھتا رہا لیکن بظاہر اس کی آنکھوں میں تمام جذبوں میں صرف حیرت غالب تھی۔
اس پیریڈ کے بعد انٹرول ہوا تو مدن اور اس کے دو قریبی دوست جرنل اور پرشاد سب سے پہلے اٹھ کر باہر چلے گئے۔ میں اور ماہتاب اگلے کلاس روم سے نکلے تو وہ تینوں کہیں دکھائی نہ دیئے۔ ہم کیفے ٹیریا کی طرف چل دیئے۔ وہاں وہ تینوں ایک میز پر بیٹھے تھے اور بڑے جوش و خروش سے کسی بحث میں مصروف تھے۔ ہمیں دیکھ کر تینوں یک لخت خاموش ہو گئے۔ مدن' ماہتاب کی طرف دیکھ کر مسکرایا مگر اس کے چہرے پر سرد مہری دیکھ کر کھسیانا ہو گیا۔
ہم ایک میز پر بیٹھ چکے تو دوسرے سے پہلے مدن اٹھ کر ہماری طرف آیا۔ "آخر ایسی بھی کیا بے رخی ماہتاب؟" اس نے خاصی بے تکلفی سے کہا اور ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ "ایسا لگتا ہے جیسے منصور نے چند لمحے کے اندر اندر تم پر کوئی جادو کر دیا ہے۔"
"مسٹر مدن!" ماہتاب نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "آج سے پہلے تو آپ مجھے آپ کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ یہ آج اتنی بے تکلفی کس سلسلے میں؟"
"حیرت ہے۔" مدن موہن نے قدرے کھسیاہٹ کے ساتھ کہا۔ "آپ ہی تو کہا کرتی تھیں کہ پڑھے لکھے اور نئی نسل کے لوگوں کے درمیان بے جا تکلفات نہیں ہونے چاہئیں۔"
"لیکن صرف اس وقت جب دوسرا فریق اس کی اجازت دے۔ میں نے یہ بھی کہا تھا۔" ماہتاب نے کہا۔ "میں جب پسند کروں گی تو ایک کلاس فیلو کی حیثیت سے آپ کے ساتھ باتیں کروں گی' آپ کی باتیں سنوں گی' ہنسوں بولوں گی' لیکن اس وقت میں منصور سے چند ضروری معاملات پر ڈسکشن کر رہی ہوں۔"

"اس سے پہلے کہ آپ ان معاملات کو طول دیں مس ماہتاب!" من موہن نے اچانک بڑے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "میں منصور کی موجودگی میں آپ کو صاف طور پر بتا دینا چاہتا ہوں کہ آپ کے معاملے میں، میں زندگی اور موت کی حد تک سنجیدہ ہو چکا ہوں مجھے نہیں معلوم کہ آپ کے دل میں میرے لئے کس حد تک جگہ تھی۔ لیکن میں اس حد تک آگے جا چکا تھا کہ میں نے اپنے پتا جی سے شادی کی بات بھی کر لی تھی۔"

"ہائیں!" ماہتاب گویا سناٹے میں آ گئی چند لمحے تک اس کے حلق سے کوئی آواز نہ نکلی۔ پھر خفگی سے اس نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ہائی گاڈ! آج کل کے نوجوان کتنے خوش فہم ہوتے ہیں۔ مسٹر من! اچھا ہوا آپ نے جلد ہی اپنی خوش فہمیوں کی پٹاری میرے سامنے کھول دی۔ میں اس کالج میں اجنبی تھی۔ آپ سب سے پہلے میرے قریب آئے اور میں نے خندہ پیشانی سے آپ کی باتیں سننا شروع کر دیں۔ اس کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں مسٹر من کہ میں آپ سے شادی کے بارے میں سنجیدہ ہو گئی تھی۔ میں کسی ہندو لڑکے سے شادی کے بارے میں تو سوچ بھی نہیں سکتی۔ اف میرے خدایا! آپ کے دل میں یہ خیال کیونکر آیا مسٹر من؟"

"آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔" من نے دونوں ہاتھ پھیلا کر کہا۔ "انڈیا میں اب بعض مسلم خاندانوں میں شادیاں شروع ہو چکی ہیں —— اور میں تو اس حد تک بھی تیار ہوں کہ اگر مجھے مسلمان ہونا پڑا تو ہو جاؤں گا۔"

"آپ جن خاندانوں کی باتیں کر رہے ہیں، میں انہیں خاندان نہیں، بے غیرتوں کے ٹولے سمجھتی ہوں۔ ایسا سوچنے والی لڑکیوں کو ننگ خاندان سمجھتی ہوں اور میں ننگ خاندان نہیں ہوں۔ میری رگوں میں شاہی خون دوڑ رہا ہے۔ سمجھے آپ؟ اب میں اس قسم کی بے ہودہ گفتگو کا ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتی۔" ماہتاب کا چہرہ سرخ ہو چلا تھا۔

"شکر ہے تو میں بھی نہیں ہوں مس ماہتاب! میں ایک کروڑ پتی برہمن کا بیٹا ہوں ——" من نے ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے کہا۔ میں بڑی دیر سے خاموش بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ میرا ایک ہاتھ شیشے کے گلاس پر تھا دوسرے ہاتھ سے میں نے من کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ "میرے خیال میں اب تمہاری تسلی ہو جانی چاہئے کروڑ پتی برہمن کے بیٹے! اب اپنی مٹی پر جاؤ۔"

"تم چپ رہو۔" اس نے نفرت سے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ "بھگوان نے جتنی چوڑی چھاتی دے دی ہے تو یہ مت سمجھو کہ ہرکولیس ہو گئے۔ ایسے جسم بعض اوقات اپنے وقت سے پہلے بھی دفن ہو جاتے ہیں۔"

مجھے خود صحیح طور پر اندازہ نہیں ہو سکا کہ کب میرا ہاتھ گھوما اور من کرسی سمیت الٹ کر دروازے کے قریب جا گرا۔ اس کے دونوں دوست نرمل اور پرشاد "تاہا" ایسے ہی

موقع کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ وہ دونوں لکڑی کی بھاری کرسیاں اٹھا کر میری طرف لپکے۔ ماہتاب نے ایک تھرتھری کی کہ پھرتی سے اٹھ کر کیفے ٹیریا کے کاؤنٹر کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ میں اچھل کر قدرے کھلی جگہ میں آ گیا تھا۔ ان دونوں نے بیک وقت کرسیاں سر سے بلند کر کے یوں گھمائیں گویا مجھے ان کے درمیان پیس ڈالنا چاہتے ہوں۔ میں تو جھکائی دے کر ایک طرف کو ہٹ گیا۔ ان کی کرسیاں اتنے زور سے ٹکرائیں کہ ان کے دو تین پائے ٹوٹ گئے اور وہ اپنے ہی زور میں لڑکھڑا گئے۔ کیفے ٹیریا میں بھگدڑ مچ گئی۔

نرمل خاصا تگڑا اور دراز قد تھا۔ میں نے پہلے اس سے نمٹنا ضروری سمجھا۔ وہ ابھی سنبھلنے نہ پایا تھا کہ میں نے اس کی گردن پر ایک الٹا سا ہاتھ رسید کیا وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح گرا اور اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ پرشاد کرسی سنبھال کر دوبارہ حملہ آور ہوتا میں نے اس کی پسلیوں میں گھونسا رسید کیا۔ میں کراٹے کا کوئی داؤ استعمال نہیں کر رہا تھا ورنہ ذرا زیادہ زور سے وار کر رہا تھا۔ شاید ان میں سے کوئی مر جاتا۔

پرشاد دیکھنے میں زیادہ مضبوط نہیں تھا لیکن جاندار تھا۔ میرا گھونسا کھا کر ڈکراتا ہوا گرا مگر فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ کرسی اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکی تھی۔ اس نے ایک میز سے تانبے کا بھاری جگ اٹھا لیا۔ جگ اس نے اتنی طاقت سے میری طرف پھینکا کہ اگر میں ایک طرف نہ ہٹ گیا ہوتا تو میرا سر پاش پاش ہو جاتا یا پھر کئی ہڈیاں چکنا چور ہو جاتیں۔ کیونکہ وہ جس میز سے ٹکرایا تھا اس کے ماربل کے ٹاپ کا ایک بڑا سا ٹکڑا علیحدہ ہو گیا تھا۔

ایک لمحے کے لئے میرا جی چاہا کہ دونوں ہاتھوں کی ضرب سے اس کا سر خربوزے کی طرح پچکا ڈالوں۔ مگر بخت ذہنی دھندے کی طرح غیظ و غضب سے پاگل ہو رہا تھا۔ میں نے اپنے آپ پر ضبط کرتے ہوئے اس کی کنپٹی پر گھونسا رسید کرنے پر اکتفا کیا۔ وہ بھی چاروں شانے چت ہو گیا اسی دوران من سنبھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔

ماہتاب کی چیخ نے مجھے اس کی طرف متوجہ کیا۔ وہ پہلے سے نکال کر ایک چاقو لئے میرے عقب سے میری طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ میرے اتنے قریب آ چکا تھا کہ اس کی کلائی پر کراٹے کا ہاتھ رسید کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ ضرب لگتے ہی چاقو اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور زوردار آواز کے ساتھ فرش سے ٹکرایا اور وہ دوسرے ہاتھ سے کلائی تھام کر کراہتا ہوا گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔

اپنے کپڑے وغیرہ درست کر کے میں کیفے ٹیریا کے کاؤنٹر کی طرف مڑا ہی تھا کہ باہر شور شرابے کی آواز سنائی دی اور پھر میں نے دیکھا کہ پرنسپل آتما رام جو بڑے مرنجان مرنج اور خلیق سے آدمی تھے اور ہمیشہ سفید براق کرتے پاجامے میں سیاہ واسکٹ میں ملبوس رہتے تھے۔ ابھی وہ اپنی ٹوپی سنبھالے بہ نفس نفیس کیفے ٹیریا میں بھاگتے ہوئے پہنچے ہی تھے۔

دروازے سے اندر قدم رکھنے سے پہلے انھوں نے مڑ کر کہا۔ "آپ لوگ خاطر جمع رکھیں ـــــ کسی قسم کا دنگا فساد نہ کریں ورنہ پولیس کیس بنا جائے گا ـــــ کالج کی ریپوٹیشن خراب ہو جائے گی۔ میں ابھی جھگڑا کرنے والے لڑکوں سے بات کر کے آپ کو بتاتا ہوں۔ یہ معمولی جھگڑا ہے اس میں ہندو مسلم فساد کھڑا کرنے کی کوئی بات نہیں۔"

کالج میں مسلمان لڑکے اقلیت میں تھے لیکن ایسا لگتا تھا کہ باہر پہنچنے والی چنگاری کو ہوا مل چکی ہے اور کسی بھی لمحے شعلے بھڑک سکتی ہے۔ کیفے ٹیریا سے باہر غالباً ہندو اور مسلمان لڑکوں کے گروپ پہنچ چکے تھے اور پرنسپل انہی سے مخاطب تھے۔ لیکن اندر سے میں ان لوگوں کو نہیں دیکھ پا رہا تھا۔

اپنی مختصر تقریر ختم کر کے پرنسپل نے اندر کا رخ کیا اور کیفے ٹیریا کا دروازہ اپنے عقب میں بند کر دیا۔ اندر آ کر پہلے انھوں نے طائرانہ نظروں سے توڑ پھوڑ کا جائزہ لیا پھر کمانی دار عینک ناک پر صحیح طریقے سے جماتے ہوئے بولے۔ "یہ میں ـــــ بھی جھگڑا ـــــ یہ کالج طلبا کو متمدن اور مہذب شہری بنانے کا دعویدار ہے اور اس کی تاریخ میں کبھی ایسا لڑائی جھگڑا نہیں ہوا۔"

انھوں نے مدن کو سہارا دے کر ایک کرسی پر بٹھایا، مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ایک نظر ماہتاب پر ڈالی اور پھر ہم سے جھگڑے کی تفصیل پوچھنے کی بجائے روشن ریپن کی طرف بڑھے جو کیفے ٹیریا کا ٹھیکیدار تھا اور اس وقت کاؤنٹر کے پیچھے سہما بیٹھا تھا۔ انھوں نے روشن سے ساری تفصیل معلوم کی پھر ہمارے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولے۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہمارے کالج میں بھی ایسا واقعہ رونما ہو سکتا ہے۔ چند مہینے اور تم لوگ گریجوایٹ ہونے والے ہو، مہذب خاندانوں سے تمہارا تعلق ہے اور حرکتیں تم نے چرسیوں، بھنگیوں اور شرابیوں والی کی ہے۔ میں اب اس پر بحث نہیں کروں گا کہ قصور کس کا ہے؟ باہر دونوں طرف کے لڑکے بپھرے کھڑے ہیں۔ میرے سامنے تین راستے ہیں ایک تو یہ کہ تم دونوں بلکہ چاروں لڑکوں کو بدکرداری کا سرٹیفکیٹ دے کر کالج سے باہر کر دوں اور جھگڑا یہیں ختم کر دوں، دوسرے یہ کہ پولیس کو طلب کر کے سارا معاملہ اس کے ہاتھوں میں دے دوں اور کالج کی ریپوٹیشن کا بیڑا غرق ہونے دوں۔ یہ دونوں طریقے حتمی ہیں۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ میں تم دونوں کو کان سے پکڑ کر باہر لے چلوں۔ سب کے سامنے تم ایک دوسرے سے معذرت کرو اور کہہ دو کہ یہ تمہارا ذاتی اور معمولی نوعیت کا جھگڑا تھا۔ وقتی ابال تھا جو ختم ہو گیا۔ بولو تمہیں کونسا طریقہ پسند ہے؟"

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے کندھے اچکا کر مدن کی طرف دیکھا۔ میرے خیال میں وہ اس قبیل کا تو نہیں تھا جو جلد شکست تسلیم کر لے یا اپنی غلطی کا اعتراف کر سکے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ان میں کسی جذبے کی جھلک نہیں

تھی لیکن نجانے کیوں مجھے یقین تھا کہ اس کے دل کی گہرائیوں میں نفرت کی تہوں میں لپٹا ہوا کوئی خوفناک منصوبہ کلبلا رہا ہو گا۔ بہرحال مجھے اس کی کوئی خاص پروا نہیں تھی۔

"معافی مانگنی بھی تمہیں ہی چاہئے کیونکہ غلطی تمہاری تھی۔" میں نے کہا۔

پرنسپل آغا رانم ہم دونوں کو باہر لائے اور ایک چبوترے پر کھڑے ہو کر سب کے سامنے ہماری صلح کرائی اور ہجوم کو ٹھنڈا کر کے منتشر کر دیا پھر انھوں نے مدن، نرمل اور پرشانت کو ہسپتال بھجوانے کا بندوبست کیا۔ مدن کی کلائی کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی، نرمل اور پرشانت صرف بے ہوش تھے۔ شاید انھیں کوئی اندرونی چوٹ بھی آئی ہو مجھے اندازہ نہیں تھا۔ حالات پر سکون ہوئے تو میں اور ماہتاب گراؤنڈ میں آ گئے۔

"ہماری تو پہلی ملاقات ہی بڑی ہنگامہ خیز ثابت ہوئی۔" وہ میری گاڑی سے ٹیک لگا کر کھڑے ہوتے ہوئے مسکرا کر بولی "یہ اچھا شگون نہیں ہے۔"

"میرے خیال میں تو بڑا اچھا شگون ہے۔" میں نے کہا۔

"لگتا ہے کہ ہماری آئندہ زندگی ہنگاموں ہی سے عبارت ہو گی اور مجھے آج پہلی مرتبہ احساس ہوا ہے کہ ہنگامہ خیزی سے میرے جسم میں نئی زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔"

"اچھا ایک بات تو بتاؤ منصور!" ماہتاب کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔ "تم نے ڈرامے میں میرے ساتھ رول کرنے سے کیوں انکار کر دیا تھا جب کہ مجھے امید تھی کہ اس میں میری شمولیت کا سن کر تم ضرور حامی بھر لو گے؟"

"میں خود نہیں جانتا۔" میں نے فائل بونٹ پر رکھتے ہوئے کہا۔ "تبھی وہ مجھے کچھ فلمی سا لگا۔ آج کل ہماری فلموں میں بھی کچھ ہوتا ہے نا۔ ہیرو اور ہیروئن کالج کے کسی ڈرامے یا ٹیبلو میں اکٹھے کام کرتے ہیں جس میں پچیس سالہ ہیروئن چودہ سالہ لڑکی والے نخروں کے ساتھ ایک بازاری رقص بھی ضرور پیش کرتی ہے۔ پھر ہیرو صاحب دو چار غنڈوں کے پیچھے دم ہلاتے پھرتے ہیں اور وہ انہیں قطعاً گھاس نہیں ڈالتی پھر یک لخت ہی اتنی مہربان ہو جاتی ہے کہ بھری پری سڑکوں پر ہیرو کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ڈوئٹ گاتی پھرتی ہے۔ مجھے لگتا تھا کہ اگر میں نے ڈرامے میں کام کیا تو یہ مراسم کا بڑا عجیب سا آغاز ہو گا۔ معلوم نہیں تم میری بات سمجھ رہی ہو یا نہیں۔"

"میں تو اسی وقت سمجھ گئی تھی کہ تمہارے انکار کے پیچھے کونسے محسوسات کام کر رہے ہیں۔" ماہتاب مسکرائی۔ "اور مجھے تمہاری یہ ادا اچھی لگی تھی۔ اگر تم ڈرامے میں کام کرنے کی حامی بھر لیتے تو شاید فلموں کے برعکس بات وہیں اسٹیج پر ہی ختم ہو جاتی اور ہمارے مراسم کا آغاز نہ ہو پاتا۔" پھر اس نے نجانے کیا سوچ کر ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور شریر نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "دیکھئے کیا موجودہ انداز؟ تمہیں علمی نہیں ؟؟"

"مطلق نہیں۔" میں نے کہا۔ "فلموں میں تو ڈھیلے ڈھالے جسم والا ایک صاحب ڈنڈ پیلتے ہوئے کسرتی جسم والوں کو مار بھگاتا ہے جبکہ حقیقی زندگی میں وہ ایک چوہے کو بھی نہیں مار سکتا جب کہ مجھے دیکھ کر کوئی بھی ذی ہوش اندازہ لگا سکتا ہے کہ میں کیا کچھ کر سکتا ہوں کیونکہ میرے پیچھے تیس برس کی ریاضت ہے۔"

"میری گاڑی آ گئی۔" ماہتاب نے گیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب میں چلتی ہوں۔ فی الحال میں تمہیں [illegible] یا فلمی ہیروئنوں کی طرح اپنے ماں باپ سے ملانے گھر نہیں لے جاؤں گی کیونکہ وہ گھر پر ہوتے ہی نہیں۔ میرے ابا کو کاروبار سے فرصت نہیں تھی۔ اور امی کو سیاست کا چسکا ہے۔ دونوں سے رات کے کھانے پر ہی ملاقات ہوتی ہے۔ اچھا خدا حافظ۔"

میں اپنی جگہ کھڑا اسے جاتے دیکھتا رہا۔ چند منٹ بعد میں نے اپنی گاڑی نکالی اور گھر روانہ ہو گیا۔ عماد سے کراٹے کی جھڑپ کے باوجود میں آج بہت خوش تھا اور سوچ رہا تھا کہ ممی سے اگلی ملاقات پر انہیں ماہتاب کے متعلق بتاؤں گا اور ہو سکا تو کسی روز ان کی ملاقات بھی کرا دوں گا اور دیکھوں گا کہ ممی اس کے متعلق کیا رائے ظاہر کرتی ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ وہ بھی اسے بے حد پسند کریں گی۔

اگلے دن عماد کالج نہیں آیا۔ اس کی درخواست آئی تھی۔ اس کے بازو پر پلاستر چڑھا تھا اور وہ گھر پر آرام کر رہا تھا۔ ذرفی اور پرشاد الہت آئے تھے لیکن کچھ مضمحل نظر آ رہے تھے اور مجھ سے آنکھ نہیں ملا رہے تھے۔ تین دن تک کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا، سوائے اس کے کہ کالج میں میری اور ماہتاب کی جوڑی مشہور ہو چکی تھی۔ اور ہم جدھر بھی اٹھتے تھے ہمیں رشک آمیز نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔

اس روز ہمارا تیسرا پیریڈ ختم ہوا ہی تھا کہ پرنسپل کا چپراسی کلاس میں آیا اور پوچھنے لگا کہ مس ماہتاب کون ہیں پھر اس نے ماہتاب کو بتایا کہ پرنسپل کے دفتر میں اس کا فون آیا ہے۔ ماہتاب اس کے ساتھ چلی گئی کچھ دیر بعد وہ واپس آئی تو پیریڈ شروع ہو چکا تھا۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا اس نے اکنامکس کے پروفیسر مہتہ جی کو بتایا کہ اس کے ابا کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ سول ہسپتال سے فون آیا تھا اور وہ وہاں جا رہی ہے۔

"سر!" میں نے کھڑے ہو کر پروفیسر مہتہ سے کہا "اگر آپ اجازت دیں تو میں ماہتاب کو ہسپتال چھوڑ آؤں؟"

"جاؤ!" مہتہ جی نے حاضری کے رجسٹر سے نظریں اٹھائے بغیر کہا باہر آ کر میں نے ماہتاب سے پوچھا "کیسے ہوا ایکسیڈنٹ؟"

"ہسپتال والوں نے زیادہ کچھ نہیں بتایا صرف اتنا ہی کہا کہ انہیں خون کی ضرورت ہے۔" ماہتاب روتے ہوئے بولی۔ "انہوں نے پہلے گھر فون کیا تھا وہاں امی بھی نہیں تھیں

کسی نوکر نے انہیں میرے کالج کا فون نمبر دیا تو انہوں نے مجھے اطلاع دی اور اس چکر میں کافی تاخیر ہو چکی ہے۔

میں نے گراؤنڈ سے گاڑی نکالی۔ کالج سے نکل کر ہم بمشکل آدھ فرلانگ دور ہی گئے تھے کہ انجن گھرر گھرر کی عجیب سی آواز کے ساتھ بند ہو گیا۔ میں نے اسے اسٹارٹ کرنے کی بہت کوشش کی لیکن ہر مرتبہ وہ ہلکی سی "گھرر گھرر" کی مختصر سی آواز پیدا کر کے خاموش ہو گیا۔

"اسے بھی ابھی خراب ہونا تھا۔" ماہتاب نے مضطربانہ لہجے میں کہا۔ "آؤ کوئی دوسری سواری تلاش کرتے ہیں۔"

ہم ابھی گاڑی سے اترے ہی تھے کہ ایک ٹیکسی سست رفتاری کے ساتھ قریب سے گزرتی دکھائی دی۔ میں نے جلدی سے ہاتھ دے کر اسے روکا۔ اور ہم لپک کر اس میں بیٹھ گئے۔ "سول ہسپتال" میں نے ڈرائیور سے کہا۔ "تیز چلانا' ایک ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔"

میلے کچیلے اور گنجے سر والے ڈرائیور نے مڑ کر ہماری طرف دیکھا۔ "جیسے آپ بولیں' میں چلاؤں گا صاحب! لیکن اگر ایک اور ایکسیڈنٹ ہو گیا تو آپ کی ذمے داری۔"

اس نے ایکسیلیٹر دبایا اور گاڑی فراٹے بھرنے لگی۔ میں اس وقت چونکا جب میں نے دیکھا کہ ڈرائیور نے گاڑی اسٹیورٹ روڈ کی طرف موڑنے کی بجائے مضافات کی طرف جانے والی سڑک پر ڈال دی تھی۔

"تم اسٹیورٹ روڈ کی طرف سے کیوں نہیں چل رہے؟" میں نے پوچھا۔

"آپ کو نہیں معلوم صاحب؟ آگے کی چوک میں کل سے سڑک کی مرمت کا کام ہو رہا ہے ہمیں لمبے سے گھوم کر آنا پڑے گا۔" ڈرائیور نے سادگی سے کہا۔ چند لمحے تذبذب کے عالم میں گزر گئے۔ میری چھٹی حس مجھے کسی خطرے سے خبردار کر رہی تھی لیکن میں نے فیصلے پر پہنچنے میں تاخیر کر دی۔ جب ڈرائیور ایک اور کچے راستے کو چھوڑ کر بدستور سنسان سڑک پر گاڑی بھگاتا رہا تو میں نے اس کی گردن پر ہاتھ ڈال دیا۔ "گاڑی روک لو' ورنہ گردن توڑ دوں گا۔" میں نے اس کی پتلی سی گردن کے منکے پر انگوٹھے سے دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔

"بہت اچھا صاحب!" اس نے سعادت مندی سے کہا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کی سعادت مندی کی وجہ یہ تھی کہ اسی وقت ایک اور کار ہمارے عقب میں رک چکی تھی۔ میں نے اس کے دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں سن کر مڑ کے دیکھا۔ اس کا اگلا بمپر ٹیکسی کے پچھلے بمپر سے تقریباً ملا ہوا تھا اور چار آدمی اس سے اتر کر ٹیکسی کے دروازے کے قریب پہنچ چکے تھے۔

میں نے ڈرائیور کی گدی پر گھونسا رسید کیا اور وہ کراہ کر اسٹیئرنگ پر سر رکھ کر ساکت ہو گیا۔ عین اسی لمحے پچھلا دایاں دروازہ کھلا اور ساتھ ہی میں نے ماہتاب کی چیخ سنی۔ کسی نے اسے بے دردی سے باہر گھسیٹ لیا تھا۔ میں نے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر قدم رکھا ہی تھا کہ میرے سر پر کسی ٹھوس اور وزنی چیز سے ضرب پڑی اور میرا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔

جب میری آنکھ کھلی تو میرے سر کے پچھلے حصے میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ کئی مرتبہ سر جھٹکنے کے بعد میری آنکھوں کے سامنے پھیلی ہوئی دھند تو چھٹ گئی لیکن سر کا درد کچھ بڑھ گیا۔ میری نظر سب سے پہلے مدن پر پڑی جو پلستر سے ڈھکا ہوا اپنا ایک بازو، گلے میں حمائل پٹی کے حلقے میں لٹکائے مجھ سے کچھ فاصلے پر سامنے ہی کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر ایسی خوفناک مسکراہٹ تھی کہ وہ اپنی عمر سے کہیں بڑا اور خون خوار نظر آ رہا تھا۔

اس کے عقب میں سیڑھیاں تھیں جو اوپر کو جا رہی تھیں اور ان کے وسط میں ایک سیڑھی پر بیٹھا لمبے چہرے والا ایک سیاہ فام کیم شحیم کوئی بیٹھا چمکیلے پھل والے ایک لمبے سے چاقو کی دھار پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ اس کے جسم پر ڈھیلی ڈھالی شلوار قمیص اور واسکٹ تھی۔ گلے میں سرخ مفلر لپٹا ہوا تھا۔ میں نے ہاتھ ہلانا چاہے تو احساس ہوا کہ وہ میری پشت پر بندھے ہوئے ہیں۔ یہ غالباً کوئی تہ خانہ تھا جس کا فرش اینٹوں کا تھا۔ اور چھت میں ایک لمبی سی تار کے سرے پر ایک بڑا سا بلب جھول رہا تھا لیکن تہ خانے کی لمبائی چوڑائی کی مناسبت سے اس کی روشنی کم معلوم ہو رہی تھی۔

تہ خانے میں دو آدمی اور تھے جو اسٹینڈز پر لگی ہوئی دو بڑی بڑی فلڈ لائٹس خاص زاویوں پر کھڑی کر رہے تھے ان لائٹس کے درمیان ایک بیڈ لگا ہوا تھا جس پر بستر اور تکیہ بھی موجود تھا۔ بیڈ کی پائنتی کی طرف اسٹینڈ پر ایک کیمرہ فٹ تھا۔ فلڈ لائٹس روشن نہیں تھیں ان کے ساتھ منسلک تاریں سیڑھیوں سے ہوتی ہوئی اوپر کہیں جا رہی تھیں۔ کیمرے کے قریب چھدرے سے بالوں والا ایک پستہ قد بوڑھا کھڑا جلدی جلدی سگریٹ کے کش لے رہا تھا اور متوحش نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ منظر بالکل ایسا ہی تھا جیسے کسی فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہو۔

مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر مدن کی مسکراہٹ پھیل گئی۔ تھوڑی سی کوشش کر کے میں اٹھ بیٹھا۔ مدن کچھ اور قریب آ گیا اور ٹانگیں چوڑی کر کے یوں کھڑا ہو گیا گویا کوئی اناڑی شکاری اپنے ہلاک کئے ہوئے شیر کے قریب آ رہا ہو اور سوچ رہا ہو کہ کس پوز میں تصویر کھنچوائے۔ "کیا حال ہے ہیرو؟" اس نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

"حال پوچھنا ہی ہے تو ہاتھ کھول کر پوچھو۔" میں نے کہا۔

"جی نہیں۔" اس نے انگلی اٹھا کر شاطرانہ لہجے میں کہا۔ "مجھے ہیرو بننے کا کوئی

شوق نہیں۔ میں تو موقع دیکھ کر وار کرنے کا عادی ہوں۔ اس وقت موقع میرے ہاتھ میں ہے بھگن دادا یہاں موجود ہے۔" اس نے سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے کریہہ صورت آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ "اگر میں تمہارے ہاتھ کھول بھی دوں تو ضرورت پڑنے پر بھگن دادا تمہیں منٹوں میں سوکھی لکڑی کی طرح توڑ سکتا ہے لیکن میں خواہ مخواہ جھنجھٹ میں آ کر کوئی خطرہ کیوں مول لوں، آخر کیا ضرورت ہے؟"

"یہاں ایک چھوٹا سا ڈرامہ ہو رہا ہے۔ جس کا نام ہے "بے عزتی کا بدلہ۔" تم چاہو تو اسے ضد کی تکمیل کا نام بھی دے سکتے ہو۔ ماہتاب میری ضد بن چکی ہے اور میں نے ہر قیمت پر اسے حاصل کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے۔" اس نے ایک نظر ماہتاب کی طرف دیکھا اور یکلخت اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ "کچھ دیر بعد یہاں میری اور ماہتاب کی ایسی بہت سی تصویریں بنائی جائیں گی جنہیں مہذبانہ زبان میں قابل اعتراض کہا جاتا ہے۔ بے فکر رہو، ان تصویروں میں میرا یہ پلستر والا بازو نظر نہیں آئے گا۔" اس نے اپنے مضروب بازو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نہایت استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "یہ بڑے میاں جن کا اصل نام تو کچھ اور ہے مگر ہم انہیں بھولے رام کہتے ہیں، اس قسم کی فوٹو گرافی میں بڑے ماہر ہیں، یوں سمجھو اپنے فن کے بادشاہ ہیں۔"

اس نے کیمرے کے قریب کھڑے بدحواس بوڑھے کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ ہندوستان کی کئی ابھرتی ہوئی فلمی ہیروئنوں کی بڑی "نادر" تصویریں بنا چکے ہیں۔ اب تم شاید پوچھو گے کہ میں اتنا تردد کس لئے کر رہا ہوں؟ اگر مقصد صرف ماہتاب کو داغدار کرنا ہی ہے تو وہ میں اب بھی کر سکتا ہوں لیکن ایسا نہیں ہے۔ میں جب کسی چیز کو حاصل کرتا ہوں تو اس وقت تک اپنے قبضے میں رکھنا پسند کرتا ہوں جب تک میرا دل نہ بھر جائے اور ماہتاب کے سلسلے میں بھی ایسا ہی بندوبست کر رہا ہوں۔"

میری کنپٹیوں میں خون ٹھوکریں مارنے لگا۔ میں اپنے اندر ہمت نہیں پا رہا تھا کہ مڑ کر ماہتاب کے تاثرات دیکھ سکوں۔

"ان تصویروں کے نیگیٹو میرے علاوہ بھگن دادا اور اس کے خاص آدمی کے پاس محفوظ رہیں گے۔" مدن نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "کل سے ہم حسب معمول کے مطابق کالج اٹینڈ کر رہے ہوں گے لیکن امتحان سے فارغ ہوتے ہی میں ماہتاب کے ماں باپ سے ماہتاب کا رشتہ طلب کروں گا اور ماہتاب انہیں مجبور کرے گی کہ وہ یہ رشتہ قبول کر لیں اگر ماہتاب ایسا نہیں کرے گی یا میرے بجائے تم یا کوئی بھی اور لڑکا ماہتاب سے شادی کی کوشش کرے گا تو ان تصویروں کے پرنٹ کالج کے ہر لڑکے کے ہاتھ میں پہنچ جائیں گے جس کلب میں ماہتاب کے ابا جاتے ہیں، اس کے پارکنگ لاٹ اور لان میں اچانک یہی پرنٹ بکھرے پائے جائیں گے اور ماہتاب یا اس کی فیملی کا کوئی جاننے والا ان کے نظارے سے

محروم ہو جائے گا تو اسے بذریعہ ڈاک بھیجے جائیں گے۔ تر تیغہ سے ہماری ماہتاب ...... اپنا یہ چاند سا چہرہ کسی کو دکھانے کے قابل نہیں رہے گی۔ کسی جوانمرد میں اسے اپنانے کا حوصلہ نہیں رہے گا اور اس موقع پر بھی صرف آپ کے اس خادم کے دل کا دروازہ کھلا رہے گا اور سراج سے منہ چھپائی اس بلال کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو گی۔"

"بڑا پورا منصوبہ ہے۔" میں نے کہا۔ "تمہارا کیا خیال ہے کہ یہاں سے نکلنے کے بعد میں تمہیں زندہ چھوڑ دوں گا؟ اس ساری کارروائی کے بعد؟"

"تم مجبور ہو گے۔" مدن نے تیزی سے کہا۔ "پرنٹ پھمن داوا کے علاوہ اس کے ایک خاص آدمی کے پاس بھی موجود ہوں گے جس کا اتا پتا تمہیں معلوم نہیں۔ اگر مجھے کوئی گزند پہنچا تب بھی پرنٹ اسی طرح نکل جائیں گے جس طرح میں نے بتایا ہے۔ اگر تم مجھے اور بالفرض کسی طرح پھمن داوا کو بھی مار ڈالو تب بھی یہی ہو گا اس لئے امید ہے کہ تم ماہتاب کی نیک نامی کے لئے ہیرو بننے کی کوشش نہیں کرو گے کیونکہ اس سے ماہتاب کی عزت کو ناقابل تلافی نقصان ہو گا۔"

"منصوبے میں ایک جھول اور ہے۔" میں نے کہا۔ "تمہیں پھمن داوا پر اتنا اعتبار کیوں ہے؟ پرنٹ اس کے قبضے میں ہوں گے اس کی کیا گارنٹی ہے کہ کل کو یہ تمہیں بلیک میل نہیں کرے گا؟"

سیڑھیوں پر بیٹھا پھمن داوا غرایا لیکن مدن نے کہا میری کم عقلی پر قہقہہ لگاتے ہوئے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ "تم بات سمجھ نہیں رہے۔" وہ بولا۔ "ماہتاب میری خدمت ہے میری عزت نہیں کہ پھمن داوا مجھے بلیک میل کر سکے اور پھر پھمن داوا بڑا بااصول آدمی ہے مجھے اس پر اس لئے اعتماد ہے کہ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں یہ کسی بھی کام کے منہ مانگے پیسے لیتا ہے مگر پھر معاہدے کی پابندی اس طرح کرتا ہے کہ جان پر بھی کھیلنا پڑے تو دریغ نہیں کرے گا۔"

"اگر بات ایسی ہی تھی۔" میں نے کہا۔ "تو مجھے یہاں لانے کی زحمت کیوں کی گئی؟ یہ کام تو صرف ماہتاب کو اغوا کر کے بھی ہو سکتا تھا۔"

"اس کی کئی وجوہات تھیں۔" مدن نے بڑی خوش دلی سے کہا۔ "پہلی بات تو یہ کہ تمہیں لایا نہیں گیا درحقیقت تم خود ہی آ گئے ہو۔ مجھے معلوم تھا کہ ماہتاب جب فون پر تمہارے فرضی ایکسیڈنٹ کی خبر سنے گی تو اس وقت اس کی گاڑی کالج میں موجود نہیں ہو گی اور تم ہی اسے ہسپتال پہنچانے کے لئے نکلو گے اس لئے میں نے احتیاطاً تمہاری گاڑی کی ٹنکی میں تھوڑی سی چینی ڈلوا دی تھی۔ جب تمہیں ہمارے آدمی کی ٹیکسی سے اترتے وقت بے ہوش کیا گیا تب بھی ہم تمہیں سنسان سڑک پر بے ہوش چھوڑ کر آ سکتے تھے لیکن میری دلی خواہش تھی کہ تم یہ فلمیں یہ حسین ڈرامہ دیکھ سکو تاکہ یہ بات

شروع سے تمہاری سمجھ میں آ جائے۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ تمہاری کیفیت سے میں بھی اتنا ہی محظوظ ہو سکوں، جتنا اس روز تم کالج میں میرا بازو توڑ کر اور میرے دوستوں کو بے ہوش کر کے ہو رہے تھے۔" اس کے چہرے کے عضلات میں کھنچاؤ سا آ گیا لیکن زہریلی مسکراہٹ ابھی بھی اس کے ہونٹوں پر منجمد تھی۔

"یہ ساری باتیں مجھے اب بھی بچگانہ سی لگ رہی ہیں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "مجھے تم چودہ سال کے لیے ناسمجھ لڑکے لگ رہے ہو جس کا دماغ بہرام ڈاکو کے کارنامے پڑھ پڑھ کر خراب ہو گیا ہے۔ سب سے زیادہ حیرت تو مجھے اس بات پر ہے کہ تم سب سے زیادہ انحصار اس پھمن داوا پر کر رہے ہو اور اسی کے بھروسے پر اچھل رہے ہو، جو مجھے شکل سے ہی پکا خبیث لگ رہا ہے۔ یہ غلط نا تحقیق ...... کرائے کا بدمعاش......"

میں نے پھمن داوا کو تین چار تیکھی تیکھی گالیاں اور دے دیں جن کا رد عمل وہی ہوا جو میں چاہتا تھا پھمن داوا چوٹ کھائے اژدہے کی طرح تڑپ کر اپنی جگہ سے اچھلا اور سیڑھیوں سے کود کر پھنکارتا ہوا میری طرف لپکا۔ اس کا چیچک زدہ سیاہ چہرہ شدت غضب سے بالکل ہی مسخ ہو کر رہ گیا تھا اور سرخ سرخ آنکھوں سے لپ تو گویا خون ہی ٹپک رہا تھا۔ چاقو پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی تھی۔

میں اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا میرے لئے اتنا ہی غنیمت تھا کہ میری ٹانگیں بندشوں میں جکڑی ہوئی نہیں تھیں اگر اسے معلوم ہوتا کہ میں درحقیقت جوڈو کراٹے کا ماہر ہوں اور میرے لئے اپنی ٹانگیں ہاتھوں سے بھی زیادہ اہم ہیں تو انہیں بھی ضرور بندھوا دیتا۔

"پھمن داوا ......" مدن چیخا۔ "اس کے قریب مت جانا ......"

مگر پھمن داوا ایک روایتی بدمعاش تھا جسے اپنے آپ پر بڑا زعم ہوتا ہے میری ملاقات میں کر وہ رک نہیں سکا تھا۔ قریب پہنچ کر اس نے اپنی دانست میں میری انتڑیاں نکال دینے کے لئے چاقو سے وار کیا میں عین اس وقت اس کے سامنے سے ہٹا جب چاقو کی نوک میرے پیٹ سے دو انچ دور رہ گئی تھی۔ چاقو کا پھل پختہ دیوار سے ٹکرایا اور کچھ پلستر اکھڑ کر زمین پر جا گرا۔ پھمن بگڑے ہاتھی کی طرح ذرا سا لڑکھڑایا۔ میں ابھی کے بل گھوما اور میری لات اس کی پشت پر پڑی۔ اس کا سر توپ کے گولے کی طرح دیوار سے ٹکرایا آدمی سخت جان تھا ورنہ وہیں ڈھیر ہو جاتا۔

اس نے سیدھا ہونے کی کوشش کی لیکن اس سے پہلے میری دوسری لات اس کے منہ پر پڑی۔ اس کا مسخ شدہ چہرہ اور مسخ ہو گیا ایک خوفناک ڈکراہٹ کے ساتھ اس نے غصے میں اندھے ہو کر ہوا میں ہاتھ لہرائے۔ چاقو اس کے ہاتھ سے گر چکا تھا اور اسے میں نے ٹھوکر کے ساتھ تہہ خانے کے اس حصے میں پہنچا دیا تھا جدھر روشنی بہت کم تھی۔ اسی لمحے میری نظر بدقسمت مدن پر پڑ گئی جو ریوالور نکال چکا تھا لیکن بائیں ہاتھ سے اسے نشانہ

اٹھنے میں دقت پیش آ رہی تھی۔ میں چھلانگ لگا کر اس کے قریب پہنچا اور اس کے سینے پر ایک لات رسید کی۔ وہ پچھلی دیوار سے ٹکرا کر اوندھے منہ گرا اور اپنے پلستر زدہ بازو کو تھام کر بیٹھنے لگا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا لیکن اس کے قریب ہی پڑا تھا تاہم اپنی تکلیف میں اسے اس کا ہوش نہیں رہا تھا۔

لیکن دلاور میرے قریب پہنچا تھا، اس کا چہرہ خون میں چھپ گیا تھا وہ اب بھی اسی زعم میں تھا اور کسی طرح مجھے پکڑ لینا چاہتا تھا۔ اگر وہ مجھے پکڑ لیتا تو شاید واقعی کچھ کر گزرتا۔ ایڑی کے بل گھوم کر میں نے ایک بار پھر وہی داؤ آزمایا اور وہ اس تناور درخت کی طرح فرش پر آ رہا جس کی جڑیں طوفان نے اکھاڑ دی ہوں۔

عین اسی لمحے میں نے دیکھا کہ وہ دو نوجوان جو اسٹینڈ پر لگی ہوئی لائٹس درست کر رہے تھے ان میں سے ایک مان پر سے چھلانگ لگا کر سیڑھیوں کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ وہ شاید تہہ خانے سے نکل کر دروازہ باہر سے مقفل کرنا چاہتا تھا یا پھر اوپر سے کوئی کمک لینے جا رہا تھا۔ میں لپک کر اس کے پیچھے پہنچا جب وہ تیسری سیڑھی پر قدم رکھ چکا تھا، اس کی ٹانگ میں ٹانگ پھنسا کر میں نے اسے پیچھے کھینچ لیا۔ وہ اوندھے منہ سیڑھیوں پر گرا اور درد سے بلبلایا۔ میں نے اس کی کنپٹی پر ہلکی سی ٹھوکر رسید کی اور وہ نیچے فرش پر آ گرا اور وہیں ساکت ہو گیا۔ دوسرا نوجوان اسٹینڈ سمیت ایک لائٹ اٹھا کر میرے سر پر آن پہنچا تھا لیکن اس نے شاید دوسروں کے انجام سے سبق حاصل کیا تھا اور اندھا دھند مجھ پر وار نہیں کیا تھا۔

ہم ایک دوسرے کے سامنے نیم دائرے میں گھومنے لگے۔ دفعتاً اس نے گرز کی طرح لائٹ کو گھمایا میں پیچھے کو لیٹ کر دیوار سے جا لگا اور لائٹ سیڑھیوں سے ٹکرا کر چکنا چور ہو گئی۔ نوجوان نے لائٹ وہیں پھینک دی۔ اس کی نظر اچانک مان کے ریوالور پر پڑ گئی تھی۔ وہ ریوالور کی طرف لپکا اور جلد بازی میں مار کھا گیا۔ میری ٹھوکر اس کی بغل پر پڑی۔ وہ ہوا میں کئی فٹ اوپر اچھلا اور ایک کربناک چیخ کے ساتھ فرش پر آ رہا۔ میں نے اسے بے ہوش کرنے کے لئے کنپٹی پر ٹھوکر والا طریقہ ہی آزمایا۔

میں نے دیکھا کہ مان کا کانپتا ہوا ہاتھ ریوالور کی طرف رینگ رہا تھا۔ اس کے قریب پہنچ کر میں نے ہاتھ پر ایڑی سے معمولی سی ضرب لگائی۔ اس نے کراہ کر ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ میں نے ریوالور کو بھی ٹھوکر مار کر تہہ خانے کی پہلی دیوار کے پاس پہنچا دیا۔

دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ بوڑھا فوٹوگرافر نظر نہیں آ رہا۔ میں نے اس کی تلاش میں نظر دوڑائی تو بیڈ کے نیچے مجھے اس کے جوتے حرکت کرتے دکھائی دیئے۔ "باہر آ جاؤ۔" میں نے بیڈ کے قریب پہنچ کر اس کے جوتوں پر ہلکی سی ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔ بمشکل تمام وہ رینگتا ہوا بیڈ کے نیچے سے نکل آیا۔ صورت حال اگر کچھ اور ہوتی تو شاید میں اس کی

شکل دیکھ کر ہنسے بغیر نہ رہ سکتا لیکن اس وقت میری حس مزاح میرے جسم میں پھوٹنے پسینے کے ساتھ بہہ گئی تھی۔

"زندہ رہنا چاہتے ہو؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔ اس کے نرخرے میں حرکت پیدا ہوئی اور اس نے باقاعدہ "ہوں" کی آواز کے ساتھ تھوک نگلتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی دھندلی دھندلی آنکھیں پھیل کر کپ کے پیندے جیسی ہو چلی تھیں۔

"ادھر کہیں فرش پر چاقو پڑا ہے اسے اٹھاؤ۔" میں نے آنکھوں سے تہہ خانے کے اندھیرے گوشے کی طرف اشارہ کیا۔ "میں تمہارے پیچھے ہوں۔ کوئی غلط حرکت کی کوشش نہ کرنا، تم تو ایک ٹھوکر کی مار ہو۔"

○

وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اندھیرے گوشے کی طرف بڑھا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ چاقو کے پھل کی جھلملاہٹ نے بوڑھے سے پہلے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ "وہ پڑا ہے۔" میں نے کہا۔ "اسے اٹھاؤ اور چل کر لڑکی کی بندشیں کاٹو۔ میں ایک بار پھر تنبیہہ کر رہا ہوں کہ کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرنا ورنہ پچھتانے کی مہلت بھی نہیں ملے گی۔" میں محض احتیاطاً اسے خبردار کر رہا تھا ورنہ اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ کوئی چالاکی دکھا سکتا۔ اس کے تھرتھرے جسم پر لرزہ طاری تھا۔

چاقو اٹھا کر وہ ماہتاب کے پاس آیا جس کا چہرہ وحشت سے بگڑا ہوا تھا۔ لیکن اب اس کی آنکھوں میں زندگی کی چمک لوٹ آئی تھی۔ بوڑھا گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس کی رسیاں کاٹنے لگا۔ میری نظر اس کے ہاتھوں کی حرکت پر تھی جو اب بھی اس طرح کانپ رہے تھے کہ مجھے خدشہ محسوس ہونے لگا کہ وہ رسی کی بجائے ماہتاب کے ہاتھ کی کوئی رگ نہ کاٹ دے۔ "سنبھل کر کاٹو۔" میں نے اسے نرم لہجے میں تنبیہہ کی......

ہاتھ کھلتے ہی ماہتاب اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنی کلائیوں کو مسلنے لگی۔ نازک جلد پر رسیوں نے گہرے سرخ نشان ڈال دیئے تھے۔ "ماہتاب! بوڑھے سے چاقو لے لو اور جلدی سے میری رسیاں بھی کاٹ دو۔"

ماہتاب نے میری بندشیں کاٹ ڈالیں تو میں نے اطمینان کی سانس لے کر اپنی کلائیوں کا جائزہ لیا۔ اچھل کود کے دوران بازوؤں کے عضلات بھی زبردست کھنچاؤ کا شکار رہے تھے اور رسیوں کی رگڑ سے میری کلائیاں چھل چکی تھیں۔ ماہتاب سے چاقو لے کر میں نے اسے بند کر کے جیب میں ڈالا۔ پھر دوسرے گوشے میں جا کر ریوالور تلاش کیا اور اسے بھی جیب میں رکھ لیا۔ میں واپس مڑا تو بوڑھا خطبۃ الحواسوں کی طرح راستے میں کھڑا تھا۔ میں نے گریبان سے پکڑ کر اسے فرش سے اوپر اٹھا لیا۔ وہ کٹھ پتلی کی طرح ہوا میں ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔

"تمہیں کتنے پیسے ملے تھے اس کام کے؟" میں نے پوچھا۔

"چار ہزار۔" وہ تھرتھراتی آواز میں بولا۔ "دو ہزار ایڈوانس اور دو ہزار بعد میں ملنے

تھے۔"

میں نے اسے فرش پر گرا دیا اور اس کا کیمرہ اٹھا کر فرش پر دے مارا۔ حالانکہ اس حرکت کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ابھی تو کیمرہ استعمال بھی نہیں ہو پایا تھا۔ لیکن میرے اندر جو غصہ ابل رہا تھا، اسے نکاس کو کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا۔ مدن نے اگر بات میری ذات تک محدود رکھی ہوتی تو شاید مجھے یہ شکایت نہ ہوتی۔ لیکن اس نے ماہتاب پر ہاتھ ڈالنے کے لئے جو گھٹیا اور غلیظ منصوبہ بنایا تھا اس پر میرا دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ اس عمارت میں موجود تمام افراد کے سر ان کے جسموں سے جدا کر ڈالوں تاکہ یہ ذہنی مریض آئندہ معاشرے میں بھٹکنے کے قابل نہ رہیں لیکن میری عقل سرد تھی اور مجھے قتل اور خونریزی سے دامن بچائے رکھنے پر مجبور کر رہی تھی۔ اس لئے میں نے ہر ممکن کوشش کی تھی کہ میرے کسی وار سے کوئی مرنے نہ پائے، صرف وقتی طور پر ناکارہ ہو جائے۔ البتہ مجھے دادا پر مجبوراً خطرناک وار کرنا پڑا تھا کیونکہ میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور کسی دوسرے طریقے سے اس کا میرے قابو میں آنا مشکل تھا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی اور مجھے امید نہیں تھی کہ وہ دوبارہ اپنے پیروں پر چلنے کے قابل ہو سکے گا۔

کیمرے کے ٹکڑے ادھر ادھر بکھر چکے تھے۔ میں نے بوڑھے کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ "تمہیں دو ہزار روپے جو مل چکے ہیں، ان سے دوسرا کیمرہ خرید لینا اور آئندہ ایسا کام نہ کرنا۔ اس بڑھاپے میں تمہیں ایسے کام زیب نہیں دیتے۔"

میں مدن کے قریب پہنچا اور گردن سے پکڑ کر اسے اٹھایا۔ وہ بری طرح کراہ رہا تھا۔ میں نے اس کے منہ پر الٹے ہاتھ کا تھپڑ رسید کیا۔ وہ الٹ کر دیوار کے ساتھ جا لگا۔ اس کے ہونٹوں سے خون کی پتلی سی لکیر بہہ نکلی۔

"یہ دوسرا اور آخری موقع ہے کہ میں تمہیں زندہ چھوڑ رہا ہوں۔ حارث زندہ رہے!" میں نے اپنے سینے میں بھڑکتی ہوئی آگ کو بمشکل دباتے ہوئے کہا۔ "لیکن آئندہ تم نے ایسی جرأت کی تو میں نتائج کی پروا کئے بغیر کم از کم تمہارا بیٹا تو صاف کر ہی دوں گا......" میں نے اس کے گھٹنے پر ٹھوکر رسید کی۔ "اوپر کتنے آدمی ہیں؟"

"کوئی نہیں......" وہ کراہا۔

میں نے ماہتاب کا ہاتھ پکڑا اور سیڑھیوں کی طرف چل پڑا۔ وہ ابھی تک گویا ایک عالم خواب میں چل رہی تھی۔ سیڑھیوں کے اختتام پر چھوٹا سا دروازہ تھا۔ میں نے اس سے سر نکال کر ادھر ادھر دیکھا۔ ہمارے سامنے ایک وسیع ہال تھا جس میں کوئی فرنیچر وغیرہ نہیں تھا۔ دیواروں کا پلستر بھی جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ اس ہال سے گزر کر ہم ایک کمرے میں آ گئے۔ یہ بھی خالی تھا۔ مدن نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اوپر کوئی نہیں ہے۔ اس کمرے سے گزر کر ہم برآمدے میں آ گئے اور تب میں نے دیکھا کہ یہ شہر کے مضافات میں واقع ایک

چھوٹا سا مکان تھا جو کافی مدت سے غیر آباد تھا۔ اس کے چھوٹے سے لان پر جھاڑ جھنکار پھیلا ہوا تھا اور دیواروں پر سیلن زدہ سیاہی سی جمی ہوئی تھی۔

برآمدے کے قریب مدن کی گاڑی کھڑی تھی۔ اس کے اگنیشن میں چابی نہیں تھی۔ میں چاہتا تو واپس جا کر مدن سے چابی لا سکتا تھا مگر میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ "سڑک پر چلتے ہیں۔" میں نے ماہتاب سے کہا میرا خیال ہے اس علاقے سے شہر کے لئے بسیں کوئی بس مل جائے گی۔"

"منصور!" ماہتاب نے میرا ہاتھ تھام کر چلتے ہوئے کہا۔ "مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا کہ ہم اس مصیبت سے نکل آئے ہیں۔" اس کے ہاتھ میں اب بھی ہلکی لرزش تھی۔

"اب تو یقین کر ہی لو ڈیئر!" میں نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ میں نے اسے پہلی مرتبہ ڈیئر کہا تھا۔ اس کے رخساروں پر زندگی کے گلاب ایک بار پھر کھل اٹھے۔ چند قدم چل کر وہ جیسے کچھ سوچ کر شرمیلے لہجے میں بولی ...... "میں ابو سے کہہ کر اس خبیث مدن کو مزہ چکھاؤں گی۔"

"نہیں۔" میں نے کہا۔ "ہمارا مسئلہ تو یہ ہے کہ میں اس معاملے کی ہوا بھی کسی کو لگنے نہیں دینا چاہتا۔ بات خواہ مخواہ پھیل کر بتنگڑ بن جاتی ہے اور تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ ہمارے معاشرے میں اکثر اوقات افواہوں سے لڑکیوں کا مستقبل برباد ہو جاتا ہے۔ مدن میں اگر ذرا سی بھی عقل ہوگی تو آئندہ وہ کوئی حماقت نہیں کرے گا۔"

"میں تو اس کالج میں آ کر پھنس ہی گئی۔" ماہتاب نے اپنا سکارف درست کرتے ہوئے کہا۔ "میں اب سنجیدگی سے سوچ رہی ہوں کہ کسی اور کالج میں داخلہ لے لوں۔"

"اگر تم اس کالج میں نہ آئی ہوتیں تو مجھ سے تمہاری ملاقات کیونکر ہوتی؟" میں نے کہا۔

"ملاقاتیں اگر آسمان پر لکھ دی گئی ہوں تو وہ ہو کر ہی رہتی ہیں۔ مقامات کی تبدیلی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" وہ مسکرائی۔

"بڑا فلسفہ بولا جا رہا ہے۔" میں نے آہستگی سے اس کا ہاتھ دبایا۔

"فلسفہ نہیں یہ حقیقت ہے۔" اس نے شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ پھر یک لخت سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ "وہ بات بیچ ہی میں رہ گئی۔ مجھے واقعی مدن سے خوف آنے لگا ہے۔ وہ ایک آسیب کی طرح میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔"

"آج میرے ہاتھوں اس کا اور اس کے کرائے کے بدمعاشوں کا حشر دیکھنے کے بعد بھی تمہیں اس سے خوف آ رہا ہے؟" میں نے کہا۔ "اس کا مطلب تم مجھ پر چھوڑ دو۔ اب میری ذمے داری ہے۔"

"کبھی سے؟" وہ شرارت سے مسکرائی۔ "ابھی تو تم میرے ابو سے بھی نہیں ملے۔"

"آج مل ہی لیتے ہیں۔ اب تو بے تکلفی بھی پیدا ہو گئی ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ تو ٹھیک ہے۔" اس نے مسکراہٹ کے ساتھ ایک ایک لفظ پر زور دیا۔ ہم اب مین روڈ پر آ پہنچے تھے۔ سورج ڈھلنے لگا تھا۔ میں نے سڑک پر کھڑے ہو کر انتظار کرنے کے بجائے چلتے رہنا بہتر سمجھا۔ کچھ دیر بعد ہم نے پیچھے سے آتی کسی گاڑی کی آواز سنی۔ ہم نے مڑ کر دیکھا وہ کوئی انگریز بوڑھا تھا۔ میں نے فوراً لفٹ کے لئے اشارہ دیا۔ انگریز نے کار روک لی۔

لفٹ لے کر راستے میں ہم انگریز بوڑھے سے ہلکی پھلکی باتیں کرتے ڈیوا لیس تک گئے اور شکریہ ادا کر کے اتر گئے۔ وہاں سے ماہتاب کے گھر کا فاصلہ ایک فرلانگ کا تھا۔ کچھ دیر بعد میں ماہتاب کی رہنمائی میں جس بنگلے میں داخل ہوا وہ زیادہ طویل و عریض تو نہیں لیکن خوبصورت ضرور تھا۔ لان پر ایک ادھیڑ عمر آدمی چھڑی لئے بے چینی سے ادھر ادھر ٹہل رہا تھا۔ یہ غالباً ماہتاب کے ابو تھے۔ حالانکہ ابھی سردی مکمل طور پر نہیں آئی تھی لیکن انہوں نے تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا۔ سر پر ترکی ٹوپی تھی اور ناک پر موٹے موٹے عدسوں کی کمانی دار عینک۔ تقریباً انہی کی عمر کی ایک گوری سنہری میانہ قد خاتون جن کے جسم پر ایک گلدار ساڑھی بہت جچ رہی تھی، ان کے قدم سے قدم ملا کر ٹہلنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وہ دونوں تیز تیز لہجے میں کوئی بات کر رہے تھے۔

"ماہتاب!" ہم پر نظر پڑتے ہی وہ بے کلی سے چلائے اور پھر دونوں ہماری طرف لپکے۔ دونوں نے بیک وقت ماہتاب کو لپٹا لیا۔

"تم کہاں تھیں بیٹی اب تک؟" بڑے میاں نے عینک سنبھالتے ہوئے کہا۔ "ڈرائیور تمہیں لینے گیا تو تمہاری ایک کلاس فیلو نے بتایا کہ تمہیں کون ......"

"ہاں ابو! بدمعاشوں نے میرے لئے یہ جال پھیلایا تھا۔" ماہتاب بولی۔ "وہ تو شکر ہے کہ منصور مجھے اپنی گاڑی میں چھوڑنے چل پڑے تھے۔ راستے میں چار بدمعاشوں نے مجھے اغوا کرنے کی کوشش کی لیکن منصور نے ان سب کو مار بھگایا ...... منصور میرے کلاس فیلو ہیں۔" اس نے میری طرف اشارہ کیا۔ "اور یہ میرے ابو ہیں۔ نواب زادہ سراج علی خان۔"

"اوہ ...... تو اب ان رذالوں کی ایسی غنڈہ گردی ہونے لگی ہے۔ کون تھے وہ بدمعاش؟ میں انہیں چھٹی کا دودھ یاد دلا دوں گا۔" نوابزادہ سراج علی خان نے میری طرف مطلق توجہ دیئے بغیر ہوا میں چھڑی لہراتے ہوئے کہا۔ "یہ ضرور اس کم بخت فیروز خان کی شرارت ہوگی۔ وہ اب ان طریقوں سے میری دولت ہتھیانا چاہتا ہے۔ میں تو سوتیلا ہونے کے باوجود اس کا لحاظ کرتا ہوں ...... اسے ہمیشہ بھائیوں جیسی عزت دیتا رہا ہوں لیکن ......"

"تقریر بعد میں کرتے رہنا ......" بیگم سراج نے ناگواری سے مداخلت کی۔ "بیچے ہلکان ہو رہے ہیں۔ ذرا دیکھو تو کیا ذرا ذرا سے منہ نکلے ہوئے ہیں۔ چلو اندر چلو۔"

"ارے ہاں بھئی ......" سراج صاحب نے میری طرف مصافحے کے لئے پہلے چھڑی اور پھر چونک کر اسے بغل میں دبا کر ہاتھ بڑھایا ـــــ "کیا نام بتایا تھا ان کا بیٹی؟" انھوں نے ماہتاب سے پوچھا۔

"منصور!" ماہتاب نے میری طرف دیکھ کر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"ہاں تو منصور! بہت بہت شکریہ بیٹے کہ تم نے ہماری جان کے لئے اپنی بچی کو میرا مطلب ہے ہماری بچی کے لئے اپنی جان کو خطرے میں ڈالا۔ آج کل کون کسی کے لئے اتنی تکلیف کرتا ہے۔ زمانے سے مروت تو ـــــ"

"پھر تقریر؟" بیگم سراج نے آنکھیں نکالیں ...... "تمہیں تو جوہری کے بجائے لیڈر ہونا چاہئے تھا۔"

"وہ ہمیں اندر لے گئیں۔ ملازمہ کو ایرانی قہوہ لانے کا حکم دیا اور اطمینان سے بیٹھنے کے بعد سارا قصہ پوچھا۔" ماہتاب نے کافی تراجم کے بعد نامعلوم غنڈوں کی کوشش اور میری بہادری کا قصہ سنایا۔ جس کے دوران سراج صاحب بار بار لقمہ دیتے رہے کہ یہ اس بدمعاش محمود کے علاوہ کسی کی حرکت نہیں ہو سکتی اور ان کی بیگم بار بار ان کی تردید کر کے انھیں چپ کرائی رہیں۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ محمود خان کے پاس تو شراب کا ادھا خریدنے کے لئے دس روپے نہیں ہوتے وہ کرائے کے بدمعاشوں کی خدمات کیسے حاصل کر سکتا تھا۔

"میں تو پولیس کو اطلاع دینے والا تھا ـــــ" ماہتاب کے خاموش ہونے پر سراج صاحب بولے ...... "ایس پی سرمدور ناتھ میرا لنگوٹیا ہے شہر کے سارے بدمعاشوں کو لائن حاضر کرا دیتا تو شام تک۔"

"میں تو کہتی ہوں چلو جو کچھ ہوا سو ہوا لیکن خدا نے کرم یہ کیا کہ اس بچے کو فرشتہ رحمت بنا کر ماہتاب کے ساتھ بھیج دیا۔" بیگم سراج جھرجھری لیتے ہوئے بولیں۔ پھر وہ میرے اور میرے گھربار کے متعلق کرید کرید کر پوچھنے لگیں۔

میں نے انھیں بتایا کہ میرے والد کا میرے بچپن ہی میں انتقال ہو چکا ہے۔ والدہ دستکاری کا ایک ادارہ چلاتی ہیں۔ جس کا مالک کوئی اور ہے' باپ کا چھوڑا ہوا تھوڑا سا اثاثہ موجود ہے۔ جس سے میری والدہ گریجویشن کے بعد مجھے بزنس کرانا چاہتی ہیں۔"

"ماشاء اللہ ـــــ ماشاء اللہ۔" میرے خاموش ہوتے ہی سراج صاحب بول اٹھے ـــــ "ابھی ہمارا ارادہ تو گریجویشن کے بعد ماہتاب کو ولایت بھیجنے کا ہے۔ لیکن اس سے پہلے اس کے ہاتھ پیلے ضرور کر دیں گے ...... پھر اگر ان کے میاں کی مرضی ہوئی تو وہ بھی

ساتھ چلے جائیں گے ہم نے تو سوچ رکھا ہے لڑکا خواہ کیسا ہو اور اس کے حالات کیسے بھی ہوں مگر بس وہ غیرت مند اور خاندانی ہو ـــــ دیکھو نا میاں ...... مالی حالات کا کیا ہے۔ یہ تو بدلتے ہی رہتے ہیں۔ آج کوئی انسان پانچ ہزار کماتا ہے کل کو پانچ لاکھ بھی کما سکتا ہے لیکن خاندان نہیں بدلتا۔ جو آج بھی گھٹیا ہے کل بھی گھٹیا رہے گا چاہے اس کے پاس لاکھوں روپیہ آ جائے اور جیب اشرفیوں ہمیشہ جیب اشرفیاں ہی رہے گا خواہ اس کی جیب خالی ہو ـــــ کیوں بیگم؟" انھوں نے تائید طلب نظروں سے بیگم کی طرف دیکھا۔ ماہتاب نے کچھ زیادہ ہی سر جھکا لیا تھا اور قہوے کی چسکیاں لینے لگی تھی۔

"تم تو ہمیشہ فضول کی باتیں لے کر بیٹھ جاتے ہو۔" بیگم نے مصنوعی خفگی سے کہا اور پھر مجھ سے مخاطب ہو گئیں "تمہاری ذات کیا ہے بیٹے؟"

"ہم لوگ مغل ہیں۔" میں نے کہا ــــــ عمیرہ خونی 03036360159

"دیکھا ...... مجھے تو پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ لڑکے کی رگوں میں جوشیلا خون دوڑ رہا ہے۔" سراج صاحب نے بات اچک لی۔ "ایسی چار بدمعاشوں کو تن تنہا بھگا دینے والا مغلوں ہی کی نسل سے ہو سکتا ہے۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو گئے "لیکن میاں مغلوں کے انجام سے دل چھوٹا مت کرنا ...... بادشاہوں کے ساتھ اونچ نیچ ہوتی ہی رہتی ہے۔ اب ہم مغلوں کی تاریخ ......"

"خان صاحب ......" بیگم سراج نے اپنے میاں کو گھورا اور وہ جھینپ کر قہوے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

ماہتاب کے والدین سے ملاقات بڑی دلچسپ رہی رات کو جب میں گھر لوٹا تو میرا موڈ تمام تر تھکن کے باوجود نہایت خوشگوار تھا۔ ماہتاب کے والدین نے مجھے پسند کیا تھا اور حسین مستقبل کی خوشبو میرے قریب آ چکی تھی۔ اگلی صبح میں جلدی گھر سے نکلا اور گاڑی مکینک کے ہاں پہنچا کر کالج چلا گیا۔

اس دن سے میرا تقریباً معمول ہی بن گیا کہ کالج سے واپسی کے بعد شام کو میں ماہتاب کے ہاں چلا جاتا اس کے والدین کی موجودگی میں دلی باتیں تو نہیں ہو سکتی تھیں جیسی دو چاہنے والے کیا کرتے ہیں۔ پھر بھی وقت اچھا گزر جاتا تھا۔

ملک ان دنوں کالج نہیں آ رہا تھا ـــــ تقریباً دس دن بعد وہ کلاس میں نمودار ہوا بڑا ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے کے نقش متدمل ہو چکے تھے لیکن دادا پر بدستور چلبلا تھا۔ پہلا پیریڈ مسٹر بل کا تھا وہ حاضری لینے لگے تو اس کی آواز سن کر چونکے۔ "ملک بھئی تمہاری صحت ٹھیک ہو گئی ہے؟" انھوں نے خالص لہجے میں کہا۔ پھر غور سے اسے دیکھ کر بولے۔ "بھئی تم تو پہلے سے زیادہ صحت مند نظر آ رہے ہو ...... لگتا ہے اچھے دن خوب آرام کیا ہے۔"

"آرام کہاں سر!" مان مسکرا کر بولا۔ "میں تو بڑی بھاگ دوڑ میں لگا ہوا تھا اور ہکوئین کی کرپُڑ سے میری بھاگ دوڑ بڑی نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔ مجھے ایک ایسے راز کا پتہ چلا ہے جس کا جاننا شاید پوری کلاس کے لئے مفید ہو اور خاص کر مس ماہتاب کے لئے۔"
اس نے چبھتی ہوئی نظروں سے ماہتاب کی طرف دیکھا اور اس کی نظروں کے تعاقب سے سب کی نظریں ماہتاب پر مرکوز ہو گئیں۔
مسٹر علی نے کوئی سوال نہیں کیا لیکن مان نے بات جاری رکھی۔ "مس ماہتاب کو یہ سن کر خوشی ہو گی کہ مسٹر منصور جنہیں وہ اپنا جیون ساتھی بنانے کے خواب دیکھ رہی ہیں ایک طوائف کے بیٹے ہیں۔"
پوری کلاس پر چھایا ہوا سناٹا یک لخت کچھ اور گہرا ہو گیا ...... ایک لمحے کے لئے تو گویا کائنات کی گردش تھم گئی ...... میرے جسم سے شاید کسی نے روح کھینچ لی تھی کہ میں کچھ بولتا تو درکنار' پلک تک نہیں جھپکا رہا تھا ...... شاید میرے قدموں تلے کوئی دھماکا سیٹ پھٹ گیا تھا۔ میرے چیتھڑے اڑ چکے تھے اور میری روح اس وقت عالم فانی اور عالم بالا کے درمیان کہیں معلق تھی۔ میں چیخنا چاہتا تھا اور اس کائنات کو تہ و بالا کر دینا چاہتا تھا۔ لیکن اس وقت جسم کا ایک رواں بھی شاید میرے اختیار میں نہیں تھا۔
پھر جیسے دھماکے سے اڑی ہوئی گرد ذرہ ذرہ کر کے دوبارہ زمین پر آ جمع ہوئی۔ میرا بکھرا ہوا وجود یکجا ہوا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس عمل میں چند صدیاں لگی تھیں یا چند لمحے۔ جب مان کا چہرہ میری نظروں میں صاف ہوا تو میں اٹھ کر اس تک پہنچ چکا تھا۔ میں نے اس کا گریبان اس سختی سے پکڑا کہ اس کے پاؤں زمین سے چند انچ اوپر اٹھ گئے۔ کلاس روم میں اس قدر گہرا سناٹا تھا کہ مجھے کسی کی موجودگی کا احساس ہی نہیں ہو رہا تھا۔
"تمہیں یہ کہنے کی جرأت کس طرح ہوئی غلاظت کے کیڑے؟" میرے ہونٹوں سے الفاظ' سانپ کی پھنکار کی طرح نکلے ...... "کیا تمہیں اپنی زندگی بالکل عزیز نہیں؟"
"مجھے مار کر تم حقیقت کو تو نہیں بدل سکتے۔" مان نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ "آج نہیں تو کل لوگوں کو معلوم ہو ہی جائے گا کہ کل کی طوائف اور آج کی نائکہ خانم جو بھٹی کے تارس روڈ پر وہاں کا سب سے بڑا کوٹھا آباد کئے بیٹھی ہے وہ تمہاری ماں ہے۔"
میں نے اسے ڈیسک پر پٹخ دیا ...... وہ چوٹ کی پروا کئے بغیر بولا۔ "تم تو ایسے بن رہے ہو جیسے تم کو اس حقیقت کا علم ہی نہیں تھا ...... کیا کسی بیٹے سے ماں کی اصلیت بھی چھپی رہ سکتی ہے؟"
میں شاید اسے اسی وقت اور اسی جگہ ختم کر دیتا لیکن میرے ذہن کے کسی چور دروازے سے شک کا سپولیا اندر رینگ آیا تھا۔ کوئی بغیر کسی بنیاد کے اس طرح منہ بھر کر اتنی بڑی بات تو نہیں کہہ دیتا اور پھر بچپن سے میرے ذہن کے کسی تاریک گوشے میں پڑا

ایک بھولا بسرا سا سوال میرے سامنے یک لخت عفریت بن کر آ کھڑا ہوا تھا ...... آخر ممی نے آج تک مجھے اپنے ساتھ کیوں نہیں رکھا تھا؟ پھر مجھے اپنی تلاش اور بچپن کی وہ رات یاد آئی جب میں نے ممی کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا تھا۔ "ممی! آپ مجھے اپنے ساتھ کیوں نہیں لے جاتیں؟ کیا میں آپ کو اچھا نہیں لگتا جو آپ مجھے اپنے ساتھ نہیں رکھتیں؟"
مجھے یاد تھا کہ اس سوال پر وہ کس طرح بلک بلک کر رو دی تھیں۔ مجھے آج تک یاد تھا' انہوں نے کہا تھا ...... "ابھی وقت کہاں نہیں بیٹے؟ تمہیں کیا معلوم کہ تمہاری ممی تم سے دور رہ کر کس طرح زندگی گزار رہی ہے۔ ابھی وقت نہیں آیا ...... وقت نہیں آیا ......"
انہیں کس وقت کا انتظار تھا؟ کیا ملازمت پیشہ مائیں اپنے بچوں کو ساتھ نہیں رکھتیں۔ کیا وہ اپنے بچوں کو میری طرح الگ گھر میں نوکروں کے ساتھ رکھ کر اتنے ہی اخراجات کا بوجھ اٹھاتی ہیں؟ شک کے سپولئے نے آن کی آن میں ایسے بیسیوں سوالوں کا زہر میری نس نس میں پھیلا دیا۔ میرے دانت اتنی سختی سے بھنچے ہونٹ پر گڑے ہوئے تھے کہ رستے ہوئے خون کا کھارا پن زبان پر محسوس ہونے لگا تھا۔
میں نے ایک بار پھر مان کو گریبان سے پکڑ کر اٹھایا۔ اس کی اکھڑی ہوئی سانسیں میرے چہرے سے ٹکرا رہی تھیں۔ "سنو مان!" میں نے اپنی روح کی تمام توانائی یکجا کر کے بیٹھی بیٹھی سی آواز میں کہا۔ "اگر یہ بات غلط ہوئی تو یاد رکھنا کہ میں اسی جگہ تمہیں ذبح کر کے تمہاری لاش کا ریشہ ریشہ الگ کر دوں گا۔"
"اگر یہ بات جھوٹ ہوئی تو میں خود ہی اپنی گردن اتار کر تمہارے ہاتھ میں دے دوں گا۔" مان نے اپنا گریبان چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ...... "اور اگر درست ہوئی تو یہاں واپس مت آنا ...... کس منہ سے آؤ گے؟"
میں نے اسے ڈیسک پر پٹخا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ میں نے اپنے عقب میں ماہتاب کی آواز سنی لیکن یہ مجھے بہت دور کی آواز محسوس ہوئی۔ ہزاروں بدروحوں کے قہقہے میرا تعاقب کر رہے تھے' ان میں ماہتاب کی آواز دب کر رہ گئی۔ طوفانی ہوا کے تھپیڑے مجھے دھکیلے لئے جا رہے تھے۔ گراؤنڈ میں پہنچ کر میں نے گاڑی نکالی۔ اب نہ جانے کیوں یک لخت ہی میرے ذہن و دل پر گہرا سناٹا چھا گیا تھا۔ ماحول پر بھی گویا موت کا سا سکوت طاری تھا۔ گراؤنڈ میں درختوں پر اکا دکا پرندوں کی آوازیں مجھے قبرستان سے بلند ہونے والے نوحوں سے مشابہ محسوس ہو رہی تھیں۔
گیٹ پر پہنچ کر ایک لمحے کے لئے گاڑی روک کر میں نے پیچھے دیکھا۔ ستونوں والے برآمدے پر ایک بھگی میں نصب گھڑیال کسی بھتنی چہرے والے عفریت کی طرح جھانک رہا

تھا۔ میں نے کالج کی پروقار عمارت پر ایک الوداعی نظر ڈالی۔ میں اپنی متاع حیات' اپنی محبت یہاں چھوڑے جا رہا تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ میں واپس بھی آ سکوں گا یا نہیں؟ برآمدے میں میں نے ایک بھاگتی ہوئی لڑکی کی جھلک دیکھی شاید وہ ماہتاب ہی تھی۔ میں نے گاڑی تیزی سے آگے بڑھا دی۔ میں اس کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھ میں جرات ہی نہیں تھی۔

پونا سے بمبئی کا فاصلہ تقریباً سو میل تھا۔ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ کالج کی طرف سے تفریحی یا تعلیمی دوروں پر ہم کئی لڑکے' لڑکیاں سڑک کے راستے بمبئی گئے تھے اور کئی مرتبہ لڑکوں سے دبی دبی زبان میں' میں نے فارس روڈ کا تذکرہ سنا تھا لیکن کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک روز دل پر ہزاروں اندیشوں کا بوجھ لئے ادھر کا رخ کرنا پڑے گا۔

میرا جی چاہ رہا تھا کہ سو میل کا یہ سفر کبھی ختم نہ ہو تاکہ اس سفر کے اختتام پر اگر کوئی ہولناک حقیقت واقعی میری منتظر ہے تو میں اس کا سامنا کرنے سے پہلے موت کی آغوش میں پہنچ جاؤں مگر فاصلہ گھٹتا گیا میں اس مجرم کی طرح ڈوبتے دل سے بمبئی کے قریب پہنچ رہا تھا جسے کسی ناکردہ جرم کی سزا میں پھانسی کے تختے کی طرف لے جایا جا رہا ہو

بمبئی پہنچ کر مجھے فارس روڈ پہنچنے کے لئے کئی جگہ راستہ دریافت کرنا پڑا۔ ہر شخص نے ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ مجھے راستہ بتایا۔ جب میں وہاں پہنچا تو بازار حسن میں شام اتر رہی تھی۔ یہ ایک لمبی سی خم دار سڑک تھی۔ جس کے اطراف میں نجانے کتنی گلیاں دائیں بائیں نکل رہی تھیں۔ بنی سنوری طوائفوں کے جھرمٹ ابھی ابھی رہائشی کمروں سے نکل کر اپنے اپنے کوٹھوں کی طرف آ رہے تھے۔ اکثر کوٹھوں کے دروازے کھلے تھے ...... اور سازندے ابھی اپنے ساز درست کر رہے تھے۔ کہیں کہیں سے طبلے کی ادھوری تھپ تھپ' یا ہارمونیم کی "میں میں" کسی زخمی کراہ کی طرح ابھرتی اور معدوم ہو جاتی۔

کسی کسی بالا خانے پر کوئی طوائف بن سنور کر آ کھڑی ہوئی تھی اور عالم' چڑھتی رات کے ریلے میں بہہ کر آنے والے اپنے خریداروں کا انتظار کر رہی تھی۔ پان سگریٹ اور خوشبویات کی دکانوں والے اپنی دکانوں کو آخری رنگ دے رہے تھے۔ یہاں کی دکانیں بھی شاید طوائف والی تھیں' ان کے مالکوں نے شام ڈھلے ہی ان کی تزئین و آرائش شروع کر رکھی تھی۔

پھولوں کے گجروں والے قدم قدم پر کھڑے تھے اور ہر آنے والے کو روک رہے تھے۔ بازار میں خاصی چہل پہل تھی اور مجھے گاڑی چلانے میں دقت ہو رہی تھی۔ ایک چھوٹی سی گلی میں میں نے کئی گاڑیاں کھڑی دیکھیں تو اپنی گاڑی بھی انہی کے ساتھ کھڑی کر

دی اور پیدل چلنے لگا۔ عجیب و غریب حلیوں کے انسان میرا تعاقب کر رہے تھے۔

ان میں کوئی ناٹا تھا' کوئی لمبا کوئی مجہول تھا اور کوئی خوب کھلا ہوا' کوئی سیاہ فام تھا اور کوئی خوب گورا چٹا' کوئی داڑھی مونچھ سے بے نیاز اور کوئی گھنی مونچھوں والا' کسی کی باچھوں سے پان کی پیک بہہ رہی تھی تو کسی کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ کوئی تن کر چل رہا تھا تو کسی کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ لیکن ایک بات ان سب میں مشترک تھی اور وہ یہ کہ سب بھنچی بھنچی سی آواز میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ کبھی ایک میرے قریب آتا اور بظاہر لاتعلقی سے میرے ساتھ چلتے ہوئے کہتا ...... "میاں نوابزادے! میرے ساتھ تشریف لے چلئے۔ رقص ملاحظہ فرمانا ہو یا چاہے شب باشی کا ارادہ ہو' بندہ آپ کو فردوس ارضی میں لے چلے گا ...... فدوی کا دعویٰ ہے کہ آپ دنیا کو بھول جائیں گے۔"

میں اسے گھور کر دیکھتا تو وہ وہیں رک جاتا اور دوسرا میرے ہم قدم ہو جاتا ...... "صاحبزادے! میرے ساتھ چلئے ...... آپ کو چودہ سال کی اس اچھوتی چھیل چھبیلی پاکی نار کے روبرو لے چلوں جس کے حسن بلاخیز نے پوری بمبئی میں تہلکہ مچا رکھا ہے ...... جس کے دروازے پر فلم والوں کی قطار لگی رہتی ہے مگر وہ کہتی ہے فلم والے مجھے کیا دیں گے؟ دو چار لاکھ یا ہزار؟ میرے تو ایک جلوے' ایک ایک ادا کی قیمت لاکھوں سے اوپر ہے۔ میں آپ سے سچ کہہ رہا ہوں' وہ صرف آپ جیسے خوبرو نوجوان نوابزادوں کی قدر دان ہے۔"

میرا جی چاہا کہ چیخ کر اس سے کہوں ...... میں نوابزادہ نہیں ہوں ...... میں ...... میں تو شاید ایک طوائف زادہ ہوں ...... مگر میرے حلق سے آواز نہ نکل سکی۔

وہ میری خاموشی سے مایوس ہو کر پیچھے رہ گیا ...... تو ایک اور میرے شانہ بشانہ چلنے لگا ...... "آپ کو شاید نیلم بائی لاہور والی کی تلاش ہے ...... ہاں صاحب! وہ تو ہے ہی نیلم کا ٹکڑا ...... حسن کے قدر دان جانے دور دور سے اس کی تلاش میں آتے ہیں۔ میرے ساتھ آئیے ...... آپ شاید اجنبی ہیں۔ میں آپ کی رہنمائی کی خدمت انجام دیتا ہوں۔"

یہ سرگوشیاں جب پیچھے رہ گئیں تو میں تھک کر رک گیا۔ اس طرح تم کہاں جا رہے ہو؟ میں نے اپنے آپ سے پوچھا ...... میرے دونوں ہاتھ میرے نیلے بلیزر کی جیبوں میں تھے۔ میں ایک چبوترے کے کنارے بنی ہوئی چھوٹی سی جالی دار دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ خشکی سے میرے ہونٹ پھٹنے لگے تھے۔ میں نے ان پر زبان پھیری' تو سامنے کچھ بلندی پر ایک طویل و عریض کمرے کے وسط میں چاندنی پر بیٹھی ایک لڑکی مسکرائی۔ شاید وہ یہی سمجھی تھی کہ میں نے اسے دیکھ کر ہونٹوں پر زبان پھیری ہے۔

اس کمرے میں اتنی تیز روشنی تھی کہ آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ ایک طرف دیوار

کے ساتھ چھ سات سازندے بیٹھے اپنے ساز درست کر رہے تھے۔ ان کے قریب ہی ایک زرد بیمار سی سانولی سی نائکہ ایک بڑا سا نقرئی پاندان سامنے رکھے گلوری بنا رہی تھی۔ کمرے کے عین وسط میں بڑے فانوس تلے وہ لڑکی تھی۔ اس کی ناک پر نازک سی کمانی نظر کی عینک لگی ہوئی تھی۔ اگر وہ اس کے کوٹھے پر نہ بیٹھی ہوتی تو اپنے معصوم سے بیضوی چہرے اور نظر کی عینک کے ساتھ کوئی ٹیچر یا سوشل ورکر معلوم ہوتی۔ میری طرف مسکرا کر دیکھنے کے بعد اس نے عینک اتار کر نائکہ کو تھما دی اور پیروں میں گھنگرو باندھنے لگی۔ میں وہاں سے آگے بڑھ گیا۔

مجھے احساس تھا کہ اگر اس کوٹھے کا جس کی مجھے تلاش تھی واقعی کوئی وجود ہے تو وہ یوں گھومتے پھرتے رہنے سے مجھے نہیں ملے گا۔ میں سگریٹ پان کی ایک دکان پر رک گیا۔ اس دکان پر کوئی گاہک نہیں تھا۔ دکاندار نے شاطرانہ سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ عزیزہ خانم کا کوٹھا کس طرف ہے لیکن یہ الفاظ میرے حلق میں اٹک کر رہ گئے تھے۔

"فرمایئے صاحب کیا پیش کروں؟ پان سگریٹ' لیمن یا کچھ اور۔" آخری دو لفظوں پر اس نے زور دیا تھا۔ مجھے خاموش دیکھ کر وہ ایک آنکھ دبا کر بولا ۔۔۔۔ "اگر اچھا وقت گزارنا ہے تو یہ بغل والی گلی میں چلے جایئے بڑی طرحدار اور الھڑ لڑکیاں ہیں۔ باقی سب کو بھول جایئے گا۔"

"ایک لیمن دے دو۔" بالآخر میں نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا ۔۔۔۔ قدرے مایوسی کے ساتھ اس نے آئس بکس سے لیمن کی ایک بوتل نکال کر کھولی اور میری طرف بڑھا دی۔ تلخ و ترش لیمن کی پوری بوتل تقریباً ایک ہی سانس میں' میں نے معدے میں انڈیل لی۔ حلق کچھ تر ہوا تو پیسے دینے کے بعد اٹک اٹک کر پوچھا۔ "عزیزہ خانم ۔۔۔۔ کا ۔۔۔۔ کوٹھا ۔۔۔۔ کس طرف ہے؟"

"اوہ ۔۔۔۔" دکاندار نے سر تا پا میرا جائزہ لیا ۔۔۔۔ "تو آپ کو ان کی تلاش ہے۔ میں تو پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ آپ کوئی نوابزادے ہیں۔ چھوٹے موٹے لوگ تو عزیزہ خانم کے کوٹھے کی سیڑھیاں ہی نہیں چڑھ سکتے۔ آپ یوں کیجیے ۔۔۔۔ سیدھے چلے جایئے تقریباً بیس قدم چل کر دائیں ہاتھ پر پانی کی ایک سبیل نظر آئے گی۔ اس کے ساتھ ہی مڑ جایئے۔ دائیں ہاتھ پر ہی سبز اور گلابی رنگ و روغن والی ایک عمارت دور سے چمکتی نظر آئے گی۔ بالکونی میں مختلف طرز کے فانوس لگے ہوں گے جن سے رنگ برنگی روشنیاں پھوٹ رہی ہوں گی۔ اس عمارت کی اوپر کی پوری منزل پر عزیزہ خانم کا بالا خانہ ہے۔"

میں نے جب اس سے سوال کیا تھا تو میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ موہوم سی امید مدھم سے سانس لے رہی تھی کہ وہ جواب میں کہہ دے گا ۔۔۔۔ "عزیزہ خانم نام کی عورت پورے بازار حسن میں نہیں ہے ۔۔۔۔" لیکن نہیں ۔۔۔۔ جس کا ڈر تھا' اس نے وہی جواب دیا۔ اس کی آواز زہریلے تیر کی طرح میرے کانوں کے پردوں کو چھید رہی تھی۔ میں تیزی سے اس کی بتائی ہوئی سمت میں بڑھ گیا۔

اس عظیم الشان بالا خانے کے سامنے کھڑے ہو کر میں نے اوپر دیکھا۔ بالکونی میں بھی فانوس لگے ہوئے تھے اور ان کی جھلملاہٹ کھڑکیوں سے چھنتی رنگ رنگا روشنیوں میں مدغم ہو رہی تھی۔ بالکونی میں' میں نے ایک سرو قد لڑکی کو زرق برق لباس میں ایک دروازے سے دوسرے دروازے کی طرف جاتے دیکھا۔ اس کے بالوں کے اونچے جوڑے میں جھلملاتے موتیوں کی مالا لپٹی ہوئی تھی اور دور سے ایسا لگتا تھا جیسے اس نے سر پر تاج رکھا ہوا ہو۔ بالکونی میں چلتے چلتے اس نے ایک عجیب شان بے نیازی سے گلی پر اچٹتی سی نظر ڈالی اور دوسرے دروازے کے پیچھے غائب ہو گئی۔

میں نے سر جھٹک کر اپنے حواس پر چھائی دھند سے چھٹکارا پانے کی کوشش کی' اپنی توانائیوں کو مجتمع کیا اور بالا خانے کی سیڑھیوں پر قدم رکھ دیا۔ سیڑھیوں کے اختتام پر ایک وسیع برآمدہ تھا۔ برآمدے میں کھڑی دو خادمائیں میری طرف لپک کر آئیں۔ ایک نے میری بلائیں لیتے ہوئے' والہانہ اور شاطرانہ لہجے میں مجھے خوش آمدید کہتے ہوئے ایک ننھی سی شیشی سے کوئی خوشبو میرے لباس پر لگائی۔ دوسری نے موتیے کی کلیوں کی ایک مالا میرے گلے میں ڈالی اور میری جوتیاں لینے کے لئے میرے پیروں کی طرف جھکی۔ میں نے مالا گلے سے نکال کر اس کے کندھے پر ڈال دی اور پاؤں پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا ۔۔۔۔ "یہ تکلیف نہ کرو بڑی بی! میں مجرا دیکھنے نہیں آیا ۔۔۔۔" دیر تک خاموش رہنے کے بعد میری جو آواز نکلی وہ خود مجھے بھی اجنبی سی محسوس ہوئی۔

میں سامنے ہال کے دروازے کی طرف بڑھا تو دائیں طرف ایک چھوٹے سے کمرے میں چار پانچ [illegible] آدمی تاش کھیلتے نظر آئے۔ انہوں نے میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ ہال کے دروازے پر پہنچ کر میں رک گیا۔ طویل و عریض ہال میں چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ دیواروں کے ساتھ گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ ایک طرف سفید براق چاندنی پر آٹھ دس سازندے بیٹھے اپنے سازوں کے سر تال درست کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک کے سامنے وہی لڑکی جسے میں نے بالکونی میں دیکھا تھا سرخ انگیا' گھیردار چوڑی دار پاجامے میں دو زانو بیٹھی کسی غزل کی مشق کر رہی تھی۔ دیوار کے ساتھ دو نوعمر لڑکیاں ایک مجلد کتاب کھولے بیٹھی تھیں اور آپس میں کچھ بحث کر رہی تھیں۔

یک لخت ساز خاموش ہو گئے اور اس کے ساتھ ہی باتوں کی بھنبھناہٹ بھی ختم ہو گئی۔ ایک لمحے کے لئے گویا کائنات خاموش ہو گئی۔ وہ لڑکی جو غزل کی مشق کر رہی تھی' اٹھی اور فرشی سلام کرتے ہوئے بولی۔ "تشریف لایئے سرکار ۔۔۔۔"

"معزز خانم کہاں ہیں؟" میرے حلق سے شاید کسی اور کی آواز نکلی۔ "وہ آج تشریف نہیں لائیں۔" لڑکی نے مترنم آواز میں کہا۔ "ان کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔ گھر ہی آرام کر رہی ہیں۔"

"گھر کہاں ہے؟" میں نے اکھڑے اکھڑے لہجے میں پوچھا۔

"منجھوارے ہی میں ہے۔" لڑکی نے الجھن آمیز نظروں سے میرا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "اگر کوئی ضروری کام ہے تو پیغام بھجوا دیتے ہیں۔ آپ تشریف رکھئے۔"

"مجھے گھر پہنچوا دیجئے۔ میں ان کے لئے ایک ضروری پیغام لے کر آیا ہوں۔" اس بازار میں گھستے ہی مجھے مصلحت کوشی اور دروغ گوئی آ گئی تھی۔

"بی مغلانی!" اس لڑکی نے باآواز بلند پکارا ــــ میرے عقب سے وہی بڑھیا نکل آئی جس نے میرے کپڑوں پر خوشبو لگائی تھی۔ "انہیں خانم کے پاس لے جاؤ۔" لڑکی نے اسے حکم دیا۔ بڑھیا نے مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ بالا خانے سے اتر کر ہم گلی میں آئے۔ چند قدم چل کر بڑھیا دائیں طرف مڑ گئی اور ہم بالا خانے کے پچھواڑے آ گئے۔

بڑھیا ایک ایسے مکان کی سیڑھیاں چڑھنے لگی جس کی دیواروں کا پلستر کہیں کہیں سے اکھڑ رہا تھا ــــ سیڑھیوں کے اختتام پر منقش لکڑی کا ایک بلند اور محرابی دروازہ تھا جس کی چوکھٹ کے ساتھ دائیں بائیں دو چھوٹے چھوٹے ستونوں پر پتھر سے تراشیدہ دو شیر بیٹھے تھے۔ ملازمہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ ڈیوڑھی سے گزر کر ہم ایک وسیع دالان میں پہنچے جہاں چاروں طرف کمروں کے دروازے نظر آ رہے تھے۔ ایک دروازہ کھلا تھا اور اس پر حریری پردے لہرا رہے تھے جن سے مدھم سی روشنی چھن چھن کر دالان میں آ رہی تھی۔

"وہ خانم کی خوابگاہ ہے۔" بڑھیا نے دور ہی رک کر اشارے سے مجھے بتایا۔ "تم دروازے پر دستک دینا۔ اگر وہ اجازت دیں تو اندر چلے جانا۔" وہ واپس جانے کے لئے مڑ گئی۔

میں نے آگے بڑھ کر کھلے دروازے پر دستک دی اور دوسرے ہی لمحے میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا جب میں نے ممی کی آواز سنی "کون ہے؟ آ جاؤ۔"

ایک ہاتھ سے پردہ اٹھا کر میں نے اندر قدم رکھا۔ وہ میری طرف پشت کئے کھڑکی کی چوکھٹ پر کہنیاں ٹکائے کھڑی تھیں۔ ان کے جسم پر مصری عورتوں کا سا ڈھیلا ڈھالا ریشمی لبادہ تھا اور سلیقے سے [illegible] ستھرے بال کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ ان کی کمر کسی انجانے بوجھ سے جھکی ہوئی تھی۔ بڑی آہستگی سے وہ میری طرف مڑیں اور میرا دل یک لخت کرب کے عمیق سمندر میں ڈوب گیا۔

☆☆☆☆

چند دن قبل میں نے انہیں دیکھا تھا۔ اس وقت وہ مکمل نظر آ رہی تھیں مگر اب تو ان کا چہرہ بالکل ہی زرد پڑ چکا تھا اور آنکھوں کے گرد حلقے نمودار ہو چکے تھے۔ اب مجھے دیکھ کر ان کے چہرے سے زندگی کی آخری رمق تک معدوم ہو گئی۔ نہ جانے کتنی دیر تک ہم ساکت کھڑے "پلکیں جھپکائے بغیر" ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر انہوں نے یوں لڑکھڑا کر قریبی مسہری کے سرہانے کے تختے کا سہارا لیا۔ گویا ان کی ٹانگوں نے ان کا بوجھ سہارنے سے انکار کر دیا ہو۔

"مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا۔" ان کے کپکپاتے ہونٹوں سے آواز نکلی جو کمرے کے پھیلاؤ کی سرسراہٹ سے بھی مدھم تھی کہ ایک نہ ایک روز تم یونہی اچانک اپنی آنکھوں میں ہزاروں سوال لئے میرے سامنے آ کھڑے ہو گے۔"

"ممی ـــ!" اس ایک لفظ کے ساتھ ہی میری آواز رندھ کر رہ گئی۔ اس ایک لفظ میں میری زندگی کا "نچوڑ" تحیر اور کرب سمٹ آیا تھا۔ میں کہنا چاہتا تھا "ممی! اتنے بڑے راز زندگی بھر کے لئے تو چھپائے نہیں جا سکتے تھے پھر آپ نے کیا سوچ کر اپنے جگر گوشے کو اب تک ایک دور [illegible] اندھیری دنیا میں رکھا اور اس کے معصوم بچپن اور کنواری خواہشوں کا سودا بھرے بازار میں کر ڈالا؟ یہ رسوائی بچپن ہی سے ساتھ ملتی تو شاید اتنی گراں نہ گزرتی مگر اس اچانک انکشاف نے تو میرا حال اس چکور کا سا کر دیا جو چاند کی طرف اڑتے اڑتے یک لخت کھائی میں آ گرا ہو۔"

اچانک ممی نے سینے پر ہاتھ رکھ لیا اور کسی اندرونی تکلیف سے ان کے چہرے کے عضلات کھنچ کر رہ گئے۔ گردن کی نسیں پھول گئیں وہ مسہری کی پٹی پر بیٹھ گئیں۔ کانپتے ہاتھ سے انہوں نے سرہانے کی طرف رکھی ایک تپائی سے ایک [illegible] کھینچ کر اسے کھولا اور اس میں سے چمڑے کی سیاہ جلد والی ایک چھوٹی سی کتاب نکالی۔ پھر مجھے اشارے سے قریب بلانا چاہا مگر میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ تب وہ مسہری پر [illegible] ہو گئیں۔ ان کے چہرے پر پسینے کے قطرات نمودار ہو رہے تھے اور سینے پر بائیں ہاتھ کی گرفت سخت ہوتی جا رہی تھی۔ گویا کوئی انتہائی اور ناقابل برداشت درد ہو رہا ہو۔ تب میں ان کے قریب چلا گیا۔ انہوں نے وہ کتاب سی میری پتلون کی جیب میں ڈال دی۔

"اس نوٹ بک میں ــــ میں نے اپنی زندگی کی کل کہانی رقم کر رکھی ہے منصور!" انہوں نے لرزتے لہجے میں کہا ــــ "وہ سب کچھ جو میں نے تمہارے متعلق لکھا تھا ــــ سوچا تو میں نے کچھ اور تھا لیکن پھر ــــ اسی خیال سے یہ صفحے لکھ کر رکھ لیا تھا ــــ کہ شاید کل اور وقت اسی طرح ــــ تم میری دہلیز تک پہنچو ــــ مجھ سے ملنے کا وقت نہ ہو یا تمہارے زبان پر طنز و طعن کا قفل ہو۔ میری اس خود نوشت

میں تمہیں اپنے ہر سوال کا جواب مل جائے گا اور پھر شاید میں تمہاری نظروں میں ...... گنہگار نہ رہوں۔ ان میں میری وصیت بھی لکھی ہے جو تمہارے لئے بہت بھاری ذمہ داری ہو گی ...... لیکن اگر تم نے اس پر عمل نہ کیا ...... تب بھی مجھے تم سے کوئی شکوہ نہ ہو گا البتہ میری روح بے چین رہے گی ...... آسمانوں میں بھٹکتی پھرے گی ...... تو ...... یہ دل کا درد......

ان کی گردن کی نسیں اور زیادہ پھول گئیں اور سانس گویا سینے میں اٹکنے لگی۔ ذرا سانس آئی تو وہ آنکھیں کھول کر مشکل سے انداز میں مسکرائیں اور مجھے اپنے اوپر جھکا دیکھ کر ڈوبتی آواز میں بولیں ...... "مجھے یوں اجنبیت سے نہ دیکھو بیٹا ...... میرے سینے پر سر رکھ دو ...... میں اب بہت تھک گئی ہوں ...... مجھے معاف کر دینا بیٹا ...... میں تمہیں منزل پر نہیں پہنچا سکی۔"

غیر ارادی انداز میں میں نے ان کے سینے پر سر رکھ دیا۔ ان کا ہاتھ پیچھے سے بہت کر میرے سر پر ٹک گیا۔ ایک لمحے کے لئے میں سب کچھ بھول گیا۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کا رکا ہوا سیلاب امڈ پڑا۔ دفعتہ" ممی کا جسم یک بارگی زور سے کپکپایا اور میرے بالوں میں رینگتا ہوا ان کا مرتعش ہاتھ پھسلا اور پھر بازو مسہری سے نیچے جھول گیا۔

میں ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا ...... ممی کی نیم وا آنکھیں ساکت ہو چکی تھیں ...... اور ہونٹوں پر ایک موہوم مسکراہٹ منجمد تھی۔ میں نے انہیں جھنجھوڑا تو ان کی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی پھر میں نے ان کی دھڑکن سننے کی کوشش کی دھڑکن بھی معدوم تھی۔ ایک لمحے کے لئے میں اس بچے کی طرح کھڑا رہ گیا جسے کوئی لق و دق صحرا میں تنہا چھوڑ گیا ہو۔ کمرے کی اونچی چھت میرے لئے دھوپ کا سائبان بن گئی اور قالین تلے دبا ہوا فرش ریگزار......

اس ایک ہی لمحے میں مجھے احساس ہو گیا کہ ماں کے مرنے کے بعد انسان دنیا میں کتنا بے اماں رہ جاتا ہے خواہ ماں طوائف ہی کیوں نہ ہو۔ خواہ وہ برسوں میں صرف ایک ہی بار ملنے کیوں نہ آتی ہو، چند لمحے پہلے میں یہ سوچ کر آیا تھا کہ اگر ماں کی پیشانی پر اس بازار کا داغ میرے لئے ناقابل برداشت ہوا تو اسے قتل کر دوں گا اور اب میرا جی چاہ رہا تھا کہ دھاڑیں مار مار کر روؤں۔

دفعتہ" پردہ ایک جھٹکے سے ایک طرف کو سرکا اور مہ لقا اور سازندوں کی طرح دندناتے ہوئے چار جسیم و تنومند افراد کمرے میں گھس آئے یہ "جالا" وہی تھے جنہیں میں نے ناچ خانے پر تاش کھیلتے دیکھا تھا ان کے چوڑے چکلے چہرے آگ پر رکھی تانبے کی پتیلیوں کی طرح دہک رہے تھے اور آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ ان میں سے ایک لپک کر ممی کے قریب پہنچ

آ کر اس نے ان کی نبض دیکھی۔ پپوٹے الٹ کر آنکھوں کی پتلیاں دیکھیں، ناک پر ہاتھ رکھ کر سانس محسوس کرنے کی کوشش کی، پھر میری طرف مڑا اور خون خوار لہجے میں بولا۔ "تم نے خانم کو کیوں مار دیا؟"

میں نے کوئی جواب نہ دیا میں دیوار سے لگا کھڑا تھا اور دنیا کی ہر چیز مجھے بے معنی و بے وقعت محسوس ہو رہی تھی۔ ان چاروں کا وجود بھی نہایت غیر اہم لگ رہا تھا۔ سوال کرنے والے نے آگے بڑھ کر مجھے گریبان سے پکڑ کر جھٹکا دیا۔ "بولتے کیوں نہیں ...... کیوں مارا ہے تم نے خانم کو؟" وہ دہاڑا اس کے موٹے موٹے سرخ ہونٹ تھوک آلود تھے

میں نے اس کی معمولی سی کلائی پر مضبوطی سے ہاتھ ڈالا اور گریبان سے اس کا ہاتھ آہستگی سے ہٹا دیا۔ میں حیران تھا کہ کیا اسے میرے چہرے پر ماں کی موت کا دکھ یا آنسوؤں کی نمی نظر نہیں آ رہی تھی جو وہ مجھے قاتل سمجھ رہا تھا۔ شاید میرے آنسو خشک ہو چکے تھے اور چہرہ پتھرا گیا تھا۔

"میں نے انہیں نہیں مارا۔" میرے جسم کے شکستہ ساز سے بالآخر آواز نکلی۔ "میں انہیں مار بھی کیسے سکتا ہوں ...... میں ان کا بیٹا ہوں۔"

"بیٹا؟" اس نے دہرایا اور دنیا بھر کی بے یقینی اس کے لہجے میں سمٹ آئی۔ "اس بازار کی عورتوں میں بیٹوں کو جنم دینے کا رواج نہیں آیا۔ سچ سچ بتاؤ تم کس کے آدمی ہو" یک لخت وہ گرج اٹھا اور اس نے ساتھ ہی میرے منہ پر الٹے ہاتھ کا تھپڑ رسید کیا یہ تھپڑ کسی عام آدمی کو پڑا ہوتا تو وہ چکرا کر گر جاتا۔

میرے نچلے ہونٹ پر حرارت آمیز سی نمی پھوٹ پڑی۔ میں نے ہونٹوں پر زبان پھیری تو خون کی نمکینی کا احساس ہوا۔ رخسار پر ہاتھ رکھے رکھے میں نے اب گویا حقیقت کی دنیا میں لوٹ کر ان کا جائزہ لیا۔ ان میں ایک دروازے پر جا کھڑا تھا۔ ایک مسہری کے قریب تھا ایک نے کھلی جگہ سنبھال رکھی تھی۔ میرے جسم کی نس نس شریان سے چنگاریاں سی پھوٹیں اور خون کے بہاؤ کے ساتھ گویا کنپٹیوں میں جمع ہونے لگیں ...... اور دوسرے ہی لمحے ذہن میں جیسے کوئی بارود خانہ پھٹ پڑا۔ میں نے اتنی قوت سے اپنے مقابل کی پیشانی پر گھونسا رسید کیا کہ اس کی جگہ کوئی عام سا آدمی ہوتا تو دوسری سانس نہ لیتا۔ اس نے ایک بار پیچھے کو جھکولا کھایا پھر کٹے ہوئے شہتیر کی طرح ڈھیر ہو گیا۔

باقی تینوں عجیب و غریب آوازیں نکالتے مجھ پر جھپٹے ان میں سے ایک کے بال شانے لمبے تھے۔ ان بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر میں نے اس کا سر دیوار سے ٹکرا دیا۔ وہ مجھ سے بری طرح لپٹ پڑے تھے۔ ان میں سے ایک میری کمر کے گرد شکنجہ ڈال کر مجھے گویا تنکے کی طرح درمیان سے توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان کے حلق سے بھونڈی غراہٹیں

فارغ ہو رہی تھیں۔

میرے پاؤں زمین سے اکھڑنے لگے تو میں نے اس کے کندھے پر کراٹے کا ہاتھ مارا۔ میری کمر تو اس کی گرفت سے چھوٹ گئی لیکن عین اسی لمحے میں نے دوسرے کو نیفے سے ایک لمبا سا خوفناک چھرا نکالتے دیکھا۔ میں ایک قدم پیچھے ہٹ کر دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ پھر میں نے وہ چھرا اس کے ساتھی کے جسم میں پیوست ہوتے دیکھا اگر میں درمیان سے نہ ہٹتا تو اس کا ہدف میں ہی بنتا۔ کمرے میں ایک دلدوز چیخ گونجی۔ چھرے والے نے چھرا جلدی سے واپس کھینچ لیا ...... اور سکتے کے عالم میں اس کے خون آلود پھل کو گھورنے لگا دوسرا شخص دونوں ہاتھوں سے پیٹ تھامے اوندھے منہ قالین پر ڈھیر ہو گیا۔ اسی لمحے کسی نے پردہ ہٹا کر اندر جھانکا اور فوراً ہی غائب ہو گیا۔ ساتھ ہی باہر شور بلند ہونے لگا ...... "خون ...... قتل ...... دوڑو ...... بھاگو ...... سرفروش قتل ہو گیا۔"

میں باہر کو لپکا تو وہ شخص گویا سحر زدگی سی کیفیت سے جاگ اٹھا اور وحشیانہ انداز میں چھرے سے گویا ہوا کو کاٹتے ہوئے مجھ پر جھپٹا۔ اس پر خون سوار ہو چکا تھا۔ میں نے جھکائی دے کر اس کا ایک وار خالی کر دیا اور وہ اپنے زور میں لڑھکتا چلا گیا۔ اپنے عقب میں میں نے ایک بھیانک خرخراہٹ سنی۔ اس لمحے میں دروازے پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ شخص نہ جانے کس طرح اوندھے منہ گرا تھا کہ اس کا چھرا اس کے حلق میں گھس کر گدی سے نکل آیا تھا۔ وہ بری طرح ہاتھ پاؤں پٹخ رہا تھا۔

باہر سیڑھیوں پر بہت سے جوتوں کی دھپ دھپ سنائی دے رہی تھی۔ پھر سپاہیوں کی وسلیں گونجنے لگیں۔ میں نے پردہ ہٹایا ہی تھا کہ سیڑھیوں پر لال ٹوپیوں کی جھلک دیکھ کر پلٹ پڑا۔ اس افراتفری کے عالم میں بھی میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ بازار حسن میں پولیس کتنی مستعد ہوتی ہے۔

دریچہ کمرہ اس وقت میرے لئے ایک چور دروازہ بن چکا تھا۔ میں دوڑ کر کھڑکی تک گیا اور نیچے جھانک کر دیکھا۔ دس بارہ فٹ نیچے ایک دیوار کے ساتھ ہی ایک کچی چھت آگے کو نکلی ہوئی تھی۔ معمولی سی چوڑائی کی یہ چھت دیوار کے ساتھ ساتھ کافی دور تک چلی گئی تھی اور اندھیرے میں نجانے کس عمارت کے ساتھ مل رہی تھی۔ میں اچک کر کھڑکی پر چڑھا اور پنجوں کے بل اس چھت پر کود گیا۔ میں بائیں طرف دوڑ پڑا۔ دائیں طرف جانے میں اندیشہ تھا کہ میں بالاخانے کے آس پاس نہ دھر لیا جاؤں۔

تقریباً بیس قدم دوڑنے کے بعد میں تیکھی روشنی میں آ گیا۔ میرے دائیں طرف نشیب میں ایک گلی شروع ہو گئی تھی جس کی دکانوں کی روشنی اوپر تک پہنچ رہی تھی۔ میں دیوار کے ساتھ جھک کر چلنے لگا۔ دفعتاً میرا پاؤں کسی خلاء میں اتر گیا۔ اگر میں فوراً نہ سنبھلتا تو بری طرح اوندھے منہ گرتا۔ یہ چھت میں بنا ہوا کسی تاریک کمرے کا چھوٹا سا روشن دان تھا۔ اسے پھلانگ کر میں چند قدم آگے پہنچا تو کسی مکان کی دیوار سامنے آ گئی۔ دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی۔ میں نے اچک کر منڈیر پر ہاتھ جمائے اور جسم کو بل دے کر اوپر پہنچ گیا۔ یہ ایک پکی چھت تھی جس پر ایک طرف کبوتروں کا ڈربہ بنا ہوا تھا۔ دیوار کے ساتھ بانس پر کبوتروں کا اڈہ بھی لگا ہوا تھا۔

زینے پر چڑھ کر میں دوسری چھت پر کود گیا۔ اس سے آگے کوئی مکان نہیں تھا۔ سامنے گلی آتی تھی۔ میرے عقب میں دور تک سیٹیاں گونج رہی تھیں۔ ان کی بھنک مدھم سی آواز یہاں تک پہنچ رہی تھی تاہم اس سے مجھ پر کوئی خاص گھبراہٹ نہیں تھی اور نہ ہی سانس پھولی ہوئی تھی۔ یہ بھاگ دوڑ میرے لئے معمولی سی ورزش تھی۔

گھپ اندھیرے میں میں نے چھت کا جائزہ لیا۔ یہاں لوہے کے دو پلنگ اور چند بھدی سی کرسیاں پڑی تھیں۔ الگنی پر چند کپڑے لٹکے ہوئے تھے جو مدھم سی ہوا میں سرسرا رہے تھے۔ آنگن کے قریب ہی سے سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔ میں نے ایک نظر پیچھے دیکھا اور سیڑھیاں اترنے لگا۔ ایک منزل نیچے آ کر سیڑھیاں اچانک ہی ختم ہو گئیں۔ اور میں نے اپنے آپ کو ایک لمبے کمرے میں کھڑا پایا جس میں کئی کھڑکیاں تھیں اور ان پر چقیں لٹکی ہوئی تھیں۔ ایک گوشے میں ایک مسہری پر ایک لڑکی گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ میری آہٹ سن کر اس نے کتاب بڑے اطمینان سے چہرے کے سامنے سے ہٹائی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ مجھے یوں اچانک کمرے میں پا کر نہ تو اس کے ہاتھ سے کتاب چھوٹ کر گری اور نہ ہی اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں۔ کتاب اس نے نہایت سکون سے ایک طرف رکھ دی اور میرا سر تا پا جائزہ لینے لگی۔

وہ عجیب سی لڑکی تھی۔ اس کے حسن میں کچے آموں کا سا رسیلا پن تھا۔ بھرا بھرا سا چہرہ، معنی معنی سیاہ تیکھی سی آنکھیں، مسہری سے نیچے تک لٹکی ہوئی چمکیلے سیاہ بالوں کی مخفی سی چوٹی، لمبی مائل جسم۔ لیکن اس لمبی میں بھی عجیب غضب کا تناسب تھا۔ مسہری پر لیٹی وہ خاصی طویل القامت لگ رہی تھی لیکن جب اٹھ کر بیٹھی تو گولائیوں میں سمٹ گئی۔

"کیا کر کے آئے ہو؟" اس نے شرارت بھری مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔ اس کی آواز میں گھونگھروؤں والی کھنک تھی۔

"کچھ نہیں۔" میں نے ایک لمحے کے توقف سے جواب دیا۔ "البتہ اگر نہ بھاگتا تو شاید جرم بے گناہی میں پھنس جاتا۔"

"پھنس تو اب بھی سکتے ہو۔" میں حیران تھا کہ وہ اب بھی مسکرا رہی تھی۔

"فی الحال مجھے یہ اندیشہ محسوس نہیں ہو رہا ہے۔" میں نے لاپروائی سے کہا اور میری یہ لاپروائی لوافری پر مبنی نہیں تھی۔ "لیکن تم نے مجھے دیکھتے ہی یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں کچھ کر کے آیا ہوں؟ میرا خیال ہے میرا حلیہ کچھ ایسا بگڑا ہوا تو نہیں ہے۔"

"بات حلیے کی نہیں اتفاقات کی ہے۔" اس نے کہنی گاؤ تکیے پر ٹکا لی۔ "اب تو مجھے یوں محسوس ہونے لگا ہے جیسے میں کسی کہانی کا کردار ہوں۔ یہ تیسرا موقع ہے کہ کوئی اس طرح سیڑھیوں کے راستے میرے کمرے میں آیا ہے۔ ایک مرتبہ گھنٹہ گھر کا ایک پاگل آیا تھا جس نے ایک طوائف کو گلا گھونٹ کر مارنے کی کوشش کی تھی اور اس کے شور مچانے پر بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ ایک مرتبہ ایک مارواڑی سیٹھ آیا تھا جس نے نشے میں کسی تماش بین کو قتل کر دیا تھا۔ خون دیکھ کر اس کا سارا نشہ ہرن ہو گیا تھا اور اس نے نہ جانے کہاں سے بھاگنے کا راستہ ڈھونڈ لیا تھا۔ اب تیسرے تم آئے ہو۔ عجیب اتفاق در اتفاق نہیں ہے کہ ان تین موقعوں پر میں اسی مسہری پر موجود تھی؟ حالانکہ عام طور پر میں روزانہ اس وقت اس کمرے میں نہیں ہوتی۔ مجھے لگتا ہے کہ آئندہ میں جب بھی اس وقت یہاں لیٹا کروں گی تو مجھے انتظار رہا کرے گا کہ ابھی کوئی بانکا ترچھا سیڑھیوں کے راستے آ جائے گا۔" پھر وہ خود ہی گویا اس تصور سے ہنس پڑی۔

"تم سے پہلے آنے والوں کا کیا انجام ہوا تھا؟" میں نے دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں ٹھونستے ہوئے پوچھا۔

"پکڑے گئے تھے۔ میں نے انہیں پکڑوا دیا تھا۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

"لیکن مجھے پکڑوانے کی کوشش نہ کرنا۔" اب میں بھی مسکرا دیا۔ "کیونکہ میں نے کچھ نہیں کیا اور نہ میں اچھا کانچا گیا ہوں اور مجھے ایسے لوگ بالکل پسند نہیں جو بے گناہوں کے ساتھ کمین کو بھی پیسنے کی کوشش کریں۔" پھر میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "ویسے بائی دی وے تم کون ہو؟"

"اس بازار میں مستور عورت کیا ہو سکتی ہے؟" اس نے گویا میری کم عقلی پر ماتم کرتے ہوئے کہا۔

"اگر تم اس بازار کی ہو تو اس وقت کمرے میں لیٹی کیا کر رہی ہو؟ تمہیں تو اس وقت کوٹھے پر ہونا چاہیے تھا۔" میں نے اپنے سوال کا جواز پیش کیا۔

"میں ابھی زیر تربیت ہوں اور مہینے میں کچھ دن میرے آرام کے ہوتے ہیں۔ سمجھے؟ اور تم کون ہو؟" اس نے ایک بار پھر گہری نظروں سے میرا جائزہ لیا۔

"طوائف زادہ۔" میں کہنے لگا تھا لیکن میری زبان نے ساتھ نہ دیا۔ میرے حلق میں یک لخت کڑواہٹ سی گھل گئی اور میرے حواس پر ایک بار پھر اس صدمے کی دبیز تیرگی چھا گئی جس سے میں گزر کر آیا تھا۔ میں نے مدھم سی آواز میں کہا۔ "میں بلندیوں کی دنیا کا مسافر تھا مگر اچانک میرے قدموں سے زمین کھینچ لی گئی ہے۔"

"پھر تو ہماری ایک سی کہانی ہے۔" وہ بدستور مسکرا رہی تھی۔۔۔۔ شاید مسکراہٹ اس کے ہونٹوں ہی کا ایک حصہ تھی۔

دفعتہً مجھے کہیں قریب ہی سے پولیس کی وسل سنائی دی مجھے پولیس والوں کی یہ ادا ہمیشہ عجیب لگی کہ وہ دور ہی سے اپنے مطلوبہ آدمی کو خبردار کر دیتے تھے کہ وہ اپنی حفاظت کا بندوبست کر لے۔

"بھاگنا چاہتے ہو؟" لڑکی نے پوچھا پھر جواب کا انتظار کئے بغیر بولی۔ "بہتر ہے کہ

بھاگ ہی جاؤ۔ نہ جانے کیوں میرا دل کہتا ہے کہ وہ اس گھر کی تلاشی ضرور لیں گے۔"

"مجھے پکڑواؤ گی تو نہیں؟" میں نے غیر ارادی طور پر پوچھا۔

"تمہیں پکڑوانے کو جی نہیں چاہ رہا۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "بلکہ اگر تم ان حالات میں نہ آئے ہوتے تو شاید ایک رات کے لئے میں خود ہی تمہیں گرفتار کر لیتی۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ تھرتھری سی لے کر اپنی ناگن سی چٹیا کو پشت پر پھینکا اور میرا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔ "میرے ساتھ آؤ۔" اس کا نرم و گداز ہاتھ بجلی کا تار بنا ہوا تھا۔ جس نے مجھے سر سے پاؤں تک ہلا کر رکھ دیا۔ اپنے جسم میں ایک بلا سا ارتعاش لئے میں اس کے ساتھ چل دیا۔ اس نے گویا اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ویسے میں بھی کسی کے ساتھ ایک وعدہ کر چکی ہوں۔ ویسے ہم لوگ زندگی میں وعدہ نہیں کرتیں اور کرتی ہیں تو آخری سانس تک نبھاتی ہیں۔" پھر وہ گہری اور سرد سانس لے کر بولی۔ "کاش تم مجھے چند دن پہلے نظر آئے ہوتے۔"

"پھر کیا ہو جاتا؟" میں نے پوچھنا چاہا لیکن نجانے کیوں خاموش ہی رہا۔ کمرے سے نکل کر ہم ایک چھوٹی سی ڈیوڑھی نما جگہ پر آ گئے۔ یہاں سے تنگ سی سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔ میرے اندازے کے مطابق یہ مکان زیادہ اونچا نہیں تھا۔ لیکن جب اس کی رہنمائی میں میں نے سیڑھیاں اترنا شروع کیں تو یوں لگا جیسے ہم کنویں کی تہہ کی طرف جا رہے ہیں۔ سیڑھیوں کے اختتام پر ایک تنگ اور تنگ سی ڈیوڑھی تھی جس کی دیوار کے ساتھ نجانے کیا کیا کاٹھ کباڑ پڑا تھا۔ چھت میں ایک چھوٹا سا بلب نصب تھا جو گرد و غبار سے اس قدر دھندلایا ہوا تھا کہ اس کی روشنی چراغ سے بھی کم تھی۔ اوپر کونوں میں مکڑیوں نے جالے تان رکھے تھے۔ نیچے ایک کونے میں نل تھا جس سے بوند بوند پانی ٹپک رہا تھا۔

اس ڈیوڑھی سے ہم سیڑھیوں کی مخالف سمت میں مڑ گئے اور ایک ڈربے نما کمرے میں پہنچ گئے۔ ان مکانوں کی ساخت میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ نہ جانے کس کی چھت کس سے ملی ہوئی تھی۔ اور کس کے دروازے کن کن گلیوں میں کھلتے تھے۔ اس ڈربے نما کمرے میں گندے میلے کپڑوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اس کمرے کے پچھلے دروازے پر رک کر وہ میری طرف مڑی۔

"اس دروازے سے تم تنگ گلی میں نکلو گے تو سامنے ہی دو عمارتوں کے درمیان ایک تاریک خلاء نظر آئے گا۔" وہ مجھے سمجھاتے ہوئے بولی۔ "اس میں گھس جانا اور سیدھے ہی چلتے رہنا۔ راستے میں دو جگہ چھوٹے چھوٹے چوراہے آئیں گے۔ دوسرے چوراہے سے ذرا آگے بائیں ہاتھ پر ایک بہت اونچی دیوار ہو گی۔ وہ میجسٹک سینما کا پچھلا حصہ ہو گا۔ اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا آہنی دروازہ ہو گا۔ اس میں داخل ہو کر سینما کے کمپاؤنڈ سے گزر کر تم فارس روڈ کی حدود سے باہر پہنچ جاؤ گے وہاں سے جدھر جی چاہے

بائیں بھاگ جانا۔ اب زیادہ وقت ضائع نہ کرنا۔ اگر پولیس کی نفری آگئی تو شاید وہ بازار کی ناکہ بندی کی کوشش کرے۔ اب یہ پوچھنے کا وقت نہیں ہے کہ کیا ہوا تھا۔ لیکن معاملہ کافی سنگین ہی لگتا ہے۔ جبھی بھاگ دوڑ کی آوازیں آ رہی ہیں۔ اچھا خدا حافظ۔"

میں دروازہ کھول کر تیزی سے نکل گیا۔ یہ ایک تنگ اور نیم تاریک سی گلی تھی۔ لیکن اتنی زیادہ سنسان نہیں تھی۔ پر اسرار بھوتوں کی طرح خاصی تعداد میں لوگ ادھر ادھر جاتے دکھائی دے رہے تھے۔

میں نے محتاط نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور تیزی سے سڑک عبور کر کے سامنے دو عمارتوں کے درمیان خلاء میں داخل ہو گیا۔ یہ ایک متعفن اور تنگ تاریک سی بے قاعدہ سی گلی تھی۔ قدم قدم پر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ زمین کچی اور اونچی نیچی تھی۔ اندھیرے میں سنبھل سنبھل کر قدم اٹھانے لگا۔ اگلے چوراہے تک پہنچنے میں کافی دیر لگ گئی۔ چوراہے سے آگے گلی کچھ کشادہ ہو گئی اور یہاں کچھ روشنی بھی نظر آنے لگی۔ یہ روشنی در حقیقت کچھ مکانوں کی عقبی کھڑکیوں کے شیشوں سے چھن چھن کر آ رہی تھی۔ میں تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔

راستے میں میں نے کوڑے کا بڑا سا ڈرم دیکھا جس کے ارد گرد بھی کوڑا بکھرا ہوا تھا۔ ڈرم سے آگے چار چھ سیڑھیاں تھیں۔ یہاں سے گلی اونچی ہو گئی تھی۔ میں تیزی سے سیڑھیاں چڑھ رہا تھا کہ سامنے سے تیزی سے سیڑھیاں اترتا ہوا کوئی شخص مجھ سے ٹکرا گیا۔ وہ لڑکھڑا کر دھپ سے سیڑھی پر گرا اور اس کے ہاتھ سے کوئی چیز چھوٹ کر چرچراتی سیڑھیوں سے گری اور لڑھکتی ہوئی کوڑے کے ڈرم کے قریب تاریکی میں چلی گئی میں سنبھلا اور رک گیا وہ شخص فوراً اٹھ کر دیوانوں کی طرح ڈرم کی طرف لپکا۔

"کہاں گئی... کہاں گئی؟" وہ آواز بلند مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

"کیا چیز؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا اور میری طرف پیٹھ کئے گھٹنوں کے بل زمین پر گر کر اندھیرے میں یوں ہاتھ مارنے لگا گویا اس کی عمر بھر کی کمائی کھو گئی ہو۔ میں چاہتا تو اسے اس کے حال پر چھوڑ کر آگے چل دیتا لیکن غیر ارادی طور پر رک گیا شاید تجسس کے تحت۔

اندھیرے سے کوئی چیز اٹھا کر وہ سیدھا کھڑا ہوا اور جب اس کا ہاتھ قدرے روشنی میں آیا تو میں نے دیکھا وہ ایک پتلی ہوئی لمبی سی سرنج تھی۔ وہ آنکھوں کے قریب لا کر اسے وحشت زدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ چوڑے چکلے ڈھانچے کا ایک طویل القامت ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ اس کے جسم پر ایک میلا کچیلا پرانا اور ڈھیلا ڈھالا گھٹنوں تک لمبا کوٹ تھا جو غالباً اس زمانے کا تھا جب اس کے جسم پر گوشت موجود رہا ہو گا۔ اس کے گال پچکے ہوئے تھے اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ ان میں ایک عجیب وحشیانہ وحشت سی کی چمک

رہی تھی۔ رخساروں پر کئی دن کی بڑھی ہوئی شیو تھی۔ اس کے استخوانی کھردرے سے ہاتھ میں ہلکی سی لرزش تھی۔

"توڑ دی...... ٹھیک ہے...... کتنے...... کمینے تو نے میری سرنج توڑ دی...... بھری بھرائی سرنج توڑ دی...... "وہ بڑبڑایا...... معلوم ہے آج کل مارفیا کا کیا بھاؤ ہے......"

اگر میں اس کی بات صحیح طور پر سمجھ پاتا تو شاید میں اسے کچھ پیسے دے دیتا لیکن اس نے مجھے اس کی مہلت ہی نہیں دی اور اچانک اس سرنج سے مجھ پر حملہ کر دیا جس کے ایک سرے پر اب شارک کی دانتوں کی طرح نوکیں نکلی ہوئی تھیں۔ مجھے اس شکستہ حال اور زندہ درگور انسان سے حملے کی توقع نہیں تھی۔ وہ سرنج کو خنجر کی طرح پکڑ کر یک لخت ہی مجھ پر جھپٹا تھا اور میں نے غیر ارادی طور پر بائیں بازو کی آڑ لے کر اس کے وار سے بچنے کی کوشش کی تھی فوراً ہی مجھے احساس ہو گیا تھا کہ یہ میری غلطی تھی حواس کی ذرا سی بھی بھول چوک بعض اوقات بڑی مہلک ثابت ہوتی ہے۔ ذرا دیر پہلے میں چار جسیم اور پیشہ ور مسلح لڑاکوں سے بچ کر نکل آیا تھا لیکن اسی نشئی کے سامنے غلطی کر گیا۔

سرنج کی نوکیں کہنی سے نیچے کپڑوں سے گزر کر میرے بازو میں پیوست ہو گئیں اور کئی انچ تک چیرتی چلی گئیں۔ اگر میرے جسم پر لبادہ نہ ہوتا تو شاید نیچے تک میری کلائی پر لمبے زخموں کی گہری لکیریں پڑ جاتیں۔ تکلیف سے میرے دانت بھنچ گئے۔ نشئی نے دوسرا بازو میری کمر میں ڈال دیا تھا اور مجھے سیڑھیوں سے نیچے گرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اس کی کنپٹی پر ایک ہاتھ رسید کیا...... اور وہ اچھل کر کوڑے کے ڈرم کے قریب جا گرا اور وہیں ساکت ہو گیا۔

میں نے ایک نظر اپنے بائیں بازو پر ڈالی۔ زخموں سے خون نکل رہا تھا اور دھیرے دھیرے جلد کی آستین سے رسنے لگا تھا۔ فی الحال اس کا کوئی علاج نہیں تھا۔ میں نے دائیں ہاتھ سے کہنی سے ذرا اوپر بازو کو سختی سے تھاما اور دوڑ پڑا۔ اس وقت بڑی شدت سے مجھے اپنی گاڑی کا خیال آیا تھا۔ کاش کسی طرح میں اس تک پہنچ سکتا۔ لیکن اب مجھے سمتوں کے لحاظ سے اندازہ نہیں رہا تھا کہ میں نے گاڑی کہاں کھڑی کی تھی اور یہ موقع ایسا نہیں تھا کہ میں غیر یقینی طور پر گاڑی کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکنے کا خطرہ مول لیتا۔

دوسرا چوراہا عبور کرنے کے بعد میں لڑکی کی بتائی ہوئی نشانیوں کے مطابق سینما کے پچھواڑے سے عقبی گیٹ پر پہنچ گیا۔ میرے بازو سے اب خون کی بوندیں ٹپکنے لگی تھیں۔ گیٹ سے گزر کر میں نیم تاریک احاطے میں پہنچا اور پارکنگ لاٹ کے قریب سے گزر کر سینما کی عمارت کے پہلو میں چلنے لگا۔ کمپاؤنڈ کا اگلا حصہ روشن تھا۔ سامنے دائیں ہاتھ پر دیوار کے ساتھ کینٹین اور پان سگریٹ کی دکان نظر آ رہی تھی جن پر کاؤنٹر کے پیچھے دو تین آدمی اونگھ رہے تھے۔ کمپاؤنڈ میں ویرانی تھی۔ میں نے گھڑی دیکھی، سوا دس بج رہے تھے۔

غالباً آخری شو شروع ہو چکا تھا۔ اس لئے کمپاؤنڈ میں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔

کینٹین کے سامنے پہنچ کر میں برآمدے میں ہو گیا کیونکہ کاؤنٹر کے پیچھے اونگھتا ہوا آدمی کچھ چونک کر میری طرف دیکھنے کے بعد سنبھل کر بیٹھ گیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کی نظر میرے بازو پر پڑے۔ جس کی آستین اب خون میں بھیگ چکی تھی۔ برآمدے سے گزرتے وقت میری نظر بکنگ کی کھڑکیوں پر پڑی ایک کھڑکی کے پیچھے ابھی روشنی نظر آ رہی تھی۔ گیلری کے ٹکٹ ابھی ختم نہیں ہوئے تھے اور بکنگ کلرک ایک ہاتھ پر ٹھوڑی ٹکائے بیٹھا متوقع نظروں سے باہر دیکھ رہا تھا۔ بجلی کے کوندے کی طرح ایک خیال میرے ذہن میں لپکا کہ اگر میں ٹکٹ لے کر اندر جا بیٹھوں تو ہال کے اندھیرے میں ایک تو میں اپنے بازو پر اطمینان سے کوئی رومال وغیرہ باندھنے کی کوشش کر سکتا ہوں۔ دوسرے مجھے سکون سے کچھ سوچنے کی مہلت مل جائے گی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔

بکنگ ونڈو خاصی اونچی تھی کلرک وہاں سے میرے بازو پر نظر نہیں ڈال سکتا تھا۔ میں نے خاموشی سے پیسے اس کی طرف بڑھا کر ٹکٹ لیا اور کھڑکیوں کے ساتھ ہی گیلری کی طرف رہنمائی کرنے والا ایک تیر کا نشان دیکھ کر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گیا۔ یہاں روشنی تھی۔ میں نے بائیں بازو کو بائیں پہلو سے لگا کر ہاتھ جیب میں ٹھونس لیا اور گیٹ کیپر کو ٹکٹ دے کر آدھا حصہ واپس لے کر جلدی سے دروازہ کھول کر اندر گھس گیا۔ گیٹ کیپر نے مشینی انداز میں اپنا کام انجام دیا تھا اور میری طرف خاص توجہ نہیں دی تھی۔

اندر پہنچ کر میں چند لمحے تو دروازے سے ٹیک لگائے ہی کھڑا رہا اور جب آنکھیں ہال کے اندھیرے سے کچھ مانوس ہو گئیں تو میں نے کرسیوں کی قطاروں کا جائزہ لیا۔ پردے پر جب کوئی زیادہ روشن سین آتا تو کرسیوں پر موجود اکا دکا انسانی ہیولے نظر آنے لگتے تھے۔ بائیں طرف کی پچھلی قطار تقریباً خالی ہی تھی۔ میں اس کی آخری کرسی پر جا بیٹھا۔ مجھ سے آگے بھی کئی کرسیاں خالی تھیں۔ قدرے اطمینان کا سانس لینے کے بعد میں نے جیب سے رومال نکالا۔ مگر مجھے اندازہ ہوا کہ اس کی لمبائی کچھ زیادہ نہیں تھی دوسری چیز ٹائی ہی تھی جو اس مقصد کے لئے موزوں تھی۔ میں نے ٹائی کھولی اور اسے کہنی سے اوپر بازو پر دو تین چکر دے کر ایک ہاتھ اور دانتوں کی مدد سے حتی الامکان سختی سے گرہ لگا لی۔ زخم کی تکلیف تو یک لخت بڑھ گئی لیکن مجھے امید تھی کہ کچھ دیر بعد خون کا بہاؤ بہت کم ہو جائے گا۔

بازو کی طرف سے توجہ ہٹی تو خیالات نے یک لخت ذہن پر یلغار کر دی۔ کالج کا تصور، ماہتاب کی یاد، ماں کی موت کا دکھ سب کچھ آج کی باتیں تھیں مگر زندگی گویا پلک جھپکتے ہی وقت کی سمت جیسے پھلانگ کر کہیں سے کہیں نکل گئی تھی۔ اب سوچا تو یک لخت ہی آنکھوں میں آنسوؤں کا غبار سا مچل گیا اور پہلو میں تلملاتے کٹے زخموں کے مد

کھل گئے۔ جیسے شعلے پہ کیا ہو گیا تھا اور میں کس لڑکی کی کھائی کے جانے پر آکڑا ہوا تھا؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

ایک بات تو بہرحال طے تھی کہ میں اب لوٹ کر پنڈا نہیں جا سکتا تھا۔ کم از کم ان لوگوں کے حلقے میں نہیں جا سکتا جن کی مجھ سے ذرا سی بھی شناسائی تھی۔ ماں نے یا پھر شاید میری اپنی ہی تقدیر نے مجھے ان لوگوں کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ بستی میں بھی کم از کم اس وقت میں خطرات کے چنگل میں اٹک رہا تھا۔ پولیس "یقیناً" میری تلاش میں سرگرم ہو چکی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں نے جائے وقوع سے فرار ہو کر صحیح قدم اٹھایا تھا یا غلط۔ مگر وہاں ٹھہرنا بھی "یقیناً" میرے لئے کوئی اچھے حالات کا پیغام لے کر نہ آتا اور ویسے بھی اب جو کچھ ہو چکا تھا اسے بدلنا تو میرے اختیار میں نہیں تھا۔

مجھے یہ بھی یقین تھا کہ بجٹسرے میں جو وہ اقرار نامہ بیچے تھے انہوں نے اپنے دو ساتھیوں کے قتل کا الزام مجھ پر ہی ڈالا تھا اور ان دونوں کے علاوہ چائے خانے میں جس لڑکی سے میرا سامنا ہوا تھا اور جو خادمہ مجھے ممی کے پاس لے کر گئی تھی وہ پولیس کو میرا حلیہ خاصی تفصیل سے بتا سکتی تھی۔ اس لڑکی اور خادمہ کے رویے سے ویسے بھی میں نے شروع ہی میں محسوس کیا تھا کہ انہیں میری آمد کا انداز خاصا مشکوک لگا تھا اور میری طرف سے کھٹک سی گئی تھیں۔ اور تو اور میری اپنی ماں کے قتل کا الزام بھی مجھ پر آسکتا تھا۔

ان کا بیمار دل مجھ سے یوں سامنا ہونے کے اثرات شاید برداشت نہیں کر سکا تھا مگر کون یقین کر سکتا تھا کہ اس ملاقات کے صدمے نے ان کی دھڑکنیں چھین لی تھیں۔ کسی کو صدمے کی نوعیت کا علم ہی نہیں تھا۔ کسی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ انہوں نے اپنی اصلیت کو میری نظروں سے اوجھل رکھنے کے لئے بیس سال تک مجھے ایک علیحدہ دنیا میں رکھا تھا مگر ان کی ساری جدوجہد اکارت گئی تھی۔

صورت حال کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ تین افراد کے قتل کی یہ کہانی اگر اخبارات میں آجاتی تو ملن نے بھی میرے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کے لئے پولیس کو میرے بارے میں ہر وہ بات بتانی تھی جو اس کے علم میں ہوتی۔ میرے گھر کے بارے میں پولیس کو مطلع کرنا تھا تاکہ میں وہاں بھی پناہ نہ لے سکوں۔ اس نے تو پہلے ہی میری زندگی کا کوئی کمزور پہلو ڈھونڈنے کے لئے نہ جانے کتنی محنت کی تھی۔ مجھ سے دشمنی شروع ہونے کے بعد اس نے "یقیناً" میرے گھر کی نگرانی کی تھی اور اسی دوران ممی مجھ سے ملنے آئی تھیں تو ملن یا اس کے کسی کارندے نے "یقیناً" ان کا تعاقب کیا تھا اور جو بات مجھے بیس برسوں میں معلوم نہیں ہو سکی تھی وہ اس نے چند دنوں میں معلوم کر لی تھی۔ دشمن تھا نا ـــ گھات میں لگا ہوا تھا۔

تصور ہی تصور میں اس کی شکل دیکھ کر میرے جسم کا رواں رواں شعلہ بن گیا اور بے بسی اور بے حالی کے اس لمحے میں بھی میں نے یہ ضرور سوچا کہ اس لمبو کے بچے کو کبھی ضرور پیروں تلے روند کر چھوڑوں گا۔ مجھے بیماری کے جہنم میں دھکیل کر اسے نہ جانے کیا ملا تھا۔ ماہتاب کو تو وہ اب بھی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ اتنا مجھے یقین تھا۔ میرے ساتھ تو اب جو بھی ہونا تھا سو ہونا تھا لیکن میں اپنی بیماری کے بعد اسے زندگی سے لطف کشید کرنے کے لئے نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ دل ہی دل میں اس فیصلے سے مجھے ایک گونہ سکون دے رہا تھا۔

پھر مجھے اس ڈائری کا خیال آیا جو ممی نے میری جیب میں ڈالی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ اس میں میرے ہر سوال کا جواب موجود ہے۔ میں دل ہی دل میں لئے ان کے دروازے پر پہنچا تھا۔ افسوس کہ سینما کے اندھیرے میں ڈائری کا مطالعہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے اضطراب سے پہلو بدلا اور میرے بازو میں ایک بار پھر ٹیس اٹھی۔

"میری طرح تمہارا دھیان بھی فلم میں ہرگز نہیں ہے۔"

میں اپنے کان کے قریب سرگوشی سن کر تقریباً اچھل پڑا۔ وہ لڑکی نہ جانے کب میرے برابر والی سیٹ پر آبیٹھی تھی۔ نیم اندھیرے میں میں نے اس کے خدوخال کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔

اس کے بال کٹے ہوئے تھے۔ گھٹنوں کے نیچے تک کے اسکرٹ پر اس نے پھولی پھولی سی اون کی جرسی پہن رکھی تھی۔ اس کی عمر بیس سال سے زیادہ نہیں ہو گی۔ اس کے رخسار بھرے ہوئے اور آنکھیں لمبی تھیں۔ فلم کے پردے سے منعکس ہونے والی مدھم روشنی میں اس کے ہونٹوں پر گلابی لپ اسٹک چمک رہی تھی۔

اس کی رنگت کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ پھولی پھولی جرسی میں اس کا جسم یوں قید تھا گویا چھوٹے جال میں بڑی مچھلی پھنسی ہو۔ اس کے کپڑوں سے کوئی سستی سی خوشبو پھوٹ رہی تھی تاہم بری نہیں لگ رہی تھی۔

میرے سینے سے ایک طویل سانس خارج ہوئی پھر میں نے آہستگی سے کہا۔ "ہاں سنو فلم کی طرف واقعی میرا دھیان نہیں تھا۔"

"کیوں؟ کیا تمہیں ان فلمی ہیروئنوں سے کوئی دلچسپی نہیں جن کے عشق میں آج کل کے نوجوان مرے جا رہے ہیں؟" اب اس نے گردن گھما کر میری آنکھوں میں جھانکا اور اس کی سانسوں کی خوشگوار حرارت مجھے اپنے رخساروں پر محسوس ہوئی۔

مجھے کوئی جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔ ایک بار تو میرا جی چاہا کہ اٹھ کر بھاگ لوں لیکن پھر میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ یہ تو زیادہ ہی مشکوک لگنے والی بات تھی۔ "میرا ذہن دراصل کہیں اور الجھا ہوا تھا۔" بالآخر میں نے کہا۔

"کیا اسے کچھ اور چیزوں پر دھیان دینے کے لئے بھی وقت نہیں نکالا جا سکتا؟" وہ مسکرائی۔

"مثلاً؟" میں نے پوچھا۔

"مثلاً ایک چھوٹے مگر پرسکون اور آرام دہ کمرے میں کسی کی صحبت میں رات گزارنا' دنیا بھر کی پریشانیوں سے نا آسودگی سے بے نیاز ہو جانا وغیرہ۔" اس نے بدستور مسکراتے ہوئے سرگوشی کی۔

"کہاں اور کیسے؟" میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔ میرے ذہن کے کسی گوشے میں اچانک ایک خیال نے سر ابھارا تھا۔ لڑکی یک لخت مجھے بہت اہم محسوس ہونے لگی تھی۔

"یہاں سے کچھ ہی دور۔ ایک کمرے میں۔" اس نے جواب دیا "اور وہاں پینے پلانے کو بھی کچھ مل سکتا ہے بشرطیکہ اس کی قیمت علیحدہ سے ادا کر سکو۔"

"پینے پلانے کو چھوڑو۔" میں نے ٹھوک بجا کر کہا۔ "مجھے منظور ہے۔"

"تو آؤ پھر چلیں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا رخ اگلے دروازے کی طرف تھا۔ میں نے ایک قدم بڑھا کر اسے روک لیا۔

"پچھلے دروازے سے ہی چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"کیوں ڈر لگ رہا ہے؟" اس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"نہیں۔۔۔ دراصل۔۔۔" میں کچھ ہچکچایا۔
دراصل ایک جھگڑے میں میرا بازو زخمی ہو گیا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اس کی طرف کسی کی توجہ مبذول ہو۔"

ایک لمحے کے لئے وہ یوں ساکت کھڑی رہی گویا کسی سوچ میں پڑ گئی ہو۔ پھر اپنے تراشیدہ بالوں کو خفیف سا جھٹکا دے کر بولی۔ "خیر ٹھیک ہے۔۔۔ زخمی بازو سے میرے کاروبار پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔"

ہم پچھلے دروازے سے باہر آ گئے۔ گیت کہیں غائب ہو چکا تھا۔ پیچھے آکر سینما سے نکلنے کے بعد ہم فٹ پاتھ پر چلنے لگے۔ چند قدم آگے فٹ پاتھ کے ساتھ کئی ٹیکسیاں اور سائیکل رکشا کھڑے تھے۔ ایک ٹیکسی کی کھڑکی میں ہاتھ ڈال کر لڑکی نے اونگھتے ہوئے ڈرائیور کو جگایا۔ "آؤ۔۔۔ چلیں اسٹیشن چلو۔" اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا اور میرا ہاتھ پکڑ کر پچھلا دروازہ کھول کر خود بیٹھنے کے بعد مجھے بھی اندر کھینچ لیا۔

کچھ دیر بعد اس نے جس عمارت کے سامنے ٹیکسی رکوائی اس کی زرد اور نم زدہ دیواروں پر کہیں کہیں سیاہ کائی بھی جمی ہوئی تھی۔ سامنے ہی بغیر دروازے کے ایک خاصی کشادہ گلی سی تھی جس کے ایک طرف سے چکردار چوبی زینہ اوپر جا رہا تھا۔ کھٹ کھٹ کرتے اس زینے سے چڑھ کر ہم پہلی منزل کی راہداری میں آ گئے جہاں دونوں طرف کمروں

کی قطاریں تھیں۔ ہر کمرے کا دروازہ سیاہ رنگ کا تھا جو کبھی سلیٹی رہا ہو گا۔ لڑکی نے بائیں طرف کے آخری کمرے کا دروازہ کھولا اور لائٹ آن کر کے یوں ایک طرف کھڑی ہو گئی گویا مجھے کمرے کا معائنہ کرا رہی ہو۔

عمارت جتنی پرانی خستہ حال نظر آ رہی تھی۔ اس کی نسبت کمرا اندر سے خاصا صاف ستھرا تھا حتیٰ کہ دیواروں پر تازہ سفیدی بھی نظر آ رہی تھی۔ فرش صاف ستھرے ٹاٹ کا تھا۔ ایک گوشے میں مسہری لگی ہوئی تھی جس پر صاف ستھرا بستر تھا۔ اس کے قریب چھوٹی سی تپائی اور ایک کرسی تھی۔ تپائی پر چند کتابیں رسالے اور ایلومینیم کی ایک کیتلی اور کپ رکھا ہوا تھا۔

ایک گوشے میں کھڑکی کے قریب چھوٹی سی کارنس تھی جس پر اسٹوو اور چند برتن پڑے تھے۔ کارنس کے قریب ہی واش بیسن تھا۔ ایک طرف لکڑی کی دیوار گیر الماری تھی۔ جس کے ایک پٹ پر خاصا بڑا آئینہ لگا ہوا تھا قریب ہی ایک چھوٹی سی سنگھار میز رکھی ہوئی تھی۔

لڑکی نے دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھا دی اور مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں بیٹھ چکا تھا تو اس نے پھولی پھولی سی اون والی جرسی اتار کر مسہری پر پھینک دی اب میں نے دیکھا کہ وہ اتنی زیادہ جسیم نہیں تھی جتنی جرسی میں نظر آ رہی تھی۔

"اب پہلے تمہارے زخمی بازو کا بندوبست کیا جائے یا نا آسودہ خواہشوں کا؟" اس نے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر ایک ادا سے بالوں کو جھٹکا دے کر پوچھا۔ چھت میں کمرے کے وسط میں لٹکے ہوئے بلب کی روشنی میں اس کی صندلی رنگت میں عجیب سی چمک پیدا ہو گئی تھی۔

"زخمی بازو کا علاج پہلے ہونا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "میرا کافی خون ضائع ہو چکا ہے۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور سنگھار میز کی طرف بڑھ گئی۔ اس کی تینوں درازوں میں ہاتھ مارنے کے بعد بالآخر اس نے چوڑی پٹی کا ایک چھوٹا سا رول اور ٹنکچر آیوڈین کی ایک شیشی نکالی اور بولی۔ "جلدی اتار کر واش بیسن پر آ جاؤ۔"

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ اس نے قمیض کی آستین کو تہ در تہ اوپر کو الٹنے کے بعد زخم کا معائنہ کیا اور اس کے ہونٹ سیٹی بجانے کے انداز میں سکڑ گئے۔ زخم واقعی میری توقع سے بھی بڑا تھا بلکہ وہ ایک نہیں کئی زخم تھے ایسا لگتا تھا کہ کسی تیز دھار چاقو سے بازو کا حصہ چھیدا گیا ہو۔ اس نے پٹی کا کچھ حصہ پھاڑ کر ٹنکچر آیوڈین میں بھگویا اور اسے زخم پر تھپکنے لگی۔ میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

"ارے۔۔۔ اس میں تو شیشے کے ذرے بھی ہیں۔" وہ بازو پر جھکتے ہوئے بولی۔

"کسی طرح انہیں نکال دو۔" میں نے زخم پر سے نظر ہٹاتے ہوئے کہا۔ اس نے ماچس کی ایک تیلی پر ذرا سی روئی لپیٹی اور اسے آیوڈین میں بھگو کر دوبارہ ہاتھ پر جھک گئی۔ اس نے حتی الامکان احتیاط کے ساتھ زخم کی گہرائیوں میں سے تمام ذرے نکالے اور میں دانت پر دانت جمائے کھڑا رہا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ نرسنگ عورت کی بنیادی خصوصیت ہوتی ہے اور اس کے لئے اسے کسی تربیت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کا عملی مظاہرہ میں نے آج دیکھ لیا تھا۔

شیشے کے ذرے نکالنے کے بعد اس نے زخم کو صاف کیا اور اس پر مزید آیوڈین لگا کر خوب اچھی طرح کس کر کئی بل دے کر پٹی باندھ دی اور ہاتھ دھونے لگی۔ پٹی کی بندشیں اس قدر سخت تھیں کہ میرے ہاتھ کی پشت پر نیلی رگیں ابھر آئی تھیں تاہم اب آیوڈین کی جلن اور زخم کی اذیت کافی حد تک ختم ہو گئی تھی اور مجھے کچھ سکون سا ہو گیا تھا۔

دوبارہ کرسی پر بیٹھنے کے بعد میں نے کئی گہری گہری سانسیں لیں۔ وہ مسہری کی پٹی پر آبیٹھی تھی۔ دونوں ہاتھ پیچھے کو ٹکا کر وہ بھی بیٹھی گہری گہری نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں طلب تھی پیاس تھی۔ میرے کانوں کی لوئیں سینکنے لگیں۔

"وقت" اس نے اپنی طلب اور پیاس پر سودے بازی کا پھندا ڈال کر قدرے آگے کو جھک کر ہاتھ پھیلاتے ہوئے خالص کاروباری لہجے میں کہا۔ "پیسے نکال دو۔"

میں نے سو سو کے دو نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائے اب میرے پاس کل چار سو روپے رہ گئے تھے۔ اس نے ایک نوٹ بڑی نفاست کے ساتھ تکیے کے نیچے رکھا اور دوسرا نوٹ مجھے واپس کرنے لگی۔ میں اس کے کھرے حساب کتاب پر حیران رہ گیا۔

"رکھ لو تم نے میری پٹی بھی کی ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ میں نے انسانیت کے ناطے کی ہے۔" اس نے سادگی سے کہا۔ "پیشہ اپنی جگہ ہے۔ انسانیت بھی تو کوئی چیز ہے۔" اس نے نوٹ میری گود میں پھینک دیا اور پھر اٹھ کر مجھ پر آ گئی۔ بلاشبہ وہ اپنے پیشے میں بہت ماہر تھی یا پھر شاید میں ہی نو آموز تھا۔ [illegible] اس نے مجھے ہاتھ کی تکلیف بھلا دی۔

ابھی میں تھکن اور گھبراہٹ کے پھندے سے نکلا ہی تھا کہ باہر بھاری جوتوں کی دھمک سنائی دی۔ پھر کسی نے زور سے دروازے پر دستک دی۔ میرے سینے میں ہچکولے کھاتا سانس کا پنچھی یک لخت ساکت ہو گیا۔ لڑکی گھبرا کر سیدھی کھڑی ہو گئی اور خوفزدہ نظروں سے دروازے کو دیکھنے لگی۔

"تم جلدی سے کہیں چھپ جاؤ۔" اچانک اس نے سرگوشی کی۔ میں ہکا بکا اس کی شکل دیکھنے لگا۔ یہ کمرہ سر چھپانے کے لئے موزوں تھا مگر چھپنے کے لئے نہیں۔ لے دے کے

ایک مسہری تھی مگر وہ اتنی نیچی تھی کہ اس کے نیچے میرا جسم نہیں سما سکتا تھا۔ یہ سوال بھی میرے ذہن میں ابھرا تھا کہ اگر اس کا پیشہ یہی تھا تو وہ اس بری طرح کیوں گھبرا گئی تھی جس نے ظاہر ہے چوری چوری اپنے کسی آشنا کو بلا رکھا ہو۔ لیکن پھر مجھے خفیف سا اندیشہ یہ محسوس ہوا کہ شاید دروازے پر پولیس ہو۔ راستے میں ٹپکنے والی میرے خون کی بوندوں نے ان کی یہاں تک رہنمائی کر دی ہو۔ یا شاید ٹیکسی ڈرائیور نے کسی گشت کرنے والے سپاہی کو میرے متعلق بتا دیا ہو۔ کیونکہ ٹیکسی سے اترتے وقت میری تمام تر احتیاط کے باوجود اس کی نظر میری خون میں لتھڑی ہوئی آستین پر پڑ گئی تھی اور اس نے شک آلود سی نظروں سے مجھے گھورا تھا۔ یہی اندیشے تھے جنہوں نے مجھے ہڑبڑا کر اٹھنے پر مجبور کر دیا۔

"الماری میں چھپ جاؤ۔" لڑکی نے سرگوشی کی۔ "اس میں کافی جگہ ہے۔"

میں الماری کی طرف لپکا اور دروازہ کھول کر اندر گھس گیا۔ ہینگروں پر لٹکے ہوئے اور اسی ماحول کی خوشبو میں بسے ہوئے بہت سے کپڑے میرے چہرے سے ٹکرائے۔ الماری کے فرش پر اونچی ایڑی والی جوتیوں کے کئی جوڑے رکھے تھے۔ ان پر پاؤں پڑنے سے میں لڑکھڑا بھی گیا۔ بہرحال سنبھل کر میں نے کپڑے ادھر ادھر ہٹائے اور الماری کی پچھلی دیوار سے پشت لگا کر کھڑا ہو گیا۔ لڑکی نے جھپٹ کر دروازہ بند کر دیا اور تاریکی نے مجھے اپنی پناہ میں لے لیا۔

"دروازہ کھولو شہلا!" باہر سے ایک بوجھل آواز سنائی دی اور اس مرتبہ دروازہ باقاعدہ دھڑدھڑایا گیا۔ چند لمحے بعد میں نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی پھر قدموں کی دھمک سے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی ہاتھی کمرے میں گھس آیا ہو۔

"تم آج بہت جلدی آ گئے سرمد!" میں نے شہلا کی جھلی جھلی سی آواز سنی اب مجھے اپنے آپ پر حیرت ہو رہی تھی کہ اتنے مرحلے طے کرنے کے بعد بھی میں نے لڑکی کا نام نہیں پوچھا تھا اور وہ مجھے اب معلوم ہوا تھا۔ اس کی [illegible] یہ وجہ تھی کہ اس نے بھی میرا نام نہیں پوچھا تھا۔

"بڑی دیر لگا دی تم نے دروازہ کھولنے میں؟" میں نے سرمد کی بھاری آواز سنی۔ آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ گرانڈیل کوئی ہو گا۔ مجھے حیرت تھی کہ شہلا اس سے یہ کیوں نہیں کہہ رہی تھی اس وقت میرے پاس کوئی موجود ہے۔ تم چلے جاؤ پھر کسی وقت آنا۔ لیکن پھر مجھے احساس ہوا کہ وہ میرا جیسا نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ شہلا نے اس سے پہلا سوال یہی کیا تھا۔ "تم آج بہت جلدی آ گئے سرمد۔"

"بس... میں... دراصل وہ مجھے اونگھ آ گئی تھی۔" میں نے شہلا کی آواز سنی۔

"اور اونگھ ہی اونگھ میں تمہاری ساری لپ اسٹک خراب ہو گئی۔" سرمد کی آواز میں طنز کی کاٹ تھی۔ ایک لمحے کے توقف سے اس کی آواز دوبارہ گونجی۔ "اور یہ تم نے

لڑکوں والے پلمبر کب سے پیسے شروع کر دیئے۔"

"پلمبر۔۔۔" شوبھا کی کھوکھلی سی آواز ابھری۔

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ وہ میں نے پلمبر لڑکے کو بلایا تھا۔۔۔ شاید وہ بھول گیا ہے۔۔۔ پائپ لیک کر رہا تھا۔۔۔ اس لئے میں نے لڑکے کو بلایا تھا۔"

"پانی کے پائپ سے پانی" خون لیک ہونے لگا تھا جو پلمبر کی آستین اور واش بیسن پر نکل گیا۔۔۔ ہے نا؟" سریدر کا لہجہ زہر میں بجھا ہوا تھا۔ "میں نے تم سے کتنی مرتبہ کہا ہے کہ جلدی مجھے کوئی کام مل جائے گا تم اپنی یہ حرکتیں بند کر دو۔۔۔"

"ایک سال تو ہو گیا ہے مجھے یہ سنتے ہوئے کہ جلد ہی کام مل جائے گا۔۔۔ جلد ہی کام مل جائے گا۔" میں نے شوبھا کو پھٹ پڑنے والے انداز میں کہتے سنا "مجھ سے نہیں برداشت ہوتے فاقے اور نہ میں روز روز مالک مکان سے بے عزتی کرا سکتی ہوں۔۔۔"

"چٹاخ" میں نے زور دار طمانچے کی آواز سنی۔ شوبھا کے کرنے اور پھر روتے ہوئے سسکیاں لینے کی آواز سنائی دی۔ ساتھ ہی سریدر گرجا۔ "کہاں ہے وہ مردود؟" پھر خود ہی اپنے سوال کا جواب دیتے ہوئے بولا۔ "الماری میں ہو گا اور کہاں ہو سکتا ہے۔"

میں نے بھاری قدموں کی دھمک الماری کی طرف بڑھتے ہوئے محسوس کی۔ یہ اندازہ تو مجھے پہلے ہی ہو چکا تھا کہ سریدر کوئی بھاری تن و توش کا شخص ہے میں نے اپنے چہرے کے سامنے سے کپڑے ہٹائے۔ ہاتھ سیدھا کیا اور سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔

دروازہ کھلتے ہی میں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر دروازہ کھولنے والے کی کنپٹی پر ایک گھونسا رسید کیا۔ وہ چیخ مار کر الٹ پڑا اور فرش پر جا گرا میں نے دیکھا وہ ایک قد آور نوجوان تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا مگر بھاری ڈنڈا تھا اور وہ فرش سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اس کی کنپٹی پر ٹھوکر رسید کی اور وہ ہچکی سی لے کر اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔ روتی ہوئی شوبھا اپنے چہرے سے ہاتھ ہٹا کر تیزی سے اس کی طرف لپکی اور فرش پر بیٹھ کر اسے جھنجھوڑنے لگی۔ "سریدر۔۔۔" پھر وہ میری طرف مڑ کر غضب ناک لہجے میں بولی۔ "دفع ہو جاؤ یہاں سے۔۔۔ ورنہ میں ابھی چیخ چیخ کر لوگوں کو جمع کر لوں گی۔"

میرے خیال میں لوگوں کو جمع کرنے کے لئے چیخنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی آواز پہلے ہی بہت بلند تھی اور سریدر بھی خوب غل مچا چکا تھا۔ اڑوس پڑوس میں کچھ ہلچل کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔

○

کتاب [illegible]

"اگر تمہیں اپنے خاوند کا اتنا ہی ڈر تھا تو مجھے یہاں لائی کیوں تھیں؟" میں نے قدرے غصیلے لہجے میں کہا۔

"یہ میرا خاوند نہیں بھائی ہے۔" وہ چلائی پھر قدرے نیچی آواز میں بولی۔۔۔ "اور جب بھی اسے شراب نہیں ملتی اس کی غیرت جاگ اٹھتی ہے۔ بہرحال یہ جیسا بھی ہے لیکن میں برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی یوں بے دردی سے اسے مارے۔۔۔ جاؤ۔۔۔ دفع ہو جاؤ۔ گم ہو کر نکل میری آنکھوں کے سامنے سے ورنہ میں۔۔۔"

میں نے اس کی آواز مزید بلند ہونے کا انتظار نہیں کیا اور تیزی سے باہر آ گیا۔ اڑوس پڑوس کے دروازے کھلنے لگے تھے سیڑھیوں کے قریب ایک نوجوان نے میرا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ سینے پر ہاتھ مار کر میں نے اسے ایک طرف دھکیلا اور تیزی سے سیڑھیاں اتر گیا۔

ایک بار پھر میں ایک مسافر بے اماں تھا اور گلی کوچوں کی خاک چھان رہا تھا۔ کل رات تک میرے سر پر ایک ہمسائی گھر کی چھت تھی مجھے مہکتی زلفوں کی چھاؤں میسر تھی اور آج کہیں سایہ دیوار میں بھی مجھے پناہ نہیں مل رہی تھی۔

میرے دل کو دھڑکا سا لگا ہوا تھا کہ جیسے کوئی نادیدہ ہاتھ میرے تعاقب میں ہے۔ گلیاں اجنبی تھیں اور وقت نامہربان۔ لمبے پہاڑ تھے اور دل ناتواں۔ مقدر نے اچانک ہی پلٹا کھایا تھا کہاں تو عملی زندگی کی کسی گلی سے واسطہ ہی نہیں پڑا تھا اور کہاں زمین و آسمان نے ایک دم ہی بے سری کے تمام ہتھیار آزمانا شروع کر دیئے تھے۔

بازو میں ایک بار پھر ٹیس تیز ہونے لگی تھی۔ ایک الیکٹرک پول کے قریب رک کر میں نے بازو کا جائزہ لیا کسی ہوئی پٹی پر گیلاہٹ کی علامت کے درمیان خون کی سرخی نمودار ہونے لگی تھی۔ خون دھیرے دھیرے رس رہا تھا۔ مجھ پر تھکن اور نقاہت کا غلبہ تھا۔ اعصاب اب آرام مانگ رہے تھے جسم کو پناہ کی طلب تھی۔ رات اب گہری ہو چلی تھی تاہم کچھ گلیوں اور بازاروں میں اب بھی رونق تھی اور میں ان سے بچتا بچاتا سنسان اور نیم تاریک گلیوں میں چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ایک بار میں نے سوچا کہ کسی طرح پونا واپس چلا جاؤں۔ کم از کم آج کی رات تو

میرا گھر محفوظ تھا لیکن معلوم نہیں تھا اس وقت کوئی ٹرین اس طرف جاتی تھی یا نہیں اور پھر مجھے اسٹیشن تک پہنچنا ہے جو مجھے پکڑے جانے کے تصور سے بھی خوف آرہا تھا۔

چلتے چلتے مجھے بہت دیر ہو چکی تھی اور میں نہ جانے کہاں سے کہاں نکل آیا تھا اب میں ایک ایسے علاقے میں پہنچ چکا تھا جہاں مکمل طور پر ویرانی تھی۔ خالی خالی عمارتیں تھیں۔ کچھ آگے چل کر مجھے سڑک کے بائیں ہاتھ ایک میدان سا نظر آیا۔ اس میدان میں کئی جھولا نما عمارتیں زیر تعمیر تھیں۔ میں سڑک چھوڑ کر ان عمارتوں کے درمیان پہنچ گیا۔ ایک عمارت تقریباً مکمل ہو چکی تھی۔ ایک میں لکڑی کا کام باقی تھا۔ دروازوں پر چوکھٹیں بھی لگی ہوئی تھیں اور کہیں کہیں پٹ بھی لگ چکے تھے۔ باہر بھی لکڑی پر وہ تمام الٹے بھی لگے ہوئے تھے جن پر بڑھئی کام کرتے ہیں اور ان کے ارد گرد لکڑی کا بہت سا برادہ اور چھلی ہوئی کھپچیاں وغیرہ بکھری ہوئی تھیں۔

میں نے ایک بے پٹ کے دروازے سے اندر جھانک کر دیکھا۔ سناٹا اور تاریکی تھی میں نے احتیاط سے اندر قدم رکھا اور آہستہ آہستہ آگے چلا۔ کچھ فاصلے پر ایک اور دروازے کا دھندلا سا خلا نظر آرہا تھا۔ اس سے گزر کر میں ایک کشادہ حصے میں پہنچ گیا جہاں چھت نہیں تھی اور اندھیرا کچھ کم گہرا تھا۔ اچانک میں اچھل پڑا۔ کسی نے میرے قریب ہی ماچس کی تیلی جلائی۔ اس کی سرسراہٹ مجھے بم کے دھماکے سے زیادہ بلند محسوس ہوئی تھی۔

"کون ہے ہے؟" تیلی کا شعلہ میرے چہرے کے قریب آگیا۔ لرزتی ہوئی روشنی میں میں نے اپنے مخاطب کو بھی دیکھ لیا۔ وہ گٹھے ہوئے جسم کا ایک سیاہ فام آدمی تھا۔ اس کے سیاہ چہرے پر چالاکی سی جھلک رہی تھی۔ اس کے بائیں ہاتھ میں ایک بندوق تھی۔

"تم چوکیدار ہو؟" میں نے سنبھل کر پوچھا۔ میرے ذہن میں اچانک ہی خیال ابھرا تھا کہ اسے پانچ دس روپے دے کر آج کی رات کے لئے اس عمارت میں کہیں پڑے رہنے کی اجازت لینے کی کوشش کروں گا۔

"چوکیدار؟" اس نے دہرایا اور زور سے ہنسا۔ اس کے پیلے پیلے دانت ایک لمحے کے لئے چمکے اور پھر تیلی بجھ گئی۔ اس لمحے میرے دل میں آئی کہ اسے چھپٹ ہی کر دھکا دوں کم از کم اس کی بندوق تو ایک ہی لوں پھر سوچا کہ اگر وہ میرے لئے الجھن کا باعث نہ بنے تو بلاوجہ جھگڑے کی کیا ضرورت ہے۔

اس نے بڑی پھرتی سے دوسری تیلی جلائی اور بندوق دوبارہ سنبھال لی۔ "میں سمجھ گیا۔۔۔ میں سمجھ گیا۔" اس نے ٹیڑھا سا سر ہلا دیا۔ "پناہ کی تلاش میں ہو۔ میرے ساتھ آجاؤ۔" اس کی آواز کھردری لیکن لہجہ دوستانہ تھا۔ اس کا رخ سیڑھیوں کی طرف تھا۔

"آجاؤ۔۔۔ آجاؤ۔" اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ "ہم بھی تمہارے ہی بھائی بند ہیں۔" میں اس کے پیچھے چل دیا۔ سیڑھیاں چڑھ کر ہم پہلی منزل پر آئے اور بے پٹ کے

ایک دروازے سے گزر کر میں نے اپنے آپ کو ایک ہال میں پایا۔ یہاں کا منظر دیکھ کر میں ٹھٹھک گیا۔ دیوار کے ساتھ دو میلے کچیلے گدے بچھے ہوئے تھے اور ان پر پانچ افراد موجود تھے کوئی نیم دراز تھا کوئی آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ ان میں سے دو سگریٹ پی رہے تھے اور ہال میں چرس کی بو پھیلی ہوئی تھی۔

ایک طرف دو لالٹینوں پر لالٹینیں رکھی تھیں۔ گدوں سے کچھ دور لوہے کی ایک انگیٹھی رکھی تھی جس میں کوئلے دہک رہے تھے۔ انگیٹھی پر ایک دیگچی دھری تھی جس سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ ان پانچوں میں ایک قدرے ہٹ کر بیٹھا تھا۔ اس نے سامنے رکھی ایک گٹھڑی سی پر کہنی ٹکا رکھی تھی۔ جسامت کے اعتبار سے وہ پورا دیو کا دیو تھا۔ اس کے سر کے جھاڑ جھنکاڑ بال اور داڑھی مونچھیں آپس میں یوں مدغم تھیں کہ چہرے کی جلد بہت کم نظر آرہی تھی۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں اس کی سرخ انگارہ سی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس کے ہاتھ کے قریب ہی ایک لمبی سی نال کا ریوالور اور گولیوں کی پیٹی پڑی تھی۔

"ایک مہمان آیا ہے سردار!" مجھے ساتھ لانے والے نے دیو زاد کو مخاطب کیا۔ اس کی باچھیں نہ جانے کیوں کھلی جا رہی تھیں۔

"اچھا۔۔۔ آجاؤ۔۔۔ آگے آجاؤ۔۔۔ ڈرتا کیوں ہے۔" دیو زاد نے مجھے اشارہ کیا۔ نہ جانے کیوں اسے خوشی ہوئی تھی کہ میں ڈر رہا تھا۔

میں ذرا قریب چلا گیا جہاں انگیٹھی پر دیگچی میں کچھ ابل رہا تھا۔ چرس کی بو کے درمیان ہی چائے کی مہک میرے نتھنوں سے ٹکرائی۔

"بیٹھ جاؤ۔" دیو زاد نے اشارہ کیا۔ میں وہیں بیٹھ گیا جہاں کھڑا تھا۔ وہ سب عجیب سی نظروں سے مجھے سرتاپا گھور رہے تھے۔ شاید نظروں ہی نظروں میں تول رہے تھے۔ میں بھی ان کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ سب میلی کچیلی شلوار قمیضوں میں ملبوس تھے۔ دیو زاد کے جسم پر میلی سی واسکٹ بھی تھی۔ ان میں سے ایک دبلا اور لمبا اور طویل قامت تھا۔ اس کی ناک کے قریب ایک موٹا سا مسا تھا۔ ایک ناٹا مگر چوڑا چکلا اور مضبوط آدمی تھا۔ تیسرا بھی جسامت میں تقریباً اتنا ہی تھا مگر اس کے چہرے پر چیچک کے گہرے داغ تھے چھوٹی سی مونچھیں بھوری اور رنگت گوری تھی۔ اگر وہ کچھ صاف ستھرا ہوتا اور اس کا لباس قرینے کا ہوتا تو وہ کسی معزز گھرانے کا فرد لگتا۔ پانچویں کی شکل لومڑی سے مشابہ تھی مگر جسم بیل کی طرح مضبوط نظر آتا تھا۔ مجھے یہاں لانے والے آدمی کو ملا کر وہ چھ آدمی تھے اور ان میں سے کوئی بھی کم خطرناک نہیں لگتا تھا۔ ان کی نظریں میرے جسم میں چبھ رہی تھیں۔

"گھر سے بھاگ کر آیا ہے کیا؟ بیٹو بیٹھے؟" دیو زاد نے پوچھا اور بالوں میں گھرے ہوئے اس کے موٹے موٹے ہونٹ کھل گئے۔ شاید وہ مسکرایا تھا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"کسی سے جھگڑا کر کے آیا ہے؟" اس نے کھردری آواز میں پوچھا۔ میں نے اس بار بھی نفی میں سر ہلا دیا۔

"تو پھر یہ بازو کسی شیر کے منہ میں دے دیا تھا کیا؟" اس نے میرے بازو کی طرف اشارہ کیا جس کی پٹی اب خون میں پوری طرح بھیگ چکی تھی۔

میں نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلایا تو وہ جھنجھلا کر بولا۔

"منہ میں زبان نہیں ہے کیا جو یہ دھڑی بھر کا سر ہلائے جا رہا ہے؟"

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "نہ میں گھر سے بھاگ کر یہاں پہنچا ہوں نہ میرا کسی سے جھگڑا ہوا ہے۔" میں نے ملائمت سے کہا۔ "میں کسی کی تلاش میں نکلا ہوا ہوں اور یہ بازو ۔۔۔ یہ ایک مشین پر کام کرتے ہوئے زخمی ہو گیا تھا۔"

"اسے پہلے جھوٹ بولنے کا ڈھنگ تو سیکھ لے پھر استادوں کے سامنے زبان چلانا بے۔" دیو زاد نے سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھیوں نے ہم آہنگ ہو کر قہقہہ لگایا پھر ان میں سے چیچک زدہ چہرے والا بولا۔ "دیکھ کہیں وہ آدمی ہم ہی تو نہیں جس کی تجھے کھوج ہے؟" اس نے اپنا مکا اور آگے کر دیا۔

باقیوں نے بھی اس کی تقلید کی۔ میں خاموش رہا۔ ان کی ایسی ہنسی مجھے ناگوار گزر رہی تھی۔ انہوں نے ایک بار پھر ہم آہنگ ہو کر قہقہہ لگایا اور گردنیں سیدھی کر لیں۔ ان کا قہقہہ ویران عمارت میں اس طرح گونجا تھا جیسے کسی کھنڈر میں سینکڑوں بدروحیں چلا اٹھی ہوں۔ دیو زاد نے اب اپنا ریوالور اٹھا لیا تھا اور اسے کھلونے کی طرح بار بار ہاتھ میں اچھال رہا تھا۔

لومڑی کی شکل والے نے ایک میلے کپڑے سے دیگچی پکڑ کر انگیٹھی سے اتاری اور قریب رکھی اکلوتی پیالی میں چائے انڈیلی۔ "چائے پیئے گا؟" اس نے دیگچی واپس انگیٹھی پر رکھ کر مجھ سے پوچھا اور تب مجھے اچانک احساس ہوا کہ بہت دیر سے میرے معدے میں جو ٹیسیں اٹھ رہی تھیں وہ دراصل بھوک کی تھیں۔ میں نے صبح ناشتہ کیا تھا اور اس کے بعد سے اب تک کچھ نہیں کھایا تھا۔ مجھے چائے کی مہک اتنی اچھی لگ رہی تھی۔ بھوک کے احساس سے یک لخت مجھ پر نقاہت سی طاری ہو گئی۔ تھوک نگل کر میں نے چائے کی پیالی کی طرف دیکھا اور اثبات میں سر ہلایا۔

"قیمت ادا کرنی پڑے گی۔" لومڑی کی شکل والے نے کہا۔

"میرے پاس تھوڑے سے پیسے ہیں۔" میں نے کہا "کیا قیمت لو گے؟"

"تم جیسے نئی عمر کے چھوکروں سے ہم قیمت پیسوں میں نہیں لیتے۔" چیچک زدہ چہرے والے نے کہا اور ایک بار پھر انہوں نے قہقہہ لگایا اور تب میں نے محسوس کیا کہ اتنی بھوکی نظروں سے میں چائے کی پیالی کو نہیں دیکھ رہا تھا جتنی بھوکی نظروں سے وہ مجھے گھور رہے تھے۔ پہلی بار خوف کی ایک ہلکی سی لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ اب میں نے ایک نئے زاویہ نگاہ سے ان کا جائزہ لیا۔ لومڑی کی سی شکل والا میرے سب سے قریب تھا اور ان کا سردار مجھ سے سب سے زیادہ فاصلے پر تھا اور اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور یہی ایک چیز میرے لئے سب سے زیادہ خطرناک تھی۔ خصوصاً ایسے وقت میں جب کہ میرے زخمی بازو، بھوک، تھکن اور اعصابی توڑ پھوڑ نے میری توانائی سے زیادہ جان کھینچ رکھی تھی۔

"چپ کیوں ہو گیا؟ لے چائے پی لے۔" لومڑی کی سی شکل والے نے چائے کی پیالی اٹھا کر میری طرف بڑھائی۔

"مجھے نہیں۔۔۔ مجھے نہیں چاہیے۔" میں نے کہا۔

"ڈر گیا بے چارا۔" چیچک زدہ چہرے والے نے کہا۔

"اب زیادہ نخرے نہ دکھا۔۔۔ چل۔۔۔ پی لے۔" لومڑی نما آدمی نے سخت لہجے میں کہا اور پیالی دوبارہ میری طرف بڑھائی۔ میں نے پیالی لے لی۔ ایک چسکی لینے سے میرے خشک ہونٹ کچھ نم ہوئے اور پھر جی چاہا کہ ایک ہی سانس میں یہ کھولتا ہوا سیال معدے میں انڈیل لوں تاکہ جسم میں کچھ تو زندگی کی حرارت دوڑے۔ بمشکل میں نے اپنے آپ کو اس خواہش کی تکمیل سے باز رکھا۔ یہ گرم سیال اس وقت میرے لئے بہت اہم تھا۔

چسکی لے کر میں نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ سب ساکت بیٹھے میری ہی طرف دیکھ رہے تھے گویا میں کوئی دلچسپ تماشا پیش کر رہا تھا۔

پیالی ہتھیلی پر سنبھال کر میں نے دوبارہ چسکی لینے کے لئے سر جھکایا لیکن اس بار میں نے چسکی لینے کے بجائے پیالی سردار کے منہ پر کھینچ ماری۔

حتی الامکان پھرتی سے اٹھتے ہوئے میں نے انگیٹھی کو ٹھوکر رسید کی۔ انگاروں کے بکھرنے اور دیگچی کے الٹنے کا منظر میں نے نہیں دیکھا اور دروازے کی طرف چھلانگ لگا دی۔ وحشیانہ چیخیں اور دیو زاد کی دہاڑ میں نے اپنے عقب میں سنی لیکن میں دروازہ پار کر چکا تھا۔

اندھیرے میں تیزی سے سیڑھیاں عبور کرنا خطرناک کام تھا۔ تاہم میں نے جنگلے پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ میں آخری سیڑھی پر تھا جب میرے عقب میں سیڑھیوں پر دھڑ دھڑ کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں اور پھر ایک فائر ہوا۔ دھماکہ تو میرے کان کے قریب ہی ہوا تھا تاہم گولی سے میں بچ گیا تھا۔ میں تیزی سے اس راستے کی طرف بھاگا جس سے اس عالم عذاب میں داخل ہوا تھا۔

"چھوڑوں گا نہیں سالے کو۔۔۔" میں نے اب کافی فاصلے پر دیو زاد کی گونج سنی۔ دروازے سے نکل کر میں تاریک سڑک کی سیدھ میں بھاگتا چلا گیا۔ پیچھے پکی زمین پر ان کے قدموں

کی دھپ دھپ سنائی دے رہی تھی۔ وہ بھری زیر تعمیر عمارت کے گرد چکر کاٹنے کے بعد میں یک لخت کھلے میدان میں پہنچ گیا۔ جہاں ہلکی روشنی تھی۔ میدان میں بھاگنے کی صورت میں مجھے بڑی آسانی سے گولی ماری جا سکتی تھی۔ چنانچہ میں بائیں طرف مڑ گیا اور عمارت کی عقبی دیوار کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔ قدموں کی آوازیں میرے تعاقب میں تھیں۔ تاہم ریوالور نے دوسرا فائر نہیں کیا تھا۔ میں اپنی تمام تر شکستہ حالی کے باوجود حتی الامکان تیزی سے بھاگ رہا تھا۔

دفعتہً کچی زمین ختم ہو گئی اور میں سڑک پر آگیا۔ سڑک تیزی سے عبور کر کے میں ایک گلی میں گھس گیا۔ گلی کافی طویل تھی اور اس میں روشنی بھی تھی۔ قدموں کی آوازیں گو کہ کافی پیچھے رہ گئی تھیں لیکن وہ لوگ میرا پیچھا چھوڑنے پر تیار نظر نہیں آتے تھے۔ دائیں بائیں مجھے کوئی جائے پناہ نظر نہیں آرہی تھی اور اگر میرے گلی عبور کرنے سے پہلے وہ پچھلے موڑ پر پہنچ جاتے تو آسانی سے میرا نشانہ لے سکتے تھے۔

بھاگتے بھاگتے اچانک میری نظر الیکٹرک پول کے عین قریب پتھریلی سڑک کے وسط میں موجود مین ہول کے ڈھکن پر پڑی۔ زنگ آلود اور گرد سے اٹا ہوا آہنی ڈھکن سڑک کے سینے پر پیوند کی طرح چپک رہا تھا۔ میں نے جھک کر ڈھکن کے کنڈے میں انگلیاں پھنسائیں اور اسے اوپر کو کھینچا جو کناروں پر اَٹی ہوئی مٹی میں خاصی سختی سے پیوست تھا لیکن میرے جھٹکا دینے پر بہرحال نکل آیا۔

میں نے مین ہول میں جھانک کر دیکھا میری توقع کے مطابق ایک کونے میں اوپر سے لے کر نیچے تک لوہے کی سلاخیں پیوست تھیں جو سیڑھیوں کا کام دیتی تھیں۔ میں نے ڈھکن ایک طرف کھسکا کر رکھا اور اندر لٹک کر ان سلاخوں پر پیر رکھتا نیچے اتر گیا۔ سر بھی سطح زمین کے نیچے آجانے کے بعد میں نے ایک ہاتھ سے ڈھکن کھسکا کر دوبارہ مین ہول کے دہانے پر رکھ لیا اس عمل میں مجھے بہت کم وقت لگا تھا لیکن اگر اس دوران وہ لوگ گلی کے موڑ پر پہنچ چکے تھے اور انہوں نے مجھے مین ہول میں اترتے دیکھ لیا تھا تو پھر یہی غلیظ کنواں میری قبر بننے والا تھا۔ غیر ارادی طور پر میں کچھ اور سیڑھیاں نیچے اتر گیا گٹر کا بہتا متعفن پانی اب میرے پیروں سے فقط چند انچ ہی نیچے رہ گیا تھا۔ سیلن، گھٹن اور سڑاند سے سانس لینی دوبھر ہو رہی تھی۔ چنانچہ میں نے سانس روک لی تھی۔

یوگا کی مشقوں سے استفادہ کرنے کا یہ بہترین موقع تھا ایک بار میرا ہاتھ مین ہول کی دیوار سے مس ہو گیا۔ میری انگلیوں نے ایک ایسی گندگی کا لمس محسوس کیا جس کے تصور ہی سے مجھے ابکائی سی آنے لگی تھی اگر میں نے سانس نہ روکی ہوتی تو یقینی طور پر قے آجاتی۔

میں ایک ہاتھ سے سلاخ تھامے اور نیچے ایک سلاخ پر دونوں پاؤں جمائے ساکت کھڑا تھا۔ چند سیکنڈ بعد میں نے قدموں کی دھپ دھپ سنی۔ یہ آوازیں تیزی سے قریب

آگئیں اور میری دھڑکنیں تیز تر ہوتی گئیں۔ اس وقت میں نے اپنے سینے میں مقید سانس کو دھیرے دھیرے آزاد کیا۔ جب دھپ دھپ کی یہ آوازیں مین ہول کی ڈھکن پر گزرنے کے بعد آگے بڑھتی چلی گئیں۔ کچھ دیر بعد یہ آوازیں معدوم ہو گئیں لیکن میں نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ میرا خیال تھا کہ میری تلاش میں ناکام ہونے کے بعد غالباً وہ اسی راستے سے واپس آئیں گے۔ اس وقت تک کے لئے میرا اس کمین گاہ کو چھوڑنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے ایک بار پھر سانس روکی اور انتظار کرنے لگا۔

محض اس لئے مجھے ایک تکلیف دہ احساس ہوا۔ میرے زخمی بازو پر بندھی ہوئی پٹی میں اب خون کو مزید جذب کرنے کی گنجائش نہیں تھی اور خون کی بوندیں اب غلیظ پانی میں ٹپک رہی تھیں۔

"خدایا۔ کیا اس زخم کے راستے میرے جسم کا تمام خون بہہ جائے گا؟" میں نے شدید ہول سے سوچا۔ گو کہ مجھے خون کے ٹپکنے کا صرف احساس تھا اور میں اسے دیکھ نہیں پا رہا تھا پھر بھی میں نے یوں آنکھیں بند کر لیں گویا اس طرح یہ تکلیف دہ احساس کم ہو جائے گا۔

کچھ دیر بعد میں نے چوں چوں کی ایک کریہہ سی آواز سن کر آنکھیں کھولیں۔ میرے چہرے کے قریب ہی دو گول گول نقطے سے چمک رہے تھے۔ چوں چوں کی کریہہ آواز دوبارہ مین ہول میں گونجی اور تب مجھے احساس ہوا کہ وہ ایک چوہا تھا اور غالباً خون کی بو پا کر کہیں سے آن پہنچا تھا۔ دنیا میں مجھے سب سے زیادہ کراہت چوہے سے آتی تھی اور پھر گٹر کا چوہا۔ میرا دل متلانے لگا۔ اس سے پہلے کہ میں اسے ٹھوکر رسید کرتا وہ میری پتلون پر چڑھ گیا۔ میں نے ٹانگ کو جھٹکا دیا مگر وہ بری طرح چمٹ چکا تھا۔ میری ٹانگ ساکت ہوتے ہی وہ کچھ اور اوپر چڑھ آیا۔ مجھے اپنی ٹانگ پر اس کا باقاعدہ وزن محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی جسامت بلی سے شاید کچھ ہی کم تھی۔

میں اسے ہاتھ لگانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن اس وقت نہ جانے کس طرح میں نے زخمی بازو والے ہاتھ سے اسے ہٹا جھٹکنے کی کوشش کی غلاظت میں لتھڑی ہوئی لمبی اور بالوں بھری کھال کے لمس سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ چوہا ٹانگ پر سے تو ہٹ گیا لیکن پنجوں میں لپٹے ہوئے بازو سے چمٹ گیا۔ میں نے زخمی بازو کو دیوانہ وار جھٹکے دیئے اور ہر جھٹکے پر میرے حلق سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی لیکن چوہا گویا پنجوں کے ساتھ ہی لپٹ گیا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے سلاخ پکڑ رکھی تھی۔ اسے چھوڑنے پر میں سیدھا نیچے غلاظتوں کے دھارے میں گر جاتا۔

یک لخت اس متعفن کنویں میں میرا دم گھٹنے لگا اور آنکھیں گویا حلقوں سے نکلنے لگیں۔ سر بری طرح گھوم رہا تھا۔ میں نے مین ہول کی محدود ہوا میں پے در پے لمبی لمبی

سانسیں لی تھیں۔ پھر چوہے کے دانت سوئیوں کی طرح میرے زخمی بازو میں اترتے چلے گئے۔ اب میں اپنی چیخ کو نہ روک سکا۔ معلوم نہیں میری آواز باہر تک گئی تھی یا اسی جگہ عذاب میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔ بہرحال اب مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ چوہے کے دانت مشین کی سی تیزی سے میرے زخمی بازو کو چھید رہے تھے مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں مزید ایک لمحہ بھی اسی حال میں رہا تو بے ہوش ہو کر گر پڑوں گا۔

میں اندھا دھند سیڑھیاں چڑھتا گیا۔ میرے خون کے پیاسے گلی میں واپس آئے تھے یا نہیں مجھے اب اس کی بھی کوئی پروا نہیں تھی۔ میرے ہوش و حواس مختل ہو چکے تھے۔ میرا سر کسی ہول کے ڈھکن سے ٹکرایا اور میں نے مزید ایک سیڑھی چڑھ کر سر ہی سے اسے اوپر کو الٹ دیا اور اس سانپ کی طرح تیزی سے باہر نکل آیا جس کے بل میں آگ بھڑک رہی ہو۔ آزاد ہوا میرے نتھنوں سے ٹکرائی لیکن میرے حواس کو سنبھالا نہ دے سکی۔

میں پاگلوں کی طرح گلی میں ادھر ادھر بھاگنے لگا۔ نہ جانے کتنی دیر میں یونہی چکراتا رہا۔ پھر مجھے ایک دیوار نظر آئی اور میں نے اپنے بازو کو اس پر دے مارا۔ ایک بار دوبار تین بار ہر ضرب پر چوہا دیوار کے ساتھ کچلا گیا۔ آخر کار اس کے دانت میرے گوشت کی تہوں سے نکل آئے اور وہ چت سے آنگن پر آگرا اور ساکت ہو گیا لیکن اس کی لمبی سی کٹی دم اب بھی جھٹکے لے رہی تھی۔

دھندلائی ہوئی نظروں سے میں نے دیکھا چوہا واقعی جسامت میں کسی اوسط درجے کی بلی سے کم نہیں تھا اور وہ پورا کا پورا سیاہ تھا صرف اس کی تھوتھنی کا کچھ حصہ سرخی مائل بھورا تھا۔

میرا زخمی بازو اب بے جان انداز میں میرے پہلو میں جھول رہا تھا۔ لیکن مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اسے کاٹ کر میرے جسم سے علیحدہ کر لیا گیا ہے۔ میں چند لمحے دیوار کے سہارے سنبھلنے کی کوشش کرتا رہا پھر چکرا کر گرا اور لامتناہی اندھیرے نے مجھے آغوش میں لے لیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو سب سے پہلا احساس مجھے یہی ہوا کہ مجھے قبر میں اتارا جا چکا ہے۔ وہ جگہ اتنی ہی تنگ اور سیلن زدہ تھی۔ پھر مجھے اپنا خیال بدلنا پڑا۔ میں ایک جھلنگا سی چارپائی پر لیٹا ہوا تھا اور میری آنکھوں کے عین اوپر چھت میں ایک چھوٹا سا بلب تھا۔ جس کی زرد سی روشنی یوں تو نہ ہونے کے برابر تھی لیکن اس وقت میری آنکھوں میں چبھ رہی تھی۔ قبر میں چارپائی اور بلب نہیں ہو سکتا تھا۔ تو پھر میں کہاں تھا؟ میں نے اور اسی دوران میں کھسر پھسر کی آواز سنی۔ ذرا سی گردن موڑ کر میں نے آواز کی سمت نگاہ دوڑائی۔ سفید بنیان اور چار خانے کی دھوتی پہنے ایک دبلا اور سانولا سا نوجوان گھٹنوں کے سے سینے کے ساتھ ہاتھوں کے فرش پر جمائے دے رہا تھا اور بڑی محنت سے

ہاتھوں کی درمیانی رگوں سے بھی مٹی نکال رہا تھا۔

مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر وہ پھاوڑا رکھ کر میری طرف لپکا اور قریب آکر گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے بولا۔ "کیوں شہزادے اب کیسی طبیعت ہے؟"

"میں کہاں ہوں؟" میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے پوچھا۔

"عاشق علی عرف طبلہ کے گھر میں۔" اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھک کر اور جھکتے ہوئے کہا۔

"طبلہ؟" میں نے حیرت سے دہرایا۔

"یہ میرا فلمی نام ہے" اس نے انتہائی سادگی سے جواب دیا۔ اس کے پتلے ہونٹوں پر اتنی مختصر مونچھیں تھیں کہ پہلی نظر میں گمان گزرتا تھا کہ شاید وہ مکھیاں بیٹھی ہیں۔

"تو تم فلمی آدمی ہو؟" میرے منہ سے اچانک نکلا۔ درحقیقت میں پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا وہ فلموں میں کام کرتا ہے۔

"ہوں" اس نے پھیکی پھیکی سی آواز میں اتنا طویل قہقہہ لگایا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے یہ قہقہہ نہیں شاید اپنے حال پر خود ہی رو دینے والے کسی انسان کی طویل چیخ تھی۔

"تم فلموں میں رہتے ہیں کیا؟" اس کے سینے کی گہرائی سے زخمی سی آواز نکلی۔ "وہ تو ہیرو، ہیروئن اور باقاعدہ پر رہتے ہیں۔ میں تو ایکسٹرا ہوں' ایکسٹرا! دنیا میں بھی ایکسٹرا اور فلموں میں بھی ایکسٹرا۔ یعنی اگر میں نہ بھی ہوتا تب بھی دونوں کا کام چلتا رہتا۔ کبھی کبھار کسی فلم میں کام مل جاتا ہے تو بیس تیس روپے دیہاڑی مل جاتی ہے۔ جب میں نے تمہیں گلی میں بے ہوش پڑے دیکھا تو اپنی رحم دلی کی عادت سے مجبور ہو کر تقریباً گھسیٹتا ہوا اپنی کھولی میں لے آیا۔ حالانکہ یہ بمبئی ایسا شہر ہے کہ اگر راستے میں کسی کو لاش بھی پڑی نظر آجائے تو وہ اسے پھلانگ کر اور زیادہ تیزی سے گھر کی طرف چل دیتا ہے۔"

وہ میرے قریب ہی فرش پر چوکڑی مار کر بیٹھ گیا۔ "لیکن یہ جو اپنا دل ہے نا سالا!" اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "یہ موم کا بنا ہوا ہے۔ میں جب تم کو یہاں لایا تو تمہارے بازو سے اتنا خون بہہ رہا تھا جتنا سرکاری نل سے پانی بھی نہیں آتا۔ میں دوڑا دوڑا ڈاکٹر تیلا کے گھر گیا۔ اب تم شاید اس نام پر بھی حیران ہو گے۔ نام تو اصل میں اس کا ڈاکٹر انور جعفر ہے لیکن وہ دبلا لمبا ہے کہ ہم سب کھولیوں والے اسے اتفاق رائے سے ڈاکٹر تیلا کہتے ہیں۔ لیکن بھائی۔۔۔ ہے بڑا کمال کوئی۔ اس نے تمہارے زخموں پر صرف ایک سرخ سی دوا لگائی۔ پھر ایک پاؤڈر بھر دیا اور خون یوں رک گیا جیسے روتے ہوئے بچے کو مٹھائی ملنے پر اس کے آنسو رک جاتے ہیں۔"

میں نے اپنے بازو پر نظر ڈالی۔ اس پر اب کوئی پٹی وغیرہ نہیں تھی۔ بس سرخ سرخ

گیلوں کے درمیان ساجد پاؤڈر بھرا ہوا تھا اور وہ بالکل خشک تھا۔ پانو میں اب کوئی تکلیف بھی نہیں تھی۔

اور ان باتوں معلوم ہوتا تھا اپنی دھن میں مگن کہہ رہا تھا۔ "بالکل ہونے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر تھا میری طرح رحم دل بھی خاصا ہے اب یہی دیکھو لو کر رات کے وقت گھر سے آنے کی فیس تمہیں روپے سے کم نہیں لیکن میرے پاس کل انتیس روپے تھے وہی صبر شکر کر کے لے گیا۔ ایک روپیا معاف کر گیا۔" اس نے دونوں ہاتھ پیچھے پر رکھ کر ایک گہری سانس لی۔ "تو یہ تھی بھائی کل کی کہانی اب تم ہوش میں آگئے ہو۔ بیٹا" بھوکے بھی ہو گے اور کچھ کھانے کو بھی مانگو گے۔ تو اس سلسلے میں عرض یہ ہے وہی انتیس روپے اپنی کل پونجی تھی۔ گھر میں کھانے پکانے کا معاملہ نہیں ہے اور ہوٹل والا ملباری ادھار نہیں کرتا کم از کم مجھ سے تو نہیں کرتا۔"

"کیا اتنی رات گئے ہوٹل کھلا ہو گا؟" میں نے پوچھا۔ کھانے کا نام سن کر اچانک میرے معدے میں ایک بار پھر ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔

"رات گئے؟" طیلہ ایک بار پھر خود استہزائی کے انداز میں ہنسا۔ "بھائی یہ دوپہر کا وقت ہے۔ کھولی میں جلتے ہوئے بلب پر نہ جاؤ۔ یہ غریب آدمی کا گھر ہے۔ یہاں سے روشنی کا گزر کم ہی ہوتا ہے۔"

نقاہت کے اس عالم میں میں نے ذرا پہلو بدلا اور مشکل سے پتلون کی جیب سے بٹوا نکال کر فرش پر پھینکتے ہوئے کہا۔ "اس میں کچھ پیسے ہیں بھائی طیلہ جتنی جلدی ممکن ہو اپنے اور میرے لئے اچھے سے اچھے کھانے کا انتظام کرو۔"

"یعنی ۔۔۔ کہ ۔۔ تمہاری طرف سے اجازت ہے؟" اس نے جھجکتے ہوئے پرس اٹھایا۔

"کیسی باتیں کر رہے ہو یار! تم نے مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ اب اگر تم مجھے اٹھا کر بیچ بھی دو تو مجھے کوئی شکوہ نہیں ہو گا۔" میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"سچ یار!" اس نے باقاعدہ ہاتھ اٹھا کر نعرہ لگایا۔ "تم بھی اپنی طرح کھلے دل کے آدمی ہو۔" اس نے بٹوا کھول کر اس میں سے پچاس کا ایک نوٹ نکالا اور اٹھ کر اس دروازے سے باہر چلا گیا جو پہلی نظر میں محض روشن دان معلوم ہوتا تھا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے لیٹے لیٹے گردو پیش پر نظر ڈالی۔ کمروری اور بغیر پلاستر کے سیلن زدہ دیواروں والی یہ کوٹھری بس اتنی ہی بڑی تھی کہ دو چیزیں اس میں سما سکیں۔ فرنیچر کے طور پر اس میں صرف یہی جھلنگا سی چارپائی تھی جس پر میں لیٹا ہوا تھا۔ پہلی دیوار کے ساتھ چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں صراحی اور اس پر المونیم کا گلاس اوندھا رکھا ہوا تھا۔ ایک طرف سیمنٹ کا بالکل اونچا چبوترا تھا جس پر بالٹی اور لوٹا رکھا

تھا۔ یہ شاید نہانے کی جگہ تھی۔ ایک طرف دیوار پر کھونٹوں کے دو تین ہینگر لگے ہوئے تھے اور ان کے قریب ہی کیلوں پر چند کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔ فرش پر چٹائی کے قریب ٹین کا ایک سیاہ ٹرنک رکھا تھا جس پر ایک میلی رضائی نہایت سلیقے سے تہہ کر کے رکھی ہوئی تھی۔

چند منٹ بعد ہی طیلہ بڑی شان سے ایک ہاتھ سے دھوتی کی لو سنبھالے کھولی میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے گیارہ بارہ سال کا ایک مفلوک الحال لڑکا دونوں ہاتھوں پر کھانے کی ٹرے اٹھائے آرہا تھا۔ ٹرے فرش پر رکھوانے کے بعد طیلہ نے اسے حکم دیا۔ "دس منٹ بعد کڑک چائے کے دو گلاس بھی لے آنا۔" لڑکا اثبات میں سر ہلا کر ایک اچٹتی سی نظر مجھ پر ڈال کر باہر چلا گیا۔

میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو بے پناہ نقاہت محسوس ہوئی۔ طیلہ نے سہارا دے کر مجھے چارپائی سے اتارا اور ہم چٹائی پر بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔ پہلے دو ایک لقمے تو گویا حلق کو چھیلتے ہوئے معدے میں اترے۔ اس کے بعد میں بھوکوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ یہ میری زندگی کا لذیذ ترین کھانا تھا اور کھانے کے بعد صراحی کے ٹھنڈے پانی اور گرم گرم کڑک چائے نے گویا حواس کی بند آنکھیں کھول دیں۔ ساری کلفت اور نقاہت دور ہو گئی۔ اب جو تھوڑی بہت کمزوری باقی تھی وہ شاید خون ضائع ہو جانے کی وجہ سے تھی۔

"واہ مولا! رزق دینے والا بے شک تو ہی ہے۔" طیلہ نے چائے کا گلاس ایک طرف رکھ کر دونوں ہاتھ دعائیہ انداز میں اٹھا کر بڑے معتقدانہ لہجے میں کہا اور دیوار سے ٹیک لگالی۔ میری رگ رگ میں ابھی چند لمحے پہلے تک بجلی سی دوڑی تھی لیکن اب عجیب سا خمار طاری ہو رہا تھا۔ شاید یہ گندم کا خمار تھا۔ میں نے بھی دیوار سے ٹیک لگالی۔

"اب کیا پروگرام ہے بھائی؟" طیلہ نے نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "میں تو اسٹوڈیو جانے کی سوچ رہا تھا۔ ایکسٹرا سپلائر نے بلایا تھا۔ شاید کوئی کام نکل آئے شوٹنگ تو کئی فلموں کی چل رہی ہے۔"

"ٹھیک ہے تم ہو آؤ۔" میں نے کہا۔ "میں اتنی دیر آرام کر لوں گا۔ اگر تم اجازت دو گے تو چند دن میرا قیام یہیں رہے گا۔"

"اس کے لئے اجازت کی نہیں پیسوں کی ضرورت پڑے گی میرے بھائی اگر میری باڑی چلتی رہی تب تو فکر کی کوئی بات نہیں۔ ویسے تو ادھار کی ضرورت نہیں۔ ابھی تک تو مولا کا کرم رہا ہے کہ کبھی فاقے کی نوبت نہیں آئی لیکن اگر آ جائے تو حوصلہ مت ہارنا۔" اس نے اٹھ کر کھونٹی پر لٹکے ہوئے کپڑوں میں ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"فاقے کی نوبت نہیں آئے گی۔" میں نے رفیق سے کہا۔ "چند دن کے گزارے کو تو میرے پاس پیسے موجود ہیں اور اگر زیادہ ہی کوئی مسئلہ ہوا تو میرے پاس یہ بھی ہے۔"

میں نے گلے میں پڑی ہوئی سونے کی زنجیر اسے دکھائی جو واقعی تین تولے سے کم نہیں تھی۔

"تب پھر تو فکر کی کوئی بات نہیں۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔" وہ اپنی انگلی سے پتلون پہنتے ہوئے گنگنایا پھر سنجیدہ ہو کر بولا۔ "ایک دوسرے کی داستان غم پھر کبھی فرصت میں بیٹھ کر سنیں سنائیں گے۔ اب میں چلتا ہوں۔ تم بے فکر ہو کر لمبی تان کر سو جانا، اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو دروازے سے نکل بائیں ہاتھ پر سیڑھیاں چڑھ کر سامنے ہی گلی میں ملباری کے ہوٹل چلے جانا۔ پیسے ملباری کے منہ پر مارنا اور وہ تمہاری مطلوبہ چیز فوراً باہر والے کے ہاتھ بھیج دے گا۔ پیسوں کے ذکر پر یاد آیا۔ ذرا بس کے کرائے وغیرہ کے لئے پانچ روپے تو عنایت فرماؤ۔"

بٹوا چٹائی کے قریب ہی پڑا تھا۔ میں نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "غیر دوستانہ قسم کی باتیں کیوں کرتے ہو یار! جتنے پیسوں کی ضرورت ہو اس میں سے نکال لو۔"

وہ اسی سی پتلون پر ایک شکن آلود قمیض پہن چکا تھا اور دیوار پر لگے آئینے کے سامنے کھڑا تیل میں چپڑے ہوئے بالوں کو جوڑے سے سنوار کر پیشانی پر ہٹا رہا تھا۔ میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اس کے جانے کے بعد اطمینان سے لیٹ کر اس ڈائری کا مطالعہ کروں گا جو ممی نے مجھے دی تھی اور جس میں یقیناً ان کے میری زندگی کے تمام اہم ترین سوالوں کے جواب موجود تھے اور تب اچانک جیسے میرے ذہن میں دھماکا سا ہوا۔ ڈائری تو پتلون کی جیب میں تھی اور پتلون اس وقت میرے آس پاس کہیں موجود نہیں تھا۔ مجھے یاد آیا کہ پتلون تو میں عجلت میں اس لڑکی شہلا کے کمرے ہی میں چھوڑ آیا تھا جو کوٹ بنا کر ساتھ لے گئی تھی۔

طلحہ اس وقت میرے پرس میں پانچ کا نوٹ ڈھونڈ رہا تھا۔ میں نے گھبرائے ہوئے انداز میں اسے بازو سے جا پکڑا۔ وہ طرف سے اچھل پڑا۔ "کیا بات ہے؟ تمہارا ارادہ بدل گیا ہے کیا؟" اس نے پوچھا۔

"طلحہ! اس علاقے کا نام کیا ہے؟" میں نے اس کے سوال پر دھیان دیئے بغیر کہا۔

"گلورش نگر۔" اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ "لیکن نام سے کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہونا۔ یہاں زیادہ تر وہی لوگ رہتے ہیں جن کا ایک بھی آرزو پورا نہیں ہوا۔ اب محمدی کو لے لو۔"

"ٹیکسی اسٹریٹ؟" اس نے ذہن پر زور دیا پھر چٹکی بجاتے ہوئے بولا۔ "ہاں۔۔۔ یاد آیا۔ کافی دور ہے یہاں سے۔۔۔ کیوں بات کیا ہے؟"

"وہ بات دراصل یہ ہے طلحہ! کہ میں وہاں ایک لڑکی کے گھر اپنا کوٹ بھول گیا ہوں۔ کوٹ میں کچھ ضروری کاغذات ہیں۔" میں نے مضطربانہ لہجے میں کہا۔ "تم ذرا میرے

ساتھ چلو۔ ٹیکسی میں چلتے ہیں۔۔۔ دراصل میں یہاں اجنبی ہوں۔"

"اچھا" اس نے گویا اطمینان کی سانس لی۔ "شکر ہے تم تو کوٹ ہی بھول آئے ہو۔ ہمارے ایک ڈائریکٹر صاحب ہیں۔ وہ کسی لڑکی کے ہاں جاتے ہیں تو پتلون ہی بھول آتے ہیں۔ ویسے استاد! داستان تمہاری بھی کچھ پُرپیچ ہی معلوم ہوتی ہے ٹیکسی اسٹریٹ پر لڑکی کے ہاں کوٹ بھول آنا۔۔۔ اور پھر فیکٹری ایریا میں ایک گلی میں زخمی حالت میں پڑے پائے جانا۔۔۔ واللہ۔۔۔" وہ خود کلامی کے سے لہجے میں بولا پھر قدرے چونک کر پوچھنے لگا۔ "لڑکی کے بھائی آپہنچے تھے کیا؟"

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "وہ اکیلی ہی تھی۔۔۔ پیشہ ور قسم کی۔ میرے زخمی ہونے کا چکر دوسرا تھا۔ اب وقت ضائع نہ کرو۔ میرے ساتھ چلو۔"

"چلو بھائی!" اس نے ٹھنڈی سانس لے کر ایک بار پھر آئینے میں اپنا جائزہ لیا اور دروازے کی طرف بڑھا تو مجھے اپنی قمیض کا خیال آیا جس کی آستین کندھے تک خون میں لتھڑ کر خشک ہو چکی تھی۔

"یار طلحہ! تمہارے پاس کوئی دوسری قمیض نہیں ہو گی؟" میں نے پوچھا۔

"قمیض؟" اس نے عجیب انداز نظر سے میرا سرتاپا جائزہ لیا۔ "قمیض تو ہو گی لیکن سوال یہ ہے کہ کیا میری قمیض تمہیں آجائے گی؟ یہ جن کی کھال گھوڑے پر منڈھنے والی بات ہے۔۔۔ لیکن خیر۔۔۔ میں نے پانچ چھ سال پہلے کی ایک قمیض بطور تبرک سنبھال کر رکھی ہوئی ہے۔ اسے اچانک یاد آیا۔

"کس بات کے تبرک پر؟" میں نے غیر ارادی طور پر پوچھا۔ "کہ کبھی میں بھی صحت مند تھا۔" اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا اور صندوق کی طرف بڑھ گیا۔ رضائی ہٹا کر اس نے صندوق کھولا اور ڈھونڈ ڈھانڈ کر اس میں سے ایک پرانی اور مسلی ہوئی سی زرد قمیض نکالی۔ یقین نہیں آتا تھا کہ یہ قمیض طلحہ ہی کی رہی ہو گی۔ پر مجھے کچھ ڈھیلی ہی رہی۔

قمیض پتلون میں اڑسنے کے بعد میں نے ادھر ادھر دیکھا اور جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "تمہارے پاس بھیا! کوئی ٹوپی اور سیاہ شیشوں والی عینک بھی ہو گی؟"

"بات کیا ہے یار؟" اس نے شک آلود سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "پولیس سے بھاگے ہوئے تو نہیں ہو؟"

"ایسی کوئی بات نہیں یار!" میں نے اس کا کندھا تھپکا۔ "بس وہ ذرا ایک لڑکی کے معاملے میں کچھ نٹ بولٹ میرے دشمن بنے ہوئے ہیں۔ اب ان سے سامنا ہونے کا کوئی امکان تو نہیں لیکن میں فی الحال احتیاط ہی سے کام لینا چاہتا ہوں۔ بازو زخمی ہے اس لئے لڑائی بھڑائی سے پرہیز ہی رکھوں تو بہتر ہے۔"

"ایک رات کی دوستی میں سو لاکھ دینا پڑا!" وہ بڑبڑایا پھر قدرے بلند آواز میں بولا۔
"دونوں چیزیں ہیں تو سہی میرے پاس لیکن انھیں پہن کر اچھے بھلے کارٹون لگو گے۔"

"پروا نہیں۔ تم نکالو تو سہی۔" میں نے بے تابی سے کہا۔ وہ ایک بار پھر ہائے کر عجز و نیاز کی تمثیل کے مطابق اس صندوق پر جھک گیا۔ اور گویا سمندر میں غوطہ لگا کر مراد کے موتی نکال لایا۔ سیاہ فلٹ کی ڈھیلی ٹوپی اور ایک سستا سا دھوپ کا چشمہ لگا کر میں نے دیوار پر کورے دھندلے سے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ میری ہیئت یکسر بدل چکی تھی۔

"میرا خیال غلط تھا۔" طلحہ نے میرا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "کہ میری فیلٹ ٹوپی اور عینک کے ساتھ تم کارٹون لگو گے۔" وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ "بات یہ ہے بھائی!" اس نے ایک بار پھر ٹھنڈی سانس لی۔ "کہ خوبصورت لوگ ہر حال میں خوبصورت لگتے ہیں۔ آؤ چلیں۔"

نکلنے سے قبل وہ دروازے میں تالا ڈالتے ہوئے بولا۔ "تمہاری معلومات کے لیے بتاتا چلوں کہ یہ تالا محض ہاتھی کا دانت ہے' یعنی چابی کے دکھانے کا ہے۔ آئندہ جب بھی میری عدم موجودگی میں کام پڑے تو چابی کے تردد میں نہ پڑنا' ایک ہلکا سا جھٹکا دینا اور بس کھل جا سم سم!"

میں نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ یہ ایک بہت بڑا احاطہ سا تھا۔ جس کی چھت گنبد نما تھی اور دیوار کے ساتھ چاروں طرف اسی قسم کی کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ مغلوں کے زمانے میں اسی طرز پر اصطبل بنائے جاتے تھے۔ بائیں ہاتھ پر دو دیواروں کے درمیان ایک تنگ سا راستہ تھا۔ اس سے گزر کر ہم چند بوسیدہ سیڑھیوں تک پہنچے۔ جن کے اختتام پر بڑا سا دروازہ تھا۔ اس دروازے کی چولوں میں اتنی مٹی جم چکی تھی کہ اب اس کے پٹ اپنی جگہ سے بال برابر بھی جنبش نہیں کر سکتے تھے۔ دروازے سے گزر کر ہم سڑک پر آگئے۔

پتلی بل کھاتی گلی تھی۔ دونوں طرف اونچے نیچے اونچے چھجے مکانوں کی قطاریں تھیں جن کے نچلے حصوں میں دکانیں تھیں۔ کوٹھڑیاں زمین کی سطح سے کم از کم آٹھ فٹ نیچے تھیں اور ان کے اوپر بھی مکانات نہ جانے کس حساب سے بنے ہوئے تھے۔

"بارش میں تو پانی کوٹھڑیوں میں چلا جاتا ہو گا؟" میں نے طلحہ کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

"شکر ہے بمبئی میں زیادہ بارشیں نہیں ہوتیں۔" وہ بولا۔ "جب سے میں یہاں آیا ہوں تب سے ایک ہی زوردار بارش ہوئی ہے۔ شکر ہے اس روز میں چٹائی پر نہیں سویا ہوا تھا ورنہ ڈوب ہی جاتا۔ میری تو نیند بھی کمبخت ایسی ہے۔ پتہ ہی نہیں چلا کہ کب بارش ہوئی اور کب کوٹھڑی میں گھٹنوں گھٹنوں پانی بھر گیا۔" دفعتہً وہ چونک کر بولا۔
"روک لو!"

"کیسے؟" میں نے چونک کر پوچھا۔
"وہ ایک ٹیکسی آرہی ہے۔" اس نے سادگی سے کہا اور سامنے اشارہ کیا۔
"فوراً روکو۔" میں نے خود ہی ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ ٹیکسی ہمارے قریب آرکی۔
"محمد علی روڈ کی طرف چلو۔" طلحہ نے پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے ڈرائیور کو ہدایت کی۔ "آگے میں راستہ بتاؤں گا لیکن اسٹریٹ جانا ہے۔"
تقریباً تیس منٹ بعد ہم کیمپس اسٹریٹ پہنچے اور مطلوبہ عمارت کو پہچاننے کے بعد میں نے ٹیکسی رکوائی۔ "تم یہیں گاڑی میں ٹھہرو۔ میں ابھی آیا۔" میں نے طلحہ سے کہا اور چکردار چلی سیڑھیاں پھلانگتا اوپر جا پہنچا۔

مطلوبہ کمرے کے سامنے پہنچ کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ دروازے پر تالا لٹک رہا تھا۔ کچھ لمحے تو میں گم صم کھڑا رہا' پھر میں نے اپنے آپ کو تسلی دی کہ رات کے وقت پھر آؤں گا۔ اس وقت شاید لڑکی اور اس کا بھائی دونوں ہی کہیں گئے ہوئے تھے۔ میں واپس جانے کے لیے مڑا تو احساس ہوا کہ برابر والے دروازے میں کھڑی ایک سوکھی سی عورت چبھتی نظروں سے مجھے گھور رہی تھی۔ اس کے بال تو سیاہ تھے مگر چہرے پر بڑی بوڑھیوں کی طرح جھریاں تھیں۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ پوچھنے کی جرات کرتا وہ خود ہی بول پڑی۔

"شبانہ کے گاہک ہو کیا؟" اس نے کرخت اور دھیمے لہجے میں پوچھا۔
"گاہک؟" میں نے بوکھلا کر کہا۔ "نہیں۔۔۔ نہیں تو۔۔۔ میں تو ایک دکان دار ہوں۔ کل سرور میرے پاس کچھ دوائیں لینے آیا تھا تو سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔ میں نے ترس کھا کر اسے اپنا کوٹ دے دیا تھا۔ میں وہ کوٹ واپس لینے آیا تھا۔ اس نے تو وعدے کے مطابق صبح نہیں پہنچایا۔ کہاں گیا ہے وہ؟"
"جہنم میں۔" بڑھیا نے جل کر کہا۔ "صبح مالک مکان نے انھیں دھکے دے کر نکال دیا۔"

"نکال دیا؟" میں نے دہرایا اور میرا دل بیٹھ سا گیا۔

○

"ڈالتا نہیں تو اور کیا کرتا۔" بڑھیا ناگواری سے ہاتھ نچا کر بولی۔ "پہلے یہاں سب شریف لوگ رہتے تھے اس بلڈنگ میں۔ اس اکیلی لڑکی نے گند ڈال رکھا تھا۔ ایک مچھلی سارے جل کو گندا کرتی ہے۔ یہاں مدت سے جو رہنے والے آئی رہتے ہیں۔ سب کب سے دوڑ ڈالے بیٹھے تھے مالک مکان پر۔ ایک تو شہلا کے پاس ہی کچھ کم نہیں تھے، اوپر سے اس کا وہ بے غیرت بھائی روز شراب پی کر آجاتا تھا اور رات بھر غل غپاڑا مچا کر دن میں سوتا رہتا تھا۔ کل آئی اس نے یہاں وہ اودھم مچایا کہ خدا کی پناہ۔ آخر مالک مکان کو غیرت آہی گئی۔ اور وہ بھی شاید اس لئے کہ ان پر تیسرے مہینے کا کرایہ بھی چڑھ گیا تھا۔"

بڑھیا کے الفاظ میرے پردہ سماعت کو چھید رہے تھے۔ اس کا اصلاح معاشرہ کا جوش کچھ کم ہوا تو قدرے نرم پڑتے ہوئے بولی۔ "کیا بتایا تھا تم نے؟ رشتہ دار ہو تم؟ تمہارا کوٹ مانگ کر لایا تھا سرمد؟"

"جی ۔۔۔ جی ہاں۔" میں نے تھوک نگل کر کہا۔ ہونٹوں کے ساتھ ساتھ گویا میری زبان بھی پتھری ہو گئی تھی۔

"کیسا وہ گیبرڈین سا کوٹ تھا؟ اس کے سامنے والی جیب پر سنہرے دھاگے سے ایک چڑیا سی کڑھی ہوئی تھی؟" بڑھیا کی آنکھوں میں چمک سی لہرائی گویا وہ مجھے کوٹ کے متعلق کوئی اہم بات بتانے لگی ہو۔ کوٹ کی جیب پر کڑھے ہوئے عقاب کو اس نے چڑیا بنا دیا تھا لیکن بہرحال اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ بڑھیا نے کوٹ دیکھا تھا۔

"ہاں ہاں، جی ہاں۔ بالکل وہی کوٹ تھا۔" میں نے دھڑکتے دل سے کہا۔

"وہی کوٹ تو سرمد نے اس وقت پہنا ہوا تھا جب مالک مکان کے آدمیوں نے اسے دھکے دے کر نکالا۔" بڑھیا نے اطمینان سے کہا۔ "سامان کی گٹھڑی سر پر لدی ہوئی تھی اور وہ ساری بلڈنگ والوں کی لعنت ملامت سنتا وہی کوٹ پہنے یوں اطمینان سے اکڑتا ہوا جا رہا تھا جیسے شاہی خلعت پہن رکھی ہو اور رعایا اس کی شان میں قصیدے پڑھ رہی ہو۔"

"کچھ اندازہ ہے وہ دونوں کہاں گئے ہوں گے؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"مجھے کیا پتا؟" بڑھیا نے گویا برا مان کر کہا۔ "گئے ہوں گے کسی ایسے محلے میں جہاں ان کا دھندا اچھی طرح چل سکے۔"

"مالک مکان سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے؟ دراصل مجھے کوٹ کی تو اتنی پروا نہیں لیکن غلطی سے اس کی جیب میں میری ایک حساب کتاب کی ڈائری آگئی تھی۔ میں وہ ڈائری کھلوا کر دیکھنا چاہتا تھا۔ شاید سرمد وہ ڈائری کمرے میں ہی چھوڑ گیا ہو۔" میں نے امید بھرے لہجے میں کہا۔

بڑھیا نے بڑے وثوق سے نفی میں سر ہلایا۔ "کمرے میں تو ان کا ایک تنکا بھی نہیں رہا۔ میں خود دروازے میں کھڑی دیکھ رہی تھی۔ بلڈنگ والوں ہی نے ان کا سارا سامان باندھ باندھ کر ان کے منہ پر مارا تھا۔ مجھے تو کہیں کوئی ڈائری نظر نہیں آئی تھی۔ اگر ہو گی تو کوٹ کی جیب ہی میں ہو گی۔" اس نے میری آخری امید کو بھی لفظوں کے بے رحم قدموں تلے کچل کر رکھ دیا تھا۔

میں نے ڈوبتی نظروں سے آخری بار بند کمرے کے دروازے پر مضبوط تالے کو دیکھا اور قدموں کو گھسیٹتا سیڑھیوں کی طرف چل دیا۔ لوگ بھی عجیب ہوتے ہیں۔ رات کی رات، آن کی آن میں کسی کی کائنات اجاڑ کر رکھ دیتے ہیں سب کچھ تہس نہس کر دیتے ہیں۔ اب میں کہاں ڈھونڈوں گا سرمد کو؟ کہاں ملے گی مجھے اس بیکراں شہر میں وہ ننھی سی ڈائری؟ اور کیسے سلجھاؤں گا میں اس الجھی ہوئی داستان کا تانا بانا جس کی کھوج نے مجھے ایک رات میں کہاں سے کہاں لا پہنچایا تھا؟

نیچے آکر میں ٹیکسی میں طلحہ کے قریب کٹے ہوئے شہتیر کی طرح ڈھیر ہو گیا۔ اس نے پر تشویش نظروں سے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ "خیریت تو ہے؟"

میں نے مختصراً اسے بتایا کہ جس چیز کی تلاش میں میں یہاں آیا تھا وہ کس طرح میری دسترس سے کہیں دور نکل گئی ہے۔

میں واپس اپنی گلی میں پہنچ کر ٹیکسی سے اتر گیا اور طلحہ مجھے گھر جانے کی ہدایت کر کے خود اسٹوڈیو روانہ ہو گیا۔ میں اس جگہ سے کچھ دور ہی اتر گیا تھا جو اب میرا مسکن تھی۔ راستے میں ایک جگہ فٹ پاتھ پر مجھے کچھ اخبار اور رسالے رکھے نظر آئے۔ میں نے انگریزی، سندھی اور اردو کے کئی اخبارات خرید لئے اور کھولی میں آکر بے چینی سے ان کی ورق گردانی کرنے لگا۔ صرف تین اخباروں میں بازار حسن میں ہونے والی قتل کی دو وارداتوں کے بارے میں مختصر خبریں چھپی تھیں۔ پولیس کی تفتیش کے مطابق ممی کی موت قدرتی تھی۔ البتہ ان کی رائے میں ممی کی موت کے بعد نامعلوم قاتل اور دلالوں کے درمیان کوئی جھگڑا ہوا تھا جس میں دو دلال مارے گئے تھے۔ پولیس کے خیال میں اس جھگڑے کے پیچھے در حقیقت کسی اور کا ہاتھ تھا اور مجھے انہوں نے کرائے کا قاتل قرار دیا تھا۔ خوش قسمتی سے تفتیش کے دوران میری کوئی خاص شناخت متعین نہیں ہو سکی تھی۔

وہ رقاصہ لڑکی جس سے میں نے بالا خانے پر ممی کے متعلق پوچھا تھا میرے متعلق

صرف اتنا پتا لگی تھی کہ وہ ایک وجیہہ اور دراز قد سا لڑکا تھا۔

بہرحال یہ کوئی زیادہ اطمینان بخش صورت حال نہیں تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ خبریں جب ملن کی نظر سے گزریں گی تو وہ پولیس کو میرے بارے میں ہر ممکن معلومات فراہم کرنے کی کوشش کرے گا۔ میرے لئے فی الحال روپوش رہنا ناگزیر تھا۔

دو دن بعد میرے پاس پیسے ختم ہو گئے۔ طیبہ اس دوران پچاس ساٹھ روپے کما لیتا تھا لیکن میں نے اس پر بوجھ بننا مناسب نہ سمجھا اور اس کے ہاتھوں اپنی سونے کی زنجیر بازار بھجوا کر بکوا دی۔ ڈیڑھ ہزار روپے مل گئے جو کھولی کے معیار زندگی کے مطابق کم از کم ایک ماہ کے لئے ہم دونوں کو کافی تھے۔ میں نے اپنے لئے دو جوڑے کپڑے بھی خرید لئے۔

طیبہ دن چڑھے اسٹوڈیو چلا جاتا تھا اور رات گئے لوٹتا تھا۔ میرا معمول بن گیا تھا کہ اس کے جانے کے بعد میں اپنا اخبار رسالے پڑھتا رہتا۔ ڈاکٹر ... سے میں بازو کی مرہم پٹی بھی کروا رہا تھا۔ دسویں دن زخم پر کھرنڈ آگئے۔ بازو اب بالکل صحیح طور پر کام کرنے لگا تھا۔ چودھویں دن یہ کھرنڈ بھی اتر گئے۔ اس عرصہ میں میں نے دانستہ طور پر شیو نہیں بنائی تھی اور اب میرے چہرے پر مختصری داڑھی مونچھوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ ہیر اسٹائل بھی میں نے بدل لیا تھا۔

طیبہ اور میں اب گہرے دوست بن چکے تھے وہ ایک دلچسپ کردار تھا اور اس کی صحبت میں میرا بہت اچھا وقت گزر رہا تھا۔ گوشہ نشینی میں مجھے چوبیس دن گزر گئے تو دل ڈوبنے لگا۔ بیکار پڑے پڑے میری جان تختہ بن گئی تھی۔ گو کہ اب میں نے ورزشیں بھی شروع کر دی تھیں لیکن کھولی کی سیلن زدہ فضا میں رہتے رہتے اب مجھے اپنا وجود ایک چمگادڑ سے مشابہ معلوم ہونے لگا تھا۔

"اس طرح کب تک گزرے گی؟" ایک روز میں نے طیبہ سے کہا۔ "میں تو بیکار پڑے پڑے مفلوج سا ہو گیا ہوں۔"

"میرے ساتھ اسٹوڈیو چلا کرو۔" اس نے کھولی کے چبوترے پر اپنی انگوٹھی اسٹک کی چلمن دھوتے ہوئے کہا۔ "شوٹنگ دیکھتا ہوں تو کوئی خاص دلچسپی کا کام نہیں لیکن بیکار پڑے رہنے سے بہتر ہے اور پھر شاید اسٹوڈیو میں تمہیں بھی کوئی کام مل جائے۔ مجھے تو یہ ڈائریکٹر ترقی کرتے دیکھنا نہیں چاہتے بھئی ایکسٹراؤں کے ہجوم میں سب سے پیچھے کھڑا کر دیتے ہیں جہاں اللہ اللہ" ہاں میں کبھی کبھار کیمرے کی زد میں آجاتا ہوں۔ ایک دفعہ ایک فلم میں میرا پورے ایک منٹ کا پارٹ تھا۔ میں بڑے فخر سے اپنے دو تین دوستوں کو اپنا کام دکھانے سینما ہاؤس لے گیا۔ فلم ختم ہو گئی مگر میری شکل کہیں نظر نہ آئی بعد میں میں نے ڈائریکٹر سے جا کر پوچھا تو لاپرواہی سے کہنے لگا۔ "وہ حصہ ہم نے ایڈیٹنگ میں نکال دیا تھا۔" وہ

میری زندگی کا طویل ترین پارٹ تھا۔ ویسے تو ایک اور فلم میں بھی میں نے تقریباً ایک منٹ کا رول کیا تھا لیکن اس میں میں ڈاکوؤں کا ساتھی تھا اور میرے منہ پر نقاب تھی۔"

اس نے چلمن کو پانی میں پھینک کر ایک کو بھری... "کیا فائدہ ہے ایسی زندگی کا۔"

"یار! تجویز تو تمہاری اچھی ہے۔" میں نے چارپائی پر اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "صبح مجھے بھی ساتھ لے کر چلنا۔"

صبح تیار ہو کر اس کے ساتھ روانہ ہوتے وقت میں نے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ چہرے پر بھوری مختصری داڑھی' ہلکی ہلکی مونچھوں دھوپ کے چشمے اور بدلے ہوئے ہیر اسٹائل نے کم از کم ان لوگوں کے لئے تو میری شناخت تقریباً ناممکن بنا دی تھی جنہوں نے پہلے مجھے دیکھا تھا۔ مطمئن ہو کر میں طیبہ کے ساتھ باہر آگیا۔

بس میں بیٹھ کر ہم ایف ایم اسٹوڈیو پہنچے۔ طیبہ نے دروازے پر موجود چوکیدار سے لے کر اوپر فلور تک ہر ملنے والے شخص کو نئے خوشامدانہ انداز میں جھک جھک کر سلام کیا کہ مجھے اس کے ساتھ چلتے ہوئے شرم محسوس ہونے لگی۔

"طیبہ! ایک بات کہوں' برا تو نہیں مانو گے؟" میں بولے بغیر نہ رہ سکا۔

"یار! اب ہم ایک حد سے کی باتوں کا برا ماننے کے اسٹیج سے گزر چکے ہیں۔ البتہ اگر تم نے آکرہ ... کے ساتھ گفتگو کی تو میں ضرور برا مناؤں گا۔" اس نے کہا۔

"تم لوگوں کے ساتھ اتنے خوشامدانہ انداز میں پیش نہ آیا کرو۔ میرے خیال میں تمہاری ناکامی کی وجہ یہی ہے ورنہ تم ایکسٹرا کے بجائے اچھے بھلے کامیڈین بن سکتے تھے۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔ "تمہاری صلاحیتیں تو رہیں ایک طرف۔ میرے خیال میں تو تمہارے کامیڈین بننے کے لئے تمہاری مونچھیں ہی کافی ہیں۔ ہماری فلموں میں کامیڈین صرف منہ بگاڑنے اور الٹی سیدھی اچھل کود کرنے کے علاوہ کرتا ہی کیا ہے؟"

"لیکن یار! مجھے تو ایک پرانے گرگے نے بتایا تھا کہ فلمی دنیا میں کامیابی کا مختصر ترین راستہ خوشامد ہے۔" طیبہ نے سوچ میں ڈوبے لہجے میں کہا۔

"اور تم اس (مختصر ترین) راستے پر چھ سال سے چل رہے ہو۔ کہاں تک پہنچے؟" میں نے ہنستے ہوئے لہجے میں کہا۔ "خوشامد کسی کسی کو راس آتی ہے تم تھوڑے سے انا پرست بن کر دیکھو۔"

"میں ایک انا پرست کو بھی جانتا ہوں۔ ایک سال پہلے تک وہ ہیرو تھا۔ کل اسے کسی نرسنگ ہوم میں داخل کرانے کے لئے چندہ جمع کیا جا رہا تھا۔" طیبہ کے الفاظ تلخ مگر لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔ کم بخت بڑی سے بڑی بات سپاٹ لہجے میں کرتا تھا۔

"بہرحال اس نے عروج تو دیکھا نا!" میں اپنے استدلال پر اڑا ہوا تھا۔ "تاتی رہا اس کا درد ناک انجام۔ تو شاید اس کی وجہ اس کی انا نہیں بے اعتدالیاں رہی ہوں۔"

اس دوران سیٹ تیار کرنے والوں نے اپنا کام ختم کر لیا اور اپنے اوزار سمیٹ کر باہر چلے گئے۔ اس کے چند ہی سیکنڈ بعد عجیب و غریب حلیوں والے چھ آدمیوں کی ٹولی اندر آ گئی۔ ڈھیلے ڈھالے سفید لباسوں، پگڑیوں اور نقلی مونچھوں کی مدد سے "قاتلوں" انہوں نے ڈاکوؤں کا روپ دھارنے کی کوشش کی۔ ان کی کمروں کے گرد لپٹے ہوئے کپڑے میں ٹین کی تلواریں بھی اڑسی ہوئی تھیں۔ ان میں سے سب سے آگے پیلی سی رنگت والا ایک نوجوان گیٹ اپ میں تھا۔ اس کا قد درمیانہ تھا لیکن جسم خاصا گٹھا ہوا تھا۔ موسم خاصا خنک تھا لیکن اس نے کوہنی آستینوں کی، نائیلون کی چست شرٹ پہن رکھی تھی۔ "قاتل" اپنے بازوؤں کی ابھری ہوئی مچھلیاں دکھانے کے لئے۔ اس کی آنکھ کے قریب زخم کا ایک لمبا سا نشان تھا اور نچلا ہونٹ نسبتاً کچھ زیادہ ہی موٹا تھا۔

"یہ فائٹ انسٹرکٹر قادری شاہ ہے۔" شعلہ نے سرگوشی میں لقمہ دیا۔

مرلیا اور بھولی نے "آداب" کرشنا جی کو دور ہی سے سلام کر کے ایک نیم تاریک گوشے میں کھڑے ہو گئے اور قادری شاہ کرشنا جی کے قریب آ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"تم نے کل فائٹ کی اچھی طرح ریہرسل کرا لی تھی نا؟" کرشنا جی نے پوچھا۔

"ہاں جی۔ میں نے ان کی تسلی کرا دی تھی۔" قادری شاہ نے کرشنا کے اسسٹنٹ کی طرف اشارہ کیا۔ "معمولا کے کرم سے پہلے ہی شاٹ میں اوکے ہو جا سکتی ہے۔۔۔ بشرطیکہ میڈم ریتا اپنے ڈائیلاگ نہ بھول گئیں۔" اس نے بڑی ادا سے اپنی سگریٹ کا گل جھاڑا۔

"ریتا کے ڈائیلاگ ہیں ہی کتنے۔" کرشنا جی نے جیب سے ایک چٹکی نکال کر ناک پر ملتے ہوئے کہا۔ "ہائے اللہ اوئی اللہ ہی تو کرنا ہے اس نے۔"

"پھر ٹھیک ہے۔ اس قسم کی آوازیں نکالنے میں تو میڈم بڑی ماہر ہیں۔" قادری شاہ شاطرانہ انداز میں مسکرایا۔

عین جب جاب ایک طرف کھڑا معمولی قد کا ایک شخص طرار باتیں سن رہا تھا وقت بانس کے پول پر چڑھے ہوئے ایک لائٹ مین نے ہانک لگائی۔ "ہٹ کے۔۔۔ لائٹس آن۔"

بانسوں پر لگی ہوئی فلڈ لائٹس روشن ہو گئیں اور بارہ دری کا سیٹ، گلاب اور درخت تیز روشنی میں جگمگا اٹھے۔ لائٹ مین نے ایک دو لائٹوں کا زاویہ درست کیا پھر اوپر سے ہانک لگائی۔ "ٹھیک ہے کرشنا جی؟"

کرشنا جی نے ناقدانہ نظروں سے سیٹ کا جائزہ لیا پھر آواز دے کر کسی سے پوچھا۔ "ٹھیک ہے اجیت؟"

فلور کے کسی اندھیرے گوشے سے ایک چھوٹا سا مختصر آدمی برآمد ہوا اور درختوں کے قریب ٹرالی پر رکھے ہوئے کیمرے پر جھک گیا۔ "اوکے" چند لمحے بعد اس نے سر اٹھا کر

کہا۔ فلڈ لائٹس ایک بار پھر بجھ گئیں۔ صرف ایک لائٹ آن رہی۔

"چلو بھئی۔۔۔ شروع کرو ریتا کو بلاؤ۔۔۔ اور وہ ایکسٹرا لڑکیاں کہاں ہیں؟" کرشنا جی با آواز بلند اپنے اسسٹنٹ سے مخاطب ہوئے۔ فلور پر یک لخت ہل چل سی مچ گئی۔ بھاگ دوڑ سی شروع ہو گئی۔ اندھیرے گوشوں سے بہت سے افراد برآمد ہو گئے۔ اسسٹنٹ نے کسی کو باہر دوڑایا اور ساتھ ہی کرشنا جی کو بتانے لگا۔ "ایکسٹرا لڑکیاں تو کب سے تیار ہو کر کینٹین میں بیٹھی ہیں۔ میڈم ریتا کا میک اپ ہو رہا ہے۔ آپ نے انہیں چٹیا کرنے کو کہا تھا لیکن وہ بال کھلے رکھنے پر اصرار کر رہی تھیں۔ بڑی مشکل سے میں نے انہیں سمجھایا تھا۔"

"اس جاہل عورت نے کبھی تاریخ پڑھی ہو تو اسے پتا ہو کہ شہزادیاں بال کھلے نہیں رکھتی تھیں۔" کرشنا جی نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ "کل رات کے ایک سیٹ پر تو میں نے دیکھا تھا کہ وہ مس کلر بنی بیٹھی تھی اور کلائی پر تازہ ترین ماڈل کی ویسٹ اینڈ گھڑی بندھی ہوئی تھی۔ اب میں کل رات تو نہیں ہوں نا۔۔۔ کہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر دھیان نہ دوں۔ میں ان مہ نور بیوقوفوں کو اشاروں پر چلاتا جاتا ہوں۔"

جوش جذبات سے کرشنا جی اٹھ کھڑے ہوئے "قاتل" سیٹ کا معائنہ کرنے چل دیئے۔ جلدی میں ایک درخت سے ان کا ہاتھ ٹکرا گیا اور درخت فوراً" زمین پر آ رہا۔ غنیمت تھا کہ درخت زیادہ لمبا چوڑا نہیں تھا۔ ورنہ کرشنا جی بھی اس کی لپیٹ میں آ جاتے۔ دو لڑکے فوراً آگے لپکے اور انہوں نے درخت کو اٹھا کر دوبارہ سیدھا کھڑا کر دیا۔

کرشنا جی سیٹ پر پہنچے تو وہیں ایکسٹرا لڑکیاں بھی آ گئیں۔ وہ حتی المقدور بنی سنوری تھیں۔ ان میں سے دو تین خوب کھلی کھلی سی تھیں۔ چار چھ مرجھائی ہوئی سی تھیں اور ایک دو تو بالکل ہی دقیانوسی تھیں لیکن گھٹیا قسم کے میک اپ سے ان سب کو حتی الامکان خوبصورت بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔

وہ رنگ برنگے پرانے طرز کے بھاری بھاری فراکوں میں اور چوڑی دار پاجاموں میں ملبوس تھیں۔ وہ سب کرشنا جی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئیں۔ کرشنا جی نے مختصراً انہیں کچھ سمجھایا اور وہ بارہ دری کے چکنے فرش پر بچھے ہوئے ایک چھوٹے سے قالیچے کے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئیں۔ ان میں چند ایک آپس میں کچھ باتیں کرتے ہوئے بے ڈھنگے پن سے ہنس رہی تھیں۔ اب "قاتلوں" صرف ہیروئن کا انتظار تھا۔ کرشنا جی سیٹ سے اتر آئے اور مختلف لوگوں کو کچھ ہدایات دینے لگے۔

فلور پر غلغلہ سا بلند ہوا۔ "میڈم آ رہی ہیں۔۔۔ میڈم آ گئی ہیں۔۔۔" پھر دروازہ کھلا اور فلور پر سکوت سا چھا گیا۔

میڈم ریتا روشنی کی حدود میں آئیں تو میں نے اسے دیکھا۔ وہ ایک دراز قد عورت

ہے۔ گدھوں کی طرح دولتیاں جھاڑنے کے لئے؟"

مجھ سے نہ رہا گیا۔ مجھے فلمی دنیا کے طور طریقوں وغیرہ کا تو کچھ زیادہ علم نہیں تھا بس یونہی لاابالی انداز میں آگے جا پہنچا۔

"میرے خیال میں تمہیں ٹھیک طریقہ نہیں آتا ہے۔" میں نے فاروقی شاہ سے کہا۔

"تم کون ہو میاں؟" وہ پلٹ کر دھاڑا۔ "اور کہاں سے آ گئے ہو مجھے طریقہ سکھانے؟"

"میں تمہاری طرح ڈائرکٹر تو نہیں ہوں۔ میں تو دوستانہ طور پر مشورہ دینا چاہتا تھا کہ اگر تم ایک اور طریقہ استعمال کرو تو یہ چاروں اس سے بھی زیادہ اونچی چھلانگ لگا کر تالاب کے پار پہنچ سکتے ہیں۔" میں نے ملائمت سے کہا۔

وہ بری طرح کھسیایا ہوا تھا اور ساری جھنجلاہٹ شاید مجھ پر اتارنا چاہتا تھا۔ استہزائیہ انداز میں اس نے سب کو مخاطب کیا۔ "ایک تو ہر لونڈا لپاڑا استاد بنا پھرتا ہے۔" پھر وہ انگلیوں سے میری ٹھوڑی چھوتے ہوئے خالص فلمی انداز میں بولا۔ "میں چاہوں تو ایک ٹھوکر میں تمہیں بھی تالاب کے پار پہنچا سکتا ہوں۔"

اس نے جھنجلاہٹ کے ساتھ لیکن بڑے ماہرانہ انداز میں ٹانگ گھمائی میں نے تھوڑے پیچھے ہٹ کر اسی ٹانگ سے پکڑ کر اسے تالاب کے پار اچھال دیا۔ وہ چیخ کے ساتھ دوسرے کنارے پر جا گرا۔ سر کے بل گرتا تو اچھا یا برا؟ ایک بار تو اس کی ریڑھ کی ہڈی کے تمام منکے جھنجنا اٹھے ہوں گے۔ شاید وہ سمجھ ہی نہیں سکا تھا کہ اس کے ساتھ ہوا کیا ہے۔

چند لمحے تک وہ چیت پڑا آنکھیں جھپکاتا رہا۔ پھر کمر پر ہاتھ رکھ کر اٹھا اور تالاب کے پانی میں چھپ چھپ کرتا' لنگڑاتا ہوا میرے سامنے آیا۔ ایک لمحے کے لئے تو وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا رہا گویا فیصلہ کر رہا ہو کہ میری گستاخی کی مجھے کیا سزا دے۔ پھر اس نے بجلی کی سی پھرتی سے میرے کلے پر گھونسہ رسید کرنے کے لئے ہاتھ گھمایا۔ یہ بڑا ماہرانہ وار تھا میں نے اپنی جگہ سے حرکت کئے بغیر بازو پر یہ وار روک لیا۔

وہ کوئی اور وار کرنے کے لئے اچھلا لیکن بیچ ہی میں کرشنا جی بیچ میں آ گئے۔ "بند کرو یہ کشتی کشتی۔" انہوں نے فاروقی شاہ کو جھاڑا۔ "اگر کام نہیں آتا اور کوئی بتا رہا ہو تو سیکھ لینا چاہئے مگر تم جاہل ڈائرکٹروں کو اتنی توفیق نہیں ہوتی۔ چار دن سیکھ کر مینڈک کی طرح پھدک کر آ جاتے ہو اسٹوڈیو میں ـــــ اندھوں میں کانا راجہ۔ یہاں کسی لالہ نے خواب میں بھی اکھاڑے کی شکل نہیں دیکھی ہو گی۔ چلو جا کر کرسی پر بیٹھو اور چار مینار کا ایک سگریٹ پیو۔ اتنی دیر میں میں اس لڑکے کی مدد سے سین شوٹ کرا لوں۔ چلو ـــــ

شاباش۔" انہوں نے فاروقی شاہ کو پرے دھکیلا۔

وہ خاموشی سے کرسیوں کی طرف بڑھ گیا۔ تو کرشنا جی میری طرف متوجہ ہوئے۔

"ہاں تو بھئی تم کونسی تکنیک بتا رہے تھے؟ ذرا سمجھاؤ تو۔ شیطان جی کے ان ناکام کھلاڑیوں کو۔" انہوں نے ڈاکوؤں کی طرف اشارہ کیا جو چھلانگ لگا کر بے حال ہو چکے تھے۔

کرشنا جی کا انداز تخاطب ایسا تھا گویا وہ بڑی دیر سے مجھ سے ہم کلام تھے اور میں انہی کے عملے کا کوئی رکن تھا۔ میں نے ڈاکوؤں کو اپنے قریب کھڑا کیا اور پہلے خود انہیں چھلانگ لگا کر دکھائی جب میں تالاب کے دوسرے کنارے پر پہنچ کر سیدھا کھڑا ہوا تو میں نے دیکھا وہ ایکسٹرا لڑکیوں کے جھرمٹ سے نکل کر بارہ دری کی سیڑھیوں پر کھڑی عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کی گہری کالی آنکھوں میں دلچسپی کی چمک تھی۔ ایک لمحے کے لئے ہماری نظریں ملیں۔ جنگل کا سحر رکھنے والی ان آنکھوں کے پھندے سے میں نے بمشکل اپنے آپ کو چھڑایا اور الٹی چھلانگ لگا کر تالاب کی دوسری طرف آ گیا۔

میں نے محسوس کیا کہ کتنی ہی ساکت آنکھیں مختلف سمتوں سے مجھے گھور رہی تھیں۔ میں نے سب ڈاکوؤں کو چھلانگ لگانے کا دوسرا طریقہ سمجھایا اور وہاں سے ہٹ گیا۔

شیلا بڑے جوش سے میری طرف لپکا اور میرا ہاتھ کھینچتے ہوئے بولا۔ "تم تو چھپے رستم نکلے یار! تمہیں تو اسٹوڈیو میں بڑا کام مل سکتا ہے۔"

"مگر مجھے یہاں کام کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

میں نے کہا۔ "میرا یہاں دم گھٹ رہا ہے۔ آؤ چلیں۔"

"ٹھہرئیے۔ ذرا ٹھہر جائیے۔" شیلا نے مجھے روکا۔ کرشنا جی نے ڈاکوؤں کے آنے' دوبارہ کے چھلانگ لگانے اور اس کی سہیلیوں کے گھبرا جانے کا سین شوٹ کر لیا اور فارغ ہوتے ہی سیدھے میری طرف آئے۔ مجھے کرسی پیش کی اور میرے سامنے بیٹھتے ہوئے بولے۔ "نوجوان تم کون ہو؟ کیا کرتے ہو اور کہاں سے آئے ہو؟"

"جی میں کوئی بھی نہیں ہوں' کچھ بھی نہیں کرتا اور کہیں سے بھی نہیں آیا۔" میں نے سادگی سے جواب دیا۔

"بہت خوب ـــــ بہت خوب۔" ان کی مخصوص خاموش ہنسی کے ساتھ ان کی توند تھرتھرائی۔ "بتانا نہیں چاہتے۔ خیر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں تو دوستانہ طور پر تمہیں مشورہ دینا چاہتا تھا کہ تم فلموں کے لئے فائٹ انسٹرکٹر کے طور پر کام کیوں نہیں شروع کر دیتے؟"

"یہاں مجھے کیا مل جائے گا۔" میں نے بے تکلف پوچھا۔

"یہ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ اب فلم کمپنیوں میں ملازم رکھنے کا رواج تو کم ہو گیا ہے۔

سب لوگ آزادانہ طور پر کام کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے سارے شعبے ویڈیو فلم کر کے تمہیں تین ہزار روپے مہینہ تو ضرور ہی جایا کرے گا اور بعض اوقات فلموں کی ایسی لائن لگتی ہے کہ آدمی دونوں ہاتھوں سے کماتا ہے۔" کرشناجی نے بتایا۔

"میں معذرت چاہوں گا کرشناجی! دراصل اسٹوڈیو میں کام کرنا میری طبیعت سے مطابقت نہیں رکھتا۔" میں نے دو ٹوک لہجے میں کہا اور پھر اجازت طلب کر کے طلحہ کے ساتھ کمرے سے باہر آ گیا۔ وہاں روشنیاں بجھ چکی تھیں اور نہ جانے کیوں میرا اس ماحول میں واقعی دم گھٹ رہا تھا۔

"تم نے اچھا نہیں کیا یار!" طلحہ نے باہر میرے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ "کرشناجی کی مدد سے کام شروع کر دیتے۔ کسی دھندے سے تو لگتے۔ پھر کوئی کہے گا کہ بیکار پڑے پڑے بدن کو زنگ لگتا ہے۔"

"تم بے فکر رہو طلحہ! مجھے لگتا ہے کہ میں اب زیادہ عرصے بیکار نہیں رہوں گا۔ میں کسی اور قسم کا راستہ چاہتا ہوں۔ فٹ پاتھ ٹائپ قسم کے کام مجھے پسند نہیں۔"

ہم راستے میں ایک فوارے کے قریب دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ کچھ دور ایک لان میں شوٹنگ ہو رہی تھی۔ ایک صاحب گھوڑے پر بیٹھے بار بار اس کی لگام کھینچ کر زبردستی اس کی گردن ہلا رہے تھے۔ گھوڑے کے دائیں طرف کینوس کا ایک بڑا سا ڈرم ایک رولر پر گھمایا جا رہا تھا۔ ڈرم پر رنگ برنگے مناظر، پہاڑ اور درخت بنے ہوئے تھے اور اسے گھما کر یہ تاثر دیا جا رہا تھا کہ گھوڑا ایک ہی جگہ نہیں کھڑا بلکہ تیزی سے بھاگ رہا ہے۔ درختوں اور پہاڑوں کو پیچھے چھوڑتا جا رہا ہے۔ شوٹنگ میں یہ دشواری پیش آ رہی تھی کہ گھوڑا بار بار گردن جھکا کر لان کی گھاس چرنے لگتا تھا۔

کھلی ہوا میں چند گہری گہری سانسیں لے کر ہم آگے بڑھنے ہی تھے کہ کسی نے عقب سے آواز دی۔ "ذرا رکئے!" میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہی کمسن سا لڑکا ہماری طرف لپکا آ رہا تھا جسے میں نے میڈم ریٹا کا ہینڈ بیگ اٹھائے دیکھا تھا۔

"میڈم ریٹا آپ کو بلا رہی ہیں۔" قریب آ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ میں نے طلحہ کی طرف دیکھا۔

"خدا خیر کرے۔" وہ کندھے اچکا کر بولا۔

"کہاں ہے وہ؟" میں نے لڑکے سے پوچھا۔

"اپنے میک اپ روم میں۔" لڑکے نے جواب دیا۔ "میرے ساتھ آ جائیے۔"

ان ساحر آنکھوں کے تصور میں میری دھڑکنیں کچھ تیز ہو گئیں۔ "چلنے میں کیا حرج ہے؟" میں نے مشورہ طلب نظروں سے طلحہ کی طرف دیکھا۔ اس نے ایک بار پھر

کندھے اچکائے۔

لڑکے کی رہنمائی میں ہم چھوٹے چھوٹے کمروں کی ایک قطار کے قریب پہنچے۔ ایک کمرے کے دروازے پر رک کر لڑکے نے انتہائی شائستہ اور معذرت خواہانہ لہجے میں طلحہ سے کہا۔ "آپ باہر ہی ٹھہریئے گا۔ میڈم اکیلے میں ان سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتی ہیں۔" لڑکا خود بھی باہر ہی رک گیا اور اس نے مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ میں دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

وہ ایک مختصر سا چوکور کمرا تھا۔ دیوار کے ساتھ ایک بہت بڑی سنگھار میز تھی جس پر میک اپ کا انواع و اقسام کا سامان بکھرا پڑا تھا اور اس کے سامنے ایک اونچی کرسی پر وہ بیٹھی تھی۔ اس کی شال کرسی سے نیچے جھول رہی تھی۔ سنگھار میز کے آئینے پر دو بڑے بڑے بلب نصب تھے۔ ان کی روشنی آئینے سے بھی منعکس ہو رہی تھی اور چھوٹا سا کمرہ کچھ زیادہ ہی روشنی سے بھرا بھرا لگ رہا تھا۔

میڈم ریٹا کے بال کھلے ہوئے تھے اور اب وہ پہلے سے کچھ مختلف سی لگ رہی تھی۔ اس کے قریب ہی اس کی خادمہ کھڑی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ سنگھار میز پر ٹکا ہوا تھا اور ایک ہاتھ میں سبز جلد کی ڈائری تھی۔ اس ڈائری کو دیکھ کر میرے ذہن میں سیاہ جلد والی اس ڈائری کا خیال ایک درد کی طرح ابھر آیا جو کسی نے مجھے دی تھی اور جو میرے لئے کب ایک متاع گم گشتہ بن چکی تھی۔ اس کی گمشدگی کا ناسور فراموشی کے پھاہے تلے ایک بار پھر رس اٹھا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے محسوس ہوا کہ شاید کسی کی روح اب بھی فضائے بعید میں کہیں بے چین و بے قرار پھر رہی ہے کہ انہوں نے سہانی راتوں کی جو کائنات میرے سپرد کی تھی میں اس سے آشنا نہ ہو سکا۔

دل سے اٹھنے والی بے معنی سی ہوک کو دبا کر میں نے ریٹا کی طرف دیکھا۔ مخروطی انگلیوں والے اس کے ہاتھ کرسی کے ہتھوں پر ٹکے ہوئے تھے اور وہ ساکت بیٹھی میرا سر تاپا جائزہ لے رہی تھی۔

"بیٹھ جاؤ۔" پھر اس کے ہونٹوں نے حرکت کی۔ میں اس کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گیا جو قدرے نیچی تھی۔ "تم باہر جاؤ۔" اس نے خادمہ کو حکم دیا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" خادمہ کے جانے کے بعد اس نے پوچھا۔ اس کی آواز سرگوشی سے بلند نہیں تھی۔ مگر یہ سرگوشی گویا میرے کان کے قریب ہی ابھری تھی۔

"منصور مغل!" میں نے ایک لمحے کے توقف سے کہا۔ میں نے اسے اپنا نام بتانے میں کوئی حرج محسوس نہیں کیا۔

"بڑا شاہی سا نام ہے۔ حلق پر زور دے کر بولنا پڑتا ہے۔" اس کے لہجے پر

مسکراہٹ صبح کی پہلی کرن کی طرح دھیرے دھیرے طلوع ہو رہی تھی۔ "بات یہ ہے منصور!" اس نے سرگوشی کے لہجے سے کہا تھا۔ "کہ میں بڑی مجبور ہوں۔۔۔ دولت مند لیکن نہایت کمزور عورت ہوں۔ وہ عورت بہت ہی کمزور ہوتی ہے جو دنیا میں تنہا ہو۔ میرے ارد گرد انسانوں کا ہجوم ہے مگر میں تنہا ہوں اور کچھ لوگ میرے دشمن ہیں میری گھات میں ہیں۔ میری جان کے درپے ہیں۔ جب میں مرنا چاہتی تھی تو کوئی مجھے نہیں مارتا تھا اور اب مجھے زندگی سے کچھ انسیت ہو گئی ہے اور میں کسی ہری بیل کی طرح زندگی کے دامن سے لپٹی ہوئی ہوں تو کچھ لوگ یہ نعمت مجھ سے چھین لینا چاہتے ہیں۔" اس نے ایک طویل سانس لی۔ "میں چاہتی ہوں کہ کوئی مضبوط اور بے جگر مرد جو سائے کی طرح میرے ساتھ رہے' اس وقت تک میری حفاظت کرے جب تک زندگی میرے لئے دوبارہ سے وقتی نہیں ہو جاتی۔ لیکن وہ شخص محض تنخواہ اور چند آسائشوں کی خاطر اس فریضے کو اس طرح نہ نبھائے جس طرح چوکیدار راتوں کو ڈنڈا لے کر گلیوں میں گھومتے ہیں لیکن اپنے سے طاقتور چوروں کو دیکھ کر گلی کترا جاتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ کوئی میری اس طرح حفاظت کرے جس طرح اپنی جان کی کی جاتی ہے اور وہ اس کا اہل بھی ہو۔ گزشتہ دو سال میں میں نے یکے بعد دیگرے چار آدمیوں کو ملازموں کی طرح نہیں' اتالیق کی طرح رکھا۔ بڑی ڈینگیں مارتے تھے بڑے لڑاکے مشہور تھے بڑی بے جگری کی باتیں کرتے تھے' بڑے لمبے چوڑے جوان تھے لیکن جب میری خواب گاہ کا دروازہ توڑا گیا' جب میری کار پر بیچ سڑک پر گولیاں چلائی گئیں' جب مجھ پر تیزاب پھینکنے کی کوشش کی گئی تو میرے کسی محافظ سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ حملہ آوروں میں سے ایک آدھ کو ہی پکڑ سکتا۔ تاکہ میں اپنے دشمن کے خلاف پولیس کو کوئی ثبوت تو دے سکتی۔ مجھے معلوم ہے میرا دشمن کون ہے مگر میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی کیونکہ میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔۔۔" وہ خاموش ہو گئی اور نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ شاید وہ چاہتی تھی کہ میں کچھ بولوں۔

"اگر تم کمزور اور تنہا ہو تو شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟ کوئی مضبوط سہارا ڈھونڈ کر۔"

میں نے پہلی بار ہی اسے تم کہہ کر مخاطب کیا۔

وہ دھیرے سے ہنسی اسی کی ہنسی بھی سے مطلب تھی۔ "شادی میں میرے لئے کوئی کشش نہیں رہی۔ میں فلمی دنیا میں آنے سے پہلے شادی شدہ تھی۔ اب کچھ سرمایہ والے ہیں جو مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ان کی دو دو تین تین قانونی بیویاں پہلے سے موجود ہیں۔ غیر قانونی بیویوں کی تعداد کا مجھے علم نہیں۔ میں کسی کا ڈرائنگ روم سجانے کی خاطر ان کی خواہش کی زینت بنا نہیں چاہتی۔ کچھ مخلص ہیں مگر وہ کمزور ہیں اور ایک کمزور

دوسرے کمزور کا سہارا اور بھی بوجھل بنا دیتا ہے۔۔۔ اور سنو میں نے تمہیں مشورہ لینے کے لئے نہیں بلایا۔ دینا چاہتے ہو تو مجھے اپنی بے جگری دے دو' شہ زوری دے دو' پناہ دو' تحفظ دو' میں ان کی قیمت تو نہیں دے سکتی مگر تمہاری ضروریات کے لئے دس ہزار ماہانہ دے سکتی ہوں۔ کھانا میرے ساتھ دستر خوان پر کھاؤ گے' رہائش میرے بنگلے کی انیکسی میں ہو گی جس میں اس غرض سے ٹیلی فون بھی موجود ہے کہ کسی بھی وقت ضرورت پڑنے پر تمہیں بلایا جا سکے۔ اگر تم ویسے ہی ثابت ہوئے جیسا میں تمہیں دیکھنا چاہتی ہوں تو پھر میرے اور تمہارے درمیان کوئی حساب نہیں ہو گا۔ جو میرا ہو گا تمہارے لئے کر دوں گی۔ فلموں میں آنا چاہو گے تو میں تمہاری سفارش کر دوں گی اور فی الحال فلمی دنیا میں میری سفارش چلتی ہے اور نہ بھی چلے تو میں تمہارے لئے ذاتی فلم پروڈیوس کر دوں گی' اور تمہارا کوئی مسئلہ ہو گا تو دوسرے' دوسرے لفظوں میں مجھے اپنے ساتھ رکھو گے' بولو کیا کہتے ہو؟"

فلموں میں آنے کا مجھے کوئی شوق نہیں۔" میں نے کہا۔ "تمہارے انداز سے پتہ چلتا ہے کہ بات ملازمت کی نہیں دو اجنبیوں کے درمیان ایک بے نام رفاقت کے رشتے استوار کرنے کی ہو رہی ہے۔"

"ہاں" اس نے بلا تامل کہا اور اس کی آنکھیں گویا کسی خواب کے بوجھل پن سے نکل آئیں۔

"یہ بات مجھے پسند آئی ہے۔ لیکن تم نے کیا سوچ کر اتنی وضاحت اور یقین و اعتماد کے ساتھ مجھ سے باتیں کی ہیں؟ جب کہ تم نے مجھے پہلی دفعہ دیکھا ہے۔ تمہیں میرے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں اور تم نے پوچھا بھی نہیں۔"

"زندگی میں ان گنت ٹھوکریں کھا کر ایک ہی فن تو سیکھا ہے۔" اس کے ہونٹوں پر ادھوری سی مسکراہٹ ابھری۔ "ذات کی پہیلیاں بوجھنے کا فن۔۔۔ میں نے تمہیں غور سے دیکھا تھا اور اب خاصی دیر سے تم سے باتیں کر رہی ہوں۔ اس تمام وقت میں تمہیں بوجھ رہی تھی۔ یوں تو انسان کی ذات کا سارا حساب کتاب اس کے خدوخال پر لکھا ہوتا ہے۔ مگر آنکھیں تو خصوصاً ذات کا دروازہ ہیں۔ میں نے تمہارے خدوخال پر لکھی ہوئی کہانی کسی حد تک پڑھی ہے اور آنکھوں کے دروازے سے اتر کر تمہاری ذات کی بھول بھلیوں کی تھوڑی سی سیر بھی کی ہے۔ کہو تو تھوڑا کچھ بتاؤں؟"

"کہو" میں نے قدرے دلچسپی سے کہا۔

"تمہاری رگوں میں شاہی خون دوڑ رہا ہے۔" اس نے گویا نوک زبان سے ذات کی گرہیں کھولنا شروع کیں۔

"پڑھے لکھے ہو۔ آج کل کسی مسئلے سے دوچار ہو۔ تمہارا کچھ کھو گیا ہے شاید کوئی قیمتی چیز یا کوئی عزیز از جان ہستی۔ لیکن ان سب باتوں میں کوئی زیادہ دلچسپی نہیں۔ مجھے سب سے زیادہ جس چیز نے متاثر کیا وہ یہ کہ تمہاری ذات کی بھول بھلیوں میں کہیں کسی خوف کا نام و نشان نہیں ہے۔ تم ایک بے خوف انسان ہو اور یہ انسانوں کی ایک نایاب ہے۔ ہر انسان کے شعور یا لاشعور میں کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی خوف کا سایہ ہوتا ہے۔ بتاؤ کیا مجھ ان پڑھ عورت کا یہ مطالعہ درست ہے؟" اس نے کرسی کے پیچھے

سر ہلا دیا۔

"خطرناک حد تک۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

"تو پھر میری پیشکش کے جواب میں کیا کہتے ہو؟" اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

"مجھے سوچنے کے لئے کچھ وقت چاہیے۔" میں نے جواب دیا۔

"میری قسمت شناسی تو بتاتی ہے کہ فیصلہ تم نے کر لیا ہے۔ لیکن خیر۔۔۔ اگر تکلفات پورے کرنے چاہتے ہو تو تمہاری مرضی۔" اس نے شال کندھوں پر کھینچ لی۔

"میں اس اسٹوڈیو میں چھ بجے تک شوٹنگوں میں مصروف ہوں۔ تم اس دوران گھومو پھرو، سوچنے کو کچھ باقی ہے تو سوچو۔ کسی سے مشورہ کرنا ہے تو کر لو۔ میں چھ سے سات بجے تک اسی میک اپ روم میں انتظار کروں گی۔ اگر فیصلہ بدل نہ لو تو آ جانا۔"

میں اٹھا اور باہر آ گیا۔ طیلہ برآمدے میں ایک ستون کے قریب بیٹھا آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے کسی خاص تجسس یا اشتیاق کا اظہار نہیں کیا۔ خاموشی سے اٹھ کر میرے ساتھ چل دیا۔ فوارے کے قریب پہنچ کر ہم لان پر بیٹھ گئے۔

"کیا بات تھی؟" اب اس نے مدھم لہجے میں پوچھا۔ میں نے بلا کم و کاست سب کچھ بتا دیا اور آخر میں پوچھا "تم کیا مشورہ دیتے ہو؟"

"تم نے کیا سوچا ہے؟" اس نے الٹا سوال کیا۔

"میں نے سوچا ہے کہ اس پیشکش کو قبول کر لوں۔"

میں نے ایک لمحے کے توقف سے کہا "اس پیشکش میں وہ تمام چیزیں آ جاتی ہیں جن کی فی الحال مجھے ضرورت ہے۔ میں نے مستقبل کے بارے میں کچھ اہم پروگرام بنا رکھے ہیں جن کے لئے ایک اچھا آغاز چاہیے۔"

"ایک بار پھر سوچ لو۔" طیلہ نے مدھم لہجے میں کہا۔ "دنیا یہاں پڑھے لکھے لوگوں میں "ساحرہ" اور ان پڑھوں میں خطرناک عورت کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے ساتھ رہنے میں ایک نقصان یہ ہے کہ لوگ منہ پر تو تمہاری بڑی عزت کریں گے لیکن پیٹھ پیچھے بڑی تحقیر کریں گے، مذاق اڑائیں گے۔"

"پیٹھ پیچھے تو لوگ بادشاہوں کو بھی گالیاں دیتے آئے ہیں۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے تو یہ دیکھنا ہے کہ اس کام میں مجھے میری ضرورت کی ہر چیز مل رہی ہے۔"

"تمہاری مرضی۔" اس نے کندھے اچکائے۔ "تجربہ کر کے دیکھ لو۔ وہ اب تک تم جیسے کئی خوبصورت اور صحت مند نوجوانوں کو کسی نہ کسی بہانے ملازم رکھ چکی ہے مگر زیادہ دن کسی کی کسی سے نہیں بنی۔۔۔ بہرحال۔۔۔" اس نے ایک لمحے کے توقف سے کہا۔ "اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنی بات منوانا جانتی ہے۔"

لیا۔ مجھ صابن سے نہانے اور آرام کرنے سے میری رنگت کچھ اور نکھر آئی تھی۔ میری داڑھی اور سر کے بھورے بال چمک رہے تھے۔ کپڑوں کی شکنیں درست کر کے میں کمرے سے نکل گیا۔ کتا مجھے بنگلے کے اندرونی دروازے پر ملا۔ اس نے سیڑھیوں تک میری رہنمائی کی اور چلا گیا کہ ریتا اوپر ٹیرس پر بیٹھی ہیں۔

ٹیرس پر ایک ننھا سا رنگین بلب روشن تھا۔ وسط میں شیشے کے ٹاپ کی ایک میز اور لوہے کی چند خوبصورت گدے دار کرسیاں پڑی تھیں۔ ان میں سے ایک کرسی پر ریتا نیم دراز تھی۔ اس کے ہاتھ میں گلاس تھا اور بوتل تپائی پر رکھی تھی۔ ریتا کے جسم پر ایک ڈھیلا ڈھالا سفید لمبی فراک تھا۔ کھلے بال ٹیرس کے فرش تک پہنچ رہے تھے۔

اس دھندلی دھندلی سی شبیہہ کو دیکھ کر دل میں سویا ہوا ایک درد جاگ اٹھا۔ وہ میری جہاں میری حاصلِ حیات ماہتاب نہ جانے کس حال میں تھی۔ میرے متعلق کیا سوچ رہی تھی اور کیا سوچ بھی رہی تھی یا اس نے مجھے بھلا دیا تھا؟ محبت کے نقوش بے شک بڑے گہرے تھے مگر زمانہ بھی تو بلا کا برق رفتار تھا پیچھے رہ جانے والوں کی طرف مڑ کر دیکھنے کی رسم تو لوٹ چکی تھی مگر نہ جانے مجھے کیوں امید تھی یا خوش فہمی کہ وہ مجھے کبھی نہیں بھلا سکتی۔

"بیٹھ جاؤ۔" ریتا نے گلاس سے بڑا سا آخری گھونٹ بھرنے کے بعد کہا۔ اس کے پیچھے ایک کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ جو اس کی خواب گاہ تھی۔ کمرے میں ہلکی دھندلی روشنی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کمرے کی جو دیوار میرے سامنے تھی اس پر مختلف شکل عقل صحت مند اور خوبصورت بچوں کی رنگ برنگ فریم شدہ تصویریں آویزاں تھیں۔ یہ تصویریں غالباً کیلنڈروں اور رنگین رسالوں وغیرہ سے کاٹ کر فریم کی گئی تھیں۔

ریتا نے اپنے گلاس کے علاوہ ایک اور گلاس میں بھی وہسکی انڈیلی۔ چھوٹی سی خوبصورت بالٹی سے برف کے ٹکڑے نکال کر ان میں ڈالے اور اپنا گلاس اٹھا کر وہ میری طرف کھسکاتے ہوئے بولی۔ "پیو۔"

"شکریہ۔ میں نہیں پیتا۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ وہ مزید کچھ نہ بولی۔ خاموشی سے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرنے لگی۔ میں نے پشتے کے کشن سے سر ٹکا دیا۔ ہوا میں خاصی تندی تھی اور دور کہیں سے آنے والی سمندر کی مخصوص بو خوشگوار محسوس ہو رہی تھی۔

اس نے آدھا گلاس حلق سے نیچے انڈیلنے کے بعد نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ بڑی بڑی ساحر آنکھیں خمار کے سمندر میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اس کی آواز پر بھی خمار کا غلبہ تھا۔ "میرا جی چاہ رہا تھا کہ تم سے ان گنت باتیں کروں۔" وہ بولی۔ "لیکن اب سامنے آ بیٹھے ہو تو کوئی بات نہیں سوجھ رہی۔ دوسروں کے لکھے ہوئے ڈائیلاگ بول بول

شاید میں اپنی باتیں بھول گئی ہوں۔"

میں خاموش رہا تو وہ ایک اور گھونٹ بھر کر بولی۔ "تم ہی کچھ بولو نا۔"

"میں ... میں بہت کم بولتا ہوں۔" میں نے اس کے سادہ مگر مخمور حسن کی سحرکاری سے اپنے آپ کو آزاد کراتے ہوئے کہا۔ "سننے میں مجھے زیادہ لطف آتا ہے۔"

"یہ بھی تمہارے نایاب ہونے کی ایک اور نشانی ہے ورنہ ہر انسان چاہتا ہے کہ صرف وہی بولتا رہے۔ مسلسل بولتا رہے اور دوسرے سنتے رہیں۔ ہر ایک کو اپنی ذات کے اظہار کا مسئلہ درپیش ہے۔ کوئی کسی کی سننا نہیں چاہتا۔" اس نے گلاس میز پر رکھ کر سگریٹ کا پیکٹ اٹھایا اور ایک سگریٹ نکال کر لبے سے ہولڈر میں لگا کر سلگائی۔ ایک گہرا کش لے کر وہ کرسی پر جھکی اور سست گئی۔ پھر اس کی آواز گویا دور افق کے جزیرے سے آئی۔ "منصور! تمہیں معلوم ہے پہلی مرتبہ میں کس قیمت میں بیچ دی گئی تھی؟"

میں خاموش رہا۔ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"صرف ایک وقت کی روٹی کے عوض۔" اس نے سسکی سی لی۔ پھر اس نے گلاس اٹھا کر ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ ایک ہاتھ سے آنکھوں کو مسلا اور سر کو ہلکا سا جھٹکا دے کر بولی۔ "انسان سارے دشمنوں سے تو لڑ سکتا ہے مگر پیٹ کے عفریت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔" ایک لمحہ خاموش رہ کر وہ بولی۔ "میں نے بھی بہت مقابلہ کیا بہت لڑی لیکن چھٹے دن فاقوں سے شکست کھا کر اس عورت کے پاس چلی گئی جو ایک عرصے سے مجھے ایک راستہ دکھا رہی تھی اور پھر رفتہ رفتہ سب کچھ میرے قدموں میں ڈھیر ہوتا گیا۔" اس کے لہجے میں ایسی کاٹ تھی جو میرے دل کو لہو لہو کر رہی تھی۔ موضوع بدلنے کی خاطر میں نے پوچھا۔

"تمہارے دشمن کون کون ہیں؟"

جواب دینے سے پہلے اس نے ایک اور گلاس بھرا۔ میں نے دیکھا بوتل تقریباً آدھی خالی ہو چکی تھی۔ "مجھے ایک طوائف نے ہی پالا تھا۔ میں ایک طرح سے اس کی غلام تھی۔ جب میں اپنے پیروں پر کھڑی ہوئی تو میں نے اس سے بغاوت کر دی۔ اس وقت اس نے کہا تھا کہ وہ مجھے ذلتوں سے نہیں بچنے دے گی۔"

دھیمے لہجے میں بولتے بولتے اسے ہلکی سی کھانسی آئی اور اس کا گلاس چھلک پڑا۔ "اس کا کہنا تھا کہ میں نے اس کی ساری محنت برباد کر دی ہے۔ اسے دھوکا دیا ہے حالانکہ میں اس کے پاس بہت کچھ چھوڑ کر آئی تھی جو اس کی "محنت" کے معاوضے سے کہیں زیادہ تھا۔ لیکن دراصل اس کی انا کو ٹھیس لگی تھی۔ وہ بہت طاقتور اور بارسوخ عورت ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ آج کل وہ کہاں رہتی ہے لیکن میں اتنا ضرور جانتی ہوں کہ مجھ پر جتنے بھی حملے ہوئے ہیں ان کے پیچھے اس کا ہاتھ ہے۔ وہ مجھ سے انتقام لینا چاہتی ہے۔"

ریتا عجیب سے انداز میں ہنسی۔ "مجھے ہر طرح سے برباد کر کے بھی اسے چین نہیں۔

وہ سمجھتی ہے یہ عیاشی یہ دولت یہ شہرت بہت بڑی نعمتیں ہیں جو اس کی بدولت مجھے ملی ہیں۔۔۔ وہ مجھے کہیں ملے تو میں اس سے کہنا چاہتی ہوں کہ یہ سب کچھ مجھ سے لے لے اور میرا وہ چھوٹا سا گھر مجھے لوٹا دے جس میں میرے معصوم بچے کی قلقاریاں گونجتی تھیں اور جہاں میرا ٹوٹ کر محبت کرنے والا شوہر انتظار کیا کرتا تھا۔۔۔"

"وحشت" اسے زور کی کھانسی آئی۔ چھلکتا ہوا گلاس اس نے میز کے شیشے پر پٹخ دیا اور برابر والی کرسی پر پڑے اپنے بیگ سے ایک شیشی نکال کر اس میں سے ایک گولی نکالی اور منہ میں ڈال کر چبانے لگی۔ چند لمحے بعد وہ کچھ پرسکون ہوئی تو میں نے دیکھا اس کے رخساروں پر آنسوؤں کی لکیریں چمک رہی تھیں۔ کچھ کہے بغیر وہ اٹھنے لگی مگر کرسی سے ابھر کر بری طرح لڑکھڑا گئی۔

میں نے اٹھ کر اسے سہارا دیا۔ اس کا جسم بری طرح تپ رہا تھا۔ "تمہیں بخار ہے کیا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ میرے جسم میں ماضی کی چتا جل رہی تھی۔" وہ مضمحل انداز میں مسکرائی۔ "مجھے بیڈ روم میں پہنچا دو۔"

میں اسے سہارا دے کر بیڈ روم میں لایا۔ بیڈ روم کی باقی دو دیواروں پر بھی بچوں ہی کی رنگ برنگی تصویریں آویزاں تھیں۔ "تمہارا بچہ کہاں گیا مریا؟" میں نے غیر ارادی طور پر پوچھا حالانکہ میں اس کے زخموں کو کریدنا نہیں چاہتا تھا۔

"نمونیے سے مر گیا تھا۔" اس نے اختصار سے جواب دیا۔ گویا یہی کل داستان تھی، یہی آغاز، یہی انجام۔

"اور تمہارا شوہر۔؟" میری سمجھ میں نہیں آیا کہ سوال کیسے مکمل کروں۔

"ایک حادثے میں اس کی آنکھیں ضائع ہو گئی تھیں اور آنکھوں کے ساتھ ہی گویا اس کی ساری قوت برداشت حوصلہ اور جوانمردی چلی گئی تھی۔ مصائب سے گھبرا کر وہ ایک روز گھر سے نکلا اور پھر لوٹ کر نہیں آیا۔" مریا نے کہا اور میرے بازو کا سہارا چھوڑ کر دھم سے بستر پر ڈھیر ہو گئی اور یوں سکڑ سمٹ کر لیٹ گئی گویا اسے کسی قبیل سے خوف آ رہا ہو۔

"کھانا نہیں کھاؤ گی؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ تم جا کر کھاؤ اور مجھے تنہا چھوڑ دو۔" اس نے ڈوبتی سی آواز میں کہا اور تکیہ رخسار پر رکھ لیا۔ میں نے کمبل اس کی ٹانگوں پر ڈالا، کھڑکیوں کے پردے کھینچے اور کمرے سے نکلنے ہی لگا تھا کہ اس نے پکارا۔ "منصور"

میں پلٹ کر اس کے قریب گیا۔ اس نے رخسار سے تکیہ ہٹا لیا تھا اور تھکی تھکی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ "تم بہت سلجھے ہوئے نوجوان ہو منصور! مجھے محسوس

ہو رہا ہے کہ رفتہ رفتہ تم مجھے اور میرے درد کو سمجھ لو گے۔

مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے یہ دیکھ کر کہ مجھے مدہوش اور تنہا پا کر تم نے ہمدردی جتانے اور دلاسے دیتے دیتے میرے بستر میں گھسنے کی کوشش نہیں کی۔ اس سے پہلے میں نے جتنے بھی مرد کا اس نے موقع پاتے ہی ایک ہی ساعت میں تمام مرحلے طے کرنے کی کوشش کی۔ ان کے خیال میں میرے انداز و اطوار کھلی دعوت کے اشاریے تھے۔۔۔ میں نے کچھ عرصہ دیکھنے کے بعد انہیں رخصت کر دیا اور فلم انڈسٹری میں میں عیاش مشہور ہو گئی۔۔۔ میں۔۔۔ میں عیاش نہیں ہوں منصور!"

اس کے لہجے میں شدت آگئی اور چہرہ سرخ ہو گیا گویا میں نے ہی اس پر کوئی الزام لگایا ہو اور وہ اس کی تردید میں اپنا زور بیان صرف کرنا چاہتی ہو۔ "میں۔۔۔ مجھ میں عیاشی کی سکت ہی نہیں ہے۔ مجھ میں تو عشق کی سکت بھی نہیں ہے۔ مجھے اپنا آپ کھوکھلا کھوکھلا سا لگتا ہے اور عدم تحفظ کا احساس مجھے ہر دم ہی ہولائے رکھتا ہے۔۔۔ اور۔۔۔ اس لئے میں اب تک ایک مضبوط سہارے کی تلاش میں تھی۔۔۔ ایک دوست جو مجھے دنیا والوں کی نظر سے نہ دیکھے۔ میری اپنی آنکھ سے دیکھے۔۔۔ میرے خلا خلا دل میں پھنکاریں مارتے خوف کو نکال پھینکے۔" اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے ابھر آئے تھے اور وہ اپنے سینے میں چھپا سارا غبار بے ربط جملوں کی شکل میں اگل دینا چاہتی تھی۔

"وضاحتوں کی ضرورت نہیں۔" میں نے نرمی سے اس کا کندھا تھپکا۔ "آپ سو جاؤ اور ساری الجھنیں اور پریشانیاں ذہن سے جھٹک دو۔ گو یہ ممکن تو نہیں مگر کوشش ضرور کرو۔ فرض کر لو کہ میں ہی وہ شخص ہوں جس کی تمہیں تلاش تھی۔ رفتہ رفتہ شاید تمہیں چین بھی آ جائے۔ اب بس سو جاؤ۔" میں نے اسے کروٹ دلائی۔

"مجھے چین آ جا رہا ہے۔" وہ بڑبڑائی اور آنکھیں بند کر کے خاموش ہو گئی۔ باہر نکلنے سے پیشتر میں نے دروازے کا جائزہ لیا اس کا قفل کا تالا [illegible] اور آٹو میٹک تھا۔ اندر سے ہینڈل دبانے سے کھل سکتا تھا جب کہ باہر سے اسے صرف چابی سے کھولا جا سکتا تھا کوئی ہینڈل وغیرہ نہیں تھا۔ میں نے کمرے پر الوداعی نظر ڈالی اور باہر آ کر دروازہ بند کر دیا۔ کلک کی ہلکی سی آواز کے ساتھ تالا بھی بند ہو گیا۔

اگلی صبح ڈائننگ روم میں ناشتے کی میز پر مریا سے سامنا ہوا۔ وہ گزشتہ روز کی نسبت کہیں زیادہ تر و تازہ اور ہشاش بشاش نظر آ رہی تھی۔ لیکن اس کی آنکھوں کے گرد ہلکے سیاہ حلقے تھے۔ یہ حلقے میرے اندازے کے مطابق خاصے پرانے تھے لیکن کل میک اپ کی تہ میں مجھے نظر نہیں آئے تھے۔

"رات میں پھولوں آبشاروں اور تتلیوں کے خواب دیکھتی رہی۔" اس نے میز پر مگ میں کافی انڈیلتے ہوئے ایک معصومانہ سی مسرت کے ساتھ مجھے بتایا۔ "اس سے

مجھے پیشہ ور اداکارے خراب کرتے تھے۔"

"تم نے خواہ مخواہ اپنی ذات کو پیچیدہ اور اپنے مسائل کو گھمبیر بنا رکھا ہے۔" میں نے کپ اپنی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔ "دنیا میں تم سے کہیں زیادہ دکھی ان گنت لوگ پڑے ہیں جنہیں یہ سہولت بھی میسر نہیں کہ کسی کے سامنے لب کھول کر دل کا بوجھ ہلکا کر سکیں۔ اگر موازنہ کرنے بیٹھو تو لاکھوں انسانوں سے اپنے آپ کو آسودہ پاؤ گی۔"

"اپنی عمر سے بڑی بڑی باتیں نہ کیا کرو۔" اس نے کہا مجھے ڈانٹا مگر اس ڈانٹ میں پیار بھی تھا، شوخی بھی اور احساس تفاخر بھی۔ اس نے بالوں کی دو چٹیاں بنا کر سینے پر ڈال رکھی تھیں۔ اس ہیر اسٹائل اور کچھ اس کی شگفتگی کی بدولت اس کی عمر کئی برس کم معلوم ہو رہی تھی۔

چند لمحے بعد کان کی چٹکیاں لیتے ہوئے اس نے بتایا۔ "کل صبح دس بجے ٹیلر ماسٹر آکر تمہارا ناپ لے جائے گا اور تین چار روز میں ہی تمہارے چند سوٹ وغیرہ سل کر آجائیں گے۔" پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی۔ "میرے پاس اعشاریہ تین دو کا ریوالور ہے۔ وہ اپنے پاس رکھا کرو۔ اس کا لائسنس علی جان کے نام پر ہے لیکن تم بوقت ضرورت پڑنے پر اسے بلا خوف و خطر استعمال کر سکتے ہو۔ نتائج مجھ پر چھوڑ دینا۔ اس کے علاوہ تمہاری ایجنسی کی ایک الماری میں شارٹ بیرل رائفل بھی رکھی ہے۔ اس کا کوئی لائسنس وغیرہ نہیں ہے لیکن اس کے استعمال کے سلسلے میں بھی تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔"

اس نے ایک اور خادمہ جس کا نام وحیدہ تھا کو اشارہ کیا اور وہ اثبات میں سر ہلا کر کمرے سے چلی گئی۔ چند لمحے بعد وہ واپس لوٹی تو اس کے ہاتھوں میں ہولسٹر میں محفوظ ایک ریوالور تھا۔ میں اس وقت پتلون بش شرٹ میں ملبوس تھا میں نے ریوالور لے کر کمر کے ساتھ بیلٹ میں اڑس لیا۔ کچھ فاضل گولیاں جیبوں میں ڈال لیں اور ہولسٹر خادمہ کو واپس کر دیا۔

"اسٹوڈیو میں مجھے زیادہ خطرہ محسوس نہیں ہوتا۔" ریما نے کپ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "تاہم میں جس طور پر بھی شوٹنگ کے لئے جاؤں تم وہاں سیٹ پر ہی موجود رہا کرو یا کم از کم قرب و جوار کے آس پاس ہی کہیں نہ کہیں موجود رہا کرو۔ میرے دل کو تقویت رہے گی۔" وہ میری طرف دیکھ کر ہولے سے مسکرائی۔ "بظاہر تمہاری حیثیت میرے منیجر کی ہو گی کسی کو یہ علم نہ ہونے پائے کہ میری حفاظت تمہارے ذمے ہے۔"

میں نے خاموشی سے اس کی ہدایات سنیں۔ پھر ہم ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ کچھ دیر بعد ڈرائیور آگیا۔ اسے ناشتہ دے کر ہم اسٹوڈیو روانہ ہو گئے۔

اس روز میں کئی فلموں کے سیٹوں پر ریما کے ساتھ رہا۔ کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا اور میرا زیادہ وقت بوریت میں گزرا۔ تاہم یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ ہر سیٹ پر مختلف فلمسازوں وغیرہ کے دفتروں میں ریما نے میرا تعارف میری حیثیت کو خوب بڑھا چڑھا کر کرایا تھا۔ میرے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اعلیٰ نسب ہونے کا خصوصی ذکر کیا تھا اور تاثر یہی دیا تھا کہ میں نے اس کے نہایت اصرار پر اس کی ملازمت قبول کی ہے۔ خود اپنی ذات کے لئے ریما کا انکسار میرے لئے باعث حیرت تھا۔

ایک عام اور بے حیثیت عورت کو بھی اپنی ذات پر بڑا گھمنڈ ہوتا ہے اور اگر قدرت اسے کسی کو ملازم رکھنے کی توفیق دے دے تو اس میں رانیوں جیسی نخوت آجاتی ہے لیکن ریما فلمی دنیا میں اپنے شاندار مرتبے کے باوجود بے حد منکسر المزاج تھی اور اس کی یہی خصوصیت مجھے اس کے ساتھ وابستہ رکھ سکتی تھی۔ اس کا یہ انداز مصلحت تھا یا عادت بہرحال اس سے مجھے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ ہر شخص مجھ سے نہایت احترام سے پیش آیا۔ وہاں پھر اسٹوڈیوز میں میں جہاں جہاں بھی رہا میری آنکھیں [illegible] کی تلاش میں مصروف رہیں لیکن حیرت کی بات تھی کہ وہ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔

نائٹ شفٹ میں ریما کام نہیں کرتی تھی۔ سات بجے کے بعد کا وقت وہ کسی فلمساز کو نہیں دیتی تھی اور سیدھی گھر آتی تھی۔ دن بھر وہ بلا تکان کام کرتی تھی اور اگر پانچ منٹ کے لئے بھی سستانے کا موقع میسر آ جاتا تب بھی "تھکا" پیدا نہیں کرتی تھی۔ تین چار دن میں مجھے اس کے معمولات اور عادات کو سمجھنے کا اچھی طرح موقع ملا۔ پانچویں دن اس کی دو فلموں کی بیک وقت آؤٹ ڈور شوٹنگ شروع ہو گئی۔

ایک فلم کے لئے ہمیں بمبئی کے ایک نواحی علاقے میں جانا پڑتا تھا جہاں خشک ریتیلا میدان اور بے آب و گیاہ ٹیلے بکھرے تھے اور دوسری فلم کے لئے ہمیں ناسک روڈ کے ایک خطرناک حصے میں جانا پڑتا تھا۔

مصروفیت بہت زیادہ بڑھ گئی اور ساتھ ہی میری ذمے داری بھی۔ ان دونوں علاقوں میں آؤٹ ڈور شوٹنگ کے دوران مطلوبہ حصے کے گرد خاردار تاریں ڈال جاتی تھیں مگر اردگرد سے گزرنے والے سیکڑوں افراد شوٹنگ دیکھنے کے لئے آجمع ہوتے۔ ان میں زیادہ تعداد ملاحوں اور مزدوروں کی ہوتی تھی اور ان میں سے بہت کم لوگ یونٹ کے منتظمین کی ہدایت کی پروا کرتے تھے۔ ریما کے دشمن اس ہجوم میں شامل ہو کر اگر کچھ کر گزرتے تو ان کا سراغ لگانا بے حد مشکل ہوتا۔ مجھے ہر وقت ریما پر نظر رکھنا پڑتی۔

اسی ایڈونچر نما مصروفیت میں پندرہ دن گزر گئے۔ اس دوران ایک ہدایت کار وجے میرا گہرا دوست بن گیا۔ وہ ایک زندہ دل نوجوان تھا اور حال ہی میں اس کی دو فلمیں اوپر تلے باکس آفس پر ہٹ ہوئی تھیں جنہوں نے اس کے لئے کامیابیوں کے دروازے کھول دیئے تھے۔ آؤٹ ڈور شوٹنگ کے دوران فرصت ملتے ہی وہ آکر مجھے کھینچ کر اپنے خیمے میں لے جاتا بوتل کھول کر بیٹھ جاتا اور بے تحاشا باتیں کرتا۔

مجھے اس کی ایک خصوصیت پسند تھی کہ زندگی کے بارے میں اس کا مشاہدہ بے حد تیز تھا اور اس کم عمری ہی میں اس نے اپنے سینے میں جگر خراش تجربات کا خزینہ جمع کر رکھا تھا۔ اب یوں لگتا تھا کہ وہ گویا گئت کامیابیوں کے جھرمٹ میں گھر کر زمانے سے اپنی تمام گزشتہ ناکامیوں، تلخیوں اور ذلتوں کا انتقام لے رہا ہے۔ ضرورت سے زیادہ خود اعتماد ہو گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اسے زوال بھی جلد ہی آئے گا۔ دوڑتے دوڑتے اوندھے منہ گرے گا۔ اسے خود بھی اس حقیقت کا ادراک تھا مگر وہ پروا نہیں کرتا تھا۔ کہتا تھا کہ عروج خواہ ایک دن کا ہو اس میں اپنی تمام حسرتیں پوری کر لینی چاہئیں۔ بہرحال اپنی تمام تر قباحتوں سے قطع نظر وہ دوست بہت اچھا تھا۔

آؤٹ ڈور شوٹنگوں سے فارغ ہو کر دو دن تک ہما اسٹوڈیو نہیں گئی۔ دوسرے دن مجھے طلحہ سے ملنے کی خواہش نے بے قرار کیا۔ ہما نے صبح ہی بتا دیا تھا کہ وہ اسٹوڈیو نہیں جائے گی۔ میں نے اس سے دو تین گھنٹے کے لئے اجازت طلب کی۔ وہ لان پر بیٹھی تھی۔

"اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے منصور!" وہ مسکرائی۔ "تم مرضی کے مالک ہو۔ تاہم جلدی آنے کی کوشش کرنا۔ تم ادھر ادھر ہوتے ہو تو مجھے بے اطمینانی سی رہتی ہے۔"

کار کی چابیاں میرے ہی پاس تھیں۔ میں اٹھنے لگا تو جیسے اسے کچھ یاد آ گیا۔ "ذرا ٹھہرو۔" اس نے کہا اور اٹھ کر اندر چلی گئی۔ چند لمحے بعد واپس آئی تو چند نوٹ اس کے ہاتھ میں تھے۔ کچھ نوٹ نکال کر اس نے گن کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ چار ہزار رکھ لو۔ شاید تمہیں ضرورت پڑ جائے۔"

"فی الحال تو مجھے ضرورت نہیں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "جب ہو گی تو مانگ لوں گا۔"

"میں کہتی ہوں رکھ لو۔" اس نے واضح تحکم سے انداز میں کہا۔

"ہاں ۔۔۔ مجھے یاد آیا۔" میں نے کچھ چونک کر کہا۔ "ایک دوست کے لئے مجھے شاید ان کی ضرورت پڑ جائے۔" میں نے نوٹ لے کر کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لئے۔ میرا ہاتھ ریوالور سے مس ہوا جسے اب میں بغلی ہولسٹر میں رکھنے لگا تھا۔ آؤٹ ڈور شوٹنگوں کے دوران میں نے ریوالور کو ہولسٹر سے نکالنے اور نشانہ لگانے کی اچھی مشق کر لی تھی کہ اب میں پلک جھپکنے میں یہ عمل دہرا سکتا تھا۔

"کورنش گر پہنچنے کے لئے مجھے صرف ایک جگہ راستہ پوچھنا پڑا۔ کچھ دیر بعد میں نے اس تنگ سی گلی میں گاڑی روکی اور اتر کر پیدل آگے بڑھا۔ ہوٹل والے لطیفی نے مجھے دیکھ کر سامان نکالتے نکالتے حیرت سے میری طرف دیکھا پھر سر جھکا کر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

طلحہ کی کھولی کا دروازہ کھلا ہی تھا۔ میں سیدھا اندر چلا گیا۔ وہ رضائی لئے جھلنگا سی

چارپائی پر دراز تھا۔ میری آہٹ سن کر اس نے آنکھیں کھولیں۔ کمزور تو وہ پہلے ہی تھا اب کچھ زیادہ ہی نحیف نظر آ رہا تھا۔

"آؤ میرے یار! تم نے تو عیش و عشرت میں ہمیں بھلا ہی دیا۔" اس نے رضائی پھینک کر لیٹے ہی لیٹے دونوں بازو پھیلا دیے۔ میں نے اس کی گردن کے نیچے ہاتھ ڈال کر کچھ اوپر اٹھا کر اسے سینے سے لگا لیا۔

"تم کس غم میں اپنی ارتھی سجائے پڑے ہو؟" میں نے اس کے قریب بیٹھ کر تاریک شیشوں کی عینک اتارتے ہوئے پوچھا۔

"تین دن سے طبیعت کچھ خراب ہے یار!" اس نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اس سے پہلے اسٹوڈیو میں کئی مرتبہ تمہارا پتہ کیا۔ معلوم ہوا کہ تم آؤٹ ڈور شوٹنگوں میں ہما کے ساتھ ہی مصروف ہو۔" پھر وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "پہلے میں چائے کا آرڈر دے آؤں۔ پھر باتیں ہوں گی۔"

"تم بیٹھے رہو۔ میں خود کہہ آتا ہوں۔" میں نے اسے روکا۔

"نہیں۔ آج میری طبیعت بہت بہتر ہے بلکہ میں تو اسٹوڈیو جانے کا بھی ارادہ کر رہا تھا۔" اس نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر وہ چونکا اور پلٹ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ "لطیفی کی سڑی ہوئی چائے پی لو گے؟"

"چائے ہو یا وسکی دیکھ لیں گے؟" میں نے فرش پر پاؤں مار کر کہا۔ وہ ہنستا ہوا باہر چلا گیا۔

چائے کے دوران ہم ایک دوسرے کو اپنی اپنی مصروفیات کا احوال سناتے رہے۔ پھر میں نے دو ہزار کے نوٹ نکال کر اس کی گود میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "یار طلحہ! میں چاہتا ہوں تم اس کھولی کو چھوڑ کر کسی اچھی جگہ منتقل ہو جاؤ۔"

وہ یک لخت سنجیدہ ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں گہری سرد مہری عود آئی۔ "اس قسم کی عنایتوں کی ضرورت نہیں منصور ڈیئر!" اس نے اجنبی سے لہجے میں کہا۔ "ان اداری کارروائیوں کے بغیر بھی میں تمہارا دوست ہی رہوں گا۔"

"لیکن انہیں قبول کر لینے میں تمہیں کیا تکلیف ہے؟" میں نے خفگی سے کہا۔ وہ ذرا سا خاموش رہا تو میں نے اس کا کندھا پکڑ کر ہلایا۔ "بولو یار!"

"کچھ کہہ دوں۔ ناراض ہو گے تو نہیں؟" اس نے غیر متوقع سنجیدگی سے کہا۔

"مرے ہوئے کو کیا مارو گے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی رمق تک نہ ابھری۔ اس نے عجیب سی نظروں سے میرا سر تا پا جائزہ لیا۔ میرے نئے سوٹ کو دیکھا چمکتے جوتوں پر نظر ڈالی اور مدھم لہجے میں کہا۔ "منصور! تم مجھے اس وقت ہو طوائف لگ رہے ہو۔ تمہاری کمائی کھانے کو میرا دل نہیں مان رہا۔"

ایک شعلہ سا میری کنپٹیوں سے ابھرا اور بالوں کی جڑوں تک لپک گیا۔ میں بمشکل اپنے آپ پر قابو رکھ سکا۔ اگر میں اسے ایک ہاتھ بھی مار دیتا تو اس کی گردن ٹوٹ جاتی۔ چند لمحے بعد بمشکل میرے حلق سے آواز نکلی۔ "ہماری فرسودہ سوسائٹی میں عورتوں کے متعلق افسانے تراشنے کا رواج بڑا پرانا ہے لیکن مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی کہ مجھ سے ضروری تفصیل پوچھے بغیر تم ریٹا کے اور میرے تعلق کے بارے میں اتنی بڑی بات کہہ دو گے۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ اس کے ساتھ میرے شب و روز کس طرح گزرتے ہیں۔ پھر خود ہی فیصلہ کرنا کہ میں اس کے لیے کیا ہوں۔ میں تو کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔"

پھر میں نے اسے ریٹا کے ساتھ گزرے ہوئے دنوں کے ایک ایک لمحے کی تفصیل کم و کاست سنا دی جس میں کہیں رنگین راتوں اور عشقیہ خلوتوں کا ذکر نہیں تھا۔ "تمہاری تسلی کے لئے بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں کہ یہ سب کچھ سچ ہے۔"

"مجھے اعتبار آ گیا اور میں تم سے معافی مانگتا ہوں۔" اس نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ "میں اپنے جاہلانہ تبصرے پر سخت شرمندہ ہوں۔ میں تمہاری پیشکش ہوتے ہوئے بھی اپنے لئے دوستی کا اعزاز سمجھ کر رکھ رہا ہوں لیکن رہوں گا میں اسی کھولی میں۔"

"کیوں۔" میں نے پوچھا۔ میرے دل سے غصے کا غبار چھٹ گیا تھا۔

"میں تمہارے کہنے پر ابھی جگہ منتقل ہو جاؤں۔ جب تک تم یہاں ہو مجھے عیش کراتے رہو گے لیکن تمہارا کیا بھروسہ؟ تم مجھے سیلانی سے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ کل کو کہیں چلے گئے تو مجھے عرش سے فرش پر آنے میں بڑی تکلیف ہو گی۔ نہ بابا۔" اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ "میں اس کھولی میں رہ کر جتنا بھی چاہے معیار زندگی بلند کر لوں لیکن رہوں گا یہیں۔ اس کا کرایہ چالیس روپے ماہوار ہے جو میں برے وقت میں بھی آسانی سے دے سکتا ہوں۔"

اس کی بات میرے دل کو لگی۔ میں نے مزید اصرار نہیں کیا۔ پہلے اس نے رکھ لئے۔ کچھ دیر گپ شپ کے بعد میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ گاڑی تک مجھے چھوڑنے آیا۔

اگلے دن شام کو اسٹوڈیو میں میں ریٹا کو شوٹنگ میں مصروف چھوڑ کر وسیم کے دفتر میں آ بیٹھا جو اس فلور سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا جہاں ریٹا کام کر رہی تھی۔ وسیم جوتے اتارے دونوں ٹانگیں میز پر رکھے ریوالونگ چیئر پر نیم دراز تھا اور سہگل کا وہ گانا گنگنا رہا تھا جو کبھی بے حد مقبول تھا۔

غم دیئے مستقل کتنا نازک ہے دل یہ نہ جانا

وسیم کی یہ خاص عادت تھی جب بہت خوش ہوتا تھا تو ایسے گانے گاتا تھا۔

"بہت خوش نظر آ رہے ہو۔" میں نے صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے کہا۔ "آؤٹ ڈور

کی حسرت اتر گئی کیا؟"

"ہاں۔ آتے ہی اتر گئی تھی۔" اس نے دونوں ہاتھ گدی کے پیچھے رکھ کر کچھ اور پھیلتے ہوئے کہا۔ "کل ہیروئن بننے کی امیدوار ایک لڑکی آئی تھی اور معلوم ہے اسے لے کر کون آیا تھا؟ اس کا بھائی!" وسیم دونوں پاؤں میز سے اتار کر اچانک سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "یار! ابھی بھی مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے گو کہ یہ تماشا میرے لئے نیا نہیں ہے کہ شہرت دولت اور آسائشوں کی طلب انسان کو کتنا بے غیرت بنا دیتی ہے۔ میں نے لڑکی کے بھائی کو سگریٹ لینے بھیج دیا اور وہ بھلا مانس میرا مطلب سمجھ کر پورے ایک گھنٹے میں سگریٹ لے کر واپس آیا۔ اس دوران میں نے پیچھے ریٹائرنگ روم میں نہایت اطمینان سے لڑکی کا اسکرین ٹیسٹ لیا۔"

"پھر تو وہ بھلا مانس پہلے ہی سے تربیت یافتہ بے غیرت ہو گا۔ شہرت اور دولت کے لالچ میں نیا نیا بے غیرت نہیں بنا ہو گا۔" میں نے کہا "تم نے انہیں جواب کیا دیا ہو؟"

"یہی کہ ابھی میں کچھ فیصلہ نہیں کر سکتا۔ کل پھر آنا۔" وسیم نے جواب دیا۔ "آج وہ پھر آئیں گے بلکہ آنے والے ہیں۔ یار! جب وہ آئیں تو پیارے بھائی تم بھی رخصت ہو جانا۔" اس نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

"میں ابھی چلا جاتا ہوں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"نہیں ...... نہیں۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑا۔ "مستقبل کی ہیروئن کے درشن کر کے جانا۔" پھر وہ قدرے سنجیدگی سے بولا۔ "یار! ویسے پتے کی بات یہ ہے کہ لڑکی میں ہیروئن بننے کے گن ہیں کل سے یہی سوچ رہا ہوں کہ ......" چپڑاسی کو اندر آتے دیکھ کر وہ خاموش ہو گیا۔ چپڑاسی نے ایک چٹ اس کے سامنے رکھ دی۔

"بھیج دو۔" وسیم نے چٹ پر نظر ڈال کر کہا اور ٹائی کی گرہ درست کر کے بیٹھ گیا۔ چند لمحے بعد بھولے بھالے سے چہرے والی ایک لڑکی ایک لمبے تڑنگے نوجوان کے ساتھ دفتر میں داخل ہوئی۔ انہیں دیکھتے ہی مجھے بجلی کا شاک سا لگا اور میں اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ شہناز اور سرمد تھے۔

انہوں نے مجھے نہیں پہچانا تھا۔ سرمد نے تو خیر اس رات میری شکل ہی نہیں دیکھی تھی جب میں نے اسے بے ہوش کیا تھا۔ شہناز اس لئے نہیں پہچان پائی تھی کہ اب میرے چہرے پر فرنچ کٹ داڑھی تھی اور آنکھوں پر تاریک شیشوں کی عینک تھی۔ انہوں نے قدرے ٹھٹک کر میری طرف دیکھا اور وسیم کا اشارہ پا کر اس کے سامنے بیٹھ گئے۔

اس سے پہلے کہ وسیم ان سے بات شروع کرتا میں ان کے سامنے میز پر جھک گیا۔ ایک ہاتھ میز پر ٹکا کر دوسرے ہاتھ سے عینک اتار کر میں نے براہ راست شہناز کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "مجھے پہچانتی ہو شہناز؟"

اس نے قدرے پیچھے کھسک کر سہمی سہمی سی نظروں سے مجھے دیکھا پھر ہچکچاہٹ آمیز انداز سے اثبات میں سر ہلایا۔ "مجھے وہ بنڈل چاہیے جو اس رات میں تمہارے کمرے میں بھول گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس ڈائری سمیت جو اس میں موجود تھی۔"

"ان دونوں چیزوں کے متعلق اس سے پوچھو۔ مجھے کوئی علم نہیں۔" شہلا نے اپنے بھائی کی طرف اشارہ کیا۔

"تم وہی ہو جس نے اس رات کپڑوں کی الماری سے مجھے گھونسا مارا تھا؟"
مسعود بول اٹھا۔

"ہاں۔ میں وہی ہوں۔" میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ "اور اگر تم نے وہ ڈائری مجھے واپس نہ کی تو میں تمہیں ایک اور گھونسا ماروں گا اور وہ تمہاری زندگی کی آخری چوٹ ہو گی۔"

"ناراض ہونے کی ضرورت نہیں بھائی جی!" مسعود نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ "آپ وجے بابا کے دوست ہیں تو ہمارے بھی دوست ہیں۔ وہ ڈائری اس وقت بھی میرے پاس موجود ہے۔ اس میں ڈھیر سارے ورقوں پر تو اردو میں لکھا ہوا تھا۔ اردو مجھے پڑھنا نہیں آتی لیکن میں نے ڈائری کو اس لئے اپنے پاس رکھا ہوا ہے کہ اس میں کافی ورق خالی تھے۔ ان پر میں اپنا اور شہلا کا خرچ پانی کا حساب کتاب لکھتا ہوں۔ بہرحال ڈائری تمہاری امانت ہے۔ ابھی سے لو۔ کوٹ میرے گھر پڑا ہے۔ کہو تو ابھی لا دوں اور کہو تو کل یہیں پہنچا دوں۔" اس نے اپنی واسکٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا۔

"کوٹ کو گولی مارو۔ ڈائری نکالو۔" میں نے بے چینی سے کہا۔

جس وقت میں نے ڈائری اس کے ہاتھ سے لی میرا دل اس شدت سے دھڑک رہا تھا جیسے ابھی سینے سے باہر آ جائے گا۔ ڈائری جیب میں رکھ کر میں وجے کی طرف مڑا جو دم بخود بیٹھا تھا۔

"شہلا اس لڑکی کے لئے میری بھرپور سفارش ہے۔" میں نے شہلا کی طرف اشارہ کیا۔ "ہو سکے تو اسے کچھ نہ کچھ بنانے کی کوشش ضرور کرنا۔ بے وقوف بنانے کے علاوہ"

وجے کو کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر میں اس کے دفتر سے نکل گیا۔ ہما مجھے برآمدے میں ملی۔ وہ لباس تبدیل کرنے جا رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ اگلے سین کی شوٹنگ ملتوی ہو گئی ہے کیونکہ ہیرو صاحب ابھی تک نہیں پہنچے۔

گھر پہنچتے پہنچتے ہمیں نو بج گئے۔ راستے میں ہما کو تین تقسیم کاروں کی دفتروں سے اپنے معاوضے کی قسطوں کے چیک لینے تھے۔ ان دفتروں میں ادھر ادھر کی باتوں میں خاصی دیر لگ گئی۔ گھر پہنچتے ہی ہم کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ دوسری ایکٹریسوں کے برعکس ہما سیٹ پر پروڈیوسروں کی طرف سے منگایا گیا کھانا نہیں کھاتی تھی خواہ وہ کتنے ہی اعلیٰ ہوٹل سے

کیوں نہ منگوایا جاتا۔

آج اسے کام کم کرنا پڑا تھا اس لئے خاصی تازہ دم نظر آ رہی تھی۔ کھانے کی میز پر ہی بیٹھے بیٹھے کافی دیر تک باتیں کرتی رہی۔ آج میرا اس کی باتوں میں دھیان بہت کم تھا۔ مجھے بار بار جیب میں رکھی ڈائری کا خیال آ رہا تھا۔ میں جلد از جلد اپنے بیڈ روم میں جا کر اس کا مطالعہ کرنا چاہتا تھا۔ تقریباً گیارہ بجے ہما نے جمائی لی اور بغور میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "اب سونا چاہیے۔ تم بھی کچھ کھوئے کھوئے سے نظر آ رہے ہو۔"

"دراصل میں ..... کچھ خطوط لکھنا چاہتا ہوں۔ دفتر میں تو وقت نہیں ملتا۔" میں نے بہانہ کیا۔ "خطوط پر یاد آیا کہ ہیما بھی دو دن سے نہیں آ رہی۔ کافی جواب طلب خطوط جمع ہو گئے ہیں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ہیما اس کی سیکرٹری تھی۔ "اگر وہ کل بھی نہ آئی تو کچھ اہم خطوط کے جواب لکھ دینا پلیز!"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور گویا قید سے چھوٹ کر انیکسی کی طرف بھاگا۔ بیڈ روم میں پہنچ کر میں نے کپڑے بدلے۔ ریوالور سرہانے رکھا اور بیڈ لیمپ جلا کر لیٹ گیا۔ جس ڈائری کے کھو جانے کا مجھے اتنا قلق تھا اب اسے کھولتے ہوئے نہ جانے کیوں خوف آ رہا تھا۔ کافی دیر تک میں اسے دونوں ہاتھوں میں تھامے بے حس و حرکت لیٹا رہا پھر آہستگی سے اسے کھولا۔

دفعتہً ٹیلیفون کی گھنٹی سن کر میں یوں اچھل پڑا گویا میرے قریب ہی بم پھٹا ہو۔ یک لخت جھنجھلاتے ہوئے اعصاب پر قابو پا کر میں نے ڈائری سرہانے رکھی اور کہنی کے بل اٹھ کر ریسیور اٹھایا۔

"منصور .....!" ہما کی سرگوشی نے مجھے چونکا دیا۔ "کوئی میرے بیڈ روم کی کھڑکی توڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جلدی آؤ ..... جلدی ....." اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔

کتاب پر ... نگیں

میں نے دائیں بغلی کے نیچے دبی اور ریوالور لے کر دیوان کی خوابگاہ کی طرف دوڑا۔ سیڑھیاں عبور کرکے میں ٹیرس پر پہنچا تو چست سیاہ لباس اور چمڑے کی جیکٹ میں ملبوس ایک شخص دروازے کے تالے پر جھکا نظر آیا۔ میری طرف اس کی پشت تھی۔ میں دبے قدموں اس کے قریب پہنچا وہ کسی آلے سے تالا کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں اس کی کنپٹی پر ریوالور کا دستہ رسید کرنے ہی لگا تھا کہ اسے غالباً میری موجودگی کا احساس ہوگیا۔ اپنے اوزار کو تالے ہی میں پھنسا چھوڑ کر وہ بجلی کی سی تیزی سے پلٹا اور ایک ہاتھ سے اس نے میرے پیٹ میں گھونسا رسید کیا۔ گھونسا کیا تھا لوہے کا ایک وزنی ہتھوڑا تھا جس نے پیٹ میں گویا میری آنتوں کو کچل کر رکھ دیا۔ ابکائی لے کر میں لڑکھڑایا۔

دھندلائی نظروں سے میں نے دیکھا اس شخص کے آدھے چہرے پر نقاب تھی۔ پیشانی کے نیچے اس کی غیر معمولی طور پر گول گول آنکھیں نہایت بھیانک لگ رہی تھیں۔ اس سے بھی بھیانک وہ مشین پسٹل تھا جو اس کے دوسرے ہاتھ میں تھا۔ یوگا کی ایک ... سے کام لیتے ہوئے میں سانس روک کر سنبھل گیا لیکن اس سے پہلے کہ میں فائر کرسکتا ... نے مشین پسٹل سے ایک برسٹ مارا۔

میری قسمت اچھی تھی کہ ابھی میں سیدھا نہیں ہوپایا تھا ورنہ گولیوں کی بوچھاڑ سے شاید میرا اوپری دھڑ جسم سے علیحدہ ہو جاتا۔ مشین پسٹل سے "ترٹ ترٹ" کی نہایت ... سی آواز برآمد ہوئی تھی۔ غالباً اس پر سائلنسر لگا ہوا تھا۔ یہ گن بھی نہایت ... تھی ... نقاب پوش بھی نہایت اعلیٰ تربیت یافتہ گوریلا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے مقابلے میں معمولی چوک سے بھی میرے پرخچے اڑ سکتے تھے۔ موت کے خوف سے تو میں ناآشنا تھا لیکن ... حالت میں جان کی حفاظت کا جو احساس کار فرما ہوتا ہے اس نے میری تمام خفتہ صلاحیتوں اور طاقتوں کو بیدار کردیا۔

قلابازی کھا کر میں نے اس کی ٹھوڑی کے نیچے ٹھوکر رسید کی اور سیدھا ہوتے ہوئے اس کی کلائی پر کراٹے کا ایک ہاتھ رسید کیا۔ مشین پسٹل سے دوسرا برسٹ مارا لیکن اس کے ساتھ ہی پسٹل اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ گولیوں کی بوچھاڑ کا رخ ... رہا۔ بلکہ فرش سے چھت کے ان گنت ٹکڑے اکھڑ کر ہوا میں بکھر گئے۔

نقاب پوش کا بالا بے جان ہوکر جھول گیا تھا۔ میں نے فوراً ہی دوسری ٹھوکر اس کی ناف کے نیچے رسید کی۔ یہ ضرب اس کے لئے ناقابل برداشت تھی وہ زخمی اونٹ کی طرح بلبلایا اور دیوار سے جا ٹکرایا۔ میں نے دلچسپی سے اسے فرش پر گرتے دیکھا۔ عین اسی وقت کوئی نکیلی سی چیز سنسناتی ہوئی میرے کان کے قریب سے گزری اور دروازے کی چوکھٹ میں پیوست ہوگئی۔

پلٹ کر دیکھے بغیر بھی مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ ایک خنجر تھا۔ یہ خنجر ایک دوسرے نقاب پوش نے پھینکا تھا جو کمرے کی پہلی دیوار سے نمودار ہوا تھا۔ وہ غالباً اس طرف کھڑکی کھولنے میں مصروف عمل تھا اور تخریب کی آواز سن کر ادھر آیا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں لوہے کی تقریباً دو فٹ لمبی ایک سلاخ اب بھی موجود تھی۔

خونخوار چیتے کی طرح اس نے مجھ پر جست لگائی اور ساتھ ہی سلاخ اس تیزی سے گھمائی کہ اس کی ضرب شاید پتھر کی سل کو بھی دو ٹکڑے کر دیتی مگر میں اس کے بدلے سے ہٹ چکا تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل گرا اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھل سکتا میری لات اس کی پشت پر پڑی اور وہ قلابازی کھا گیا۔ وہ ٹیرس کی ریلنگ کے قریب پہنچ چکا تھا۔

دوسرے ہی لمحے وہ اٹھا اور ریلنگ سے نیچے کود گیا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرا نقاب پوش بھی فرش سے اچھلا اور جست لگا کر ریلنگ سے کود گیا۔ اب تک میری کوشش نجانے کیوں یہی رہی تھی کہ مجھے فائر نہ کرنا پڑے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اعشاریہ تین دو کا جو پرانی ساخت کا ریوالور میرے پاس تھا۔ توپ کی طرح گرجتا تھا۔ لیکن اب چھلانگ لگا کر میں ریلنگ تک پہنچا۔

لان پر کچھ دور تک ہلکی روشنی تھی۔ اس روشنی میں میں نے دو سایوں کو آگے پیچھے دوڑتے دیکھا میں نے اندھا دھند چار فائر کئے لیکن دونوں سایوں کی رفتار میں کوئی فرق نہ آیا۔ پھر وہ اندھیرے کے شکم میں اتر گئے۔ چند لمحے بعد میں نے ان میں سے ایک سائے کو لان کی عقبی دیوار پر نمودار ہوتے دیکھا میں نے ایک اور فائر کیا لیکن وہ سایہ بروقت جھک گیا۔

میں نے دیکھا وہ اپنے ساتھی کو سہارا دے کر دیوار پر چڑھا رہا تھا اپنے ساتھی کو دیوار پر چڑھاتے ہی وہ خود دیوار کی دوسری طرف کود گیا۔ دوسرا ابھی کودنے ہی لگا تھا کہ میں نے ایک فائر اور کیا۔ گولی غالباً اس کی ٹانگ میں لگی تھی۔ وہ کودنے کی بجائے بے جان سے انداز میں دوسری طرف لڑھک گیا۔ پھر میں نے انہیں گرتے پڑتے سڑک پار کرتے دیکھا۔ دوسری طرف تاریکی میں غالباً کوئی گاڑی کھڑی تھی۔ میں نے ایک بار پھر ٹریگر دبایا لیکن ریوالور سے محض "کلک" کی آواز برآمد ہوئی۔ ریوالور خالی ہوچکا تھا۔

میرے عقب میں ایک دھماکا ہوا۔ میں نے پلٹ کر مڑ کے دیکھا۔ کوٹھی کا چوکیدار

اشتیاق خان بوکھلاہٹ کے عالم میں سیڑھیاں چڑھتا آرہا تھا اور اس نے اپنی رائفل سے ہوائی فائر کیا تھا۔

"کیا ہوا کدھر گیا۔ کون تھا صاحب جی؟" اس نے میرے قریب پہنچ کر ہانپتے ہوئے پوچھا اور جواب کا انتظار کیے بغیر دوسرا فائر کرنے لگا تھا کہ میں نے اسے روک دیا۔

"کچھ نہیں ہوا۔" میں نے ریوالور جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ "تم گیٹ پر ہی رہو ..... اور چوکس رہنا۔"

وہ حونق نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا واپس چلا گیا۔ میں نے خواب گاہ کے دروازے پر دستک دی۔ "کون؟" فوراً ہی دروازے کے عقب سے اس کی مدھم اور لرزتی سی آواز سنائی دی۔

"منصور" میں نے جواب دیا۔ "دروازہ کھولو۔ خطرہ ٹل گیا ہے۔"

ملیحا نے ایک گہری سانس لی جس کا ہنکارہ مجھے باہر بھی سنائی دیا۔ پھر کلک کی آواز کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔ وہ ایک ہاتھ سے چوکھٹ تھامے میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہلکے سے خوف کی پرچھائیاں تھیں۔ زلفوں کی بے ترتیب شام رخساروں اور کندھوں پر سایہ فگن تھی۔

بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے اس نے انہیں پشت پر پھینکا اور ہموار لہجے میں بولی۔ "کیسے تھے وہ؟"

"دو۔" میں نے جواب دیا۔ "دونوں فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے مگر ان کے ہتھیار یہیں رہ گئے۔" وہ دروازے کی چوکھٹ سے باہر نکلی۔ پھر اس نے چوکھٹ میں پیوست خنجر اور لابی پر پڑا مشین پسٹل دیکھا۔

"بڑی عمدہ چیز ہے۔" میں نے مشین پسٹل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس پر سائیلنسر بھی لگا ہوا ہے۔"

"اگر تمہیں پسند ہے تو رکھ لو۔" وہ یوں شفقت سے مسکرائی گویا میں ایک بچہ تھا اور وہ مجھے کھلونے دلوانے بازار لائی تھی۔

"پولیس کو اس کے متعلق بتانا تو ضروری نہیں!" اس نے جھک کر مشین پسٹل اٹھایا۔ الٹ پلٹ کر دیکھا اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے خوابگاہ میں لے آئی۔

سنگھار میز کی دراز کھول کر اس نے پسٹل رکھا اور دراز بند کرتے ہوئے بولی۔ "صبح مجھ سے لے لینا۔"

پھر اس نے پلٹ کر اچانک مجھے بستر پر دھکا دیا اور میری بانہوں میں آ گئی۔ "منصور! میرے پیارے ... میرے دوست۔" وہ بے ترتیب سانسوں کے درمیان کٹے کٹے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ "تم نہ ہوتے تو آج نہ جانے کیا ہوتا؟ ..... منصور مجھے کبھی چھوڑ کر نہ جانا

..... کوئی تو ہو جو زندگی بھر میرا ساتھ نبھائے۔ مجھے بھیڑیوں سے بچائے۔"

دفعتاً باہر سیڑھیوں پر جوتوں کی دھپ دھپ سنائی دی۔ ملیحا اپنے وجود کے آتش فشاں کو سمیٹ کر اٹھی۔ میں بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ آنے والا اشتیاق خان تھا۔ ٹیرس پر وہ ہی رک کر ہراساں نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس نے پکارا "بی بی جی۔ بی بی جی۔"

"کیا بات ہے؟" ملیحا نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بہ آواز بلند کہا۔ اس کے پیچھے پیچھے میں بھی دروازے پر پہنچا۔

"وہ جی پولیس کی جیپ آئی ہے۔" اشتیاق نے بتایا۔ "گشت کے دوران انہوں نے فائرنگ کی آوازیں سنی تھیں۔ وہ پوچھ رہے ہیں۔ کیا چکر ہے؟"

"انہیں یہیں لے کر آؤ تاکہ چکر کے آثار وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔" ملیحا نے کہا۔

کچھ دیر بعد چار پولیس والے یوں بندوقیں سنبھالے اوپر آئے گویا میدان جنگ میں انہیں زبردستی کسی مورچے سے باہر دھکیلا گیا ہو۔ ان میں ایک انسپکٹر تھا جو تینوں کانسٹیبلوں سے پیچھے رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ مجھے اور ملیحا کو اطمینان سے لابی پر کھڑے دیکھ کر ان کی جان میں جان آئی۔ انہوں نے بندوقیں جھکائیں اور انسپکٹر صاحب سینہ تھوڑا سا تان کر مسکراتے ہوئے آگے آئے۔

"نمستے ملیحا جی!" اس نے ریوالور ہولسٹر میں رکھ کر دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا چکر تھا ..... فائرنگ وغیرہ ....."

"وہی پرانا چکر ہے انسپکٹر جی۔" ملیحا نے مسکراتے ہوئے کہا ..... "البتہ اب آپ کی راجدھانی میں ان کی ہمت اتنی بڑھ گئی ہے کہ آج گھر پر بھی چڑھائی کر دی۔"

پھر ملیحا نے انہیں لابی کے ایک گوشے میں پڑی کرسیوں پر بٹھایا اور تمام واقعہ سنایا تو نہایت متفکر تھا۔ "..... پھر یہ میرے منیجر صاحب آ پہنچے۔" آخر میں ملیحا نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اور وہ دونوں نقاب پوش بھاگ گئے۔ فائر انہوں نے ہی کیے تھے۔"

انسپکٹر ایک ڈائری میں سب کچھ لکھتا رہا۔ ملیحا کے خاموش ہونے کے بعد اس نے گھوم پھر کر جائے واردات کا معائنہ کیا۔ پھر ایک کانسٹیبل کو نقشہ تیار کرنے کو کہا جس نے کافی دیر تک شرقاً غرباً کی گردان کرنے کے بعد بالآخر ایک کاغذ پر کچھ دائرے اور چند آڑی ترچھی لکیریں کھینچ لیں۔ پھر وہ لوگ میرے ساتھ لان اور سڑک پر بھی آئے۔

جہاں جہاں میں نے نقاب پوشوں کو دوڑتے دیکھا تھا وہاں سڑک پر ہمیں خون کے دھبے بھی دکھائی دیے اور ایک جگہ درختوں کے قریب کسی کار کے ٹائروں کے تازہ نشان بھی نظر آئے۔ معائنے کے دوران میں نے دیکھا کہ ارد گرد کی کئی کوٹھیوں میں روشنی نظر آنے

گئی تھی مگر کوئی شخص باہر آتا دکھائی نہیں دیا۔ کانسٹیبل نے تمام نشانات وغیرہ کی تفصیل نوٹ کی اور ہم میزوں پر آگئے۔ ماہا نے اس دوران اسکاچ کی ایک بند بوتل اور چار گلاس میز پر لا رکھے تھے۔

"شوق فرمایئے انسپکٹر صاحب۔" ماہا نے کہا۔

"معذرت ماہا جی...... لیکن آپ کو تو علم ہے کہ میں پیتا نہیں ہوں۔" انسپکٹر بھواس نے للچائی نظروں سے بوتل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور اس وقت تو میں ویسے بھی ڈیوٹی پر ہوں۔ گھر پر کبھی کبھی مہمان آجائیں تو ایک آدھ پیگ کا شغل ہو جاتا ہے۔"

"تو پھر میری طرف سے مہمانوں کے لئے رکھ لیجئے۔ میں بھی مہمانوں ہی کے لئے رکھتی ہوں۔" ماہا نے مسکرا کر کہا اور پھر اخلاق خان کو بلا کر کہا۔ "یہ بوتل اخبار میں لپیٹ کر انسپکٹر صاحب کی گاڑی میں رکھ دو۔"

"آپ خواہ مخواہ تکلیف کر رہی ہیں۔" انسپکٹر نے مزاحمت سے عاری لہجے میں کہا۔ "خیر آپ اصرار کرتی ہیں تو رکھ لیتا ہوں۔ آپ جیسی ہستی سے ملی ہوئی چیز تو ویسے بھی نشانی کے طور پر رکھی جا سکتی ہے۔" پھر اخلاق خان کے جاتے ہی اس نے خود بھی اٹھتے ہوئے کہا۔ "اگر زحمت نہ ہو تو اپنے منیجر صاحب کو میرے ساتھ پولیس اسٹیشن بھیج دیجئے۔ یہ ایف آئی آر پر دستخط کر دیں گے۔"

"ایف آئی آر کی کوئی ضرورت نہیں بھواس جی۔" ماہا نے ہاتھ اٹھا کر فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "پانچ ایف آئی آر تو درج ہو چکی ہیں۔ دو آپ کے علاقے میں اور تین دوسرے علاقوں میں انہی کا آج تک کچھ نہیں بنا۔ خواہ مخواہ رجسٹر کالے کرنے سے کیا فائدہ؟ میں اب مزید کوئی ایف آئی آر درج نہیں کراؤں گی۔"

"تو پھر آپ نے پہلے ہی کیوں نہ منع کر دیا؟ میں نے خواہ مخواہ ہی اتنی سر کھپائی کی۔" انسپکٹر نے ندامت کی خفیف سے احتجاج کے ساتھ کہا۔

"میں سوچ رہی تھی کہ چلو آپ تحقیق کا شوق ہی پورا کر لیں۔" ماہا نے مسکراتے ہوئے کہا اور جواباً انسپکٹر بھی قدرے بے بسی سے مسکرا کر رہ گیا۔ انہیں رخصت کرنے میں اور ماہا سیڑھیوں تک گئے اور وہیں سے پلٹ آئے۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ نو بج رہے تھے۔

"نیند آ رہی ہے۔" میں نے ایک مصنوعی جمائی لیتے ہوئے کہا۔ "اب میں چلتا ہوں۔" میرے ذہن پر ایک بار پھر ڈائری سوار تھی۔ جسے میں تکیے تلے رکھ آیا تھا۔

"مجھے ڈر لگے گا۔ میں سو نہیں سکوں گی۔" اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

بستر پر لیٹے لیٹے ماہا نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا اور انٹرکام کا سوئچ آن کر کے تین نمبر کا بٹن دبایا۔ جس سے آشا کے کمرے میں لگے ہوئے سیٹ کی گھنٹی بجی تھی۔ چند لمحے کے توقف کے بعد وہ بولی "آشا! جب یہاں آؤ تو اس سے کہنا کہ ڈائری میں آج کی شوٹنگیں دیکھ کر ڈائریکٹروں کو اطلاع دے دے کہ آج میں نہیں آسکوں گی...... نہیں نہیں ......

میری طبیعت خراب نہیں ہے ...... بلکہ میری طبیعت تو مدتوں بعد آج ٹھیک ہوئی ہے...... ہاں...... ٹھیک ہے؟ اوکے۔"

ریسیور رکھ کر وہ کروٹ لے کر میری طرف مخمور نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرائی اور تکیے پر رخسار ٹکے دبا کر آنکھیں موند کر لیٹ گئی۔ چند لمحوں کے بعد وہ بے سدھ ہو گئی۔

اس کے کمرے کا دروازہ بند کر کے میں انیکسی میں آیا اور کپڑے بدلنے کے بعد اپنے بستر پر جالیٹا۔ تکیے تلے سے ڈائری نکالتے وقت ایک بار پھر میری رگ رگ میں اضطراب سا دوڑ گیا۔ پچھلی شب کی سرشاری اور خمار کافور ہو گیا۔ ڈائری کھولتے ہی میری نظر پہلے صفحے پر پڑی جس پر صرف ایک سطر لکھی تھی۔

"میرے بس میں ہو تو اس داستان زندگی کا ایک ایک لفظ اپنے لہو سے لکھتی۔"

میں نے ورق پلٹا۔ سکون اور شکستہ سے الفاظ کا ایک جال میرے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ لکھا تھا۔

آج میں اپنی لہو لہو زندگی کا کل احوال کاغذ کے ان بے جان ٹکڑوں پر منتقل کر دینا چاہتی ہوں۔ کچھ گھاؤ اور چرکے ایسے ہوتے ہیں جنہیں کاغذ میسر نہیں آتے۔ لیکن جب بھی کسی کو ان کی حفاظت کا فریضہ سونپا جائے تو اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ ماضی کے ایک ایک پہلو سے آگاہ ہو۔ اسے جاننا چاہیے کہ اس کے باغ کے کس کس بوٹے کو کس کس نے اجاڑا، روندا اور برباد کیا۔

اسے لٹیروں اور ان کے مظالم کی ایک ایک تفصیل سے آگاہی ہونی چاہئے کیونکہ باغوں کو اجاڑنے والے لٹیرے اپنے مظالم سے کبھی باز نہیں آتے۔ وہ لوٹ کر تہ بھی آئیں تو بھی نئے باغوں کو اجاڑنے کی دھن میں رواں دواں رہتے ہیں۔ انہیں تلاش کرنا اور ان کے کئے کی سزا دینا انسان کی زندگی کا بہترین مصرف ہے۔ میری نظر میں۔

بیٹے! میں نے اپنی کہانی تمہارے علم میں لانے کے لئے کاغذ اور قلم کا سہارا اس لئے لیا ہے کہ اسے تمہارے سامنے بیان کرنے کا مجھ میں حوصلہ نہیں۔ اس میں کئی پہلو ایسے شرمناک ہیں جنہیں کوئی بھی ماں اپنے بیٹے کے روبرو لفظوں کا قالب نہیں دے سکتی۔ تحریر میں یہ کام آسان ہے اور میں یہ سب کچھ اس لئے تمہارے علم میں لانا چاہتی ہوں کہ میں اپنے اوپر ہونے والی ایک ایک زیادتی کا بلا کم و کاست تذکرہ کئے بغیر اس وصیت کی تکمیل کی امید نہیں رکھ سکتی جو میں تم پر نافذ کرنا چاہتی ہوں۔

تم آخر سے پہنچنے والے وہ محافظ ہو جنہیں لٹیروں سے ان کے ایک ایک ظلم کا

رہتا ہے۔ لیکن حضور جان... گا۔ میں اس نگرانی کے کام میں ہی ٹھیک ہوں۔" بدستور ہاتھ باندھے کھڑے رہے۔ "تجارت میں نفع کے ساتھ ساتھ نقصان کا بھی لینا دینا پڑتا ہے۔ میری گزر بسر تو اسی کے بدلے میں ہی بڑی اچھی طرح ہو جاتی ہے۔"

"اچھا ـــ ہم تمہاری بھلائی کے لئے کچھ اور بہتر طریقے سوچیں گے۔" نواب صاحب بغور انہیں دیکھتے ہوئے مسکرائے اور گاؤ تکیے پر ہو کر لیٹ گئے۔

"لیکن حضور ـــ!" ایلچی نے جھکتے ہوئے کہا۔ "باتوں باتوں میں اصل بات تو رہ گئی۔ آپ کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا جو اس وقت اس عالم میں ـــ؟" انہوں نے بات نامکمل چھوڑ دی۔

"شکار پر نکلے ہوئے تھے ہم۔" نواب صاحب کی آواز دھیمی پڑ گئی۔ "ریاست کی طرف واپس جا رہے تھے کہ کچھ نقاب پوش گھڑ سواروں نے حملہ کر دیا۔ وہ اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے۔ ہمارے ساتھ صرف تین محافظ تھے۔ ایک زخمی ہو کر گر گیا۔ ایک گھوڑے کو گولی لگی۔ ہمارے گھوڑے کی بھی گردن پر گولی لگی اور وہ بدک گیا۔ نہ جانے کدھر کدھر کی خاک چھانتا رہا۔ پھر یہ پچھواڑے کے جنگل میں آگرا اور گردن کے زخم سے بے دم ہو کر گر پڑا۔ گھڑ سوار وہاں تک ہمارے تعاقب میں آئے تھے لیکن جنگل میں گھس گئے اور ہم جان بچا کر نکل آنے میں کامیاب ہو گئے۔ بندوق بھی کہیں گر گئی۔"

پھر انہوں نے اپنے لمبے لمبے گرد آلود بالوں میں انگلیاں پھیریں جن میں سے آدھے سفید تھے۔ "ہماری پگڑی بھی کہیں گر گئی۔ اس میں بڑا قیمتی ہیرا اور موتی جڑے تھے۔"

"لیکن حضور۔" ایلچی نے گھبرا کر ڈرتے ڈرتے کہا۔ "آپ کے علاقے میں ڈاکوؤں کی یہ دیدہ دلیری؟ ہم نے تو کبھی ان اطراف ڈاکوؤں کا نام و نشان ـــ"

"ہم اس وقت اپنے علاقے میں نہیں تھے اور نہ ہی وہ گھڑ سوار ڈاکو تھے۔" نواب صاحب کے لہجے میں قدرے تیزی آگئی۔ "ہم جانتے ہیں وہ چند چھوٹے موٹے رجواڑوں کے سرپھرے لڑکے ہیں۔ طالب علم ہیں۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے نا آج کل ہندوستان سے انگریزوں کو نکالنے کی تحریک ایک بار پھر زور پکڑ رہی ہے اور یہ لونڈے لپاڑے ہمیں شک کرتے ہیں۔ انگریزوں کا ایجنٹ سمجھتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریزوں سے مراسم گہرے ہیں۔ ہم دو مرتبہ انگلستان میں گئے ہیں۔ پولیٹیکل ایجنٹ بھی ہر معاملے میں مشورہ کرنے آتا ہے مگر اس بناء پر ہمیں غدار قرار دینا تو شرافت نہیں ہے۔ انگریزوں سے بنا کر رکھنا پڑتی ہے۔ اس کے بغیر تو ہماری جاگیرداری نہیں چل سکتی۔ دوسری اصلاحات کے نام پر اپنی زمینیں تو نہیں چھڑوا سکتے نا۔ جب آزادی کی تحریک

چھڑے گی تو دیکھا جائے گا کہ ہم کس کا ساتھ دیں۔ ادھر دلی میں جن چھ تومیوں کو پھانسی دی گئی اس کا ذمے دار بھی یہ لوگ ہمیں گردانتے ہیں کہ ہم نے مخبری کی تھی۔ حالانکہ بات صرف اتنی ہے کہ دلی سے کچھ لونڈے لپاڑے طالب علموں کا ایک گروہ ہمارے پاس آیا تھا۔ وہ لوگ ہم کو بولتے تھے کہ تحریک چلانے کے لئے ہم ان کے فنڈ میں پانچ لاکھ روپیہ دے دیں۔ ہم نے انکار کر دیا۔ تب سے کچھ لوگ ہمارے خون کے پیاسے ہو گئے۔ پانچ لاکھ بڑی رقم ہوتی ہے میاں۔ کوئی پتہ نہیں کون لوگ تحریک کے ذمہ دار ہوں گے کیا کام لیا جائے گا اس پیسے سے ـــ اور ہم ایسے ہی اٹھا کر اتنی بڑی رقم تو انہیں دے دیں؟ ہم کو پاگل کتے نے کاٹا ہے؟ اور پھر ایسی باتیں انگریزوں سے چھپی تو نہیں رہتی ناں۔ انگریزوں کے جاسوسوں کا تو ہمیں پتا ہے ناں۔"

نواب صاحب جوش میں بولے جا رہے تھے اور ایلچی دم سادھے کھڑے تھے۔ نواب خاموش ہو گئے تو ان کی گردن کی پھولی ہوئی رگیں اعتدال پر آگئیں۔ انہوں نے دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھ کر چھت کی کڑیوں کو گھورتے ہوئے کچھ بدلے بدلے اور ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ "لیکن ان ملاں مکتب کو شرافت علی سے دشمنی مہنگی پڑے گی۔ ہم ان کو کھوج نکالیں گے اور ان کے سرپرستوں کو بھی اور ان کا حشر دنیا دیکھے گی۔ ان کو ہماری طاقت کا علم نہیں ہے۔"

"بے شک ـــ بے شک حضور!" ایلچی نے قدرے دھیمی آواز میں کہا۔ "ارے۔" نواب صاحب ان کی طرف دیکھ کر قدرے چونکے۔ "تم ابھی تک کھڑے ہی ہو؟ بیٹھ جاؤ۔ بیٹھ جاؤ۔"

"کوئی بات نہیں سرکار ـــ میں ٹھیک ہوں۔" ایلچی گڑبڑا کر بولے۔ "میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ آپ زخمی نظر آ رہے ہیں۔ آپ کے لئے کوئی دوا یا مرہم پٹی وغیرہ کا بندوبست سب سے پہلے کرنا چاہئے تھا لیکن یہاں ایسا کوئی انتظام نہیں ہے۔ اگلے ڈیرے پر ایک حکیم صاحب رہتے ہیں۔ آپ حکم فرمائیں تو انہیں ـــ"

"نہیں ـ نہیں۔" نواب صاحب یک لخت اٹھ بیٹھے۔ ان کے چہرے سے تھکن ایک بار پھر چھا کر رہ گئی۔ "کسی کو بلانے کی ضرورت نہیں۔ کسی کو یہاں ہماری موجودگی کا علم نہیں ہونا چاہیے۔ اس حالت میں ہم کسی کے سامنے آنے کا حوصلہ نہیں لے سکتے۔ نوکروں کے دلوں سے رعب اٹھ جاتا ہے۔ تم بس اتنا کرو کہ گرم گرم دودھ میں ذرا سی ہلدی حل کر کے پلوا دو۔ علاج ہے تو ناگوار۔ لیکن فی الحال یہی غنیمت ہے۔ ہم طبیعت پر جبر کر کے پی لیں گے۔"

"بہت بہتر۔" ایلچی مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "آگ جلا کے دودھ گرم کرو اور ایک

گلاس میں ذرا سی پسی ہوئی ہلدی ملا کر لے آؤ۔"

اب نواب صاحب یوں میری طرف متوجہ ہوئے گویا اب تک میری موجودگی سے لاعلم رہے ہوں۔ میں ان کے سرہانے کھڑی تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ بری طرح چونک اٹھے۔

"یہ کون ہے بھئی؟" انہوں نے مبہوت سا ہو کر اباجی سے پوچھا۔

"میری بچی ہے حضور! اکلوتی بچی۔" اباجی نے جواب دیا۔

"بہت خوب۔" نواب صاحب کی آنکھیں گویا جھپکنا بھول گئی تھیں۔

"ماشاء اللہ۔ چاند اترا ہوا ہے تمہارے آنگن میں اتنی خوبصورت بچی برسوں ہو گزری ہے اور وہ بھی اس کٹیا میں۔ ادھر آؤ بھئی۔ کیا نام ہے تمہارا؟" انہوں نے ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ نہ جانے کیوں میرے پاؤں زمین میں گڑ گئے۔

"ارے بھئی یہ کیا بدتمیزی ہے۔" اباجی نے مجھے گھڑکا۔ "آگے آؤ! نواب صاحب بلا رہے ہیں۔"

بمشکل تمام اور بادل نخواستہ میں آگے بڑھی۔ میرے پیروں میں چاندی کی چھاگل کی پازیب تھی۔ میرے ہر جھجکتے قدم کے ساتھ یہ پازیب معمول سے کچھ زیادہ ہی چھنک اٹھی۔ میں پلنگ کی پٹی کے قریب جا کھڑی ہوئی۔

نواب صاحب نے میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور اس ہاتھ کے بوجھ سے گردن خم سا کھا گئی۔ میں بال ہمیشہ کھلے رکھتی تھی اور یہ کولہوں سے بھی نیچے تک تھے۔ اس وقت میرے سر پر دوپٹہ نہیں تھا۔ نواب صاحب کا ہاتھ میرے بالوں کے اوپر سے پھسلتا ہوا کمر تک چلا گیا۔ میں کچھ سمٹ کر رہ گئی۔ انہوں نے ہولے سے میری کمر تھپکی دی۔ "ہم نے تمہارا نام پوچھا تھا تمہیں بتاؤ گی کیا؟"

"عزیزہ۔" میں نے ہولے سے جواب دیا۔ عجیب لرزتی ہوئی سی آواز میرے حلق سے نکلی۔

"خوبصورت نا مناسب نام ہے۔" نواب صاحب کے بھدے ہونٹوں کے عقب سے زرد دانت جھانک اٹھے۔ "تمہارا نام تو حور پری ہونا چاہئے تھا۔ ہم تمہارا یہی نام تجویز کرتے ہیں یعنی خدا داد خان؟ تمہیں پسند ہے یہ نام؟"

"یہ تو حضور کی نوازش ہے جو ذرے کو آفتاب بنا رہے ہیں۔" اباجی نے بدقسمتی میں کہا۔ "عزت افزائی ہے ہم غریبوں کی۔"

"اپنے آپ کو غریب مت کہو خدا داد خان! تم تو ہیرے کے مالک ہو۔" نواب صاحب کی چندھی چندھی آنکھیں کچھ اور سکڑ گئیں۔ میری کمر سے ہاتھ ہٹا کر انہوں نے خاکی کوٹ کی ایک بڑی سی جیب کا بٹن کھولا اور بڑے بڑے سرخ نوٹوں کی ایک گڈی

نکال کر اس میں سے کچھ نوٹ علیحدہ کر کے انہوں نے میرے ہاتھ میں تھمانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "یہ رکھ لو عزیزہ صرف حور پری! ہم پہلی مرتبہ تمہارے گھر گئے ہیں۔ اگر قصداً آئے ہوتے اور ہمیں تمہاری موجودگی کا علم ہوتا تو تمہارے شایان شان کوئی تحفہ لاتے۔"

جب انہوں نے دیکھا کہ میرا ہاتھ نوٹوں کو گرفت نہیں لے رہا۔ تو اباجی کو مخاطب کیا۔ "بھئی تم ہی اسے سمجھاؤ کہ آداب کا تقاضا کیا ہے؟"

"یہ۔۔۔ وہ تو ٹھیک ہے حضور والا۔" اباجی نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "لیکن اتنی بڑی رقم کی کیا ضرورت ہے۔ کوئی روپیہ دھیلا عنایت فرما دیجئے۔"

مجھے خود بھی احساس تھا کہ ہر فصل پر اباجی کو جب ملا رام چھ ماہ کی اکٹھی تنخواہ دیتا تھا تب بھی ان کے پاس اتنے نوٹ نہیں ہوتے تھے۔ نواب صاحب نے نوٹ میرے پیروں کے پاس پھینک دیئے اور قدرے خفگی آمیز لہجے میں کہا۔ "اٹھاؤ۔ اٹھاؤ۔ جلدی کرو۔ شاباش۔"

پھر انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر مجھے جھکانے کے لئے ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ میرے جسم سے یکلخت وہ مخصوص شاخ گل کی سی لچک مفقود ہو گئی اور لڑکپن کا تناؤ ابھر آیا۔ تب نواب صاحب کے شہتیر نما بازو کا دباؤ بڑھ گیا اور میں جھکنے پر مجبور ہو گئی۔

"اٹھاؤ۔ اٹھاؤ بیٹے!" اباجی کے لہجے میں شکست تھی۔ میں نے نوٹ اٹھا لئے۔

"جاؤ۔ اب جلدی سے دودھ بنا لاؤ۔" نواب صاحب نے کہا اور مجھے بازو کے بوجھ سے آزاد کر دیا۔ میں بھاگ کر کمرے سے باہر آ گئی۔

"خوبصورت، چاند کا ٹکڑا، حور پری چڑیل۔" یہ وہ الفاظ تھے جو میں بچپن سے اپنے متعلق سنتی آئی تھی اور بچپن کی تمام ترنا سمجھی اور پھر لڑکپن کی معصوم سی سمجھ داری کے دور میں بھی انہیں سن کر میرے انگ انگ میں ایک عجیب سے تفاخر سے تن جاتی تھی لیکن آج نجانے کیوں ان الفاظ نے مجھے سن کر کے رکھ دیا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے تھے اور جسم سے گویا جان نکل گئی تھی۔

بچپن دنوں سے اباجی اکثر مجھے تلقین کرنے لگے تھے۔ "اب تو سیانی ہو رہی ہے۔ دوپٹہ اچھی طرح اوڑھا کر۔ یوں کود کرتے شاگی نہ چلا کر۔ ہر کسی سے چلاخ چلاخ باتیں نہ کیا کر۔" لیکن ان سب ہدایات کو میں نے کبھی وہ غور اعتنا نہ سمجھا تھا۔ صرف استانی جی کے ہاں اردو فارسی اور عربی کا درس لینے کے لئے جاتے وقت دوپٹہ صحیح طرح لیتی تھی۔

لیکن اباکی ہدایات کے بغیر ہی جب میں نواب صاحب کے لئے ہلدی والا دودھ لے کر واپس کمرے میں پہنچی تو دوپٹہ میرے سر اور سینے پر اچھی طرح لپٹا ہوا تھا۔

نواب صاحب اباجی سے باتیں کر رہے تھے۔ اباجی اب ان کے پائنتی ایک کرسی پر بیٹھ چکے تھے۔ میرے پہنچتے ہی نواب صاحب نے خاموش ہو کر گہری نظروں سے میرا سر تاپا

جانچ لیا۔ ان کی موٹی موٹی نوکیلی مونچھیں پھڑپھڑا کر رہ گئیں گویا وہ کچھ کہتے کہتے رہ گئے ہوں جیسے انہوں نے ارادہ ملتوی کر دیا ہو۔

میرے ہاتھوں میں پلی ہوئی طشتری سے گلاس اٹھا کر انہوں نے ہونٹوں سے لگایا اور ایک سانس میں خالی کر دیا۔ مونچھوں پر لگا ہوا دودھ صاف کر کے انہیں بل دے کر ایک ڈکار لے کر ۔۔۔ وہ دوبارہ لیلیٰ کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"۔۔۔ بس صبح اندھیرے ہی تم ہمارے لئے گھوڑا گاڑی کا بندوبست کر دینا۔ کچھ فاصلہ طے کر کے ہم کار کا بندوبست کر لیں گے۔ کوچوان گھوڑا گاڑی واپس لے آئے گا۔ اب تم جا کر چند گھنٹے آرام کر لو۔" پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولے۔ "اور جو باتیں میں نے سمجھائی ہیں ان کا دھیان رکھنا۔ ان پر عمل کرنا ہم نے تمہارے ہی بھلے کو یہ سب کچھ کیا ہے۔"

"آپ بالکل فکر نہ کریں حضور! یہ تو آپ کی بندہ پروری ہے کہ آپ نے ہمیں اس قابل سمجھا کہ مشوروں سے نوازیں۔" لیلیٰ نے کہا تاہم ان کے لہجے میں اب پہلے کا سا خوشامدانہ جوش و خروش نہیں رہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ بس اب جاؤ۔ میں بھی سونے کی کوشش کرتا ہوں۔" نواب صاحب نے کہا اور بستر پر لیٹ کر پائنتی رکھا ہوا کمبل سینے پر کھینچ لیا۔

میں اور لیلیٰ اپنے کمرے میں آ گئے۔ لیلیٰ نے دوسری لالٹین روشن کر کے طاق میں رکھ دی اور ہم دونوں اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے۔ میں نے نواب صاحب کے دیئے ہوئے نوٹ لیلیٰ کے تکیے کے قریب ہی رکھ دیئے تھے۔ لیکن انہوں نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا اور نہ ہی کوئی بات کی۔ میں بھی خاموش رہی۔

دھندلی روشنی میں میں نے انہیں رضائی سے سر نکالے، چت لیٹے، چھت کو گھورتے دیکھا اور کچھ دیر بعد کروٹ بدل لی۔ رفتہ رفتہ میری رگ و پے کی بے کلی ختم ہو گئی۔ جسم میں اتری ہوئی غیر مرئی برف دھیرے دھیرے پگھلتی گئی اور لہو کی حرارت آئی۔ اسی مخصوص خمار گرفتہ حرارت کی آغوش میں بالآخر مجھے نیند آ گئی۔

اگلی صبح خلاف معمول میری آنکھ دن چڑھے کھلی۔ نواب صاحب نہ جانے کب رخصت ہو چکے تھے۔ لیلیٰ گھر پر ہی تھے۔ اور ڈیوٹی پر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ روزانہ صبح کو ہمارے ہاں ایک ملازمہ اور اس کا چودہ پندرہ سال کا لڑکا رحیم آتا تھا۔ ملازمہ گھر کا کام کاج کرتی تھی۔ لیلیٰ کو ناشتہ بنا کر دیتی تھی۔ اور رحیم بھینسوں کے لئے چارہ تیار کرتا تھا۔ انہیں نہلاتا تھا۔

میں نے دیکھا کہ اس کی ماں تو گھر کے کام کاج میں مصروف تھی لیکن رحیم کہیں نہیں آیا تھا۔ بھینسوں کا چارہ بھی تیار نہیں ہوا تھا۔ جانے سے پہلے ابا نے چارہ [illegible]

چارے کے بجائے ویسے ہی کچھ تنکے اٹھا کر بھینسوں کے سامنے ڈال دیئے اور وہ بے دلی سے ان پر منہ مارنے لگیں۔ تب میں نے ابا سے پوچھا "آج رحیم نہیں آیا کیا؟"

ابا نے ٹھٹک کر گہری نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "نہیں میں نے اسے منع کر دیا ہے۔" انہوں نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں کہا۔

"کیوں ابا جی؟" میں نے صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"اب تو سیانی ہو رہی ہے عزیزہ!" انہوں نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ "اور جس گھر میں لڑکی سیانی ہو رہی ہو وہاں جوان لڑکے کا آنا جانا ٹھیک نہیں ہوتا۔"

"یہ بات آپ کو نواب صاحب نے بتائی ہے کیا؟" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ لیلیٰ نے بری طرح چونک کر پلٹ کر میری طرف دیکھا گویا کسی چھوٹے منہ سے بہت بڑی بات سن لی ہو۔ حقیقتاً مجھے خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ بلا سوچے سمجھے میرے منہ سے یہ بات کیسے نکل گئی تھی۔ ایک لمحے کے لئے تو مجھے یہی محسوس ہوا تھا گویا میرے منہ میں کسی اور کی زبان پھڑک اٹھی ہو۔

"کسی نے بھی بتائی ہو۔" ابا نے خشک لہجے میں کہا۔ "بات ہے کام کی ۔۔۔ اس لئے میں نے پلے باندھ لی ہے۔"

"اور بھینسوں کا کام کون کرے گا؟" میں نے بالوں کی چوٹی بناتے کھولتے اور پاؤں کے انگوٹھے سے کچے صحن کی مٹی کریدتے ہوئے پوچھا۔

"میں بابا بخشو کو بھیج دوں گا۔ وہی کیا کرے گا۔" ابا جی نے دروازے کی طرف قدم بڑھاتے بڑھاتے رک کر کہا۔ "اور اسی کے ساتھ خالہ کے ہاں جایا کرو گی۔ وہی تمہیں وہاں سے لے کر آیا کرے گا۔"

وہ باہر نکل گئے۔ میں نے بھی اٹھنے کے لئے چپلوں میں پاؤں پھنسائے لیکن اٹھ نہ سکی۔ نہ جانے کس احساس کے بوجھ تلے دبی بیٹھی رہی۔ میرا ذہن اب تک ایک کورا کاغذ تھا جس کی زیر تعمیر عمارت میں دھیرے دھیرے قدم جماتے جذبوں کے رنگ کبھی کبھی شاید اس کاغذ پر ابھرتے تھے۔ لیکن مجھے آج تک ان کا کچھ احساس نہیں ہوا تھا۔ سب کچھ میرے لئے محض ایک سوالیہ نشان تھا۔ لیکن آج یہی سوالیہ نشان ذہن کے کورے کاغذ پر بہت زیادہ نمایاں ہو گیا تھا۔ معصوم تجسس کی کائنات دھیرے دھیرے اتھل پتھل ہو رہی تھی۔

مجھے ابا کا بدلا بدلا سا انداز کچھ اچھا نہیں لگا تھا۔ شاید اس لئے کہ الفاظ ان کے تھے مگر ہدایات کسی اور کی۔ اس گھر میں رہتے ہوئے میرا ذہن بچپن سے کچھ ایسے سانچے میں ڈھل گیا تھا کہ اس میں کسی تیسرے فرد کی مداخلت کی گنجائش نہیں تھی۔ اگر ایک رات پہلے نواب صاحب کی ذات شریف کا نزول اس گھر میں نہ ہوا ہوتا تب شاید ابا کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ مجھے یوں اجنبی اجنبی نہ لگتے۔

جس رحیم کو اباجی نے جوان لڑکا کہا تھا مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس میں جوانوں والی کیا بات تھی۔ میرے خیال میں جوان تو کسی لمبے تڑنگے اور مونچھوں والے کوہی کو کہا جاسکتا تھا۔ رحیم بے چارہ تو ابھی لڑکا بلکہ شاید بچہ تھا۔ پتلا دبلا میانہ قامت۔ اس کی تو ابھی مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں۔ میں نے کبھی اس کے وجود پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی اور نہ ہی ہمارے درمیان کبھی زیادہ دیر تک گفتگو ہوئی تھی۔ میرا رویہ اس کے ساتھ ایک طرح سے حاکمانہ ہوتا تھا۔ بہرحال آج اباجی کی گفتگو سن کر رحیم مجھے کچھ پراسرار سی مخلوق محسوس ہوا۔ شاید اس کی شخصیت میں کوئی راز پنہاں تھا جس سے ابا خوف زدہ تھے۔

میانی ـــ جوان لڑکا ـــ یہ کچھ اور سوالیہ نشان تھے جو میرے ذہن کے کورے کاغذ پر ثبت ہوگئے تھے۔ بہرحال شب و روز کچھ ایسے اسلوب سے گزرنے لگے۔

اور پھر ایک شام ایک کار ہمارے دروازے پر آکر رکی۔

O

غیر متوقع طور پر جلا رام اندر آیا۔ اس کے پیچھے دو مزدور چند تھیلے اٹھائے ہوئے تھے۔ جلا رام نے بتایا کہ تھیلوں میں خشک میوے اور کچھ دیگر تحائف ہیں جو نواب صاحب نے بھجوائے ہیں۔ اباجی بھی کچھ متحیر نظر آرہے تھے' بہرحال انہوں نے جلا رام کو بیٹھک میں بٹھایا۔

ان دنوں میں مہمانوں کی تواضع عام طور پر دودھ اور پھلوں وغیرہ سے کی جاتی تھی۔ جب یہ چیزیں طشتری میں رکھ کر بیٹھک میں گئیں تو جلا رام ابا سے کہہ رہا تھا۔ "تم لوگ خوب کھلایا پلایا کرو' جان بنایا کرو۔ نواب صاحب نے یہ چیزیں اسی لیے بھیجی ہیں۔"

پھر اس نے اپنی کمانی دار عینک اچھی طرح ناک پر جما کر شیشوں کے اوپر سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس بچی کا تو بہت ہی خیال رکھا کرو۔ ایشور عمر دراز کرے۔ بڑی ہونہار بچی ہے۔" نہ جانے اس پر میری ہونہاری کا کب اور کیونکر انکشاف ہوا تھا کیونکہ اس سے پہلے تو اس نے کبھی میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی کبھی بات کی تھی۔

اس کے بعد کچھ معمول سا بن گیا۔ ہر مہینے دو مہینے بعد نواب صاحب کی طرف سے کچھ نہ کچھ تحائف موصول ہوتے۔ ان میں زیادہ تر بیشتر نایاب قسم کے پھل اور میوے ہوتے تھے یعنی ایسی چیزیں جو ہمارے علاقے میں مشکل ہی سے ملتی تھیں۔ ظاہر ہے یہ چیزیں گھر میں ہوتی تھیں تو اردگرد پڑوس اور جاننے والوں میں بھی بٹتی تھیں۔ ابا کی بھی باہر معاملے کے چرچے نکلی تھی اور فصلوں میں بھی زیادہ حصہ ملنے لگا تھا۔ میں محسوس کرتی کہ حالات کے اس تسلسل نے اباجی کو کچھ پریشان سا کر دیا تھا لیکن وہ اس مبہم اور بے عنوان سی پریشانی کو دبائے پھرتے تھے۔

میری عمر اب چودہ سال ہو گئی تھی۔ دیکھنے والیاں کہتی تھیں' بڑا روپ نکالا ہے لڑکی نے۔ ہم عمر لڑکیوں میں شاید ہی کسی نے مجھ سا قد پایا ہو' شاید ہی کسی کی رنگت میرے رخساروں کے گلابی رنگ سے میل کھاتی ہو' شاید ہی کسی کی زلفوں نے یوں ریشم کو مات کیا ہو۔ شادی بیاہ کی محفلوں اور مجلسوں میں کوئی عورت سر سے پاؤں تک ایک نظر ڈالتی اور ایک حسرت آمیز رشک سے کہتی۔ "جس گھر میں جائے گی' اجالا کرے گی۔"

کوئی سرد و گرم چشیدہ خاتون گزرتے گزرتے ٹھوں کی راکھ میں انگلیاں مار کر کسی مدفون چنگاری کو ہوا دیتے ہوئے کہتی۔ "کیا مزہ اور عمر ہے! لگام ڈالنے والا ابھی کوئی جوڑ کا ہو تو بات بنے ہے۔"

۔۔۔۔ اور کوئی صرف دیکھتی اور دیکھتی ہی رہ جاتی۔ کسی مرد کی نظر سے کا اتفاق شاذ و نادر ہی ہوتا تھا کیونکہ اب میرا گھر سے نکلنا تقریباً موقوف تھا۔ نکلنا ہوتا بھی تو سر سے پاؤں تک لڑکی چادر میں لپٹ کر۔ اس زمانے میں کم از کم گاؤں دیہات میں رہنے والے مردوں کی نظریں اتنی بھوکی نہیں ہوتی تھیں کہ بس چلے تو سات پردوں کو چیر کر جسم کے پار نکل جائیں۔ کسی کی نظریں تعاقب بھی کرتیں تو ہچکچاہٹ' جھجک اور بے کسی کی تہوں میں لپٹی ہوئی میلی طلب لے کر۔

پھر ایک روز عجیب حادثہ ہوا بلکہ شاید یہ حادثوں کا نقطہ آغاز تھا۔ ہمارے دروازے پر موٹر آ کر رکی اور ابا جی دروازے پر پہنچے تو بلا رام موٹر سے اتر کر ان کے ساتھ اندر آیا اور اس کے پیچھے تین ادھیاں بھی گھر میں داخل ہو گئیں۔ ان کے سروں پر بڑے بڑے تھال تھے جو گوٹے کناری والے سرخ ریشمی کپڑوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ تھال انہوں نے آنگن میں رکھ دیئے اور تھیری بلائیں لے کر ایک طرف مؤدب کھڑی ہو گئیں۔ بلا رام نے چاندی کا ایک روپیہ اور ایک ٹکا ابا جی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"یہ کیا ہے بلا رام؟" ابا جی نے ہکا بکا ہو کر پوچھا۔ "شگن کا ٹکا روپیہ ہے۔" بلا رام نے سر جھکا کر بڑی ملائمت سے جواب دیا۔ "نواب صاحب نے تمہاری لڑکی کو پسند کر لیا ہے۔ اسی چاند کی چودھویں کو وہ بارات لے کر آئیں گے۔ رسم بڑی سادگی سے ہو گی۔ ان کے ساتھ کل آٹھ دس باراتی ہوں گے۔ کوئی خاص اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں۔ ساری خوشیاں دلہن کے محل میں پہنچنے کے بعد کی جائیں گی۔ بہرحال تم اگر کوئی انتظام وغیرہ چاہو تو اس کے لیے یہ رقم رکھ لو۔"

اس نے بڑی صفائی سے نوٹوں کی ایک گڈی ابا کی واسکٹ کی جیب میں ٹھونس دی۔ اس نے سب کچھ اتنی روانی سے کہا تھا گویا کوئی لکھا لکھایا مضمون پڑھ رہا ہو۔ ابا جی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے گویا اپنے خلاف ناکردہ گناہوں کی فرد جرم سن رہے ہوں۔ پھر وہ یوں آہستگی سے آنگن میں پڑی ہوئی بڑی سی چارپائی پر گرے گویا ٹانگیں ان کے جسم تلے سے سرک گئی ہوں۔

میں باورچی خانے کے دروازے میں کھڑی تھی۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے یہ سب آخر شب کا خواب محسوس ہوا۔ پھر جانے کیوں میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔ میں نے چوکھٹ کا سہارا لینے کی کوشش کی لیکن میرا ہاتھ اس سے رگڑ کھاتا ہوا نیچے آ گیا اور پھر میں نے اپنے آپ کو چوکھٹ پر بیٹھے پایا۔ میری آنکھوں کے سامنے

زنگے تاریکی کے دائروں سے گویا لاتعداد عفریت نکل کر میری طرف رینگ رہے تھے اور ہر عفریت کا چہرہ نواب شرافت سے مشابہ تھا۔ دو برس پہلے دیکھا ہوا وہ چہرہ مجھے بھولا نہیں تھا۔

"بلا رام۔" بالآخر میں نے ابا کی ڈوبتی سی آواز سنی۔ "کیا میں اسے مذاق سمجھوں؟ یہ سب کیا ہے۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"کیا اس سے پہلے میں نے کبھی تم سے مذاق کیا ہے؟" میں نے بلا رام کی آواز سنی۔ "اب ہم چلتے ہیں۔ سمجھو منگنی کی رسم ادا ہو گئی۔ چاند کی چودھویں تاریخ یاد رکھنا۔"

میری بصارت دھیرے دھیرے لوٹ آئی۔ میں نے بلا رام اور ادھیوں کو دروازے کی طرف بڑھتے دیکھا' جہاں بہت سے بچے اکٹھے ہوئے تھے اور متجسس نظروں سے اندر جھانک رہے تھے۔ کچھ بچے دروازے کے سامنے کھڑی موٹر کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے تھے۔ بلا رام نے انہیں ڈانٹا اور وہ تتر بتر ہو گئے۔ موٹر دروازے کے سامنے سے غائب ہو گئی۔

میں چوکھٹ کا سہارا لے کر اٹھی' جسم گویا نچڑ گیا تھا۔ بمشکل تمام قدم اٹھاتی میں ابا کی طرف بڑھی' وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ابا!" میرے حلق سے ایک دلخراش چیخ نکلی اور میں ان سے جا لپٹی۔ میں کچھ کہنا چاہتی تھی مگر مجھے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ میری ہچکی بندھ گئی تھی اور آنسو گویا صرف آنکھوں سے نہیں ہر مسام سے پھوٹ رہے تھے۔ ابا کے جسم میں بھی لرزش تھی۔

"تو مت بیٹی۔" بالآخر ابا کی آواز نہ جانے کن گہرائیوں سے ابھری۔ "ایسا نہیں ہو گا۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ تو تسلی رکھ ۔۔۔ مجھے سوچنے دے ۔۔۔" وہ بولتے ہوئے مجھے تھپکنے لگے۔ مجھے کچھ حوصلہ ہوا۔ میرے آنسو تھمنے لگے۔

میں اس وقت بھی ان کے سینے سے لگی کھڑی تھی جب بستی کی عورتوں کی ایک ٹولی گھر میں داخل ہوئی۔ "ارے بھئی بڑے چھپے رستم نکلے تم دونوں! چپ چپاتے ہی بچی کی منگنی کر دی اور ہمیں کانوں کان خبر نہیں ہونے دی۔" ایک عورت نے کہا۔

"اب ایسی بھی کیا رازداری۔ ہمیں غیر سمجھتے ہو کیا۔" دوسری نے لقمہ دیا اور سب کی سب ہمارے گرد گھیرا ڈال کر کھڑی ہو گئیں۔ مجھے ان سے خوف آ رہا تھا۔ حالانکہ ان میں سے کئی وہ تھیں جنہوں نے مجھے گود کھلایا تھا۔

"ارے بھئی مانا کہ نوابوں کے ساتھ رشتہ جڑ گیا ہے مگر ابھی سے اتنی غیریت تو نہیں برتنی چاہیے تھی۔ ہم ہی تمہارے دکھ سکھ کے ساتھی ہیں۔" کرخت آواز والی ایک عورت بولی۔

پھر ایک اور عورت دوسری عورتوں کو پیچھے ہٹا کر ابا کے قریب آئی۔ "بھئی یہ تو بتاؤ یہ قلعہ کیسے منہ سے چھو گئی۔ ہم نے تو نواب صاحب کو کبھی یہاں نہیں دیکھا' ان کے قصے ہی

سے ہیں۔"

ابا جی نے مجھے آہستگی سے ایک طرف ہٹایا۔ پھر عورتوں کے حلقے کو توڑ کر دیوانوں کی طرح بیٹھک کی طرف دوڑتے چلے گئے۔ کمرے میں گھس کر انہوں نے دروازہ بند کر لیا۔ ان کے جاتے ہی کئی عورتوں نے بیک وقت مجھے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ "ارے دیکھو بچی کیسے زرد ہو رہی ہے۔ خوشی ہونے کے بجائے رو رو کر آنکھیں سجا لی ہیں۔" کسی نے کہا۔

"کنواری منگنی بیاہ کے موقع پر یہی حال ہوتا ہے۔" کسی نے ہانک لگائی۔

"ارے یہ کوڑی کیسی منگنی ہے۔ نہ ڈھولک' نہ گیت' نہ شیرینی' نہ سنگھار۔" کوئی چہک کر بولی۔ "ارے چلو لڑکیو کچھ ٹھٹھے گانے کا بندوبست کرو۔ بچی کا جی بہلاؤ۔"

آناً فاناً کہیں سے دری ڈھونڈ کر صحن میں بچھا دی گئی۔ عورتوں نے مجھے بیچ میں بٹھا لیا۔ دوپٹے سے میرا گھونگھٹ نکال دیا اور گیتوں کی لے پر بے سری آوازوں میں جلنے کیا گانے لگیں۔ پھر کسی نے چیخ کر کہا۔ "ارے بھئی ڈھولک لاؤ' یوں مزا نہیں آرہا۔"

دو تین عورتیں اٹھ کر باہر کو لپکیں۔ مجھے ان کی شکلیں دھندلی دھندلی دکھائی دے رہی تھیں اور آوازیں یوں سنائی دے رہی تھیں گویا کھنڈروں میں ہزاروں چڑیلیں جمع ہو کر چیخ پکار کر رہی ہوں۔

پھر ڈھولک آگئی۔ ہجوم کچھ اور بڑھ گیا۔ میرے قریب بیٹھی عورتوں کی کھسر پھسر جاری تھی۔ "لڑکی کے نصیب کھل گئے مگر ایک بات بڑی غلط ہے۔"

"وہ کیا؟" دوسری نے بے کلی سے پوچھا۔

"سنا ہے نواب صاحب تیس بیویوں کو تو اب تک طلاق دے چکے ہیں' دس بیویاں اب بھی محل میں موجود ہیں' کنیزیں وغیرہ اس کے علاوہ ہیں۔" عورت نے کہا۔

"ہائے اللہ۔ اتنی بیویوں کا وہ کیا کرتے ہوں گے؟" ایک حیرت بھری آواز ابھری۔

"سوال یہ نہیں ہے۔ سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ اتنی ساری بیویاں کیا کرتی ہوں گی۔" ایک عورت نے کہا اور بے ساختہ کئی قہقہے بلند ہوئے۔

"ارے بھئی یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں۔ نوابوں کے ہاں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔" قریب بیٹھی کسی عورت نے گویا بالواسطہ مجھے تسلی دی۔

پھر ڈھولک پر تھاپ پڑنے لگی اور سب عورتیں گیتوں میں شریک ہو گئیں۔ محسوس ہو رہا تھا کہ شدت سے میرے دماغ کی نسیں پھٹ جائیں گی۔ میں نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے اور قریب تھا کہ میں چیخوں کی تمام تر طاقت کے ساتھ چلا اٹھتی کہ ایک کھٹکے سے بیٹھک کا دروازہ کھلا۔

"میرے بالی یہ کیسا سحر ڈھایا رے...." گیت کا بول یک لخت سکوت میں ڈوب گیا۔ ابا لمبے لمبے ڈگ بھرتے صحن میں آگئے۔ ان کے ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ جسم کی کپکپاہٹ دور سے بھی دکھائی دے رہی تھی۔

"بند کرو یہ بکواس۔" وہ دھاڑے۔ "ابھی کوئی منگنی وگنی نہیں ہوئی' صرف پیغام آیا ہے اور تم لوگوں نے یہاں ڈھول ڈھمکے شروع کر دیئے.... دفع ہو جاؤ اپنے گھروں کو۔" غصے کی شدت سے ان کی آواز پھٹ گئی۔ انہوں نے لاٹھی ہوا میں لہرائی۔ عورتوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ سب اٹھ کر باہر کو دوڑیں۔

"توبہ.... توبہ...." ایک عورت میرے قریب سے اٹھ کر دوڑتے ہوئے چلائی۔ "ایسی بے ہودہ تقریب دیکھی نہ سنی۔" صحن میں رکھے ہوئے تھال الٹ پلٹ ہو گئے اور ڈھیروں مٹھائیاں اِدھر اُدھر بکھر گئیں۔ عورتیں وہاں سے نکل گئیں۔

ابا میرے قریب آگئے۔ "اٹھو بیٹی! تم یہ سب کچھ ذہن سے نکال دو.... بالکل نکال دو۔" انہوں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "نواب شرافت علی کی ایسی کی تیسی.... تم اٹھ کر آرام سے کھانا کھاؤ اور سو جاؤ' سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو۔ میں سب ٹھیک کر لوں گا۔ میں اپنی پھول سی بچی کو اس خبیث کی بھینٹ نہیں چڑھنے دوں گا۔ چلو شاباش اٹھو۔"

ان کے لہجے کے اعتماد نے مجھے یکلخت گویا پاتال سے نکال کر کہکشاں پر لا بٹھایا۔ میں نے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا اور باورچی خانے سے کھانا نکالا جو ملازمہ تیار کر کے رکھ گئی تھی۔ تھوڑا بہت کھانا زہر مار کر کے ہم سرِشام ہی سونے کے لیے جا لیٹے۔ اب میں الگ کمرے میں لیٹی ہوئی تھی' اس لیے مجھے نہیں معلوم کہ ابا سونے میں کامیاب ہو گئے تھے یا نہیں' بہرحال مجھے رات گئے تک نیند نہ آئی۔ ابا کی باتوں سے گو کہ کافی ڈھارس بندھ گئی تھی مگر دل جانے کیوں طرح طرح ڈوب ڈوب جاتا تھا۔

اگلی صبح منہ اندھیرے ہی ابا نے مجھے جگایا۔ دروازوں اور کھڑکیوں کی کنڈیاں وغیرہ اچھی طرح لگا کر رکھنے کی ہدایت کی اور خود نہ جانے کہاں چل دیئے۔ صرف اتنا کہہ گئے۔

"میں دیر سے لوٹوں گا۔ شاید دوپہر تک......"

دن چڑھے تک ملازمہ بھی نہ آئی اور سارا کام کاج میں نے خود ہی کر لیا۔ یوں کچھ دیر کے لیے دھیان بٹ گیا۔ بکری اب ہمارے ہاں ایک ہی تھی۔ گیارہ بجے کے قریب چرواہا آکر اسے لے جاتا تھا۔ اس بے زبان کی موجودگی سے بھی احساسِ تنہائی کچھ کم ہو جاتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد گھر کاٹنے کو دوڑ رہا تھا۔

ایک جان گسل انتظار کے بعد ابا سہ پہر ڈھلے واپس آئے۔ ان کے چہرے پر گہری تھکن اور درماندگی تھی۔ دھول سے جوتیاں اٹی ہوئی تھیں۔ آنکھوں میں ویرانی تھی۔ خلافِ معمول انہوں نے آتے ہی منہ ہاتھ نہیں دھویا۔ کھانے کو بھی منع کر دیا اور سیدھے کمرے میں جا لیٹے۔ میں ان کے پاس جا بیٹھی۔

میں پیچھے کو کھسک کر پچھلا پردہ اٹھایا۔ وہ آدمی گاڑی کے پیچھے پیچھے ہی آ رہے تھے۔ ان کی شکلیں صاف نظر نہیں آ رہی تھیں لیکن ان میں سے ایک کے ہاتھ میں بندوق اور دوسرے کے کندھے پر کلہاڑی کی جھلک ضرور دیکھ لی۔ میں گھبرا کر ابا کی طرف متوجہ ہو گئی۔

گاڑی کے ساتھ چلتے ہوئے دونوں آدمیوں میں سے ایک نے نیفے میں ہاتھ ڈال کر ایک بدہیئت سا پستول نکالا اور اسے ہاتھوں میں اچھالتے ہوئے بڑے سرسری سے لہجے میں بولا۔ "کہیں جا رہے ہو خداداد خان؟"

ابا نے کوئی جواب نہ دیا۔ انہوں نے بیلوں کی نکیل کھینچ کر جھٹکا دے کر دوڑانے کی کوشش کی لیکن دوسرے آدمی نے رسی پر ہاتھ ڈال دیا۔

"آدھی رات گئے کہیں جانا اچھا نہیں ہوتا۔" ریوالور والے نے ریوالور کا گھوڑا کھینچتے ہوئے کہا۔ ابا نے اب بھی کوئی جواب نہ دیا۔ اس شخص نے بیلوں کی رسی اتنی طاقت سے کھینچی کہ وہ بلبلا کر ایک دو قدم اٹھا کر رک گئے۔

"میں کہتا ہوں واپس گھر جاؤ۔" وہ شخص گرجا اور ابا کی طرف منہ کر کے تن کر کھڑا ہو گیا۔ ابا نے خاصے غیر محسوس طریقے سے ہاتھ پیچھے لا کر گاڑی میں چھپے ہوئے گدیلے کے نیچے سے کلہاڑی نکالی اور گاڑی پر کھڑے ہو کر اس شخص پر وار کرنے کے لیے کلہاڑی تیزی سے ہوا میں گھمایا لیکن وہ شخص اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔

"سنو خداداد۔۔۔!" وہ خوفناک لہجے میں غرایا۔ "میں آخری بار کہہ رہا ہوں کہ گھر واپس۔۔۔"

ابا نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی چھلانگ لگا دی اور ایک بار پھر کلہاڑی گھمائی۔ اس شخص نے وار خالی دیا اور اسی لمحے ایک بھیانک دھماکہ ہوا۔ میرے حلق سے گھٹی گھٹی سی چیخ نکلی۔ ابا سینہ تھام کر نشیب میں لڑھک گئے تھے۔ گولی پیچھے سے آئی تھی۔ ریوالور والے نے فائر نہیں کیا تھا۔ پیچھے سے ان کے دونوں ساتھی بھی دوڑتے ہوئے قریب آ پہنچے۔ میں وحشت سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی کہ نشیب میں ابا چاروں شانے چت پڑے تھے۔ ان کے جسم میں زندگی کی کوئی علامت نہیں رہی تھی۔

"تم بڑے جلد باز ہو۔" ریوالور والے نے بندوق بردار سے کہا۔

"میں سمجھا تھا تمہیں کلہاڑی لگ گئی ہے۔" بندوق بردار نے لاپرواہی سے کہا۔ انہوں نے ابا کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ اچانک میرا سکتہ ٹوٹا اور میں پوری قوت سے چیخنے لگی، مسلسل اور بے تکان۔۔۔ ان میں سے ایک اچھل کر گاڑی پر چڑھا۔ جس طرح عقاب فاختہ کو دبوچتا ہے، اس طرح اس نے مجھے دبوچا اور ایک ہاتھ مضبوطی سے میرے منہ پر رکھ دیا۔

"گاڑی تم نے کہاں کھڑی کی تھی؟" دوسرے نے بیل گاڑی پر چڑھتے ہوئے ساتھی سے پوچھا۔ اس کے لہجے میں ذرا بھی گھبراہٹ یا اضطراب کی جھلک نہیں تھی۔

"چوہدری کریم کے ڈیرے پر۔" دوسرے نے جواب دیا۔

"چلو جلدی کرو۔ یہ مریل بیل پتہ نہیں کتنی دیر میں وہاں تک پہنچائیں گے۔" ایک بولا۔ وہ چاروں بیل گاڑی پر چڑھ چکے تھے۔ ایک نے رسی تھامی اور بیلوں کو درشتی سے ہانکنا شروع کیا۔

میں بری طرح چیخنے لگی۔ میں کہنا چاہتی تھی۔ "ظالمو! میرے باپ کی لاش تو ساتھ لے لو۔" لیکن میرے ہونٹوں پر سے سخت بے رحم ہاتھ کا بند نہ ٹوٹ سکا۔ میں زیادہ چیخی تو ریوالور والے نے ریوالور کا بھاری دستہ میری کنپٹی پر رسید کیا اور میرے حواس کی عمارت ڈھے گئی۔ آنکھوں کے سامنے نیلے پیلے دائرے بکھرے اور پھر گہری تاریکی چھا گئی۔

جب مجھے ہوش آیا تو سب سے پہلے میری نظر ایک بہت بڑے فانوس پر پڑی جو میرے پلنگ کی سیدھ میں اونچی سی چھت میں جھول رہا تھا اور اس کے ان گنت پہلوؤں میں رنگ برنگی روشنیاں جھلمل جھلمل کر رہی تھیں۔ پھر مجھے ان بہت سی عورتوں کی موجودگی کا احساس ہوا جو میرے چاروں طرف بیٹھی تھیں۔ ان میں سے ایک میرا سر دبا رہی تھی اور کنپٹیوں پر کچھ مسل رہی تھی۔

دو عورتیں میرے تلوے اور دو عورتیں ہتھیلیاں سہلا رہی تھیں۔ دو عورتیں میرے جسم پر تیز خوشبو والے کسی سیال کی مالش کر رہی تھیں۔ مجھے اپنا وجود نہایت ہلکا محسوس ہو رہا تھا۔ ہوا میں ایک عجیب مہک رچی ہوئی تھی۔۔۔ پھر اچانک مجھے اپنی بے لباسی کا احساس ہوا۔ میں نے سمٹنے کی کوشش کی لیکن عورتوں نے مجھے جنبش نہ کرنے دی۔

"میں کہاں ہوں؟" میں شاید کچھ اور پوچھنا چاہتی تھی لیکن میرے ہونٹوں پر یہ سوال آ گیا۔ سب عورتوں نے ایک دوسری کی طرف دیکھا گویا فیصلہ کر رہی ہوں کہ کون جواب دے گی۔ وہ سب ہی جوان العمر تھیں اور خاصی حد تک خوبصورت بھی لیکن ان کے چہروں پر عجیب سا پھیکا پن تھا۔ صرف ایک عورت جو میرے پہلو میں دائیں طرف بیٹھی تھی، قدرے بڑی عمر کی تھی۔ چہرے مہرے سے سب کی سب شوخ طبع اور خوش وقت لگتی تھیں۔

"اپنی خوابگاہ میں اور کہاں۔" قدرے بڑی عمر کی عورت نے کہا۔

"میری۔۔۔ میری تو کوئی خوابگاہ نہیں۔ یہ کونسی جگہ ہے؟" میرے حلق سے کمزور سی آواز نکلی حالانکہ میں نقاہت محسوس نہیں کر رہی تھی۔

"نواب صاحب کی زنانہ محل سرا۔" اسی عورت نے ملائمت سے کہا۔ "تمہیں گھبرانے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہاں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی، ہر آرام ملے گا۔"

"مجھے میرے گھر پہنچا دو۔ میرے ابا۔" میں نے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کر رونا چاہا لیکن

تیزیں سلانے والیوں نے میرے ہاتھ نہ چھوڑے۔

"اب یہی تمہارا گھر ہے لڑکی! سب کچھ بھول جاؤ۔ چند دن میں تمہارا یہاں خوب دل لگے گا۔" عورتوں نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔

"مجھے جانے دو۔" میں چیخ اٹھی اور ساتھ ہی میں نے یک لخت اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی۔ میرے سر کے نیچے رکھے ہوئے تکیے اتنے ملائم تھے جیسے ہوا نے ریشم کا روپ دھار لیا ہو' بستر بھی ایسا ہی نرم اور گدیلا تھا۔ عورتوں سے اپنے آپ کو چھڑانے کی میری جدوجہد میں یہ سب کچھ اتھل پتھل ہو گیا۔ میرے ساتھ ساتھ ان کے چہرے پر بھی پسینے کی بوندیں ابھر آئیں۔

"بیکار میں اپنی جان ہلکان مت کر۔" بڑی عمر کی عورت نے اپنی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "یہاں آنے کے ہزار راستے ہیں مگر جانے کا کوئی راستہ نہیں۔"

ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے میرے پہلو میں بیٹھی ہوئی عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس کا نام قدسیہ ہے۔ یہ بھی کم و بیش تمہارے ہی جیسے حالات میں یہاں آئی تھی۔ اس نے بھی بڑا واویلا کیا تھا۔ بعد میں ٹھیک ہو گئی تھی۔ صرف چار مرتبہ نواب صاحب نے اسے شرف خلوت بخشا اور بس' اتنے میں اس سے دل بھر گیا تو اسے انعام کے طور پر ایک کارندے کو بخش دیا۔ وہ نکاح پڑھوا کر لے گیا۔ دس ماہ گھر میں رکھا' پھر کسی بات پر اس سے ناراض ہوا۔ صرف تین مرتبہ اونچی آواز میں طلاق' طلاق' طلاق کہا اور دھکا دے کر گھر سے باہر کیا۔ پھر خود بھی جاگیر سے باہر کہیں بھاگ گیا۔ اسے باہر کہیں اور پناہ نہ ملی' خود ہی یہیں لوٹ آئی۔"

میں نے اس عورت کی طرف دیکھا' وہ باتوں کی نسبت کم عمر تھی۔ اس کی آنکھیں لمبی اور ناک ستواں تھی۔ رخسار ڈھلے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود وہ اب بھی خوش شکل تھی۔ اس کے ہاتھ تو بہت ہی خوبصورت اور گداز تھے جن سے وہ میری مالش کر رہی تھی لیکن ان ہاتھوں میں حرارت نہیں تھی۔ میرے جسم کی حرارت بھی ان میں منتقل نہیں ہو رہی تھی۔ شاید ان میں اب حرارت جذب کرنے کی صلاحیت بھی نہیں رہی تھی۔ وہ بدستور اپنی خوبصورت لمبی پلکیں جھکائے یوں اپنے کام میں مصروف رہی گویا بات کسی اور کی ہو رہی ہو۔

"اور یہ دونوں بہنیں ہیں۔" بڑی عمر کی عورت نے میری پائینتی بیٹھی دو عورتوں کی طرف اشارہ کیا۔ "عذرا اور بشریٰ۔ ان کی ماں نے بھی یہیں عمر گزار دی تھی' اب یہ بھی گزار رہی ہیں بلکہ یوں سمجھو کہ گزار چکی ہیں اور یہ جو تمہارے سرہانے بیٹھی ہے' اس کا نام سروری ہے۔ یہ اپنی مرضی سے یہاں آئی تھی۔ پہلے بڑی بیگم کے پاس ہوتی تھی۔

لیف ہولڈ بالی کا گلاس دیتے یہاں نواب صاحب کے کمرہ خاص میں آئی' پھر واپس نہیں جا سکی۔ باقی رہی میں ۔۔۔ تو میں ذرا مختلف حالات سے ہوتی ہوئی یہاں آئی تھی۔ مجھے میرے سوتیلے باپ نے چند روپوں کے عوض بیچ دیا تھا۔ میرا نام نورجہاں ہے۔ تمہیں معلوم ہے ایک نورجہاں ملکہ بھی ہوئی تھی۔"

"تم سب کون ہو؟" میں نے دہشت زدہ ہو کر پوچھا۔

"کنیزیں۔" اس نے سادگی سے جواب دیا۔

"اور بیگمات کہاں ہیں ۔۔۔؟" میں نے پوچھا۔

"چار تو اسی محل کے مختلف حصوں میں رہتی ہیں۔ بڑی بیگم قریب ہی علیحدہ حویلی میں رہتی ہیں' باقیوں کا پتہ نہیں۔ بہت عرصہ ہو گیا ہے یہاں سے باہر گئے۔" نورجہاں نے جواب دیا۔ "تمہارے لیے بھی محل کا یہ علیحدہ حصہ مخصوص کیا گیا ہے۔"

احساس بے بسی سے میری آواز گھٹ کر رہ گئی۔ میں نے کچھ بولنا چاہا مگر نہ بول سکی۔ آنکھوں سے آنسو امڈ کر رخساروں پر ڈھلکنے سے پہلے کنپٹیوں پر سے ہوتے ہوئے تکیے میں جذب ہو گئے۔ نورجہاں نے ایک ملائم اور دبیز رومال سے میری آنکھیں پونچھیں اور جمائی مسہری سے اترتے ہوئے بولی۔ "اب اٹھ کر غسل کر لو اور لباس تبدیل کرو۔ طبیعت سنبھل جائے گی۔"

میں اٹھ بیٹھی۔ اپنے سراپا پر نظر پڑی تو مجھے اپنے آپ سے بھی حجاب آگیا۔ عورتوں میں سے کسی نے میرا ہاتھ تھاما' کسی نے کمر میں ہاتھ ڈالا۔ میں اپنے پیروں پر چل رہی تھی لیکن انہوں نے جیسے محتاط انداز میں میرے گرد گھیرا ڈال رکھا تھا۔ طویل و عریض کمرے کے وسط میں ریشمی پردے جھول رہے تھے۔ انہیں ایک طرف کو سمیٹ کر دوسری طرف لے جایا گیا۔

سامنے دیوار میں دروازہ تھا۔ دائیں طرف دیوار کے ساتھ سیاہ لکڑی کی ایک عظیم الشان سنگھار میز لگی ہوئی تھی جس کا آئینہ دیوار کے تقریباً اس پورے حصے پر پھیلا ہوا تھا جو پہلے کی حد فاصل سے نیچے تھا اور یہ اتنا بڑا آئینہ بالکل بے جوڑ تھا۔ سنگھار کے سامان سے میز بھری پڑی تھی۔

نورجہاں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ غسل خانہ بھی طویل و عریض تھا' کمرے سے کچھ ہی کم تھا۔ فرش اور دیواریں چمکدار ٹائلوں سے مزین تھیں۔ سامنے کی دیوار پر اونچائی پر ٹنکی لگی ہوئی تھی جس کے نچلے حصے میں ٹونٹیاں اور فوارے نصب تھے۔ دیوار کے سامنے ہی سفید پتھر کی سیڑھیاں نیچی سے وہاں تک جا رہی تھیں۔ ایک طرف لمبی سی کارنس پر رنگ برنگے ولایتی صابن رکھے ہوئے تھے۔ کھونٹیوں پر چھوٹے بڑے سفید براق تولیے لٹکے تھے۔

نورجہاں اور ایک دوسری عورت جس کا نام اس نے سہودی بتایا تھا' میرے ساتھ ہی اندر آگئیں۔ میں نے انھیں باہر جانے کو کہا تو نورجہاں بولی۔

"نہانے سے کیا شرم ہے۔ ایک دفعہ نہانے کا سلیقہ سیکھ لو' پھر یہ کام خود ہی کر لیا کرنا۔"

.....اور جس طرح انھوں نے مجھے نہلایا' اس طرح مجھے نہانے کا واقعی سلیقہ نہیں تھا۔ پانی نیم گرم اور خوشبودار تھا۔ اس سے گلاب کی مہک میرے جسم میں بس گئی۔ پھر وہ مجھے غسل خانے کے دوسرے حصے میں لائیں جہاں دیوار کے ساتھ بنے ہوئے خانوں میں چند ملبوسات تہہ کیے رکھے تھے۔ انھوں نے میرے لیے سرخ سرخ زرتار جمپر اور ریشمی غرارہ منتخب کیا۔ یہ لباس میرے جسم پر یوں پورا رہا جیسے میرے لیے ہی سیا گیا تھا۔ پھر انھوں نے مجھے باہر لا کر سنگھار میز کے سامنے بٹھا دیا۔ نورجہاں دروازے پر گئی اور پٹ کھول کر باہر جھانکا' پھر نجانے کس سے کہا۔ "مشاطہ کو بھیج دو۔"

کچھ دیر بعد ادھیڑ عمر کی ایک چوڑی چکلی عورت اندر آئی جس نے اپنی مشاطگی کے تمام ہنر اپنے اوپر بھی جی بھر کے آزما رکھے تھے۔ نورجہاں سنگھار میز کے قریب کھڑی رہی' باقی کنیزیں باہر چلی گئیں۔ مشاطہ نے ایک لفظ منہ سے نکالے بغیر مشاقی انداز میں میرا سنگھار شروع کر دیا۔

آج تک مجھے دلہن بنی ہوئی ہر لڑکی خوبصورت لگی تھی لیکن مشاطہ کی تقریباً پون گھنٹے کی مصروفیت کے بعد جب میں نے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا تو خود ستائشی سے قطع نظر آج تک دیکھی ہوئی تمام دلہنیں اپنے سامنے ہیچ نظر آئیں۔ اپنے عکس پر مجھے اعتبار نہ آیا۔ کیا واقعی یہ میں تھی؟

"چشم بددور۔" نورجہاں نے بلائیں لیتے ہوئے کہا۔ "ہماری آنکھیں چکاچوند ہو رہی ہیں' نواب صاحب کا تو نجانے کیا حال ہوگا۔ اس محل میں چاند تو بڑے اترے لیکن آفتاب آج اترا ہے۔"

میرے کانوں میں اپنے گاؤں کی کسی عورت کے الفاظ گونج اٹھے۔ "جس گھر میں جائے گی اجالا کر دے گی۔" مگر یہ گھر تو نہیں تھا جہاں قسمت نے مجھے پہنچا دیا تھا۔ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ حسن و نسوانیت کا یہ بلند مقام میرا مقدر ہوگا۔ میں نے تو ایک چھوٹے سے گھر کے خواب دیکھے تھے جہاں میرا راج ہوگا۔ ایک محنت کرنے والے کے سپنے دیکھے تھے جس کی میں عزت ہوتی۔ جو میرا' صرف میرا ہوگا۔ جس کے دم سے میری ہستی سلامت رہتی۔ کیا میرا حسین ہونا اتنا ہی بڑا جرم تھا کہ باپ اپنی زندگی دے کر مجھے سزا سے نہ بچا سکا.....؟

میرا معصوم ذہن نجانے کیا کیا سوچتا رہا اور شل ہو گیا۔ مشاطہ کب کی جا چکی تھی۔

بیٹا اٹھ کھڑی ہوئی۔ نورجہاں بازو سے تھام کر مجھے مسہری تک لائی اور گاؤ تکیوں کے سہارے بٹھاتی ہوئی بولی۔ "اب تم یونہی بنی سنوری رہا کرو۔ نواب صاحب کی آمد و رفت اب ادھر ہی رہے گی۔" پھر وہ کمرے پر الوداعی نظر ڈالتے ہوئے بولی۔ "اب میں جاتی ہوں' کسی چیز کی ضرورت ہو تو مسہری کے قریب یہ لٹکی ہوئی ڈوری کھینچ دینا' خادم آجائے گی۔ جو کہنا ہو تو اس سے کہہ دینا۔ کھانا وغیرہ یہیں آجائے گا۔ اور دیکھو' ابھی چند دن تک باہر نکل کر ادھر ادھر جانے کی کوشش نہ کرنا' خواہ مخواہ الجھن میں پڑو گی۔" وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی اور رخصت ہو گئی۔

اس کے قدموں کی آواز معدوم ہوتے ہی میں مسہری سے اتر کر کھڑکی کی طرف بڑھی جس پر باریک پردے پڑے ہوئے تھے اور ان میں سے معمولی سی روشنی چھن چھن کر اندر آ رہی تھی۔ میں نے جب کھڑکی سے پردے ہٹائے لیکن یہ دیکھ کر دل بجھ گیا کہ کھڑکی میں جالیاں لگی ہوئی تھیں۔ باہر سرسبز گھاس کا فرش' پھلدار پھولوں کی کیاریاں اور ایک بڑے حوض کے درمیان فوارہ چلتا نظر آ رہا تھا۔ باغیچے میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ میں کم از کم چھ سات گھنٹے بے ہوش رہی تھی۔

میں کھڑکی سے ہٹی تو دیوار کے ساتھ لگی ہوئی میز پر نظر پڑی۔ اس میز پر طشتریوں میں مختلف پھل سجے ہوئے تھے۔ مجھے بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے ایک سرخ سیب اٹھا لیا۔ چھری قریب ہی رکھی تھی لیکن میں سیب کو کاٹے بغیر کھانے لگی۔ آدھے سے زیادہ سیب کھا کر باقی میں نے کھڑکی کے راستے باغ میں پھینکا اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔

دروازہ ایک چھوٹے ہال میں کھلتا تھا جو بالکل خالی تھا۔ اس میں صرف قالین بچھا ہوا تھا۔ اس کے دونوں سروں پر ایک ایک دروازہ تھا۔ میں بائیں طرف والے دروازے پر پہنچی اور اس کا لٹو گھما کر اسے کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ میری زور آزمائی سے تھوڑی سی آواز پیدا ہوئی اور فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔ میں باہر قدم رکھنے کو تھی کہ کسی نے بازو سے رستہ روک لیا۔ میں نے گردن نکال کر دیکھا' باہر ایک ادھیڑ عمر مستعد کھڑا تھا۔ پہلی نظر میں تو مجھے اس پر عورت کا گمان گزرا تھا کیونکہ اس کی داڑھی مونچھیں چٹ تھیں اور وہ عورتوں جیسی کھلی گھیردار قمیض اور سبز چوڑی دار پاجامہ پہنے ہوئے تھا۔ کانوں میں بالیاں تھیں' کمر میں پٹکا بندھا ہوا تھا جس کے ساتھ چھوٹی سی نیام میں ایک خنجر جھول رہا تھا۔

"براہ کرم باہر تشریف نہ لائیں۔" اس نے مودبانہ لہجے میں کہا۔

"کیوں؟" میں نے حتی الامکان بارعب آواز میں پوچھا۔

"نواب صاحب کا حکم ہے۔" اس نے سر جھکا کر جواب دیا اور دروازہ بند کرنے لگا۔

مجھے پیچھے ہٹنا پڑا۔ میں نے اب دوسرے دروازے کا رخ کیا۔ یہاں بھی میرا سامنا اسی قسم کے ایک نوجوان سے ہوا۔ اس کا لباس بھی ویسا ہی تھا البتہ جسمانی لحاظ سے یہ اچھا خاصا تنومند تھا۔

میں کمرے میں لوٹ آئی اور پلنگ پر ڈھیر ہو گئی۔ پھر میری آنکھوں میں ذلت کا سیلاب امڈ آیا اور بے اختیار میرے آنسو بہنے لگے۔ روتے روتے میری ہچکی بندھ گئی لیکن بلند و بالا سنگلاخ دیواروں والے اس مقبرے میں میری سسکیاں سننے والا اور میرے زخم دل پر پھایا رکھنے والا کوئی نہ تھا۔ روتے روتے نجانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ کسی نے میرا کندھا ہلایا تھا جس سے میری آنکھ کھلی۔ میں کروٹ لے کر سیدھی ہوئی تو دیکھا نورجہاں تھی۔

"ارے تو نے تو رو رو کر سارا کاجل خراب کر لیا ہے۔" وہ بولی۔

"بھاڑ میں گیا تمہارا کاجل۔ زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں چلا اٹھی۔

اس نے گویا میری بات سنی ہی نہیں۔ ایک رومال کا کونہ گیلا کر کے لائی اور میرے چہرے پونچھ دیئے۔ "کھانا کھا لو۔" اس نے ملائمت سے کہا اور میز کی طرف اشارہ کیا۔ میں مضمحل انداز میں اٹھ بیٹھی۔ میز پر کئی قسم کے کھانے رکھے ہوئے تھے۔ "اور کسی خاص چیز کی ضرورت ہو تو بتا دینا۔"

میں نے ترحمی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے خاموشی سے گردن جھکا لی۔ چند لمحے خاموشی رہی' دفعتاً" میں نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "تم کسی طرح مجھے یہاں سے نہیں نکال سکتیں؟"

اس نے سر اٹھا کر سپاٹ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "میں نے کہا تھا کہ یہاں آنے کے تو ہزاروں راستے ہیں' جانے کا کوئی راستہ نہیں۔" پھر ایک لمحے خاموش رہ کر بولی۔ "ایک مرتبہ ایک کنیز نے ایک لڑکی کو فرار ہونے میں مدد دی تھی۔" "پھر" میں نے بے کلی سے پوچھا۔

"اس کے سارے ناخن زنبور سے کھینچ لیے گئے تھے۔ جسموں سے کھال ادھیڑ دی گئی تھی۔ پھر اس کے کمرے کے دروازے پر موجوں کی قطار لگا دی گئی تھی۔ وہ نوجوان تھی' پھر بھی یہ اذیتیں برداشت نہ کر سکی۔ کچھ دنوں بعد طرح تڑپ کر مر گئی۔ میری تو اب اتنی عمر بھی نہیں رہی۔"

یہ سب کچھ اس نے سپاٹ اور ہر جذبے سے عاری لہجے میں کہا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں دھواں ہی دھواں پھیل گیا تھا۔ میں نے جھرجھری لی تو وہ بولی۔ "اور سب سے تکلیف دہ بات تو یہ ہے کہ جس لڑکی کو اس نے بھگایا تھا' اسے کچھ گھنٹے سے بھی کم وقت میں ڈھونڈ کر محل میں حاضر کر دیا گیا تھا۔ نواب صاحب کے محافظوں کے پاس شکاری کتے ہیں اور خود محافظوں کی ناکیں ان کتوں سے بھی زیادہ تیز ہیں۔ جوان لڑکی کی خوشبو تو

انہیں دور ہی سے آجاتی ہے۔"

اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور قدرے بلند آواز میں بولی۔ "چلو کھانا کھا لو۔"

میں نے مشکل چند لقمے زہر مار کیے اور واپس مسہری پر آکر لیٹ گئی۔ میرا اب یہ عالم تھا کہ ہاتھ پاؤں ہلانے تک کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ میرے حواس شل ہو چکے تھے۔ کچھ دیر بعد دو کنیزیں آئیں اور برتن طشتریوں میں رکھ کر لے گئیں۔ نورجہاں بھی ان کے ساتھ چلی گئی۔

مجھے وقت کا احساس نہیں رہا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر میں تاریک خلاؤں میں معلق رہی۔ جب میں نے ہاتھ پاؤں ہلانے اور سوئی ہوئی حسیات کو جگانے کی کوشش کی تو احساس ہوا کہ کمرے میں تاریکی پھیل رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر بتی جلانے کا ارادہ کیا مگر دیر تک نہ اٹھ سکی۔ اندھیرا اور گہرا ہو گیا۔ نورجہاں ایک بار پھر کمرے میں آئی۔ وہ کچھ عجلت میں تھی۔ اس نے بتیاں روشن کیں اور کمرہ جگمگا اٹھا۔

"نواب صاحب تشریف لا رہے ہیں۔" اس نے اعلان کیا۔

میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ "ابھی تمھیں تمھارے نواب صاحب کی۔" میں یک لخت پھٹ پڑی۔

اس نے متوحش نظروں سے میری طرف دیکھا اور تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ منٹ گزر گئے۔ بالآخر دروازہ کھلا اور پھر میں نے اس عفریت کو دروازہ پر کھڑے دیکھا۔ میری رگوں میں دوڑتا لہو نفرت کا لاوا بن گیا۔ ان کی رنگت پہلے سے زیادہ تاریک، پہلے سے زیادہ بھاری اور شکل پہلے سے زیادہ منحوس نظر آ رہی تھی۔ چہرے پر سرخ آنکھیں یوں دکھائی دے رہی تھیں جیسے توے پر دو انگارے پڑے ہوں۔ وہ آنکھیں ایک ٹک گھور رہی تھیں، جھپکنا بھول گئی تھیں۔ پھر دھیرے دھیرے ان کے بھدے ہونٹوں پر مکروہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"ہم نے ذہن میں نقشہ باندھا تھا کہ اس عمر میں تم سے کیا روپ نکلا ہوگا۔" انھوں نے وہیں کھڑے کھڑے بھاری آواز سے میرے پردۂ سماعت کو چھیدتے ہوئے کہا۔ "لیکن تم نے تو ہمارے اندازوں کو مات کر دیا ہے۔ ماشاء اللہ، ماشاء اللہ۔"

وہ ہاتھی کی طرح تھل تھل کرتے آئے اور مسہری کی پٹی پر بیٹھ گئے۔ میں اپنی جگہ اور سمٹ کر بیٹھ گئی۔

"تمھیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی [illegible]؟"

"میرے ابا کو قتل کروانے کے بعد آپ پوچھ رہے ہیں کہ مجھے کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔" میں نے جلتی آنکھوں سے انھیں گھورتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا۔

"نہیں! ہم نے کوئی ایسا حکم نہیں دیا تھا۔" انھوں نے تیزی سے اپنے [illegible] ہلائے۔ "وہ ایک حادثہ تھا۔ تمھارے ابا کی بیوقوفی کا نتیجہ۔ بہرحال اب تم سب بھول جاؤ۔ ہم تمھاری ہر تکلیف کی تلافی کر دیں گے۔ تمھیں سونے میں تول دیں گے۔"

انھوں نے بڑے محبت بھرے انداز میں میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے ان کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ان کی تنی ہوئی مونچھوں تلے سے مکروہ مسکراہٹ یک لخت غائب ہو گئی۔ ایک لمحے کے لیے انھوں نے سخت نظروں سے مجھے گھورا۔ میں بھی ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتی رہی۔

دھیرے دھیرے ان کی مسکراہٹ لوٹ آئی اور وہ کچھ آگے کھسکتے ہوئے بولے۔ "اس ناراضگی اور اکڑفوں سے فائدہ؟"

"آپ تو مجھ سے شادی کر رہے تھے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

"اوہ۔" ان کے ہونٹ کھل گئے۔ "کمسن مگر چالاک ہو۔ شادی سے بھلا کیا فرق پڑتا ہے۔ قبولیت تو یہاں ہونی چاہیے۔" انھوں نے دل پر انگلی رکھی۔ "جن سے شادی کر رکھی ہے، ان کے پاس جانے کو جی نہیں چاہتا۔ بہرحال تمھیں اتنی ہی فکر ہے تو شادی بھی کر لیں گے، یہ کونسا مشکل کام ہے۔" انھوں نے بند گلے کے کوٹ کے اوپری بٹن کھول کر نہایت بے تکلفی سے دونوں ہاتھ میری طرف بڑھائے۔

میری تمام تر نفرت اور کراہت گویا اب ایک نقطے پر مرتکز ہو چکی تھی جس نے مجھے خوف سے بے نیاز کر دیا تھا۔ میں نے پوری طاقت سے نواب صاحب کے منہ پر گھونسہ رسید کیا۔ وہ گوشت کا پہاڑ اپنی جگہ سے ہلا تو نہیں البتہ گردن جھٹکے سے پیچھے کو جھک گئی۔ جب گردن سیدھی ہوئی تو میں نے دیکھا کہ نواب صاحب کا نچلا ہونٹ درمیان سے پھٹ گیا تھا اور خون کی ایک پتلی سی لکیر ٹھوڑی پر پھسل آئی تھی۔

لڑکی۔" وہ دھاڑے اور ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ٹھوڑی پر انگلی پھیر کر انھوں نے ایک قطرہ خون کی سرخی دیکھی اور اس انگلی سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے غرائے۔ "یہ خون تمھیں اپنی زبان سے چاٹنا پڑے گا، کمینی۔"

انھوں نے مجھے تھپڑ رسید کرنے کے لیے ہاتھ گھمایا لیکن میں پھرتی سے ہٹی اور مسہری سے اتر گئی۔ وہ میرے پیچھے دوڑے، ہم مسہری کے گرد چکر کاٹنے لگے۔ میں نے بری طرح چیخنا شروع کر دیا۔ تب نواب صاحب بڑے اطمینان سے مسہری پر یوں بیٹھ گئے اور تکیے کہنیوں کے نیچے کھینچ کر یوں دیکھنے لگے گویا کوئی دلچسپ تماشا ہو رہا ہو۔

"چیخو، خوب چیخو۔ کوئی نہیں آئے گا۔" انھوں نے پھولی سانسوں کے درمیان کہا۔

میں دروازے کی طرف دوڑی اور ایک موہوم سی امید کے ساتھ اسے کھولنے کی کوشش کی۔ وہ باہر سے بند تھا۔ دروازے سے ٹیک لگا کر میں نے بے بسی سے چاروں طرف دیکھا اور پہلی مرتبہ مجھے اس پنچھی کے محسوسات کا اندازہ ہوا جسے شکاری جال پھینک کر پکڑتے ہیں۔ چند لمحے خاموشی رہی۔ نواب صاحب وہیں بیٹھے لاتعلق نظروں سے مجھے دیکھتے رہے، پھر انھوں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور اٹھ کر دونوں بازو پھیلا کر میری طرف بڑھے۔ میں نے دیوار کے ساتھ کھسکنا شروع کر دیا۔ کونے میں پہنچ کر میں گر گئی۔ نواب صاحب نے جھپٹ کر مجھے اٹھایا اور مسہری پر لا پٹخا۔

"ہم نے جنگلی جنگلی منہ زور گھوڑیوں کے گھٹنے ٹکوا دیے ہیں، تم کیا چیز ہو منحی بلبل!" انھوں نے بڑے فخر سے کہا لیکن آدھے منٹ کی کشمکش اور ہاتھا پائی کے بعد وہ تھکے ہوئے

کتے کی طرح ہانپنے لگے۔ یہ مجھے موقع ملا اور میں نے دونوں پاؤں جوڑ کر ان کے پوری طاقت سے ضرب لگائی' وہ مسہری پر چت ہو گئے۔

میں اسی لمحے میرا ہاتھ قریب ہی میز پر رکھی ہوئی پھلوں کی ایک طشتری سے ٹکرایا۔ طشتری الٹی تو مجھے اپنے ہاتھ پر کسی پتلی سی ٹھوس چیز کے لمس کا احساس ہوا۔ ایک ا[illegible] سے میرا دل اچھل کر گویا حلق میں آ گیا۔ یہ پھل کاٹنے والی چھری تھی۔

نواب صاحب اٹھ کر ایک بار پھر مجھ پر جھپٹے تو میں نے اپنی بچی کھچی توانائی مجتمع کر کے چھری سے ان کے پہلو پر وار کیا لیکن میری یہ کوشش ناکام رہی۔

نواب صاحب کا کوٹ نہایت موٹے کپڑے کا تھا اور چھری کا پھل دھاردار نہیں تھا' [illegible] سے کھل تھا۔ تاہم نواب صاحب کو اتنی تکلیف ضرور پہنچی کہ ان کے حلق سے ایک کراہ نکل گئی۔ ذرا پیچھے ہٹ کر انہوں نے میری کلائی پر ہاتھ ڈالا اور جھنجھوڑنے کے انداز میں اسے [illegible] دیا۔ چھری میرے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گری۔ میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ جب تک میرے دم میں دم ہے' شکست نہیں مانوں گی۔ مزید ایک آدھ منٹ کی کشمکش [illegible] نواب صاحب بے دم ہو گئے۔

"تو تم یوں نہیں مانو گی۔" انہوں نے اچانک مجھے چھوڑ دیا اور قریب ہی دیوار کے ساتھ لگی ہوئی ڈوری کو جھٹکا دیا۔ میں نے مسہری سے اترنے کی کوشش کی تو انہوں نے مجھے بالوں سے پکڑ لیا جو اب بری طرح بکھر چکے تھے۔ چند لمحے بعد دروازے پر دستک [illegible]

"سرداراں کو بھیج دو۔" نواب صاحب نے ہانپتے ہوئے یہ آواز بلند کہا۔ میری جد[illegible] اب بھی جاری تھی۔ چند لمحے بعد بڑی آہستگی سے دروازہ کھلا اور کوئی اندر آیا [illegible] اس کے عقب میں بند ہو گیا۔ نواب صاحب نے اب خود ہی مجھے فرش پر دھکیل [illegible] قدرے تھکے تھکے انداز میں سر اٹھا کر میں نے دروازے کی طرف دیکھا اور میرے لرز[illegible] جسم میں ایک نئے خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ ایسا خوف مجھے نواب صاحب کو دیکھ کر بھی محسوس نہیں ہوا تھا۔

آنے والی تھی تو عورت لیکن میں تصور تک نہیں کر سکتی تھی کہ کوئی عورت ایسی بھی ہو سکتی ہے۔ اس کا قد کم از کم چھ فٹ تھا۔ زیادہ فربہ جسم نہیں تھی مگر اس کا [illegible] مردوں کی طرح چوڑا چکلا تھا۔ رنگت گہری سانولی اور رخساروں کی ہڈیاں بہت ابھری تھیں۔ پتلے پتلے سفاک ہونٹ یوں سختی سے ایک دوسرے پر جمے ہوئے تھے کہ دہانے کی جگہ محض ایک لکیر سی نظر آ رہی تھی۔

اس کی عمر کا اندازہ لگانا مشکل تھا' تاہم بال سیاہ ہی تھے جنہیں اس نے سختی سے پیچھے کھینچ کر سر کے بیچ میں جوڑا بنا رکھا تھا کہ اس کی پتلی پتلی بھنویں کمان ہو کر رہ گئی تھیں۔ وہ کسی سیاہ کھردرے کپڑے کا مردوں جیسا کرتا پاجامہ پہنے ہوئے تھی۔ آستینیں چڑ[illegible]

ہوئی تھیں اور اس کی چوڑی کلائیوں پر بال نظر آ رہے تھے۔ اس کے سراپا میں خوفناک ترین چیز اس کی آنکھیں تھیں۔ میرے جسم میں دوڑنے والی سرد سی لہر کا باعث یہ آنکھیں ہی تھیں۔ ان میں ایک عجیب سی پیاس تھی۔ خون کی پیاس سے بھی زیادہ خوفناک اور یہ آنکھیں شاید جھپکنا تو جانتی ہی نہیں تھیں۔

"سرداراں!" میرے عقب سے نواب صاحب کی آواز سنائی دی۔ "دو دن بعد ایک نئی چیز آئی ہے۔"

"ہاں... تو یہ ہے!" عورت کے پتلے پتلے ہونٹوں میں جنبش ہوئی اور الفاظ ایک سرگوشی کی طرح برآمد ہوئے۔ اس کی نظریں بدستور مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر "شڑاپ" کی ایک زوردار آواز سنائی دی اور تب میں نے دیکھا کہ عورت کے ہاتھ میں ہنٹر تھا۔ بمشکل تمام میں نے اپنی لرزتی ٹانگوں پر اپنے جسم کا بوجھ اٹھایا اور کھڑی ہو گئی۔

[illegible] مجھے خیال آیا کہ اگر میں دوڑ کر غسل خانے تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤں تو اندر گھس کر کنڈی بند کر سکتی ہوں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس اقدام سے مجھے کیا فائدہ پہنچے گا لیکن میرے ذہن میں ایک ہی صدا گونج رہی تھی۔ مزاحمت' مزاحمت!

ابھی میں غسل خانے کی طرف دوڑنے بھی نہ پائی تھی کہ شڑاپ کی آواز کے ساتھ ہنٹر میری کمر میں لپٹا اور اس سے پہلے کہ اس کا گھیرا کھل پاتا' سرداراں نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے ایک جھٹکے سے یوں مجھے اپنی طرف کھینچ لیا جیسے بنسی کو جھٹکا دے کر کانٹے میں پھنسی ہوئی مچھلی کو کھینچا جاتا ہے۔

میں سیدھی اس کے سینے سے جا ٹکرائی لیکن اس نے میرا گریبان پکڑ کر مجھے ذرا سے چند انچ کے فاصلے پر روک لیا۔ ہنٹر کو چھوڑ کر اس نے میرے گال پر زناٹے کا تھپڑ رسید کیا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ سرداراں کا ہاتھ گویا لوہے کا ایک [illegible] تھا۔ پھر اس نے گریبان کو نہایت سفاکانہ جھٹکا دیا اور میرا جمپر نیچے تک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔

سرداراں نے گھٹنے سے میرے پیٹ پر ضرب لگائی اور جونہی میں [illegible] آگے کو جھکی' اس کی کہنی میری گدی پر پڑی۔ اس نے بالوں سے پکڑ کر مجھے اٹھایا اور دور پھینک دیا۔ شڑاپ کی آواز ایک بار پھر گونجی۔ ہنٹر شاید میرے ہی جسم پر پڑا تھا مگر میری حسیات اب جواب دے چکی تھیں۔ اچھا ہی تھا کہ ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔ اب یہی ایک گوشہ عافیت تھا میرے لیے۔

مجھے نہیں معلوم کہ بے خبری کا یہ وقفہ کتنا طویل تھا۔ جب آنکھ کھلی تو جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ جہاں تک ٹٹولا گئی' میں نے اپنے آپ کو خراش خراش پایا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میں غلاظت کی ایک دلدل سے نکلی ہوں جس میں ہزاروں سانپ' بچھوؤں نے

مجھے ڈسا ہے اور ان گنت جونکوں نے میرا لہو چوسا ہے۔

نورجہاں اور سوری میری مسہری پر دائیں' بائیں موجود تھیں اور ایک بار پھر خوشبودار پتے سیال سے میری مالش کر رہی تھیں۔ میں نے یکے بعد دیگرے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ دونوں نے نظریں جھکا لیں اور اپنی مصروفیت میں مصروف رہیں۔ میرے اندر ایک بے نام سناٹا چھا چکا تھا۔ کچھ کہنے' سننے یا جاننے کی خواہش مر چکی تھی بلکہ احساسات میں خود بھی مر چکی تھیں۔ آہستگی سے میں نے کروٹ لے لی۔ بستر کی چادر بدلی جا چکی تھی۔ میں نے ایک بازو پھیلا کر چہرہ چھپا لیا اور آنکھیں موند لیں۔ میرے حلق سے سسکی نہ نکلی' جسم میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔ بس خاموشی سے آنکھوں سے آنسو بہہ کر بالوں میں جذب ہونے لگے' حتیٰ کہ میرے رخسار کے نیچے تکیہ بھیگ گیا۔ شاید میرا وجود ہی بن گیا تھا۔ تمسخر اور شکست کا آنسو!

دونوں عورتیں خاموشی سے میری تیمارداری میں مصروف رہیں۔ وہ پنکھے سے پنکھیاں جھول رہی تھیں۔ نہ جانے کتنی دیر بعد میں نے نورجہاں کی آواز سنی۔ "حضور لو۔" غسل میں خود ہی کرنا چاہ رہی تھی' ان دونوں کا سہارا لے کر اٹھ بیٹھی۔ غسل خانے تک چلنے میں بھی مجھے ان کے سہارے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

غسل کرنے اور نئے کپڑے پہننے کے بعد تن کی درماندگی تو دور ہو گئی' من کا عالم ویسا کا ویسا رہا۔ ایک کنیز کھانا لے کر آئی تھی۔ نورجہاں نے تقریباً زبردستی چند لقمے میرے حلق میں ٹھونسے' نہایت میٹھا اور گاڑھا سا کوئی شربت مجھے پلایا اور آرام کرنے کی تلقین کر کے چلی گئی۔

تیسرے دن پامال ذہن پر اپنی فتح کا جھنڈا گاڑنے نواب صاحب پھر آ گئے۔ انہیں تو اپنا مقصد معلوم ہو گیا تھا۔ اس لیے اس کی کوکھ سے کوئی زلزلہ نہ پھوٹا۔ نواب صاحب جب مزاحمت کے کوئی آثار نہ دیکھے تو بے حس دھرتی پر ان کے بڑھتے قدم کچھ تیز ہو گئے۔ مفتوح کی لاش پر فتح کا جشن رات بھر جاری رہا۔

اس کے بعد زندگی اسی ڈھب پر چل نکلی۔ غلاظتوں کی دلدل میں ہاتھ پاؤں مارنے کی بھی سکت نہ رہی۔ نواب صاحب پہلے پہلے تو ہر دوسرے تیسرے دن آ جاتے تھے۔ پھر یہ وقفہ طویل ہوتا گیا۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ میں نے پورے ایک مہینے بعد ان کی شکل دیکھی۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ غلاظت کی دلدل میں میں کتنی گہرائی تک جا چکی تھی لیکن دل میں نفرت کی چنگاری اب بھی روشن تھی۔ اس شخص سے مجھے آج بھی روز اول ہی جیسی نفرت تھی لیکن یہ ایک مجبور نفرت تھی جسے اپنے ردعمل کے اظہار کا موقع نہیں ملتا جو اندر ہی اندر بس کھولتی رہتی ہے۔ انسان کے اعصاب کو ریزہ ریزہ کرتی رہتی ہے مگر کوئی راستہ

نہیں بھولی۔

تقریباً پانچ ماہ بعد میں نے آئینے میں بغور اپنی شکل دیکھی۔ میری آنکھوں کے گرد حلقے نمودار ہو چکے تھے۔ سرخ و سفید رنگت پیلاہٹ میں بدل چکی تھی اور ہاتھ پاؤں ہر وقت مرے مرے رہتے تھے حالانکہ اونچی اونچی دیواروں والے اس شاہانہ قید خانے میں میرے لیے آسائشوں اور خدمت گاروں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ میرے لیے انواع و اقسام کے کھانے پکتے تھے اور میں اب انہیں کھاتی بھی تھی۔

میرے کمرے کی الماریاں ایک سے ایک اعلیٰ اور قیمتی ملبوسات سے بھری ہوئی تھیں۔ میری سنگھار میز پر ہیرے موتیوں کے زیورات کے کئی ڈبے موجود تھے۔ مجھے اب محل کے اس مخصوص حصے میں باہر نکلنے اور باغ میں جانے کی بھی آزادی تھی لیکن ایسے موقعوں پر کہیں نہ کہیں سے کسی نہ کسی کی آنکھیں میری طرف نگراں رہتی تھیں۔ کوئی نہ کوئی خواجہ سرا' کوئی نہ کوئی کنیز میرے آس پاس موجود رہتی تھی۔

میں چاہتی تو اس صورتحال کو اپنی قسمت کا حرف آخر سمجھ کر سب کچھ سوچنا چھوڑ دیتی۔ جسم کے پامال کھنڈر کو اس کے حال پر چھوڑ دیتی مگر میرے سینے میں کوئی زخم تھا جو اندر سے مجھے مرنے نہیں دیتا تھا اور اس زندگی سے مجھے کوئی سمجھوتا بھی نہیں کرنے دیتا تھا۔ میں سوچتی رہتی تھی حتیٰ کہ ذہن شل ہو جاتا اور خیالوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے بھٹکتے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا تھا۔

کبھی کبھی میں تعین کرنے کی کوشش کرتی کہ میں کیا سوچتی ہوں؟ کیا میں اس پرتعیش قید خانے سے نکلنا چاہتی ہوں؟ لیکن فرار ہو کر میں کس کے پاس جاؤں گی؟ بے سہارا عورت کے لیے تو باہر کی دنیا بھی بھیڑیوں سے بھرا جنگل ہوتی ہے۔ ایک بھیڑیے سے بھاگ کر میں کہیں ان گنت بھیڑیوں کے نرغے میں تو نہیں گھر جاؤں گی؟ لیکن ان تمام امکانات کے باوجود بہرحال میں اس فیصلے پر پہنچی کہ میں فرار ہونا چاہتی ہوں اور صرف فرار ہونا ہی نہیں چاہتی بلکہ اس بھیڑیے کا سر بھی کچلنا چاہتی ہوں جس نے مجھے بھری پری دنیا سے یوں آسانی سے اٹھا کر اپنی خواہشوں کے کھونٹے سے باندھ دیا تھا اور کسی نے اس کی طرف انگلی تک نہیں اٹھائی تھی۔ کیا میں کسی بھیڑ بکری جتنی وقعت بھی نہیں رکھتی تھی؟ آخر میرا کیا جرم تھا؟

اپنی خواہش انتقام کبھی کبھی مجھے ایک ہوائی قلعہ لگتی اور میں سوچا کرتی کہ وہ سب عورتیں جو اس عشرت کدے میں زندہ دفن ہیں' ان سب نے یا ان سب میں سے بیشتر نے بھی شروع شروع میں میری ہی طرح سوچا ہوگا۔ قفس کی دیواروں سے بہت سر ٹکرایا ہوگا لیکن رفتہ رفتہ بال و پر جھڑ گئے ہوں گے۔ خواہش پرواز مر گئی ہوگی اور انہیں راس آگئی ہوگی کی تسکین نہیں— میں لرز کر سوچتی۔ میں تو اس ڈگر پر زندگی کی شام ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔

اب میں کھانا کھانے کے لیے کبھی کبھار کھانے کے کمرے میں بھی چلی جاتی تھی۔ یہاں کھانا کھانے کے لیے جو میز لگی ہوئی تھی' اس پر تیس افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی لیکن عموماً مجھے تنہا ہی کھانا پڑتا۔ کبھی کبھار میں خادمہ یا کسی نو عمر کنیز کو اپنے ساتھ بٹھانے کی کوشش کرتی تو وہ بڑے ادب سے انکار کر دیتی۔

"ارے میں کونسا بیگمات میں سے ہوں جو تم یوں حد ادب قائم رکھتی ہو۔" میں دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ کہتی۔

"وہ تو ٹھیک ہے خانم! مگر آپ کا مرتبہ بیگمات والا ہی ہے۔" کنیز جواب دیتی۔

میں نے کئی مرتبہ نواب صاحب کو شادی کا وعدہ یاد دلایا تھا لیکن ہر بار انہوں نے بات ٹال دی تھی۔ حالانکہ میرے خیال میں اب اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ عزت اور توقیر کی جو کم بخت تو اب واپس نہیں آسکتی تھی۔ پھر بھی نجانے کیوں میں نے کئی مرتبہ اصرار کیا تھا' شاید اپنی نسوانیت کی مردہ لاش پر پھاہا رکھنے کے لیے..... اور نجانے کیوں نواب صاحب ٹال مٹول سے کام لیتے تھے۔ حالانکہ یہ ان کے لیے بہت سہل کام تھا۔ جب چاہتے حق مہر کے بتیس روپے آٹھ آنے ہاتھ میں تھما کر طلاق' طلاق' طلاق کہہ کر محل سے رخصت کر سکتے تھے۔ جیسا کہ نجانے کتنی مرتبہ کر چکے تھے۔

پھر مجھے کسی نے بتایا کہ نواب صاحب کی بڑی بیگم جو ایک نوابزادی ہی تھیں اور جن کے پاؤں خاصے مضبوط تھے' خاصا ہنگامہ کھڑا کر کے نواب صاحب کے شادیوں کے شغل کو مزید جاری رہنے سے روک چکی تھیں۔ وجہ یہ نہیں تھی کہ اب اس عمر میں ان کے جذبہ رقابت نے انگڑائی لے لی تھی بلکہ بات صرف یہ تھی کہ اب وہ دولت و جائیداد کا مزید کوئی حصے دار پیدا ہوتے دیکھنا نہیں چاہتی تھیں۔

نواب صاحب کی اولاد رکھنے والی بیگمات علیحدہ علیحدہ حویلیوں میں رہتی تھیں۔ ان حویلیوں میں سے بھی کبھار کوئی گوہر بھی آنکلتا۔ ایک بار میں باغ میں افسردہ بیٹھی گلاب کے پھولوں پر مصلوب ان کلیوں کو دیکھ رہی تھی جو عنقریب کھلنے والی تھیں' دفعتاً ایک کنیز دوڑی دوڑی آئی۔ اس نے مجھے اطلاع دی جس کا مفہوم یہ تھا کہ نواب صاحب کے چھوٹے چھوٹے سرکاروں میں سے ایک سرکار تشریف لا رہے تھے۔ وہ یہ اطلاع دے کر الٹے قدموں لوٹ گئی۔

میں بھی اپنے کمرے میں جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی لیکن میں ابھی فوارے کے قریب ہی پہنچی تھی کہ بیس بائیس سال کا ایک خوش شکل سا لڑکا اچانک ہی سامنے آگیا۔ ایک کنیز کی گردن میں بازو ڈالے وہ یوں چل رہا تھا گویا چلنے کی اس میں سکت نہ ہو۔ سر پر چھوٹی سی مخصوص پگڑی تھی اور گلے میں موٹے موٹے جھلملاتے موتیوں کی مالا تھی۔ دور ہی سے اس کی نگاہ مجھ پر جم گئی تھی۔ اس کے نین نقش میں باپ کی جھلک قطعاً نہیں تھی۔ میں اس کے قریب سے گزرنے لگی تو اس نے موٹی موٹی سرخ آنکھوں سے گھورتے ہوئے اچانک میری کلائی پر ہاتھ ڈال دیا۔

"یہ مغرور حسینہ کون ہے جس نے ہمیں آداب کرنے کی بھی زحمت نہیں کی؟" اس نے بدستور مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"حضور!" کنیز نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "یہ عزیزہ خانم ہیں' بڑے سرکار کی پسند۔ ان کی طرف ہاتھ بڑھانا آپ کو زیب نہیں دیتا۔"

"کیوں بھلا؟" نوابزادے نے دوسرا ہاتھ کنیز کے کندھے سے ہٹا کر لاپروائی سے پوچھتے ہوئے کہا۔ "داشتہ ہی تو ہے' کوئی منکوحہ تو نہیں ہے۔"

میرے پہلو میں جیسے کسی نے برچھی سی اتار دی۔ میں نے جھٹکا دے کر کلائی چھڑانا چاہی لیکن اس کی گرفت بے حد مضبوط تھی۔ وہ ایک طاقتور نوجوان تھا۔ میں نے دوسرا جھٹکا دیا اور اس بار میں اپنے جسم کی طاقت سے تو نہیں البتہ اپنی نفرت کی طاقت سے اس کی گرفت سے کلائی چھڑانے میں کامیاب ہو گئی۔ میں دوڑتی ہوئی اپنے کمرے میں پہنچی اور بستر پر گر کر بلک بلک کر رونے لگی۔ اتنی تذلیل اور اتنی سبکی! میں نے کرب سے سوچا۔ اس سے تو بہتر ہے میں مر جاؤں۔

پھر میں دیر تک یہی سوچتی رہی کہ کس طریقے سے اپنی زندگی کا خاتمہ کر سکتی ہوں؟ اپنے آپ سے نفرت کا دھارا دھیرے دھیرے نواب صاحب کی طرف بہنے لگا۔ میں نے تہیہ کیا کہ جب مرنا ہی ہے تو کیوں نہ اس غلاظت کو بھی مار کر مروں۔ شاید میری اس قربانی سے مزید بہت سی لڑکیاں برباد ہونے سے بچ جائیں۔ لیکن مسئلہ یہی تھا کہ یہ کام کیسے کروں؟ مجھے تو اپنے آپ کو ہلاک کرنے کا ہی کوئی طریقہ نہیں سوجھ رہا تھا' اس غلاظت کو موت کے گھاٹ اتارنا تو اس سے کہیں زیادہ دشوار تھا۔

قد کاٹھ کے اعتبار سے تو میں ایک بھرپور عورت تھی لیکن میری عمر پندرہ سال ہی تھی۔ میرا دامن تجربے سے خالی تھا۔ اب تک صرف ایک ہی لرزہ خیز تجربے سے بار بار گزر رہی تھی..... اور یہ اپنی بربادی کا تجربہ تھا۔ ظلم اور جبر کے خلاف میرا کل اثاثہ میری نفرت تھی۔ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا اور اگر ہوتا بھی تو مجھے کسی بھی ہتھیار کے استعمال کا تجربہ نہ تھا لیکن یہ بعد کی بات تھی۔ پہلا مسئلہ تو ہتھیار کے حصول کا تھا۔

کمرے میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جسے میں ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکتی۔ زہر مجھے کہیں سے مل نہیں سکتا تھا۔ پھر ایک خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں کوندا۔ ایک امید کے ساتھ میں بستر سے اٹھی۔ منہ ہاتھ دھویا اور کمرے سے نکل گئی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ نوابزادے نے میرے کمرے کا رخ نہیں کیا تھا ورنہ اسے اندر آنے سے شاید کوئی نہ روک سکتا۔ دروازے میں اندر کی طرف کوئی کنڈا' چٹخنی نہیں تھی' صرف باہر سے بند ہوتا

تھا اور جب بھی نواب صاحب آتے تھے' ایک خواجہ سرا بالا خانہ اسے باہر سے بند کر دیتا تھا۔

ٹہلتی ٹہلتی میں کھانے کے کمرے میں پہنچی اور اس سے گزر کر پچھواڑے میں واقع باورچی خانے میں داخل ہوئی۔ میں پہلی مرتبہ باورچی خانے میں گئی تھی۔ یہاں تینوں باورچنیں ابھی سے رات کے کھانے کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ مودبانہ انداز میں اٹھ کھڑی ہو گئیں۔

"بیٹھی رہو' بیٹھی رہو۔" میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ "میں تو بس ویسے ہی وقت گزاری کی خاطر یہ دیکھنے آگئی تھی کہ رات کے کھانے میں تم کیا کچھ تیار کر رہی ہو۔" میں ان کے قریب ہی ٹہلنے لگی۔ وہ مجھے ان پکوانوں کے نام گنوانے لگیں جن کی وہ تیاری کر رہی تھیں۔

ان کے الفاظ پر میرا کچھ دھیان نہیں تھا۔ ٹہلنے کے دوران غیر محسوس طور پر میری نظریں دیگچوں و برتنوں باورچی خانے کے مختلف گوشوں پر بھٹک رہی تھیں۔ ایک دیوار پر مجھے اوپر تلے لوہے کی کئی کھانچے دار پٹیاں سی نظر آگئیں۔ ان پٹیوں پر بہت سے چھوٹے بڑے چمچے اور کفگیر وغیرہ لٹکے ہوئے تھے اور انہی پٹیوں میں سے ایک پر مجھے اپنے مطلب کی چیز نظر آگئی۔ یہ سبزی کاٹنے کی ایک جیسی چار چھریاں تھیں۔ ان میں سے صرف ایک چھری مجھے درکار تھی جو سب سے زیادہ چمکیلی اور تیز دھار معلوم ہوتی تھی۔ چھری زیادہ بڑی اور مضبوط نہیں تھی لیکن اگر صحیح جگہ اور صحیح طریقے سے وار کیا جاتا تو مہلک ثابت ہو سکتی تھی۔ اب مسئلہ اسے دیوار سے اتارنے کا تھا۔

تینوں عورتیں ایک میز پر اپنے سامنے کئی تھال رکھے بیٹھی تھیں۔ ان میں سے ایک کا چہرہ اسی دیوار کی طرف تھا جس پر میرا گوہر مراد آویزاں تھا۔ بظاہر تو تینوں ہی عورتیں سر جھکائے اپنے اپنے کام میں مصروف تھیں لیکن مجھے احساس تھا کہ تھوڑے تھوڑے وقفے بعد وہ کن انکھیوں سے میری طرف ضرور دیکھ لیتی تھیں۔

میں ٹہلتے ٹہلتے دیوار تک جاتی تو میری ان کی طرف پشت ہو جاتی' ان کی طرف پشت کیے بغیر دیوار سے چھری اتارنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اس لمحے ان میں سے کوئی یا شاید تینوں کی تینوں ہی میری طرف دیکھ رہی ہوں۔ کئی منٹ تک ادھر ادھر ٹہلنے کے بعد مجھ پر مایوسی طاری ہونے لگی۔ ویسے بھی میری موجودگی اب بے جواز سی لگنے لگی تھی۔ میں خواہ مخواہ مختلف چیزوں میں مصنوعی دلچسپی ظاہر کر کے وقت گزار رہی تھی۔

دفعتاً میرے لیے امید کی کرن پیدا ہوئی۔ وہ عورت جو میری مطلوبہ دیوار کی طرف منہ کر کے بیٹھی تھی' چاولوں کا تھال لے کر اٹھی اور کونے میں اپنے پیچھے کافی فاصلے پر لگی

ہوئی پانی کی ٹینکی کے نیچے انہیں دھونے چلی گئی۔ میں جلدی سے دیوار کے عین قریب اس طرح کھڑی ہو گئی کہ دیوار پر لگی ہوئی لوہے کی کئی کھانچے دار پٹیاں میرے پیچھے چھپ گئیں۔

وہ عورت چاول دھونے لگی تو میں نے با آواز بلند کہا "ارے...دیکھو چاول گر رہے ہیں۔" حالانکہ جہاں میں کھڑی تھی' وہاں سے چاولوں کا تھال مجھے نظر نہیں آرہا تھا۔ غیر ارادی طور پر باقی دونوں عورتیں بھی اسی طرف دیکھنے لگیں۔ میں نے اندازے سے اپنی مطلوبہ چھری کی طرف پیچھے ہاتھ بڑھایا۔ میری انگلیوں نے اس کے پھل کا لمس محسوس کیا اور دوسرے ہی لمحے میں نے اسے کھانچے سے باہر کھینچ لیا۔ اس سے پہلے کہ عورتیں میری طرف متوجہ ہوتیں' میں نے چھری اچھی طرح کرتے کے نیفے میں اڑس لی۔

"چاول دھوتے ہوئے چند دانے تو گر ہی جاتے ہیں خانم!" چاول دھونے والی عورت نے فرش کا جائزہ لینے کے بعد پلٹ کر ایک نظر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم کچھ تھوڑی ہی زیادہ گرا رہی ہو۔" میں نے اپنی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ پھر چند سیکنڈ ادھر ادھر کی ہانکنے کے بعد میں باورچی خانے سے نکل آئی۔

اپنے کمرے میں آکر میں سیدھی غسل خانے میں پہنچی اور دروازہ بند کر کے چھری نکال کر اس کا جائزہ لیا۔ خاصی نوکیلی اور تیز تھی۔ اس کا لکڑی کا دستہ چھوٹا تھا۔ اچھی طرح گرفت میں نہیں آتا تھا۔ پھل بھی زیادہ لمبا نہیں تھا۔ نواب صاحب جیسے سانڈ کو ختم کرنے کے لیے کافی تھا۔ وہ میرے کمرے میں آتے تھے تو ترجیحاً ایک مرحلہ تو ایسا ضرور ہوتا تھا جب ان کا وجود میری اس چھری کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا تھا۔

کمرے میں آکر چھری میں نے مسہری کے گدے تلے پٹی کے قریب چھپا دی اور ایک خاص زاویئے سے لیٹ کر کئی بار مشق کر کے دیکھا کہ ضرورت کے وقت میں غیر محسوس طریقے سے اسے نکال سکوں۔ مطمئن ہو کر میں آرام سے لیٹ گئی' اب مجھے صرف انتظار کرنا تھا۔

گیارہ دن گزر گئے اور نواب صاحب نہیں آئے۔ پہلے ان کی آمد کے تصور سے ہی میرا دم ہولنے لگتا تھا لیکن اب مجھے بے کلی سے ان کا انتظار تھا اور دن گویا صدیوں کے برابر ہو گئے تھے۔ بارھویں دن وہ آئے۔ بڑے ہشاش بشاش نظر آرہے تھے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ موقع آیا جس کا مجھے انتظار تھا۔ میرا ہاتھ رینگتا ہوا گدے کے نیچے پہنچا۔ نواب صاحب اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ میرے ہاتھ کی یہ حرکت دیکھ سکتے۔

چھری ہاتھ میں آتے ہی میرا جسم سرد پڑ گیا۔ میں نے دستے پر گرفت مضبوط کی اور گوشت کے اس متحرک پہاڑ کے پہلو میں اتار دی اور چھری پر سے میری گرفت ہٹ گئی۔ میں اسے نواب صاحب کی پسلیوں سے نکال کر اپنے سینے میں گھونپنا چاہتی تھی لیکن اس

تھل تھل کرتے جسم میں یک لخت گویا پارہ بھر گیا تھا۔ گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر انہوں نے سب سے پہلے دیوار کے ساتھ لگی ہوئی ڈوری کھینچی' پھر میرا وہ ہاتھ پکڑ لیا جسے میں چھری کے دستے تک پہنچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ دستے کے اردگرد انہوں نے دوسرا ہاتھ سختی سے جما رکھا تھا جس سے خون کا بہاؤ رکا ہوا تھا۔

وہ اس بکرے کی طرح چیخ رہے تھے جسے نامکمل طور پر ذبح کر کے چھوڑ دیا گیا ہو۔ یہ زندگی اور موت کی کشمکش تھی جس میں مجھے زندگی نہیں' موت چاہیے تھی۔ ان کی بھی اور اپنی بھی۔ مچھلی کی طرح تڑپ کر میں اٹھی اور اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے ان پر ٹوٹ پڑی۔ وہ پشت کے بل بستر پر گرے لیکن یہیں اسی لمحے انہوں نے میرے پیٹ میں لات رسید کی۔ میں مسہری سے کچھ دور فرش پر جا گری۔

اس سے پہلے کہ میں پیٹ پر پڑنے والی ضرب کی اذیت کو پی کر اٹھتی اور دوبارہ ان پر جھپٹتی' دروازہ کھلا۔ ایک خواجہ سرا نے اندر جھانک کر پہلے تو پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے فرش سے اٹھتے دیکھا' پھر اس کی نظر چیختے تڑپتے نواب صاحب پر پڑی اور اچانک اسے گویا صورتحال کا اندازہ ہوا۔ لپک کر اس نے ٹانگ پھنسا کر مجھے دوبارہ فرش پر گرایا اور میری گدی پر گھونسا رسید کیا۔ میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ دوسرے ہی لمحے اندھیرا چھٹا تو میں نے بمشکل گردن موڑ کر دیکھا' وہ میری کمر پر اپنا گھٹنا رکھے' اپنی پگڑی کھول کر میرے ہاتھ پشت پر باندھ چکا تھا۔ پھر وہ مجھے چھوڑ کر نواب صاحب کی طرف لپکا۔

"ڈاکٹر کو بلاؤ۔۔۔۔اور حکیم کو بھی۔۔۔۔جلدی۔۔۔۔" وہ تھرتھراتی آواز میں بولے۔ "اور سرداراں کو بھی بھیجو۔۔۔۔اسے کہنا۔۔۔۔اس خبیث اور ناشکری لڑکی کو خاص سزا دے۔۔۔۔آج سے اس پر۔۔۔۔ہمارا عتاب ہے۔"

خواجہ سرا باہر کو دوڑ گیا۔ میں نے اوندھے پڑے پڑے فرش سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوئی۔ میری حالت غیر ہو چکی تھی۔ بمشکل تمام میں کروٹ لے کر سیدھی ہوئی لیکن میرے بازو اس طرح میرے پیچھے دب گئے کہ کندھوں میں شدید ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ ابھی میں اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ دو خواجہ سرا اور کئی کنیزیں دوڑتی ہوئی کمرے میں آگئیں۔ خواجہ سرا نواب کی طرف متوجہ ہو گئے اور کنیزیں میری طرف۔

ایک خواجہ سرا نے نواب صاحب کے پہلو سے چھری نکالی اور زخم پر سختی سے ہاتھ رکھ دیا۔ دوسرے نے ایک چادر کی گدی سی کر کے اسے زخم پر جمایا۔ تیزی سے خون بہنے نہیں پایا تھا۔ وہ عفریت ابھی ہوش میں تھا۔ مجھے غلیظ گالیاں بھی دے رہا تھا۔ چھری کی نوک شاید نواب صاحب کے دل تک نہیں پہنچی تھی۔ ان کے بھاری جسم نے انہیں بچا لیا تھا یا پھر شاید میں صحیح وار ہی نہیں کر سکی تھی۔

پھر سرداراں کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے جسم پر وہی مخصوص لباس' آنکھوں میں

وہی درندوں کی سی چمک اور ہاتھ میں وہی ہنٹر تھا۔ چہرہ اس وقت بھی ہر تاثر سے عاری تھا۔ نہایت پرسکون انداز میں اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ کنیزوں کے جھرمٹ میں "ہائے ہائے" کرتے نواب صاحب کی نظر اس پر پڑی تو قدرے کمزور آواز میں بولے "سرداراں! لے جاؤ اسے۔۔۔۔کمینی۔۔۔۔"

سرداراں نے تعمیلی انداز میں سر کو نہایت ہلکی سی جنبش دی۔ اس کے پتلے پتلے سانولے ہونٹ سختی سے ایک دوسرے پر جمے ہوئے تھے۔ پھر وہ مجھ پر جھکی' اس کی موٹی موٹی انگلیوں والا پھیلا ہوا ہاتھ میرے سر کی طرف بڑھا۔ یہ ہاتھ کسی دیو ہیکل عقاب کا پنجہ معلوم ہوتا تھا۔

میرے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر ایک جھٹکے سے اس نے مجھے فرش سے اٹھا لیا اور گھسیٹتی ہوئی کمرے سے باہر لے چلی۔ ہال سے نکلنے کے بعد وہ مجھے ایک ایسی سمت لے چلی جدھر جانے کی اس سے پہلے مجھے اجازت نہیں تھی۔ میں رکنے کی کوشش کرتی تو وہ مٹھی میں جکڑے ہوئے بالوں سے گردن کو ایسا جھٹکا دیتی کہ مجھے گردن ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوتی۔ ساتھ ہی وہ اپنے بھاری' مردانہ بوٹ سے میرے ٹخنے پر ایسی ٹھوکر رسید کرتی کہ میں بلبلا اٹھتی۔

ایک عظیم الشان اور آراستہ و پیراستہ ہال سے گزرنے کے بعد ہم ایک دروازے پر پہنچے جس پر بھاری تالا لگا ہوا تھا۔ ایک ہاتھ سے اپنی جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر سرداراں نے تالا کھولا۔ یہ ایک چھوٹا سا خالی کمرہ تھا جس کے کونے میں مکڑیوں نے جالے تان رکھے تھے۔ سرداراں نے دروازہ بھیڑنے کے بعد میری کمر پر گھٹنا مار کر مجھے ایک طرف دھکیلا اور تب میں نے دیکھا' اس طرف فرش میں چوکور خلا تھا جہاں سے سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔ گہرائی میں بتدریج تاریکی گہری ہو رہی تھی۔

سرداراں نے دیوار پر موجود ایک سوئچ دبایا اور سیڑھیوں میں روشنی ہو گئی۔ سیڑھیاں خاصی گہرائی تک چلی گئی تھیں اور اس کے اختتام پر لوہے کی موٹی موٹی سلاخوں والا ایک دروازہ تھا۔ سرداراں نے مجھے سیڑھیوں کی طرف دھکیلا۔

"نہیں۔" پہلی مرتبہ میرے حلق سے دہشت بھری چیخ نکلی۔ میں نے پاؤں مضبوطی سے فرش پر جما لیے۔ میرے ٹخنے پر ایسی ٹھوکر پڑی کہ لڑکھڑا کر پہلی سیڑھی پر جا گری۔ اگر میرے بال اس کی مٹھی میں نہ ہوتے تو یقیناً میں قلابازیاں کھاتی نیچے تک چلی جاتی۔

"خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔۔۔۔معاف کر دو۔۔۔۔" میں بلک اٹھی۔ اس نے میری ریڑھ کی ہڈی پر گھٹنا رسید کیا۔ میری چیخ نکل گئی اور پاؤں اگلی سیڑھی پر جا ٹکے۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور جسم لرز رہا تھا۔

نیچے پہنچ کر اس نے ایک ہاتھ سے سلاخوں والے دروازے کا تالا کھولا اور مجھے اپنے

آگے آگے اندر دھکیلنے کے بعد اندر کی طرف تالا لگا لیا اور مڑ کر میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی۔ یہ مدھم سی مسکراہٹ اتنی خوفناک تھی کہ میرے جسم کی لرزش کچھ اور بڑھ گئی۔
یہ ایک طویل و عریض تہہ خانہ تھا۔ فرش، دیواریں اور چھت پتھر کی سلوں کی تھیں۔ اس کے باوجود یہاں سیلن تھی۔

چھت کے وسط میں تار کے سرے پر بلب جھول رہا تھا۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ کوٹھڑیوں کی قطار تھی۔ کوٹھڑیاں کیا تھے بڑے بڑے پنجرے تھے۔ بمشکل چار فٹ اونچے دروازے لوہے کی سلاخوں والے ہی تھے۔ مجھو تھا یہ تمام کوٹھڑیاں خالی تھیں لیکن انہیں دیکھ کر وحشت آتی تھی شاید اس تصور سے کہ ان میں انسانوں کو بند رکھا جاتا رہا ہوگا کیونکہ ہر پنجرے میں ایک ایک گھڑا اور ایک ایک ٹین کا ڈبہ موجود۔ شاید غلاظت کے لیے۔

سرداراں نے بالوں کو جھٹکا دے کر مجھے دور دھکیل دیا۔ میں منہ کے بل فرش پر جا گری۔

"شڑاپ" ہنٹر کی آواز گونجی لیکن یہ میرے جسم پر نہیں پڑا تھا۔ سرداراں نے ہوا ہی میں گھمایا تھا۔ ہتھیلیاں ٹھنڈے فرش پر جما کر میں نے اپنے کپکپاتے جسم کو سنبھالا دینے کی کوشش کی اور اٹھنے ہی لگی تھی کہ شڑاپ کی آواز کے ساتھ ہنٹر کمر پر پڑا۔ میں اچھل کر فرش پر لوٹ گئی۔ ایسا محسوس ہوا تھا جیسے کسی نے کند چھری سے پشت کا گوشت کھرچ دیا ہو۔

"خدا کے لیے سرداراں! مجھے معاف کر دو... مجھ پر رحم کرو... میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں..." میں نے بمشکل سر اٹھا کر آنسوؤں سے دھندلائی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ بڑی آہستگی سے وہ ایک ایک قدم اٹھاتی میری طرف بڑھی۔ میرے قریب پہنچ کر جوتوں کی ٹھک ٹھک رک گئی۔ میں اوندھی پڑی تھی۔ ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ بمشکل میں نے گردن کچھ اوپر اٹھا کر دیکھا۔ سرداراں میرے سر پر ٹانگیں چوڑی کیے تنی کھڑی تھی۔ دفعتاً وہ ہنٹر گلے میں لٹکا کر جھکی اور میرے ہاتھ کھولنے لگی۔ شاید اسے مجھ پر رحم آگیا تھا لیکن نہیں... یہ میری خوش فہمی تھی۔
ہاتھ کھول کر اس نے ایک بار پھر بالوں سے پکڑ لیا اور ایک جھٹکے سے مجھے سیدھا کھڑا کر دیا۔ میری لرزتی ہوئی ٹانگیں جسم کا بوجھ اٹھانے سے قاصر تھیں لیکن سرداراں کی طرف سے رحم کی توقع نے کچھ سہارا دیا۔ اس نے میری آنکھوں میں جھانکا اور دوسرے ہی لمحے الٹے ہاتھ کا تھپڑ میرے منہ پر رسید کر دیا۔ میں ایک بار پھر فرش پر جا گری۔
نفرت کی آتش میرے سینے میں تمام تر قوت کے ساتھ جاگ اٹھی۔ سرداراں سے رحم کی توقع عبث تھی۔ مجھے اپنے دفاع کے لیے کوشش کرنی چاہیے، میں نے اپنے آپ کو سمجھایا۔ میرے ہاتھ اب کھلے تھے اور سرداراں بے شک قوی بھی غیر معمولی تھی لیکن بہرحال ایک عورت تھی۔ میں نے اپنی بچی کھچی توانائی کو مجتمع کیا اور اس بار جیسے ہی وہ

سرداراں نے بالوں سے پکڑ کر مجھے اٹھایا، میں نے پوری قوت سے اس کے پیٹ میں لات رسید کر دی۔ میرا پاؤں جیسے لوہے کے کسی ستون سے ٹکرایا اور جھنجھنا کر رہ گیا۔ فوراً ہی میں نے اس کے سینے پر دونوں ہاتھوں سے گھونسے رسید کیے مگر اس نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کی اور نہ ہی اس کے حلق سے کوئی آواز خارج ہوئی۔
میں نے سہمی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شعلے ناچ رہے تھے۔ میرا جسم ایک بار پھر لرز اٹھا۔ وہ غیر معمولی نہیں شاید مافوق الفطرت عورت تھی۔

"تمہاری حملہ کرنے کی عادت گئی نہیں۔" وہ زخمی شیرنی کی طرح غرائی۔ "بہرحال فکر نہ کرو۔ میں بڑے بڑے سورماؤں میں سے یہ عادت نکال دینے میں مشہور ہوں۔"
یک لخت اس نے میرے گریبان میں ہاتھ ڈالا اور چرر کی آواز کے ساتھ میری قمیض جو اس وقت میرا کل لباس تھی، میرے جسم سے علیحدہ ہوگئی۔

ایک جھٹکے سے اس نے مجھے نیچے گرا دیا اور مجھ پر ٹوٹ پڑی۔ اب وہ مجھے پیٹ نہیں رہی تھی بلکہ دانتوں سے میرے جسم کے مختلف حصوں کو چبا رہی تھی۔ میں اس بکرے کی طرح فرش پر تڑپنے لگی جسے باندھے بغیر ذبح کیا جا رہا ہو۔ تڑپتے تڑپتے میں نہ جانے کہاں سے کہاں جا پہنچی لیکن سوزاں بدستور آسیب کی طرح مجھ سے چمٹی ہوئی تھی۔

کئی بار میں نے تڑپ کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس کی کہنی میرے حلق پر تھی سے اٹھتی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ مجھے زندہ چبا جانا چاہتی تھی لیکن نہیں..... جسم کے ہر حصے کو دانتوں سے تھوڑا سا کچل کر چھوڑ دیتی تھی اور پھر کسی اور حصے پر دانت گاڑ دیتی۔

بالآخر اذیت میری برداشت سے باہر ہو گئی اور چیختے چیختے میں بے ہوش ہو گئی۔ اذیت کا مدھم مدھم سا احساس اب بھی باقی تھا لیکن پھر رفتہ رفتہ اس پر چھائی ہوئی تاریکی گہری ہوتی گئی۔ آخری احساس مجھے یہی ہوا کہ شاید میں موت کی آغوش میں اتر رہی ہوں۔

پھر نجانے کتنی دیر بعد حسیات بیدار ہوئیں لیکن کئی مرتبہ آنکھیں جھپکنے کے باوجود کچھ نظر نہ آیا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کسی یخ بستہ سمندر کی تہہ میں پڑی ہوں۔ جسم سن تھا اور چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی۔ احساس اور بیدار ہوا تو یہ تاریکی دھیرے دھیرے چھٹنے لگی اور اس کے ساتھ ہی گویا جسم میں ہزاروں پھوڑوں کی دکھن ابھر آئی۔ جسم کا ہر ریشہ گویا زخم بنا ہوا تھا۔

دھیرے دھیرے میری آنکھیں اس زرد روشنی کو محسوس کرنے کے قابل ہوئیں لہٰذا مجھے وہ سلاخیں نظر آئیں جو میرے چہرے کے قریب سے چار فٹ اونچی چھت تک پہنچ رہی تھیں۔ میری ٹانگیں سکڑی ہوئی تھیں۔ میں نے انہیں حرکت دینے کی کوشش کی تو اذیت ناک ٹیسوں کے ساتھ دوسرا احساس یہ ہوا کہ میں انہی پنجرہ نما کوٹھڑیوں میں سے ایک میں بند ہوں جنہیں میں کچھ دیر قبل دیکھ چکی تھی۔ ان کوٹھڑی کی ساخت ایسی تھی کہ انسان نہ تو سیدھا لیٹ سکتا تھا اور نہ ہی سیدھا کھڑا ہو سکتا تھا۔

کئی منٹ کی جدوجہد کے بعد میں اٹھ کر بیٹھنے میں کامیاب ہوئی اور اس عمل کے دوران غیر ارادی طور پر میرے حلق سے نہ جانے کتنی گھٹی گھٹی چیخیں نکل گئیں۔ سانس ذرا معتدل ہوئی تو میں نے اپنا جائزہ لیا۔ میرے جسم پر اب بوری کی طرح موٹے اور

کھردرے کپڑے کا موٹا اور ڈھیلا ڈھالا لبادہ تھا۔ اسے الٹ پلٹ کر میں نے اپنے آپ کو دیکھا۔ میری حالت اس خرگوش سے مشابہ تھی جسے کئی شکاری کتے بھنبھوڑنے کے بعد محض اس لیے چھوڑ کر آگے بڑھ گئے ہوں کہ وہ پہلے ہی سے شکم سیر تھے۔ جسم پر جابجا چبھے ہوئے دانتوں کے نشان نیلے پڑ چکے تھے اور ان سے خون رس رس کر کھرنڈ کی طرح جم گیا تھا۔

میں رونا چاہتی تھی لیکن آنسوؤں کے سوتے شاید خشک ہو چکے تھے۔ حلق سے صرف گھٹی گھٹی چیخیں یا اذیت بھری سسکاریاں نکلتی تھیں۔ قریب ہی لکڑی کی ایک ٹرے پڑی تھی جس میں وہ تندوری روٹیاں جو شکل دیکھنے سے ہی لکڑی کی طرح اکڑی ہوئی لگتی تھیں اور دال کا ایک پیالہ رکھا تھا۔ نہ جانے میں کتنی دیر بے ہوش رہی تھی اور یہ ٹرے کب سے میرے پاس رکھی تھی اور مجھے کچھ کھائے ہوئے بھی نہ جانے کتنا وقت گزر چکا تھا لیکن بھوک کا کوئی احساس نہیں تھا۔ بے پناہ سوزش اور دکھن اور ٹیسوں سے اٹھتی ہوئی ٹیسیں ہر احساس پر حاوی تھیں۔

جانے کتنی دیر تک میں ساکت بیٹھی سلاخوں کو گھورتی رہی۔ ایک موہوم سی امید کے سہارے کہ یہ سب کچھ شاید ایک بھیانک خواب ہے اور ابھی منظر بدل جائے گا لیکن کچھ بھی نہ بدلا۔ سلاخیں بدستور ایستادہ رہیں، سامنے پھیلا ہوا طویل و عریض ہال اور اس کا کچا فرش اور دیواریں جوں کی توں رہیں۔ چھت کے وسط میں لٹکا ہوا دھندلا دھندلا سا بلب بھی وہیں موجود رہا۔

جب مجھے یقین ہو گیا کہ یہ منظر بدلنے والا نہیں تو میں سلاخوں کو تھام کر بمشکل اٹھ کھڑی ہوئی۔ جسم پر گویا بحران گزرا زخموں کے منہ کھل گئے مگر اب یہ اذیت شاید جسم کا ہی ایک حصہ بن گئی تھی۔ میں نے سلاخوں پر مشتمل دروازے کو ہلانے کی کوشش کی لیکن وہ صرف ذرا سا کھڑکھڑا کر رہ گیا۔ تب میں نے دیکھا کہ باہر معلق سی کنڈی میں ایک زنگ آلود کلا جھول رہا تھا۔ میرے ہاتھ بے جان سے ہو کر سلاخوں پر پھسلتے چلے گئے اور میں ایک بار پھر دھپ سے کچی فرش پر بیٹھ گئی۔

اب مجھ پر نیم بے ہوشی سی طاری تھی۔ ایک دھندلا سا احساس تھا کہ شاید قریب ہی میں نے کہیں لوہے کے دروازے کی کھڑکھڑاہٹ سنی تھی، پھر جیسے کسی نے میرا سر تھوڑا سا اوپر کر اٹھا کر کسی گداز چیز پر رکھ دیا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا، ایک اجنبی عورت مجھ پر جھکی ہوئی تھی اور میرا سر اس کے زانو پر تھا۔

"عزیزہ خانم! میری آواز سن رہی ہو؟" اس نے سرگوشی کی اور نہایت آہستگی سے میرا کندھا ہلایا۔ میں نے ہولے سے اثبات میں سر ہلانے کی کوشش کی تو سر پھوڑے کی طرح دکھ اٹھا۔ اس عورت نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے مٹی کے پیالے سے تھوڑا سا پانی میرے

حلق میں پہنچایا۔ حلق کچھ تر ہوا تو میں نے اشارے سے اور پانی مانگا۔ اس نے پیالہ ہونٹوں سے لگایا تو احساس ہوا کہ میرے ہونٹ بھی کٹے پھٹے اور سوجے ہوئے تھے۔ چار گھونٹ پینے کے بعد میری آنکھوں کی دھندلاہٹ کچھ کم ہوئی اور جسم میں زندگی کی رمق محسوس ہوئی۔

"میں زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتی۔" عورت نے سرگوشی کی۔ "پہلے بھی میں کھانا لے کر آئی تھی تو تمہیں ہوش میں لانے کی کوشش کی تھی لیکن کامیابی نہیں ہوئی تھی۔" اس نے گریبان میں ہاتھ ڈال کر ٹین کی ایک گول ڈبیا نکالی۔

"یہ نورجہاں نے بھیجی ہے۔" اس نے ڈبیا میرے پاس رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ ایک خاص مرہم ہے۔ نورجہاں نے کسی بہانے سے بڑے حکیم سے حاصل کیا ہے۔ اسے اپنے زخموں پر ضرور لگا لینا۔ نورجہاں کہہ رہی تھی کہ انسانی دانتوں کے زخم بہت زہریلے ہوتے ہیں۔"

"کیا نورجہاں یہاں آئی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ اسے تو یہاں آنے کی قطعاً اجازت نہیں ہے کیونکہ سرداراں بیگم کو شک ہے کہ وہ تم پر کچھ نہ کچھ مہربان ہے۔" عورت نے جواب دیا۔

"تو پھر اسے میرا حال کیسے معلوم ہوا؟" میں نے نحیف آواز میں پوچھا۔

"اسے خوب اچھی طرح اندازہ تھا کہ سرداراں نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا اور کچھ میں دیکھ کر گئی تھی۔ میں نے اسے بتایا تھا۔" عورت بولی۔

"اور تم کون ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں؟ میں بھی کنیز ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ "آپ سے میرا سامنا صرف ایک مرتبہ ہی ہوا ہے۔ اچھا اب میں چلتی ہوں۔" اس نے میرا سر زانو سے ہٹا کر بڑی احتیاط سے پتھریلے فرش پر لٹا دیا۔

"سنو... سنو... نواب کا کیا حال ہے؟ کیا وہ زندہ بچ گیا؟" میں نے اپنی اکھڑتی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ "خون کافی بہا ہے لیکن نواب صاحب کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ بڑے حکیم صاحب کا کہنا ہے کہ وہ چند دنوں تک بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔"

تنگ کوٹھری میں بمشکل سمٹ سمٹا کر وہ اٹھی اور جھکی جھکی ہی آہنی دروازہ کھول کر نکل گئی۔ تالا لگا کر اس نے سلاخوں کے درمیان سے جھانکتے ہوئے کہا۔ "مہر تم کچھ کھانے کی کوشش کرنا۔ مجھے افسوس ہے کہ فی الحال میں تمہیں اس سے بہتر کھانا فراہم نہیں کر سکتی کیونکہ نگرانی بہت سخت ہے۔" پھر وہ مڑی اور تیزی سے ہال کے بڑے گیٹ کی طرف چلی

دی جو چھوٹے سے بلب کی کمزور سی روشنی کی زد سے دور تھا۔

اس تہہ خانے میں زندگی کی رفتار کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ وقت گویا اپنی جگہ تھما رہتا تھا۔ دن یا رات کا کوئی پتا نہ چلتا۔ مجھے نہیں معلوم کہ کتنی دیر بعد معدے میں اٹھنے والی ٹیس سے مجھے بھوک کا احساس ہوا۔ میں نے سوکھی روٹی کو دال میں بھگو کر کھانے کی کوشش کی۔ چند لقمے تو پیٹ میں چلے ہی گئے جس سے مجھے اپنی نقاہت میں کچھ کمی محسوس ہوئی۔

اب میں نے مرہم کی ڈبیا کھولی۔ یہ سفیدی مائل بے رنگ سی چیز تھی۔ میں نے زخموں کا جائزہ لیا تو ان کا گویا کوئی شمار ہی نہ تھا۔ پورا جسم ہی زخموں سے بھرا ہوا تھا اور مرہم ان کے لیے ناکافی تھا۔ بہرحال میں نے ہر زخم پر تھوڑا تھوڑا لگانا شروع کیا۔ انگلی کے لمس سے ہر زخم میں اذیت کی ایک نئی لہر دوڑ جاتی تھی۔

اس کام سے فارغ ہو کر مجھے ایک گونہ سکون کا احساس ہوا۔ مرہم واقعی جلد اثر تھا کہ زخموں کی اذیت یک لخت ہی معدوم سی ہو گئی تھی۔ میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں گویا مفلوج ہو گئی تھیں۔ شاید یہ شکست کی علامت تھی۔ جب تک میری روح نے ہتھیار نہیں ڈالے تھے، میں کچھ نہ کچھ سوچتی رہتی تھی۔ نجات کا کوئی طریقہ، بغاوت کا کوئی انداز، چھٹکارے کی کوئی تدبیر، لیکن اب دل میں محض ایک بے نام سناٹا طاری تھا۔ امیدیں، امنگیں، خواہش اور جذبات سب کچھ ہی ختم ہو چکا تھا۔

دفعتاً اسی خالی الذہنی کے عالم میں پہلی مرتبہ میں نے محسوس کیا کہ تہہ خانے ہی کے کسی دور افتادہ اور نظر نہ آنے والے حصے سے وقفے وقفے سے کچھ آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ کبھی یہ آوازیں درندوں کی غراہٹ سے ملتی جلتی محسوس ہوتی تھیں اور کبھی انسانوں کی چیخ و پکار سے۔ کبھی کبھی کوئی کراہ سنائی دیتی تھی اور کبھی کوئی گھٹی گھٹی اور بہت ہی مدھم سی چیخ۔

احساس تنہائی نے اتنا ہراساں نہیں کیا تھا جتنا ان آوازوں نے۔ میں نے اپنی جگہ سے حرکت کیے بغیر اس سمت دیکھا جدھر سے یہ آوازیں آتی تھیں۔ بائیں طرف جہاں تہہ خانہ ختم ہوتا دکھائی دیتا تھا، وہاں دیوار میں لوہے کا ایک بڑا سا جالی دار دروازہ تھا۔ اس دروازے کے عقب میں اندھیرا تھا لیکن دیکھنے پر احساس ہوتا تھا کہ شاید تہہ خانے کا ایسا ہی ایک حصہ اس طرف بھی ہے جو مجھے اپنی جگہ سے نظر نہیں آ رہا تھا۔

اگلی مرتبہ کنیز وہی دال روٹی پر مشتمل کھانا لے کر آئی تو میری حالت پہلے سے بہت بہتر تھی۔ میرے پوچھنے پر اس نے جھجکتے ہوئے بتایا کہ دروازے والی دیوار کے پرلی طرف واقعی تہہ خانے کا دوسرا حصہ ہے اور اس طرف آمد و رفت کا راستہ دوسرا ہے، وہاں مجرم قیدیوں کو رکھا جاتا ہے۔

اس کی زبانی مجھے یہ سن کر کوئی خاص حیرت نہ ہوئی کہ ان عورتوں میں سے بعض چودہ پندرہ برس سے وہاں قید تھے اور ان میں سے اگر کسی کے لواحقین موجود تھے تو انہیں ان کے بارے میں قطعاً کوئی علم نہ تھا۔ وہ ان سے جدائی پر صبر کر چکے تھے۔ یہ قیدی نواب صاحب یا ان کے خاندان کے کسی نہ کسی فرد کے معتوب تھے اور انہیں ان موت کے خانے کا زندان میں ڈلوانے کے بعد کسی کو ان کا نام تک یاد نہیں رہا تھا۔ مجھے یہ سن کر اس لیے حیرانی نہیں ہوئی کہ مجھے تو بہت پہلے ہی احساس ہو چکا تھا کہ اندھیر نگری میں کچھ بھی بعید نہیں۔ خدا کی دھرتی پر یہ ایک علیحدہ ہی خدائی تھی۔

اس تجربے میں میرے اندازے کے مطابق مجھے چھ یا سات دن گزر چکے تھے۔ جب سرداراں کی مکروہ صورت ایک بار پھر مجھے دکھائی دی۔ میرا دل ڈوب سا گیا۔ اس عورت سے مجھے واقعی خوف آنے لگا تھا۔ ایک ایسا خوف جو ہڈیوں تک میں اتر جاتا ہے۔ اتنا خوف میں نے کبھی نواب صاحب کی صورت دیکھ کر بھی محسوس نہیں کیا تھا یا شاید اس کی نوعیت مختلف تھی۔

کوٹھری کا دروازہ اس نے پورا کھول دیا اور دونوں ہاتھ کولہوں پر ٹکا کر تن کر میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔ ہنٹر اب بھی اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ سرخ سرخ آنکھوں سے وہ مجھے ایک ٹک گھور رہی تھی اور اس کی نظریں گویا میرے جسم کے پار ہوتی جا رہی تھیں۔ میں اس مختصر سی کوٹھری میں اور سمٹ سکڑ گئی۔ سرداراں کے چہرے سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ یہاں بلامقصد یا محض مجھے دیکھنے نہیں آئی بلکہ میرے خیال میں تو وہ بلا مقصد یا چھوٹے موٹے کام سے تو کہیں بھی نہیں آتی تھی۔ وہ عورت نہیں بلکہ شاید خاص کاموں کے لیے سدھایا ہوا درندہ تھی۔

کھڑے کھڑے یک لخت وہ جھکی اور میرے الجھے بالوں کو اپنے خاص انداز میں مٹھی میں پکڑ کر اس نے جھٹکے سے مجھے کوٹھری سے باہر نکال لیا۔ میرے بالوں کی جڑوں میں گویا بیکٹروں ڈنکوں کے منہ کھل گئے تھے۔ سرداراں نے پہلے جتنی مرتبہ یوں مجھے بالوں سے پکڑ کے اٹھایا تھا ابھی اس کی دکھن ختم نہیں ہوئی تھی۔

"تو اب بھی خاصی تر و تازہ نظر آ رہی ہے۔" میرا چہرہ اپنے چہرے کے قریب لاتے ہوئے وہ سانپ کی طرح پھنکاری۔ "میں تجھے کچلی اور مسلی ہوئی دیکھنا چاہتی ہوں۔ جیسا میں تجھے چھوڑ کر گئی تھی۔"

"سرداراں!" میں نے لرزتی آواز میں کہا۔ "کیا تجھے مجھ پر رحم نہیں آتا؟ آخر تو بھی ایک عورت ہے۔ مجھے معاف کر دے۔" میں نے جھک کر اس کے پیروں کو چھونا چاہا لیکن اس کا وہ ہاتھ ساکت رہا جس سے اس نے میرے بال جکڑے ہوئے تھے' اس لیے میں جھک نہ سکی' کراہ کر رہ گئی۔

"عورت۔۔۔!" اس کی پھنکار کچھ اور زہریلی ہو گئی۔ "تجھے کس نے کہہ دیا کہ میں عورت ہوں۔۔۔؟ مجھے کبھی عورت نہیں سمجھا گیا۔۔۔ اور مجھے نفرت ہے اس لفظ سے۔۔۔ عورت ہو تو۔۔۔ عورت تو تو ہے' کمزور' بے بس' رحم کی بھکاری!"

"لیکن اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں سرداراں!" میں نے گڑگڑا کر کہا۔ "میں تو تجھے عورت ہی محسوس ہوئی اور مجھے کمزور' بے بس تو حالات نے بنا دیا ہے۔"

"قصور؟" اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر بے حد مدھم مگر نہایت سفاک مسکراہٹ ابھری۔ "تیرا قصور یہ ہے کہ تو کمزور اور بے بس ہو کر اپنی مرضی کی زندگی گزارنا چاہتی ہے' او کی بچی!" اس نے نفرت سے مجھے فرش پر دے مارا۔ میرا سر ٹل کر رہ گیا۔ کوشش کے باوجود میں فوری طور پر اٹھ نہ سکی۔

"آج نواب صاحب کی طبیعت کچھ مضمحل ہے۔" سرداراں نے گویا مجھے اطلاع دی۔ "اور انہوں نے پہلی بات مجھ سے یہی پوچھی تھی کہ میں نے تجھے کچھ سبق دے دیا ہے کہ نہیں۔ تب مجھے یاد آیا کہ میں تو اپنا کام ادھورا چھوڑ کر گئی تھی۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔" میں بے اختیار چلا اٹھی۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹوں کے عقب سے جھانکتے ہوئے نوکیلے سے دانتوں کی جھلک دیکھ کر میرے جسم میں سوئی ہوئی اذیتیں جاگ اٹھیں لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس بار سرداراں اپنی مشق ستم دہرانے کا ارادہ نہیں رکھتی بلکہ درندگی کا ایک نیا ہی باب رقم کرنے آئی ہے۔ اس نے ایک بار پھر میرے بال مٹھی میں جکڑے اور مجھے گھسیٹتی ہوئی ایک طرف کو لے کر چلی۔

میں نے مزاحمت کی' فرش پر ہاتھ پاؤں مارے مگر سپاٹ پتھریلے فرش پر کوئی ایسی چیز نہ تھی جسے میں تھام سکتی۔ جب وہ رکی تو میں نے دیکھا' وہ تہہ خانے کے وسط میں حد فاصل کا کام دینے والے دروازے پر کھڑی تھی۔ میرے بال چھوڑ کر اس نے پھرتی سے یوں میرے نرخرے پر پاؤں رکھ دیا گویا کوئی بھیڑیا اپنے نیم جاں شکار کو تڑپتے پھڑکتے دیکھ کر محظوظ ہو رہا ہو۔ میری گردن اس نے کچھ اس انداز سے بھاری بوٹ تلے دبائی تھی کہ جونہی میں نے اس کے نیچے سے نکلنے کی کوشش کی' مجھے فوراً محسوس ہو گیا کہ اگر میں نے ذرا بھی مزید حرکت کی تو میری گردن ٹوٹ جائے گی یا نرخرہ پچکنے سے سانس کی آمد و رفت موقوف ہو جائے گی۔

اسی عالم میں اس نے نہایت اطمینان سے چابیوں کا گچھا نکال کر آہنی دروازے کا تالا کھولا اور مجھے ایک بار پھر بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور اندر کی طرف سے دوبارہ تالا لگا چکی تھی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا' یہاں اتنا اندھیرا نہیں تھا جتنا دور سے نظر آتا تھا۔ میرے مقابل میں کافی فاصلے پر اسی طرح ایک دھندلا سا بلب چھت میں لٹکا ہوا تھا' جس طرح اس حصے میں تھا جہاں میں مقید تھی۔ یہی نہیں بلکہ تہہ خانے کا یہ حصہ ہوبہو ویسا ہی تھا۔ فرق

صرف یہ تھا کہ اپنے حصے میں قیدی صرف میں ہی تھی اور یہاں شاید کوئی پنجرہ خالی نہیں تھا۔

سرداراں نے اچانک میرے پیٹ پر لات رسید کی اور میں بلبلا کر لڑھکتی ہوئی روشن حصے میں پہنچ گئی۔ میرے دائیں طرف پنجروں کی قطار تھی۔ ہر پنجرے میں کوئی نہ کوئی قیدی یا تو اکڑوں بیٹھا تھا یا سلاخوں کو تھامے کھڑا تھا اور عجیب انداز میں سلاخوں کے درمیان سے جھانک رہا تھا۔ ان میں ہر عمر کے مرد تھے اور سب کی داڑھیاں اور سر کے بال جھاڑ جھنکاڑ کی طرح بڑھے ہوئے تھے۔ آنکھیں دھنسی ہوئی تھیں اور رخساروں کی ہڈیاں ٹیلوں کی طرح ابھری ہوئی تھیں۔ ان کے غلیظ جسموں پر چیتھڑے جھول رہے تھے۔ وہ زمانہ غار کے انسان معلوم ہوتے تھے۔ لاغر جسموں سے قطع نظر ان کے چہروں پر وہی حیوانیت اور آنکھوں میں وہی وحشت تھی جس کا تصور زمانہ غار کے انسان کے حوالے سے کیا جا سکتا ہے۔

"کیا حال ہے کیڑو!" سرداراں نے ہنٹر کو ہوا میں جھٹکا دے کر کہا۔ "تم سب زندہ ہو؟ کوئی مرا تو نہیں؟"

کسی پنجرے سے کوئی جواب نہ آیا۔ سب سہمی سہمی نظروں سے سرداراں کی طرف دیکھ رہے تھے گویا کوئی عفریت ہو اور وہ اس کی زبان سمجھنے سے قاصر ہوں۔

"میں تالے کھولنے لگی ہوں۔ تم سب باہر آ کر قطار میں کھڑے ہو جاؤ۔" سرداراں نے ہنٹر لپیٹ کر بغل میں اڑس لیا اور ڈھیلے ڈھالے لبادے کی جیب سے لمبی نال کا ایک خوفناک ریوالور نکال لیا۔

دائیں ہاتھ میں ریوالور سنبھال کر اس نے بائیں ہاتھ میں موجود چابیوں کے گچھے سے صرف ایک چابی منتخب کر کے سارے تالے کھول دیے۔ چھ پنجروں میں قیدی تھے، صرف ایک پنجرہ خالی تھا۔ تالے کھولنے کے بعد سرداراں پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ شکار پر نکلے ہوئے چیتے کی طرح چوکس نظر آ رہی تھی۔

"اب باہر آ جاؤ۔" اس نے حکم دیا۔ تمام قیدی فرمانبردار غلاموں کی طرح باہر آ گئے اور پنجروں کے سامنے ہی قطار میں کھڑے ہو گئے۔ میں ان کے سامنے تھی اور سرداراں میرے عقب میں ریوالور سنبھالے کھڑی تھی۔ "آج تمہاری دعوت شیراز ہے۔" سرداراں نے قیدیوں کو مخاطب کیا اور تب میرے ذہن میں چھناکا سا ہوا۔ اسکا مطلب سمجھ کر میں سر سے پاؤں تک لرز کر رہ گئی۔ میرے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ نکلی۔ میں نے راہ فرار کی تلاش میں ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ میرے دائیں بائیں بڑے بڑے آہنی دروازے تھے۔ عقب میں بلند و بالا دیوار تھی اور سامنے پنجروں کی قطار۔

دہشت کے ان لمحات میں بھی ایک لمحے کے لیے مجھے ان مردوں پر حیرت ہوئی کہ

پنجروں سے باہر آ کر بھی بھوکی نظروں سے ایک ٹک صرف مجھے دیکھ رہے تھے۔ ان کے ذہن میں اس خیال کا شاید گزر تک نہیں تھا کہ وہ کوشش کریں تو اس اکیلی عورت سرداراں کو قابو کر سکتے ہیں اور اپنی رہائی کی تدبیر کر سکتے ہیں۔ شاید انہیں یاد ہی نہیں رہا تھا کہ آزادی بھی کوئی چیز ہے یا شاید سرداراں کی ہیبت مجھ سے زیادہ ان پر تھی۔

کوئی راہ فرار نہ پا کر میں بدحواسی میں دوڑ پڑی۔ جیسے دیواریں یا کوئی آہنی دروازہ خود ہی مجھے راستہ دے دے گا۔ اپنے عقب میں سرداراں کا بھیانک قہقہہ سن کر میرے اعصاب جھنجھنا اٹھے۔ پھر میں نے اس کی بلند آواز سنی جس میں ایک عجیب سی کھنک شامل ہو چکی تھی۔ "کیڑو! وہ دیکھو... گوشت بھاگ رہا ہے... کھڑے منہ کیا تک رہے ہو؟"

پھر جیسے تہ خانے میں غیر انسانی غراہٹوں، مسرت بھری اور دیوانگی آمیز سی چیخوں کا طوفان مچ گیا اور بھیڑیوں کا ایک غول میرے تعاقب میں دوڑ پڑا۔ میں زیادہ دیر تک نہیں بھاگ سکی۔ انہوں نے چاروں طرف سے مجھے گھیر لیا اور بھوکے کتوں کی طرح مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ میری چیخیں... میری آواز معدوم ہو گئی اور ہوش و حواس نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ آخری آواز جو میں نے سنی، وہ سرداراں کے دیوانہ وار قہقہوں کی تھی۔

اس بار جب میری آنکھوں میں روشنی لوٹ کر آئی تو میں اپنی کوٹھری ہی میں تھی لیکن میرا وجود شاید ہزاروں چٹانوں تلے پس کر ریزہ ریزہ ہو چکا تھا۔ ان گنت آریوں سے کاٹ کر اسے ریشہ ریشہ کر دیا گیا تھا۔ جب مجھے صحیح طور پر احساس ہوا کہ میں زندہ ہوں تو اس زندگی پر بے حد ندامت ہوئی۔ نہ جانے کیوں قدرت نے میرے اندر اتنی قوت برداشت رکھ دی تھی۔ کاش میں مر چکی ہوتی۔

اپنے آپ سے ندامت اور نفرت کے ان جاں گسل لمحات میں اپنے دریدہ بدن اور شکستہ دل کی ٹیسوں کو سہتے ہوئے میں نے صرف ایک ہی بات سوچی کہ آئندہ جب بھی میرا سرداراں سے سامنا ہوا تو خواہ میرا حال کچھ بھی ہو، میں اس پر ٹوٹ پڑوں گی اور اسے مجبور کر دوں گی کہ وہ گولی مار بیٹھے کہ مجھے ایک بار پھر نیم جان کر کے نہ چھوڑ جائے بلکہ موت کے گھاٹ اتار دے۔ دل میں یہ مصمم ارادہ کر کے مجھے قرار سا آ گیا۔

لیکن اس کے بعد دن پر دن گزرتے گئے اور سرداراں تہ خانے میں دوبارہ دکھائی نہ دی۔ وقت کے ساتھ ساتھ جیسے میرا احساس فنا ہو گیا۔ مجھے شاید صحیح طور پر یاد بھی نہ رہا تھا کہ میں کون تھی اور کس طرح یہاں تک پہنچی تھی۔ چاولوں سے بھی زیادہ غلیظ اور مکروہ زندگی گویا میرے وجود میں رچ بس گئی۔ میرا ذہن شاید میرے تن سے جدا ہو کر کہیں پیچھے رہ گیا تھا یا شاید اس بری طرح شل ہو چکا تھا کہ سوچنے، محسوس کرنا اس کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ مجھے زندہ صرف اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ میرے جسم میں سانسوں کی آمد

درفت جاری تھی ورنہ معنوی اعتبار سے شاید میں مر چکی تھی۔

میرے ہاتھوں کی لکیروں میں میل اس طرح جم چکی تھی کہ اب بے تحاشہ بڑھے ہوئے ناخنوں سے بھی نہیں نکلتی تھی۔ اگر لکیروں سے مقدر کا واقعی کوئی تعلق ہوتا ہے تو یقیناً اس میل میں دفن ہو چکا تھا۔ میری جلد کی اصل رنگت بھی میل کے نیچے چھپ چکی تھی اور عجیب بات یہ تھی کہ مجھے اب اپنے آپ سے گھن بھی نہیں آتی تھی۔ میں سوچتی ہوں کہ معنوی اعتبار سے شاید میں مر چکی تھی۔ کھانا لانے والی کنیز نے ایک بار بتایا کہ مجھے اس قید میں اترے دو سال گزر چکے ہیں تب بھی مجھے کوئی خاص حیرت نہ ہوئی۔

اس کے چند دن بعد ایک عورت بدحواسی کے سے عالم میں تہہ خانے میں آئی۔ کانپتے ہاتھوں سے اس نے کوٹھری کا دروازہ کھولا۔ چابیوں کا گچھا اس کے ہاتھ سے گر گر جاتا تھا۔ میں آڑی ترچھی لیٹی لاتعلقی سے اسے دیکھتی رہی۔ اس کی شکل مجھے کچھ شناسا سی محسوس ہو رہی تھی۔

"عزیزہ! اٹھو۔ جلدی سے باہر آؤ۔" اس نے دروازہ کھول کر گھبرائی ہوئی سی آواز میں کہا۔ ایک لمحے کے لیے تو گویا مجھے یاد ہی نہ آیا کہ عزیزہ میرا ہی نام ہے۔ پھر میں سستی سے انداز میں اٹھ بیٹھی۔

غالباً میری آنکھوں میں لاتعلقی کی جھلک دیکھ کر وہ تیزی سے اندر آئی اور گھٹنوں کے بل میرے قریب بیٹھ کر مجھے بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے بولی۔ "آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟" اور اس سوال کے ساتھ میرا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"میں نورجہاں ہوں۔" اس نے گلوگیر آواز میں کہا اور تب بچپن کی کچھ بھولی بسری سی پرچھائیاں میرے ذہن میں روشن ہو گئیں۔ یادداشت کا کوئی گم شدہ حصہ جیسے لوٹ آیا۔

"آج کسی بات پر نواب صاحب اور ان کے بڑے بیٹے کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔" نورجہاں نے ہانپتے ہوئے بتایا۔ "بیٹے نے باپ پر گولی چلا دی۔ محل میں بھگدڑ مچی ہوئی ہے۔ افراتفری میں سردارن سے چابیوں کا گچھا گر گیا۔ میرے دل میں پہلا خیال یہی آیا کہ شاید قدرت نے مجھے تمہاری مدد کرنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ اس سے پہلے کہ سردارن کو چابیوں کے گچھے کی عدم موجودگی کا احساس ہو، میں تمہیں محل سے نکالنا چاہتی ہوں لیکن تم بھی کچھ ہمت کرو۔ یوں بت بنی کر نہ بیٹھو۔"

اس نے بازو سے پکڑ کر مجھے اٹھایا اور ساتھ لے کر تہہ خانے کے بڑے دروازے کی طرف دوڑی۔ میں دوڑنے کے بجائے اس کے ساتھ تقریباً گھسٹ رہی تھی۔ میرے پاؤں چلنا بھول چکے تھے اور میں یوں لڑکھڑا رہی تھی گویا ہموار فرش کے بجائے پتھروں کے ڈھیر پر دوڑنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ کوٹھری سے نکل آنے کے باوجود میری کمر کبڑوں کی طرح جھکی ہوئی تھی۔ دو سال میں نے اس کوٹھری میں گزارے تھے جہاں سیدھے ہونے کی

...

تنجائش ہی نہیں تھی اور سر جھکائے بیٹھے بیٹھے کر میری ریڑھ کی ہڈی میں مستقل خم آ گیا تھا۔ شاید میں چوپایہ بن گئی تھی۔

نورجہاں نے تہہ خانے سے نکلتے وقت کوٹھری اور بڑے دروازے کا تالا دوبارہ لگا دیا تھا۔ سیڑھیوں کے دروازے سے نکل کر ہم طویل راہداری میں گئے جہاں گھپ اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ نورجہاں اندھا دھند دوڑ رہی تھی۔ کافی دیر تک اس کے ساتھ گھسٹنے کے بعد میرے قدم سیدھے پڑنے لگے تھے لیکن کمر کو اب بھی سیدھا کرنے کی کوشش کرتی تو ریڑھ کی ہڈی میں درد محسوس ہوتا۔ اب ہم باغ میں دوڑ رہے تھے جو ختم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ میں بری طرح ہانپ رہی تھی لیکن نورجہاں مجھے سانس درست کرنے کا موقع نہیں دے رہی تھی۔

خدا خدا کر کے ہم ایک دیوار تک پہنچے۔ نورجہاں نے رک کر چند گہری سانسیں لیں اور اپنا بڑا سا دوپٹہ اتار کر مجھے دیتے ہوئے بولی۔ "یہ رکھ لو۔ تن ڈھانپنے کے کام آئے گا۔ یہ تمہاری قمیض تو آگے سے بالکل کھلی ہے۔"

پھر وہ مجھے راستہ سمجھاتے ہوئے بولی۔ "یہ دیوار پھاند کر تم جس سڑک پر پہنچو گی اسے پار کر کے میدان میں بھاگتی جانا۔ آگے نہر آئے گی، اس کا پل عبور کر کے جنگل شروع ہو جائے گا۔ پل کی سیدھ میں جنگل کو عبور کرنا۔ آگے چند فرلانگ پر ایک بستی ہے۔ کسی طرح وہاں تک پہنچ جانا۔ اس کے بعد کیا ہو گا یا تمہیں کیا کرنا ہو گا، میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اب جاؤ، خدا حافظ!"

پھر وہ چاروں ہاتھ پیروں پر جھک گئی۔ "میری کمر پر چڑھ کر دیوار پھلانگ لو، جلدی کرو۔" اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔

میں اس کی بات سمجھنے کے باوجود چند لمحے تک تو عمل کرنے سے قاصر رہی۔ اس نے میری پنڈلی پر زور سے گھونسا مارا تو میں گویا کسی تنویمی سی کیفیت سے چونک اٹھی اور اس کی کمر پر چڑھ گئی۔ دیوار سے پرلی طرف دھندلا سا تاریک میں نظر آ رہی تھی، تاہم میں نے خالی الذہنی کے سے عالم میں اندھیرے میں چھلانگ لگا دی۔

ایک لمحے کے لیے تو گویا میرا تمام جسم مفلوج ہو کر رہ گیا۔ سنبھل کر میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ چاروں طرف ویرانی کا راج تھا۔ سامنے پتلی سی سڑک اندھیرے میں مدھم نظر آ رہی تھی۔ یہ سڑک پار کر کے میں سیدھی میدان میں بھاگنے لگی۔ بھاگتے بھاگتے میں دو مرتبہ منہ کے بل گری لیکن کھلی ہوا کے لمس نے گویا جسم میں آزادی کی مردہ طلب کو نئی زندگی دے دی تھی۔ اس لیے میں تھک ہار کر پڑی رہنے کی بجائے ہر مرتبہ ایک نئے حوصلے سے اٹھ کر دوڑنے لگی۔ میری تمام حسیات ایک طویل مدت تک خوابیدہ رہنے کے بعد بیدار ہو چکی تھیں۔

میدان ختم ہوا تو میرے سامنے نہر آگئی۔ اس وقت تک اندھیرا گہرا ہو چکا تھا اور مجھے اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ پل پر پہنچنے کے لیے مجھے دائیں جانا چاہیے یا بائیں؟ خوش قسمتی سے تھوڑے ہی فاصلے پر مجھے پل نظر آگیا۔ پل عبور کرنے کے بعد میں جنگل میں داخل ہوئی۔ شروع میں درختوں کا سلسلہ گنجان نہیں تھا۔ گنجان حصہ شروع ہوا تو ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

کئی مرتبہ میں درختوں سے ٹکرائی اور مجھے یہ بھی اندازہ نہیں رہا کہ میں سیدھی جا رہی ہوں یا میرے سفر کی سمت تبدیل ہو گئی ہے۔ حسیات بیدار ہوئی تھیں تو اندر کا خوف بھی جاگ اٹھا تھا۔ اب خشک پتوں کی چرچراہٹ یا کبھی کبھی کہیں دور دراز سے سنائی دینے والی کسی جانور کی ہلکی سی آواز سے دل دہل جاتا تھا۔

پھر مجھے یہ احساس بھی نہ رہا کہ جنگل میں بھٹکتے ہوئے مجھے کتنی دیر ہو چکی ہے۔ میرے پاؤں شدید زخمی ہو چکے تھے کیونکہ اب ہر قدم پر ان میں ٹیسیں سی ابھر رہی تھیں۔ اس تصور سے مجھے ہول آرہا تھا کہ اس طرح نہ جانے کب تک میں بھٹکتی رہوں۔ ایک جگہ میں نہ جانے کس چیز سے ٹھوکر کھا کر گری۔ درختوں کی کچھ خشک ٹہنیاں میرے بوجھ تلے چرچرائیں۔ عین اسی لمحے کانوں کے پردے پھاڑ دینے والا دھماکہ ہوا اور ایک انگارہ سا سنسناتا ہوا میری ناک سے چند انچ کے فاصلے سے گزر گیا۔ بے اختیار میرے حلق سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی اور میں اپنی جگہ پڑے پڑے تھر تھر کانپنے لگی۔ پھر کہیں بلندی سے روشنی کا ایک فوارہ سا پھوٹا۔ اس کا رخ میری ہی طرف تھا۔ میری آنکھیں چندھیا کر رہ گئیں۔

چند سیکنڈ تک روشنی کا یہ دائرہ دھیرے دھیرے حرکت کرتا رہا' پھر غائب ہو گیا۔ گرد و پیش پر ایک بار پھر وہی گھٹا ٹوپ اندھیرا اور سناٹا چھا گیا۔ میرا جی چاہا کہ اٹھ کر بھاگ لوں لیکن جسم میں گویا سکت ہی نہ رہی تھی۔ چند لمحے بعد دھپ کی سی آواز سنائی دی گویا کوئی بلندی سے کودا ہو۔ پھر خشک پتے اور ٹہنیاں چرچرانے لگیں۔ کوئی میری طرف آرہا تھا۔ خوف سے میری گھگھی بندھ گئی۔

روشنی کا سیلاب ایک بار پھر امڈا اور میں اس میں نہا گئی۔ میں نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ چند لمحے سکوت طاری رہا تو میں نے ڈرتے ڈرتے آنکھوں سے ہاتھ ہٹایا اور تب مجھے احساس ہوا کہ وہ ایک طاقتور ٹارچ تھی جس کی روشنی مجھ پر مرکوز تھی لیکن جس شخص نے اسے تھام رکھا تھا' اس کا چہرہ مجھے نظر نہیں آرہا تھا۔ صرف ٹارچ پر جما ہوا اس کا ہاتھ اور نیچے دو بے ہنگم جوتوں کی جھلک دکھائی دی۔

"تم کیا مخلوق ہو بھئی۔" بالآخر اس شخص کی بھاری اور بارعب آواز ابھری۔ "چڑیل' ڈائن یا پگلی؟"

"میں... میں عورت ہوں۔" بے اختیار میرے حلق سے لرزتی سی آواز نکلی۔

"عورت؟" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "کس کی عورت ہو...؟" پھر وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔ "بھوتنی اور چڑیلیں تو بہت دیکھی تھیں لیکن شیطان آج پہلی مرتبہ دیکھی ہے۔" پھر وہ ڈپٹ کر بولا۔ "اگر تم صحیح الدماغ ہو تو ٹھیک بتاؤ تم کون ہو؟"

"میں ایک... مصیبت زدہ عورت ہوں۔" میری آواز خود بخود بھرا گئی۔ "خدا کے لیے میری مدد کرو۔" میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

"میں نے ابھی جس شیرنی کے دھوکے میں تم پر گولی چلائی تھی' اگر وہ نشانے پر لگ گئی ہوتی تو تمہاری ساری مصیبتوں کا خاتمہ ہو جاتا اور عین ممکن ہے کہ وہ شیرنی اب بھی اس طرف آ نکلے اور تمہارے ساتھ ساتھ میری مصیبتوں کا بھی خاتمہ ہو جائے۔" اس شخص نے اب قدرے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ویسے بائی دی وے میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

اس سوال کا مجھے کوئی جواب نہ سوجھا۔ حقیقتاً مجھے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ مجھے کس قسم کی مدد کی ضرورت ہے۔ میں خالی خالی نظروں سے چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ ٹارچ کی روشنی کے عقب میں اب مجھے اس کے دھندلے دھندلے خدوخال نظر آنے لگے تھے۔ وہ چوڑے کندھوں والا ایک دراز قد اور جسیم آدمی تھا۔ عمر اور نقوش کا کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کیونکہ اس کے سر پر ہیٹ موجود تھا' تاہم اس کی گھنی مونچھوں کی جھلک نظر آتی تھی۔

میں نے اپنے زنگ آلود ذہن پر بہت زور دیا کہ مجھے اس کے سوال کا کیا جواب دینا چاہیے۔ بالآخر میرے منہ سے نکلا۔ "مجھے چند دن کے لیے پناہ دے دو... کہیں چھپا لو۔"

اس نے ٹارچ کی روشنی کا زاویہ بدلا اور غالباً ایک بار پھر میرا سراپا جائزہ لیا اور ہنکارا سا بھرتے ہوئے کہا۔ "کہاں سے بھاگ کر آئی ہو؟"

میں شاید اسے بتانے ہی لگی تھی کہ میں کہاں سے اور کس طرح آئی ہوں کہ یک لخت میرے ہوشیار ذہن نے مجھے خبردار کیا کہ یہ شخص مجھے پکڑ کر دوبارہ محل میں نہ پہنچا دے۔ ایک لمحے کے لیے میں گڑبڑا سی گئی' پھر سنبھل کر بولی۔ "میں... میں دراصل ایک بے سہارا عورت ہوں اور اپنے کچھ عزیزوں کے ظلم و ستم سے تنگ آکر فرار ہو گئی ہوں۔ دربدر بھٹک کر ادھر آ نکلی ہوں... تم دیکھ رہے ہو' انہوں نے مجھے کس حال کو پہنچا دیا ہے۔"

"ہمم!" اس نے ایک بار پھر ہنکارا بھرا' گویا سوچ میں پڑ گیا ہو۔ پھر اس نے ٹارچ بجھا دی۔ سارا وجود ایک بار پھر بحر ظلمات میں ڈوب گیا... محض چند لمحوں تک تیز روشنی کا سامنا کرنے سے میری آنکھوں میں درد سا ہونے لگا تھا۔ اندھیرے میں اس شخص کے گہری گہری سانسیں لینے کی آواز مجھے سنائی دے رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ ہوا میں کچھ سونگھنے کی

کوشش کر رہا تھا۔

"اٹھو میرا ہاتھ پکڑ لو۔" بالآخر اندھیرے کی آغوش سے اس کی کوئیلی آواز ابھری گو اس کا ہاتھ ہی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے خود ہی جھک کر مجھے بازو سے پکڑ کر اٹھایا پھر مضبوطی سے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔ "میرے ساتھ چلتی آؤ۔"

اس کی رہنمائی میں میرا سفر شروع ہو گیا۔ تقریباً ایک گھنٹہ چلتے رہنے کے بعد چھدرے درختوں کا سلسلہ شروع ہوا اور تب مجھے معلوم ہوا کہ آسمان پر پورا چاند نکلا ہوا تھا۔ چھدرے درختوں کا سلسلہ جلد ہی ختم ہو گیا اور ہم ایک پگڈنڈی پر آ گئے جس کے دونوں طرف کہیں جھاڑیاں' کہیں جھنڈ اور کہیں اکا دکا درخت تھے۔ اب اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور میں اس کے برابر چلنے لگی۔

ایک دو بار ہم نے خالی خالی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر اپنے اپنے دھیان میں چلنے لگے۔ بظاہر وہ کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا لیکن نہ جانے کیوں بڑا چوکنا اور گرد و پیش سے باخبر معلوم ہوتا تھا۔ اس کی عمر تیس اور پینتیس کے درمیان ہوگی۔ رنگت سلیٹ جیسی تھی۔ آنکھیں بھوری تھیں اور دھندلی دھندلی سی چاندنی میں بھی بلا کی چمکیلی نظر آتی تھیں۔ وہ خیالے سے رنگ کی ایک کھردری' چست پتلون اور بند گلے کا چمڑے کا کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ ایک ہاتھ میں بندوق تھی۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟" میں نے محض سکوت توڑنے کے لیے پوچھا۔

اس نے گردن گھما کر یوں میری طرف دیکھا جیسے میرا سوال اسے نہایت احمقانہ لگا ہو' پھر مدھم آواز میں کہا۔ "جہاں میں ٹھہرا ہوا ہوں۔" پھر ایک لمحے کے توقف سے بولا۔ "یہاں سے تقریباً ایک کوس کے فاصلے پر کوئی ریاست کا کھنڈر نما گڑھی خراب ہے۔ اس سے تقریباً ایک فرلانگ پہلے وہ مکان آتا ہے جہاں میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ اس سے پہلے کہ تم مزید سوالات کرو' میں تمہیں خود ہی بتا دوں۔ میرا نام شوکت محسن ہے اور میں اصل رہنے والا کلکتہ کا ہوں۔ ایک آدم خور شیرنی کا چرچا سن کر تقریباً ایک ماہ پہلے یہاں آیا تھا' تب سے اب تک میرا خیال ہے کہ میں جنگل کے سارے جانوروں کو مار چکا ہوں' سوائے اس شیرنی کے۔ پہلے تو مجھے اس کے وجود کا یقین ہی نہیں تھا کیونکہ اس علاقے میں شیر نہیں پائے جاتے لیکن یہ شیرنی تمہاری طرح نہ جانے کہاں سے بھٹکتی ہوئی آ نکلی ہے۔ بہرحال اب مجھے اس کے وجود کا یقین آگیا ہے کیونکہ پرسوں شب میں نے اسے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور میری گولی سے شاید اس کی ایک پچھلی ٹانگ بھی زخمی ہوئی ہے لیکن اس کے بعد سے وہ غائب ہو گئی ہے۔ کوئی سراغ نہیں مل رہا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ زیادہ زخمی ہو گئی ہو اور کسی کھوہ میں پڑی موت کا انتظار کر رہی ہو۔"

اس کا انداز گفتگو خاصا شگفتہ اور دوستانہ تھا لیکن اس کا [illegible] نہ جانے کیوں مجھے

تکلیف دہ محسوس ہوئی۔

"تم اسے کیوں مارنا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔ اس نے ایک بار پھر یوں میری طرف دیکھا گویا اسے ایسے احمقانہ سوال کی قطعاً توقع نہ رہی ہو۔

"اس لیے کہ میں ایک شکاری ہوں۔" ایک گہری سانس لے کر اس نے گویا سمجھاتے ہوئے کہا۔ "شوقیہ شکاری۔ گو کہ میں کوئی نوابزادہ نہیں ہوں لیکن بس اس شوق میں پڑ گیا ہوں اور اس سے پہلے میں نے کوئی شیر یا شیرنی نہیں ماری۔ ویسے بہتر ہوتا کہ تم مجھ سے یہ سوال کرنے کے بجائے اس شیرنی کو ڈھونڈ کر اس سے یہ پوچھتیں کہ وہ گڑھی خراب کے تمام نزاروں کو ہڑپ کرنے پر کیوں تلی ہوئی ہے۔"

پھر اس نے چلتے چلتے بندوق کندھے سے لٹکا کر ایک لمحے کے لیے ہیٹ اتار کر سر کھجایا۔ تب میں نے دیکھا کہ اس کے بال بھورے اور لمبے تھے اور کھلنڈرے لڑکوں کی طرح بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے ہیٹ دوبارہ سر پر رکھ کر گہری گہری نظروں سے میری طرف دیکھا' پھر راستے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے ایک لمحے کے توقف کے بعد اچانک پوچھا۔ "تم پاگل تو نہیں ہو؟"

میں سمجھ نہیں سکی کہ اس نے یہ سوال سنجیدگی سے کیا تھا یا یہ بھی اس کے مخصوص انداز گفتگو کا ایک حصہ تھا۔

"تمہیں یہ پوچھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟" میں نے پوچھا۔

"ویسے ہی... احتیاطاً پوچھ رہا تھا۔" اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ پھر اپنی گھنی مونچھوں کو بل دیتے ہوئے بولا۔ "دراصل مجھے پاگل عورتوں سے بڑا ڈر لگتا ہے۔"

"میں پاگل نہیں ہوں۔" میں نے کہا "البتہ کچھ عرصہ اور مجھے قرار کا موقع نہ ملتا تو شاید ہو جاتی۔"

"ہم ہندوستانی بہت پسماندہ ہیں۔" اس نے مدھم سی آواز میں گویا اپنے آپ سے کہا۔ "ہمارے ہاں عورت پر بہت ظلم ہوتا ہے۔ تمہاری حالت دیکھ کر مجھے یقین نہیں آرہا کہ تم کسی جگہ سے آئی ہو جہاں سے انسانوں کا بھی گزر تھا۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ فی الحال میں اس مقام اور ان حالات کا تصور ذہن میں نہیں لانا چاہتی تھی جن سے میں گزر کر آرہی تھی ورنہ میں شاید پھوٹ پھوٹ کر رو پڑتی۔ ہم خاموشی سے چلتے رہے۔

ایک موڑ پر آکر اس نے پگڈنڈی چھوڑ دی اور دائیں ہاتھ چل دیا۔ اب ہم ایک کھلے میدان میں چل رہے تھے۔ ہوا ساکت تھی اور قدرے اوس پڑ رہی تھی۔ زخمی پیروں کو نرم نرم' خنک اور نم آلود گھاس کا لمس مجھے اچھا محسوس ہونے لگا۔ کافی دیر میدان میں چلتے رہنے کے بعد جیسے اچانک ہی ہم درختوں کے ایک جھنڈ کے قریب پہنچ گئے۔ اس جھنڈ

کے درمیان ایک نیم پختہ مکان کی چار دیواری نظر آ رہی تھی۔

دروازے پر پہنچ کر شوکت حسن نے دستک دی۔ تیسری دستک کے بعد اندر آہٹ سنائی دی اور خفگی سے بوجھل نسوانی آواز میں پوچھا گیا۔ "کون ہے؟"

"تیرے والد بزرگوار!" شوکت نے بہ آواز بلند کہا۔ "جلدی سے دروازہ کھول۔"

کنڈی گرنے کی آواز آئی۔ دروازہ کھولنے والا واسکٹ اور دھوتی میں ملبوس گٹھے ہوئے جسم کا ایک ادھیڑ عمر کا سانولا سا آدمی تھا۔ کھچڑی سی داڑھی، چندھی چندھی آنکھیں اور موٹے موٹے ہونٹ مگر اس کے چہرے پر معصومیت کا پرتو تھا۔ وہ ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے میں لاٹھی اٹھائے ہوئے تھا۔

"خیریت تو ہے ملک صاحب؟" دروازہ کھولتے ہی اس نے پوچھا اور اسی لمحے اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ وہ ہڑبڑا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"تیری روح کہاں فنا ہو گئی نذرو؟ یہ شیرنی تو نہیں ہے۔" شوکت نے اسے ایک طرف ہٹایا اور میرا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گیا۔ نذرو سر جھکائے پیچھے آ رہا تھا۔

صحن عبور کرکے ہم ایک وسیع کمرے میں داخل ہوئے جہاں طاق میں ایک اونچا سا کیروسین لیمپ روشن تھا۔ دیوار کے ساتھ ایک لمبے چوڑے دیوان پر بستر لگا ہوا تھا۔ وسط میں ایک گول تپائی کے گرد موٹے موٹے تختوں سے بنی ہوئی چند کرسیاں پڑی تھیں۔

"نذرو!" شوکت نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "جلدی سے کنویں سے پانی نکال کر بالٹیاں بھر اور اس دکھیاری لڑکی کے نہانے دھونے کا بندوبست کر۔ پہننے کے لیے اسے میرے شب خوابی کے کپڑے دے دے اور پھر اس کے لیے کھانے اور چائے کا بندوبست کر۔" نذرو سعادت مندی سے سر ہلاتا ہوا باہر چلا گیا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد جب میں غسل خانے سے نکلی تو ڈھیلی ڈھالی مگر صاف ستھری نائٹ شرٹ اور پاجامے میں مجھے اپنا وجود روئی کے گالے کی طرح سبک لگ رہا تھا۔ کنویں کا پانی نہایت فرحت بخش تھا اور خوشبودار صابن کے ڈھیروں جھاگ کے ساتھ میرے جسم سے چپٹی ہوئی مدتوں کی غلاظتیں بہہ گئی تھیں۔ نذرو نے مجھے ایک دوسرے کمرے میں پہنچا دیا جس کا فرش کچا مگر صاف ستھرا تھا۔ ایک طرف بنی سی چارپائی تھی جس پر سلیقے سے بستر لگا ہوا تھا۔

"آپ کنگھی وغیرہ کر لیں بی بی جی! میں اتنی دیر میں کھانا لاتا ہوں۔" نذرو نے ایک دیوار کی طرف اشارہ کیا جس پر ایک لمبا سا آئینہ آویزاں تھا اور قریب ہی ایک طاق میں کنگھا رکھا ہوا تھا۔ مدتوں بعد میں نے آئینے میں اپنی شکل دیکھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ کچھ دیر پہلے تک میں کیسی لگ رہی تھی۔ پھر بھی اپنا آپ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی مصور نے اپنی بھولی بسری [illegible] مگر نامکمل تصویر کو جھاڑ پونچھ کر نئے رنگوں سے اس کے خدوخال از سر نو ابھارے ہوں۔

کنگھی کرکے میں بالوں کا جوڑا بنا کر پلٹی تو شوکت کو دروازے میں کھڑا پایا۔ وہ کپڑے بدل چکا تھا اور کرتے پاجامے میں پہلے سے مختلف لگ رہا تھا، پختہ اور جہاں دیدہ سا۔ جیسے اس کی عمر میں چند برس کا اضافہ ہو گیا ہو۔ اس کی آنکھوں میں تھکن بھی تھی اور بے

چیخی بھی۔

"یہ تم ہی ہو ... کیا نام بتایا تھا تم نے اپنا؟" اس نے تیزی سے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔

"عزیزہ!" میں نے سر جھکا کر آہستگی سے جواب دیا۔

"ہاں ... عزیزہ! تمہاری تو جون ہی بدل گئی۔" اس نے چوکھٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ میں خاموش رہی۔ دفعتاً اس کے پیچھے نذرو نمودار ہوا۔

"میں نے بڑے کمرے میں کھانا لگا دیا ہے بی بی جی!" اس نے اطلاع دی۔ شوکت کے پیچھے چلتی ہوئی میں دوبارہ اس کمرے میں پہنچی جہاں کرسیاں وغیرہ پڑی تھیں۔ تپائی پر ایک ٹب میں بھنا ہوا گوشت اور چنگیر میں بڑی بڑی روٹیاں رکھی تھیں۔ میں نے حتی الامکان صبر اور شائستگی سے کھانے کی کوشش کی لیکن اپنے ندیدے پن پر قابو نہ رکھ سکی۔ شوکت باہر جانے سے پہلے کھانا کھا چکا تھا۔ اب صرف چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے مجھے دلچسپی سے کھاتے دیکھ رہا تھا۔

کھانے اور چائے سے فارغ ہوتے ہی مجھ پر ایک عجیب سرور آمیز غنودگی طاری ہونے لگی، جیسے ایک مدت تک صحراؤں میں آبلہ پا سفر کرنے کے بعد کوئی مسافر یک لخت آسودگیوں کے گلستان میں پہنچ کر اونگھنے لگے۔

شوکت کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "اب تم اسی چھوٹے کمرے میں جا کر سو جاؤ، باقی باتیں کل ہوں گی۔" وہ کہہ رہا تھا۔

میں شوکت کی ڈھیلی ڈھالی چپلوں کو گھسیٹتی ہوئی چھوٹے کمرے میں آگئی اور کنڈی لگا کر بستر پر ڈھیر ہو گئی۔ عام سا بستر اس وقت مجھے پھولوں کی سیج سے زیادہ آرام دہ اور مخمل کے گدوں سے زیادہ دبیز محسوس ہو رہا تھا۔ سب سے زیادہ فرحت مجھے اس بات میں محسوس ہو رہی تھی کہ اس پر میں ٹانگیں پوری طرح پسار کر لیٹ سکتی تھی۔ اس لذت و فرحت کا اندازہ وہی شخص کر سکتا ہے جو دو سال تک سرد پتھریلے فرش پر چار فٹ سے بھی کم جگہ میں سکڑ سمٹ کر سوتا رہا ہو۔ چند لمحے بعد میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئی۔

اگلے روز میں کمرے سے نکلی تو دیکھا صحن میں تیز چمکیلی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ چند لمحے تک تو اس دھوپ میں میری آنکھیں ہی نہ کھلیں، پھر جب تک آنکھیں مانوس ہوئیں تو میں نے دیکھا نذرو ایک گوشے میں چھپر تلے بیٹھا چولہے پر دودھ گرم کر رہا تھا۔ یہ گوشہ شاید مکان کا باورچی خانہ تھا۔ نذرو نے بتایا کہ صاحب چند آدمیوں کے ساتھ جنگل کی طرف گئے ہیں البتہ وہ اسے ایک کام کہہ گئے تھے جو اس نے کر دیا ہے۔

"کیا کام نذرو؟" میں نے پوچھا۔

"صاحب کہہ گئے تھے کہ میں آپ کے لئے ایک جوڑے کپڑوں کا بندوبست کر دوں۔"

اس نے پتیلی چولہے سے اتارتے ہوئے جواب دیا۔ "وہ میں گاؤں سے لے آیا ہوں۔" وہ اٹھ کر بڑے کمرے کی طرف گیا اور چند لمحے بعد کھدر کا تھیلا اٹھائے باہر آیا۔

"اس میں دو زنانہ جوڑے ہیں۔" اس نے تھیلا میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میں زنوبے سے استعمال شدہ لیکن اچھے ہیں اور میرا خیال ہے کہ آپ کو پورے بھی آئیں گے۔"

میں نے کپڑے تھیلے سے نکال کر دیکھے، پھولدار ریشمی شلوار اور قمیض تھی۔ ایک دوپٹہ اور ایک زنانہ چپلی بھی تھیں۔ نہا دھو کر میں نے ان میں سے ایک جوڑا پہنا۔ اس میں اگر کوئی خامی تھی بھی تو کم از کم اس وقت مجھے محسوس نہیں ہوئی۔ میں نے تو گویا ایک نیا جنم لیا تھا اور ہر چیز ہی میرے لئے نعمت سے کم نہیں تھی۔ ناشتہ کر کے جو دراصل دوپہر کا کھانا تھا، میں ایک بار پھر سو گئی۔ نہ جانے کیوں مجھے بے تحاشہ نیند آئے جا رہی تھی۔

دوبارہ جب میری آنکھ کھلی تو شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ صحن میں مجھے کوئی نظر نہ آیا تو میں بڑے کمرے میں چلی گئی اور دیکھا شوکت سامنے بوتل کو سامنے رکھے، جام سنبھالے بیٹھا تھا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی جوشیلے انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"تمہارے قدم بہت مبارک ہیں۔" وہ تقریباً چلا اٹھا۔ "آج میں نے شیرنی مار ہی لی۔ بڑا ہنگامہ رہا بھئی۔ تصویریں کھنچیں، گاؤں میں باقاعدہ میرا جلوس نکالا گیا، ہار پہنائے گئے، یہاں بھی لوگ مبارکباد دینے آ رہے ہیں۔ نمبردار بھی میرے ساتھ ہی آیا تھا، ابھی گیا ہے۔"

"لاش کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"کھال میں نے اتار کر محفوظ کر لی ہے۔ لاش ناظم جنگلات کو بھیج دی گئی۔ وہاں سے باقاعدہ رپورٹ تیار ہو کر کلکٹر صاحب کو جائے گی۔" اس نے بڑے مسرور اور مخمور لہجے میں بتایا۔ پھر چونکتے ہوئے بولا۔ "ارے تم کھڑی کیوں ہو، آؤ بیٹھو نا۔ آج میں بہت خوش ہوں۔"

اس نے گلاس میں بچی ہوئی شراب ایک ہی گھونٹ میں حلق میں انڈیلی اور دوسرا جام تیار کرنے لگا۔ میں بیٹھ گئی تو اس نے سرتاپا میرا جائزہ لیا اور جب اس کا جوش و خروش ذرا کم ہوا تو ذرا ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔ "تمہارا کیا پروگرام ہے؟ میں تو شاید پرسوں تک یہاں سے روانہ ہو جاؤں۔"

میرا دل ڈوب سا گیا۔ "کہاں جا رہے ہو؟" میں نے بمشکل پوچھا۔ "یہاں سے تو گھر جاؤں گا۔ چند دن آرام کر کے آگے کا پروگرام بناؤں گا۔" اس نے جواب دیا۔ میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ میں اسے کیا بتاتی کہ میرا پروگرام کیا تھا۔ ابھی تو میں آزادی کے احساس سے بھی پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو چکی تھی۔

"تمہارا کوئی ایسا عزیز' رشتے دار نہیں' جس کے پاس تم جانا چاہو۔" چند چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرنے کے بعد اس نے پوچھا

میں نے خاموشی سے نفی میں سر ہلایا۔

"عزیزہ!" دفعتاً" اس نے سرگوشی سی کی۔ "تم... تم مجھے بہت اچھی لگی ہو... میرے بس میں ہوتا تو میں تم سے شادی کر لیتا لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میں شادی شدہ ہوں۔ میرے تین بچے ہیں جن میں سے دو بیاہے ہو چکے ہیں اور میری بیوی بڑی پٹھے خان کی بیٹی ہے۔ وہ یہ تو برداشت کر سکتی ہے کہ مجھے کوئی آدم خور شیر کھا جائے لیکن یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ میں دوسری شادی کر لوں۔"

"اگر تم شادی شدہ ہو تو حالات خواہ کتنے ہی موافق ہوتے' میں کبھی تم سے شادی نہ کرتی۔" میں نے مدھم لہجے میں کہا اور جانے کے لیے اٹھنے لگی تو اس نے بے تابی سے ہاتھ ہلا کر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"بیٹھو' بیٹھو۔ مجھے کچھ سوچنے کا موقع دو شاید میرے ذہن میں کوئی تدبیر آجائے۔" اس نے کہا۔

میں بیٹھ گئی۔ وہ جام پر جام خالی کرنے لگا اور ایک ٹک مجھے دیکھتا رہا' اس کی تانبے کی سی رنگت کچھ اور گہری ہو گئی تھی اور آنکھوں میں سرخی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں منتظر نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ بہت وقت گزر گیا۔ بوتل آدھی سے زیادہ خالی ہو گئی تھی لیکن اس کا سکوت نہ ٹوٹا۔

اس کی آنکھوں میں عجیب عجیب سائے لہرا رہے تھے کہ اس کے اندر نہ جانے کیا کیا جذبوں کا کاروزار گرم ہے۔ تھک کر میں بے چینی سے پہلو بدلنے لگی تو وہ کرسی دھکیل کر اٹھا جیسے اچانک کسی فیصلے پر پہنچ گیا ہو۔ غیر متوازن سے قدموں سے دروازے تک جا کر اس نے کنڈی چڑھا دی۔ میری دھڑکنیں یک لخت تیز ہو گئیں اور کنپٹیوں میں دھماکے سے ہونے لگے۔

وہ واپس آکر میری کرسی کے عقب میں کھڑا ہو گیا اور اچانک اس نے دونوں ہاتھ مضبوطی سے میرے کندھوں پر رکھ دیے۔ "عزیزہ!" اس نے میرے کان کے قریب سرگوشی کی۔ اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی اور آواز کی تہہ میں کوئی درندہ بول رہا تھا۔ یک بیک ہی اس میں کوئی تبدیلی آگئی تھی۔

"یہ بیٹھے بیٹھے تمہیں کیا ہو گیا ہے۔؟" میں نے سخت لہجے میں کہا اور اس کے ہاتھ کندھوں سے ہٹانے کی کوشش کی مگر اس کی گرفت مضبوط تھی۔

"تم نے مجھے پاگل کر دیا ہے عزیزہ۔ اب مجھے نہ ترساؤ۔" یک لخت اس نے نہ جانے کس طرح مجھے اٹھایا اور دیوان پر لے جا پٹخا۔ پھر وہ عقاب کی طرح مجھ پر جھپٹا۔

"شوکت...!" میں بلبلا اٹھی۔ "مجھے معاف کر دو۔ مجھ میں اب کسی کی ہوس کا نشانہ بننے کی سکت نہیں ہے... شوکت..." پھر میری آواز گھٹ کر رہ گئی۔ اس کے منہ سے اٹھتے ہوئے شراب کے بھبکے میرے حواس کو مختل کر رہے تھے۔ میں نے بہت مزاحمت کی۔ اس کی دست درازیوں کا سیلاب روکنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ بہت طاقتور تھا۔ دفعتاً" میرے گھٹنے کسی طرح اس کے پیٹ سے ٹکرائے اور وہ دیوان سے نیچے جا گرا۔ میں اٹھی تو میری پشت دیوار سے جا ٹکرائی اور کوئی بھاری سی چیز دیوار سے علیحدہ ہو کر میرے کندھے سے ٹکرائی ہوئی پیروں کے قریب آگری۔ میں نے لپک کر اسے اٹھا لیا۔ یہ شوکت کی رائفل تھی۔

میں نے رائفل سیدھی ہی کی تھی کہ شوکت دیوار پر چڑھ کر دیوانہ وار مجھ پر جھپٹا۔ ایک جھٹکے سے لبلبی دب گئی۔ دل دہلانے والے دھماکے کے ساتھ ہی مجھے زبردست دھچکا لگا اور میں دیوار کے ساتھ ٹکرا کر دیوان پر گر گئی۔ میرا کندھا گویا جسم سے علیحدہ ہو گیا تھا۔ میں سمجھی کہ گولی مجھے لگ گئی ہے لیکن دوسرے ہی لمحے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا تو میں نے دیکھا شوکت فرش پر چاروں شانے چت پڑا تھا اور اس کی آدھی کھوپڑی' ایک آنکھ اور ناک کا کچھ حصہ غائب تھا۔ ابل ابل بہتے خون اور بھیانک زخم کے رخ اس کا ادھورا چہرہ نہایت خوفناک لگ رہا تھا۔

رائفل اب بھی میرے ہاتھ میں تھی اور مجھ میں گویا اٹھنے کی سکت ہی نہیں رہی تھی۔ پھر جیسے میں کسی ارادے خواب سے جاگی اور اٹھ کر دروازے کی طرف بھاگی۔ کنڈی کھول کر میں نے صحن میں قدم رکھا لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے رک جانا پڑا' تذرو میرا راستہ روکے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے کی معصومیت کہیں غائب ہو چکی تھی اور وہ ہونٹ بھینچے اپنی چندھی چندھی آنکھوں سے ایک ٹک مجھے گھور رہا تھا۔

ایک لمحے کے لیے تو ہم آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ساکت کھڑے رہے' پھر وہ مجھ پر جھپٹا۔ دفعتاً" میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا اور تذرو کی اصل شکل گویا میرے سامنے سے غائب ہو گئی۔ وہ مجھے دوسرا شوکت نظر آیا۔ اسی لمحے مجھے احساس ہوا کہ رائفل میرے ہاتھ میں ہے۔

میرے بازو پوری قوت سے گھومے اور رائفل کا کندا تذرو کی کنپٹی اور رخسار پر پڑا۔ وہ ایک ہاتھ کنپٹی پر رکھ کر بری طرح لڑکھڑایا۔ اب مجھ میں اپنے دفاع کی حس اور احتیاط بیدار ہو چکا تھا۔ اب تک میں نے غیر ارادی سے انداز میں ہاتھ پاؤں چلائے تھے۔ اب میں نے باقاعدہ ہوش و حواس سے کام لیتے ہوئے رائفل کو نال کی طرف سے پکڑا اور اس کے کندے سے کلہاڑی کی طرح تذرو کے سر پر وار کیا۔ اس مرتبہ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی کراہ سی نکل گئی۔ سر تھامنے کے لیے اس نے دونوں ہاتھ اٹھائے لیکن یہ ہاتھ سر تک

نہ پہنچ سکے اور وہ لڑکھڑا کر چت ہو گیا۔ خون کی ایک تیز دھار اس کے بالوں کی جڑوں سے ہوتی ہوئی کان کی لو تک بہہ آئی تھی۔ میں نے رائفل وہیں پھینکی اور اس کا بے حس و حرکت جسم پھلانگ کر دروازہ کھول کر باہر آگئی۔

مکان سے کافی دور نکل آنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ ارد گرد تو دور تک سناٹا طاری تھا۔ میں چاہتی تو مکان میں ہی رہ سکتی تھی اور دن نکلنے کے بعد کہیں کا رخ کر سکتی تھی لیکن پھر مجھے شوکت کی لاش کا خیال آیا۔ ادھورے اور بھیانک چہرے والی اس لاش کی موجودگی میں مجھے اس مکان میں رات گزارنے کا تصور بھی ناممکن محسوس ہوا اور پھر نذیر کے بارے میں مجھے صحیح طور پر معلوم نہیں تھا کہ وہ بھی مر گیا ہے یا صرف بے ہوش ہوا ہے۔ رات کو یا صبح ہی صبح اگر کوئی مکان کی طرف آتا تو میرے لیے کوئی راہ فرار نہ رہتی' اس لیے میں نے مکان کی طرف واپس جانے کا خیال ہی دل سے نکال دیا اور سیدھی چلتی رہی۔ کچھ دیر بعد میں سڑک پر پہنچ گئی۔ اتنا مجھے اندازہ تھا کہ شوکت کے ساتھ میں کس سمت سے آئی تھی۔ میں نے اس سے مخالف سمت میں چلنا شروع کر دیا۔

کچھ دیر بعد اپنے عقب میں گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ فوری طور پر میں سہم کر پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر سڑک سے نیچے میں اتر کر نشیب میں بھاگنے ہی والی تھی کہ غیر ارادی طور پر مڑ کر دیکھ لیا۔ دھندلی چاندنی میں' میں نے دیکھا کہ ایک گھوڑا ہلکی چال سے آرہا تھا' گویا اس کے کوچوان کو کوئی خاص عجلت نہیں تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے ڈھارس سی ہوئی کہ گاڑی پر کوچوان اکیلا ہی تھا۔

میں نے بھاگنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور اپنے آپ کو حتی الامکان پرسکون ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے سڑک کے کنارے کنارے چلنے لگی۔ گھوڑا گاڑی بالکل قریب آپہنچی تو میں رک گئی اور اس کی طرف مڑ کر کھڑی ہو گئی۔ کوچوان ایک دبلا پتلا ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ معمولی تہمد اور کرتے میں ملبوس تھا' سر پر مختصری پگڑی تھی۔ اس کی مونچھیں سفیدی مائل اور رنگت گہری سانولی تھی۔ قریب پہنچتے ہی اس نے گھوڑا گاڑی کی رفتار کچھ اور کم کر دی اور ٹھٹکے ہوئے کھڑے شک آلود سی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"کہاں جا رہے ہو چاچا؟" میں نے جی کڑا کر کے حتی الامکان سرسری لہجے میں کہا۔

"رحیم آباد' کیوں؟" کوچوان نے گھوڑے کی لگامیں کھینچ لی تھیں۔

"کہاں ریلوے سٹیشن ہے؟" میں نے پوچھا اور فوراً ہی مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا کہ یہ سوال مجھے اس علاقے میں قطعی طور پر اجنبی ثابت کر رہا تھا۔ بہرحال اب تو الفاظ منہ سے نکل چکے تھے۔

"ہاں ہے تو سہی۔" گاڑی والے نے الجھن زدہ سے لہجے میں جواب دیا۔ "لیکن میں سٹیشن نہیں' غلہ منڈی جا رہا ہوں۔ دونوں کے درمیان کافی فاصلہ ہے۔"

"اگر تم مجھے سٹیشن چھوڑ دو تو تمہاری بہت مہربانی ہوگی چاچا!" میں نے ملتجیانہ سے لہجے میں کہا۔

اس نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا' پھر سر کے اشارے سے گاڑی پر چڑھنے کی اجازت دے دی۔ میں گاڑی پر چڑھ کر بوریوں کے قریب سکڑ سمٹ کر بیٹھ گئی۔ گاڑی ایک بار پھر چل پڑی' رات کے سناٹے میں صرف گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز گونج رہی تھی۔

"گھر سے بھاگ کر آئی ہو؟" چند لمحے بعد گاڑی والے نے مڑ کر میری طرف دیکھے بغیر انتہائی سنجیدگی سے پوچھا۔ اس نے کچھ یوں اچانک یہ سوال کیا تھا کہ میں اچھل پڑی۔

"نہیں تو۔" میں نے جلدی سے جواب دیا۔ "نہیں۔۔۔ میں دراصل ایک مصیبت زدہ لڑکی ہوں اور بھٹک کر اس علاقے میں آنکلی ہوں۔ میری کہانی بہت لمبی ہے۔"

"اگر تم مصیبت زدہ ہو تو میرے ساتھ چلو۔ مجھ سے جو ہو سکا' میں تمہاری مدد کروں گا۔ میری گھر والی بھی دل کی بہت اچھی ہے۔" وہ بظاہر عام سا آدمی تھا لیکن اس کی آواز خاصی بارعب تھی۔

"نہیں' نہیں۔" اضطراری طور پر میں تقریباً چلا اٹھی اور جب گاڑی والے نے مڑ کر عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا تو میں نے قدرے خفت سے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔ "میں کسی کے گھر نہیں جا سکتی۔ میں اب بس اپنے گھر جانا چاہتی ہوں۔"

"تمہاری مرضی۔" اس نے لاپروائی سے کہا اور گھوڑے کو ٹہوکا دے کر اس کی رفتار کچھ تیز کر دی۔ دھندلی چاندنی میں ویران رستے پر سفر جاری تھا۔ اسی دوران سڑک سے کافی ہٹ کر کھیتوں میں گھرے ہوئے دو ایک گاؤں بھی نظر آئے۔ گاڑی والا اب گویا میرے وجود سے بالکل بے خبر تھا۔ وہ گلی پھوڑے ایک بوری سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے بے آواز بلند پنجابی میں رخصتی کا ایک گیت گانا شروع کر دیا۔ ایک آدھ بول گا کر ہی شاید اپنی آواز کے بے سرے پن یا شاید گیت کی ناموزونیت کو محسوس کرتے ہوئے وہ چپ ہو گیا۔

سفر تقریباً ایک گھنٹہ جاری رہا ہوگا اور سات آٹھ میل کا فاصلہ طے ہوا ہوگا' جب ہم ایک آبادی میں داخل ہوئے۔ یہ ایک اچھا خاصا شہر تھا۔ مکانات پختہ اور سڑکیں چوڑی تھیں۔ یہاں بھی چاروں طرف سناٹا تھا۔ رات خاصی بیت چکی تھی۔ میں نے جھجکتے ہوئے گاڑی والے سے پوچھا۔ "غلہ منڈی تو اس وقت بند ہو چکی ہوگی' تم کس کے پاس لے جاؤ گے غلہ؟"

"میرا دراصل کام یہی ہے۔ میں تو ہمیشہ صبح سے ایک گاڑی سے غلہ ڈھو رہا ہوں۔ یہ میرا آخری پھیرا ہے۔ میں یہیں رحیم آباد کا رہنے والا ہوں۔" اس نے بھی میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

کچھ دیر بعد اس نے ایک پیلی سی بیچ دار عمارت کے سامنے گاڑی روک دی اور ناک کی سیدھ میں دیکھتے ہوئے بولا۔ "ریلوے اسٹیشن آگیا۔"

ایک بار پھر مجھ پر گھبراہٹ سی طاری ہو گئی اور اس گھبراہٹ میں' میں اس کا شکریہ ادا کرنا بھی بھول گئی۔ گاڑی سے اتر کر میں چھجے کے نیچے سے گزر کر گیٹ کی طرف بڑھی۔ تین چار سیڑھیاں چڑھنے کے بعد میں نے مڑ کر دیکھا۔ گاڑی والا گہری نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے مڑتے دیکھ کر اس نے گاڑی آگے بڑھا دی اور اسے گھما کر سے تاڑی سے واپس چل دیا۔

گیٹ پر کوئی نہیں تھا۔ گیٹ سے ذرا پہلے بائیں ہاتھ پر ٹکٹوں کی کھڑکی تھی۔ اس کے عقب میں ایک ٹکٹ کلرک کرسی پر نیم دراز سٹول پر پاؤں رکھے کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ آگے بڑھ کر میں نے پلیٹ فارم پر نظر دوڑائی۔ دائیں طرف ٹین کا بہت بڑا شیڈ تھا جس کے نیچے بنچوں پر چند افراد سکڑے سمٹے پڑے سو رہے تھے یا نیم غنودگی میں تھے۔ بائیں طرف پلیٹ فارم کا طویل حصہ ویران پڑا تھا۔ کافی دور ایک کھمبا کھڑا نظر آ رہا تھا جس پر پیلو کمیں لیمپ روشن تھا۔

سامنے ایک ٹرین کھڑی تھی جس کا بیشتر حصہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ چند ایک کھڑکیوں میں دھندلی دھندلی سی روشنی نظر آ رہی تھی۔ ان ڈبوں میں مسافر لکڑی کے تختوں والی سیٹوں یا فرش پر بستر بچھائے سو رہے تھے۔ ایک کھڑکی میں ایک عورت اپنے بچے کو کھڑکی سے لٹکائے پیشاب کروانے کی کوشش کر رہی تھی۔ گاڑی کی پرلی طرف دور دور تک اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ ماحول پر اس قدر سکوت طاری تھا کہ بے اختیار جی چاہتا تھا کہ کوئی چیز حرکت کرے' کوئی آواز پیدا ہو۔ ٹرین بھی یوں ساکت اور خاموش کھڑی تھی گویا اس نے برسوں سے اپنی جگہ سے حرکت نہ کی ہو۔

کئی ڈبوں کے قریب سے گزرتے ہوئے میں چھوٹے سے ڈبے کے ایک دروازے پر پہنچی جو کھلا تھا اور اندر دو لمبی گدے دار نہایت ہی آرام دہ نشستیں نظر آ رہی تھیں۔ بلا سوچے سمجھے میں نے اس فرسٹ کلاس ڈبے میں گھس کر دروازہ بند کر لیا اور اندر سے کنڈی بھی لگا لی۔ کافی دیر تک تو میں پہلی نشست پر اکڑی اکڑی سی بیٹھی رہی کہ ابھی کوئی درمیانی دروازے سے آئے گا اور مجھے گریبان سے پکڑ کر اتار دیا جائے گا یا مجھ سے الٹے سیدھے بے شمار سوالات کرے گا۔ جب میں کوئی تسلی بخش جواب نہ دے پاؤں گی تو مجھے پولیس والوں کے حوالے کر دے گا جو مجھے نجانے کہاں لے جائیں گے۔ شاید واپس وہیں کسی قید خانے میں جہاں سے میں فرار ہوئی تھی لیکن دیر تک نہ تو درمیانی دروازے سے کوئی آیا اور نہ ہی بیرونی دروازے پر کسی نے دستک دی۔

میرے جسم کا تناؤ کچھ کم ہو گیا لیکن الجھن بڑھنے لگی کہ آخر میں یہاں کیوں بیٹھی

ہوں اور یہ ٹرین کبھی چلے گی بھی یا نہیں؟ پھر مجھے یہ احساس ہوا کہ ذہن کے کسی اندھیرے گوشے میں یہ خواہش چھپی ہے کہ میں اس علاقے سے بہت دور کہیں نکل جاؤں۔ کسی ایسی جگہ جہاں کوئی یہ نہ جان سکے کہ میں نواب شرافت کے بندی خانے میں قید تھی یا شکاری شوکت اور اس کا ملازم میرے ہاتھوں قتل ہوئے ہیں۔

بیٹھے بیٹھے جب میری قوت برداشت جواب دے گئی اور میں اترنے کا ارادہ ہی کر رہی تھی کہ سیٹی کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں تذبذب کے عالم میں دوبارہ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ سیٹی کے جواب میں انجن نے وسل دی۔ سیٹی ایک بار پھر بجی اور تھوڑے سے وقفے سے انجن کی وسل بھی گونجی اور بالآخر ٹرین نے رینگنا شروع کر دیا۔

ٹرین نے رفتار پکڑی تو مجھے قدرے اطمینان سا محسوس ہونے لگا۔ مجھے اس سے غرض نہیں تھی کہ یہ اطمینان دیرپا ثابت ہو گا یا نہیں۔ لیپ کھڑکیوں سے تیز ہوا آنے لگی تھی۔ میں نے ان کے شیشے گرائے اور نشست پر نیم دراز ہو گئی۔ میں کچھ سوچنا چاہتی تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مجھ میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں۔ کھوپڑی میں دماغ کی جگہ محض ایک خلا رہ گیا ہے' حواس شل ہو چکے ہیں۔

میں اس وقت جبکہ میرے حواس پر جمی ہوئی برف دھیرے دھیرے پگھلنے لگی تھی' میرے سامنے باتھ روم کا دروازہ آہستگی سے کھلا اور دوسرے ہی لمحے میری چیخ نکل گئی۔ جب میں نے ایک نوجوان کو اپنے سامنے کھڑا پایا۔

"ششش۔" اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مضطرب لہجے میں کہا۔ "چیخ و پکار مچانے کی ضرورت نہیں ورنہ دونوں ہی مارے جائیں گے۔ میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔"

اس کے الفاظ پر غور کرتے ہوئے میں سنبھل کر نشست پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ وہ کسرتی جسم اور لمبے قد کا ایک وجیہہ نوجوان تھا۔ بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے لمبے گھنگھریالے بال' باریک تراشی ہوئی مونچھیں' گہری بادامی آنکھیں جن کی گہرائی میں اس وقت بھی شریر سی مسکراہٹ مچل رہی تھی۔ اس کی رنگت سرخی مائل تھی' رخساروں پر بڑھے ہوئے شیو کی نیلاہٹ۔ وہ سفید کرتے پاجامے پر واسکٹ اور سیاہ کوٹ پہنے ہوئے تھا جس کے بٹن اس وقت کھلے ہوئے تھے۔ پیروں میں [illegible] تھے۔

اس کے لباس پر کئی جگہ مٹی کے دھبے تھے۔ دفعتاً اس نے بالوں میں ہاتھ پھیرا اور میں نے دیکھا' اس کے ہاتھ کی پشت پر خراشیں تھیں۔ بہرحال اس ایک آدھ مشکوک سی نشانی سے قطع نظر وہ کسی بھی اعتبار سے کوئی چور اچکا یا ڈاکو نظر نہیں آتا تھا۔ میری کچھ ہمت بندھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس وقت مجھے اپنے آپ کو پراعتماد ظاہر کرنے کی ضرورت ہے۔

"دونوں ہی مارے جائیں گے سے تمہاری کیا مراد ہے؟" میں نے قدرے سخت لہجے

میں کہا۔ "مجھے کیوں اپنے ساتھ شامل کر لیا تم نے؟"

"اس لیے کہ تم بھی میری ہی طرح جان بچا کر بھاگتی نظر آ رہی ہو۔" اس نے سر تا پا میرا جائزہ لیا اور آگے بڑھ کر نشست کے ایک کونے پر بیٹھ گیا۔ میں اپنی جگہ کچھ اور سکڑ سمٹ گئی حالانکہ اس کے اور میرے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ "لیکن تم شکل سے انتہائی احمق نظر آ رہی ہو' بدحواسی تمہارے رونگٹے رونگٹے سے ٹپک رہی ہے۔ اس طرح تم جلد ہی پکڑی جاؤ گی اور اگر میرا ساتھ دو گی تو خود بھی بچ جاؤ گی اور مجھے بھی فائدہ پہنچے گا۔"

فوری طور پر میں کوئی جواب نہ دے سکی۔ وہ بڑے اطمینان سے نشست سے ٹیک لگا کر اپنی ناک کی سیدھ میں دیکھ رہا تھا۔ میں نے دزدیدہ نظروں سے اپنا جائزہ لیا۔ میرا ظاہری حلیہ لٹا پٹا نہیں تھا اس میں دو بڑے نقائص تھے۔ ایک تو اس وقت میرے پاؤں میں صرف ایک ہی چپل تھی اور پاؤں بری طرح گرد آلود تھے۔ دوسرے میرے سر پر دوپٹہ نہیں تھا حالانکہ باقی لباس کی مناسبت سے میں ایک گھریلو لڑکی نظر آ رہی تھی۔

"تم خواہ مخواہ اپنے ساتھ مجھے لپیٹ رہے ہو۔" میں نے مصنوعی خفگی ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ "میں بھلا کیوں پکڑی جاؤں گی؟ کون پکڑے گا مجھے؟ میں تو ایک کام کے سلسلے میں جا رہی ہوں۔"

"کہاں؟" اس نے فوراً میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا اور میں گڑبڑا گئی۔ یہ تو واقعی مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں جا رہی تھی یا جانا چاہتی تھی۔

میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور دوبارہ ناک کی سیدھ میں دیکھتے ہوئے بولا۔ "ضروری نہیں کہ خوبصورت لوگ جھوٹ بھی خوبصورت بول سکیں۔ خیر مجھے اس سے کیا۔ میں تمہیں سچ بولنے پر مجبور نہیں کروں گا۔ بس تمہیں اتنی تکلیف ضرور دوں گا کہ چند گھنٹوں کے لیے مجھے اپنا ہم سفر سمجھ کر برداشت کر لو۔ مجھ سے تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ جہاں تمہارا جی چاہے' اتر جانا اور جہاں میں مناسب سمجھوں گا اتر جاؤں گا۔" یک لخت اس کے لہجے میں اتنی سنجیدگی عود کر آئی کہ مجھے حیرت سی ہونے لگی۔

کئی لمحے تک کوچ میں ہم دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھے رہے۔ انجن کی چھک چھک اور پٹڑی پر پہیوں کی گڑگڑاہٹ کے باوجود مجھے اپنے ارد گرد گہرا سکوت محسوس ہو رہا تھا۔ وہ نوجوان یکلخت یوں لاتعلق ہو کر اپنے خیالوں میں کھو گیا تھا جیسے میری موجودگی سے بالکل بے خبر ہو۔ اس کے اس انداز سے مجھے یقین سا ہونے لگا کہ وہ مجھے نقصان پہنچانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا اور اس کا ساتھ میرے لیے سود مند ہی ہو سکتا تھا۔ صورتحال پر غور کرتے ہوئے مجھے یہ اندازہ بھی ہو چکا تھا کہ اپنے طور پر شاید مجھ میں چند قدم چلنے کی بھی صلاحیت نہیں تھی۔

دنیا میرے لیے ایک شکارگاہ کی طرح تھی' جس میں قدم قدم پر پھندے لگے ہوئے تھے۔ مجھے کسی کے مضبوط لیکن مخلص سہارے کی ضرورت تھی۔ کوئی ایسا شخص جو آگے چل کر شوکت ثابت نہ ہو' تاہم اس اجنبی کے سامنے حقیقت کو تسلیم کرنے سے پہلے میں نے اسے کریدنا بہتر سمجھا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ اس وقت میری عقل اور ہوش و حواس میرا ساتھ دے رہے تھے۔

"تم کس سے جان بچا کر بھاگ رہے ہو؟" بالآخر میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"تو تم نے مجھ پر اعتماد کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔" وہ مسکرایا اور میری طرف رخ کر کے بیٹھ گیا۔

"یہ میں نے کب کہا؟ میں نے تو تم سے ایک سوال کیا ہے۔" میں نے کہا۔

"پولیس سے!" اس نے نہایت خلوص سے کہا۔ "یہ تو تھا تمہارے سوال کا جواب اور حقیقت یہ ہے کہ مجھے پولیس سے اتنا خوف نہیں۔ میرا اصل دشمن کوئی اور ہے جو پولیس سے بھی زیادہ طاقتور' بے رحم' خوفناک اور مکروہ انسان ہے۔"

"وہ کون ہے؟" میں اپنے لہجے کی دلچسپی نہ چھپا سکی۔

اس نے ایک بار پھر میرا سرتاپا جائزہ لیا' پھر خودکلامی کے سے انداز میں بڑبڑایا۔ "میرا خیال ہے تمہیں بتانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔" پھر قدرے بلند آواز میں بولا۔ "نواب شرافت علی۔"

مجھے یکلخت دھچکا سا لگا۔ شاید میرے چہرے پر ایسا تغیر آیا تھا کہ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔ پھر وہ سنبھل کر بیٹھ گیا اور بظاہر سپاٹ سے لہجے میں بولا۔ "کیا تم اسے جانتی ہو؟" لیکن اس لہجے کے عقب میں ہزاروں شکوک کے سائے رینگ رہے تھے۔

"بابا!" میرے حلق سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔ "میری بربادیوں کا ذمہ دار بھی وہی شخص ہے۔" اب میرے لیے مزید مصلحت کوشی سے کام لینا ممکن نہیں رہا تھا۔ الفاظ خودبخود میرے ہونٹوں سے پھسلتے چلے گئے۔ "اس نے میرے باپ کو قتل کرایا' مجھے بے آبرو کیا' مجھے بے گھر کیا' میرے اجداد رویے کی وجہ سے دو سال تک مجھے اپنے ذاتی بندی خانے میں ڈالے رکھا۔ گزشتہ رات ہی میں وہاں سے فرار ہوئی ہوں۔"

وہ پلکیں جھپکائے بغیر میری طرف دیکھتا رہا۔ اس کا چہرہ یکلخت سپاٹ نظر آنے لگا تھا لیکن آنکھوں میں شعلے سے جل بجھ رہے تھے جیسے کہیں دور افتادہ کھنڈروں میں آگ لگی ہو۔

"ہماری کہانی ایک ہی ہے۔" بالآخر اس کے ہونٹوں نے حرکت کی۔ آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔ "شاید دشمن بھی ایک ہو۔"

"کیا ہے تمہاری کہانی؟" میں نے اونچی آواز میں پوچھا اور فوراً ہی مجھے احساس ہوا کہ

میری آواز بھرانے لگی تھی۔

"کہانی تو بہت طویل ہے۔" وہ گویا کسی خواب سے جاگتے ہوئے بولا، "قصہ مختصر یہ کہ نواب شرافت کی زمینوں سے متصل ہماری بھی تھوڑی سی زمین تھی جسے میرے والد نے سنبھالا ہوا تھا۔ میں کلکتہ کالج میں پڑھتا تھا۔ آخری سال میں، میں نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور ہم چند لڑکے اپنی ایک تنظیم بنا کر ہندوستان کی آزادی کے لیے کام کرنے والوں کا ساتھ دینے لگے۔ تعلیم ختم کر کے میں گاؤں آیا تو وہاں بھی ہم نے کام جاری رکھا۔ نواب شرافت سے بھی ہم ملے اور اس کا تعاون طلب کیا۔ اس نے ہمیں بڑی صفائی سے ٹال دیا لیکن اس کے بعد سے ہمارے اور اس کے مزارعوں کے درمیان چھوٹے چھوٹے جھگڑے بڑھنے لگے، پھر دونوں طرف کے چند قتل بھی مارے گئے۔ مقدمے بازی کے دوران مجھے معلوم ہوا کہ نواب انگریزوں کا کتنا بڑا پٹھو تھا۔ پھر میں نے اپنے نوجوانوں کی تنظیم کو اس نہج پر ڈالا کہ تحریک آزادی سے پہلے دراصل انگریزوں کے پٹھوؤں کی سرکوبی ضروری ہے۔ ہماری تنظیم صحیح معنوں میں کوئی سیاسی تنظیم نہیں تھی۔ بس چند جوشیلے نوجوانوں کا ایک گروہ تھا۔ چالاکی، سازشیں اور لمبے دماغ سے چالیں چلنا ہمیں نہیں آتا تھا۔ نواب شرافت کی طاقت کا بھی ہمیں اندازہ نہیں تھا۔ اپنی دانست میں بڑے [illegible] اور صبر پسندانہ انداز میں ہم نے نواب سے تصادم بھی مول لے لیا۔ کچھ عرصے بعد میرے دوست بکھر گئے۔ کچھ نے نوکریاں کر لیں، کچھ کی شادیاں ہو گئیں، کچھ اور طرح سے عملی زندگی میں پھنس پھنسا گئے اور رفتہ رفتہ ایک دوسرے سے بے خبر ہو گئے۔ نواب کی آنکھوں میں کھٹکنے کے لیے صرف میں رہ گیا۔ ایک مرتبہ میں کسی کام سے دلی گیا ہوا تھا۔ واپس آیا تو میری دنیا اندھیر ہو چکی تھی۔ مزارعوں کے درمیان جھگڑا ایک مرتبہ پھر ہوا تھا اور اس مرتبہ نواب کے آدمیوں نے میرے والد کا سینہ چھلنی کر دیا تھا حالانکہ وہ جھگڑے کے مقام پر موجود نہیں تھے۔ انہیں وہاں سے کافی فاصلے پر ایک دوسرے کھیت میں جا کر مارا گیا تھا۔ مقدمہ چلتا رہا اور اس مقدمے میں ہماری مختصر سی زمین کا نصف سے زیادہ حصہ بک گیا اور نتیجہ کیا رہا؟ میں نواب کو عدالت میں بلوا تک نہیں سکا۔ عدالت کے فیصلے کے مطابق یہ مزارعوں کا باہمی تنازع تھا جس کی لپیٹ میں میرے والد آ گئے تھے۔ نواب کے مزارعوں میں سے پچپن ساٹھ سال کے ایک آدمی نے قتل کا اعتراف کر لیا۔ اسے عمر قید کی سزا ہو گئی اور دوسرے مزارعوں کو چند چند سال کی۔ مجھے معلوم تھا کہ اصل مجرم نواب تھا لیکن میں یہ ثابت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تو اپنی جگہ بیٹھا صرف مہرے ہلاتا تھا۔ میں بے آسرا رہ گیا تھا۔ باپ کے بعد دنیا میں میرا کوئی نہ رہا تھا۔ ماں تو پہلے ہی مر چکی تھی، چند ایک عزیز و اقارب تھے۔ انہوں نے جب سنا کہ نواب سے میری دشمنی چل رہی ہے تو انہوں نے ویسے ہی کنارہ کشی اختیار کر لی۔ میں زمین کے معاملات میں الجھا

بیٹی پگلی لگتی تھی۔ سب مزارعوں ہی کے سپرد کر دی اور ان سے ملنے والے حصے پر گزر اوقات کرنے لگا لیکن رہا آبائی مکان ہی میں۔ دن رات میں بڑا نواب سے انتقام لینے کے [illegible] طریقے سوچتا رہتا لیکن حقیقت یہ تھی کہ دل ہی دل میں اس شخص سے مجھے خوف آنے لگا تھا۔ ابھی میں کسی واضح نتیجے پر نہیں پہنچ پایا تھا کہ نواب کے محل میں ایک اہم واقعہ رونما ہوا۔ عشائیے کی میز پر اس کے ایک بیٹے نے اس پر گولی چلا دی۔ پہلی گولی بیچ میں کھڑے ہوئے ایک مصاحب کو لگی، دوسری نواب صاحب کو۔ ہسپتال پہنچتے پہنچتے مصاحب تو مر گیا، نواب بچ گیا۔ سننے میں آیا ہے کہ لڑکے نے جائیداد کے کسی جھگڑے پر باپ پر گولی چلائی تھی۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ اصل وجہ یہ تھی کہ نواب نے بیٹے کی بیوی پر ہاتھ ڈالا تھا یعنی بہو کو بھی نہیں بخشا تھا۔

جھگڑے کی وجہ بہرحال جو کچھ بھی رہی ہے۔ ہوا یہ کہ پولیس دو دن تک صرف ہسپتال کے چکر لگاتی رہی، اسے محل کی طرف سے اور افسران بالا کی طرف سے رپورٹ درج کرانے کی اجازت ہی نہیں مل سکی۔ ہوش میں آتے ہی نواب نے خاندان کے چند افراد کو بیٹی طلب کیا۔ باپ، بیٹے اور بیگمات کے درمیان صلح صفائی ہو گئی۔ واقعے کے چند چشم دید گواہوں کو بلا کر ہدایت دی گئیں کہ انہیں درحقیقت کیا بیانات دینے ہیں اور سارا قصہ مجھ پر ڈال دینے کا نہایت [illegible] کر لیا گیا۔

نواب نے ایک لمبا چوڑا بیان قلمبند کرایا جس میں گزشتہ واقعات اور دلائل سے ثابت کیا گیا کہ میں کتنے عرصے سے اس کے خون کا پیاسا چلا آ رہا تھا اور واقعے کے روز میں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ محل میں گھس آیا تھا۔ قاتلانہ حملہ میں نے ہی کیا تھا وغیرہ وغیرہ۔ نواب شرافت کا خاص محل ہمارے گھر سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر ہے۔ محل سے میرے ایک پرانے ہمدرد نے بروقت مجھے اطلاع دے دی کہ کیا ڈرامہ تیار ہوا ہے اور کن تیاریوں کے ساتھ پولیس مجھے گرفتار کرنے کے لیے آنے والی ہے۔ مجھے یقین نہ آیا کہ اس دھرتی پر اتنا اندھیر بھی ہو سکتا ہے، اس لیے میں گھر پر ہی موجود رہا البتہ دل کو ایک کھٹکا سا لگ گیا تھا۔ کچھ نقدی وغیرہ سمیٹ کر گومگو کے عالم میں بیٹھا سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کرنا چاہیے، کھڑکی کے راستے میں نے دیکھا ایک گاڑی گھر کے سامنے آ کر رکی ہے۔ گاڑی سے بظاہر کچھ شریف افراد اترتے نظر آئے لیکن میں سمجھ گیا کہ سادہ لباس میں یہ پولیس والے ہیں۔ وہ اس وقت مکان کو گھیرے میں لے رہے تھے، جب میں پچھلی طرف سے بھاگتا ہوا وہاں سے بھاگ نکلا۔

اس علاقے کو شاید ہی کوئی مجھ سے بہتر جانتا ہو۔ میں نے سیدھا ریلوے اسٹیشن کا رخ کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس وقت ایک پسنجر ٹرین ادھر سے گزرتی ہے۔ خوش قسمتی سے میں ٹھیک اس وقت اسٹیشن پر پہنچا جب یہ وہاں سے چل پڑی تھی لیکن پھر رحیم آباد تک یہ ایک

رہی کہ چلنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ مجھے اندیشہ محسوس ہونے لگا کہ اگر پولیس کا ذہن اس طرف چلا گیا کہ میں نے یہ ٹرین پکڑی ہوگی تو اتنی دیر میں تو وہ رحیم آباد بھی آ پہنچیں گے۔ بہرحال میں کھڑکی سے جھانک کر دیکھتا رہا۔ پھر میں نے تمہیں اس ڈبے کی طرف آتا دیکھا تو اٹھ کر باتھ روم میں گھس گیا۔ یہ ہے کل کہانی۔"

وہ بول رہا تھا تو مجھے کوئی اور آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ خاموش ہوا تو ٹرین کی گڑگڑاہٹ سنائی دینے لگی۔ اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور بالوں میں انگلیاں پھیر کر بے مقصد سے انداز میں مسکرایا۔ میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"اب کہاں جاؤ گے؟" میں نے پوچھا۔

"فی الحال تو میں یہاں سے بہت دور نکل جانا چاہتا ہوں' غالباً بمبئی کی طرف' جہاں میں اپنے آپ کو گم کر لوں۔" وہ آہستگی سے بولا "لیکن ایک روز میں واپس آؤں گا۔ پہلے میں اس سے ڈرتا تھا لیکن اب یک لخت ہی میرے دل سے اس کا ڈر نکل گیا ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی سمجھ میں آگیا ہے کہ اس سے انتقام لینے کے جو افسانوی طریقے میں سوچتا تھا وہ کام نہیں دیں گے۔"

اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی اور وہ میرے چہرے سے نظریں ہٹا کر کسی غیر مرئی چیز کو گھورتے ہوئے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "میں نواب شرافت علی کی موت کا پروانہ لے کر واپس آؤں گا۔"

ایک لمحے کے لیے گویا موت کا سا سکوت چھا گیا۔ اس کے اٹل لہجے میں کوئی ایسی بات تھی جس نے میرے خون کی گردش تیز کر دی۔ ایک لمحے کے وقفے کے بعد اس نے میری طرف دیکھا۔ "اور تم کہاں جاؤ گی؟"

"میں بھی بہت دور نکل جانا چاہتی ہوں۔" میں نے پہلو بدل کر کہا۔

"میں نے کہا تھا نا..... کہ شاید ہماری منزل بھی ایک ہو۔" وہ مسکرایا۔ "میرا ساتھ دو گی؟"

مجھے سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ قطعی اضطراری طور پر میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "ملاؤ ہاتھ۔" مسکرا کر اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ جھجکتے ہوئے میں نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا اور ایک مدت بعد میرے ہاتھ نے زندگی کا لمس محسوس کیا۔ اس کا مضبوط کھردرا سا ہاتھ اپنی گرفت میں ایک وعدہ لیے ہوئے تھا۔

"اگلا اسٹیشن بخیر و عافیت گزر جائے۔" اس نے آہستگی سے میرا ہاتھ چھوڑتے ہوئے

... اس کے بعد اللہ تیا تک لمبی تان کر سوئیں گے۔ کل تیارا اس ٹرین کا ٹرمینل ہے' وہاں سے ہم کوئی سیل ٹرین پکڑ لیں گے۔"

"اگلا اسٹیشن تو خیر و عافیت ہی گزر گیا لیکن وہ ابھی لمبی تان کر سونے کے لیے اوپر کی برتھ پر چڑھا ہی تھا کہ کوپے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے اتر کر دروازہ کھولا سامنے ٹکٹ چیکر کھڑا تھا۔ "معاف کیجئے میں نے آپ کی نیند میں خلل ڈالا۔" چیکر نے دزدیدہ نظروں سے کوپے میں جھانکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن میری ڈیوٹی ختم ہو رہی ہے اور اگلے سٹیشن پر اترنے سے پہلے مجھے آخری مرتبہ ٹکٹ چیک کرنے تھے۔"

"جواباً میں بھی آپ سے معذرت ہی چاہوں گا ٹکٹ چیکر صاحب۔" اس نے مسکراتے ہوئے نہایت اطمینان سے کہا۔ "ہمیں اور بھر اپنی بکنگ اور ہنگامی دوڑ میں ٹرین میں سوار ہونے ہیں کہ ٹکٹ تک کہاں لینا تھا' پاؤں کی جوتیاں اور تن کے کپڑے سنبھالنے کی بھی مہلت نہیں مل سکی۔" اس نے کوٹ کی اندرونی جیب سے دو نوٹ نکالے۔" ٹکٹ بنا دیجئے۔" اس نے پہلے ایک نوٹ چیکر کو تھمایا۔ "یہ تو ٹکٹ کے پیسے۔" پھر دوسرا نوٹ تھماتے ہوئے بولا۔ "اور یہ آپ کے لیے۔"

"کنڈیکٹر گارڈ تو ٹرین کے ساتھ نہیں ہے۔" چیکر نے نوٹ لیتے ہوئے نہایت شیریں لہجے میں کہا۔ "بہرحال میں اگلے سٹیشن پر اتروں گا تو ٹکٹ آپ کو پہنچا جاؤں گا۔ کوئی فکر نہ کیجئے' آرام فرمائیے۔"

میں نے آسودگی کی گہری سانس لی۔ اگر قدرت نے اس اجنبی کو نہ بھیجا ہوتا جو اس وقت میرے لیے سب سے بڑا آسرا تھا تو شاید میں اس مرحلے پر کسی بڑی مصیبت میں پھنس چکی ہوتی۔ میری جیب میں تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی اور پھر ہولناک اور تنہا ہونا میرا سب سے بڑا عیب تھا جس کی شاید قدم قدم پر مجھے سزا ملتی۔

ٹکٹ چیکر کے جانے کے بعد وہ دروازہ بند کر کے مڑا تو میں نے مسکرا کر پوچھا۔ "کیا بیوی اپنے زبردستی کے شوہر کا نام پوچھ سکتی ہے؟"

"کیا ازراہ کرم اس بیچارے کو زبردستی کے شوہر کے بجائے مستقبل کا شوہر نہیں کہا جا سکتا؟" اس نے سنجیدگی سے کہا

"فی الحال تو نہیں۔" میں نے بظاہر سنجیدگی سے کہا۔ "البتہ غور کیا جا سکتا ہے۔" لیکن میں اپنے آپ کو بہت بہتر محسوس کر رہی تھی۔ تفکرات اور خطرات سے بے نیاز۔ دل جیسے ہلکا پھلکا سا ہو گیا تھا۔

"میرا نام کچھ اکھڑ سا ہے۔ خواتین کو عموماً پسند نہیں آتا۔" اس نے دوبارہ برتھ پر چڑھتے ہوئے کہا۔

"نام کو پسند یا ناپسند کرنے سے کیا ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "میرے خیال میں تو نام اور شخصیت کے درمیان بڑے فاصلے ہوتے ہیں۔ اب اسی نواب شرافت علی کو لے لو۔ نام میں شرافت ہی شرافت مگر شرافت شاید سات پشتوں میں بھی اس کے آباؤ اجداد کو چھو کر نہیں گزری۔"

"اس خبیث کا نام نہ لو میرے سامنے۔" اس کے چہرے پر یکلخت سرخی کی جھلک آئی لیکن دوسرے ہی لمحے گویا وہ خود پر قابو پاتے ہوئے پرسکون لہجے میں بولا "میرا نام پوچھتے پوچھتے بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی مجھے ارباب مغل کہتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ آنکھیں بند کر کے برتھ پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے خراٹوں کی آواز آنے لگی۔ میں بھی لیٹ گئی اور سونے کی کوشش کرنے لگی لیکن کافی دیر تک دل کو کھٹکا سا لگا رہا۔ بار بار میں آنکھیں ذرا سی کھول کر دیکھتی رہی کہ ارباب برتھ سے اترا تو نہیں مگر میرا یہ خدشہ محض خدشہ ہی رہا۔

بمبئی پہنچ کر دو دن ہم ایک ہوٹل میں رہے۔ تیسرے دن ارباب کرائے کا ایک مکان تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ مختصر سے اس مکان کے ارد گرد آبادی تو تھی پھر بھی اپنی وضع کی وجہ سے یہ بالکل الگ تھلگ سا لگتا تھا اور اس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں تہہ خانہ بھی تھا۔ اگلے روز ارباب ضرورت کا مختصر سا سامان ایک گاڑی میں لاد کر لے آیا۔ ہمارے پاس پیسے تیزی سے ختم ہو رہے تھے مگر وہ کچھ خاص فکرمند نہیں تھا۔

مکان میں رہتے ہوئے ہمیں چوتھا دن تھا جب ارباب نے مجھ سے کہا۔ "آخر میں انسان ہوں۔" میں نے اس بلا تمہید جملے پر حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ "تو میں نے کب تمہارے انسان ہونے پر شک کیا ہے؟"

"شک تو نہیں کیا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن ایک انسان کا اس حد تک امتحان لینا بھی کہاں کا انصاف ہے۔ کتنے دن گزر گئے ہیں کہ تم چوبیس گھنٹے میری رسائی میں ہو مگر میں تمہاری طرف زیادہ دیر دیکھنے سے بھی اپنے آپ کو باز رکھتا ہوں۔ اندر ہی اندر اپنے آپ سے لڑتا رہتا ہوں اور میں نے اپنے آپ کو توڑ پھوڑ لیا ہے مگر میں زیادہ دیر برداشت کر رہنا نہیں چاہتا۔" آخری الفاظ اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہے۔

"تو پھر کیا کرنا چاہیے؟" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہمیں نکاح کر لینا چاہیے اور خوشگوار زندگی بسر کرنی چاہیے۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا "تاکہ یہ جو ہم چوروں کی طرح ایک دوسرے سے بدکے بدکے پھرتے ہیں' یہ مسئلہ ختم ہو جائے اور ہم ایک طرف سے یکسو ہو کر باقی معاملات کے بارے میں اپنی آئندہ کا کوئی لائحہ عمل طے کر سکیں۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن تم سوچ لو۔ ایک تو زندگی کے کسی موڑ پر مجھے دغا نہ دینا' دوسرے کبھی مجھے ماضی کے کسی واقعے کا طعنہ نہ دینا۔"

"زندہ کھلونے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے اُسی لہجے میں کہا۔ "مجھے تم جیسی ہی بیوی کی ضرورت ہے' خصوصاً موجودہ حالات میں۔ ایسی شریک حیات جس کی روح پر ظلم و ظلم کے چرکے لگ چکے ہوں تاکہ وہ انتقام کے راستے میں ثابت قدمی سے میرا ساتھ دے سکے۔ مصیبتوں سے گھبرا کر منہ نہ موڑ جائے۔ جس کے اندر سلگتی ہوئی زخمی انا کی چنگاری کسی وقت بھی بھڑک کر شعلہ بننے کے لیے تیار ہو۔ ایک عام سی عورت میری آئندہ زندگی میں میرا ساتھ نہ دے سکے گی۔ فی الحال تم ایک عام عورت نظر آتی ہو مگر میں جب بھی تمھیں بغور دیکھتا ہوں' کوئی غیبی قوت میرے کان میں سرگوشیاں کرتی ہے کہ تم ایک عام عورت نہیں ہو۔"

"اچھا' تقریر بند کرو اور کام کی بات کرو۔" میں نے کہا۔ "چلو تم تیار ہو جاؤ' ہم نکاح پڑھوانے چلتے ہیں۔" اس نے اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"تم تو اتنے آرام سے کہہ رہے ہو جیسے ہم بازار سے دو ٹکے کی مٹھائی خریدنے جا رہے ہوں۔" میں نے کہا۔

"تو اور کیا دھوم دھڑکے سے کہوں تاکہ پڑوسی اکٹھے ہو جائیں جو ہمیں پہلے ہی میاں بیوی سمجھتے ہیں اور وہ مالک مکان بھی آجائے جس نے ہمیں بیاہتا جوڑا سمجھ کر مکان کرائے پر دیا تھا اور جو بڑی دلچسپی سے ہمارے ہی گھر کی طرف کان لگائے بیٹھا ہے کہ کب ہمارے ہاں سے کسی ننھے منے کی ٹیاں ٹیاں سنائی دیتی ہے۔" ارباب میری طرف دیکھتے ہوئے شرارت سے مسکرایا۔ "اگر ان سب کو معلوم ہو گیا کہ ابھی ہمارا نکاح ہی نہیں ہوا تو ہماری شرافت اور صبر و قناعت پر کوئی بھی یقین نہیں کرے گا اور سب لوٹ مار کر ہمارا بھرکس نکال دیں گے۔ چنانچہ فی الحال صبر و شکر کے ساتھ چپ چپاتے ہی نکاح ٹھیک ہے۔ چلو اب تیار ہو جاؤ۔"

شام کو اپنے گھر سے آگے دو تین گلیاں چھوڑ کر ہم نے ایک مسجد تلاش کی جس کے ساتھ ہی ایک حجرے پر نکاح رجسٹرار کا چھوٹا سا بورڈ آویزاں تھا۔ حجرے کا دروازہ مسجد کے اندر ہی تھا۔ جوتے اتار کر ہم نے اندر جا کر حجرے کے دروازے پر دستک دی۔ ادھیڑ عمر کے ایک بزرگ نے دروازہ کھولا۔ داڑھی کے ساتھ ساتھ ان کی بھنوؤں تک کے بال سفید ہو چکے تھے مگر چہرہ جوانوں سے زیادہ روشن اور آنکھوں میں زندگی کی چمک تھی۔

"ہم نکاح پڑھوانا چاہتے ہیں۔" ارباب نے نہایت سادگی اور بغیر کسی تمہید کے اس طرح یہ جملہ ادا کیا کہ مولوی صاحب ہکا بکا رہ گئے۔

"بڑی خوشی کی بات ہے برخوردار!" بالآخر انھوں نے سنبھل کر کہا۔ "لیکن باراتی کہاں ہیں؟ گواہ کون ہوں گے اور تمھارے والدین کہاں ہیں؟"

"یہ سب لوگ تو میسر نہیں ہیں مولوی صاحب!" ارباب کے چہرے پر بدستور مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی اور اس کا لہجہ بھی انتہائی ہموار ہی لیے ہوئے تھا۔ "لیکن اگر لڑکا اور لڑکی بالغ ہوں اور شادی کے لیے آمادہ ہوں تو کیا نکاح نہیں ہو سکتا؟"

"ہو تو سکتا ہے برخوردار!" مولوی صاحب نے قدرے الجھن زدہ سے لہجے میں کہا۔ "لیکن میں احتیاطاً اس قسم کے نکاح نہیں پڑھاتا' کیا معلوم کیا چکر ہو۔ لڑکی ورغلا کر یا بھگا کر لائی گئی ہو' کچھ مقدمہ یا بہت درج ہو۔"

"مولوی صاحب! قصہ مختصر یہ ہے۔" ارباب نے گہری سانس لے کر کہا۔ "ہم دونوں زمیندار گھرانوں کی اولاد ہیں اور ایک تیسرے زمیندار سے دشمنی میں ہمارے گھرانے مٹ چکے ہیں۔ والدین مر چکے ہیں۔ ہم بمشکل جانیں بچا کر بھاگے ہیں ورنہ ہم بھی خواہ مخواہ کی عداوت بازی میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے۔ ہم کئی دن سے ساتھ ہیں۔ ہم چاہتے تو ایک دوسرے کی رضا و رغبت سے گناہ کی زندگی بھی گزار سکتے تھے لیکن ہمارے ضمیر نے یہ گوارا نہیں کیا اور ہم آپ کے پاس آگئے۔ ہم اس اجنبی شہر میں امن و آشتی کے ساتھ ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا چاہتے ہیں لیکن آپ اگر عالم ہوتے ہوئے بھی خوف کا شکار ہیں اور ہمارے لیے نئی زندگی کے دروازے کھولنے پر تیار نہیں ہیں تو ہم کوئی اور راستہ ڈھونڈیں گے۔"

مولوی صاحب نے چند لمحے غور کیا۔ باری باری ہم دونوں کا سرتاپا جائزہ لیا۔ میں نے نظریں جھکا لیں البتہ ارباب پرامید نظروں سے مولوی صاحب کی طرف دیکھتا رہا۔

"میں معذرت خواہ ہوں۔" بالآخر مولوی صاحب نے آہستگی سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" ارباب نے پرسکون سے لہجے میں کہا۔ "ہم چند ایک جگہ اور کوشش کر لیتے ہیں ورنہ پھر جسٹس آف پیس سے اجازت نامہ لے کر آجائیں گے۔"

اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور واپس جانے کے لیے مڑ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ مولوی صاحب تذبذب کے عالم میں چوکھٹ پر کھڑے تھے۔ ہم ابھی مسجد کے بیرونی دروازے تک نہ پہنچے تھے کہ انھوں نے عقب سے آواز دی۔ "سنو صاحبزادے!"

ہم واپس پہنچے تو انھوں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "میرے خیال میں ایک مسلمان جوڑے کو شادی کے لیے انگریز حاکم سے اجازت نامہ لینے کی ضرورت نہیں۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "لڑکی! کیا تم حلفیہ اور تحریری بیان دے سکتی ہو کہ تم اپنے والدین یا دیگر سرپرستوں کی مرضی کے خلاف اس نوجوان کے ساتھ فرار ہو کر نہیں آئی ہو؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ ایک طرف ہٹ گئے۔ "ٹھیک ہے' اندر آجاؤ۔"
عشاء کی اذان سے پہلے ہمارا نکاح ہو گیا۔ موذن اور متنی گواہ بنے۔ ارباب نے قاری کا ہدیہ اور نمازیوں کے لیے چھوارے منگوا کر بانٹنے کی غرض سے کچھ رقم مولوی صاحب کے سپرد کی اور ہم گھر آ گئے۔

یہ ایک عجیب شادی تھی۔ میرے ہاتھوں میں مہندی رچی تھی' نہ ڈھولک پر رسمی کے گیت گائے گئے تھے۔ میں نے عروسی جوڑا پہنا تھا نہ کسی نے اپنی دعاؤں کے ساتھ مجھے رخصت کیا تھا۔ کسی نے میرا سنگھار کیا تھا نہ میرے در پر شہنائیاں بجی تھیں۔

ڈھائی سال پہلے جب میری نام نہاد منگنی ہونے لگی تھی تو پڑوسیوں نے ڈھولک کی تھاپ پر گیت الاپنے شروع کر دیے تھے مگر اس وقت ہر بول برچھی کی طرح سینے میں اتر رہا تھا۔ آج میرے کان ڈھولک کی تھاپ اور رسیلے گیت سننا چاہتے تھے مگر سنانے والا کوئی نہ تھا۔

کبھی کمل سرا کا پر آسائش اور شاندار رہائشی حصہ میسر تھا تو خلوتوں کا سنگی ایک [illegible] کمرہ مخصوص تھا۔ آج من کا میت سامنے تھا تو خلوت گاہ کو سجانے کے لیے چار پھول بھی میسر نہ تھے۔ دیر تک ہم دونوں آمنے سامنے چارپائی پر بیٹھے ایک ٹک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے' پھر خود بخود آنکھیں بھر آئیں۔

"ملی! میری تقدیر اس طرح کیوں لکھی گئی ہے؟" میں نے بے زبان خاموش سوال کیا اور آنسو میرے رخساروں پر امڈ آئے۔

ارباب نے مجھے اپنی مضبوط بانہوں کے حلقے میں سمیٹ لیا۔ "سمجھ رہی ہو پگلی! میں سمجھ رہا ہوں مگر یہ سب چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں۔" وہ اپنا لہجہ شگفتہ رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "مجھے لگتا ہے کہ ہم دونوں ان سے کہیں زیادہ بڑی باتوں پر دھیان دینے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ ہاں اگر تمہیں روکھے پھیکے طریقے سے شادی ہونے کا دکھ ہے تو فی الحال اس دکھ کو دل سے نکال دو۔ ہم اس وقت اپنی شادی کا جشن منا لیں گے جب حالات ہمارے حق میں ہوں گے۔ ہم ساری رنگیں لوا کر دیں گے۔ سارے ارمان نکال لیں گے' بس یہ سمجھ لو کہ جشن ادھار رہا۔ چلو اب ہنس دو۔ منہ بسورتی اچھی نہیں لگتیں۔ چلو ہنسو۔" اس نے میرے پہلو میں گدگدی کی۔ میں ہنس پڑی' اس کا دل رکھنے کے لیے نہیں' سچ مچ۔

"اور اگر اس وقت ہمارے منہ میں دانت اور پیٹ میں آنتیں نہ رہیں تو؟" میں نے ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"تو پھر کیا۔ جشن تو دانتوں اور آنتوں کے بغیر بھی منایا جا سکتا ہے۔" اس نے ملائمت

سے کہا۔ اس کا گفتگو کرنے کا یہ انداز نہایت عجیب تھا۔ کبھی نہایت خطرناک اور کبھی نہایت پر مزاح' کبھی بے حد تحقیقی اور کبھی نہایت لا یعنی بات۔ وہ اسی سرسری اور سادہ سے لہجے میں انتہائی بھولپن سے بات کر جاتا تھا جیسے اسے اپنے الفاظ کے معنی و مفہوم کا صحیح اندازہ نہ ہو۔ اس کی یہ ادا مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔

ارباب کے پاس پیسے بالکل ہی ختم ہونے لگے تو وہ نوکری کی تلاش میں جانے لگا۔ نوکری اسے بہت جلد مل سکتی تھی کیونکہ اس کے پاس فن تعمیر کی ڈگری تھی لیکن مصیبت یہ تھی کہ وہ یہ ڈگری پیش نہیں کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی اپنا اصل نام ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ اپنا حلیہ بھی اس نے بہت بدل لیا تھا۔ کلین شیو' چھوٹے چھوٹے بال' بہتر تراش انگریزی لباس۔ اب یہ اس کی شخصیت کے نمایاں جز تھے۔ وہ بظاہر کوئی کھلنڈرا اور مغرور سا نوجوان نظر آتا تھا جو کسی وجہ سے رائل آرمی میں کمیشن حاصل کرنے میں ناکام ہو گیا ہو مگر شوق بہرحال ابھی تک اس کے سر پر سوار ہو۔

اس سے پہلے کہ گھر میں فاقہ کشی کی نوبت آتی' ارباب کو ایک تعمیراتی کمپنی میں سائٹ سپروائزر کی نوکری مل گئی۔ تنخواہ اس نے [illegible] لگے بندھے معاوضے کے مطابق گزارے۔ اب میں امید سے تھی اور ارباب نے جب یہ سنا تو خوشی سے پھولا نہیں سمایا تھا لیکن اب چند دن سے میں یہ محسوس کر رہی تھی جیسے وہ کسی ادھیڑ بن میں مصروف رہتا ہو۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کا سیاسی ذہن کسی جوڑ توڑ میں لگا ہوا ہے۔ ایک دو بار میں نے پوچھا بھی تو ٹال گیا۔ "ابھی بتانے والی کوئی بات نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے اس کے طرز عمل کی وجہ کام کی زیادتی سمجھی کیونکہ اب وہ نجی طور پر کچھ چھوٹے موٹے نقشے بنانے کا کام کرنے لگا تھا۔ اس زمانے میں ضابطے اتنے سخت نہیں تھے۔ نجی پریکٹس میں کام کا معیار دیکھا جاتا تھا' نام اور ڈگریاں نہیں۔ اس طرح کے کاموں سے ارباب کی آمدنی میں خاصا اضافہ ہوا تھا۔

پھر گاہے بگاہے اسے کچھ لوگ ملنے آنے لگے۔ اس نے بتایا کہ یہ اس کے دفتر کے ساتھی ہیں۔ وہ لوگ تھوڑی دیر تک بیٹھک میں گپ شپ کرتے پھر تہہ خانے میں چلے جاتے۔ ارباب نے ڈرائنگ وغیرہ کے کام کا بندوبست بھی تہہ خانے میں کیا ہوا تھا۔ اس کی ڈرائنگ کی مخصوص میز اور اسٹول وغیرہ کے علاوہ تہہ خانے کے ہال میں اس نے ایک بہت لمبی سی میز اور چالیس کرسیاں بھی ڈلوا دی تھیں۔

رفتہ رفتہ ہر ہفتے کی شام کو اس سے ملنے کے لیے آنے والوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ ان میں ایک نوجوان سے ارباب کے خصوصی طور پر بہت گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ نرم و نازک اور شرما شرما کر بات کرنے والے اس حلیم طبع سے نوجوان کا نام نصیر بیگ تھا۔ عام

طور پر وہ سفید کرتا اور سفید ہی تنگ پاجامہ پہنے ہوتا تھا اور اس لباس میں کچھ زیادہ ہی بھلا لگتا تھا۔ ملاقاتیوں میں وہ ممنون سب سے پہلے آتے۔ دونوں دیر تک بیٹھک میں بیٹھے چائے پیتے اور تبصرے کرتے رہتے۔ پھر وقتی لوگ بھی آنا شروع ہو جاتے۔

ایسا لگتا تھا کہ باقی سب لوگ ارباب کے ساتھ اس نوجوان قسیم چک کی بھی غیر معمولی طور پر عزت کرتے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ ایک خاص وقت پر وہ لوگ اٹھ کر تہہ خانے میں چلے جاتے اور ارباب تہہ خانے کی سیڑھیوں کا دروازہ بند کر لیتا تھا۔ میں نے بارہا تجسس ہو کر ارباب سے پوچھا کہ آخر وہ کیا کر رہا ہے مگر اس نے ہمیشہ یہی جواب دیا کہ وقت آنے پر وہ مجھے خود ہی بتا دے گا۔

تہہ خانے کے روشن دان برآمدے کی سطح سے ذرا اوپر تھے لیکن ان روشن دانوں پر بھی اندر کی طرف گتہ لگا ہوا تھا۔ ایک روز تہہ خانے کی صفائی کرتے ہوئے میں نے گتہ کونے سے تھوڑا سا پھاڑ دیا۔ اب ضرورت پڑنے پر میں اوپر برآمدے سے اس جھری کے راستے جھانک سکتی تھی۔ میں بارہا تہہ خانے میں کوئی ایسی چیز تلاش کرنے کی کوشش کر چکی تھی جس سے کچھ اشارہ مل سکے کہ وہ آخر تہہ خانے میں اکٹھے ہو کر کیا کرتے ہیں۔

اگر کوئی اجلاس ہوتا ہے تو کس قسم کا؟ مگر مجھے ارباب کے کاموں کی چیزوں کے علاوہ کبھی کاغذ کا کوئی ٹکڑا پرزہ تک نظر نہیں آیا۔

اگلے سنیچر کی رات کو جب ان سب کو تہہ خانے میں گئے ہوئے کچھ دیر ہو گئی تو میں صحن میں تہہ خانے کے روشن دان پر پہنچی اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس جھری پر جھک گئی جو میں نے گزشتہ روز تیار کی تھی۔ تہہ خانے میں بتی جل رہی تھی مگر اس کے باوجود طویل میز کے ایک سرے پر شمعدان میں ایک موم بتی جل رہی تھی۔ میز کے ارد گرد نہایت قرینے سے رکھی ہوئی بیس کرسیاں حاضرین سے بھری ہوئی تھیں۔ باقی خالی کرسیاں دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔

ان سب لوگوں کے چہروں پر خوفناک حد تک سنجیدگی طاری تھی۔ پہلی نظر میں تو وہ سب مجھے پتھرائے ہوئے انسان محسوس ہوئے۔ پلکیں تک نہیں جھپک رہے تھے۔ دفعتاً ایک شخص نے ہاتھ بڑھایا اور شمعدان ایک پختہ عمر اور گٹھے ہوئے جسم کے ایک آدمی کے آگے رکھ دیا جو چند ہی دن پہلے مجھ کو آتے جاتے دکھائی دینے لگا تھا۔ اس نے ہوا میں کسی غیر مرئی نقطے پر نظریں گاڑ کر نہایت آہستگی سے کچھ کہا۔ فاصلہ زیادہ تھا' میں الفاظ سمجھ نہ پائی۔ روشن دان پر میں کچھ اور جھک کر ہمہ تن گوش ہو گئی۔ اب اس شخص کی آواز بھی قدرے بلند ہو چکی تھی۔

اب "وائٹ اینجلس" میں میری شمولیت ہی میری زندگی کا اثاثہ ہے۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "تقریب حلف وفاداری پر میں عہد کرتا ہوں......" یہ کہتے ہوئے اس نے گویا تحیر کے عالم میں دھیرے دھیرے شہادت کی انگلی بڑھائی اور موم بتی کی لو پر معلق کر دی۔ "کہ اس منشور کا پابند رہوں گا جو ہمارے سینوں میں نقش ہے۔ آج کے بعد ظلم کو طاقت سے روکنا' اتنی طاقت سے جتنی ہمیں میسر ہوگی' میرا نصب العین ہوگا۔ اگر میں "وائٹ اینجلس" کے منشور سے غداری کروں گا تو اپنے آباؤ اجداد کے چہروں پر غلاظت ملنے اور اپنے نسب کو مشکوک بنانے کا مرتکب ہوں گا۔"

اس نے انگلی پیچھے ہٹائی جس سے گہرے سیاہ دھوئیں کی مولی سی لکیر ہوا میں بلند ہونے لگی تھی۔

اس کے بعد شمعدان ایک اور شخص کے سامنے کھسکا دیا گیا۔ اس کی صورت بھی مجھے کچھ ہی دنوں پہلے نظر آنے لگی تھی۔ وہ بھی یہی الفاظ دہرانے لگا۔ میرے لیے روشن دان پر جھکے رہنا دوبھر ہو رہا تھا۔ میں پورے دنوں سے تھی۔ میری سانس اب گویا اکھڑنے لگی تھی۔ صورت حال کا مجھے کافی حد تک اندازہ ہو ہی چکا تھا' اس لیے میں اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔

رات کو بستر پر میں نے ارباب سے کہا۔ "یہ تم نے کیا ڈرامے بازی شروع کر رکھی ہے؟ تم تو کہتے تھے' تم نے انتقامی منصوبے بنانے بند کر دیے ہیں۔"

"تو تم نے کچھ باتیں سن لی ہیں۔" اس نے ایک گہری سانس لے کر میری طرف کروٹ بدل لی۔ پھر جواب کا انتظار کیے بغیر بولا۔ "بہرحال تم تسلی رکھو۔ یہ نہ تو کوئی ڈرامہ ہے اور نہ ہی انتقامی منصوبہ۔ میں سب کچھ بہت سوچ سمجھ کر کر رہا ہوں۔"

"ارباب! میری عمر' تعلیم' تجربہ سب کچھ تم سے بہت کم ہے۔" میں نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "لیکن جب سے میں نے ان ہونق سی شکلوں والے آدمیوں کو موم بتی کے شعلے پر انگلی رکھ کر قسمیں کھاتے دیکھا ہے' مجھے تم ایک نوعمر اور نادان لڑکے لگنے لگے ہو۔ آخر تم کرنا کیا چاہتے ہو؟"

"میں نے جو کچھ سوچا ہے' اس کے سوا میرے لیے کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں اکیلا نواب کو قتل نہیں کر سکتا۔ اس تک میری رسائی ہی نہیں ہو سکتی۔ قانونی اور جائز طریقوں سے میں اسے اس کے گناہوں کی سزا نہیں دلا سکتا۔ میں بیس جانثار اکٹھے کر چکا ہوں' دس اور تلاش کروں گا۔ تیس جانثاروں کی اس تنظیم کے ساتھ کسی روز میں رات کے اندھیرے میں نواب کے محل پر بجلی بن کر گروں گا اور اس کا اور اس کی اولادوں میں سے جو بھی ہاتھ لگا' سب کا نام و نشان مٹا دوں گا۔" وہ مسکرایا۔ "اس کے بعد اس فہرست پر

کام شروع ہو جائے گا جو میرے جانثاروں نے مرتب کر رکھی ہے۔"

"گویا تم ایک پڑھے لکھے اور ذہین آدمی سے ڈاکو بننے جا رہے ہو۔" میں نے خفگی سے کہا۔ "اول تو کوئی امید نہیں کہ اس طرح تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤ گے اور اگر ہو بھی گئے۔۔۔ تو بیوی بچوں کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ کر باقی زندگی جیل میں سڑتے گزار دو گے۔"

"میں ڈاکو بننے نہیں جا رہا۔" اس نے قدرے برہمی سے کہا۔ "میں نہایت سائنٹفک بنیادوں پر یہ تنظیم قائم کر رہا ہوں۔ کوئی ہماری گرد کو بھی نہیں پا سکے گا۔ تمہیں کیا معلوم کہ میں نے ان زخم خوردہ لوگوں کے ناخنوں کے کس کس تار کو چھیڑ کر انہیں اپنا ہم خیال جانثار بنایا ہے اور اپنا لائحہ عمل مرتب کرنے سے پہلے گوریلا لڑائیوں کی کتنی طویل تاریخ پڑھی ہے۔"

"میں نے زیادہ کتابیں نہیں پڑھیں۔ زندگی نے مجھے مہلت ہی نہیں دی۔" میں نے نہایت تحمل مزاجی سے کہا۔ "البتہ مجھے اپنے ابا جی کی کہی ہوئی بات نہیں بھولتی کہ سائنسی فارمولے تو عملی طور پر درست ثابت کیے جا سکتے ہیں مگر زندگی کے باقی معاملات میں کتابی علم شاذ و نادر ہی کام دیتا ہے۔ ضروری نہیں کہ جس طریق کار کے تحت ایک آدمی نے کامیابی حاصل کی ہو، دوسرا بھی اسی فارمولے کو اپنا کر کامیاب ہو جائے۔ اگر ایسا ہونے لگے تو دنیا کا ہر فرد ہی کامیاب ہو جائے۔ اس کے علاوہ میری سمجھ میں یہ بھی نہیں آرہا کہ جس طریق کار کے تحت تم قدم اٹھا رہے ہو، اس کے اہم ترین مرحلے کیسے سر ہوں گے؟ وسائل کہاں سے آئیں گے؟ اسلحہ کہاں سے آئے گا؟"

"یہ سب کچھ میں نے سوچ رکھا ہے۔" ارباب کے لہجے میں تیز تندی کی سی جھلک آئی۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تمہیں اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"نہ جانے کیوں میرا دل نہیں مانتا۔" میں نے کہا۔ "میں بدشگونی کرنا نہیں چاہتی لیکن نہ جانے کیوں مجھے وہم سا ہے کہ یہ طریقہ درست نہیں۔"

"تو پھر تم کیا طریقہ تجویز کرتی ہو؟" ارباب بظاہر پرسکون لہجے میں بولا مگر مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کی تہہ میں وہی جھنجلاہٹ چھپی تھی جو پڑھا لکھا اور جہاندیدہ شوہر اس وقت محسوس کرتا ہے جب اس کی کم پڑھی لکھی اور کم تجربہ کار بیوی اس کے معاملات میں ٹانگ اڑاتی ہے۔

"یہی تو مصیبت ہے۔" میں نے بے بسی سے کہا۔ "کہ میرے ذہن میں کوئی متبادل طریقہ یا تجویز نہیں ہے۔ میری عقل کچھ کام نہیں کرتی لیکن میں ایک موٹی سی بات جانتی ہوں۔ انسان کو اپنی زندگی کے نازک ترین معاملات صرف اپنی ہی ذات کی رو سے انجام

پہنچ جائیں۔ بات جتنی محدود رہے گی، اتنی ہی اس میں سلامتی ہوتی ہے۔۔۔"

"میں اب سلامتی اور عدم سلامتی کی فکر سے نکل چکا ہوں۔" ارباب نے چت لیٹ کر اپنی ٹانگوں پر کھینچتے ہوئے کہا۔ "اور جہاں تک تمہارے تحفظ فکر کا تعلق ہے تو میں بھی یہ موٹی سی بات جانتا ہوں کہ اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔۔۔" وہ جمائی لینے لگا۔

"لیکن مجھے تو تمہاری سلامتی کی فکر ہے۔" میں نے ہولے سے کہا۔ "شاید کوکھ میں پلتی ہوئی ان معصوم روحوں کی وجہ سے۔ مجھے دائی نے بتایا ہے کہ میرے ہاں جڑواں بچے ہوں گے۔"

"میں نے تم سے شادی اس لیے کی تھی کہ تمہارے سینے میں بھڑکتا ہوا انتقام کا شعلہ مجھے بھی حرارت پہنچاتا رہے گا۔" ارباب نے چھت کو گھورتے ہوئے کہا۔ "لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ تمہارے جذبے اس قدر جلد سرد ہو جائیں گے اور تم الٹا مجھے بزدل بنانے کی کوشش کرو گی، میرے قدموں میں بیڑیاں ڈالنی چاہو گی۔"

میں کچھ دیر خاموش رہی۔ وہ میری بات نہیں سمجھ رہا تھا اور مجھے سمجھانا نہیں آرہا تھا۔ "میں نے سنا ہے عورت بہت جذباتی ہوتی ہے۔" میں نے مجروح سے لہجے میں کہا۔ "شاید یہ درست ہو مگر مجھے اس مختصری عمر میں تجربہ ہوا ہے کہ اس جذباتیت پر پردہ ڈالے رکھنے میں بھی عورت کا کوئی ثانی نہیں۔ ارباب! میرے سینے میں آتش انتقام ابھی تک سلگ رہا ہے مگر اس کی تپش کو تم ابھی محسوس نہیں کر سکتے۔ میں نے اس پر صبر و ضبط کی یخ بستگی کے اتنے پردے ڈال رکھے ہیں۔۔۔ میں اوچھا وار کرنا نہیں چاہتی۔ چاہے مجھے برسوں انتظار کرنا پڑے۔۔۔"

"اور خواہ اس دوران وہ وحشی قبر میں سو جائے اور اس کی ہڈیاں تک گل جائیں۔" ارباب نے طنزیہ لہجے میں کہا اور کمبل چہرے تک کھینچ لیا۔

"کمینوں کو جلد موت نہیں آتی۔ عموماً اچھے انسانوں کو خدا جلد اپنے پاس بلا لیتا ہے۔ شاید اس میں بھی خدا کی مصلحت ہو کہ وہ ظالموں کی رسی دراز کرتا ہے حتیٰ کہ وہ خود کو لازوال سمجھنے لگتے ہیں۔ مجھے یقین ہے۔" غیر ارادی طور پر میری آواز خودکلامی کی سی سرگوشی میں ڈھل گئی۔ "یہ نواب جلد نہیں مرے گا۔۔۔ کیسے کیسے قاتلانہ حملوں سے تو وہ ماہر ہو گیا ہے۔"

ارباب نے شاید میری سرگوشی نہیں سنی تھی۔ "میں تمہاری باتوں پر غور کرنے کی کوشش کروں گا۔" اس نے رکھائی سے لہجے میں کہا اور میری طرف کروٹ بدل کر آنکھیں موند لیں۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ کل اسے یہ بات یاد بھی نہیں رہے گی کیونکہ وہ یاد رکھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

زندگی کی وہ رات میری پہلی ناقابل بیان مسرت کی رات تھی جب میں نے درد کے لامتناہی سمندر سے گزر کر آنکھ کھولی تو اپنے آپ کو حت کے ساحل پر پایا۔ میں نے جڑواں بچوں کو جنم دیا تھا۔

ویسے تو مجھے اس وقت بھی اندازہ تھا کہ ہر ماں کو اپنا بچہ سب سے حسین لگتا ہے لیکن دنیا بھی ہر تی ماں کو "چاند سے بیٹے یا بیٹی" کی نوید سناتی ہے مگر میرے بچوں کو تو جس نے بھی دیکھا' رسمی تبصرہ کرنا بھول گیا اور مبہوت ہو کر رہ گیا۔

پاس پڑوس کی اکا دکا عورتوں ہی کا ہمارے ہاں آنا جانا تھا۔ ان میں سے ایک بمشکل ہی کی خاموشی کے بعد صرف اتنا کہہ سکی۔ "اللہ نظر بد سے بچائے۔ بچوں کے وجود نے گویا پورے گھر میں چاندنی بکھیر دی ہے۔"

ارباب نے دیکھا تو گویا کہ اس کی زبان گنگ ہو کر رہ گئی۔ پھر اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھر آئے۔ "تمہیں معلوم ہے۔" اس نے میرے قریب بیٹھ کر نوعمر لڑکوں کی طرح شرماتے' جھجکتے اور اٹکتے ہوئے کہا۔ "میں نے پہلے یہ سوچ رکھا تھا کہ ہمارے جڑواں بچوں میں ایک لڑکا اور لڑکی ہوگی تو ان کے نام منصور اور مریم رکھیں گے۔ میں نے ایک عربی کتاب میں یہ نام پڑھے تھے اور مجھے بہت اچھے لگے تھے۔ تمہیں پسند ہیں؟"

میں نے نقاہت آمیز ہنسی سے اثبات میں سرہلا دیا۔ میرا ہاتھ ارباب کے ہاتھ میں تھا۔ دونوں بچے میرے پہلو میں تھے اور اس وقت مجھے دنیا کی ہر چیز انتہائی حسین لگ رہی تھی۔ وقتی طور پر میں ماضی کے تمام زخموں کی اذیت اور زندگی کی تمام ناگواریاں بھول گئی۔

ارباب کی خواہش کے مطابق لڑکے کا نام منصور اور لڑکی کا نام مریم رکھ دیا گیا۔ ہاں منصور! یہ دونوں بچے تم اور تمہاری بہن مریم تھے۔

ماں کی کوکھ میں جب بچے کی بنیاد پڑتی ہے تو گویا اس کی زندگی کے ایک عجیب مسحور کن دور کا آغاز ہو جاتا ہے۔ (ہر مرحلہ پہلے سے زیادہ عجیب اور ناقابل تشریح ہوتا) ہے۔ پہلے اپنے اندر اس ننھی روح کو رفتہ رفتہ پنپتے محسوس کرنا۔ اپنی دھڑکنوں کے ساتھ اس کی دھڑکنیں سننا۔ پھر پردہ غیب سے اسے ظہور میں آتے دیکھنا۔ اپنے پہلو میں اس ننھی سی جان کا لمس محسوس کرنا۔ اس کے رونے کی آواز یا اس کی قلقاریاں سننا اور پھر ایک نئے سرے سے اس کی پرورش میں منہمک ہو جانا۔ یہ سب ایسے محسوسات ہیں جن کی تفصیل میں اترنا عورت کے بس میں ہو تو نہ جانے کتنی ضخیم کتابیں تصنیف ہو جائیں۔ یہ سارا عمل اور اس کے تمام مرحلے شاید دنیا کے عجیب ترین تجربات ہیں۔

بچے جب چند ماہ کا ہوتا ہے تو والدین کے لیے امید و بیم اور انتظار کا ایک نیا دور شروع

ہو جاتا ہے۔ پہلے انہیں انتظار ہوتا ہے کہ بچہ نہ جانے کب گھٹنوں کے بل چلنا شروع کرے گا۔ پھر اسے اپنے پیروں پر چلتے دیکھنے کے لیے ایک ایک دن گن گن کر گزارتے ہیں۔ پھر وہ توتلی زبان میں باتیں شروع کرتا ہے تو اس کا ہر لفظ سن کر والدین یوں خوشی سے نہال ہو جاتے ہیں گویا اس نے کوئی نئی دنیا دریافت کر لی ہے۔

غرض یہ کہ محبت' مصروفیت' انتظار اور جاگتی آنکھوں خواب دیکھنے کا ایک دور شروع ہو جاتا ہے۔ جس میں دنیا و مافیہا کا کوئی ہوش نہیں رہتا۔ ہر بات گھوم پھر کر کسی نہ کسی طرح بچوں پر ہی آ کر ختم ہوتی ہے۔ میں بھی اس عمل میں مگن تھی اور پھر میری توجہ جذب کرنے کے لیے ایک نہیں دو دو ننھی ہستیاں موجود تھیں۔ دیکھتے دیکھتے تم اور مریم ڈیڑھ سال کے ہو گئے۔

تم دونوں لب گدے گڑیا کی طرح گھر کے ایک کونے سے صحن میں دوڑتے پھرتے تھے۔ تم دونوں کی شکلیں بھی بہت ملتی تھیں۔ بھورے' چمکیلے بال' بڑی مائل نیلگوں آنکھیں' گلابی رنگت' پتلی اونچی ناک اور ترشے ہوئے ہونٹ' فرق بس یہ تھا کہ مریم کے نقوش میں ایک عجیب سی نزاکت تھی جو کہ ہونی ہی چاہیے تھی۔ آخرکار وہ لڑکی تھی۔

تم دونوں کی عادتیں بھی بہت ملتی تھیں۔ جڑواں بہن بھائیوں میں عموماً پیار تو ہوتا ہی ہے لیکن تم دونوں تو اس معاملے میں کچھ زیادہ ہی غیر معمولی تھے۔ تم اکٹھے کھیلتے' ایک ہی وقت پر سوتے' ایک ہی وقت پر جاگتے' ایک جیسی چیزیں کھاتے اور ایک دوسرے سے شاذ و نادر ہی لڑتے۔ بعض اوقات تو تم دونوں گھنٹوں گھر کے کسی کونے کھدرے میں بالکل خاموشی سے کھیلتے رہتے کہ تمہاری موجودگی کا گمان تک نہ ہوتا۔ ارباب نے سختی سے منع کر رکھا تھا کہ دوسرے بچوں کی طرح تم دونوں کو گلی میں کھیلنے کودنے کے لیے نہ نکلنے دیا جائے لیکن تم دونوں نے خود ہی کبھی باہر جانے کی ضد نہیں کی۔ باہر سے کوئی بچہ اگر گھر میں آ بھی جاتا تو تم دونوں شاذ و نادر ہی اس کے قریب پھٹکتے۔

میں تم دونوں کی ذات میں مگن ضرور تھی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میرے ماضی کے زخم بھر گئے تھے۔ اذیت کم ضرور ہو گئی تھی' ختم نہیں ہوئی تھی۔ زہر ایک بار سانسوں میں گھل جائے' خون کا حصہ بن جائے تو پھر اسے الگ کرنا ممکن نہیں رہتا۔ ماضی کی ہر یاد کا زہر بھی میری نس نس میں شامل تھا' جسے میں فراموش کرنا چاہتی بھی تو نہیں کر سکتی تھی۔ کبھی کبھی راتوں کو جب میرے ایک طرف تم اور مریم اور ایک طرف ارباب بے سدھ سو جاتے تو میں گھنٹوں چھت تکتی اپنی بے خواب آنکھوں سے' دھندلی دھندلی روشنی میں چھت کو گھورتی رہتی جس پر پنکھے کی گردش سے پرچھائیاں لرزتی دکھائی دیتیں۔ ان پرچھائیوں کا ہجوم اتنا بڑھتا کہ بالآخر میں چادر میں منہ چھپا لیتی لیکن نیند پھر بھی آنکھ سے کوسوں دور

رہتی۔

بچوں کے بارے میں ارباب کے محسوسات بھی مجھ سے زیادہ مختلف نہیں تھے لیکن اس کا دھیان نہ جانے کتنی سمتوں میں بٹا رہتا۔ اس نے اپنا پیشہ ورانہ اور دیگر نشین دونوں ہی کام بہت پھیلا لیے تھے۔ وہ بہت مصروف رہتا تھا۔ اتنا مصروف جیسے کسی... تک کو فتح کرنے کی تیاری کر رہا ہو۔

ابولی وہ اب بھی دیتا تھا۔ اسے ترقی بھی مل گئی تھی اور فنی طور پر بھی معیاری کام ہونے لگا تھا۔ دفاتر میں چھٹی صرف اتوار کو ہوتی تھی لیکن ارباب وہ دن چھٹی کرتا اور ان دو دنوں میں گھر سے تقریباً غائب ہی رہتا۔ کبھی کبھار محض دو چار گھنٹے سونے کے لیے آجاتا۔ نہ جانے اب اس کے وہائٹ الیکس کی تعداد کیا تھی اور وہ کس منزل پر تھی؟ عرصے سے ان لوگوں نے گھر کے تہہ خانے میں اجلاس کرنا ترک کر دیا تھا۔ معلوم نہیں اب ان کا ٹھکانہ کہاں تھا۔ میں نے ارباب سے اس موضوع پر کچھ کہنا سننا چھوڑ دیا تھا۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ اس معاملے میں ہمارے درمیان ہم آہنگی پیدا ہونا تقریباً ناممکن ہی ہے لیکن میں بہرحال اس کی رفیق تھی۔ مستقبل کے پردے میں جو کچھ پنہاں تھا' اس کا سامنا کرنے کے لیے میں نے اسے تنہا نہیں چھوڑا تھا۔ اب جو بھی ہوتا' میں بہرحال اس کے ساتھ تھی۔

کاش مجھے معلوم ہوتا کہ یہ رفاقت مجھے کہاں لے جا رہی تھی... لیکن غیب کا حال تو کسی کو معلوم نہیں ہوتا جاں...!

تہہ خانے میں اب اجلاس تو نہیں ہوتے تھے لیکن وہاں لکڑی کی کئی پیٹیاں' بکس' صندوق وغیرہ ہلکی پھلکی چیزوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ یہ پیٹیاں مقفل تھیں۔ اس پر کسی قسم کا نہ ہی ارباب نے مجھے ان کے متعلق کچھ بتایا تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ ان؟

کبھی کبھی مجھے حیرت بھی ہوتی تھی کہ ارباب یہ سب کچھ کس طرح کر رہا ہے۔ اب ہم پر خوش حالی آچکی تھی۔ ارباب کی آمدنی میں خاصا اضافہ ہو چکا تھا۔ اس نے لے لی تھی حالانکہ جس محلے میں ہم رہتے تھے اس میں کار رکھنا تو درکنار ان دنوں قریب سے دیکھنے کا اتفاق بھی بہت کم لوگوں کو ہی ہوتا ہو گا' مگر پھر بھی جو کچھ کر رہا تھا وہ اس کی آمدنی میں ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ اس کی آمدنی تو گھربار اور بکھاوں ہی میں کھپ جاتی تھی۔ باقی سرگرمیاں کس طرح جاری تھیں؟

اس کے ساتھیوں میں بھی' مجھے کوئی صاحب ثروت نظر نہیں آتا تھا۔ تنظیم کا تو شاید بنیادی چندہ بھی مقرر نہیں کیا گیا تھا کیونکہ جتنے ارکان کو میں نے دیکھا تھا وہ تو مجھے چندہ ادا کرنے کے قابل بھی نظر نہیں آتے تھے۔ ان میں صرف ضمیر بیگ ہی کچھ حال معلوم ہوتا تھا۔ باقی سب تو شاید غربت و افلاس کے مارے' جھنجھلائے ہوئے اور ارباب کے زخم خوردہ لوگ تھے۔

ضمیر بیگ اب بھی گھر آتا جاتا تھا اور اس کے آنے کا کوئی خاص دن یا وقت مقرر تھا۔ وہ اور ارباب ایک ہی کمپنی میں ملازم تھے بلکہ دفتری عہدے کے لحاظ سے ضمیر ارباب کا افسر تھا لیکن تنظیم میں میرے اندازے کے مطابق اس کی حیثیت ثانوی ارباب کے نائب کی حیثیت تھی اس کی۔ وہ جب بھی آتا ارباب ڈرائنگ روم ان کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھ جاتا یا پھر وہ تہہ خانے میں چلے جاتے۔

خوشحالی کے باوجود ارباب نے مکان نہیں بدلا تھا حالانکہ رہن سہن کے اعتبار سے یہ شایان شان نہیں تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ تو تہہ خانہ تھا۔ بہت کم مکانوں میں تہہ خانے ہوتے ہیں۔ دوسرے اس مکان کا محل وقوع کچھ ایسا تھا کہ خواہ کتنے ہی لوگوں کی آمدورفت رہتی اردگرد رہنے والوں کو بمشکل ہی اس کا احساس ہو سکتا

تھا۔ اس علاقہ میں گو کہ قریب قریب متوسط طبقہ ہی آباد تھا مگر اس طبقے کی روایت کے برعکس لوگوں کو ایک دوسرے کی ٹوہ میں رہنے کی عادت نہیں تھی۔ اس مکان سے متعلق یہ خصوصیت بلاشبہ ارباب کیلئے بہت اہم تھیں۔

ایک روز کام پر روانہ ہوتے وقت ارباب نے دروازے پر رکتے ہوئے اچانک کہا ”مہم صاحب کی ابتدا تو ہونے لگی ہے۔“

”ہم تو اب اپنے دیرینہ دوست کے ٹھکانے کی طرف کوچ کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے کہ ہمارے جاسوس نے وہاں سے اطلاع بھیج دی ہے کہ آج کل وہ خود یہیں پہنچ گیا ہے۔“ ارباب مسکرا کر بولا۔

”تمہارا مطلب ہے نواب——“ میری آواز بیٹھ سی گئی۔

”ظاہر ہے اس کے علاوہ میں اس طرح خصوصیت سے کس کا تذکرہ کر سکتا ہوں؟“ وہ کچھ مسلسل بڑے مسرور انداز میں مسکرائے جا رہا تھا۔ ”شاید پہلے تمہیں میں نے نہیں بتایا کہ تقریباً ہر بڑے شہر میں اس موذی کا عشرت کدہ موجود ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ شکار خود ہی پھندے کی طرف آ رہا ہے اور بڑے صحیح وقت پر آیا ہے۔ میں اپنی تیاریاں مکمل کر چکا ہوں۔ اب مجھے صرف اس کی آمد کا انتظار تھا۔“

”تم کیا کرنا چاہتے ہو ارباب؟“ میں نے اپنی بے اعتدال دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”کیا تمہیں بھی مجھ سے یہ پوچھنے کی ضرورت ہے؟“

اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ ”کم از کم تمہیں تو معلوم ہونا چاہئے کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔“

میں خاموش ہو گئی اور اسی خاموشی کے ساتھ اسے رخصت کر کے دروازے سے پلٹ گئی۔ میرا دل ڈوب سا گیا تھا۔ نواب شرافت علی کے چیتھڑے اڑتے دیکھنا شاید میری زندگی کی شدید ترین خواہش تھی۔ اس مناسبت سے مجھے ارباب کی بات سن کر خوش ہونا چاہئے تھی بلکہ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اب ارباب پہلے کی طرح کمزور اور تنہا نہیں تھا مگر نہ جانے کیوں مجھے یہ سب کچھ—— بے وقت سا لگ رہا تھا۔ بہرحال میں نے کوشش کی کہ سب کچھ ذہن سے جھٹک دوں۔ میں نے اپنے آپ کو گھر کے کام کاج میں الجھا لیا لیکن ذہن کے کسی گوشے میں اندیشوں کی گھنٹیاں بجتی رہیں۔

شام کو ارباب کے گھر واپس آنے کا کوئی وقت مخصوص نہیں تھا مگر اندھیرا گہرا ہونے سے پہلے وہ بہرحال آ جاتا تھا۔ اس روز اندھیرا گہرا ہونے پر اس کی جگہ نصیر بیگ آیا اور اس کا اشتعال سا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ باریک کمانی کی عینک کے عقب سے آنکھیں گویا ابلی پڑ رہی تھیں۔ ایک اور شخص بھی اس کے ہمراہ تھا۔ اس کا نام غالباً عبداللہ

تھا۔ جن دنوں ”وہائٹ انجیلس“ کے اجلاس قحبہ خانہ میں ہوتے تھے ان دنوں میں نے اس شخص کو بھی آتے دیکھا تھا۔ اندر آتے ہی نصیر بیگ نے کانپتی انگلیوں سے دروازے کی چٹخنی چڑھا دی۔

”بھابی!“ کمرے میں پہنچ کر اس نے سرگوشی کی۔ ”جلدی سے بچوں کو سنبھالئے اور میرے ساتھ اس گھر سے چلئے یہاں چھاپہ پڑنے والا ہے۔“

”مگر کیوں؟“ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ ”ارباب کہاں ہے؟“

”میں راستے میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔“ وہ تیزی سے بولا۔ ”وقت ضائع نہ کیجئے آپ فوراً میرے ساتھ چلئے۔“

”کہاں؟“ میں نے پوچھا۔

”ایک محفوظ جگہ پر۔ پولیس کو ابھی تک ارباب کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہے کہ وہ شادی شدہ تھا لیکن اگر چھاپے کے وقت آپ یہاں موجود ہوئیں تو شاید عمر بھر آپ چھٹکارا نہ پا سکیں۔“ اس نے بے چینی سے انگلیاں مروڑتے ہوئے کہا۔

میں نے جلدی جلدی مریم کو کمبل میں لپیٹا اور جوتے پہنے۔ مریم سو رہی تھی۔ اسے عبداللہ نے اٹھا کر کندھے سے لگا لیا۔ تم جاگ رہے تھے، تمہیں نصیر بیگ نے گود میں اٹھا لیا۔

”مجھے ضرورت کی چند چیزیں تو لینے دو نصیر!“ میں نے گھبراہٹ میں ادھر ادھر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

”نہیں! آپ کو زیادہ سے زیادہ دو منٹ دے سکتا ہوں۔“ نصیر نے رکتے ہوئے کہا۔ ”آپ کوئی سامان وغیرہ اٹھانے کی کوشش نہ کیجئے۔ جہاں آپ جا رہی ہیں، وہاں آپ کی ضرورت کی ہر چیز ملے گی۔“

دو منٹ بعد ہم گھر سے نکلے۔ پہلے نصیر نے دروازے سے باہر سر نکال کر ادھر ادھر جھانکا پھر قدم باہر رکھا۔ اس کے پیچھے میں تھی اور مجھ سے چند قدم پیچھے عبداللہ۔ گلیوں میں تاریکی تھی۔ دائیں بائیں گلیوں میں مڑتے ہم تینوں لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگے۔

اس وقت ہماری جو حالت تھی شاید ایسی ہی حالت ان بچے کھچے سپاہیوں کی ہوتی ہوگی جن کے لشکر پر بدست شب خون مارا گیا ہو، مگر وہ اندھیرے کی لڑائی لڑنے کے بجائے کسی طرح جان بچا کر بھاگ آئے ہوں۔ اب عبداللہ آگے چل رہا تھا۔ وہ ایک تگڑا آدمی تھا اور مریم کو اس نے یوں آسانی سے صرف ایک ہاتھ کی مدد سے سینے سے لگا کر رکھا تھا جیسے اس کا کوئی وزن ہی نہ ہو۔ نصیر البتہ تمہیں اٹھائے ہوئے ہانپنے لگا تھا۔ میں نے تمہیں اس کی گود سے لینا بھی چاہا لیکن اس نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ اس طرح میں تیز نہ چل سکوں گی۔

خاصی دیر تک تاریک گلیوں میں چلتے رہنے کے بعد ہم قدرے کھلی سڑک پر نکلے ہی تھے کہ سامنے سے دو بڑی بڑی ہیڈ لائٹس اپنی طرف آتی دکھائی دیں۔

"پولیس جیپ!" نصیر نے سرگوشی کی اور مجھے ایک ہاتھ سے الٹے قدموں دھکیلتے ہوئے واپس گلی میں گھس گیا۔ اسی ہاتھ کے دباؤ سے اس نے مجھے دیوار کے ساتھ لگایا اور خود بھی دیوار سے چپک گیا۔ عین اسی لمحے تم نے سسکنا شروع کر دیا لیکن فوراً تمہاری آواز گھٹ کر رہ گئی۔ شاید نصیر نے سختی سے تمہارے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ عین اسی لمحے مجھے احساس ہوا کہ عبداللہ گلی میں نہیں پلٹ سکا تھا' کیونکہ وہ ہم سے کئی قدم آگے تھا' اور غالباً روشنی کی زد میں بھی آ گیا تھا۔

جیپ کی گھڑگھڑاہٹ بالکل قریب آ چکی تھی۔ پھر اس گھڑگھڑاہٹ کے ساتھ ہی میں نے ایک کرخت آواز سنی۔ "رک جاؤ۔"

ہمارے سامنے سڑک پر ہیڈ لائٹس کی روشنی ساکت ہو چکی تھی اور اس کے اجالے کی وجہ سے روشنی نظر آنے لگی تھی اور اس روشنی میں' میں نے عبداللہ کی پرچھائیں دیکھی۔ وہ احمق انسان مریم کو کندھے سے لگائے اندھا دھند بھاگتا جا رہا تھا۔

"رک جاؤ' ورنہ گولی مار دی جائے گی۔۔۔" وہ کرخت آواز دوبارہ ابھری' مگر عبداللہ رکا نہیں' پھر میں نے جیپ کو سڑک سے اتر کر عین اس گلی کے دہانے پر پہنچتے دیکھا۔ گلی تنگ تھی اس لئے جیپ وہیں رک گئی۔ البتہ اس میں سے پانچ چھ سپاہی بندوقیں سنبھالے کودے اور سب کے سب اندھا دھند گلی میں گھس گئے۔ جیپ میں صرف ڈرائیور رہ گیا تھا۔ ایک سپاہی نے گلی میں فائر کیا لیکن اس وقت تک عبداللہ کہیں غائب ہو چکا تھا۔

نصیر نے میرا ہاتھ پکڑا اور پیچھے اسی طرح کھسکنے لگا جس طرح سے ہم آئے تھے' لیکن میرے پاؤں تو اپنی جگہ گڑ کر رہ گئے تھے۔ "نصیر۔۔۔! میری بچی۔۔۔" میں نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ میں پوری قوت سے چیخنا چاہتی تھی' مگر نہ جانے کس طرح خود پر ضبط کیے ہوئے تھی۔

"یہ جذبات میں الجھنے کا وقت نہیں ہے بھابی!" اس نے جھنجھوڑتے ہوئے لہجے میں سرگوشی کی۔ "عبداللہ کو معلوم ہے کہ ہمیں کہاں جانا ہے۔ اگر وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تو وہ وہیں پہنچ جائے گا۔ آئیے۔"

میں اس کے ساتھ گھسٹنے لگی۔ کئی بار میں نے مڑ کر دیکھا لیکن اب گلی میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا' جدھر عبداللہ گیا تھا۔ کئی گلیوں میں چکرانے کے بعد ہم دوبارہ غالباً اسی سڑک پر آ گئے تھے' لیکن اس جگہ سے ہم یقیناً بہت دور نکل آئے تھے جہاں پولیس جیپ سے ہمارا سامنا ہوا تھا۔

کچھ دیر تک ہم مکانوں کی قطاروں کے ساتھ ساتھ چلتے رہے' پھر سڑک کے کنارے دور دور تک درختوں اور جھاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک جگہ درختوں کے نیچے مجھے ایک بگھی کھڑی نظر آئی۔ کوچوان اپنی نشست پر بڑے اطمینان سے ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھا بیڑی کے کش لے رہا تھا۔ نصیر بگھی کے قریب پہنچا تو اس نے بیڑی ایک طرف پھینک دی۔

"بہت دیر لگا دی۔" اس نے سرسری لہجے میں کہا اور باگیں سنبھال لیں۔

"فاصلہ بہت تھا' اور پھر راستے میں تھوڑی سی گڑبڑ ہو گئی۔ مزید چکر کاٹنا پڑا۔" نصیر بیگ نے جواب دیا اور بگھی کا پردہ ہٹا کر مجھے اندر بیٹھنے کا اشارہ کیا' پھر خود بھی میرے برابر بیٹھ کر پردہ گرا دیا۔ بگھی کا یہ حصہ چاروں طرف سے بند تھا۔ صرف دائیں طرف ایک چھوٹی سی جالی دار کھڑکی بنی ہوئی تھی' اور اس کھڑکی میں بن چمنی والا ایک چھوٹا سا کیروسین لیمپ فٹ تھا۔ نصیر نے تمہیں میری گود میں لٹا دیا۔ تم پر اب غنودگی سی طاری ہونے لگی تھی۔

بگھی نے چند جھٹکے لے کے پھر ہموار سڑک پر آ کر دوڑنا شروع کیا۔ گھوڑے کے ٹاپوں کی تیز آواز سڑک کی ویرانی کا پتہ دے رہی تھی۔ نصیر نے پچھلی نشست کے ایک سرے پر کھسک کے گدیلے پیچھے سے ٹیک لگائی اور واسکٹ کی جیب سے قینچی کیپسٹن کا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ سلگائی اور گہرے گہرے کش لینے لگا۔ اب وہ خاصا پرسکون نظر آ رہا تھا۔ کئی منٹ گزر گئے۔

بالآخر میں نے کہا۔ "تم نے کہا تھا کہ راستے میں سب کچھ بتا دو گے۔ سب سے پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ ارباب کہاں ہے؟"

"وہ مر چکا ہے۔" اس نے دھیمے اور سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"نہیں۔" میں سمجھی تھی کہ میرے حلق سے یہ لفظ ایک فلک شگاف چیخ کے ساتھ برآمد ہوا ہے' لیکن پھر مجھے احساس ہوا کہ میرے ہونٹ وا ضرور ہوئے تھے لیکن میرے حلق سے کوئی آواز نہیں نکلی تھی۔ یہ لفظ۔ "نہیں" میں نے صرف سوچا تھا اسے آواز نہیں مل سکی تھی۔

شاید مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا تھا' کیونکہ دوبارہ جب میں احساسات کی دنیا میں واپس آئی تو نصیر گھبرائے ہوئے انداز میں میرا کندھا ہلا رہا تھا۔ میں نے آہستگی سے اس کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹایا۔ تمہیں گود میں سمیٹ کر تم پر یوں چادر تان لی گویا میں تمہارے ننھے سے وجود کے گرد ایک حصار تعمیر کر رہی ہوں تاکہ برے لفظوں کی آہٹ' برے وقت کا سایہ اور بری خبروں کا زہر تم تک نہ پہنچ سکے۔ میرا دل یکلخت یوں سن ہو گیا تھا' گویا شریانوں میں لہو کی بجائے پگھلی برف کا آبشار اس میں گرنے لگا ہو۔

بگھی اسی رفتار سے بھاگی جا رہی تھی۔ اب آس پاس سے کبھی کبھار کسی گاڑی وغیرہ

سے گزرنے کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ شاید اب بگھی کا رخ کسی آباد علاقے کی طرف تھا۔

"یہ کیسے ہوا؟" بالآخر میں نے اپنے لہو لہو آنسوؤں کو پلکوں ہی پر روک کر پوچھا۔ نصیر نے گہری سانس لی۔ گویا مجھے بولتے دیکھ کر اسے اطمینان ہوا ہو۔ وہ ایک بار پھر پردے کو ہٹا کر بیٹھ گیا اور نئی سگریٹ سلگانے لگا۔

"وہ کریم کے علاقے میں ایک پراجیکٹ کی سائٹ کا معائنہ کر کے واپس آ رہا تھا۔" نصیر نے ایک طویل کش لے کر کیروسین لیمپ کو گھورتے ہوئے کہا۔ "گندے نالے کی پلیا پر ایک بہت بڑے ٹرک نے بڑے عجیب طریقے سے اس کی کار کو ٹکر مار دی۔ کار بہک کر لڑھکتی ہوئی نشیب میں پھیلی سڑک پر جا گری اور فوراً ہی اس نے آگ پکڑ لی۔ پروگرام کے مطابق میں کچھ دیر بعد سائٹ سے واپس روانہ ہوا تو میں نے راستے میں ہجوم دیکھا۔ عینی شاہدوں نے مجھے حادثے کی تفصیل بتائی۔ ٹرک حادثے کے فوراً بعد ہی غائب ہو گیا۔ میں جس وقت وہاں پہنچا لوگوں نے آگ بجھا لی تھی' لیکن کار کیا' محض سیاہ لوہے کے ٹکڑوں کا ایک ڈھیر رہ گیا تھا۔ صرف ایک نمبر پلیٹ جو ٹوٹ کر دور جا گری تھی اس سے میں نے کار کو پہچانا۔ اب تم اندازہ کر سکتی ہو کہ لاش کی کیا حالت ہو چکی ہو گی۔ بس یوں سمجھ لو کہ راکھ کا ایک ڈھیر بچا تھا۔"

اس نے خاموش ہو کر مضطربانہ انداز میں سگریٹ کے دو تین کش لیے۔ "نہ جانے کیوں میرا ماتھا ٹھنکا۔ آج شام ہماری ایک مہم طے تھی۔ تنظیم کے کئی ارکان کے پاس ہتھیار تھے۔ میرے تھیلے میں بھی تمنچہ اور پستول موجود تھا۔ میں نے موقع پا کر وہ دونوں چیزیں وہیں گندے نالے میں پھینک دیں اور دفتر واپس جانے کے بجائے ایک اور جگہ چلا گیا۔ وہاں سے میں نے دفتر اپنے ایک خاص آدمی کو فون کیا۔ میرے اندیشوں کی تصدیق ہو گئی۔ تنظیم کے جو رکن کمپنی میں ملازم تھے انہیں تو وہیں گرفتار کر لیا گیا اور باقی کو دوسری جگہوں سے۔ انہیں انگریز سرکار سے غداری اور زیر زمین سرگرمیوں کے جرم میں پکڑا گیا تھا اور جتنی کامیابی سے یہ کارروائی ہوئی تھی اس سے صاف ظاہر تھا کہ تنظیم ہی میں سے کسی نے غداری کی ہے' لیکن مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ غدار نے اگر صرف پولیس کو مطلع کیا تھا تو وہ ارباب کو بھی زندہ ہی گرفتار کرتی۔ اسے اتنے پراسرار انداز میں کیوں مارا گیا---؟"

"غدار نے شاید ایک شخص کو مطلع کیا ہو گا' اور باقی ساری کارروائی کیلئے اس شخص نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ڈوریاں ہلائی ہوں گی۔" میں نے مدھم آواز میں گویا اپنے آپ کو بتایا۔

"آپ کا مطلب ہے نواب---؟" اس نے سنبھل کر میری طرف دیکھا۔ میں نے

ہستگی سے اثبات میں سر ہلایا تو ڈبڈبائی آنکھیں چھلک پڑیں۔ پہلا آنسو گویا بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوا۔ ایک بار آنکھیں چھلکیں تو گویا سیلاب ہی امڈ آیا' لیکن میں نے نہایت ہوشی سے چادر کا پلو آنکھوں پر رکھ کر اس سیلاب کا ریلا جذب کر لیا اور ایک بار پھر کسی نہ کسی طرح اس کی روانی پر بند باندھ دیا۔

آنسوؤں سے نظریں ہی نہیں' عقل و حواس بھی دھندلا جاتے ہیں' اور میں نے زندگی کے اب تک کے مصائب سے ایک ہی تجربہ حاصل کیا تھا کہ سانحوں پر صرف ماتم کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ چند لمحوں کے لیے سنبھل کر اگر یہ بھی دیکھ لیا جائے کہ ساتھ بچ بچا کر کیا کچھ لایا جا سکتا ہے تو مزید بہت سی تباہ کاریوں سے بچنے میں مدد مل سکتی ہے۔

"مگر میرے علاوہ کسی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ آج کی مہم کا بھی مقرر کیا ہے۔" نصیر نے سوچ میں ڈوبتے ہوئے کہا۔ "باقی سب نے تو آنکھیں بند کر کے ہدایات کی تعمیل کرنا تھی۔"

"عبداللہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اسے تو میں خود بروقت گھر سے نکال کر لایا ہوں۔ چند منٹ بعد ہی اس کے ہاں بھی چھاپہ پڑا ہے۔" نصیر بیگ نے جواب دیا۔ "اور اس کے علاوہ تمہیں کے ہمیں آدمیوں میں سے شاید ہی کوئی بچا ہو۔"

عبداللہ کا خیال آتے ہی میرا تمام ساحل گویا ریزہ ریزہ ہونے لگا۔ پولیس اس کے تعاقب میں تھی۔ ان کی بندوقوں کی گولیاں لہو چاٹنے کیلئے بے قرار تھیں--- اور--- عبداللہ کی گود میں میری بچی تھی۔ خدایا! اسے محفوظ رکھنا۔ میں تجھ سے کبھی کچھ اور نہیں مانگوں گی--- زندگی نے اب تک مجھ سے جو جو ظلم روا رکھے اس کا شکوہ بھی نہیں کروں گی۔ بس اس کی جان بخشی کر دینا۔

یہ دعا میں نے بے اختیار دل ہی دل میں مانگ لی تھی' مگر اس کی قبولیت کی امید کم ہی تھی' کچھ لوگ شاید پیدا ہی نحوست ہوتے ہیں اور مجھے اب اپنی نحوست کا یقین ہو چلا تھا۔ میرے لئے اگر کوئی خوشی آئی بھی تھی تو اس کے تعاقب میں آلام و آفات کا ایک ہجوم ہوتا تھا۔ میرے لئے تو شاید مناسب ہی تھا کہ کبھی بھول کر بھی--- کاتب تقدیر سے کسی مسرت کی بھیک نہ مانگوں۔

بگھی شاید کسی بارونق علاقے سے گزر رہی تھی۔ ٹریفک کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور کیروسین لیمپ کے عقب میں جھولتی ہوئی جالی دار کھڑکی سے روشنیاں پیچھے جاتی دکھائی دے رہی تھیں۔ بگھی کی رفتار کم ہو گئی تھی' لیکن کچھ ہی دیر بعد رفتار پھر بڑھ گئی اور گرد و پیش کے سناٹے کا احساس ایک بار پھر ہونے لگا۔ اب پھر سڑک پر صرف گھوڑے کی ٹاپیں ہی گونج رہی تھیں۔

بالآخر بگھی رک گئی۔ قریب ہی ایسی گڑگڑاہٹ سنائی دی جیسے لوہے کا کوئی بھاری بھرکم گیٹ کھولا گیا ہو' پھر ایک شخص نے پردہ اٹھا کر بگھی کے اندر جھانکا۔ سپاٹ سی نظروں سے اس نے ہمارا جائزہ لیا اور پردہ گرا دیا۔ بگھی آگے بڑھ گئی اور مزید تھوڑا فاصلہ طے کر کے رک گئی۔

نصیر بیگ بگھی سے اتر کر پردہ سمیٹ کر کھڑا ہو گیا۔ "اتر آیئے۔"

اس نے مجھے سہارا دینے کیلئے ایک ہاتھ بڑھایا۔ تم سو چکے تھے۔ میں تمہیں کندھے سے لگائے بگھی سے اتری اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ ہم سرخ پتھر کی بنی ہوئی ایک کوٹھی کے وسیع و عریض احاطے میں کھڑے تھے۔ برآمدے کی سیڑھیاں سامنے ہی تھیں اور برآمدے کی چھت میں فانوس اور چھت سے اوپر کوٹھی کی محرابی پیشانی پر جڑے سے بلب شیڈ میں ایک طاقتور بلب روشن تھا۔ باقی عمارت باہر سے تاریکی کی قبا اوڑھے کسی دیو ہیکل پرچھائیں کی طرح کھڑی نظر آ رہی تھی۔

نصیر بیگ میرا ہاتھ تھامے برآمدے کی طرف بڑھا۔ سیڑھیاں عبور کر کے اس نے دروازے پر دستک دی۔ ایک طویل القامت نوجوان نے دروازہ کھولا اور نصیر کو دیکھ کر خاموشی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ ہم ایک آراستہ و پیراستہ نشست گاہ میں داخل ہوئے۔ اس طویل و عریض کمرے کی آرائش اور شان و شوکت دیکھ کر مجھے حیرت ہونے لگی کہ اگر یہ ڈیانٹ انجلس کی پناہ گاہ تھی تو پھر وہ واقعی بہت منظم ہو چکے تھے۔

نشست گاہ میں کوئی بھی نہیں تھا۔ نصیر میرا ہاتھ تھامے ایک اور دروازے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اس دروازے سے ہم ایک طویل راہداری میں نکلے۔ جس میں دونوں طرف کمروں کے دروازے نظر آ رہے تھے۔ مدھم سی روشنی میں یہاں کا فرش سطح آب کی طرح چمک رہا تھا۔ راہداری کے اختتام پر ایک بڑا دروازہ تھا جس کے قریب سٹول پر ایک شخص دیوار سے ٹیک لگائے گردوپیش سے لاتعلق سا بیٹھا تھا۔ اس کی گود میں ایک رائفل رکھی تھی۔ ہمیں دیکھ کر بھی اس نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی' صرف ہونٹ غیر محسوس طور پر ہلائے۔ "تمہارا انتظار ہو رہا ہے۔"

نصیر نے کوئی جواب نہ دیا اور ایک ہاتھ سے دروازہ کھولتے ہی دوسرے ہاتھ سے مجھے نہایت نرمی سے آگے کو دھکیلا۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی اچانک میرے ذہن کے کسی گوشے میں خطرے کی گھنٹی سی بجی' لیکن مجھے تاخیر ہو چکی تھی۔ نصیر میرے عقب میں دروازہ بند کر چکا تھا' اور خود دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

ہال نما اس وسیع کمرے کے وسط میں تین افراد موجود تھے۔ ایک لمبا تڑنگا سیاہ فام جاٹ جو تنومندی بھینسے کی طرح ایک طرف ایستادہ تھا۔ اس کے سامنے ایک نہایت شاندار مخملیں آرام کرسی بچھی ہوئی تھی جس پر نواب شرافت علی خاں نیم دراز تھا۔ اس کے

قدموں میں ایک گوری ریشمی بال اس کی کمر اور شانوں پر سے ہوتے ہوئے قالین تک پہنچے ہوئے تھے۔ عورت حسین نہیں تھی مگر اس کا جسم نہایت حسین تھا۔ وہ نواب کی ہدایت پاؤں اپنی گود میں لئے بیٹھی تھی اور ایک خوبصورت قینچی سے نہایت انہماک اور احتیاط کے ساتھ اس کے ناخن کاٹ رہی تھی۔

نواب نے دھاری دار چمکیلے سے کپڑے کا گاؤن پہن رکھا تھا جس کے ساتھ اس کی سیاہ رنگت کا تضاد کچھ زیادہ نمایاں محسوس ہو رہا تھا۔ اسے آخری بار دیکھے ہوئے مجھے کوئی بہت طویل مدت نہیں گزری تھی' مگر اس میں بہت سی تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ بالوں کی سفیدی بڑھ گئی تھی' جبڑوں کا گوشت لٹک گیا تھا' چہرے پر شکنیں نمودار ہو چکی تھیں۔ میں نے ایک ہی نظر میں اس کا سرتاپا جائزہ لیا اور نصیر بیگ کی طرف مڑی۔

"غدار تم ہی تھے نصیر بیگ!" مجھے اپنی آواز زخمی سانپ کی پھنکار سے مشابہ معلوم ہوئی۔ اگر محض لفظوں سے کسی کو قتل کرنا ممکن ہوتا تو شاید میرے ہر لفظ سے نصیر بیگ کئی مرتبہ قتل ہو چکا ہوتا۔

نصیر بیگ کے چہرے کے تاثرات گویا یکلخت ہی بدل گئے تھے وہ اب ایک شرمیلے اور محنتی سے نوجوان کے بجائے ایک شاطر شخص نظر آ رہا تھا۔ اس نے گویا اچانک ہی کینچلی بدل لی تھی۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکا اور انتہائی مکارانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "جی ہاں محترمہ پہلے میں نے تھرپار سے رابطہ کر کے اپنی قیمت پوچھی تھی۔ غداری کا معاوضہ چونکہ نہایت شاندار مل رہا تھا اس لئے میں نے آمادگی ظاہر کرنا ہی مناسب سمجھا۔ ایسے موقعے زندگی میں بار بار تو نہیں آتے ہیں؟" اس کی شکل مجھے نواب سے بھی زیادہ مکروہ لگنے لگی تھی۔ میں نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ نواب آرام کرسی پر سنبھل کر بیٹھ چکا تھا۔ پاؤں اس نے عورت کی گود سے کھینچ لئے تھے اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے بڑی دلچسپی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"ہیرے کو اندھا سو کوس سے ڈھونڈ لیتا ہے۔" نواب نے گاؤن ہٹا کر اپنا گھٹنا کھجاتے ہوئے کہا۔ "ارے بدبخت! تجھے وہ مردود ارباب ہی ملا تھا بیاہ رچانے کو۔۔۔۔؟"

"خونخوار کالے شیطان! اگر تو نے میرے شوہر کے متعلق ایک بھی لفظ منہ سے نکالا تو۔۔۔۔" میں اس بری طرح چیخی کہ میری آواز پھٹ گئی۔

"تو تم کیا کرو گی جان من؟" نواب نے بدستور مسکراتے ہوئے خلاف توقع بڑے رسیلے مگر دھیمے لہجے میں پوچھا۔ میرے سینے میں بے بسی کا طوفان سا اٹھا' مگر میں نے آنکھوں سے آنسو نہ چھلکنے دیئے۔ مجھے معلوم تھا کہ شکار جتنا تڑپے' جتنا چلائے' صیاد اتنا ہی لطف اندوز ہوتا ہے۔

"جس طرح تم نے ہمیں مخاطب کیا ہے شاید اس پر ہم تمہاری زبان گدی سے

کھنچوا لیتے۔" نواب نے خلاف توقع اپنا ملائم لہجہ برقرار رکھا۔ "لیکن اب ہماری عادتیں بدل گئی ہیں۔ ہم جیسے ٹھنڈے دل سے سوچنے اور عمل کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ شاید یہ ڈھلتی ہوئی عمر کا تقاضا ہے' یا پھر دو مرتبہ موت کو نہایت قریب سے دیکھ لینے کا نتیجہ ہے۔ اب یہی دیکھ لو کہ ارباب اور تمہارا سراغ ملنے کے بعد ہم چاہتے تو خود اپنے ہی آدمیوں سے تم دونوں کو اٹھوا لیتے۔ یا جس طرح بے وقوفوں کی اس تنظیم کی سن گن پولیس کمشنر کو فراہم کی جا چکی تھی ان کے ساتھ ساتھ ہم تم دونوں میاں بیوی کو گرفتار ہونے دیتے۔ لیکن اس طرح معاملہ بہت لمبا ہو جاتا۔ مقدمہ چلتا اور ہمارے دشمنوں کو نہ جانے کیا سزا ملتی۔ اس لئے ہم نے نہایت عمدگی سے وہ طریقہ اختیار کیا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ اب ہم خود کوئی غلط عمل نہیں چلتے اور اپنی کارروائیوں کا کوئی ثبوت نہیں چھوڑتے' کیونکہ آج کل انگریز سرکار کو انصاف پسند کہلانے کا بہت شوق پیدا ہو گیا ہے اور وہ رسمی طور پر ہی سہی لیکن بہرحال شہادتوں اور مقدمے کی کارروائیاں پوری کرنے کے عادی ہو گئی ہے۔ اب ہم لاکھ ٹھنڈے دماغ کے سہی لیکن اپنے دشمنوں کو انجام کو پہنچتے دیکھنے کیلئے اتنا طویل انتظار بھی نہیں کر سکتے تھے خصوصاً جب ہمیں ان کا سراغ بھی مل چکا تھا۔۔۔"

"ویسے جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے۔۔۔" نواب کے ماتھے پر شکنیں گہری ہو گئیں۔ "ہم نے تمہیں قید خانے میں ڈلوایا تھا وہاں سے فرار ہونے میں تم کیسے کامیاب ہو گئیں اور ارباب سے کیسے جا ٹکرائیں؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بدستور اسے اپنی جگہ کھڑی گھورتی رہی۔ میرا کچھ بولنے کو جی ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ مایوسی و شکستگی کی آخری حد ہو یا غم و غصے کی انتہا۔ دونوں صورتوں میں انسان کی قوت گویائی سلب ہو کر رہ جاتی ہے لیکن میں نہیں کہہ سکتی کہ میں مایوسی و شکستگی کی آخری حد پر تھی یا غم و غصے کی انتہا پر۔ شاید ان مختصر وقت میں پے درپے اتنے صدمات نے میرے حواس کو جو دھچکے پہنچائے تھے انہوں نے مجھے سوچنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔

نواب نے چند لمحے تک میری طرف منتظر نگاہوں سے دیکھا' لیکن جب میں نے کوئی جواب نہ دیا تو کندھے اچکا کر بولا۔ "خیر۔۔۔ نہیں بتانا چاہتیں تو نہ سہی۔ ہمیں بھی گزری باتوں سے اب کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی۔"

باتوں کی آواز تمہاری نیند میں خلل ہو رہی تھی اور تم نے میرے بازو پر کسمسانا شروع کر دیا تھا۔ تمہیں اٹھائے اٹھائے ویسے بھی میرا بازو شل ہونے لگا تھا۔ دفعتاً تم نے آنکھیں کھول دیں۔ اور معصوم سی حیرانی کے ساتھ چاروں طرف دیکھا۔ اجنبی ماحول اور اجنبی صورتیں دیکھ کر تم رونے لگے۔ میں نے تمہیں قالین پر کھڑا کر دیا اور گھٹنوں کے بل

تمہارے قریب بیٹھ کر تمہیں چپ کرانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس لمحے ایک بار پھر میری نظر ضمیر بیگ پر پڑی۔

"عبداللہ بھی تمہارے ساتھ ہی بک گیا تھا کیا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں اس بے چارے کو کچھ بھی نہیں معلوم۔" ضمیر بیگ نے مسکرا کر جواب دیا

گیا میں نے اس کا مزاج پوچھا۔

"اس کا مطلب ہے کہ اگر وہ بچ بھی گیا تو میری بچی کو لے کر یہاں نہیں پہنچ سکے گا۔" میرے مجروح دل میں ایک اور ٹیس اٹھی۔

"نہیں! اسے اس جگہ کا پتا ہی نہیں۔ اسے تو میں نے محض تھوڑی بہت مدد کیلئے ساتھ لے لیا تھا۔ راستے ہی میں اسے میں نے ٹرخا دیا تھا۔" ضمیر بیگ نے لاابالی سے جواب دیا۔

اس کے چہرے پر شرمندگی' ندامت یا تاسف کی ہلکی سی رمق تک نہیں تھی۔ ارباب سے ایک مدت کی دوستی اور احسان مندیاں سہہ رہی ہے۔ ہوس کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھاتے ہوئے اسے شاید ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوئی تھی۔ ارباب شاید اس دنیا میں نہیں تھا اور مرنے والوں کے بارے میں اچھا ہی سوچنا چاہئے۔ خصوصاً جبکہ وہ آپ کی زندگی کا حاصل رہے ہوں۔ لیکن مجھے ارباب پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ اس شخص ضمیر بیگ سے اس کا دن رات کا ساتھ تھا۔ کیا اسے کبھی شبہ تک نہیں ہوا تھا کہ اس شخص میں ضمیر نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے؟ اگر ارباب اتنا ہی مردم ناشناس تھا تو پھر اس کا انجام یہی ہو سکتا تھا۔

"تم نے مجھے یہاں کیوں بلوایا تھا؟" میں نے نواب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ تم نے اب باقاعدہ رونا شروع کر دیا تھا اور میری تمام تر کوشش کے باوجود تم چپ نہیں ہو رہے تھے۔

"بتا دیں گے۔۔۔ بتا دیں گے۔ پہلے اس روتی صورت کو تو چپ کراؤ۔" نواب نے تمہاری طرف اشارہ کیا۔

دفعتاً لمبا تڑنگا سیاہ فام جاٹ آگے آیا اور تمہاری طرف دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولا۔ "لاؤ اسے میں باہر پہنچا دوں۔"

تم اس کی ڈراؤنی صورت دیکھ کر اور بھی زور زور سے رونے لگے۔ ساتھ ہی تم نے اپنے ننھے سے ہاتھ سے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ پرے ہٹانے کی کوشش کی اور مجھ سے چمٹ گئے۔ جاٹ نے اپنے بھاری جوتے سے تمہاری ننھی منی ٹانگوں پر ہلکی سی ضرب لگائی۔ ضرب تو ہلکی تھی' مگر تم ایک ننھے سے بچے کیلئے تو ناقابل برداشت ہی تھی۔ تم بلبلا اٹھے اور بری طرح مجھ سے چمٹ گئے۔

اب تک مجھ پر جو جسمانی اور روحانی اذیتیں گزر چکی تھیں۔ ان کا حال میں کہہ ہی

چکی ہوں لیکن جتنی تکلیف مجھے تمہاری اس چیخ سے ضرب کے پڑنے اور تمہارے بلبلا کر رونے سے پہنچی تھی اتنی اب تک کسی بھی ظلم اور تشدد سے نہیں پہنچی تھی۔

میرے سینے میں جیسے آتش فشاں سا پھٹ پڑا۔ میں نے تمہیں ایک طرف بٹھایا اور اس سیاہ فام درندے پر جھپٹ پڑی۔ نہ جانے مجھ میں اتنی ہمت کہاں سے آ گئی تھی کہ دونوں ہاتھ جوڑ کر جب میں نے اس کے چہرے پر ضرب لگائی تو وہ ڈگمگا کر پیچھے کو لڑکھڑایا۔ ساتھ ہی میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر چبا ڈالا۔ اس کے حلق سے غراہٹ نما چیخ سی نکلی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے سنبھل کر میرے پیٹ میں گھونسا رسید کیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے لوہے کا بڑا سا ہتھوڑا میرے پیٹ پر پڑا ہو۔ آنتیں یک لخت گویا ایک ہی نقطے پر سمٹ کر رہ گئیں اور میں چکرا کر قالین پر ڈھیر ہو گئی۔ میری آنکھوں کے سامنے چھایا اندھیرا دوسرے ہی لمحے غائب ہو گیا تھا لیکن کوشش کے باوجود میں اٹھ کر نہیں بیٹھ سکی۔

"ارے او نابکار!" میں نے نواب کی آواز سن کر اس کی طرف دیکھا۔ بظاہر اس نے بڑی سنجیدگی سے ڈانٹنے کے سے انداز میں جاٹ کو مخاطب کیا لیکن اس کے ہونٹوں کے گوشوں سے مسکراہٹ پھوٹی پڑ رہی تھی۔ "ارے ان کو مت مار تجھے معلوم نہیں یہ تیرے میاں ایک بہت بڑی تنظیم وائٹ اینجلس کے سربراہ کے صاحب زادے ہیں--- اور یہ ان مرحوم سربراہ کی بیوہ ہیں—— کچھ تو ان کا احترام کر——"

اس کے لہجے میں چھپے ہوئے طنز کی کاٹ پر میں تڑپنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکی تھی۔ تم روتے ہوئے میرے قریب آ بیٹھے تھے۔ بمشکل تمام میں ایک کہنی کے بل اٹھی اور تمہیں سینے سے چمٹانے کی کوشش کرنے لگی۔

دفعتاً میں نے اس عورت کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا جو اب تک نہایت لاتعلقی سے ایک طرف کو بیٹھی تھی۔ قریب آ کر اس نے تمہیں گود میں اٹھایا اور والہانہ انداز میں چومنے اور چمکارنے لگی، پھر اس نے جھک کر میری طرف دیکھا اس کا چہرہ اب بھی تقریباً سپاٹ ہی تھا، لیکن اس کی آنکھوں میں جذبوں کی نرماہٹ اور آنسوؤں کا غبار سا اتر آیا تھا۔

"میں اسے ایک دوسرے کمرے میں لے جا رہی ہوں۔" اس نے نسبتاً ہی نرم اور مدھم آواز میں کہا جسے شاید میں ہی سن سکی تھی۔ "مطمئن رہنا۔ اسے کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔" اس کے لہجے میں صداقت کی خوشبو تھی۔ میرے دل کو قدرے اطمینان سا محسوس ہوا۔ وہ تمہیں بہلاتی، پچکارتی کمرے سے لے گئی اور چند لمحوں بعد بالآخر تمہارے رونے کی آواز معدوم ہو گئی۔

"اسے لو کن کٹے!" نواب نے دوبارہ سیاہ فام جاٹ کو مخاطب کیا اور تب میں نے دھیان سے دیکھا اس دیو زاد کا دایاں کان واقعی آدھے سے زیادہ کٹا ہوا تھا۔ وہ نواب کی طرف دیکھ کر مسکرایا تو نواب نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ارے! مرحوم و مغفور سربراہ کی بیوی کو کرسی پیش کر—— یہ کوئی میزبانی کا طریقہ تو نہیں۔"

اس عفریت زادے نے دونوں ہاتھ بغلوں میں دے کر مجھے اٹھایا اور ایک کرسی پر تقریباً ٹکا دیا۔ میری نظر نصیر بیگ پر پڑی جو کمرے کے وسط میں آ چکا تھا۔ "نواب صاحب!" اس نے مضطربانہ لہجے میں کہا۔ "آپ میرا باقی حساب بھی صاف کر دیجئے مجھے ملک سے باہر جانے کا انتظام بھی کرنا ہے۔"

"کیوں نہیں بھئی۔" نواب نے انتہائی شفقت سے کہا۔ "تم نے اپنا کام نہایت عمدگی سے کیا اور تنظیم مرحوم سربراہ کی بیوہ کو شبہ تک نہیں ہونے دیا کہ انہیں کہاں لے جایا جا رہا ہے—— ہاں تو تمہارا کتنا روپیہ باقی ہے؟"

"دو لاکھ۔" نصیر نے جھک کر نہایت خاکساری سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"رقم لائی جائے۔" نواب نے کن کٹے سیاہ فام کو اشارہ کیا۔ وہ احتراماً جھکا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ اس کا ہاتھ بجلی کی سی تیزی سے گھوما اور نصیر بیگ کی کنپٹی پر پڑا۔ وہ اچھل کر دور جا گرا۔ اس کی عینک نہ جانے کہاں غائب ہو گئی۔ میرے اندازے کے مطابق اس ضرب سے اس کو کئی دن تک کے لئے بے ہوش ہو جانا چاہئے تھا مگر اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ اوندھے منہ گرتے ہی ناقابل یقین پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا اور جب وہ پلٹا تو اس کے ہاتھ میں دو دھاری چمکیلا خنجر تھا۔ جسے اس نے نوک کی طرف سے انگوٹھے اور انگلی کے درمیان سے پکڑا ہوا تھا۔

"میری طرف مت بڑھنا۔" وہ پیچھے ہٹتے ہوئے اور ایک ٹک کن کٹے کو گھورتے ہوئے سانپ کی طرح پھنکارا۔

دفعتاً نصیر بیگ کے ہاتھوں نے عجیب و غریب انداز میں جھٹکا کھایا اور اس کے ساتھ ہی میں نے خنجر اس رفتار سے اس کے ہاتھ سے نکل کر کن کٹے کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا کہ ایک لمحے کیلئے وہ بس لمبی سی چمکتی لکیر کی طرح دکھائی دیا۔ کن کٹے نے ایک بار بھی پلک نہیں جھپکائی۔ وہ صرف معمولی سا خم کھا کر خنجر کی لپک سے ذرہ بھر ہی کے ساتھ ایک طرف کو ہوا اور خنجر اس کے قریب سے گزر کر پیچھے دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس کی نوک سے پلستر دیوار سے جھڑ گیا۔ نصیر بیگ اب ایک کونے میں پھنس چکا تھا۔ عینک کے بغیر اس کی آنکھیں کچھ چندی چندی اور ابھری ابھری سی لگ رہی تھیں۔

"اسے روکو نواب شرافت علی۔" نصیر بیگ چلایا۔ اس کی نظریں بدستور کن کٹے پر جمی ہوئی تھیں۔ گو کہ مخاطب اس نے نواب کو کیا تھا۔

"ہم ابھی حرمین کو جا رہے تھے ہیں!" نواب کی نہایت پرسکون آواز ابھری میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی اس طرح کرسی پر نیم دراز تھا۔ "کہ اب ہم ہر کام نہایت

غلطے دل سے سوچ سمجھ کر کرنے کے عادی ہو گئے ہیں اور اب ہم اپنی کارروائیوں کا کوئی ثبوت نہیں چھوڑتے۔ تو جانِ شرافت! ہم تمہیں جیتی جاگتی ایک چلتے پھرتے ثبوت کو کس طرح چھوڑ سکتے ہیں۔ خود ہی انصاف کرو اور بتاؤ ——— ہیں؟ تم نے اپنے اس دوست کو کیا نہیں بتایا جس کے گھر کا تم نے نمک کھایا تھا اور جس نے تم پر اعتماد کرتے ہوئے گویا اپنی شہ رگ تمہارے ہاتھ میں دے رکھی تھی؟ تو ہم کونسا تمہارے دل جلے ہیں جو کل کو تم ہمیں بخش دو گے؟"

تبھی اسی لمحے نصیر بیگ نے ہوا میں قلابازی کھا کر کن کٹے کے سینے پر فلائنگ کک ماری مگر یہ فلائنگ کک کن کٹے کے ایک سینہ چٹان پر پڑی تھی۔ جو دھیرے دھیرے آگے کو کھسک رہی تھی۔ نصیر بیگ جب سنبھل کر اٹھا تو اسے سیدھا ہونے کی مہلت نہیں ملی۔ کن کٹے نے اس کی کھوپڑی پر گھونسا رسید کیا تو نصیر کی ٹانگیں مضحکہ خیز انداز میں مڑ گئیں اور دوسرے ہی لمحے وہ گھٹنوں کے بل گرا ادھر ادھر کو جھولنے لگا۔

اس سے پہلے کہ وہ قالین پر ڈھیر ہوتا کن کٹے نے نہایت پھرتی سے اپنے لباس کے کسی حصے سے ریشم کی انتہائی پتلی مگر انتہائی مضبوط ڈوری کا ایک ٹکڑا نکالا اور نصیر بیگ کی گردن میں پھندا ڈال کر اسے ایک جھٹکے سے دوبارہ اپنے سامنے کھڑا کر لیا۔ چند ہی لمحوں بعد ڈوری کا پھندا اتنا سخت ہو گیا کہ وہ گردن کی کھال اور عضلات میں دھنس کر تقریباً غائب ہو گئی۔

○

نصیر بیگ کی نہ صرف گردن کی رگیں خوفناک حد تک پھول گئیں بلکہ اس کی پیشانی پر بھی رگیں ابھر آئیں، آنکھیں ابل پڑیں۔ وہ صرف ایک لمحے کیلئے زخمی پرندے کی طرح پھڑکا پھر اس کے بازو ڈھیلے ہو کر اس کے پہلو میں جھول گئے اور سر بھی ایک طرف کو ڈھلک گیا۔

کن کٹے نے نہایت آہستگی سے اسے قالین پر لٹا دیا اور ڈوری اس کی گردن ہی میں پیوست چھوڑ کر مودبانہ انداز میں نواب کی کرسی کے قریب یوں آ کھڑا ہوا گویا بہت دیر سے یہاں ہی کھڑا تھا اور اس نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہیں کی تھی۔

"برکت بیگ کو بلاؤ۔" نواب نے اسے حکم دیا۔ وہ دروازے تک گیا اور ایک پٹ تھوڑا سا کھول کر باہر جھانک کر دھیمی آواز میں کچھ کہا اور واپس آ گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے وہی شخص دروازہ کھول کر اندر آیا جسے میں نے دروازے کے قریب سٹول پر بیٹھے دیکھا تھا۔ واکی ٹاکی اب اس نے کندھے سے لٹکا رکھی تھی۔

"برکت! یہ مالی پارسل کرنا ہے۔" نواب نے نصیر بیگ کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کے اپنے ہی گھر کے ایڈریس پر۔ آثار ایسے ہی نظر آنے چاہئیں جیسے تنظیم کے کسی رکن کو علم ہو گیا تھا کہ مخبری اس نے کی ہے اور اسی رکن نے اسے ٹھکانے لگا دیا۔ سمجھ گئے نا؟"

برکت بیگ نے اثبات میں سر ہلایا اور لاش کندھے پر اٹھا کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا کمرے سے باہر چلا گیا۔

"کام یہاں ہوتے ہیں۔" نواب میری طرف متوجہ ہو کر سمجھانے والے انداز میں بولا۔ "صبر و سکون اور صفائی سے۔ احباب جیسے جذباتی اور جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے والوں کا انجام کبھی اچھا نہیں ہوتا۔ خصوصاً جبکہ وہ بڑے بڑے معاملوں میں ہاتھ ڈالنے لگیں۔"

اپنی دانست میں وہ میری روح کو چرکے لگانے کیلئے ایسی باتیں کر رہا تھا لیکن یہ اس کی آخری بات مجھے بالکل سچ محسوس ہوئی۔ جو کام احباب تمہیں کو میلوں کا گروہ بنا کر نہیں کر سکا تھا اسے وہ اکیلا کر سکتا تھا بشرطیکہ وہ صبر و سکون سے کام لیتا اور جتنی توانائی اس نے تمہیں آدمیوں کی تربیت دینے میں صرف کی تھی اتنی توانائی صرف اپنے آپ کو تربیت دینے

میں صرف کرتا۔

زندگی کے اہم ترین معاملات میں کامیابی انہی کو ملتی ہے جو ان معاملات میں صرف اپنی ہی ذات کو مشیر اپنا شریک کار اور اپنا محافظ بناتے ہیں۔ اشاروں پر چلنے والے وفادار غلام صرف انہی کو میسر آتے ہیں جو نواب شرافت کی طرح پشت در پشت حکمرانی کرتے آئے ہوں اور انہی کے سینے میں جن کی جڑیں بہت گہری ہوں۔ جن کے پاس ہر طرح کے انسانوں کو خریدنے کیلئے بے اندازہ دولت ہو۔ یہ باتیں صحیح طور پر مجھے گزشتہ ایک گھنٹہ ہی میں سمجھ آئی تھیں۔

"میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تم مجھ پر اب کون سا نیا ستم ڈھانا چاہتے ہو؟" میں نے زہریلے لہجے میں پوچھا۔

"اوہ۔۔۔" نواب نے آنکھیں سکیڑ کر مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ "اب تو تمہارا انداز گفتگو اور طور طریقے واقعی بہت بدل گئے ہیں۔ جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے تم ایک نرم و نازک، شرمیلی اور ڈرپوک لڑکی ہوا کرتی تھیں۔ تھوڑے ہی عرصے میں تمہارے اندر بہت چالاکی اور بے خوفی آ گئی ہے۔"

"میں نے تمہیں اپنی ذات کی تبدیلیوں پر تبصرہ کرنے کیلئے نہیں کہا تھا۔ بڈھے رنڈوے!" میں نے نفرت سے کہا۔ "میں نے کچھ پوچھا تھا۔"

"ہائے ہائے۔" نواب نے مصنوعی انداز میں سر ہلایا۔ "تجربات و حوادث نے ہم میں کتنی قوت برداشت پیدا کر دی ہے۔ پہلے ہم ایسے انداز تخاطب پر لوگوں کی زبانیں کھنچوا دیا کرتے تھے۔ چہ چہ چہ۔۔۔ ویسے تم اگر ہمیں صرف رنڈوا کہو تو زیادہ مناسب ہو گا۔ بوڑھے ہم ابھی نہیں ہوئے۔ رنڈوے کے رنڈوے ہیں۔ جیسا تم دیکھ چکی ہو۔ باقی جہاں تک تمہارے سوال کا تعلق ہے تو بے فکر رہو، تم پر کوئی ستم وستم نہیں ٹوٹے گا۔ پہلے بھی ہمیں تم سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ جو کچھ ہوا وہ تمہاری سرکشی اور ناشکرے پن کی وجہ سے ہوا اور اب جو کچھ ہوا وہ محض اتفاق کی وجہ سے ہوا ہے۔ تم تو صرف اس کی بیوی ہونے کی وجہ سے لپیٹ میں آ گئی ہو اگر کسی اور حیثیت سے ملی ہوتیں، تو شاید ہم ماضی کی تمام تر ناگواری کے باوجود تمہیں معاف کر دیتے۔ اب بھی ہم تمہارے ساتھ کوئی ظلم نہیں کریں گے۔ بس تمہاری بنیاد پر ہم نے ایک چھوٹا سا سودا کرنے کی کوشش کی ہے۔ دوسرے تاجر نے آج رات آنا تھا، مگر کچھ دیر پہلے اس کا پیغام آیا تھا کہ وہ اب نہیں آ سکے گا، صبح آئے گا۔" وہ بھی ظالم ہمارے ہی پائے کا تاجر ہے۔"

"ٹھیک ہے نواب شرافت علی!" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ "یہ تمہارا وقت ہے جو جی چاہے کرو اور جو جی چاہے کہو، اگر آج تم دوبارہ میرے یقین پر بجلی بن کر نہ گرے ہوتے تو شاید میں ابھی تمہیں معاف کر دیتی۔ رفتہ رفتہ وہ اذیتیں فراموش کر دیتی جو تم نے

بھی مجھے پہنچائی تھیں۔ میں اپنا اور تمہارا معاملہ خدا پر چھوڑ دیتی ہوں لیکن اب میں تمہیں بھی معاف نہیں کروں گی، کیونکہ اس وقت شاید تم نے مجھے اس طرح برباد نہیں کیا تھا جس طرح اب اجاڑا ہے۔ تمہاری یہ مکروہ مسکراہٹ ایک کھونٹی کی طرح میرے دل پر نقش ہے، اور آج میں عہد کر رہی ہوں کہ اگر زندگی نے مجھے مہلت دی تو تم دیکھو گے اور یہ دنیا بھی کہ عورت اگر انتقام لینے پر اتر آئے تو ایسی مثالیں چھوڑ جاتی ہے جنہیں صدیوں تک دہرایا جاتا ہے۔"

"لہٰذا۔۔۔" نواب کہہ رہا تھا۔ "فی الحال اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ تم آج رات آرام کرو، صبح جو کچھ ہو گا تمہارے سامنے آ جائے گا۔"

"تمہیں اتنی ملائمت سے باتیں کرتے دیکھ کر واقعی یقین نہیں آ رہا ہے کہ تم وہی نواب شرافت علی ہو۔" میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

"بالکل اسی طرح جیسے ہمیں یقین نہیں آ رہا ہے کہ تم وہی عزیزہ ہو۔" اس نے نرمی سے کہا۔ "دراصل وقت کے ساتھ ساتھ ہر انسان میں تبدیلیاں آتی ہیں۔ کسی میں تیزی سے اور کسی میں آہستگی سے۔ ہم نے گزشتہ تین سال سے دوسرے تجربات کے ساتھ ایک تجربہ یہ بھی حاصل کیا ہے کہ انسان جس چیز کو دولت کے بل پر حاصل نہ کر سکے، مکاری سے نہ جیت سکے اور طاقت سے بھی حاصل نہ کر سکے اس کا خیال دل سے نکال دینا چاہئے۔ اس سے بالکل لاتعلق ہو جانا چاہئے۔ ورنہ انسان کیلئے بے شمار مشکلات اٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔"

"یہ تجربہ تمہیں بہت دیر سے ہوا ہے کالے لنگور!" میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ "جبکہ تم نے اپنے لئے ان گنت مصیبتوں کے بیج بو لئے ہیں۔ آج نہ سہی کل تو سہی، بہرحال وہ وقت ضرور آئے گا جب تیرے بوئے ہوئے بیجوں سے تیرے لئے مصائب کا ایک جنگل اُگ آئے گا اور تو اسی میں بھٹک بھٹک کر عبرت کی موت مر جائے گا۔"

"جاؤ۔۔۔ اب کونے کے کمرے میں جا کر کچھ کھا پی لو۔ اس کے بعد خادمہ تمہیں تمہارا کمرہ دکھا دے گی اور خدارا دلبر! کوئی الٹی سیدھی حرکت کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ میرا یہاں کا عملہ کچھ زیادہ ہی مستعد ہے۔ آدمی کی گردن پہلے توڑتا ہے، اجازت بعد میں طلب کرتا ہے۔" نواب نے بڑے سرسری لہجے میں کہا اور حسن کلے کو اشارہ کیا۔ وہ میری رہنمائی کیلئے آگے بڑھا۔

"میرا بچہ کہاں ہے؟" میں نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"اسے بھی تمہارے پاس پہنچا دیا جائے گا۔" نواب نے جواب دیا۔

"مگر تم اتنی ہی نرم خوئی کا اظہار کرنے پر تلے ہوئے ہو تو میں تمہیں بتا دوں کہ محل کے راستے میں مجھ سے بچھڑ گئی ہے۔۔۔" میں نے اسے سارا واقعہ بتایا اور آخر میں

اس سے کہا۔ "مجھے اپنی بچی واپس چاہئے۔"

"میں ہر ممکن کوشش کروں گا۔" نواب نے سنجیدگی سے کہا۔ "اگر وہ دونوں یعنی صرف بچی ہی اور پولیس کو ہاتھ آ گئی تو تمہیں مل جائے گی' اگر وہ بچی سمیت فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تو پھر میں کچھ نہیں کر سکتا کیونکہ میرا قیام ویسے بھی بمبئی میں زیادہ دن کا نہیں ہے۔ چند دن کیلئے میں ریاست واپس جاؤں گا اور اس کے بعد شاید علاج اور تبدیلی آب و ہوا کی غرض سے کچھ عرصے کیلئے لندن چلا جاؤں بہرحال تم خاطر جمع رکھو۔"

میں کن کٹے کی رہنمائی میں ایک شاندار ڈرائنگ ہال میں پہنچی۔ مجھے ایک کرسی پر بٹھا کر کن کٹا واپس چلا گیا' لیکن وہ بڑی لاتعلقی سے ایک کرسی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا اور اس کے پاس کوئی ہتھیار بھی نظر نہیں آ رہا تھا' لیکن مجھے معلوم تھا کہ نہ تو وہ گردوپیش سے بے تعلق ہے اور نہ ہی نہتا۔ چند لمحے بعد ایک سانولی سی لڑکی جھالروں والا چھوٹا سا سکرٹ پہنے اونچی ایڑی کی جوتی کھٹکھٹاتی ہال میں آئی۔

"کیا کھانا پسند فرمائیں گی آپ؟" میرے قریب پہنچ کر اس نے مودبانہ انداز میں ایک بار سر جھکانے کے بعد سیدھی کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔

"نواب فراست علی کا کلیجہ بھنے۔" میں نے جواب دیا۔

"وہ تو اس وقت اشیائے خوردونوش کے ذخیرے میں موجود نہیں ہے۔ آپ کسی اور چیز کا حکم فرمایئے۔" اس نے اس قدر سنجیدگی سے کہا کہ میں اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

"تو پھر کوئی بھی ایسی چیز لے آؤ جسے ایک ایسا انسان کھا سکے جس کا کچھ کھانے کو دل نہ چاہ رہا ہو۔" میں نے کہا۔

لڑکی چند لمحے نظریں جھکائے پرخیال انداز میں کھڑی رہی' پھر چٹکی بجا کر کھٹ کھٹ کرتی باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی ٹرے اٹھائے کچن سے نکلی۔ اس نے چٹنیوں اور مصالحوں کی کئی چھوٹی چھوٹی پیالیاں چمچے اور چھری کانٹے میرے سامنے سجا دیئے اور بیچ میں ایک پلیٹ رکھ دی جس میں عجیب شکل کے سرخ سرخ کباب سجے ہوئے تھے جن سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ ان کی خوشبو اس قدر اشتہا انگیز تھی کہ میں جو ان حالات میں سوائے زہر کے کھانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی بے ساختہ ہاتھ بڑھانے پر مجبور ہو گئی۔

میں نے پلیٹ خالی کر دی تو لڑکی نے پوچھا کہ میں مزید کھانا تو پسند نہیں کروں گی۔ میں نے نفی میں جواب دیا۔ وہ گرم پانی میں بھیگا ہوا تولیہ لے کر آئی اور میرے ہاتھ اور ہونٹ پونچھنے لگی۔ کیونکہ میں نے کباب ہاتھوں ہی سے کھائے تھے' پھر لڑکی نے چائے یا کافی کیلئے پوچھا۔ میں نے اس سے بھی انکار کر دیا اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آیئے! میں آپ کو آپ کے کمرے میں پہنچا دوں۔" وہ مجھے راستہ دکھاتے ہوئے

چلی۔

میں راہداری میں آئی تو عقب سے ایک سروقد اور باوقار سی عورت ایک خوبصورت سی بچہ گاڑی کو دھکیلتی نظر آئی۔ اس نے بالوں کا اونچا جوڑا بنا رکھا تھا اور نہایت بیش قیمت ساڑھی بنگالی سٹائل سے باندھی ہوئی تھی' وہ کسی امیر گھرانے کی معزز خاتون نظر آتی تھی لیکن جب وہ قریب آئی تو میں نے اسے پہچانا۔ یہ وہی تھی جسے میں نے نواب کے پاؤں گود میں رکھے اس کے ناخن تراشتے دیکھا تھا۔ بچہ گاڑی میں تم گدیلوں سے ٹیک لگائے مزے سے پڑے سو رہے تھے۔ تمہارے بال کچھ گھونگھرے بکھرے ہوئے تھے۔ ایک بھالو تو سوتے میں بھی تمہاری بغل میں دبا ہوا تھا۔

قریب آ کر اس عورت نے بچہ گاڑی میرے ہاتھ میں تھما دی' میں نے اسے "بیگم" کے طور پر پوچھا۔ "آپ اسی گھر میں رہتی ہیں؟" اس کے چہرے پر چھائی گمبھیر سنجیدگی میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ اس نے گویا میری آواز سنی ہی نہیں تھی۔

"شب بخیر۔" اس نے سرگوشی نما لہجے میں کہا اور واپسی کیلئے مڑ گئی۔ سکرٹ والی لڑکی آگے میرے انتظار میں کھڑی تھی اور مڑ مڑ کر میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں بچہ گاڑی کو دھکیلتی اس کے پیچھے چل دی۔ وہ مجھے جس کمرے میں لے گئی وہاں دو قیمتی دیواری مسہریاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک طرف سیاہ لکڑی کی خوبصورت سنگھار میز رکھی تھی۔ فرنیچر بس یہی تھا لیکن وسیع کمرہ اپنی تمام تر سادگی کے باوجود خاصا گہرے سبز رنگ کے دبیز قالین اور اسی رنگ کے باریک ریشمی پردوں کی وجہ سے بہت بھلا اور پرسکون سا لگ رہا تھا۔

"آپ کے سرہانے سوئچ بورڈ پر سفید گھنٹی لگا ہوا ہے۔" لڑکی نے دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "کسی چیز کی ضرورت ہو تو اسے دبا دیجئے گا۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے دروازہ بند کر کے بولٹ چڑھایا' تمہیں بچہ گاڑی سے نکال کر بستر پر لٹایا اور خود بھی تمہارے قریب لیٹ گئی۔ بتی بجھانے کی میری ہمت نہیں پڑ رہی تھی حالانکہ فی الوقت میرے ساتھ معزز مہمانوں ہی کا سا برتاؤ ہو رہا تھا۔ اس برتاؤ کی وجہ بھی میری سمجھ سے باہر تھی۔

بستر پر لیٹ کر مجھے قدرے سکون کا احساس ہوا اور میں نے شام سے لے کر اب تک کے واقعات پر نئے سرے سے غور کرنا شروع کیا۔ مریم سے جدائی اور ارباب کے دردناک انجام کے تصور سے میرا کلیجہ شق ہونے لگا۔ دفعتاً میرے شعور کے کسی گوشے سے ایک سوچ ابھری۔ ارباب کی موت کی خبر ابھی تک تو محض ایک سنی سنائی بات ہے۔ تم نے اس پر اتنی جلدی کیسے یقین کر لیا؟ نصیر بیگ جیسے غدار کا کیا بھروسہ۔ شاید اس نے جھوٹ

لیکن پھر مجھے یاد آیا کہ نواب نے بھی مجھے "مہرو" کے نام سے مخاطب کیا تھا اور کم از کم آج نواب مجھے جھوٹ کے موڈ میں نہیں دکھائی دے رہا تھا' لیکن یہ بھی تو ممکن تھا کہ اسے بھی غلط ہی اطلاع ملی ہو۔ اس احساس سے مجھے کچھ ڈھارس سی بندھی دھیرے دھیرے آنسو تھم گئے اور بالآخر مجھے نیند بھی آ گئی۔

صبح ناشتے کی میز پر میرا نواب سے سامنا ہوا۔ اس وقت اس کے برابر والی کرسی پر ایک اور عورت براجمان تھی۔ پہلی ہی نظر میں وہ نہ جانے کیوں مجھے عجیب سی لگی۔ وہ عمر کی اس منزل پر تھی جہاں جوانی اسے الوداع کہنے ہی والی تھی مگر یوں لگتا تھا کہ وہ دور تک جوانی کا پیچھا کرنا چاہتی ہے۔ اس نے نہایت گہرا اور آنکھوں کو چبھنے والا میک اپ کیا ہوا تھا۔ بالوں کے جوڑے پر چمکتی موتیوں کی لڑی لپیٹ رکھی تھی۔ شوخ رنگوں کی بھاری ساڑھی نے اس کے فربہ جسم کو نہایت محنت سے سنبھال رکھا تھا۔ اس کے کانوں میں ہیرے کے آویزے تھے۔ وہ کرسی کے پیچھے سے ٹیک لگائے' ایک لمبے سے سفید ہولڈر میں سگریٹ پھنسائے دھیرے دھیرے کش لے رہی تھی۔ وہ نیم باز آنکھوں سے یہاں ایک سے دوسری چیز کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے دنیا اس کی نظروں میں بازیچۂ اطفال ہو۔

ایک لمحے کیلئے مجھے خیال آیا کہ کہیں وہ نواب کی "بیگم از جہات" نہ ہو۔ میں نے نواب کے تاثرات سے ان کے باہمی تعلق کے بارے میں کوئی اندازہ لگانے کی کوشش کی' لیکن نواب کے چہرے پر سرے سے کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ سر جھکائے دنیا جہان سے لاتعلق ناشتہ کرنے میں مصروف تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں جب ڈائننگ ہال میں داخل ہوئی تو اس نے سرسری سا میرا جائزہ لیا تھا اور جب میں نے ناشتہ شروع کیا تب بھی وہ بدستور گہری نظروں سے میری ہی طرف دیکھتی رہی۔ میں نے اس کی طرف نظر اٹھائی تو وہ فوراً کسی اور چیز کو دیکھنے لگی۔

میں تمہیں دودھ پلا کر لائی تھی لیکن ناشتے کی میز پر میں نے اپنے گھر کے معمول کے مطابق تمہیں مختلف چیزوں کے چند چھوٹے چھوٹے نوالوں اور پھلوں کی کچھ قاشیں کھلانے کی کوشش کرنے لگی۔ عورت میرے اس عمل کو بھی بغور دیکھ رہی تھی۔

نواب نے ناشتہ یوں ختم کیا گویا دنیا کا سب سے ضروری کام یہی تھا' پھر اس نے ایک طویل ڈکار لے کر بچھے کے پھول جیسے سفید نیپکن سے اپنے ہونٹ جیسے سیاہ ہونٹ پونچھتے ہوئے کرسی کے پیچھے سے ٹیک لگا کر میری طرف دیکھا' پھر نیپکن ایک طرف رکھ کر خواہ مخواہ وقت ٹالتے ہوئے بولا۔ "تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟؟ رات ٹھیک اچھی گزری؟"

واقعی اس دھرتی پر تم جیسے مثلی خبیث بھی کبھی کبھار ہی پیدا ہوتے ہیں شرافت کا! میں نے دل ہی دل میں سوچا' جو ایک عورت کا سہاگ اجاڑ کر اس کی زندگی کو ہر خوشی

سے اجتناب کرکے پوچھتے ہیں کہ رات کو نیند تو اچھی آئی۔ میں اسے بتانا نہیں چاہتی تھی کہ میرے شعور کے کسی کونے میں امید کی کرن باقی ہے کہ ارباب ابھی مرا نہیں اور اسی امید کے سہارے میں گزشتہ رات سو سکی تھی۔

میں نے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا' اور پھر اس خیال سے کہ کہیں غیر ارادی طور پر میں پلیٹ اٹھا کر اس کے منہ پر نہ کھینچ ماروں' میں نے نظریں جھکا لیں۔ حالات کو اپنے حق میں بد سے بدتر بنانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

"کہیں یہ گونگی تو نہیں؟" اچانک عورت نے نواب سے پوچھا اس کے لہجے میں ڈوبی ہوئی تشویش پر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے یہ سوال اس طرح مشفقانہ انداز میں کیا تھا گویا میرا گونگی ہونا اس کیلئے کسی نقصان کا باعث بن سکتا ہو۔

"ارے نہیں گوہر جان!" نواب نے بے ہنگم قہقہہ لگایا' اس کے منہ میں تو پوری چھٹانک کی زبان ہے لیکن شاید یہ لفظوں کی کفایت شعاری کر رہی ہے۔ حالات ہی کچھ ایسے ہیں۔ تمہیں تو میں نے سب کچھ ہی بتا دیا ہے۔" پھر اس نے ایک لمحے کیلئے خاموش ہو کر عورت کو گھورا۔ "لیکن تمہیں یہ سوال پوچھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ کیا تمہیں ہماری زبان پر اعتبار نہیں؟"

"اعتبار ہے' تبھی تو آئی ہوں ورنہ صرف نامنظوری کا پیغام بھجوا دیتی۔" عورت نے کہا اور سگریٹ ایش ٹرے میں مسل کر نواب کی طرف دیکھا۔ دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے کچھ کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر وہ میری طرف دیکھے بغیر یوں کمرے سے رخصت ہو گئے گویا میں اب وہاں موجود ہی نہیں تھی۔ ہوا میں تحلیل ہو چکی تھی۔

وہی لڑکی جس نے مجھے ناشتہ دیا تھا' میرے قریب آئی اور مؤدبانہ انداز میں بولی ——
"اگر آپ کو مزید کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دیجئے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا اور دوستانہ لہجے میں پوچھا۔ "یہ عورت کون تھی؟"

لڑکی نے خالی نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر معذرت خواہانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا —— "میں کیا بتا سکتی ہوں میڈم! میرا کام مہمانوں کے آرام اور طعام کا خیال رکھنا ہے ان کے بارے میں معلومات رکھنا نہیں۔"

"تمہیں اپنے بارے میں بھی معلوم ہے یا نہیں؟" میں نے جل کر پوچھا۔ "مثلاً یہ کہ تم کون ہو' کس کی اولاد ہو' انسان ہی کی —— یا کسی اور کی؟"

"میں نے آخری بار اپنے باپ کو اس وقت دیکھا تھا جب میری عمر پانچ سال تھی۔" لڑکی نے انتہائی سنجیدگی سے قطعی غیر جذباتی لہجے میں کہا —— "وہ شراب کے نشے میں میری ماں کو کپڑے دھونے والی موگری سے پیٹ رہا تھا۔ اس کا چہرہ مجھے ٹھیک طور پر یاد نہیں

لیکن میرا خیال ہے کہ وہ بظاہر انسان ہی تھا کیونکہ اس کی دو ٹانگیں دو ہاتھ اور ایک سر تھا۔ بالکل انسانوں جیسا۔ لہٰذا میں کسی اور مخلوق کی اولاد نہیں ہو سکتی۔"

"کیا اس کے بعد تم اپنے باپ سے کبھی نہیں ملیں؟" اس بار میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔ اس لڑکی نے غیر جذباتی ہونے کی انتہا کر دی تھی۔ محال ہے جو اس کی گفتگو میں اس کے لہجے میں کوئی اتار چڑھاؤ آیا ہو۔

"کیسے ملتی؟" اس نے بدستور سپاٹ لہجے میں کہا ——— "کیونکہ اس رات میری ماں نے اسے سوتے میں قتل کر دیا تھا۔ لکڑیاں چیرنے والی کلہاڑی سے میری ماں نے اس کی کھوپڑی دو حصوں میں تقسیم کر دی تھی۔ بارہ برس تک اس نے اتنی مار کھائی تھی کہ میرے خیال میں اس کے جسم کی تقریباً ہر ہڈی ایک بار ٹوٹ کر جڑ چکی تھی۔ اگر آپ چائے ختم کر چکی ہیں تو اپنے کمرے میں تشریف لے چلیے۔" آخری جملہ بھی اس نے اپنی پہلی گفتگو کے ساتھ اسی روانی سے کہا تھا کہ ایک لمحے کیلئے تو مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ اس نے مجھے اٹھنے کیلئے کہا تھا۔ جب دوبارہ اس نے یہی درخواست کی تو میں اٹھی۔

کمرے میں آکر میری سمجھ میں نہ آیا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ کس طرح وقت گزارنا چاہیے لیکن میری یہ مشکل تم نے حل کر دی۔ تم نے میری انگلی چھوڑی اور دوڑ کر کمرے کے ایک گوشے میں کھڑی بچہ گاڑی سے کھیلنے لگے۔ تمہارے ساتھ میں بھی کھلونوں سے کھیلنے لگی۔ تمہیں بہلانے لگی۔

تقریباً دو گھنٹے کی اچھل کود اور توتلی زبان میں گفتگو کے چند الفاظ دہرانے کے بعد تم تھک کر سو گئے۔ تمہیں مسہری پر لٹا کر میں ہٹی ہی تھی کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور ساتھ ہی اس لڑکی نے اندر جھانکا۔

"تشریف لے چلیے میڈم! گاڑی تیار ہے۔" اس نے کہا۔

"کہاں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"مجھے تو معلوم نہیں میڈم!" اس نے اپنے مخصوص معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "مجھے صرف اتنا کہا گیا ہے کہ میں آپ کو صدر دروازے تک پہنچا دوں۔"

"میں نواب سے بات کرنا چاہتی ہوں۔" میں نے کہا۔

"وہ تو چند منٹ پہلے ہی کسی کام کے سلسلے میں روانہ ہو چکے ہیں۔" لڑکی نے جواب دیا۔ اس کا مطلب تھا کہ مجھے نواب کے ساتھ نہیں جانا تھا۔ چند لمحے تک میں اپنی جگہ ساکت کھڑی سوچتی رہی پھر میں نے تمہیں اٹھا کر کندھے سے لگایا اور کمرے سے باہر آ گئی۔

لڑکی کی رہنمائی میں چلتے ہوئے میں نے اپنے عقب میں ہلکی سی آہٹ سنی مڑ کر دیکھا تو وہ شخص پیچھے آتا دکھائی دیا جسے میں خواب گاہ کے دروازے پر بیٹھے دیکھ چکی تھی۔

وہ اب بھی بڑی لاتعلقی سے سر جھکائے گویا اپنی راہ چل رہا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ …ن واسکٹ کی جیب میں ریوالور کا دستہ جھانکتا دکھائی دینے کا مطلب یہی تھا کہ میں حکم …دولی کی کوشش نہ کروں۔

برآمدے کی سیڑھیوں کے قریب پورچ میں ایک سیاہ کار کھڑی تھی۔ لڑکی نے بڑے …ام سے جھک کر مجھے کار کی طرف بڑھنے کا اشارہ کیا۔ میں سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچی تو …یور نے کار سے اتر کر میرے لیے پچھلا دروازہ کھولا اور تب میں نے دیکھا کہ پچھلی …ست پر وہی عورت گوہر جان موجود تھی۔ جسے میں ناشتے کی میز پر دیکھ چکی تھی۔

میں کار کے قریب پہنچی تو گوہر جان نے اندر بیٹھے ہی بیٹھے بازو پھیلائے۔ "لاؤ مجھے …میری گود میں دے دو۔" اب میں نے محسوس کیا کہ اس کی آواز غیر معمولی طور پر مترنم …ملائم تھی۔

تم اب بھی سو رہے تھے تمہیں گوہر جان کی گود میں دے کر میں اس کے برابر بیٹھ گئی …ڈرائیور اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔ ڈرائیور کے قریب ہی ایک اور شخص بت کی طرح ساکت …تھا۔ اس کی گردن نہایت موٹی اور بھینسے کی طرح موٹی تھی۔ میں نے برآمدے کی …طرف دیکھا وہ لڑکی اور میرے پیچھے آنے والا آدمی دروازے پر کھڑے تھے۔ گاڑی صدر …دروازے کی طرف بڑھی تو لڑکی نے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا اور تیزی سے گھوم کر دروازہ …کر اندر چلی گئی۔

لوہے کا گیٹ کھلا تھا۔ گاڑی سڑک پر آ کر دائیں طرف گھومی اور چند لمحے بعد …ے بھرنے لگی۔ یہ سڑک نہایت چوڑی تھی مگر اس پر ٹریفک برائے نام تھی۔ البتہ …مکانوں کا سلسلہ گنجان ہوتے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ ہم مضافات سے اندرون شہر کی …طرف جا رہے تھے۔

"چشم بد دور۔ بہت ہی پیارا بچہ ہے۔" گوہر جان نے تمہیں اپنی گود میں ہلکے ہلکے ہلکورے دیتے ہوئے کہا۔ "بالکل ماں کی طرح خوبصورت ہے۔" …رتی تھی

"اس کا باپ بھی کم خوبصورت نہیں ہے۔" میں نے کھلے لہجے میں کہا۔ "…ملا تو تمہیں اس سے ضرور ملواؤں گی۔" …سا آیا جس

"میرے بچوں سے ملنا ممکن ہوتا تو اس دنیا میں دکھ آدھے نہ رہ جاتے۔" اس نے … طویل سانس لیکر کہا۔ …اندر داخل

میں نے اسے گھورا لیکن وہ میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ گویا اسے میرے … ایک لمحے …ر کچھ معلوم تھا لیکن مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ درحقیقت کون تھی؟ اس …لہ پوچھتے ہوئے ایک تو مجھے احساس کمتری سا ہو رہا تھا دوسرے مجھے اندیشہ تھا کہ میں پاؤں …لڑکی کی طرح فلسفہ بگھارنا شروع نہ کر دے۔ …مختلف

چند لمحے خاموشی رہی۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے اندازہ لگانے کی کوشش کرتی رہی کہ ہم کس علاقے سے گزر رہے ہیں اور اگر دوبارہ نواب کے عشرت کدے کی طرف آنا پڑے تو کن کن نشانیوں کی مدد سے راستہ طے کیا جائے' لیکن میں کوئی اندازہ نہ لگا سکی۔ ایک تو شہر پوری طرح میرا دیکھا بھالا نہیں تھا اور ویسے بھی بستی کی گلیاں نہ جانے مجھے کیوں ملتی جلتی لگتی تھیں۔

راستوں کی کچھ نشانیاں متعین کرنا بھی محال ہی نظر آ رہا تھا کیونکہ کار خلاف توقع خاصی تیز رفتار سے چل رہی تھی۔ ورنہ اس کے ظاہری حلیے سے تو یہی لگتا تھا کہ چلنے کی بجائے رینگتی ہوگی۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ وہ دیگر بہت اچھی اچھی کاروں کے مقابلے میں برائے نام آواز پیدا کر رہی تھی۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟" بالآخر میں نے گوہر جان سے پوچھ ہی لیا۔

"میرے گھر۔" اس نے سادگی سے جواب دیا۔

"تمہارا گھر کسی خلا میں تو معلق نہیں ہوگا۔" میں نے کاٹ کھانے والے لہجے میں کہا۔ "میں نے محلے کا نام پوچھا تھا۔"

اس نے ناپسندیدگی کی نظر سے میری طرف دیکھا۔ "تمہارے لئے اتنا کافی نہیں ہے کہ فی الوقت میں تمہیں ایک بھیانک قید خانے سے چھڑا کر لے آئی ہوں۔"

"تمہیں میری اتنی فکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔" میں نے جان بوجھ کر لہجے کی کاٹ بدستور برقرار رکھی۔ "میں نے اس سے بھی کہیں زیادہ بھیانک قید خانہ دیکھ رکھا ہے۔ میرے لئے تو ساری دنیا ہی ایک بہت بڑا قید خانہ ہے۔"

اس نے برا سا منہ بنایا گویا کوئی کڑوی گولی نگلی ہو۔ "ایک تو ساری زندگی بد مزاج مردوں اور ستم رسیدہ عورتوں سے الٹے سیدھے سنتے سنتے میں تنگ آ گئی ہوں۔" وہ ناگواری سے بولی۔ "فی الحال تم خاموشی سے بیٹھو۔ وقت آنے پر تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔"

خاصے طویل سفر کے بعد کار تنگ سی گلیوں کی بھول بھلیوں میں داخل ہوئی۔ چند "لمحے ادھر ادھر چکرانے کے بعد پیلے پتھروں سے بنے ہوئے بلند و بالا مکان کے سامنے جا کر ٹھہر گئی۔ مکان کا دروازہ کئی گز کی بلندی پر تھا اور اس کے دونوں طرف دو چبوتروں پر پتھر کے بنے ہوئے دو شیر نصب تھے۔ کار سے اتر کر اس نے تمہیں میری گود میں دے دیا اور اپنا دیا۔ اس نے آگے کا اشارہ کیا۔

سامنے کھڑا اندر سے یہ مکان [illegible] بہت بڑے کنویں سے مشابہ تھا جسے سطح زمین سے [illegible] گیا ہو۔ اوپر لے جانے کے بجائے نیچے [illegible] کھڑا کر دیا گیا تھا۔ مکان کی تینوں منزلوں کی بالکونیاں گیلری کی شکل میں تھیں۔ جن سے نیچے صحن میں جھانکا جا سکتا تھا۔ صحن میں کھڑے ہو کر دیکھا تو وہ

بو نور اوپر آسمان کا صرف ایک چھوٹا سا گول ٹکڑا دکھائی دیتا تھا۔ یہ حقیقت مجھے بہت بعد میں جا کر معلوم ہوئی کہ یہ مکان واقعی ایک اندھا کنواں تھا جس میں گرنے کے بعد کوئی باہر واپس نہیں جا سکا۔

کونے کونے میں آمنے سامنے دو جگہوں سے سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں۔ گوہر جان کی رہنمائی میں میں دوسری منزل کی بالکونی میں پہنچی۔ بائیں ہاتھ پر کمروں کی قطار اور دائیں طرف بالکونی کا جنگلہ تھا۔

بیشتر کمروں کے دروازے کھلے تھے اور ہر کمرے میں ایک یا دو لڑکیاں موجود تھیں۔ کوئی اپنے آپ کو تاج رانیوں کی طرح بستر پر بکھیرے پڑی تھی۔ کوئی سنگھار میز کے سامنے بیٹھی اپنے بکھرے وجود کو سمیٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کوئی لباس سے بے نیاز [illegible] ورزش میں مصروف تھی۔

ہمیں دیکھ کر کئی لڑکیاں لپک کر دروازے میں آ گئیں۔ یہ سب جوان اور حسین تھیں مگر ان کے چہرے پھیکے پھیکے ہونٹ بے رس اور آنکھیں کھنڈر کھنڈر سی تھیں۔ گویا کوئی خون آشام سوتے میں ان کے سارے وجود کی تازگی اور چہرے سے آب و تاب چوس گیا ہو۔ میں نے اپنے عقب میں ان کے آوازے سنے۔

"ہو گرفتار کوئی تیری خدا خیر کرے۔"

"ہائے ہائے چال تو دیکھو' کمر ہے شاخ گل کی طرح لچک رہی ہے دو قدم میں [illegible] جا رہا ہے۔"

"پنچھی وائی ہے۔"

"مطلقہ ابھی خود بچی ہے۔"

"گھڑی پل کو اللہ میاں نے بنا کر بے فرصتی میں بیٹھ کر۔"

اس آواز پر بڑے زور کا قہقہہ پڑا۔ گوہر جان چلتے چلتے رک گئی اور اس نے دروازوں میں کھڑی لڑکیوں پر ایک نظر ڈالی۔ منہ سے کچھ بھی نہیں کہا۔ اس کی نظروں میں یہ اثر تھا کہ تمام لڑکیاں جنگلی چیونٹیوں کی طرح اپنے کمروں میں گھس گئیں۔

چند قدم آگے چل کر گیلری میں کھلنے والے کمروں کی قطار میں ایک خلا سا آیا جس سے آگے اس حویلی کا الگ تھلگ حصہ تھا۔ یہ حصہ دیگر کمروں کی نسبت پر آسائش اور وسیع معلوم ہوتا تھا۔ اس حصے میں ایک کمرے کا خوبصورت پردہ ہٹا کر گوہر جان اندر داخل ہو گئی اور پردہ ایک طرف کو سمیٹ کر مجھے راستہ دیا۔ اندر ہلکی سی روشنی تھی۔ ایک لمحے کے لئے تو مجھے کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ گوہر جان نے لائٹ آن کر دی۔

یہ ایک شاہانہ قسم کا کمرۂ نشست تھا۔ فرش پر دبیز ایرانی قالین تھا جس میں پاؤں دھنسے جا رہے تھے۔ کمرے کے مختلف حصوں میں شاہی طرز کی اونچی کرسیاں جن پر مخملی

گدے جھلملا رہے تھے۔ انگریزی طرز کے کھلیج بلوریں چائیاں اور ایک چھوٹا سا آرام دہ دیوان بچھا ہوا تھا۔ چھت میں دو فانوس لٹک رہے تھے۔ دیواروں پر جہازی سائز کی فریم شدہ رنگین تصویریں آویزاں تھیں۔ یہ تصویریں غالباً انگریز ایکٹریسوں کی تھیں۔

ایک کونے پر میز پر بڑا سا گراموفون رکھا تھا جس کا لکڑی بھونپو پہلی نظر میں چاندی کا ایک بہت بڑا پھول معلوم ہوتا تھا۔ گراموفون کے قریب ہی اوپر نیچے چھوٹے بڑے ریکارڈوں کا انبار تھا۔ اس کے قریب ہی دیوار میں ایک لوہے کی الماری میں رنگا رنگ کی قلمیں مختلف بلوری گلاس' ایک خانے میں بیش قیمت آرائشی چیزیں اور سب سے نچلے خانے میں کچھ کتابیں بھری ہوئی تھیں۔

اس کے مقابل دیوار میں آتش دان تھا جس کے سامنے قالین پر چیتے کی کھال بچھی ہوئی تھی۔ آتش دان کی کارنس پر مختلف العمر عورتوں کے بڑے بڑے فریم شدہ رنگین پورٹریٹ سجے ہوئے تھے۔ جنہیں غالباً مختلف مگر ماہر فن مصوروں نے بنایا تھا۔ ان میں ایک تصویر گوہر جان کی بھی تھی۔ جو اس کی جوانی کی تھی۔ اس تصویر سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس کی جوانی نے کیا قیامتیں نہ ڈھائی ہوں گی۔

دفعتاً ایک ملحقہ کمرے کا پردہ ہٹا اور ایک مکروہ صورت سی بڑھیا اندر آ گئی۔ صورت کے برعکس اس کا لباس اجلا تھا اور جب وہ بولی تو اس کے لہجے کی شائستگی اور آواز کی مٹھاس نے اس کی بدصورتی کا ناگوار تاثر ختم کر دیا۔

"کیا حکم ہے بی بی گوہر؟" وہ گویا گوہر جان کے قدموں میں بچھی جا رہی تھی۔

"اس لڑکی کو کھڑکی والے کمرے میں پہنچا دو۔" گوہر جان نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔ "اس کا اور اس کے بچے کی ہر ضرورت کا خیال رکھنا۔"

"آپ بالکل فکر نہ کیجئے بی بی گوہر۔" بڑھیا نے سر خم کر کے کہا اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

دوسری شام تک میں خواب گاہ نما ایک کمرے میں رہی بڑھیا تمام وقت برابر والے کمرے میں رہی جس کا ایک مشترک دروازہ درمیان دیوار میں تھا۔ مجھے کسی بھی چیز کی ضرورت ہوتی تو میں اس پر ہولے سے دستک دیتی اور بڑھیا دوڑی آتی۔ بہرحال میرے کمرے کا آمدورفت والا دروازہ مقفل تھا۔ بڑھیا جب بھی آتی' چابی سے تالا کھول کر آتی اور باہر جاتے وقت بھی دروازہ مقفل کر جاتی۔

کمرہ نہایت کشادہ' روشن اور ہوادار تھا۔ اس لئے اس میں احساس نہیں ہوا کہ میں یہاں قید ہوں۔ ایک دوپہر کو تم رونے لگے تو بڑھیا تمہیں بہلانے کیلئے باہر لے گئی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد واپس آئی تو تمہارے لئے کھانے پینے کی بہت سی چیزیں اور کھلونے کے پیکٹ اٹھا لائی تھی۔

مجھے اب تک معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں اور مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے۔ گوہر جان کو مجھ سے کیا مطلب ہے؟ اور مجھے یہاں قیدیوں کی طرح کیوں رکھا جا رہا ہے؟ گو کہ مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں تھی لیکن مقفل کمرے میں رہنا بجائے خود ایک بہت بڑی تکلیف تھی۔ شام کو گوہر جان آئی تو اس کے ساتھ ایک منحنی سا بوڑھا آدمی بھی تھا۔

"انہیں اپنا اور بچے کا ناپ دو۔ دو تین روز میں تمہارے کپڑے وغیرہ تیار ہو کر آ جائیں گے۔" گوہر جان نے ملائمت سے کہا۔

بوڑھا ناپ لے کر جا چکا تو میں نے گوہر جان کی طرف دیکھا وہ اسی لمبے سے ہولڈر میں سگریٹ لگائے' ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھی تھی اور گہرے کش لے رہی تھی۔ میری موجودگی کا اسے گویا احساس ہی نہیں تھا۔

"یہ کیا سلسلہ ہے؟" بالآخر میں نے کھنکار کر کہا اور تب وہ میری طرف متوجہ ہوئی۔

"کیا اب مجھے یہاں رہنا ہوگا؟"

"ظاہری سی بات ہے۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

"لیکن کیوں؟ اور یہ کونسی جگہ ہے؟" میں نے تند لہجے میں کہا۔

"کیا ابھی تک تمہاری سمجھ میں نہیں آیا؟" اس نے ہلکی سی حیرت سے کہا۔

"نہیں!" میں نے تیزی سے جواب دیا۔

"بہت بھولی ہو' جو عورتیں بھرپور جوانی کے عالم میں اس دنیا میں داخل ہوتی ہیں آگے چل کر بڑی قیمت پاتی ہیں۔" اس نے ہلکا سا کش لیا اور بغور مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا نواب نے تمہیں کچھ نہیں بتایا تھا؟"

"کس سلسلے میں؟" میں تقریباً چلا اٹھی۔

"اوہ! اس مردود نواب سے یہی امید تھی۔ بہرحال میں تمہیں سارا قصہ سناتی ہوں۔" کچھ سوچ کر اس نے گویا وضاحت کی۔ "سب سے پہلے تو میں تمہیں یہ بتاؤں کہ اس وقت تم فارس روڈ کے علاقے میں ہو۔"

"ایک لمحے کیلئے تو میں نے کوئی خاص بات محسوس نہیں کی۔ دفعتاً" میرے ذہن میں چھناکا سا ہوا۔ ایک مرتبہ ارباب نے باتوں باتوں میں سرسری طور پر بتایا تھا کہ بمبئی کا فارس روڈ کا علاقہ ہندوستان کا سب سے بڑا بازار حسن ہے۔

میرے ذہن میں بازار حسن کا تصور نہایت ہولناک تھا۔ یہ تصور ذہن میں ابھرتے ہی میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے اور ساری تندی و تیزی رخصت ہو گئی۔

"لیکن مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟" میں نے سرسراتی آواز میں پوچھا۔ "کیا نواب نے مجھے تمہارے ہاتھ فروخت کر دیا ہے؟"

"نہیں۔ ابھی وہ [illegible] اتنا غریب نہیں ہوا کہ بازاری عورتوں کے ہاتھ لڑکیاں

فروخت کرنے لگے۔ اس نے تو مجھے ایک لاکھ روپیہ بھی دیا ہے۔"

میں ایک تک اسے گھورتی رہی تھی۔ دھوئیں کے مرغولوں میں اس کا معصوم چہرہ مجھے دھندلا دھندلا سا لگ رہا تھا۔ نیم وا آنکھوں سے ہوا میں کسی غیر مرئی چیز کو دیکھتے ہوئے وہ دھیرے دھیرے کش لے رہی تھی۔ اس کی محرابی پیشانی پر شکنیں ابھر آئی تھیں گویا وہ الجھن میں ہو کہ بات کہاں سے شروع کرے۔

میں اس کے لب ہلنے کی منتظر تھی۔۔۔

○

"یہ تقریباً تیس سال پہلے کی بات ہے" بالآخر گوہر جان نے کہا۔ "یعنی اس وقت کی جب نواب شرافت علی جوان تھا اور اس کوٹھے پر باقاعدگی سے آتا تھا۔ میں بمبئی میں ن کی بیٹھا کرتی تھی اور اس کی طرف سے اس زمانے میں مجھے پانچ ہزار روپے مہینہ ملتا تھا۔ پانچ ہزار روپیہ تو اس زمانے میں بھی بڑی چیز ہے۔ اس زمانے کی تو بات ہی مت پوچھو۔" سنے لمبی سانس لے کر سگریٹ کا ایک کش لیا۔ میں ایک تک اس کی صورت دیکھ رہی تھی۔

"وہ جب بھی بمبئی آتا اور جتنے دن بھی ٹھہرتا مجھے اس کے ساتھ اس کی کوٹھی میں رہنا پڑتا تھا۔" ایک لمحے کے توقف سے گوہر جان نے بات جاری رکھی۔ "اس تعلق کے دوران میں تمام تر احتیاطی کوششوں کے باوجود میرے ہاں ایک بچی پیدا ہو گئی۔ بچی خاصی خوبصورت تھی یا دوسرے لفظوں میں تم کہہ سکتی ہو کہ بالکل باپ پر گئی تھی۔ "نواب اور ہمارا بچہ تھا" ہم جیسی عورتوں کے ہاں اپنی لڑکیاں بوجھ نہیں ہوتیں۔ نواب نے کئی مرتبہ بچی کو اپنے ساتھ لے جانے کے لئے مجھ سے بات کی مگر میں ٹال مٹول کرتی رہی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ اس وقت بچی کے لئے میرے دل میں ماتا کروٹیں لے رہی تھی۔ دوسرے یہ کہ میرے ذہن کے کسی گوشے میں نواب کے خلاف کینہ موجود تھا اور وہ اس لئے کہ اس نے ابتداء میں مجھے شادی کا جھانسا دیا تھا اور میں اپنی تمام تر چالاکی کے باوجود اس کے جھانسے میں آ گئی تھی۔ بیگم بننے کے خواب دیکھنے لگی تھی۔ کئی برس کے انتظار کے بعد جب میں نے اس کا وعدہ یاد دلایا تو وہ عجیب سے انداز میں ہنس پڑا۔ کہنے لگا دو چار لوگوں نے جوش جذبات میں آ کر بازاری عورتوں سے شادیاں کر لی ہیں۔ اب ایک ہر خوش شکل عورت رانی مہارانی اور بیگم بننے کے خواب دیکھنے لگی ہے۔ لیکن ہم چونکہ بہت دور کی سوچتے ہیں اس لئے کسی بازاری عورت کو محل سرا میں لے جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے" اس کے بعد نواب نے میرا پانچ ہزار روپیہ مہینہ باندھ دیا۔ میرے دل کو ٹھیس سی لگی۔ مگر بہرحال میں خاندانی قسم کی بازاری عورت تھی' مصلحت کوشی اور عدم جذباتیت ہماری گھٹی میں پڑی ہوتی ہے اس لئے خاموشی سے اس چوٹ کو سہہ گئی۔

"ظاہر ہے کہ بچی کی پیدائش تک میں اس چوٹ کو بھولی نہیں تھی۔ چنانچہ میں بچی نواب کو دینے کے سلسلے میں ٹال مٹول سے کام لیتی رہی۔ حتیٰ کہ کچھ عرصے بعد نواب دور جانے کن جھگڑوں میں اپنی جاگیروں پر ہی الجھ کر رہ گیا اور ایک طویل مدت تک یہاں نہ آیا۔"

"کئی سال بعد اس کی آمدورفت شروع ہوئی تو میرے بجائے اس نے کسی او ڈیرہ سی لڑکی سے تعلق استوار کرلیا۔ مجھے بھی اب اس کی کوئی خاص پروا نہیں تھی۔ پھر اس عرصے میں نہ جانے کہاں سے کہاں تک پہنچ چکی تھی ـــ میں تمہیں مختصراً یہ قصہ سنائے دے رہی ہوں ـــ انہی حالات میں بالآخر میرے بطن سے جنم لینے والی نواب کی بیٹی جوان ہوگئی۔

"میں نے اس کی پرورش اور تربیت اسی طرح کی تھی جس طرح ایک بچی کی ہو سکتی ہے۔ اس کے جوان ہوتے ہی میں نے اس سے مجرا کرانا شروع کردیا۔ لڑکی کی شکل و صورت جوانی کے رنگ روپ کے باوجود کوئی خاص نہیں تھی اور کوٹھے پر بڑے پائے کے حسن پرستوں کا آنا جانا تھا۔ اس لئے دوسری لڑکیوں کے مقابلے میں اسے کوئی خاص توجہ نہیں ملتی تھی۔ لیکن جب میں جان بوجھ کر باتوں باتوں میں انہیں بتاتی تھی کہ یہ نواب شرافت علی کی بیٹی ہے تو تماش بینوں کو اس سے کچھ دلچسپی محسوس ہونے لگتی تھی۔"

"تماش بینوں میں نواب کے ہم عصر بھی ہوتے تھے اس کا کوئی شناسا بھی ہوتا کوئی اس سے حسد رکھنے والا بھی ہوتا تھا۔ یہ بات نواب کے کانوں تک بھی پہنچنے لگی کہ بعض لوگ اس کے تذکرے پر ناک بھوں چڑھا کر کہتے ہیں 'اچھا وہی نواب شرافت علی خان جس کی ایک لڑکی فارس روڈ کے ایک کوٹھے پر ناچتی ہے' تم اندازہ کرسکتی ہو کہ نواب کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ وہ اولین فرصت میں میرے پاس دوڑا آیا۔"

"لڑکی لینے کے لئے اس نے شرافت، دولت، دھمکی، لالچ سارے ہی ہتھکنڈے آزمائے مگر میں بھی نہ جانے کیوں کچھ زیادہ ہی ضد پر اڑی رہی۔ میں نے لڑکی اس کے حوالے نہیں کی۔ بالآخر اس نے وہی جاگیردارانہ حربہ استعمال کیا یعنی آٹھ دس مسلح آدمی بھیجے اور لڑکی کو اغوا کرلیا۔ انگریزوں سے اس کے بہت ہی گہرے تعلقات ہیں لیکن ان سے تعلقات ہمارے بھی کچھ برے نہیں اور پھر انگریز میں جہاں بہت سی برائیاں ہیں وہاں بہت سی خوبیاں بھی ہیں۔ یہ میرا ذاتی مشاہدہ ہے عام آدمی کا تجربہ شاید مختلف ہو مگر میں نے دیکھا ہے کہ انگریز اس طرح کی کھلم کھلا غنڈہ گردی کو پسند نہیں کرتا، خواہ اس کا مظاہرہ اس کے دوستوں اور ہندوستان کے غداروں کی طرف سے ہی ہو۔ بس تو پھر ہم نے بھی کچھ ڈوریاں ہلائیں۔ چھٹے دن لڑکی نواب کی جاگیر سے برآمد ہوگئی اور دوبارہ یہاں پہنچ گئی۔

"اس کے بعد نواب کافی عرصے کے لئے ٹھنڈا پڑ گیا لیکن کل اچانک نواب کا پیغام

کہ وہ لڑکی کے سلسلے میں مجھ سے ایک نہایت اہم سودا کرنا چاہتا ہے' اور میں تم سے کہ اس سے ملوں ضرور۔۔۔ اسے یقین ہے کہ میرے منہ میں پانی آجائے گا۔ مجھے تجسس ہوا کہ تم ادھر مل کر تو دیکھ ہی لینا۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ اس دوران میں اس لڑکی سے خاصی بیزار ہوچکی تھی۔ کیونکہ ایک تو اس کی وجہ سے مجھے کوئی خاص مالی فائدہ نہیں ہوا' دوسرے وہ خود یہاں اکھڑی اکھڑی سی رہنے لگی تھی۔ جب سے وہ باپ کی جاگیر ہو کر آئی تھی۔ خود کو ہی اس کی وارث مالک سمجھنے لگی تھی۔"

"میں نے اسے سمجھایا کہ نوابوں اور جاگیرداروں کی ہم جیسی عورتوں سے جو اولادیں ہوتی ہیں انہیں وہ محض اپنی ناک رکھنے کے لئے اپنی حویلیوں میں لے جاتے ہیں۔ لیکن حقیقتاً انہیں اس اولاد سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی اور نہ ہی وہ انہیں اپنی دولت و جائیداد میں سے کوئی حصہ دیتے ہیں۔ یہ بچے ان کی محل سراؤں میں یتیموں کی طرح پرورش پاتے ہیں۔ لیکن میرے اس سمجھانے بجھانے کا لڑکی پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ اس طرح ہم دونوں کے درمیان خلیج سی حائل ہوچکی تھی۔ چنانچہ میں نواب سے ملنے چلی گئی۔"

"ملاقات کی میز پر نواب نے مجھے تمہاری صورت دکھائی بعد میں تمہاری کہانی سنائی اور پیشکش کی کہ اگر میں تمہیں اپنے کوٹھے کے لئے اس کی بیٹی کے تبادل کے طور پر قبول کرلوں تو وہ بے حد احسان مند ہوگا اور ساتھ ایک لاکھ روپیہ بھی دے گا۔ شاید یہ میری عمر کا تقاضا تھا یا پھر نواب کی بیٹی سے بیزاری کا نتیجہ تھا کہ میں اس پیشکش کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور ہوگئی۔ اور پھر بڑی بات تو یہ ہے کہ تمہارے حسن نے میری آنکھیں خیرہ کرکے رکھ دی تھیں۔ اس گوہر جان کی آنکھیں جس نے خود اپنے زمانے میں نہ جانے کتنی آنکھوں کو خیرہ کیا تھا۔ کتنے دلوں کو دھڑکنا بھلا دیا تھا کتنی متکبر پیشانیوں کو اپنی دہلیز پر جھکایا تھا۔ اس گوہر جان کی آنکھیں جو برسوں اس بازار کی بے تاج ملکہ رہی جہاں پورے ہندوستان سے بہترین ترشے ہوئے ہیرے کسی نہ کسی طریقے سے لاکر جمع کئے جاتے ہیں۔ اس گوہر جان کی آنکھیں تمہیں دیکھ کر چند لمحے کے لئے جھپکنا بھول گئی تھیں۔"

"ظاہر میں تم سے بڑی بے نیازی برت رہی تھی لیکن اب میں تمہارے سامنے یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتی کہ اس وقت درحقیقت میری دھڑکنیں یک لخت تیز ہوگئی تھیں۔ چشم تصور میں میں نے دیکھا کہ یہ ہیرا جب تراش خراش کے بعد میرے بالا خانے کی زینت بنے گا تو کیا کیا قیامتیں بپا ہوں گی۔ نواب نے بڑی دیانت داری سے بتا دیا تھا کہ تم دو بچوں کی ماں ہو لیکن اب بھی تم اس بازار کی تمام لڑکیوں سے بہتر ہو۔ گوہر جان کی حسن کاری ہے کہ تم اس بازار کی تاریخ کا ایک اہم باب رقم کرو گی۔ امید ہے اب تم سب کچھ سمجھ گئی ہوگی یا کچھ پوچھنے کی ضرورت باقی ہے؟"

میں اب تک گویا سماعت کا سمندر بنی بیٹھی تھی' جس میں گوہر جان کی [illegible] ..

علقہ قطرہ قطرہ بن کر ختم ہوتا جا رہا تھا۔ اور جیسے میں یک لخت انسانی قالب میں آگئی۔ اس کے باوجود کئی لمحے تک میں کچھ نہ بول پائی۔ میری مٹھیاں بھنچ گئی تھیں' نچلا ہونٹ دانتوں سے دبا ہوا تھا اور جسم کا تمام خون گویا کنپٹیوں میں جمع ہو گیا تھا۔

"گوہر جان!" بالآخر میرے حلق سے آواز نکلی اور مجھے اس پر کسی زخمی درندے کی غراہٹ کا گمان ہوا۔ "تم دو انسانوں کے تبادلے کا ذکر یوں کر رہی ہو جیسے غلطی سے تم کوئی خراب ہنڈی خرید لائی تھیں اور اب وہ تم دکاندار کو واپس کر کے اچھی ہنڈی لے آئی ہو۔ نواب کی لڑکی بے شک چاند تھی لیکن اس نے جنم تو تمہاری کوکھ سے لیا تھا۔ اسے پال پوس کر یوں ایک جنس ناقص کی طرح نواب کے حوالے کرتے وقت تمہارا دل ذرا بھی نہیں دکھا تھا؟"

"اگر ہم جیسی عورتیں اس قسم کے دکھ جی میں پالنے لگیں تو ہم اور عام عورتوں میں فرق رفتہ رفتہ مٹ جائے گا۔" گوہر جان نے پرسکون لہجے میں کہا اور ہولڈر میں دوسرا سگریٹ لگانے لگی۔ سگریٹ جلا کر اس نے صوفے پر پہلو بدلا اور ایک گہرا کش لے کر بولی۔ "جذباتیت ہماری سب سے بڑی دشمن ہے۔"

"دوسری بات یہ میں نے پہلے سے ہی لہجے میں کہا "کہ تم نے کیسے فرض کر لیا کہ میں وہی کچھ بن جاؤں گی جو تم مجھے بنانا چاہو گی؟"

"تمہیں بننا پڑے گا میری جان" اس نے قدرے اضطراب سے پہلو بدل کر کہا۔ سگریٹ ہولڈر اس نے دو تین مرتبہ ایک سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا۔ پھر اپنے مخصوص انداز میں پرسکون ہو کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "اس لئے کہ تمہارے سامنے کوئی دوسرا راستہ تو کیا' واپس جانے کی بھی کوئی راہ نہیں ہے۔" اس نے نیم وا آنکھوں سے براہ راست میری آنکھوں میں جھانکا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پلکیں جھپکائے بغیر اسے گھورتی رہی۔

"میں بہت مہربان عورت ہوں" چند لمحے کے توقف کے بعد اس نے دھیمے سے لہجے میں کہا "ظلم اور زبردستی کی میں قائل نہیں' میں صرف انسانوں سے کوئی ایسے کام صرف دلیل کے سہارے کروا لیتی ہوں جن کے لئے بعض لوگ طاقت استعمال کرتے ہیں' جبر و تشدد کرتے ہیں اور پھر ناکام رہتے ہیں۔ بہرحال۔۔۔"

وہ اچانک اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اس موضوع پر بات کرنے کی مجھے کوئی جلدی نہیں' کوئی بے صبری نہیں۔ اور تم بھی ابھی سے اپنے ذہن کو مت تھکاؤ۔ اعصاب پر بوجھ مت ڈالو۔ آرام سے رہو' کھاؤ پیو' اپنی مرضی سے سوؤ' اپنی مرضی سے جاگو' ذہن سے ماضی کی خراشیں مٹنے دو' ہر مسئلے کے بارے میں سوچنے کا ایک وقت ہوتا ہے اور میرے خیال میں اس موضوع پر سر کھپانے کا ابھی وقت نہیں آیا۔ خدا حافظ۔" دوسرے ہی لمحے وہ کمرے سے جا چکی تھی۔ صرف اس کے ذہن میں بسی ہوئی خوشبو کا ہلکا سا اثر پھر اس کے نکل جانے کے بعد۔

کے دھویں کے بچے کھچے مرغولے کمرے میں چکراتے رہ گئے۔

میں اپنی جگہ سن بیٹھی رہ گئی۔ تقدیر کی اس مسلسل ستم ظریفی پر میرا چیخنے کو جی چاہتا تھا کہ گڑھے سے نکلی تھی۔ تو کھائی میں جا گری تھی' اور کھائی سے جان چھڑا کر نکلی تھی تو دلدل میری منتظر ہوتی تھی۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ آخر میں کس گناہ کی پاداش میں مسلسل تدریج کی ناگہانی گرفت میں تھی۔

مجھے اب جس تازہ صورت حال کا سامنا تھا اس کے بارے میں جتنا زیادہ سوچتی تھی اتنا ہی دل لرزتا تھا۔ پھر میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ یہاں کوئی تیری ڈھارس بندھانے تو نہیں آئے گا' تجھے راہ سجھانے نہیں آئے گا' تو خود ہی اپنی مشیر ہے اور تجھے جو کچھ کرنا ہے' صرف اپنے ہی ذہن کی مدد سے کرنا ہے تو پھر اپنے آپ کو بدحواس کرنے اور ہاتھ پاؤں چھوڑنے کا کیا فائدہ؟ تجھے کوئی راہ فرار تلاش کرنا ہوگی۔ میں سوچتی رہی۔ رات گئے تک سوچتی رہی۔

آدھی رات کے قریب جبکہ میرے کمرے پر موت کا سکوت طاری تھا اور چھیا' بہرکی دنیا بھی اسی طرح سناٹے میں ڈوبی ہوئی تھی' میں پلنگ سے اٹھی اور اس دروازے پر پہنچی جس پر دستک دینے سے بوڑھی خادمہ آن حاضر ہوتی تھی۔ میں نے دروازے پر محض ایک انگلی سے نہایت آہستگی سے ٹک ٹک کی۔ مجھے امید نہیں تھی کہ رات کے اس پہر تک ایسی مدھم سی دستک وہ بڑھیا سن سکے گی لیکن اس سے زیادہ بلند دستک دینے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔

بڑھیا کے جسم میں شاید کوئی شیطانی روح بستی تھی جو ہر وقت بیدار رہتی تھی۔ اتنی خفیف سی دستک کے باوجود مجھے بیس کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ دوسرے ہی لمحے کمرے میں چپلوں کی گھسر پھسر کی آواز سنائی دی اور میں سنبھل کر دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہو گئی۔ میرے ہاتھوں میں دوپٹہ تھا جسے میں نے پھندے کی شکل دے رکھی تھی۔

دروازہ کھلا اور بڑھیا اپنی جھونک میں تیزی سے اندر آئی۔ جو کام میں کرنے جا رہی تھی اس قسم کے کام کا مجھے کوئی تجربہ نہیں تھا لیکن اس وقت میرے سینے میں اس چڑیا کی طرح پھڑپھڑا رہی تھی جو چیل کو اپنے سر پر اٹھا کر اڑ جانا چاہتا ہو۔ اسی روح کا تقاضا تھا کہ تب میں نے بڑھیا کی طرف پھندا اچھالا تو وہ سیدھا اس کی گردن میں جا پڑا۔ دوسرے ہی لمحے وہ فرش پر چت ہو چکی تھی۔ میں نے اس کے سینے پر گھٹنے رکھ کر سب سے پہلے اس دوپٹے کا کچھ حصہ اس کے منہ میں ٹھونسا اور ڈھیلے کر کے باقی حصے سے اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے۔ بڑھیا بظاہر سوکھی سی تھی لیکن تھی سخت جان۔ بری طرح فرش پر تڑپنے اور قابو ہونے کے باوجود بری طرح ٹانگیں چلا رہی تھی۔

مجبوراً میں نے بستر کی موٹی سی رسی بنا کر بڑھیا کی ٹانگیں بھی باندھ دیں۔ اب میں

نے تمہیں اٹھا کر کندھے سے لگایا اس خوف سے میرا دل لرز رہا تھا کہ تم جاگ نہ اٹھو لیکن یہ دیکھ کر مجھے قدرے اطمینان ہوا کہ تم گہری نیند میں تھے۔

میں دبے پاؤں بڑھیا کے کمرے میں داخل ہوئی بڑھیا کو جب مکان سے باہر جانا ہوتا تھا تب بھی پہلے اپنے کمرے ہی کی طرف جاتی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ آمدورفت کا کوئی راستہ موجود تھا اسی امید پر میں نے یہ قدم اٹھایا تھا۔

بڑھیا کے کمرے میں روشنی تھی۔ اندر کی طرف سے اس کے دروازے کی کنڈی چڑھی ہوئی تھی۔ نہایت احتیاط سے میں نے کنڈی کھولی اور باہر جھانکا۔ دروازے نے بیچ چند خاص قسم کی دھیمی دھیمی آوازوں کے دھارے کو باہر ہی روکا ہوا تھا دروازہ کھلتے ہی بیچ مجھ پر ان آوازوں کی ہلکی سی پھوار پڑی۔

یہ آوازیں طبلے کی تھنک، سارنگی کی دکھی لے، گھنگھروؤں کی جھنکار اور مبہم سے زیرو بم کی تھیں۔ مگر شاید کہیں بہت دور سے محض ایک بازگشت کی طرح سنائی دے رہی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ زندگی ابھی اس علاقے میں بیدار تھی۔ اور جیسا کہ مجھے معلوم ہو چکا تھا یہ فارس روڈ کا علاقہ تھا تو اس صورت میں میرے لئے یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ یہ تو میں سن چکی تھی کہ اس جہان نغمہ و جھنکار کی راتیں جاگتی ہیں اور دن سوتے ہیں۔

میرے لئے باعث اطمینان امر تو یہ تھا کہ اس وقت وہ طویل و عریض مکان سکوت اور نیم تاریکی میں لپٹا ہوا تھا۔ کمرے کے دروازے سے نکل کر میں بالکونی میں پہنچ گئی مگر اس لحاظ سے یہ بالکونی عجیب تھی کہ اس کی دیوار انسانی قد سے بھی اونچی تھی۔

اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق میں نے سمت کا تعین کرنے کی کوشش کی اور دیوار کے ساتھ ساتھ بائیں طرف چل دی۔ میرے دائیں ہاتھ پر ایک کشادہ سی راہداری نظر آئی اس کے اختتام پر دیوار میں ایک بڑا سا کھڑکی نما ہولڈر نصب تھا۔ جس میں ایک بڑا سا بلب جھول رہا تھا۔ مگر وہ اتنا میلا تھا کہ اس کی روشنی ایک چراغ کے برابر رہ گئی تھی۔

میں تقریباً دوڑتی ہوئی اس راہداری کے سرے تک پہنچی اور تب میں نے دیکھا کہ میں بہت بڑے دائرے میں پھیلی ہوئی اس جنگلے دار بالکونی میں کھڑی ہوں جس سے نیچے جھانکنے پر یہ مکان ایک بہت بڑے کنویں سے مشابہ نظر آتا تھا۔ یہاں سے اس کی ساخت میرے لئے کافی حد تک ناقابل فہم تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ اگر میں اس گول بالکونی میں چلنا شروع کر دوں تو بائیں ہاتھ پر پڑنے والے کسی بھی زینے سے نیچے پہنچ سکتی ہوں۔ لیکن قباحت یہ تھی کہ اس وقت بائیں ہاتھ پر کمروں کی قطار تاریکی میں ڈوبی نظر آ رہی تھی۔

میں نے بچوں کے سے [illegible] بالکونی میں لمبے لمبے ڈگ بھرنے شروع کیے۔ پانچ چھ کمروں کے سامنے سے گزرتے ہی بائیں ہاتھ پر مجھے سیڑھیاں نظر آ گئیں۔ قدموں کی [illegible]

تو رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے میں سیڑھیاں اترنے لگی بچپن حویلی کی سیڑھیاں میں بخیر و عافیت اتر آئی۔ سیڑھیوں کے اختتام پر گول صحن کے باہر سامنے ہی مجھے صدر دروازہ نظر آ گیا کیونکہ وہاں بہت کم روشنی تھی۔

میں لپک کر دروازے تک پہنچی مگر یہ دیکھ کر میرا دل ڈوب گیا کہ لوہے کی بھاری سی زنجیر دار کنڈی میں موٹا سا تالا لٹکا ہوا تھا میں حسرت سے اس تالے کو گھور کر دیکھ رہی تھی کہ کہیں قریب ہی سے سرگوشی سی سنائی دی۔ "باہر جانا ہے؟"

میں اس طرح خوف زدہ ہو کر اچھلی کہ تم کسمسا اٹھے لیکن میں نے اضطراری طور پر تمہیں جلدی سے تھپک کر دوبارہ کندھے سے لگایا۔ سرگوشی سے اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ آواز عورت کی تھی یا مرد کی۔ میں نے ہراساں نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ میرے دائیں جانب گہرا اندھیرا تھا۔ اس اندھیرے نے اپنے شکم سے ایک انسانی وجود اگل دیا۔ کپڑے پہنے ڈھیلے ڈھالے سفید کرتے اور واسکٹ میں ملبوس یہ ایک دراز قد اور قوی الجثہ مرد تھا اس کے سر پر سیاہ مخملی ٹوپی تھی اور قدرے پھیلی ہوئی سی ناک تلے مونچھیں بل کھا کر یوں اٹھی ہوئی تھیں جیسے دو بچھو آمنے سامنے برہم کھڑے ہوں۔

"باہر جانا ہے؟" اس نے دوبارہ اسی سرگوشی میں پوچھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اسی طرح بھنچی بھنچی سی آواز میں بات کرنے کا عادی ہے۔ "گھبراؤ مت میرے پاس چابی ہے۔" اس کے لہجے میں رازداری تھی۔ جیسے کسی نامعلوم وجہ کی بناء پر اسے مجھ سے ہمدردی ہو۔ پھر اس نے میرے جواب کا انتظار کئے بغیر واسکٹ کی جیب سے چابیوں کا ایک گچھا نکالا اور اس میں سے ایک چابی منتخب کر کے تالا کھول دیا۔

میں تب بھی اپنی جگہ سے نہ ہلی تو اس نے خود آگے ہو کر دروازہ چوپٹ کھول دیا اور ایک طرف کو ہٹ کر ہاتھ سے باہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "جانا چاہتی ہو تو جاؤ۔ وقت ضائع مت کرو۔"

میں اب بھی ساکت کھڑی تھی۔ شاید۔ غیر شعوری طور پر میں یہ تجزیہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ یہ شخص اپنی نوازش کی کیا قیمت وصول کرنا چاہتا ہے۔ بالآخر میں اسی نتیجے پر پہنچی کہ شاید وہ بنیادی طور پر ایک خدا ترس انسان تھا اور بحیثیت نگران یا چوکیدار اسے جو مواقع میسر تھے۔ وہ مجھے ان سے فائدہ پہنچانے کی کوشش کر رہا تھا۔

میری ہچکچاہٹ دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔ "شاید راستے معلوم نہیں ہیں؟ آؤ میں تمہیں اس علاقے سے باہر چھوڑ آؤں۔" وہ مجھ سے پہلے دروازے سے نکل کر آگے آگے ہولیا۔ میں نے یوں بڑھ کر چوکھٹ عبور کی جیسے یک لخت مجھے احساس ہوا ہو کہ میں مزید ایک لمحہ بھی کھڑی رہی تو یہ دروازہ بند ہو جائے گا اور میں یہیں مقید رہ جاؤں گی۔

سیڑھیاں اتر کر وہ شخص کچھ دور تک روشن گلی میں چلتا رہا پھر ایک جگہ رک کر

اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ معنی خیز انداز میں مسکرایا اور ایک تاریک گلی میں مڑ گیا۔
"جلدی آؤ۔" میں نے تاریکی سے ایک بار پھر اس کی تیکھی تیکھی سی آواز سنی۔ "کہیں ہمارے تعاقب میں نہ آ نکلے۔"

ایک لمحے کے لئے میں نے تاریک گلی کے موڑ پر رک کر کچھ سوچنے کی کوشش کی لیکن پھر مجھے احساس ہوا کہ اس وقت میرے ذہن میں کچھ سوچنے کی سکت نہیں ہے۔ میں چپ چاپ اس کے پیچھے گلی میں داخل ہو گئی۔ اپنے سفید کپڑوں کی وجہ سے وہ اگر صاف نہیں تو کم از کم ایک ہیولے کی طرح مجھے ضرور نظر آ رہا تھا۔

کافی دیر تک ہم یونہی تاریک گلیوں میں چکراتے رہے۔ تیسیں اٹھا کر پیچھے چلنے میں ہانپنے لگی تھی۔ "شاید تم تھک گئی ہو؟" اس نے غالباً میرے ہانپنے کی آواز سن کر پلٹ کر کہا۔ "بہرحال وہ سڑک اب زیادہ دور نہیں جس پر تمہیں چھوڑ کر میں لوٹ جاؤں گا۔" وہ اب بھی پہلے ہی کی طرح تیکھی تیکھی آواز میں بول رہا تھا۔

بالآخر ہم ایک ایسی گلی میں پہنچے جس کے اختتام پر ایک بلند و بالا دیوار تھی۔ دیوار میں اتنا چھوٹا سا دروازہ تھا اسے چھوٹا ہول کر بھی ایک صحت مند انسان قدرے مشکل ہی سے گزر سکتا تھا۔ اس دروازے میں کہیں تالا نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن اس شخص نے ایک بار پھر اپنا چابیوں کا گچھا نکالا اور ایک چابی دروازے میں موجود ایک ننھے سے سوراخ میں داخل کر دی۔ دوسرے ہی لمحے دروازہ کھل گیا۔ شاید یہ کسی قسم کا چور دروازہ تھا اور نہایت تنگ سی ایک گلی میں کھلتا تھا۔ جو غالباً قدرے فراخ سڑک پر نکلتی تھی کیونکہ چند گز لمبی اس تنگ و تاریک گلی کے اختتام پر ہلکی سی روشنی نظر آ رہی تھی۔

"چلو ناک کی سیدھ میں چلتی جانا۔" اس نے ایک طرف ہٹ کر مجھے راستہ دیا۔ "مرکزی سڑک پر پہنچ جاؤ گی۔"

دھڑکتے دل سے میں نے اس تنگ اور تاریک گلی میں قدم رکھا۔ اندھیرے میں دونوں طرف کی دیواریں تک دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ لیکن چند قدم چل کر جب میں گلی کے سرے تک پہنچی جہاں روشنی تھی تو یہ دیکھ کر میرے پاؤں پتھر ہو گئے کہ میں اسی کوٹھے نما مکان کے گول صحن میں کھڑی تھی۔ میرے عقب میں ہنسی کی آواز ابھری۔ مڑ کر دیکھا تو وہ شخص پیٹ پکڑے ہنس ہنس کر دوہرا ہو رہا تھا۔ اس کی ہنسی کی آواز بھی تیکھی تیکھی سی تھی۔ چند لمحے تک میں ساکت کھڑی پلکیں جھپکائے بغیر اسے گھورتی رہی۔

بے پناہ غصہ میری شریانوں میں دوڑتے لہو کے ساتھ سمٹ کر سینے میں جمع ہو گیا۔ پھر یک لخت میں نے اس کے گھٹنے پر پوری طاقت سے ٹھوکر رسید کی۔ میرے پاؤں میں گوہر جان کے دیئے ہوئے نہایت مضبوط اور سخت تلے کے سینڈل تھے اور میرا خیال تھا کہ میری ٹھوکر سے وہ خبیث کئی دن کے لئے لنگڑانے پر مجبور ہو جائے گا مگر اس نے اُف

تک نہ کی البتہ میرا پاؤں ضرور جھنجھنا کر رہ گیا۔ عام سی جسامت کا مالک ہونے کے باوجود اس کی قوت برداشت غیر معمولی تھی۔

بہرحال اس کی "ہی ہی" ضرور تھم گئی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے کرتے کے نیچے ہاتھ لے جا کر نہ جانے کہاں سے انگلی برابر چوڑا اور بالشت بھر سے زیادہ لمبا چم چم کرتا ایک خنجر نکالا۔ اور میری گردن پر رکھ دیا۔ میں ہڑبڑا کر پیچھے ہٹی لیکن خنجر کی نوک بدستور میرے نرخرے پر لگی رہی۔ دھیرے دھیرے شہ رگ پر اس کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔

"کمینی ــــ حرافہ ....." اس کی تیکھی تیکھی سی آواز میرے کان کے قریب گونجی۔ اب یہ آواز کسی زخمی سانپ کی پھنکار سے مشابہ تھی۔ "تو نے جن بادشاہ کے جسم کو ٹھوکر ماری ہے ..... میں تیرے جسم کا ریشہ ریشہ الگ کر دوں گا۔"

"چل اب زبان مٹھیوں نہ چلا۔" اچانک اوپر کہیں خاصی بلندی سے آواز آئی۔ اس آواز میں بلا کا ٹھہراؤ وقار اور تحکم تھا۔ اور میں اس آواز کو ہزاروں آوازوں میں بھی پہچان سکتی تھی۔ گو کہ یہ پل پل بدلتی تھی کبھی اس میں غضب کا ترنم ہوتا تھا کبھی کمال کی جھنکار، کبھی تپش، کبھی ٹھنڈک، کبھی ٹھہراؤ، کبھی بہاؤ۔ میں نے گنتی کی مختصر سی ملاقاتوں میں اس آواز کے ان گنت نشیب و فراز محسوس کئے تھے۔ گوہر جان کی آواز تھی۔ گزشتہ روز ہی خدمت گار بڑھیا نے مجھے بتایا کہ گوہر جان نے برسوں راجوں، مہاراجوں اور نوابوں کے دل و دماغ پر راج کیا۔ اس میں اس کی بے پناہ خوبصورتی ہی نہیں اس کی بے مثل آواز کو بھی دخل تھا۔ اور مجھے بڑھیا کی اس بات پر کوئی شک نہیں تھا۔

"خنجر ہٹا اس کے گلے سے، کیوں اس کا دم خشک کر رہا ہے۔ ایک تو تیری حس مزاح بڑی جاہلانہ ہے اوپر سے خنجر پستول بھی نکال کر کھڑا ہو جاتا ہے۔" گوہر جان کہہ رہی تھی۔ خنجر فوراً ہی میری شہ رگ سے ہٹ گیا۔ میں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ تیسری منزل کی بائیں صورت بالکونی میں گوہر جان جنگلے پر کہنیاں ٹکائے قدرے جھکی کھڑی تھی۔ بلب گو کہ اس کے عقب میں قدرے بلندی پر دیوار میں فٹ تھا۔ لیکن میں آنکھوں کے سوا اس کے چہرے کا ہر نقش دیکھ سکتی تھی۔ اس کی انگلیوں میں اس کا مخصوص سگریٹ ابھی تک دبا ہوا تھا۔ اور اس میں موجود سلگتی سگریٹ سے دھوئیں کی ایک پتلی سی لکیر ہوا میں بلند ہو کر اوپر تاریکی میں مدغم ہوتی جا رہی تھی۔

"جن بادشاہ؟" گوہر جان نے اس مرتبہ لمبا سا کش لے کر کہا۔ "معزز خانم کو نہایت احترام سے اوپر لے آؤ۔" یہ کہہ کر وہ بالکونی سے ہٹ کر پیچھے کمرے میں داخل ہو گئی۔

"چلیے۔" جن بادشاہ نے خنجر کرتے کے نیچے کہیں چھپا کر مودبانہ انداز میں جھکتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا لہجہ یکسر بدل چکا تھا۔

اوپر لا کر اس نے مجھے اسی کمرے کے دروازے پر چھوڑا جس کے راستے پہلی مرتبہ میں گوہر جان کے ساتھ اندر پہنچی تھی۔ دروازہ کھلا تھا اور چوکھٹ کے پیچھے خدمت گار بڑھیا میرے استقبال کے لئے کھڑی تھی جسے میں باندھ کر فرش پر لٹا آئی تھی۔ اس کا چہرہ قطعی پرسکون اور ہر تاثر سے عاری تھا۔ گویا کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ خاموشی سے اس نے مجھے اندر چلنے کا اشارہ کیا۔

میں ایک بار پھر اسی کمرے میں پہنچ گئی جہاں سے چلی تھی۔ بیڈ کے قریب کرسی پر گوہر جان ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھی تھی۔ نیم وا آنکھوں سے اس نے میری طرف دیکھا اور سگریٹ کا ہلکا سا کش لیتے ہوئے بولی۔ "بچے کو بیڈ پر لٹا دو۔ بازو تھک گیا ہوگا تمہارا۔"

اس کا لہجہ قطعی رسمی سا تھا اس میں بدمی۔ خفگی، ہمدردی یا حقارت، غرض یہ کہ کسی بھی جذبے کی کوئی جھلک نہیں تھی۔ اس عورت کے اس رویے سے واقعی مجھے خوف آنے لگا تھا نہ جانے وہ کس قسم کا ذہن رکھتی تھی۔ کیا سوچتی تھی۔ کیا چاہتی تھی۔ اس کے متعلق کچھ بھی کہنا مشکل تھا۔

میں تمہیں بیڈ پر لٹا چکی تو گوہر جان نے شگفتہ سے انداز میں میرے کندھے پر ہلکی سے تھپکی دی اور ملائمت سے کہا۔ "اب تم بھی سو جاؤ، رات خاصی بیت گئی ہے۔ اپنے دل و دماغ کو پرسکون رکھنے کی کوشش کرو۔" پھر اس نے سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر میری طرف دیکھے بغیر شب بخیر کہا اور کمرے سے رخصت ہو گئی۔ بڑھیا بھی نہایت خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئی اور درمیانی دروازہ بے آواز طریقے سے بند ہو گیا۔

کسی نے میرے فرار کی اس ناکام کوشش پر سرزنش نہیں کی تھی لیکن سرزنش کے بعد شاید میری یہ کیفیت نہ ہوتی جو اس وقت تھی۔ احساس بے بسی جھنجلاہٹ، غصے اور نہ جانے کس کس جذبے نے اعصاب کو توڑ کر رکھ دیا۔ میں تمہارے قریب ہی بیڈ پر ڈھیر ہو گئی۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ روتے روتے میں نے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے تمہاری طرف دیکھا تو اپنے چہرے پر فرشتوں کی سی معصومیت لئے دنیا و مافیہا سے بے خبر آڑے ترچھے پڑے سو رہے تھے۔ تمہارے ہونٹ نیم وا تھے اور سانسوں کی ہلکی سی خرخراہٹ کے ساتھ نہایت غیر محسوس طور پر ہل رہے تھے۔

اس وقت تمہاری صورت دیکھ کر نہ جانے کیوں مریم مجھے اتنی شدت سے یاد آئی کہ میرا کلیجہ شق ہونے لگا۔ میری بچی نہ جانے کس حال میں تھی، کہاں تھی اور نہ جانے کوئی اس کی نگہداشت بھی کر رہا تھا کہ نہیں۔ مریم سے جدائی کا صدمہ اس لمحے مجھے ان تمام مصائب و آلام اور تکالیف پر بھی بھاری محسوس ہوا۔ جو میں ابھی اب تک زندگی میں اٹھا چکی تھی۔ میرا جی چاہا کہ چیخ چیخ کر روؤں۔ دیواروں سے سر ٹکراؤں، شاید اس طرح میری تکلیف میں کچھ کمی ہو مگر اس لمحے میرا ذہن دھیرے دھیرے تاریکی میں ڈوبنے لگا۔ شاید

مسائل، محسوسات اور سوچوں کا بوجھ ذہن کی برداشت سے باہر ہو گیا تھا۔ شاید دماغ کی نسیں تھک گئی تھیں۔ یہ بے خبری اور بے ہوشی اس وقت بہت غنیمت تھی۔ اندھیرے کی آغوش میں پناہ مل جانے سے کم از کم وقتی طور پر ذہنی کی اذیت ٹل گئی۔

دوسری صبح دن چڑھے آنکھ کھلی اعصاب پر ایک عجیب سی تھکن طاری تھی گزری ہوئی رات ایک دھندلے خواب کی طرح یاد رہ گئی تھی۔ مریم کا تصور البتہ اب بھی خنجر کی طرح دل میں پیوست تھا لیکن میں اس کی اذیت کو جھلائے رکھنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ دراصل اب میں اپنے شب و روز کا آغاز ایک نئے زاویے اور نئے حوصلے سے کرنا چاہتی تھی۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ اپنی کمزوریوں کا اظہار کرتے رہنے یا اپنے زخموں سے کھیلتے رہنے سے حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ مجھے اب سب سے پہلی کوشش یہ کرنی تھی کہ میرا جسم و روح کمزور نہ ہونے پائے تاکہ میں صحیح طور پر سوچ بھی سکوں اور اگر کسی فیصلے پر پہنچوں تو اس پر عملدرآمد کے قابل بھی رہوں۔

اس نتیجے پر پہنچ کر میں نے بظاہر اپنے آپ کو بے حد پرسکون بنا لیا۔ گوہر جان نے تین چار دن تو میری اس تبدیلی اور پرسکون انداز و اطوار کو شک آمیز نظروں سے دیکھا۔ پھر وہ حسب عادت لاپرواہ نظر آنے لگی۔ پھر ایک روز وہ میرے کمرے میں آئی تو اس کے ساتھ ایک عجیب الخلقت سا شخص بھی تھا۔

عمر اس کی پچاس کے قریب ہوگی۔ غیر معمولی طور پر اونچا لیکن ہڈیوں پر محض کھال چڑھی ہوئی گوشت کا نام و نشان نہیں۔ رنگت الٹے توے جیسی مگر ہاتھوں سے جھلکتی پان کی پیک کی وجہ سے دہانہ خون کی طرح سرخ نظر آ رہا تھا۔ سر پر پھولدار ریشمی کپڑے کی چھوٹی سی گول ٹوپی تھی۔ جس کے نیچے سے کھچڑی بالوں کی لمبی لمبی تیلی لٹیں کندھوں پر جھول رہی تھیں۔ یہ شخص چست ریشمی قمیض اور چوڑی دار پاجامہ پہنے ہوئے تھا جو اس کی ہرن جیسی سوکھی سوکھی ٹانگوں پر گویا منڈھا ہوا تھا پاؤں میں سیاہ مخمل کی سلیم شاہی جوتی تھی۔ اس نے اپنی کلائی بڑے اہتمام سے آگے کو بڑھائی ہوئی تھی اور اس پر پان رکھنے کا ایک بڑا سا رنگ برنگا ریشمی بٹوا جھول رہا تھا۔ جس کے لمبے لمبے پھندنے ہر جنبش پر قدم کے ساتھ لہرا رہے تھے۔ اس کی چال میں لٹنیب کی لچک تھی۔

میں اس وقت بیڈ پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی اور تم اپنے کھلونوں سے کھیل رہے تھے۔ وہ بانس کی طرح لمبا دبلا سیاہ فام شخص گوہر جان کو پیچھے چھوڑ کر لپکتا ہوا میرے قریب آیا اور یوں جھک گیا گویا سیدھے کھڑے ہو کر اسے میری صورت دیکھنے میں دشواری پیش آ رہی ہو۔ اس کے آتے ہی کمرہ چنبیلی کی خوشبو سے بھر گیا تھا۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ اس نے لباس شاید چنبیلی کے عطر میں ڈبو کر پہن رکھا تھا۔

"ماشاء اللہ۔ ماشاء اللہ چشم بددور۔" اس نے نہایت باٹ دار آواز میں کہا جو اس

کے مخملی جسم سے ہرگز میل نہیں کھاتی تھی۔ ہیرا ہے ہیرا گوہر بائی۔ اس نے سیدھے ہو کر گوہر جان کو مخاطب کیا پھر گہری سانس لے کر کہا "آج تک تم نے اتنی لڑکیوں کو چھپایا لیکن تمہارے بھاگ صحیح معنوں میں آج کھلے ہیں۔"

گوہر جان طمانیت اور خاکساری سے مسکرائی گویا اسے بھی عمر بھر کی کسی ریاضت کا صلہ مل گیا ہو۔ لمبا مجہول شخص میرے پنڈ کے قریب سے ہٹ کر طویل و عریض کمرے کے ایک حصے میں بچھے ہوئے اور چاندنی سے ڈھکے ہوئے فرش کی طرف بڑھ گیا۔ چاندنی پر دیوار کے ساتھ کئی گاؤ تکیے بھی لگے ہوئے تھے اس نے بڑی نزاکت سے اپنی سیاہ مخمل کی سلیم شاہی جوتی اتاری اور ایک گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے اپنا منہ کھڑکی سے اکہلا۔ اس کے بعد نے نہایت نفاست سے یوں موڑے گویا کپڑا تہ کر رہا ہو۔ پھر جوتے کو اپنے قریب رکھ کر دو زانو ہو کر بیٹھ گیا۔

میں اپنی حیرت کو چھپائے اس کی حرکات و سکنات دیکھ رہی تھی گوہر جان بھی آج معمول سے کچھ زیادہ بار سنگھار کئے ہوئے تھی گویا کسی تقریب میں جانے کی تیاری کر کے آئی ہو۔ وہ پلٹ کر دروازے تک آئی اور نہ جانے کس کو کوئی اشارہ کر کے لوٹ آئی۔ اس کے پیچھے پیچھے ہی دو ملازم کمرے میں داخل ہوئے ایک نے بڑا منقش قسم کا ہارمونیم اٹھا رکھا تھا اور دوسرا لڈوؤں سے بھرا ہوا ایک نقرئی تھال اٹھائے ہوئے تھا۔ لڈوؤں کے اردگرد گلاب اور چنبیلی کی پتیوں کا ایک موٹا سا دائرہ تھا۔

ملازموں نے یہ دونوں چیزیں اس مجہول شخص کے سامنے رکھ دیں اور خود خاموشی سے الٹے قدموں لوٹ گئے۔ مجہول شخص نے اپنے انگرکھے کی جیب سے ایک ریشمی رومال نکالا اور اتنی محبت سے ہارمونیم سے کوئی غیر مرئی گرد صاف کرنے لگا جیسے کوئی ماں اپنے بچے کے رخسار پونچھ رہی ہو۔

"بہت کم ایسا ہوتا ہے۔" گوہر جان نے میرے قریب پہنچتے ہوئے یوں مخاطب کیا گویا وہ بہت دیر سے مجھ سے مصروف گفتگو تھی۔ درمیان کسی وجہ سے ذرا دیر کو سلسلہ کلام ٹوٹ گیا تھا اور اب وہ اسے وہیں سے جوڑ رہی ہے۔ "کہ کوئی شخص رقص اور موسیقی دونوں میں بیک وقت کمال حاصل کرے اور استاد کے درجے کو پہنچے۔ حالانکہ دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے مگر رقاص کو صرف سروں کا علم ہوتا ہے وہ خود گا نہیں سکتا اور گانے کے استاد نرت بھاؤ سمجھتے ہیں مگر خود نرت بھاؤ بتا نہیں سکتے۔ لیکن جو اپنے استاد حبیب خان انبالے والے ہیں۔ انہوں نے دونوں فنون میں کمال حاصل کیا ہے۔"

"تو پھر میں کیا کروں؟" میں نے اکھڑے اکھڑے لہجے میں کہا۔

"تم اپنی خوش نصیبی پر فخر کرو کہ تمہیں ان کی شاگردی میں دے رہی ہوں۔" گوہر جان نے نہایت اطمینان سے کہا اور میرا ہاتھ تھام کر اٹھاتے ہوئے بولی "اگر تم چند سال

"لا حول ولا ۔۔۔ لا حول ولا ۔۔۔" استاد محترم بڑبڑائے اور رومال سے منہ صاف کرنے لگے تاہم ان کے صبر و سکون میں کوئی فرق نہ آیا۔ منہ صاف کرتے ہی دوبارہ ہارمونیم پر سر ہلانے لگے گویا کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ میرا ارادہ ہارمونیم کو بھی لات مارنے کا تھا۔ لیکن وہ فاصلہ ذرا زیادہ نظر آ رہا تھا اور اندیشہ تھا کہ میں اپنا پاؤں نہ تڑوا بیٹھوں' اس لئے اپنے آپ پر ضبط کر کے گوہر جان کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر زلزلے کے سے آثار نمودار ہو رہے تھے۔

"بدتمیز لڑکی!" اس کے حلق سے جو آواز نکلی اسے سن کر بھری عمر کی عورت شاید ڈر جاتی بشرطیکہ اس نے مجھ جتنی مصیبتیں نہ جھیلی ہوتیں۔ وہ نہ جانے کس ارادے سے مٹھیاں بھینچ کر میری طرف بڑھی لیکن اس کے مجھ تک پہنچنے سے پہلے وہ مجہول شخص' استاد حبیب خان ناقابل یقین پھرتی سے گویا رقص کا کوئی توڑا بناتے ہوئے اٹھا اور اس نے انگرکھے کی ریشمی آستین میں ملفوف لمبا سا استخوانی بازو ہم دونوں کے درمیان حائل کر دیا۔

"دیکھو گوہر جان ۔۔۔ دیکھو" وہ گنگنانے کے سے انداز میں بولا۔ "اچھی نسل کی گھوڑی اور مستقبل کی اعلیٰ بازاری عورت شروع شروع میں بڑی منہ زور ہوتی ہے۔ تمہیں یاد نہیں مطرب نے کیسا طوفان مچایا تھا؟ ہارمونیم کے ٹکڑے کر دیئے تھے۔ پردے پھاڑ دیئے تھے اور حتیٰ کے مسہری بھی نہ جانے کس طرح توڑ دی تھی۔ بعد میں کیسی سانچے میں ڈھلی تھی؟ جیسے بوتل میں پری ۔۔۔ اور ثریا کا معاملہ یاد ہے؟ وہ شیر کی بچی تو چار چار کڑیل جوانوں کے قابو میں نہیں آتی تھی اور نعیمہ خاتون اور تمنائے النساء تو کبھی مہینوں میں آئی تھیں اور اپنی مرضی سے آئی تھیں مگر تھوڑے وقت انہوں نے بھی اڑی کی تھی کہ باقی سب کچھ رسان سے سیکھ لیا تھا گوہر جان! ہم تو سمجھے تھے اب تمہاری بھداری کی عمر شروع ہو گئی ہے مگر لگتا ہے ابھی خون ٹھنڈا نہیں پڑا۔"

گوہر جان نے اپنی جگہ رک کر ایک طویل سانس لی اور جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اس کے تاثرات یک لخت معمول پر آ گئے۔ "خون ٹھنڈا ہی تو پڑ گیا ہے۔ استاد محترم! جبھی تو زینب سے سودا کر لیا تھا۔ اور کبھی تمہیں یہ لڑکی یہاں اس عالم میں نظر آ رہی ہے کہ کسی نے اسے اونچی آواز میں پکارا تک نہیں حالانکہ یہ ایک مرتبہ بھاگنے کی کوشش بھی کر چکی

رہی تھی۔ "میں دلیل دینے اور دلیل سننے کی قائل ہوں۔ تم مجھ سے ڈھنگ سے بات کرو۔ شاید تم مجھے قائل کر ہی لو۔" "تو تم چاہتی کیا ہو؟"

"میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"کہاں جاؤ گی؟" اس نے ملامت سے پوچھا۔

"کہیں بھی چلی جاؤں گی۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ تو کوئی جواب نہ ہوا اور خاص کر ایک جوان اور بلا کی حسین عورت کے ہونٹوں پر تو یہ الفاظ آنے ہی نہیں چاہئیں۔ یہ ارادہ اسے کہیں کا کہیں پہنچا دیتا ہے۔"

اس نے اپنے فراک کی دوہری جیب سے اپنا سگریٹ ہولڈر اور سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ ہولڈر میں لگا کر سلگائی۔ میں پلکیں جھپکائے بغیر اسے گھور رہی تھی۔ اس نے طویل کش لے کر دھواں میری طرف چھوڑا اور ایک لمحے کے توقف سے بولی۔

"شاید تمہیں خوش فہمی ہے کہ جب تم یہاں سے نکلو گی تو دنیا بھر کے شریف النفس انسان تمہارے استقبال کے لئے سڑک پر دونوں طرف قطاریں باندھے کھڑے ہوں گے۔ وہ تم پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کریں گے۔ تمہارے سر پر چھتریوں کا سایہ کریں گے۔ تمہیں چم چم کرتی کار میں بٹھائیں گے اور ایک عالی شان حویلی میں لے جا کر تنہا چھوڑ دیں گے اور صبح شام تم سے پوچھتے رہا کریں گے کہ ملکہ عالیہ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔"

وہ پاؤں پٹخ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور یک لخت اس کی آواز کچھ بلند ہو گئی۔ "بولو کیا تمہیں یہ خوش فہمی ہے؟"

"نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ باہر جاتے ہی چاروں طرف سے بھوکے درندے مجھ پر ٹوٹ پڑیں گے اور مجھے ہڑپ کر جائیں گے۔ آخر یہ ایک شہر ہے کوئی جنگل تو نہیں۔"

"یہی تو تمہیں معلوم نہیں بھولی رانی!" اس نے بیڈ کے گرد ٹہلتے ہوئے کہا۔ "جنگل تو مفت میں بدنام ہے۔ جنگل کے سارے قانون تو ہم نے اپنا لئے ہیں اور وہ بھی دس قدم آگے بڑھ کر۔ کیا تم ابھی تک قائل نہیں ہوئیں کہ انسانوں کی بستیوں میں طاقت کا قانون چلتا ہے۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ باقی سب ڈھکوسلے ہیں کمزوروں کو تسلی و تشفی دینے اور الو بنانے کی باتیں ہیں اس زمانے میں بچنے کے لئے انسان کے پاس کوئی نہ کوئی طاقت ہونا ضروری ہے۔ کمزور انسان تو راہ میں پڑے روڑے کی طرح ہیں۔ کوئی ٹھوکر مارتا ہے۔ ادھر کو لڑھکا دیتا ہے اور کوئی ٹھوکر مارتا ہے۔ تو واپس وہیں پہنچا دیتا ہے۔" بیڈ کے سرہانے پہنچ کر وہ اچانک رکی اور الٹے قدموں واپس میرے سامنے آکر بولی۔

"تمہارے پاس بھی ایک طاقت ہے معلوم... ہے کونسی؟"

میں خاموش بیٹھی اسے گھورتی رہی۔

"تمہارا یہ حسن۔" اس نے میرے چہرے کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ اور دوبارہ چہل قدمی شروع کرتے ہوئے بولی۔

"اس کے استعمال کا ہنر سیکھ لو۔ فائدے میں رہو گی۔"

"میں کہہ چکی ہوں۔ میں تم جیسی عورت نہیں بنوں گی ___ نہیں بنوں گی۔" میں نے بہ آواز بلند کہا۔ "تمہاری ان ڈرامائی تقریروں سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ میں جان دے دوں گی ___ لیکن تمہاری ناپاک خواہشات کی بھینٹ نہیں چڑھوں گی۔"

"چچ چچ چچ ___" اس نے تاسفانہ انداز میں کہا اور قریب آکر بزرگانہ انداز میں میرا رخسار تھپتھپایا۔ "ڈرامائی تقریر تو تم کر رہی ہو چندا۔ جان ہی دینی تھی تو نواب کے محل میں دے دی ہوتی۔ جہاں تم ان کی کنیز کی حیثیت سے دن گزارتی رہیں۔ نواب نے مجھے بتایا تھا کہ ایک مرتبہ تم نے اسے قتل کرنے کی ناکام کوشش بھی کی تھی۔ وہی چھری تم نے اپنے پہلو میں کیوں نہیں اتار لی تھی۔ میری جان؟ اس طرح تم بندی خانے میں ڈالے جانے سے بھی بچ جاتیں۔ معلوم نہیں بندی خانے میں تم پر کیا کچھ بیتی ہو گی؟" اس نے ایک گہرا کش لیا اور دھواں ناک سے نکالتے ہوئے کہا۔

"یہی ثابت ہوا کہ جان بہت پیاری ہوتی ہے اور پھر اب تو بات صرف تمہاری ہی جان کی نہیں مسئلہ اس ننھی سی جان کا بھی ہے۔" اس نے تمہاری طرف اشارہ کیا۔

اس کی باتیں میرے دل کو کاٹ رہی تھیں اور میں ان کے سحر میں گرفتار ہونا نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے چلا کر بولی۔ "تم زبردستی کر کے دیکھو۔ میں تمہیں جان دے کر دکھا دوں گی۔ اب مجھ میں اپنے وجود کی تذلیل برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں رہا ___ سکت نہیں رہی۔"

"تذلیل؟" اس نے میرے سامنے آرام دہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے حیرت سے دہرایا۔ "تذلیل ہی سے تو میں تمہیں بچانا چاہتی ہوں۔ دیکھو ___ تمہارے ذہن میں اگر یہ خیال ہے کہ کوئی ٹھکانہ' کوئی حیلہ نہ ہونے کے باوجود تم یہاں سے نکل کر تذلیل سے محفوظ رہو گی تو یہ بھی تمہاری خوش فہمی ہے۔ تم شاید سوچ رہی ہو کہ جا کر کسی خوشحال گھرانے میں نوکری کر لو گی اور بزعم خود' عزت کی زندگی گزارو گی تو یقین کرو کہ اپنے مطلوبہ گھر تک پہنچنے سے پہلے ہی کئی گدھ تمہاری عزت پر ٹوٹ پڑیں گے۔ یہ بستی ہے' یہاں کئی ایسے واقعات ہو چکے ہیں کہ کوئی لاوارث لڑکی سرِ راہ سڑک سے غائب ہوئی اور ایک مدت بعد بے ہوش و نیم مردہ کسی اندھیرے کوٹھے میں پڑی پائی گئی۔ تم اگر اس تجربے کا حصہ بننا چاہتی ہو کہ کسی سیٹھ کا کارندہ تمہیں اٹھا کر گاڑی میں ڈالے اور حویلی کے عشرت کدے پہ پہنچا دے یا بدمعاشوں کی کوئی ٹولی تم پر جھپٹے اور بندر بانٹ میں مصروف ہو جائے تو پھر شوق سے جاؤ۔ تمہارا حسن اور خاندانی وقار تمہارے لئے اتنا بڑا مسئلہ بن جائے گا۔

کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ بالفرض کالف نے تمہیں بخش بھی دیا تو تمہاری صورت تو گورے صاحبوں کی کھوپڑی بھی بھک سے اڑانے کے لئے کافی ہے۔ اس طرح باہر جا کر تمہیں جو حالات پیش آئیں گے ان سے نمٹنے کا صحیح مفہوم تمہاری سمجھ میں آ جائے گا۔ فرض کرو تم کسی خوشحال گھرانے تک پہنچ بھی گئیں تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ کسی روز بیگم کی غیر موجودگی میں صاحب کی نیت تم پر خراب نہیں ہوگی؟

چلو ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ تم جس گھرانے میں پہنچو گی وہاں کے سب افراد نہایت نیک، شریف النفس اور خدا ترس ہوں گے لیکن تمہیں معلوم ہے کہ اس قسم کے گھروں میں چوری چکاری ہو جائے تو کیا ہوتا ہے؟ انگریز نے ہندوستان کی پولیس کو تفتیش کا ایک سنہرا اصول بتا رکھا ہے جس پر وہ آنکھیں بند کر کے عمل پیرا ہیں اور وہ اصول یہ ہے کہ اگر کسی خوشحال گھرانے میں چوری ہو جائے تو سب سے پہلے اس کے نوکروں کو پکڑ کے الٹا لٹکا دو، ان کی چمڑی ادھیڑ دو۔

اب تم خود ہی سوچو کہ اگر ایسے ہی کسی اتفاق کے تحت تم جیسی نعمت غیر مترقبہ بھوکے اور ترسے ہوئے ہندوستانی پولیس والوں کے ہتھے چڑھ گئی تو اس کا کیا حشر ہوگا؟ ذرا سوچو۔۔۔ چشم تصور سے کام لینے کی کوشش کرو تاکہ تمثیل کے صحیح معانی تمہاری سمجھ میں آ سکیں۔" اس نے خاموش ہو کر تیزی سے سگریٹ کے دو تین کش لئے اور امید بھری نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "بازاری کہلانا ایک تمثیل سہی لیکن اس کے بعد عورت بے شمار دلدلوں سے بچ جاتی ہے۔"

"تم جتنا مرضی بھونکو گوہر جان!" میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مگر یہ میرا آخری فیصلہ ہے کہ میں ہر روز ایک نئے شیطان کی ہوس کا نشانہ بننے کے لئے یہاں نہیں رہوں گی۔"

"اوہ۔۔۔" دفعتاً وہ کش لیتے ہوئے رک گئی۔ "اب میں سمجھی۔۔۔ دراصل تمہارے ذہن میں بازار حسن کا اور خصوصاً میرے بالا خانے کا بڑا غلط تصور ہے۔ گوہر جان کا بالا خانہ کسی سستی قسم کی جسم فروش جھگی یا اوطی کی اندھیر کٹیا نہیں۔ جہاں ہر ایرا غیرا اور سڑا بسا آدمی جیب میں چند سکے ڈال کر چلا آئے اور حیوانوں کی طرح اپنا مطلب نکال کر چلا جائے۔

یہاں ایک نہیں کئی بالا خانے چلتے ہیں۔ ایک کو تو میری بیٹی ہی چلاتی ہے۔ ان پر صرف مجرا ہی ہوتا ہے۔ بازار حسن کے بھی کچھ قوانین اصول اور اخلاقی ضابطے ہوتے ہیں جن کا تفصیلی علم تمہیں رفتہ رفتہ ہو جائے گا۔ بہرحال جو تم سمجھ رہی ہو وہ ہرگز نہیں ہوگا۔ البتہ ایسا ضرور ہوتا ہے کہ تم جیسے ہیرے پر کسی امیر زادے کا دل آ جائے وہ اسے ملازم رکھ لیتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اسے گھر لے جاتا ہے اور اس سے جیسا تو برتی

کرواتا ہے۔ مقصد یہ کہ ایسی عورت اپنے کوٹھے پر ہی رہتی ہے۔ بظاہر مجرا نہ کرنے کا مظاہرہ کرتی ہے۔ لیکن درحقیقت مجرا کرتی رہتی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ جب نوکر وہ امیر زادہ آتا ہے تو وہ اس کی خدمت میں حاضر رہتی ہے۔۔۔ جب تک وہ چاہے۔

پھر میں تمہیں اس پابندی سے بھی آزاد رکھنے کا وعدہ کرتی ہوں۔ یعنی تمہارے لئے تن کی ملازمہ بننا یا نہ بننا تمہاری اپنی مرضی پر منحصر ہوگا۔ میں تمہیں صرف مجرے کا پابند کروں گی اور اس کے عوض دنیا کی ہر آسائش مہیا کروں گی۔ اب تمہیں مان لینا چاہئے کہ میں نہایت مہربان اور نرم دل عورت ہوں ورنہ تمہارے جیسے حالات میں جو لڑکیاں یہاں پہنچتی ہیں اور تمہارے جیسے اڑیل پن کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ انہیں نائیکہ چکی پیسانے میں لگا دیا کرتی ہے اور ایسے کارگر نسخے میرے پاس ہر نائیکہ سے زیادہ موجود ہیں۔ لیکن میں برتنے کے قائل نہیں، انہیں استعمال کرنا نہیں چاہتی۔ خصوصاً تم پر۔۔۔"

وہ کرسی پر نیم دراز ہو گئی جیسے بولتے بولتے تھک گئی ہو۔ پھر بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے اپنے کھلے بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔ اس کی سگریٹ ختم ہو رہی تھی۔ اس نے ہولڈر میں دوسری سگریٹ پھنسا کر سلگائی اور دو تین کش لینے کے بعد جواب طلب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

میں اب بھی بت بنی بیٹھی تھی۔ اس کی باتوں نے میرے دل کی سنگلاخ زمین نرم کر دی تھی لیکن میں اب بھی نہ صرف ظاہری طور پر بلکہ باطنی طور پر بھی مزاحمت کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ اپنے احساس بے بسی کو دبا رہی تھی۔ میں اپنی رضامندی سے کسی بھی تاریک راستے پر قدم رکھنا نہیں چاہتی تھی۔ بے شک میں خاندانی بہادر تھی۔ میرے دامن میں تاریکیاں ہی تھیں ان تاریکیوں کو سمیٹنے میں میری اپنی رضا تو کبھی بھی شامل نہیں رہی تھی۔

"میرا جواب کبھی ہاں نہیں ہوگا گوہر جان! تم بلاوجہ وقت ضائع کر رہی ہو۔" میں نے بے لچک لہجے میں کہا۔ "البتہ ظلم و تشدد کے ہتھکنڈے استعمال کرنا چاہو تو کر کے دیکھ لو۔ شاید کسی مقام پر میری قوت برداشت جواب دے جائے۔"

گوہر جان کا چہرہ ایک لمحے کے لئے سپاٹ ہو کر رہ گیا جیسے طاق پر رکھا چراغ بجھ گیا ہو اور پوری دیوار ہی تاریکی کا حصہ نظر آنے لگی ہو۔ تاہم اس کے طرز عمل میں کوئی تبدیلی نہ تھی۔ وہ اسی صبر و سکون سے تیز تیز سگریٹ کے کش لیتی رہی البتہ اب اس کی نظریں میرے چہرے کے بجائے کمرے کی ایک دیوار پر مرکوز ہو گئیں۔ سگریٹ ختم کر کے اس نے ٹوٹا ہولڈر سے نکال کر تپائی سے عرق کے مسلا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تمہارا انکار اقرار میں بدل جائے گا میری جان!" وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائی۔ "وہ بہت جلد۔" اس نے جاتے ہوئے میرا گال تھپتھپایا۔ اور

اپنا فراک سنبھالتی رخصت ہو گئی۔

ہر بار وہ ایک نیا شوشا چھوڑ کر میرے اعصاب میں ابال سی پیدا کر کے چند دن کے لیے غائب ہو جاتی تھی۔ صورت بھی نہیں دکھاتی تھی۔ اس بار بھی وہ تین دن غائب رہی۔ چوتھے دن وہ آئی تو اس کے ساتھ گٹھے ہوئے جسم کا ایک پست قد ملازم بھی تھا۔ جسے میں نے ایک مرتبہ پہلے بھی دیکھ رکھا تھا۔ گوہر جان آج خوب بنی ٹھنی تھی اور اس کی حرکات و سکنات سے ایک دبا دبا سا جوش جھلک رہا تھا جیسے آج وہ کسی خاص مہم پر نکلی ہو۔

"آؤ آج تمہیں ایک تماشا دکھاؤں۔" وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اٹھاتے ہوئے بولی۔ میں اس وقت تمہیں سیب کی چند ننھی ننھی قاشیں کھلا کر بیٹھی ہی تھی۔ تم تکلو تکیے کو گھوڑا بنائے اس پر چڑھے بیٹھے تھے اور خوب اچھل کود کر رہے تھے۔

"کیسا تماشا؟" میں نے مشکوک سی نظروں سے اسے گھورا۔

"ارے تو سہی چڑیا! ایسی گھبرانے والی کیا بات ہے۔" اس نے بچوں کی طرح مجھے پچکارا ـــــ "یہیں ذرا نیچے تک چل رہے ہیں۔ تمہیں کچھ سیر کرا دوں۔ شاید تمہیں میری راجدھانی پسند آجائے اور تم بھی اس کی ایک شہزادی بننا پسند کرو۔" اس نے کھینچ کر مجھے اٹھا لیا۔

"یہ بھی تو ممکن ہے کہ مجھے تمہاری راجدھانی دیکھ کر تم سے اور بھی زیادہ نفرت ہو جائے۔ میرے ارادے اور بھی زیادہ مضبوط ہو جائیں۔" میں نے جارحانہ لہجے میں کہا۔

میں اس کے عین مقابل کھڑی تھی۔ پہلی مرتبہ میں نے محسوس کیا کہ وہ قد کاٹھ میں میرے ہی برابر تھی بلکہ اس کے کندھے کچھ زیادہ چوڑے تھے اور کسی حد تک مردانہ سی ساخت کے تھے مگر نہایت غور سے دیکھنے پر ہی اس امر کا احساس ہوتا تھا ورنہ جسم سے دھیرے دھیرے پھوٹتی فربہی اور ڈھلتی عمر کے باوجود اس عورت کا جسم سر سے پاؤں تک متناسب اور قیامت خیز تھا۔ ارباب نے ایک مرتبہ مجھے بتایا تھا کہ ہمیشہ ریاض جاری رکھنے والی رقاصاؤں کے جسم سدا بہار ہوتے ہیں۔

"تم مجھ سے نفرت کرتی ہو عزیزہ خانم!" وہ ایک انگلی سے میری ٹھوڑی چھوتے ہوئے میری آنکھوں میں جھانک کر مسکرائی۔ اس مسکراہٹ کو میں کوئی معنی نہ دے سکی۔ "ایسا مت کرو عزیزہ خانم! گوہر جان سے آج تک کسی نے بھی نفرت نہیں کی۔" اس نے سرگوشی سی کی اور میرا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی طرف بڑھی۔

ملازم نے تمہیں گود میں اٹھانے کی کوشش کی تو تم نے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس کے ہاتھ جھٹک دیے اور پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ تمہیں منہ پھلائے غصے سے ملازم کو گھورتے دیکھ کر گوہر جان بے اختیار ہنس دی اور میرا ہاتھ چھوڑ کر تمہاری طرف بڑھی۔

"لو بھئی ..... اپنے شہزادے کو تو ہم خود اٹھائیں گے۔" اس نے بازو پھیلا کر

نہایت محبت سے تمہارے پھولے پھولے سرخ و سپید رخسار پر بوسہ دیا اور یوں تمہیں گود میں اٹھا لیا گویا حسین اور نازک پھولوں کے ڈھیر کو سمیٹا ہو۔ اس کی گود میں جانے تم نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ ذرا سا کسمسائے پھر مجھے پیچھے آتے دیکھ کر مطمئن ہو گئے۔

کمروں اور برآمدوں سے گزرتے جب ہم گولائی میں بنی ہوئی بالکونی میں پہنچے تو میں نے دیکھا کہ اس منزل کے تقریباً تمام کمروں کے دروازے مقفل تھے۔ گوہر جان کھٹ کھٹ کرتی مجھ سے چند قدم آگے چلی جا رہی تھی۔

دفعتاً مجھے اپنے عقب سے ملازم کی آواز سنائی دی۔ "بی بی جی! آپ کا رومال گر گیا ہے۔" میں نے رک کر پلٹ کر دیکھا۔ ایک نفیس سا گلابی تہہ شدہ رومال فرش پر پڑا تھا مگر یہ میرا نہیں تھا۔ میرے پاس کوئی بھی رومال نہیں تھا۔

"یہ میرا نہیں ہے۔" میں نے ملازم کو بتایا اور چلنے کے لیے مڑی تو دیکھا کہ گوہر جان کئی قدم آگے جا چکی تھی۔ میں نے تیز چلنے کے ارادے سے قدم بڑھایا ہی تھا کہ اچانک میرے بازو نہایت مشاقی انداز میں خودبخود میری پشت کی طرف مڑ گئے اور پھر جیسے وہ کسی فولادی شکنجے میں جکڑے گئے۔ میں لڑکھڑا کر گرنے لگی مگر اسی شکنجے نے گویا مجھے کھڑا رکھا۔ ایک لمحے کے لیے تو میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا پھر احساس ہوا کہ دراصل اس ملازم نے عقب سے میرے بازو موڑ کر اس طرح انہیں اپنے سخت ہاتھوں کے شکنجے میں جکڑ لیا تھا کہ میں اپنی جگہ بے بس ہو کر رہ گئی تھی۔

"یہ کیا بے ہودگی ..." میں چلائی لیکن جملہ میرے ہونٹوں پر ادھورا رہ گیا۔ میری نظر گوہر جان پر پڑی تھی جو چلتے چلتے رک گئی تھی۔ میری طرف رخ کر کے اس نے اچانک تمہیں دونوں بازوؤں سے پکڑا اور جنگلے پر جھک کر تمہیں جھولے دینے لگی۔ تمہارا ننھا سا وجود اپنا بہت بڑے کنوئیں سے مشابہ صحن میں لٹکا ہوا تھا۔ تین منزل نیچے رنگ برنگی ٹائلوں والا صحن کا فرش چمک رہا تھا۔ صحن کے وسط میں مجھے وہی شخص جو بادشاہ بھی کھڑا نظر آیا جو ایک بار میری بے بسی پر دل کھول کر ہنس چکا تھا۔

تمہیں خوف زدہ سے انداز میں ننھی ننھی سی لاتیں ہوا میں چلاتے دیکھ کر اور تمہارے رونے کی آواز سن کر جیسے میرے دل کی دھڑکنیں رکنے لگیں۔ "یہ کیا کر رہی ہو گوہر جان؟" میں وحشت زدہ سی آواز میں چلائی۔

"اسے نیچے پھینک رہی ہوں۔" اس کی بے رحم آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ اس کی آواز میں کسی بھی جذبے کا شعور تک نہیں تھا۔ صرف موت کی سی یخ بستگی تھی۔ "تین دن پہلے میں نے تمہیں جو پیشکش کی تھی اگر وہ اب بھی تم نے قبول نہیں کی تو میں حضور کو نیچے پھینک دوں گی۔"

تمہارے رونے کی آواز کچھ اور بلند ہو گئی اور اس میں وحشت کا عنصر کچھ اور بڑھ

گیا۔ میں اپنی جگہ سن ہو کر رہ گئی تھی۔ مجھے خاموش دیکھ کر گوہر جان نے نہایت خطرناک انداز میں تمہاری ایک ٹانگ پر ہاتھ ڈالا اور بازو چھوڑ دیئے۔ اب تمہاری صرف ایک ٹانگ اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی تھی اور تمہارا جسم بغیر کسی توازن کے خلاء میں جھول رہا تھا الٹے لٹکنے کے بعد تمہارے حلق سے صرف گھگھیائی ہوئی سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ وحشت کے عالم میں تم نے ننھے ننھے ہاتھ بڑھا کر جنگلا پکڑنے کی بھی کوشش کی تھی۔ لیکن گوہر جان نے تمہیں جنگلے سے دور رکھا تھا۔ کسی بھی لمحے غیر ارادی طور پر بھی اس کی گرفت تمہاری ٹانگ سے ہٹ سکتی تھی۔ تمہارے متحرک وزن سے اس کا ہاتھ تھک کر جواب دے سکتا تھا اور تین منزل نیچے ٹائلوں کا فرش۔

تم اسے نیچے پھینکو اور میں اسے ہوا ہی میں لوتھڑے کی طرح خنجر میں پرو کر دکھاؤں گا۔ پھر تو تمہیں اپنے فن کا استاد مانو گی؟" نیچے سے جن بادشاہ کی آواز آئی اور کنویں جیسے صحن میں اس کی بازگشت گونج کر رہ گئی۔

میں نے ایک نظر نیچے دیکھا وہ پر اشتیاق انداز میں سر اٹھائے اوپر ہی کو دیکھ رہا تھا اس مفلوک درندے کی طرح جس کے پنجرے میں اس کی خوراک پھینکی جانے والی ہو۔ ہاتھ میں چمکتا سا خنجر اس نے عموداً پکڑ رکھا تھا۔

"میں صرف تین تک گنوں گی۔" گوہر جان کی آواز آئی "ایک۔۔"

میرے سینے میں دھڑکنیں معدوم ہو گئی تھیں۔ دل کی جگہ جیسے ایک تاریک خلاء بن گیا تھا۔ اپنی جان پر تو میں ہر مطلب سہہ سکتی تھی لیکن اپنے جگر گوشے کو اپنی ہی بے وفائی کی بدولت موت کی آغوش میں جاتے دیکھنے کا حوصلہ کوئی ماں کہاں سے لائے؟ اور پھر میرے لئے تو صرف ماں ہی کے دل جیسے ارادوں کو عبور کرنے کا مسئلہ نہیں تھا۔ میرے ذہن میں جو ایک دھندلا سا خاکہ پنپنے لگا تھا دشمن کی مہلت کا جو مبہم سا راستہ ابھرنے لگا تھا اس کے ملنے بھی تو امید کی موہوم سی کرن تم ہی تھے۔ ابھی تو مجھے بہت کچھ سوچنا تھا۔ بہت سے فیصلے کرنے تھے۔

"امید کی اس موہوم سی کرن سے محرومی میں کیونکر برداشت کر سکتی تھی۔ اس کرن کے علاوہ زندگی میں اب رہ ہی کیا گیا تھا۔ اگر اس سے محروم ہونا تھا تو پھر خود بھی زندہ رہنے کی کیا ضرورت تھی اور اگر اس کے ساتھ خود کو بھی موت کے سپرد کر دیا تو قاتلوں کے ذمے کتنے ہی قرضے واجب الادا رہ جائیں گے۔ یہ قرضے یونہی واجب الادا چھوڑ جاؤں گی

حور خانم؟"

"دو۔۔۔" گوہر جان کی آواز گویا وادی مرگ سے آئی۔ اس بار اس کی آواز سن کر مجھے اس کی دھمکی میں شبہ نہ رہا کہ تین کہنے کے بعد وہ بچے کو ہاتھ سے کھول دے گی اور میری عمر بھر کی پونجی نیچے جا گرے گی۔ خون اور گوشت کے ایک ننھے سے بے وقت ڈھیر میں بدل جائے گی۔

پھیلا ہو جائے گی۔

پھر تمہاری آواز میرے پردہ سماعت سے کسی زخمی حصے سے ٹکرائی "ام۔۔ ؤ۔ ی۔۔" میرے کانوں سے جیسے بجلی جل کر کے لہو بہہ نکلا۔ اس لمحے تمہارا چہرہ میری طرف گھوم گیا اور تم نے بے بسی سے اپنا ننھا سا ہاتھ میری طرف پھیلایا۔ میں اس وقت فاصلے کے باوجود تمہارا ایک ایک نقش صاف دیکھ سکتی تھی۔ تمہارے جسم کا سارا خون شاید چہرے پر سمٹ آیا تھا۔ آنکھیں بھیگی بھیگی سی لگ رہی تھیں اور آنسو اب پیشانی کی طرف چل رہے تھے۔ ایک لمحے کے لئے تمہارا بازو میری طرف پھیلا رہا۔ تمہاری بھیگی آنکھوں میں ایک مجروح سوال تھا۔ امی! آپ میرا ہاتھ کیوں نہیں پکڑ رہیں؟

"نہ۔۔۔ نہیں۔۔۔"

"نہیں۔۔۔ گوہر جان کا لفظ مکمل ہونے سے پہلے میں اس پرندے کی طرح چیخ اٹھی جس کی شہ رگ کند چھری سے کٹی جا رہی ہو۔ "میرے بچے کو مت پھینکنا۔۔۔ میں تمہارا کہا مانوں گی گوہر جان۔۔۔ ؟ مانوں گی۔۔۔ مانوں گی۔۔۔" میری آواز چیخ میں ڈوب گئی۔ اپنا وجود مجھے دھیرے دھیرے نرم ریت میں دھنستا محسوس ہو رہا تھا۔ آنکھیں نہ جانے کہاں بند ہوئی جا رہی تھیں۔

ادھ کھلی آنکھوں سے میں نے اتنا ضرور دیکھ لیا کہ گوہر جان نے تمہیں جنگلے سے اوپر کھینچ لیا تھا اور فرش پر لاکھڑا کیا تھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ تم دونوں بازو اوپر اٹھائے روتے ہوئے میری طرف آ رہے تھے۔ پھر میرا جسم ڈھیلا پڑ گیا اور آنکھوں کے سامنے سے سب کچھ غائب ہو گیا۔ صرف تاریکی رہ گئی۔

میری آنکھ کھلی تو چند لمحے تک کچھ بھی یاد نہ آیا کہ میں کیونکر بے ہوش ہوئی تھی۔۔۔ اور آیا بے ہوش ہی ہوئی تھی یا مجھے نیند آ گئی ہوئی تھی؟ سب سے پہلے میری نظر تم پر پڑی۔ تم میرے پہلو میں لیٹے بے خبر سو رہے تھے۔ پلنگ کے قریب ہی آرام دہ کرسی پر گوہر جان بیٹھی تھی اور اس کی صورت دیکھتے ہی مجھے سب کچھ یاد آ گیا میں نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ دل ہی دل میں مجھے اس عورت کی مکاری کا اعتراف تھا۔ اس نے خوب سوچ سمجھ کر میری دکھتی رگ پکڑی تھی۔

مجھ پر جسمانی ظلم و تشدد کی انتہا کر کے بھی شاید وہ اپنا مقصد نہ حاصل کر پاتی۔ دوسرے کسی بھی قسم کے ہتھکنڈے استعمال کر کے شاید وہ مجھے اتنا کمزور نہ کر پاتی جتنا میں اس وقت خود کو محسوس کر رہی تھی۔

"ناراض ہو مجھ سے؟" گوہر جان کی آواز آئی لہجے میں حد درجہ ملامت تھی۔ تیر نگاہوں اور مہمانوں کی سی ملامت۔

"ناراض ہوں یا راضی۔۔۔ تمہارے لئے اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" میں نے

انجانی لہجے میں کہا۔

"تمہیں ابھی مزید آرام کی ضرورت ہے۔" اس نے گہری سانس لے کر کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اب میں چلتی ہوں۔ تمہارے سرہانے شیشی میں دوا رکھی ہے۔ ہو سکے تو اس کے چند قطرے پانی میں ملا کر رات کو پی لینا۔"

"بات سنو گوہر جان!" دفعتاً میں نے اسے پکارا۔ وہ جاتے جاتے رکی اور بے حد اشتیاق سے میری طرف مڑی۔ "جب بقول تمہارے تم کئی بالا خانوں کی مالک ہو اور ہر بالا خانے پر ناچنے والی کئی کئی لڑکیوں کی آمدنی تمہیں ہی آتی ہے تو تم مجھے بھی نچانے پر اتنی مصر کیوں ہو؟ مجھ اکیلی کے نہ ہونے سے تمہاری دنیا میں کون سی کمی واقع ہو جائے گی؟"

وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ "کبھی تم نے کسی جوہری سے پوچھا کہ جب اس کے پاس پہلے ہی سینکڑوں ہیرے موتی موجود ہوتے ہیں تو وہ مزید ہیروں کی خرید و فروخت میں کیوں جان کھپاتا رہتا ہے؟ کوئی اور اچھا ہیرا دیکھ کر کیوں اس کی راتوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔ کبھی تم نے کسی کارخانے دار سے پوچھا کہ جب اسے دنیا کی ہر آسائش میسر ہوتی ہے تو وہ کیوں مزید کارخانے لگانے کی بھاگ دوڑ میں ہلکان رہتا ہے؟"

میں کوئی جواب نہ دے سکی۔ شاید میری حسیات صحیح طور پر بیدار نہیں ہوئی تھیں۔ تاہم میں نے گوہر سے ایک اور سوال کر دیا۔ "فرض کرو میں اپنے وعدے سے پھر جاؤں؟" سوال کرتے ہی مجھے خود بھی اس کے بچکانہ پن کا احساس ہوا مگر اب تو الفاظ منہ سے نکل ہی چکے تھے۔

گوہر جان کی مسکراہٹ کچھ پھیل گئی۔ "تم بھی بچی ہو۔ تمہارا بچپن ابھی نہیں گیا ہے۔ اس مرتبہ تمہیں تک کھینچی کی نوبت بھی نہیں آئے گی۔" اس نے نہایت سرسری سے لہجے میں جواب دیا اور ساتھ ہی کہا۔ "میں وعدہ خلافوں کی بڑی مخالف ہوں۔ اور ان پر مجھے رحم نہیں آتا۔"

میں اندازہ لگانے کی کوشش کرتی رہی کہ اگر رحم دلی کا دعویٰ کرتے ہوئے اس عورت کا یہ عالم تھا تو جب بے رحمی پر اترتی ہوگی تو نہ جانے کیا قیامتیں ڈھاتی ہوگی۔ چند لمحے وہ پشت پر ہاتھ رکھے کھڑی میری آنکھوں میں جھانکتی رہی۔ پھر شکستہ سے انداز میں سر ہلا کر باہر کو چل دی۔ آج اس کی چال کچھ بدلی بدلی سی تھی۔ شہزادیوں کی سی تمکنت تھی چال میں ___ اور پہلی مرتبہ میں اسے سگریٹ کے بغیر دیکھ رہی تھی ورنہ تو ہمیشہ وہ سگریٹ کے کش لے رہی ہوتی تھی یا کم از کم ہولڈر اس کی انگلیوں میں ضرور دبا ہوتا تھا۔

چند دن بعد میری زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ مجھے استاد فتح یاب خان کی شاگردی میں دینے کی رسم بڑے اہتمام سے ادا کی گئی۔ پورے مکان میں چراغاں کیا گیا اس مرتبہ چونکہ گوہر جان کو میری طرف سے کسی مزاحمت کا خطرہ نہیں تھا اس لئے پیچھے ایک

سے بڑے ہال کو اس تقریب کے لئے آراستہ کیا گیا تھا اور عمارت میں رہنے والی تقریباً تمام لڑکیاں بنی سنوری وہاں جمع تھیں۔ جیسے شادی کی رسومات میں شرکت کے لئے آئی ہوں۔ ان میں سے بیشتر لڑکیاں گوہر جان ہی کے بالا خانوں پر ناچتی تھیں اور باقی اس عمارت میں اس کی کرایہ داروں کی حیثیت سے رہتی تھیں۔ ان کی نائیکائیں بھی ان کے ساتھ ہی رہتی تھیں جو عموماً ان کی مائیں ہی ہوتی تھیں۔ ان میں سے کوئی گھرانہ جب کچھ خوشحال ہو جاتا تھا تو کہیں الگ مکان لے لیتا تھا گویا یہ ایک طرح سے بازاری عورتوں کا ہوسٹل تھا۔

استاد فتح یاب کی ہدایت میں جب پہلی مرتبہ میں نے سا ___ رے ___ گا ___ ما ___ کی صدا بلند کی تو میرا جسم گویا جھرجھرا سا گیا۔ چاروں طرف سے مجھ پر پھولوں کی پتیاں برسنے لگیں۔ ایک گوشے میں بیٹھے سازندوں نے سازینہ شروع کر دیا اور لڑکیوں نے جو دوپٹے کمر میں باندھ کر ٹولیوں کی شکل میں رقص کرنا شروع کیا تو گویا راجہ اندر کے اکھاڑے کا سماں بندھ گیا۔ لڑکیوں نے استاد فتح یاب کو بھی کھینچ کر اٹھایا اور اس محفل میں ان کو رقص کرتے دیکھ کر میں دنگ رہ گئی۔ یوں تو اس کا جسم ہڈیوں ہی کا مجموعہ تھا مگر رقص کرتے دیکھ کر کہنا مشکل تھا کہ اس کے جسم میں ایک بھی ہڈی پائی جاتی ہے۔ اس کے اعضاء پارے کی طرح ہلکورے لیتے تھے۔

میں دم بخود بیٹھی یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ گوہر جان میرے پاس ہی بیٹھی تھی جو خوشی سے گلنار نظر آ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اس ماں کا سا تاثر تھا جو اپنے جوان بیٹے کے سر پر سہرا سجا کے اسے بیاہنے چلی ہو۔ لڑکیوں کی ٹولیاں رقص کرتے کرتے ہمارے گرد طواف بھی کرتی جا رہی تھیں۔ اس طرح اس روز درحقیقت صرف رسم ہی ادا کی گئی اور میرا سبق صرف "سا ___ رے ___ گا ___ ما" تک ہی محدود رہا۔ رات کو انواع و اقسام کے کھانوں سے بھرا ہوا دستر خوان سجا اور نہایت پر تکلف ضیافت رہی۔

رات کو جب مجھے تنہائی میسر آئی اور میں تمہیں لے کر سونے کے لئے لیٹی تو نہ جانے کیوں تمہیں سینے سے چمٹا کر بے تحاشا رو دی۔ آنسو یوں امڈے چلے آ رہے تھے جیسے برسوں سے خشک پڑے دریا کے سوتے ابل پڑے ہوں۔ مجھے روتے دیکھ کر تم نے بھی رونا شروع کر دیا اور تمہاری آنکھوں سے آنسوؤں کو دور رکھنے کے لئے میں نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ لئے۔

میری اصل تربیت دوسرے دن شروع ہوئی۔ استاد نے بتایا کہ مجھے اس کے لئے روزانہ کم از کم پانچ گھنٹے وقت دینا ہوگا۔ میرے پاس وقت کے سوا تھا ہی کیا؟ اور فی الحال میری نظر میں اس کی کوئی وقعت نہیں تھی۔

دن گزرتے گئے۔ ایک برس، ایک طویل برس گزر گیا۔ مجھے یہ بتانے میں عار نہیں

کہ رفتہ رفتہ میں نے اس ماحول سے سمجھوتہ کر لیا تھا ___ میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ میں نے سردیوں کی طویل اور سرد راتوں میں بابا اپنے بیڈ پر بیٹھے لیٹے چھت پر نظریں جمائے اتنی مرتبہ کتنی کتنی گھنٹے کے لئے صورت حال کے بارے میں سوچا تھا کہ میری کنپٹیاں دکھنے لگ جاتی تھیں۔ مگر مجھے کوئی متبادل راستہ نہ ملا۔ زمانے کی ٹھوکروں میں رہنے والا پتھر بننے کی اب مجھ میں واقعی سکت نہیں تھی اور پھر میرے ذہن میں جو ایک دھندلا دھندلا سا منصوبہ جڑیں پکڑ رہا تھا اس لئے ابھی میں نے بازاری عورت بننا قبول کرنا تھا۔ مجھے اب کچھ طاقت اور مضبوطی درکار تھی۔ محض دعاؤں اور دعاؤں پر تکیہ کر کے تو میں نے دیکھ لیا تھا۔

مستقبل کے لئے اب میں ایک نئے زاویے سے اپنے وجود کو تخلیق کرنے جا رہی تھی۔
مجھے یاد تھا کہ کتنی مرتبہ کس کس انداز میں مجھے اجاڑا گیا تھا اور مجھے یہ بھی یاد تھا کہ ارباب کے قتل کے بعد نواب شرافت علی کا سامنا ہونے پر میں نے سوچا تھا۔ "عجیب ہے نواب! یہ تمہارا وقت ہے۔ جو جی چاہے کرو اور جو جی چاہے کہو۔ اگر آج تم دوبارہ میری شخصیت پر کیچڑ نہ اچھالتے ہوتے تو شاید میں تمہیں معاف کر دیتی۔ رفتہ رفتہ وہ لاتیں فراموش کر دیتی جو تم نے مجھے ماری تھیں۔ میں اپنا اور تمہارا معاملہ خدا پر چھوڑ دیتی۔ لیکن اب میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی کیونکہ پہلے تم نے مجھے اس طرح برباد نہیں کیا تھا جس طرح اب اجاڑا ہے۔ تمہاری یہ مکروہ مسکراہٹ ایک گھاؤ کی طرح میرے دل پر نقش ہے۔ اور آج میں عہد کر رہی ہوں کہ اگر زندگی نے مجھے مہلت دی تو تم بھی دیکھو گے اور یہ دنیا بھی دیکھے گی کہ عورت اگر ایک بار انتقام لینے پر اتر آئے تو ایسی مثالیں چھوڑ جاتی ہے جنہیں صدیوں تک دہرایا جاتا ہے۔"

مجھے اپنا یہ عہد یاد تھا کیونکہ میرے ذہن میں اپنے بے گناہ باپ کی بے گور و کفن لاش کی یاد بھی نقش تھی۔ مجھے اپنے کنوارے خوابوں کی دنیا اجڑنے کا سوگ بھی یاد تھا۔ مجھے سرداروں کی زہریلے ناگوں کی اذیت بھی نہیں بھولی تھی۔ مجھے نواب کے بندی خانے کا وہ یخ بستہ پتھریلا فرش بھی نہیں بھولا تھا۔ جس پر مجھے اسی طرح وحشی قیدیوں کے سامنے پھینک دیا گیا تھا جس طرح رومن بادشاہ اپنے معتوب کو بھوکے شیروں کے آگے پھنکوا دیتے تھے۔

ارباب کو قتل ہوتے ہوئے میں نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا لیکن جب بھی میں اس کے متعلق سوچتی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے لہو کی ایک چادر سی پھیل جاتی تھی۔ مجھے اپنی بچی کا بچھڑنا بھی یاد تھا۔ مجھے وہ ٹھوکر بھی یاد تھی جو نواب کے باڈی گارڈ اس سیاہ فام جانت نے تمہاری نازک سی پنڈلی پر رسید کی تھی۔ مجھے گوہر جان کے ہاتھ میں ایک بے وقعت پیالہ کی طرح تین منزل کی بلندی پر تمہارا جھولنا اور وحشت زدہ ہو کر رو دینا بھی

یاد تھا۔ زمانے کے تھپیڑے مجھ پر بہت بوجھ بن چکے تھے اور مجھے یہ سب چکانے تھے۔ یہ بوجھ اتنا زیادہ ہو گیا تھا کہ اسے ساتھ لئے شاید مجھے خدا کے حضور میں پیش ہوتے ہوئے بھی شرم آتی کیونکہ اس نے مجھے اشرف المخلوقات بنا کر زمین پر بھیجا تھا۔
جو کچھ میں سوچ رہی تھی اس کا سارا دارومدار اب صرف تم پر تھا اس لئے میری آنکھیں تمہاری جانب کچھ زیادہ ہی نگراں تھیں۔

○

ایک برس میں، میں کچھ سے کچھ بن گئی تھی۔ بلاشبہ مجھ پر بہت محنت کی گئی تھی اور اس سے زیادہ قابل ذکر بات یہ تھی کہ امیرو کی مزاحمت نے دم توڑا تو مہینوں کے فاصلے دنوں میں طے ہونے لگے۔ میں نے تربیت کے تقریباً دسویں مہینے مجرا شروع کیا اور دو ماہ کے اندر اندر امیرزادوں کے طبقے میں کھلبلی مچا دی۔ گوہر جان دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہی تھی اور میری بلائیں لیتے نہ تھکتی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ اپنے وعدے پر بھی قائم تھی۔ ابھی تک اس نے مجھے جسم فروشی پر مجبور نہیں کیا تھا۔ حالانکہ "ملازمت" کی کئی منفرد پیش کشیں آچکی تھیں۔ مگر شاید وہ لفظوں کی آبرو رکھنا چاہتی تھی۔ بے آبرو عورت ہوتے ہوئے بھی!

اب مجھ پر ہر طرح سے اعتبار کیا جانے لگا تھا۔ مجھے کسی خادمہ وغیرہ کو ساتھ لے کر کہیں بھی آنے جانے کی آزادی تھی۔ جو چیز چاہتی منگوا سکتی تھی۔ دل کی افسردگی اگر بہت ہی بڑھتی تو کسی دن رقص کرنے سے انکار بھی کر دیتی تھی اور کوئی مجھے مجبور نہیں کرتا تھا۔ مجھے چھینک بھی آجاتی تو کئی کئی حکیم اور ڈاکٹر بلوائے جاتے تھے۔ زیورات اور روپیہ پیسہ بھی میرے سامنے رہتا تھا۔

میں اکثر سرِشام اپنے بالا خانے کی بالکونی میں کھڑے ہو کر تھکی تھکی آنکھوں سے ہیرا منڈی بازار کا تماشا دیکھا کرتی اور نہ جانے کیا کیا سوچا کرتی۔ میرے سامنے اب ایک مسئلہ دھیرے دھیرے سر اٹھا رہا تھا اور وہ نہایت اہم تھا۔ تم ہوش مند ہوتے جا رہے تھے اور وہ دن بدن وہ عمر قریب آرہی تھی جب گردوپیش اور ماحول کے نقوش ذہن پر ثبت ہونے لگتے ہیں۔ گھر سے نہیں تو بچے ہی سہی۔ بے شک تم گھر پر ہی رہتے تھے۔ لیکن بالآخر میں نے تمہیں تعلیم و تربیت اور اپنی جاگتی آنکھوں سے دیکھے ہوئے خوابوں کی تکمیل کے لئے باہر تو بھیجنا ہی تھا۔ اور ایک بار تم گھر سے نکلتے تو تمہارے ذہن پر ماحول کے نقوش ثبت ہونے میں زیادہ عرصہ نہیں لگنا تھا۔

اس عمر سے بہت پہلے میں تمہیں یہاں سے کہیں دور بھیج دینا چاہتی تھی لیکن جو کچھ میں سوچتی تھی اس کے لئے فی الحال کوئی واضح طریق کار میرے ذہن میں نہیں آرہا تھا

دوران معاملات میں، میں کسی دوسرے فرد سے مشورہ خیال تو درکنار کسی کو ان ارادوں کی ہوا بھی لگنے دینا نہیں چاہتی تھی۔

اسی سال کے وسط میں ایک عجیب حادثہ ہوا۔ آج بھی اس کے بارے میں سوچتی ہوں تو کوئی توجیہہ ذہن میں نہیں آتی۔ وہی کوٹھی نما مکان جہاں ہم سب رہتے تھے اور جس کا نام گوہر جان نے اپنی ماں کے نام پر "کاشانہ عشرت" رکھا ہوا تھا۔ اس کی تیسری منزل کی بالکونی میں کھڑی ایک روز گوہر جان سگریٹ پی رہی تھی۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ ہم سب کچھ ہی دیر پہلے سو کر اٹھے تھے۔

میں طبیعت کی کسلمندی اور سستی دور کرنے کے لئے اپنے رہائشی پورشن کے ساتھ بالکونی ہی میں تمہارے ساتھ کھیل رہی تھی۔ دور کھڑی گوہر جان کو میں صاف طور پر دیکھ رہی تھی۔ میں نے ایک لمحے کے لئے اس کی طرف سے منہ موڑا ہی تھا کہ اچانک ایک دھماکہ ہوا۔ میں نے ہڑبڑا کر پلٹ کے دیکھا تھی اس مقام سے بالکونی کا وہ ڈھائی گز کا ٹکڑا غائب تھا جہاں گوہر جان کھڑی تھی۔ اس جگہ بالکونی کے فرش میں ایک خلا رہ گیا تھا جس اب فرش کے کناروں سے لوہے کی ان سلاخوں کے مڑے ہوئے سرے نظر آ رہے تھے جو تعمیر میں استعمال ہوتی ہیں۔

ان سلاخوں کے جوڑ بھی نہ جانے کس طرح علیحدہ ہو گئے تھے۔

انہی کناروں سے اس وقت بھی سیمنٹ اور بجری کا آمیزہ خشک بھربھری مٹی کی طرح نیچے گر رہا تھا۔ پھر میرے دیکھتے دیکھتے یہ آمیزہ گرنا بند ہو گیا اور شکستہ فرش کے ناہموار کنارے میری آنکھوں کے سامنے تازہ زخم کی طرح چمکتے رہ گئے۔

ایک لمحے کے لئے تو میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ ہوا کیا ہے۔ پھر اضطراری طور پر تمہیں گود میں لے کر بالکونی کے کنارے سے پیچھے ہٹی۔ بالکونی کے فرش کا مستطیل نما وزنی وہ حصہ ٹوٹ کر نچلی منزل کی بالکونی کو بھی معمولی سا نقصان پہنچاتے ہوئے سیدھا صحن میں جا کر گرا تھا اور اس کے ساتھ ہی گوہر جان بھی۔

فرش کے اس ٹکڑے کے مزید کئی ٹکڑے ہو گئے تھے اور اس کی لپیٹ میں آیا ہوا گوہر جان کا کوٹھے سے زیادہ اونچا دھڑ کچلا جا چکا تھا اور ملبے میں تبدیل ہو چکا تھا۔ ادھر کی لاش بھی مسخ شدہ سی حالت میں زمین پر پڑا تھا۔ پہلے مجھے یہی گمان گزرا کہ میں خواب دیکھ رہی ہوں۔

کوئی ہستی جس پر زوال آتا محال لگتا ہو، یوں کسی غیبی طاقت کے ہاتھوں نازک سی کلی کی طرح مسلی جائے تو یہ بات حواس کو کچھ اٹھول سی لگتی ہے اور فوری طور پر اس پر یقین نہیں آتا...... اور یہ تو کوئی اٹھول سی انہونی تھی! پوری بالکونی سلامت تھی اور

اسی کے حصے پر میں کھڑی تھی۔ نوس' سیمنٹ اور سریے وغیرہ سے تعمیر شدہ عمارت کی اس بالکونی کو اگر ہتھوڑوں اور کدالوں سے توڑنے کی کوشش کی جاتی تو شاید توی ہیکل مزدوروں کی ٹولیوں کو دانتوں پسینہ آ جاتا۔ وہ خود بخود اس جگہ سے یوں ٹوٹ گئی تھی جیسے کسی نے بیچ سے بسکٹ کے درمیان انگلی مار کر سوراخ کر دیا ہو ـــــ اور وہ بھی عین اسی جگہ سے جہاں گوہر جان کھڑی تھی۔۔

لیکن مجھے ان تمام اتفاقات سے زیادہ حیرت ایک اور بات کی تھی۔ جانتے ہو وہ کیا بات تھی منصور؟ وہ بات یہ تھی کہ بالکونی جہاں سے ٹوٹ کر گری تھی یہی وہ جگہ تھی جہاں سے آج سے ڈیڑھ سال قبل گوہر جان نے تمہیں ایک ٹانگ سے پکڑ کے لٹکایا تھا اور مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے اس کی بات نہ مانی تو وہ تمہیں نیچے پھینک دے گی۔ ہاں ـــ یہ عین وہی مقام تھا۔

"کیا یہ مکافاتِ عمل تھا؟ یقین نہیں۔ قدرت مجھ پر اتنی مہربان نہیں ہو سکتی تھی ـــ اگر ہوتی تو گوہر جان کو اسی وقت سزا دیتی جب وہ میرے جگر گوشے کو ایک حقیر چوزے کی طرح جنگلے سے نیچے لٹکائے کھڑی تھی لیکن شاید اس تاخیر میں قدرت کی کوئی مصلحت ہو ..... الغرض تم میں نہ جانے کتنے متضاد خیالات میرے ذہن میں آئے اور نہ جانے میں نے اپنے آپ کو کتنی دلیلوں سے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

گوہر جان کی تجہیز و تکفین اگلے روز عمل میں آئی۔ تیسرے روز "کاشانہ عشرت" ہی میں گوہر جان کا سوم ہوا اور اس کے فوراً بعد یہاں کی چیدہ چیدہ عمر کی عورتوں اور نائکاؤں کی میٹنگ شروع ہوئی جس میں انجمن کی نئی صدر کا انتخاب عمل میں آیا۔ صدر ہمیشہ یہی چیدہ چیدہ عورتیں منتخب کرتی تھیں۔

ان تمام بڑی بوڑھیوں نے گوہر جان کی بیٹی وفا جان کو صدر منتخب کرنے کے حق میں رائے دی کیونکہ ان کے خیال میں اسے اپنی ماں کا اثر رسوخ حاصل تھا' اس کی اپنی مالی حیثیت بڑی مستحکم تھی اور وہ فنڈ کے روپے پیسے کا استعمال بھی سلیقے سے کر سکتی تھی۔ پڑھی لکھی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ طرے کی عورت تھی وقت پڑنے پر بڑے سے بڑے پھنے خاں کے سامنے سینہ تان کر کھڑی ہو سکتی تھی ـــــ اور منصور تمہیں یہ جان کر حیرت ہو گی کہ اسے ہندوستان کی چھ علاقائی زبانوں کے علاوہ انگریزی میں بولنے اور لکھنے پر عبور تھا۔ حتی کہ وہ انگریزی میں شاعری بھی کرتی تھی۔

میں نے اس کی ڈائری میں اس کی بچاسوں انگریزی نظمیں دیکھی تھیں مگر مجھے انگریزی واجبی سی آتی تھی اس لئے میں انہیں سمجھ نہیں سکتی تھی۔ وفا جان اپنی ماں کی ہی طرح حسین تھی۔

ابھی اس فیصلے پر رائے لی جا رہی تھی کہ وفا جان نے اٹھ کر تقریر کرنے کے انداز میں کہا ـــ "لیکن اس مرحلے پر میں یہ واضح کر دوں کہ میری محترمہ والدہ نے نہ جانے کیوں کچھ ہی دن قبل مجھے یہ ہدایت کی تھی کہ اگر ان کا ناگہانی طور پر انتقال ہو جائے تو صدارت کے لئے بڑی بوڑھیوں کے سامنے عزیزہ خانم کا نام پیش کیا جائے اور مجھے تو اسے ان کی وصیت سمجھ کر اس بات کی کوشش کی جائے کہ عزیزہ خانم ہی صدر بنیں۔ اب یہ آپ کے اختیار میں ہے کہ آپ میری محترمہ والدہ کی خواہش کا احترام کریں نہ کریں۔ وفا جان کی آواز بھرا گئی مگر اس نے بات جاری رکھی ـــ "میں ان کی خواہش کی تکمیل کو اپنی زندگی کا نصب العین سمجھتی ہوں اور اگر آپ میری رائے سے اتفاق کریں تو میں یہ کہوں گی کہ والدہ محترمہ کی اس تجویز میں یقیناً کوئی بہت بڑی مصلحت پوشیدہ ہوگی ـــ اور پھر عزیزہ خانم کو میں خود بھی اپنی بڑی بہن کی جگہ سمجھتی ہوں۔"

معلوم نہیں یہ بات اس نے معنوی اعتبار سے کہی تھی یا محض مسکری سے کام لیا تھا ورنہ حقیقت یہ تھی کہ وہ مجھ سے عمر میں کم از کم پانچ چھ سال بڑی تھی۔

بڑی بوڑھیوں کے ٹولے کی متفکرانہ سی نظریں مجھ پر جم کر رہ گئیں۔ مجھے معلوم تھا کہ میری حد سے زیادہ سنجیدگی اور بردباری کی وجہ سے ان کے دلوں میں میرا بے حد احترام ہے لیکن شاید وہ فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہی تھیں کہ میں اس ذمہ دارانہ "منصب" کی اہل ہو سکتی ہوں یا نہیں۔

"میرا خیال ہے ہمیں گوہر جان کی وصیت کا احترام کرنا چاہئے" بالآخر ایک نائکہ نے کہا۔ اس کا نام شمشاد بیگم تھا۔

"ہاں ـــ ہاں کیوں نہیں۔" ایک اور بڑھیا نے گوری کے میں دہاتے ہوئے کہا اور بس پھر تو چند لمحے کے اندر اندر تائید و تصدیق مکمل ہو گئی۔ صدارت کی نشانی کے طور پر ایک زرتار چادر تھی' میرے کندھوں پر ڈال دی گئی۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ مجھے بڑی ان بازاری عورتوں کی اس کرم فرمائی سے خوشی ہوئی تھی یا نہیں۔ وقتی طور پر میں کسی شکریے کے سوا کوئی رد عمل ظاہر نہیں کر سکتی تھی۔ تاہم دل کے کسی گوشے میں نہ جانے کیوں ایک طمانیت کی لہر سی ابھری تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ حالات کا دھارا نہایت مستعدی مگر سرعت سے مجھے میرے مقصد حیات کے قریب لے جا رہا ہے۔

گوہر جان کے چالیسویں کے بعد ایک صبح وفا جان میرے پاس آئی۔ اس کے ساتھ ایک دراز قد اور ہینڈسم انگریز نوجوان بھی تھا۔ جس نے باریک کمانی کی سنہری عینک لگا رکھی تھی۔ وہ خاصا خوش شکل نوجوان تھا تاہم لباس کے معاملے میں نہایت لاپروا معلوم ہوتا تھا۔ کمپاؤنڈ کی پتلون پر اس نے شکاریوں جیسی کینوس کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ جیکٹ کی

سامنے والے دونوں بڑی بڑی جیبوں میں دو کتابیں ٹھنسی ہوئی تھیں۔

وفا نے اس سے میرا تعارف کراتے ہوئے صرف اتنا بتایا کہ اس کا نام الیگزینڈر ہے۔ وفا نے اسے میرے کمرۂ نشست میں بٹھایا۔ وہ بیٹھتے ہی اپنی بغل سے انگریزی کا اخبار نکال کر اس کے مطالعے میں غرق ہو گیا اور وفا میرے ساتھ اندر بیڈ روم میں آ گئی۔

"مسز کنا! میں آپ کو ایک راز کی بات بتانے آئی ہوں۔" اس نے اسی آرام کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا جس پر عموماً اس کی ماں آ کر بیٹھا کرتی تھی۔ جیسا کہ میں بتا چکی ہوں کہ وفا مجھ سے پانچ چھ سال بڑی تھی اور دیکھنے میں بھی بڑی نظر آتی تھی مگر میرا لحاظ احترام کرتی تھی اور مجھ پر بھروسہ بھی کرتی تھی۔

"کیسی راز کی بات؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"میں آج رات الیگزینڈر کے ساتھ فرار ہو رہی ہوں۔" اس نے سرگوشی کی۔ "کل ہم شادی کر لیں گے اور سنیچر کو ایک بحری جہاز یہاں سے انگلستان روانہ ہو رہا ہے۔ اس میں ہماری نشستیں ریزرو ہیں۔ میں ہندوستان کو الوداع کہہ کر جا رہی ہوں عزیزہ امی اور الیگزینڈر اب انگلستان کے ایک چھوٹے سے گاؤں سینٹ میری میں اس کے آبائی گھر میں ایک نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔ میں یہ اطلاع دینے کے ساتھ آپ کو یہ مشورہ بھی دینا چاہتی تھی کہ میرے بالا خانے کا انتظام سنبھال لیجئے گا۔ وہاں بھروسے کی کسی نائکہ کا تقرر کر دیجئے گا ورنہ وہاں "کام" کرنے والی دونوں لڑکیاں بے مہار ہو جائیں گی۔ میں نقدی اور زیور وغیرہ سب لے جا رہی ہوں۔"

پھر وہ الوداعی انداز میں مجھ سے گلے ملی۔ میں کمرۂ نشست تک اس کے ساتھ آئی تو جہاں الیگزینڈر اخبار کے مطالعے میں غرق تھا۔ وفا کے تخاطب کرنے پر وہ چونکا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ان کے جانے کے بعد میں اپنے کمرے میں آ گئی اور دیر تک خیالوں کی دنیا میں بھٹکتی رہی۔

دھیرے دھیرے وہ چھوٹا اندھیرے میں تحلیل ہو گیا۔ شاید میرے تصور کی کرشمہ کاری تھی اس لئے جنم لیتی تھی کہ مجھے اب تک کامل یقین نہیں تھا کہ ارباب واقعی مر گیا ہے۔ اس لئے میں اپنے تصور میں اسے ہمیشہ زندہ دیکھتی تھی۔ ارباب کے تصور کے ساتھ ہی مریم کی یاد کا زخم بھی ہرا ہو جاتا تھا۔ پچھلے ایک سال میں بڑی خفیہ ذرائع سے میں نے اس کا سراغ لگانے کی کوشش کی تھی۔ خود سامنے آنے کا خطرہ تو میں مول نہیں لے سکتی تھی کہ کہیں ارباب کی "نامعلوم بیوہ" کی حیثیت سے میری شناخت عمل میں نہ آ جائے۔

اس تفتیش کے نتیجے میں نے اس انسپکٹر تک کا سراغ لگا لیا تھا جو قیامت کی اس رات کو اس پولیس پارٹی کی قیادت کر رہا تھا۔ جس نے عبداللہ پر گولیاں برسائی تھیں اور

ان کا تعاقب کیا تھا۔ مجھے اس پولیس رپورٹ کی نقل تک مل گئی تھی جو انسپکٹر نے کارروائی کے بعد اپنے روزنامچے میں درج کی تھی۔ اس رپورٹ کے مطابق عبداللہ تو ہے گھنٹے کے تعاقب کے بعد بالآخر گولیوں کی بوچھاڑ کی زد میں آ گیا تھا اور ایک برساتی نالے کے قریب ڈھیر ہو گیا تھا لیکن رپورٹ میں اس بات کا کوئی ذکر نہیں تھا کہ اس کے ساتھ زندہ یا مردہ حالت میں کوئی بچی بھی پائی گئی تھی۔ میرے ایجنٹ نے اس انسپکٹر سے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ جو رپورٹ اس نے روزنامچے میں درج کی تھی' واقعاتی اعتبار سے سو فیصد درست تھی۔

تو پھر آخر مریم کہاں گئی تھی؟ اس سوال نے کئی راتوں تک میری نیند اڑائے رکھی تھی۔ بار بار میں نے رپورٹ کو پڑھا اور بالآخر میری نظریں ان الفاظ پر اٹک کر رہ گئی تھیں جن میں اس جگہ کا نقشہ کھینچا گیا تھا۔ جہاں عبداللہ ڈھیر ہوا تھا۔ برساتی نالہ اس نقشے میں سب سے اہم تھا۔ ممکن تھا کہ مریم اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر نالے میں جا گری ہو۔ میں نے ایک بار پھر پیسہ پانی کی طرح بہایا۔ کئی کارندوں کو ایک اہم مہم پر تعینات کیا۔

برساتی نالے کے دونوں کناروں پر جائے وقوعہ سے لے کر اس کے بہاؤ کے سرے تک جتنی بھی آبادی تھی۔ اس کے ایک ایک گھر کو کریدا گیا۔ معلوم یہی ہوا کہ کہ وہ اس رات میں یا اس کے بعد بھی یہاں اتنی کم عمر بچی کی لاش کبھی نہیں پائی گئی تھی۔

غرضیکہ میں نے اپنی کوششوں میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی اور جب سے پیسہ میرے ہاتھ میں آنا شروع ہوا تھا۔ میں نے اس کا بیشتر حصہ اسی کام پر صرف کیا تھا مگر مجھے کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ مریم کا کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا۔ ارباب کے متعلق بھی کچھ پتا نہیں چل سکا تھا۔ البتہ اس کے متعلق یہ بات یقینی طور پر معلوم ہو گئی تھی کہ پولیس کو جو لاش ملی تھی وہ بری طرح جھلس چکی تھی۔ اس کی کوئی شناخت باقی نہیں تھی۔ پولیس نے صرف سونے کے ایک لاکٹ کی موجودگی کی وجہ سے اسے ارباب کی لاش قرار دیا تھا۔ ان کی تحقیق کے مطابق یہ لاکٹ وائٹ ایجنس تنظیم کے سربراہ کی واحد شناخت تھا۔

لیکن محض اس ایک لاکٹ کی وجہ سے میرا یہ تسلیم کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا کہ یہ لاش ارباب ہی کی تھی۔ میرا یہ بے یقینی اس وفا پرست بیوی کی آخری آس بھی ہو سکتی تھی جسے وہ آخری سانس تک سینے سے لگائے رہتی ہے۔ یہ ایک حقیقت بھی ہو سکتی تھی اور محض ایک خواہش بھی۔

اس رات نہ جانے کیوں میرا شدت سے جی چاہ رہا تھا کہ جلد از جلد چاروں طرف سکوت طاری ہو جائے۔ کائنات پر موت کا سناٹا چھا جائے۔ معمول کے مطابق دھیرے دھیرے سکوت پھیلنا شروع ہوا۔ چار بجے کے قریب بالآخر سناٹا چھا گیا۔ کبھی کبھی

دور کہیں گشت پر نکلے ہوئے کسی سپاہی کی وسل سنائی دے جاتی تھی اور بس۔ نیند بھی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ تم اب دوسرے کمرے میں خادمہ کے ساتھ سونے لگے تھے۔ میں تنہا اپنے بستر پر ساکت لیٹی یوں چھت کو گھور رہی تھی جیسے میرے تکتے ہی کوئی دھماکہ ہو جائے گا۔

اور پھر سچ مچ بے خبری دھماکہ ہو گیا۔

ایک نہیں — دو...... تین — چار — اور پھر وہی لامتناہی سکوت ہر دھماکے پر میرے جسم میں جیسے کوئی نس تڑختی رہی۔ لہو اندر ہی اندر بھیجتا رہا۔ زندگی اندر ہی اندر سمٹتی رہی۔

پھر دفعتہً میری خواب گاہ کے دروازے پر کسی نے انگلی سے نہایت ہلکی سی دستک دی۔ "بی بی جی! آپ جاگ رہی ہیں؟" یہ میری خادمہ خاص تھی۔

بمشکل تمام میں نے اپنے آپ کو بستر سے اٹھایا۔ ایک بار جسم حرکت میں آیا تو جیسے پیروں کو پر لگ گئے۔ میں نے جھٹکے سے دروازہ کھولا۔

"بی بی جی! آپ نے آواز سنی؟ کہیں گولی چلی ہے —" خادمہ نے کہا۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور اسے دھکیل کر سیڑھیوں کی طرف دوڑی۔ نیچے مہمان خانے کے تمام کمرے خالی تھے۔ جن بادشاہ بھی اپنے کمرے میں نہیں تھا۔

میں نے دروازہ کھولا اور ایک طرف کو دوڑ پڑی۔ میں نے عقبی گلی کی طرف سے وفا کی رہائش کا رخ کیا۔ میرا اندیشہ درست ہی نکلا۔ عقبی صحن کا دروازہ کھلا تھا۔ الیگزینڈر کی لاش چوکھٹ سے باہر کی طرف پڑی تھی ..... اور وفا کی لاش چوکھٹ سے اندر۔ دونوں کے ہاتھ عالم نزاع میں شاید ایک دوسرے کی طرف بڑھے تھے مگر چوکھٹ تک پہنچتے پہنچتے ساکت ہو گئے تھے۔ کمرے سے نکلتے وقت شاید الیگزینڈر آگے آگے تھا اور وفا پیچھے۔ گولیاں کھا کر الیگزینڈر چیخ کر آگے جا کر گرا تھا اور اس نے پلٹ کر وفا تک ہاتھ پہنچانے کی کوشش کی تھی کیونکہ گلی کی گرد آلود اور ناہموار تنگ سڑک پر اس کے گھسٹنے کا خون آلود نشان تھا۔ وفا گولی کھا کر اوندھی گری تھی اور وہ الیگزینڈر کی طرف ہاتھ بھی پوری طرح بڑھا نہیں پائی تھی اس کی انگلیاں چوکھٹ کی لکڑی پر شکنجے کی طرح جم چکی تھیں۔

دونوں کو دو دو گولیاں ماری گئی تھیں اور ایک ہی جگہوں پر۔ الیگزینڈر کی بھی پسلیوں اور سینے میں سوراخ تھا اور وفا کے بھی۔ کچھ مرد آ چکے تھے اور شاید تذبذب کے عالم میں کھڑے تھے کہ کیا کیا جائے؟ تین لڑکیاں ادھر گیلری میں وحشت کے مارے ساکت کھڑی تھیں۔ صرف ایک بڑھیا سینے پر دوہتڑ مار کر بین کر رہی تھی۔ اگر وہ خاموش ہو جاتی تو ماحول پر شاید ایک ساکت تصویر کا گمان ہوتا۔

میرے آنے پر باتوں کی بھنبھناہٹ شروع ہوئی اور شاید کسی نے مجھے مخاطب بھی کیا لیکن میں نے کسی کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ میں ان چار مسلحوں کی طرف بڑھی جو لاتعلق سے انداز میں کھلے دروازے سے ذرا ہٹ کر کھڑے تھے۔ ان میں سے دو کے کمرے تو بالکل صحن کے رخ پر تھے۔ یعنی اگر ان کے کمرے کے دروازے ذرا سے بھی کھلے ہوتے تو یہ ادھر سے آنے جانے والے ہر انسان پر نظر رکھ سکتے تھے۔ میں ان کے نام نہیں جانتی تھی۔ مگر صورتوں سے انہیں پہچانتی تھی۔ میں نے ان میں سے ایک کو گریبان سے پکڑ لیا۔

"کس نے قتل کیا ہے ان دونوں کو؟" میرے لفظوں میں میری روح کا سارا غیظ و غضب شامل تھا مگر پھر بھی میری آواز ایک سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں ہو سکی تھی۔ سوال کے ساتھ ہی میں نے باری باری چاروں کی شکل غور سے دیکھی۔

"ہم کو کیا معلوم؟ ہم تو سو رہا تھا۔" اس نے جواب دیا جس کا میں نے گریبان پکڑ رکھا تھا۔

"تو تمہیں یہاں اس لئے رکھا جاتا ہے کہ پڑے سوتے رہو؟ خواہ کوئی یہاں لاشوں کے انبار لگا جائے۔" میں نے اس کے منہ پر الٹے ہاتھ کا تھپڑ رسید کیا۔ اس نے سر کو یوں جھکا دیا جیسے ایک لمحے کے لئے اس کی نظر دھندلا گئی ہو پھر وہ رخسار پر ہاتھ جما کر کینہ توز نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔ اس کے ہونٹوں کے گوشے سے خون کی ایک پتلی سی لکیر ٹھوڑی پر پھیلنے لگی تھی۔

قاتل ان میں سے کوئی بھی ہو سکتا تھا اور یہ بھی عین ممکن تھا کہ وہ ان کا کوئی ساتھی رہا ہو جو اب تک نجانے کہاں سے کہاں پہنچ چکا ہو۔ سانپ نکل چکا تھا اور لکیر پیٹنے کا کام تو پولیس کے لئے چھوڑ دینا چاہئے تھا۔ میں نے ایک بار پھر اپنی مدتوں کی مشق کو کام میں لانے کی کوشش کی اور ذہن میں بھڑکتی آگ کو بمشکل تمام سرد کر دیا۔

اس کا گریبان چھوڑ کر میں وفا کی لاش کی طرف بڑھی۔ اس کا ایک رخسار صحن کے فرش پر ٹکا ہوا تھا۔ ملائم ریشمی بال دوسرے رخسار پر سے ہوتے ہوئے خون آلود فرش سے چپک کر رہ گئے تھے لیکن خون میں لتھڑنے کے باوجود ان کا سنہرا پن اب بھی علیحدہ ہی نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اب بھی کھلی تھیں اور ان میں آس کا وہ رنگ اب بھی منجمد تھا جو تو میرے گھر سے رخصت ہوتے وقت لے کر چلی تھی۔

موت کی اذیت اور تشنج کے باوجود اس کے بھنچے ہوئے ہونٹوں پر اس معصوم کی مسرت بھری مسکراہٹ کے مٹے مٹے سے آثار باقی تھے۔ وہ مسکراہٹ جو صرف اس انسان کے ہونٹوں پر ہوتی ہے جو ایک طویل قید سے رہائی پا کر ایک نئی زندگی کی امید پر ایک نئی

راہ پر پہلا قدم رکھتا ہے..... اور مجھے یاد آیا کہ اس نے کتنے مسرور انداز میں میرے بنگلے میں پاؤں ڈالا کرتا تھا ـــــ عزیزہ! میں ایک نئی زندگی شروع کرنے جا رہی ہوں ـــــ یہ گزشتہ شام ہی کی تو بات تھی۔ ابھی تو ان الفاظ کی بازگشت بھی میرے ذہن میں مدھم نہیں پڑی تھی۔

نئی زندگی کی لو مجھے سنانے والی وہ پارہ صفت لڑکی خاک و خون میں لتھڑی ایک مسلی ہوئی کلی کی طرح میرے قدموں میں پڑی تھی۔ جسے اس نے بڑے چاؤ اور امید سے اپنا ہم سفر چنا تھا کہ وہ اس کی حفاظت کرے گا۔ اسے اپنی مضبوط بانہوں کے حلقے میں سمیٹ کر دور بہت دور خوشیوں کے ان دیکھے اور انجانے دیس میں لے جائے گا۔ وہ اس کی تو کیا خود اپنی بھی حفاظت نہیں کرسکا اور ایک بار پھر مجھے نہ جانے کیوں وہی احساس ہوا جو ارباب کی موت پر ہوا تھا۔ ان دونوں نے بھی کچا ہی قدم اٹھایا تھا۔ انسانوں کا راستہ اختیار کیا تھا۔

ایک بار پھر اس نظریے پر میرا یقین پختہ ہوگیا۔ "کسی چیز کی طلب ہے تو پہلے اپنے اندر سے اسے چھیننے کی طاقت پیدا کرو۔ چوروں کی طرح چھپ چھپا کر روانہ ہونے والوں کو منزلیں نہیں ملا کرتیں۔"

پھر میں نے اینگریڈر کی لاش پر نظر ڈالی۔ اس کی ایک جیب سالم لیکن اس سے کالی دور پڑی تھی۔ اس کے جسم پر وہی لباس تھا جو میں شام کو دیکھ چکی تھی۔ جیکٹ کی بڑی بڑی جیبوں میں وہ کتابیں بھی اسی طرح ٹھنسی ہوئی تھیں۔ اچانک وفا کی آواز ایک بار پھر میرے ذہن میں گونج اٹھی۔ "میں کپڑوں کے ایک چھوٹے سے تھیلے میں صرف زیور اور نقدی رکھ کر تیار رہوں گی....."

لاشوں کے آس پاس کہیں بھی اس قسم کا کوئی تھیلا نظر نہیں آیا تھا۔ میرے دل میں افسردگی کی ایک اور لہر اٹھی۔ وفا اور اینگریڈر کی روحوں کی طرح تھیلا بھی شاید یہاں سے کہیں دور جاچکا تھا۔ میری مجبوری یہ تھی کہ مجھے اپنے آپ کو حالات سے بالکل ناواقف ظاہر کرنا تھا۔ اس لئے میں تھیلے کے متعلق بھی کچھ نہیں پوچھ سکتی تھی۔

"سنو....." بالآخر میں نے اپنی تمام تر تھکن کے باوجود بہ آواز بلند سب کو مخاطب کیا۔ "میں گھر جا رہی ہوں۔ پولیس آئے تو جس کو جو کچھ بھی معلوم ہو، بلا خوف بتا سکتا ہے۔" تھکے تھکے قدموں سے میں گھر لوٹ آئی۔

جیسا کہ مجھے توقع تھی کہ ایک انگریز کے قتل سے خاصی کھلبلی مچے گی ـــــ تو ایسا ہی ہوا.. اگلی صبح میں ناشتہ ابھی کرکے فارغ ہی ہوئی تھی کہ خادمہ نے بڑے خوفزدہ انداز میں اطلاع دی کہ ریذیڈنٹ صاحب بہادر تشریف لائے ہیں اور مجھ سے بات کرنا چاہتے

ہیں۔

"انہیں بٹھاؤ اور ان کا پسندیدہ مشروب وغیرہ پیش کرو۔ میں ابھی آتی ہوں۔" میرے اندر یک بیک بلا کا اعتماد اور سکون آگیا تھا۔

ریذیڈنٹ صاحب بہادر چاہتے تو مجھے اپنے دفتر میں بھی طلب کرسکتے تھے لیکن اگر یہ شخص خود چل کر آیا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ میں چار پانچ ہزار افراد کی نمائندگی کرتی ہوں۔ خواہ یہ افراد بازاری عورتیں، دلال اور نائکائیں ہی تھیں۔ معاشرے کے دھتکارے ہوئے۔ ناپسندیدہ بے عزت و بے حیثیت بے ناموس لوگ۔

اس کا نام گلبرٹ تھا۔ وہ ادھیڑ عمر کا ایک فربہ اندام، میانہ قد اور نرم طبیعت آدمی تھا اور خاصی اچھی اردو بول لیتا تھا۔ جہاں اٹکتا تھا وہاں انگریزی کا لفظ ٹانک لیتا تھا۔ دونوں ہاتھوں میں چھڑی تھماتے ہوئے بات کرتا تھا اور کہیں کہیں افسرانہ رعونت بہرحال جھلک آتی تھی۔

"..... جی سب باتیں تو معلوم ہو ہی جائیں گی۔ عزیزہ خانم!" پہلی گفتگو کی طرح اس نے یہ الفاظ بھی بگڑے ہوئے تلفظ کے ساتھ ہی کہے تھے تاہم میں درست لفظ کے ساتھ لکھ رہی ہوں ـــــ "اور قاتل بھی پکڑا جائے گا۔ فی الحال مجھے صرف یہ جاننے سے دلچسپی ہے کہ ایک انگریز نوجوان رات کے اس پہر وفا جان کے مکان کے پچھلے حصے میں کیا کر رہا تھا۔ کیا آپ کو کوئی ایسی بات معلوم ہے جو اس گتھی کو سلجھانے میں پولیس کی مدد کرسکے؟ میں نے سوچا کہ ایس پی صاحب سے پہلے آپ سے میں خود ملوں۔"

"مسٹر ریذیڈنٹ!" میں نے حتی الامکان پر وقار لہجے میں کہا۔ "کہ آپ واقعے کا تذکرہ اس طرح کر رہے ہیں کہ گویا قتل صرف اس انگریز نوجوان کا ہوا ہے۔ مت بھولئے کہ ایک نوجوان لڑکی وفا جان بھی قتل ہوئی ہے۔ باقی رہے آپ کے سوالات تو ان کے جوابات مجھے خود بھی درکار ہیں اور ممکن آپ کی انتظامیہ سے ان کے جوابات کی توقع کر رہی ہوں۔ میں اس بازار اور اس سے متعلقہ افراد کی انجمن کی صدر ضرور ہوں لیکن یہاں کا ہر فرد اپنا ہر راز مجھے بتا کر ہر قدم نہیں اٹھاتا۔ اس کی اپنی ایک نجی زندگی بھی ہوتی ہے۔"

"بہت خوب!" اس نے بردباری سے سرہلا دیا تو میں نے اس کا مطلب جواب دیا ہو حالانکہ بظاہر یہ ایسا ہرگز نہیں تھا۔ پھر اس نے اپنا ہیٹ اتار کر برابر ہی تپائی پر رکھ دیا۔ جس پر شیمپین کی بوتل اور گلاس رکھے ہوئے تھے۔ گلاس بالکل خشک اور شفاف نظر آرہے تھے۔

"آپ نے شوق نہیں فرمایا؟" میں نے تپائی کی طرف اشارہ کیا۔

"اگر آپ کچھ دیر نہ آتیں تو شاید میں ایک آدھ جام لے لیتا لیکن اب میں جلد

از جلد بات ختم کر کے جانا چاہوں گا۔"

اس نے چھڑی اپنی گود میں رکھ لی اور سر پر نمودار ہوتے ہوئے قطرے گنج پر ہاتھ پھیرا۔ جس پر پسینے کی اکا دکا بوند چمک رہی تھی۔ "میں آپ سے ضرور ایک رائے لینا چاہوں گا۔ آپ کے خیال میں پولیس کو اپنی تفتیش کا آغاز کہاں سے کرنا چاہیے ؟"

"ان چند مہمانوں کی گرفتاری سے جو مکان کے پچھلے کمروں میں رہتے ہیں۔ ان میں سے دو کے کمروں کا رخ صحن کی سمت ہے۔ انہیں یقیناً" کچھ نہ کچھ معلوم ہونا چاہئے۔" میں نے مجروح ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی۔" ریذیڈنٹ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "کہ ہم نے ان چاروں کو گرفتار کر لیا ہے اور جن میں سے ایک وفا نے الیگزینڈر کے قتل کا اعتراف بھی کر لیا ہے۔ اس کی نشاندہی پر آلۂ قتل بھی تلاش کر لیا گیا ہے۔ یہ ریوالور اس نے چار گولیاں چلانے کے بعد صحن میں موجود اس کنویں میں پھینک دیا تھا جس میں سے چند پمپ کے ذریعے پورے مکان کو پانی سپلائی ہوتا ہے۔ اس کنویں پر فرش کے رنگ سے ملتا جلتا ایسا آہنی ڈھکن موجود ہے جو سرسری نظر میں دکھائی بھی نہیں دیتا۔"

"قاتل ان چاروں میں کون ہے ؟" میں نے سرسرائی ہوئی سی آواز میں پوچھا اور تولیہ سی کیفیت میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ ریذیڈنٹ نے بلاشبہ مجھے حیرت زدہ کر دیا تھا۔

"ساحر کنال نام ہے اس کا ۔۔۔ وہی جو ان میں سب سے کم عمر ہے۔" ریذیڈنٹ نے چھڑی گھماتے ہوئے جواب دیا۔

قتل کی کوئی وجہ بتائی اس نے؟" میں نے پوچھا۔ اپنے لہجے پر میں اب قابو پا چکی تھی۔

"ہاں ۔۔۔ وہ کہتا ہے وفا اس کی محبوبہ تھی اور الیگزینڈر اسے لے کر بھاگنے والا تھا۔" ریذیڈنٹ دروازے کی طرف مڑ گیا۔۔۔ "اور یہ بات اس لئے سچ معلوم ہوتی ہے کہ الیگزینڈر کی جیب سے انگلینڈ روانہ ہونے والے ایک بحری جہاز کی دو ٹکٹیں [illegible] روم کی ٹکٹ ہی ہے۔ جس پر مسٹر اور مسز الیگزینڈر کے ناموں کا اندراج ہے۔ اب صرف ایک چھوٹی سی الجھن باقی ہے کہ وفا کی تمام پونجی اور زیورات غائب ہیں جن کی مالیت ایک خادمہ کے اندازے کے مطابق کم از کم تین لاکھ ہے۔ تین لاکھ بہت بڑی رقم ہوتی ہے۔" ریذیڈنٹ میری طرف دیکھ کر یوں مسکرایا گویا میری رائے طلب کر رہا ہو۔

"ہاں ! کم از کم اتنی ضرور ہے کہ اس کے لئے کوئی دو افراد کو قتل کر سکتا ہے یا پھر قتل کا الزام اپنے سر لے سکتا ہے۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"ہاں ۔۔۔ ہم اس پہلو پر بھی سوچ رہے ہیں۔" ریذیڈنٹ بولا۔ اس نے پرخیال نظروں سے مجھے گھور کر دیکھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کے کچھ عرصے بعد ایک اور اہم واقعہ پیش آیا۔ میں اپنے بالا خانے کی بالکونی میں کھڑی تھی۔ میں بالکونی میں کبھی کبھار ہی کھڑی ہوتی تھی اور وہ بھی اس وقت جب کبھی دل اداس ہوتا تھا تو دھیان بٹانے کے لئے کسی ستون دیکھو کی اوٹ میں آتے جاتے چہروں پر لکھی مختلف تحریریں پڑھنے کی کوشش کرتی تھی۔

میرے بالا خانے کے سامنے والے چند بالا خانے چھوڑ کر دائیں طرف دودھ ، دہی ، مشروبات ، کھیر اور دودھ والے سن کی چیزوں کی بہت بڑی دکان تھی۔ اسے پانچ بھائی چلاتے تھے۔ پانچوں پہلوان تھے۔ لیکن سب اکھاڑے کو الوداع کہہ چکے تھے حالانکہ بوڑھا ان پانچوں میں سے کوئی نہیں تھا مگر عمر کے اس دور میں سارے ہی بھائی پہنچ چکے تھے۔ جب کشتی لڑنا بس کی بات نہیں رہتی۔ بازار میں اب بھی ان کا بڑا رعب تھا۔

اسی دکان کی طرف سے تکرار کی اونچی اونچی آوازیں سن کر میں بری طرح چونک اٹھی۔

بازار حسین میں مزید خانم کے پاڑ خانے کے بعد پہلوانوں کی دکان ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں کبھی کسی کو اونچی آواز میں بولنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ نشے میں دھت شرابی بھی وہاں پہنچ کر اپنے پراگندہ حواس کو مجتمع کر لیتے تھے ورنہ کسی قسم کی ہا ہو شروع کرنے سے پہلے ہی اٹھا کر دکان سے خاصی دور پھینک دیئے جاتے تھے... اور اس کارروائی میں یہ امتیاز نہیں رکھا جاتا تھا کہ مذکورہ شخص کون ہے؟ کس حیثیت کا مالک ہے؟ بدمعاش ہے یا شریف البتہ پھینکنے سے پہلے دکان کے نوکر چاکر اس شخص کی جیب سے اس چیز کے پیسے ضرور نکال لیتے تھے جو اس نے کھائی ہوتی تھی لیکن قیمت سے زیادہ ایک دھیلا بھی نہیں نکالا جاتا تھا۔

اور جو کچھ میں اس وقت اس دکان پر دیکھ رہی تھی اور جو آوازیں سن رہی تھی وہ مجھے حیران کر دینے کے لئے کافی تھیں۔ دکان میں باہر کی طرف ایک بڑا سا سفید چبوترا تھا۔ اس کی سفید ٹائلیں دور ہی سے چمکتی نظر آتی تھیں۔ اس پر سب سے بڑے پہلوان صاحب ایک موٹے سے گدیلے پر آلتی پالتی مارے بیٹھے ہوتے تھے۔ ان کے دائیں ہاتھ پر شو کیس ہوتا تھا جس میں چند ایک خاص خاص مٹھائیوں کے تھال نہایت خوبصورتی سے سجے ہوتے تھے۔ دائیں ہاتھ پر برف کی سل ہوتی تھی جس پر کھیر کی ٹھوٹھیاں رکھی ہوتی تھیں۔ سامنے ربڑی کا تھال ہوتا تھا اور ان کے قریب بڑا سا آہنی کیش بکس ہوتا تھا جسے گلا کہا جاتا ہے۔

بڑے پہلوان صاحب اپنے عجیب ایک بہت بڑی پگڑی اور نہایت موٹی موٹی دھار دار اور تاؤ دیا موم سے اکڑائی گئی مونچھوں کی وجہ سے ان تمام چیزوں کے درمیان نہایت نمایاں نظر آتے تھے۔

اس وقت ایک شخص بوٹ سمیت اس سفید چبوترے پر پاؤں رکھے کھڑا تھا جسے بڑے پہلوان صاحب کسی ایسے شخص کی انگلی لگتے دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے جو ابھی طرح صاف ستھرا نظر نہ آرہا ہو۔ "اب کہہ تو دیا ۔۔۔ اب ہزار بار کیوں کہا کہ چھدن بابا نے آج تک کسی دکان پر کھانے پینے کے بعد پیسے نہیں دیئے۔ ابھی تو صرف دو سیر دودھ پیا ہے ۔۔۔ چھدن بابا ادھر روزانہ پانچ سیر دودھ پینے آئے گا اور کوئی پیسہ نہیں دے گا۔ مجھے پیارے

بابا کے ادرم ۔۔۔" وہ کہہ رہا تھا۔

اس نے باقاعدہ اپنا ایک لمبا ہاتھ بڑھا کر ایک انگلی سے تمسخرانہ انداز میں بڑے پہلوان صاحب کا پھولا پھولا گال چھوا۔ اس کی بلند دار آواز میں پوربیا لہجے کی جھلک تھی وہ اپنے آپ کو بابا کہہ رہا تھا مگر اس کی عمر چھبیس ستائیس سے زیادہ نہیں رہی ہو گی۔ اس کا چہرہ تو مجھے نظر نہیں آرہا تھا کیونکہ اس کی پشت میری طرف تھی تاہم اس کی کھچڑی بالوں میں مجھے کہیں سفیدی غالب نظر نہیں آئی۔

وہ ٹخنے کا کھڑا پاجامہ اور لمبا سا کرتہ پہنے ہوئے تھا جس کی آستین چڑھی ہوئی تھیں اور مجھے خاصے فاصلے سے بھی اس کے بازو کی ہر مچھلی پھڑکتی نظر آرہی تھی۔ اس کے کندھے بے تحاشا چوڑے اور گردن سانڈ کی طرح گٹھی ہوئی تھی۔ قد اتنا اونچا تھا کہ اگر وہ ذرا بلند کرتا تو اپنے سر پر گھومتے چھت میں لٹکے ہوئے اس پنکھے کو چھو سکتا تھا جس کا درمیانی حصہ کسی گیند سے مشابہ تھا۔

پکی رنگت کا یہ نامعلوم شخص وضع قطع سے تو بابا ہی تھا مگر اس کا بدن فالتو بیکار گوشت کا انبار معلوم نہیں ہوتا تھا محسوس ہوتا تھا کہ یہ شخص بیک وقت پتھر کی طرح ٹھوس بھی ہے اور ربڑ کی طرح لچکیلا بھی۔ اس کے جسم نے یقیناً" برسوں بے پناہ مشقتوں یا پھر ورزشوں کی سختی برداشت کی تھی۔

اس نے انگلی سے بڑے پہلوان صاحب کا گال چھوا تو ان کی مونچھیں بری طرح پھڑکنے لگیں نتھنے پھولنے پچکنے لگے لیکن وہ اس شخص چھدن بابا کے چہرے کی طرف نہیں شعلہ بار نظروں سے اس کے بوٹ کی طرف دیکھ رہے تھے جو سفید چبوترے پر ٹکا ہوا تھا۔ اسی کیفیت میں پہلوان صاحب کے حلق سے اچانک یوں آواز برآمد ہوئی جیسے شیر کو کسی نے رستے میں تیر چبھو دیا ہو۔

"ابے گرالو سالے کو۔۔۔ دیکھ کیا رہے ہو۔۔۔" وہ دھاڑے۔ "میں اس کے گلے میں زنجیر ڈال کر اسے کتے کی جگہ باندھوں گا۔"

دائیں بائیں سے دکان کے کئی تگڑے تگڑے سے ملازم اس شخص پر ٹوٹ پڑے جس نے اپنے آپ کو چھدن بابا کہا تھا ان میں سے ایک کے ہاتھ میں میں نے لوہے کا وہ لمبا سا خطرناک کفگیر بھی دیکھا جس کی ایک ضرب چھدن بابا کے تربوز نما سر کے دو ٹکڑے بھی کر سکتی تھی۔ اس نے اپنے پہلوؤں اور پیٹھ پر برستے گھونسوں اور لاتوں کی قطعاً" پروا نہیں کی سب سے پہلے ہاتھ سے اس طرح کفگیر کا وار روکا کہ دوسرے ہی لمحے کفگیر اس کے ہاتھ میں تھا۔

صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ شخص گھر سے ہی لڑائی کا تہیہ کر کے آیا تھا اور اس معرکے سے بڑا محظوظ ہو رہا تھا۔ اس کی گویا پشت پر بھی آنکھیں تھیں۔ اس نے کفگیر یوں گھما لیا

کہ کسی کو ضرب لگائے تو بچل کی طرف سے نہ لگے۔ صرف سلاخ کی طرف سے لگے۔ یہ سلاخ اس نے ایک ہی وار میں یوں گھمائی کہ کسرتی جسموں والے تین ملازم تو ایک ساتھ ہی دوہرے ہو کر فرش پر ڈھیر ہو گئے اور یوں تڑپنے لگے گویا ان کی کمریں ٹوٹ گئی ہوں حالانکہ چھدن بابا نے اس وار میں شاید آدھی طاقت بھی استعمال نہیں کی تھی۔ اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے دیہات کے کسی اسکول ٹیچر نے لڑکوں کو سرزنش کرنے کے لئے بید گھمایا ہو۔ اگر وہ پوری طاقت استعمال کرتا تو شاید سلاخ ان کے جسموں سے کسی دھار دار چیز کی طرح گزر جاتی۔

دوسرے وار میں باقی دو جوان بھی اوندھے ہو گئے اور چند لمحے بعد ان سب نے اپنی اپنی جگہ ساکت ہو جانے کا عقلمندانہ فیصلہ کیا۔ چھدن بابا نے سریا نہایت اطمینان سے چبوترے سے ٹکا کر کھڑا کر دیا۔

"ان بالکوں کو کہو اس نوجوانی میں بڈی پنجے کا کوئی روگ لگواؤ گے میرے ٹھاکر۔" چھدن نے ایک بار پھر پہلے ہی کی طرح انگلی سے بڑے پہلوان کے گال کو چھیڑا۔ بڑے پہلوان اب براہ راست اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پھنکار رہے تھے۔ بلاشبہ ابھی ان کی آنکھوں میں مرعوبیت کا کوئی نشان نہیں تھا تامل کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ پوری طرح اپنے آپ کو اشتعال میں لانے کی کوشش کر رہے تھے ابھی شاید کچھ کسر باقی تھی۔

لیکن میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ دراصل ان سے پہلے ان کے چاروں چھوٹے بھائیوں کی باری تھی اور شاید یہ ان کے اکھاڑے کا اصول تھا جیسے وہ یہاں بھی توڑنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ چاروں بھائی بھی بڑی بڑی پگڑیوں باندھتے تھے مگر اس وقت جب میں نے انہیں ولن کے اندرونی حصوں سے نکلتے دیکھا تو ان کے سروں پر پگڑیاں نہیں تھیں اور آستین چڑھی ہوئی تھیں۔ وہ پیچھے سے آئے تھے اور ایک طرح سے انہوں نے چھدن بابا کو دھوکے سے پکڑا تھا۔

ان میں سے دو نے چھدن کی گردن پر ہاتھ ڈالا اور دو نے جھک کر اس کی ٹانگیں پکڑنے کی کوشش کی تھی انداز یہی تھا کہ وہ ایک بھاری برتن کی طرح چھدن بابا کو اٹھائیں گے اور فرش پر مار کر چور چور کر دیں گے۔ مگر ایسا نہیں ہو سکا۔ چھدن تڑپ کر ان کی گرفت سے نکلا دو کے سر آپس میں ٹکرائے اور ایک کو اٹھا کر بڑی تختے پر یوں دے مارا کہ چاروں بھائی بوریوں کی طرح اوپر نیچے ڈھیر ہو گئے تاہم وہ جلد ہی اٹھے اور پہلے سے زیادہ جوش و خروش اور طرفداری سے چھدن بابا پر پلٹے۔

لڑتے لڑتے وہ سڑک پر آ گئے تھے اور لوگ جمع ہونے لگے۔ تاہم میں بلندی پر ہونے کی وجہ سے پورا منظر صاف طور پر دیکھ رہی تھی اور میری رگوں میں خون کی گردش اتنی تیز ہو چکی تھی کہ مجھے سانس لینے میں بھی دشواری پیش آ رہی تھی۔ مجھے چند ایک کہانیاں

پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا کہ کہ ان دنوں کشتی عملی طور پر ہندوستانی تہذیب کا ایک حصہ تھی مگر بڑے بڑے نامی پہلوانوں میں میں نے ایسی بھرپور طاقت اور داؤ کا بیک وقت ایسا عجیب مظاہرہ نہیں دیکھا تھا جو یہ شخص چھدن بابا بھی سڑک پر ایک محدود سی جگہ میں چار کیم شحیم پہلوانوں سے لڑتے ہوئے پیش کر رہا تھا۔ بے شک یہ پہلوان سانڈ ہی سی ٹکر انہیں اکھاڑا چھوڑے ہوئے زیادہ مدت نہیں ہوئی تھی اور طاقت اور داؤ پیچ میں بہرحال وہ بہت سے طاقت ور انسانوں سے کہیں برتر تھے۔

مگر یہ کم بخت چھدن بابا شاید لوہے سے بنا ہوا تھا جس میں بجلی دوڑ رہی تھی۔ وہ ان چاروں کو یوں اٹھا اٹھا کر پٹخ رہا تھا جیسے وہ مٹی کے بورے ہوں۔ بالآخر ان میں سے دو تو سڑک سے ٹکرا ٹکرا کر ساکت ہو گئے تھے اور ان کے سروں سے اور شاید چہروں کے بعض حصوں سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ باقی دو اب بھی چھدن بابا کو قابو کرنے کے لئے اپنی سی کوشش کر رہے تھے۔ دفعتاً چھدن بابا نے ہاتھ ترچھا کر کے کلہاڑی کی طرح یکے بعد دیگرے دونوں بھائیوں کی گردنوں پر رسید کیا اور دونوں طوفان سے اکھڑے ہوئے درخت کی طرح جھکولا کھا کر اپنے بے ہوش بھائیوں کے قریب ہی ڈھیر ہو گئے۔

چھدن بابا نے پلٹ کر بڑے پہلوان کی طرف دیکھا جو اب بھی چبوترے پر ساکت بیٹھا تھا۔ اس کا سپید چہرہ تپے ہوئے تانبے کی طرح سرخ ہو چکا تھا۔ یہ ایک حیرت انگیز بات تھی کہ وہ اب بھی مرا نہ۔ نہیں ہوا تھا پھر اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز طور پر میں نے اسے اٹھ کر ہوا میں چھلانگ لگا کر چھدن بابا کی طرف آتے دیکھا جیسے کسی بہت بڑے اور طاقت ور اسپرنگ نے اسے اس کی جگہ سے اچھال دیا ہو۔ اس کے بے تحاشا پھیلے ہوئے تن و توش اور بھاری بھر کم وجود کو دیکھتے ہوئے اس کا یوں عقاب کی سی اڑان کے ساتھ جھپٹنا بلاشبہ ایک طلسمی سا کارنامہ تھا۔

چند منٹ کی اس معرکہ آرائی میں پہلی مرتبہ میں نے چھدن بابا کو گرتے دیکھا۔ بڑا پہلوان اس پر سوار تھا مگر دوسرے ہی لمحے وہ بہت بڑے گولے کی طرح ہوا میں کئی فٹ اچھلا اور دھپ سے سڑک پر آ گرا کیونکہ چھدن اس کے نیچے سے نکل چکا تھا اب چھدن کو شاید غصہ آ گیا تھا کیونکہ میں نے اس کے انداز میں وحشت انگیزی محسوس کی۔

اس نے بڑے پہلوان کو سنبھلنے نہیں دیا۔ اس کی پگڑی ایک طرف کو ڈھلک چکی تھی۔ چھدن نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اس کے ضرب لگائی جس نے بڑے پہلوان کو اٹھ کر کھڑا ہونے سے باز رکھا۔ چھدن نے اب داؤ پیچ کی بجائے گھونسوں گھٹنے کی ضربوں اور کہنی کے واروں سے بڑے پہلوان کو نیم بے ہوش سا کر کے رکھ دیا۔ وہ گھٹنوں کے بل کھڑا یوں جھول رہا تھا جیسے اس کی ٹانگیں جواب دے چکی ہوں اور بار بار تکلیف آمیز انداز میں سر کو جھٹکے دے رہا تھا۔

اس کے چہرے سے بھی خون پھوٹ پڑا تھا اور مونچھیں ڈھلک گئی تھیں چندن بابا نے اسے مارنا بند کر دیا تھا اور کھڑا اپنے کپڑے جھاڑ رہا تھا۔ واللہ" بھیڑ کو چیرتے ہوئے دو سپاہی آگے آ گئے۔ پہلے انہوں نے حیرت سے بے ہوش اور نیم بے ہوش پہلوانوں کی طرف دیکھا پھر ہچکچاتے ہوئے یوں چندن بابا کی طرف دیکھا جیسے ہونے قطب مینار کو دیکھ رہے ہوں۔ ایک نے تو باقاعدہ عورتوں کی طرح دانتوں میں انگلی دے لی۔

"تم نے ان کو مارا ہے؟" ایک نے اپنی چھڑی سے پہلوانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چندن سے پوچھا۔

"ان کو ہوش میں لا کر انہی سے پوچھ لو۔" چندن بابا نے اپنی آستین درست کرتے ہوئے لاپروائی سے جواب دیا۔

"بلوہ کرتے ہو' بدمعاشی دکھاتے ہو؟" ایک سپاہی نے اپنی آواز میں کڑک پیدا کرنے کی کوشش کی مگر انداز ایسا ہی تھا جیسے کوئی بچہ تعجب لگا کر باپ کو ڈرانے کی کوشش کر رہا ہو۔ دونوں سپاہیوں نے چندن بابا کا ایک ایک بازو پکڑ لیا اگرچہ ان کے سر چندن بابا کے کندھوں سے بھی نیچے تھے۔

"چلو تھانے!" دوسرے نے بھی ہمت کر کے کہا۔

اس اثناء میں بڑا پہلوان سنبھل کر اٹھ کھڑا ہوا تھا سب سے پہلے اس نے پگڑی تلاش کر کے سر پر رکھی۔ پگڑی کا ایک سرا اس کے سینے پر ڈھلک آیا جس سے اس نے اپنا چہرہ پونچھا اور چندن کے سامنے آ کر بغور اس کا چہرہ دیکھنے لگا وہ دیکھ رہا تھا چندن کو مگر مخاطب سپاہیوں کو کیا "اسے چھوڑ دیجئے سنتری جی غلطی ہماری تھی۔۔۔ ہماری۔۔۔" اس کی پاٹ دار آواز بھرا گئی۔

"آپ کی؟" سپاہی بھونچکا رہ گئے۔ "آپ کی کیا غلطی تھی۔۔۔ پہلوان جی؟" ایک نے پوچھا۔

"میں کہہ جو رہا ہوں غلطی ہماری تھی۔" بڑے پہلوان کی آواز کچھ اور بلند ہوئی مگر پہلے سے زیادہ بھرا گئی وہ سر جھکا کر پگڑی کے پلو سے آنکھیں پونچھنے لگا۔

"آخر کچھ ہمیں بھی تو پتہ چلے کہ غلطی کیا تھی؟" ایک سپاہی نے کہا اس کے لہجے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ الجھ رہا ہے۔ "آخر ہمیں پرچہ کاٹنا ہے۔"

"کوئی پرچہ ورچہ نہیں کٹے گا سنتری جی!" بڑا پہلوان یکلخت ہی بپھری سی آواز میں غرایا مگر فوراً ہی پگڑی کے پلو سے دوبارہ آنکھیں پونچھنے لگا اور پہلے جیسی ہی بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "غلطی ہماری تھی کہ ہم پہلوانی چھوڑ کر تجارت میں پڑ گئے۔" یہ جیسے اس نے خود کلامی کے سے لہجے میں ادا کیے تھے۔ پھر وہ قدرے بلند آواز میں بولا۔ "اس جوان نے کہا تھا کہ وزن اچھا نہیں ہے ہم نے اس کی بات پر دھیان دینے کی بجائے اس سے جھگڑا

شروع کر دیا۔ اسے جانے دو سنتری بادشاہ یہ شیر آدمی ہے اسے چھوڑ دو چھوڑ دو اسے۔" وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر دکان کی طرف دوڑ گیا اور دروازہ بند کرنے لگا۔ سامان یوں کا یوں پڑا تھا۔

"تو کیا تم اس شخص کے خلاف کوئی شکایت درج کرانا نہیں چاہتے؟" ایک سپاہی نے بات کی تصدیق کی خاطر اس کے قریب جا کر پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ نہیں۔" بڑا پہلوان بدستور بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "شکایت درج کرنی ہے تو ہمارے خلاف کر لو۔"

"آپ تمہارے خلاف کیا شکایت لکھیں پہلوان جی تم شریف لوگ ہو۔" دوسرے سپاہی نے کہا اور چندن بابا کا بازو چھوڑ دیا۔

پہلوان نے دکان بند کر کے بڑا سا تالا ڈال دیا اور اپنے بھائیوں کو جھنجوڑ کر جگانے لگا۔

"دکان کیوں بند کر دی؟ کہیں جا رہے ہو؟" ایک سپاہی نے جھک کر کہا۔

"نہیں جی! جہاں ایک دفعہ عزت خراب ہو جائے وہاں کیا رہنا کیا کاروبار کرنا۔" پہلوان جی نے اپنے ہونٹوں پر زبردستی ایک مسکراہٹ پیدا کی جو مسکراہٹ کم اور کسی اندرونی ٹیس کا کھچاؤ زیادہ معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے بھائی ایک ایک کر کے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

چندن بابا ایک طرف کھڑا نہایت سکون سے مونچھوں کو بل دے رہا تھا۔ بڑا پہلوان اور اس کے بھائی دیکھتے ہی دیکھتے نہ جانے کس طرف کو غائب ہو گئے۔ یکایک مجھے اپنے دل میں بڑے پہلوان کے لئے بے پناہ احترام محسوس ہوا۔

واللہ" چندن بابا نے مجمع کو مخاطب کیا۔ "بھائیو! دکان دو تین دن بعد پھر کھلے گی صرف مالک بدل جائے گا۔ چیزیں آپ کو ایسی ہی ملیں گی بالکل فکر نہ کریں۔" یہ کہہ کر وہ اطمینان سے ایک طرف کو چل دیا گویا کوئی سیاسی لیڈر قوم سے نئے وعدے کر کے تقریر ختم کر کے اسٹیج سے اتر کر اپنی نشست کی طرف جا رہا ہو۔

میں جو اب تک گویا نیند کی سی کیفیت میں کھڑی تھی چونک کر جاگی۔ ایک بوڑھی خادمہ اور بالاخانے کی دوسری لڑکیاں میرے آس پاس ہی کھڑی تھیں۔ میں خادمہ کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے گئی اور سرگوشی میں اس سے کہا۔ "یہ جو شخص جا رہا ہے اسے جا کر لاؤ۔ پچھلے دروازے سے لانا۔ اسے کہنا میری مالکن تم سے ایک بہت ضروری بات کرنا چاہتی ہیں۔۔۔ اور بات تمہارے فائدے کی ہے۔"

کچھ دیر بعد میں نے بڑھیا کی رہنمائی میں چندن بابا کو بالاخانے کی سیڑھیاں چڑھتے دیکھا۔ وہ چیتے کی طرح چوکنا نظر آ رہا تھا اور یوں اوپر کو دیکھتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ رہا تھا

نہیں لے کر خصوصاً" میرے سامنے۔

"چھدن بابا۔!" میں نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اس نے میری بات کاٹ کر پوچھا۔ "تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا؟"

"باہر حلوائیوں کی دکان پر دھینگا مشتی کرنے سے پہلے تم نے خود ہی سینہ ٹھونک کر اپنا نام لیا تھا۔" میں نے کہا۔ "میں نہ صرف سب کچھ دیکھ رہی تھی بلکہ سن بھی رہی تھی۔"

"اوہ۔" اس نے اطمینان کی سانس لی۔ "ہاں تو تم کیا کہہ رہی تھیں؟"

"میں یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ اپنے متعلق کچھ تفصیل سے بتاؤ تم کون ہو کہاں سے آئے ہو یہاں دھیمو کا کیا چکر ہے میں تمہارے متعلق سب کچھ جاننا چاہتی ہوں۔" میرے لہجے میں جو اشتیاق جھلک رہا تھا وہ مصنوعی نہیں تھا۔

"لیکن تم سب کچھ کیوں جاننا چاہتی ہو؟" اس کے لہجے میں ایک بار پھر شک در آیا۔

"اس لئے کہ شاید ہم ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "میں تم سے ایک اہم معاہدہ کرنا چاہتی ہوں۔۔۔ تمہیں ایک پیش کش کرنا چاہتی ہوں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ مجھے تمہارے متعلق سب کچھ معلوم ہو کیونکہ معاملہ بڑا نازک ہے بہرحال اگر تمہارے متعلق سب کچھ جان لینے کے بعد میں محسوس کروں گی کہ تم میرے مطلب کے آدمی نہیں ہو تو ہم نہایت دیانتداری سے سب کچھ بھول جائیں گے۔۔۔ یہ بھی بھول جائیں گے کہ اس کمرے میں ہماری کوئی ملاقات بھی ہوئی تھی ٹھیک؟"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" اس نے بھی نہایت سنجیدگی سے کچھ سوچتے ہوئے میری آنکھوں میں جھانکا۔ "تم کہہ رہی ہو کہ معاملہ نازک ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ میری کہانی میں تو کئی معاملے نازک ہیں کئی راز کی باتیں ہیں۔ میں اپنا ٹینٹوا تمہارے ہاتھ میں کیسے دے دوں؟"

"رازوں کے جاننے سے ملتے ہیں تو میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اور پھر میں کہہ تو چکی ہوں کہ اگر بات نہ بنی تو ہم اس ملاقات کو بھول جائیں گے تم غالباً بدمعاش ہو اور میں بازاری عورت۔ اگر ہم ہی عہد کی پاسداری نہیں کریں گے تو کون کرے گا؟ شرفاء نے تو یہ کاروبار کب کا چھوڑ دیا ہے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔" اس نے ایک گونج دار سا قہقہہ لگا کر کہا پھر لمحے کے لئے وہ سوچ میں ڈوب گیا پیشانی پر شکنیں ابھر آئی تھیں گویا فیصلہ نہ کر پا رہا ہو کہ بات کہاں سے شروع کرے۔ پھر اچانک ہی بولا۔ "میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے کہ تفصیل سے سب کچھ بتاؤں۔ ویسے بھی میں موٹے دماغ کا آدمی ہوں پرانی باتوں کی تفصیل مجھے یاد نہیں رہتی۔"

اس نے ایک گہری سی سانس لے کر صوفے پر پہلو بدلا اور ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔

"میرا اصل نام خوش بخش ہے۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے یک لخت کہا۔

"اور میں امرتسر کے قریب ایک گاؤں حضور پور کا رہنے والا ہوں یہ گاؤں مسلمانوں کا ہے اور زمینداری ابھی وہاں مسلمانوں ہی کی قائم ہے۔ زمین تقریباً ساری کی ساری چوہدری عاشق نامی ایک شخصیت کی ملکیت ہے۔ میرا مطلب ہے کہ سات سال پہلے جب میں وہاں سے بھاگا تھا تب تک تو اسی کی ملکیت تھی۔ آج کل کا پتا نہیں۔" اس نے ایک لمحے کے لئے خاموش ہو کر گہری سانس لی اور عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"کچھ لوگ امیر زادے ہوتے ہیں کچھ نوابزادے کہلاتے ہیں کسی کو لوگ بڑا شریف زادہ اور کسی کو اجڑا صاحبزادہ کہہ کر بلاتے ہیں لیکن میں اپنے گاؤں میں چمار زادہ مشہور تھا۔ وجہ یہ تھی کہ کسی زمانے میں میرے باپ نے کچھ عرصے کاشتکاری چھوڑ کر جوتے گانٹھنے کا کام کیا تھا۔ لیکن یہ میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے کی بات تھی۔

"جب میں نے ہوش سنبھالا تو میرا باپ پہلے ہی کی طرح چوہدری عاشق کا مزارع تھا لیکن اس کے نام کے ساتھ لفظ چمار مستقل طور پر نتھی ہو چکا تھا۔ وہ بے چارہ شریف آدمی تھا ایک دو مرتبہ اس نے دبی دبی زبان سے احتجاج کیا تو پھر وہ بھی چھوڑ دیا۔

"میرے جوان ہونے تک میرا باپ سانپ کے کاٹنے سے مر چکا تھا مگر ورثے میں مجھے چمار زادے کا خطاب دے گیا تھا جوان ہونے سے پہلے ہی میں چوہدری کے مزارعوں کی صف میں شامل ہو چکا تھا۔ باپ کی موت کے بعد بھی انہی زمینوں پر کام کرتا رہا۔ ماں میری پہلے ہی مر چکی تھی۔ اس لئے بس ایک عجیب خالی خالی اور بیکار سی زندگی تھی جو میں گزار رہا تھا۔

"ہاں یہ تو میں تمہیں بتانا ہی بھول گیا کہ میرا قد کاٹھ بچپن ہی سے غیر معمولی تھا گھر میں روپیہ پیسہ کپڑا لتا نہیں تھا مگر کھانے پینے کی چیزوں کی کمی نہیں تھی۔ بھینس بھی تھی۔ میں ڈٹ کر کھاتا تھا اور ڈٹ کر کام کرتا تھا۔ دن بھر کھیتوں میں کام کرنے اور جان توڑنے کے باوجود جسم میں کوئی بجلی سی لہریں لیتی رہتی جو بے چین کئے رکھتی چنانچہ میں اکھاڑے چلا جاتا اور اپنی عمر سے بڑے بڑے اور پختہ کار گھبروؤں سے کشتی زور آزمائی کرتا۔

"اپنی غیر معمولی طاقت کا احساس مجھے اس دن ہوا جس دن ایک آوارہ بیل نہ جانے کس ترنگ میں آ کر چنگھاڑیں مارتا اور فصلوں کو روندتا پگڈنڈی پر میرے سامنے آ کر بلکہ میرے سامنے نہیں یوں کہئے کہ اس کم عمر لیکن خوبصورت نازک سی لڑکی کے سامنے آ گیا جو میرے آگے آگے جا رہی تھی اور میں اس کی پتلی کمر پر نظر گاڑے گھر کے غلام کی طرح اس کے پیچھے چلا جا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس کی پتلی کمر کے نظارے سے دل بھرے تو تیز تیز قدموں سے آگے نکل کر اس کا چہرہ دیکھوں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کون تھی اس کا لباس بہرحال امیرانہ تھا اور اسی قسم کے رکھ رکھاؤ کی لڑکی کو میں نے پہلی ہی مرتبہ اس پگڈنڈی پر دیکھا تھا۔

پیچھے بھی بہتا جا رہا تھا اور گنڈاسا بھی تمہارے جا رہا تھا۔ ولید!" میں نے بندوق کا رخ اپنی طرف ہوتے دیکھا اور گنڈاسا چھوڑ کر نہر میں چھلانگ لگا دی۔ اپنے آس پاس مجھے پانی میں کئی گولیوں کی شپاشپ سنائی دی تاہم میں پانی کے نیچے ہی تیرتا دوسرے کنارے کی طرف بڑھتا گیا۔ نہر کا پاٹ کافی چوڑا تھا۔ اوپر آ کر میں نے سر نکال کر پیچھے دیکھا۔ چار پانچ آدمی میرے پیچھے تیرتے آ رہے تھے۔ کچھ پانی کی تہ سے نیچے بھی ہوں گے۔ بہرحال جو مجھے نظر آ رہے تھے ان میں سے تین کے ہاتھ میں بندوقیں اور گولیوں کی پیٹیاں تھیں اور بندوق والے ہاتھ انہوں نے پانی کی سطح سے بلند رکھے تھے تاکہ بندوقیں اور گولیاں بھیگنے سے محفوظ رہیں۔

دوسرے کنارے پر پہنچ کر میں جنگل میں گھس گیا۔ گولیاں اب بھی میرے تعاقب میں تھیں اور فائروں کے دھماکوں سے چرند پرند بدحواس ہو کر اپنے ٹھکانوں سے نکل کر ادھر ادھر دوڑنے یا اڑنے لگے تھے۔ پھر میں اونچی اونچی گھاس کے ایک ایسے سلسلے میں گھس گیا جہاں انہیں میرے تعاقب کے سلسلے میں سمت کا اندازہ نہ رہا۔

پھر فائرنگ کے درمیانی وقفے میں میں نے ماسٹر کے بھائی کی للکار سنی۔ "سنو! چمار کے بچے۔۔۔! اب چاہے زندگی بھر بھاگتے رہو میں پاتال تک تیرا پیچھا کروں گا۔"

بس! پھر قصہ مختصر یہ کہ میں بھاگتا رہا۔ تین سال بھاگتا رہا۔ ایک شہر سے دوسرے شہر دوسرے سے تیسرے۔ کبھی کسی سمت میں کبھی کسی سمت میں اور بالآخر بمبئی پہنچ گیا۔ اتنی دور آ کر بھی کافی دن تک مجھے خوف رہا کہ کوئی میرا تعاقب نہ کر رہا ہو، پیچھے سے مجھے گولی نہ مار دے۔ اس سے بھی زیادہ خوف مجھے پولیس سے آتا تھا۔ پولیس کے کسی سپاہی کو دیکھ کر بھی میرے پسینے چھوٹنے لگتے تھے اور میں ادھر ادھر گلیوں میں گھس جاتا تھا۔ مگر جب کافی عرصے تک کچھ نہ ہوا تو مجھے اطمینان ہو گیا۔

ایک روز میں فٹ پاتھ پر سویا ہوا تھا کہ صبح ہی صبح چار تگڑے تگڑے اچھے سے آ گئے۔ ایک نے ٹھوکر مار کر مجھے اٹھایا اور بولا۔ "کرایہ نکالو۔"

میں نے ہکا بکا ہو کر پوچھا۔ "کس چیز کا کرایہ؟"

بولا۔ "فٹ پاتھ پر رہنے کا۔ ادھر رہنا ہے تو ایک مہینے کا ایڈوانس کرایہ نکالو۔ پندرہ روپیہ۔"

میں نے مزید حیران ہو کر پوچھا۔ "فٹ پاتھ پر رہنے کا بھی کرایہ لگتا ہے؟"

اس نے میرے سوال کی پروا کیے بغیر مجھے ایک اور ٹھوکر رسید کی اور بگڑ کر بولا۔ "کام کھولی کین کرنا ہے۔ تم کو معلوم نہیں ہے جو مچھر دانیوں کی طرح کے کپڑے کی چادر دیواروں سے لگا کر ادھر فٹ پاتھوں پر ہزاروں خاندان آباد ہیں... سب کرایہ دیتے ہیں۔"

میں نے ادب سے کہا۔ "مگر بھائی! میں تو آوارہ ہوں۔ آج یہاں ہوں، کل کہیں اور

ہوں گا۔ میں نے اگر ادھر رہنا ہوا تو کرایہ دے دیتا۔"

اب اس شخص کے صبر کا پیمانہ گویا لبریز ہو گیا۔ چلا کر بولا "تین دن سے تو ہم تجھے یہاں دیکھ رہے ہیں۔ اب کرایہ ادا کرنا تجھ پر لازم ہو گیا ہے۔ ہماری طرف سے تو بھی گھر بسا، شادی کر، بچے پیدا کر، جو مرضی کر، مگر ہمیں کرایہ ضرور ادا کر۔"

میں نے گویا ایک اہم نکتے کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا۔ "مگر بھائی صاحب! سڑکیں اور فٹ پاتھ تو سرکار کے ہوتے ہیں۔ کیا تم سرکار کی طرف سے کرایہ لینے آئے ہو؟"

اس نے غصے میں پہلے سے زیادہ زور سے مجھے ایک ٹھوکر رسید کی اور پہلے سے زیادہ بلند آواز میں بولا۔ "سرکار کی ایسی تیسی! ادھر ہم خود سرکار ہیں۔"

اب بہت ہو چکی تھی۔ میں ٹھوکریں بھی کھا چکا تھا اور مجھے یہ تسلی بھی ہو چکی تھی کہ وہ سرکاری آدمی نہیں ہیں۔ چنانچہ میں نے اٹھ کر انہیں کرایہ ادا کرنا شروع کر دیا۔ گھونسوں، تھپڑوں اور لاتوں کی شکل میں۔

وہ زیادہ دیر نہیں ٹکے۔ ابھی میں نے گنتی بھی شروع نہیں کی تھی کہ بھاگ گئے۔ ان میں سے ایک نے چاقو بھی نکالا تھا مگر وہ وہیں پڑا رہ گیا۔ میں بھی وہاں سے کھسک لیا۔ اسی شام میں ایک فٹ پاتھیے ہوٹل کے چھپر تلے بیٹھا تھا کہ ایک خوش پوش آدمی سر پہ ہیٹ اور آنکھوں پر رنگین شیشوں کی عینک لگائے میرے قریب ہی بنچ پر آ بیٹھا اور سرگوشی میں مجھ سے بولا۔ "نوکری چاہیے؟ اچھے ہی پیسے ملیں گے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور غور سے اس کی طرف دیکھا۔ بظاہر وہ شریف آدمی ہی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے بدستور سرگوشی میں کہا۔ "میرے ساتھ آؤ۔۔۔ کسی شریفانہ جگہ پر چل کر بات کرتے ہیں۔"

میں اٹھ کر اس کے ساتھ ہو لیا۔ کار میں بیٹھ کر وہ مجھے کسی شریفانہ جگہ پر لے گیا۔ وہ اس کا اپنا فلیٹ تھا جہاں دو سانولی سی لڑکیاں انتہائی مختصر لباس میں موسیقی کے ایک ریکارڈ کی دھن پر تھرک رہی تھیں۔

یہ شخص "ڈون" کا خاص آدمی تھا۔ اس کے توسط سے میں بابا کے گروہ میں شامل ہوا۔ اسی نے مجھے ضروری تربیت دی، شہری زندگی گزارنا سکھایا۔ تاہم ڈون کے متعلق اسے بھی کچھ معلوم نہیں تھا۔ میری تربیت مکمل ہو گئی اور اپنے کام میں نے غیر معمولی کامیابی سے انجام دینا شروع کر دیا تو بابا کا یہ خاص آدمی اپنا فلیٹ میرے حوالے کر کے غائب ہو گیا۔ ساری چیزیں جوں کی توں چھوڑ گیا، سوائے ان دو لڑکیوں کے۔ انہیں وہ ساتھ نہ لے گیا ہوتا، چھوڑ بھی جاتا تو میرے کس کام کی تھیں؟ میری طرف تو عورت مسکرا کر بھی دیکھ لے تو میری آنکھوں میں ذرا ایک گردن کٹی لاش ابھر آتی ہے جس کے نرخرے سے بھل بھل خون ابل رہا ہوتا ہے اور اس کی وحشت سے پھٹی پھٹی ساکت آنکھیں میری

طرف ایک سوال لئے دیکھ رہی ہوتی ہیں۔۔۔ مجھے بچا نہیں سکے اور خود زندہ پھر رہے ہو بے غیرت۔

اس کے ساتھ ہی میرا جسم ٹھنڈا پڑ جاتا ہے اور میرے اندر کا آدمی مر جاتا ہے۔

چندن بابا نے خاموش ہو کر گہری سانس لی اور گویا کسی خواب سے چونکتے ہوئے بولا۔

"پہلی مرتبہ اپنی کہانی کسی کو سنائی ہے کیونکہ پہلی مرتبہ ہی کسی نے اتنی اپنائیت سے فرمائش کی ہے۔ اب تم بتاؤ تم کیا چاہتی ہو؟"

"تم نے یہ وضاحت تو کی ہی نہیں کہ گروہ میں تمہارا کام کیا ہے؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔

"اس سے پہلے میں ایک وضاحت اور کر دوں کہ یہ میرا اپنا ہی خیال ہے کہ "باس" کا کوئی گروہ موجود ہے۔ ورنہ میں نے آج تک وہ تین افراد کے سوا کسی کو نہیں دیکھا۔ ایک تو لڑکا سا ہی ہے جو "مٹھوا" میرے لئے پیغام لے کر آتا ہے۔ زیادہ تر پیغامات مجھے ٹیلی فون پر ہی ملتے ہیں۔ دوسرا وقتی باس کا خاص آدمی تھا جو بعد میں غائب ہو گیا۔ تیسرا ایک اور خاصی حد تک میری ہی طرح بگڑا آدمی ہے جس نے مجھے خنجر پستول کے نت نئے داؤ پیچ اور کار' لانچ وغیرہ چلانا سکھائی تھی۔ وہ بھی مجھے شاذ و نادر ہی نظر آتا ہے۔ باقی رہی میرے کام کی بات تو یہ بڑا لمبا چکر ہے۔ میرے کئی طرح کے کام ہیں۔ لیکن بنیادی طور پر میں وصولی کرنے والا آدمی ہوں۔ مجھے حکم ملتا ہے کہ فلاں سیٹھ کے ہاں چلے جاؤ یا فلاں بڑے تاجر کے پاس پہنچ جاؤ۔ وہ اتنی رقم لئے بیٹھا ہو گا اس سے لے کر فلاں جگہ پہنچا دو۔ بعض مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ میں رقم لینے پہنچا تو خنجر بدستوں سے مسلح کئی آدمی مجھے اپنے منتظر ملے وہاں مجھے اپنی مہارت اور طاقت دکھانی پڑی۔"

"کبھی ایسا نہیں ہوا کہ تم رقم لینے پہنچے تو متعلقہ آدمی کے بجائے تمہیں وہاں پولیس والے بیٹھے ملے ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں رقم کی وصولی کے دوران کبھی ایسا نہیں ہوا۔ البتہ ویسے پولیس سے اکثر سامنا ہوتا رہتا ہے بلکہ جہانگیر نام کا ایک ایس پی ہے' وہ تو اکثر میری ٹوہ میں رہتا ہے۔ اسے باس' اس کے نامعلوم گروہ اور میری سرگرمیوں کی کچھ سن گن مل گئی ہے۔ اس نے ایک بار مجھے بلوے کے الزام میں پکڑ بھی لیا تھا لیکن اگلے ہی روز دانت پیستے ہوئے رہا کرنے پر مجبور ہو گیا۔ تاہم اس نے منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے یہ ضرور کہا تھا۔ "چندن! کچھ دن اور عیش کر لو۔ میں کوشش میں لگا ہوا ہوں جلد ہی تمہیں اور تمہارے پالن ہاروں کو ایسی جگہ دفن کروں گا جہاں سے تم کبھی سر نہیں نکال سکو گے۔" اس شخص سے حقیقتاً مجھے خوف آتا ہے جب بھی میں اس کے شکنجے میں آ گیا اور ساتھ ہی اگر میرے ماضی میں کئے ہوئے قتل بھی سامنے آ گئے تو میں سیدھا پھانسی کے تختے پر پہنچ جاؤں گا۔ لیکن وہاں سے

میں نے جب بھی فون پر اس سلسلے میں بات کی تو اس نے اپنی دمے کے مریضوں جیسی ہنسی کے درمیان ادا کی ہے اور لاپروائی سے کہتا ہے کہ ایس پی جہانگیر جیسے نہ جانے کتنے اس کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں اور اسے پانے کے بجائے خود نجانے کہاں پہنچ جاتے ہیں۔"

"وصولی کے علاوہ تمہارا کوئی کام نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے کہا نا کہ لمبا چکر ہے۔ کبھی کبھی میں کسی لانچ پر مال کے ساتھ بطور محافظ بھی جاتا ہوں اور کیش وصول کر کے لانا میری ذمہ داری ہوتا ہے۔ کبھی مجھے کسی کارخانے یا سیاسی جلسے میں تصادم شروع کرانے کا کام بھی انجام دینا پڑتا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ تصادم شروع ہوتے ہی میں خود کھسک جاؤں اور کوئی یہ نہ جان سکے کہ فساد کی اصل وجہ کون تھا۔ کبھی مجھے حکم ملتا ہے کہ باس فلاں جگہ پر واقع فلاں دکان کو بند دیکھنا چاہتا ہے یا فلاں جگہ کوئی دکان یا مارکیٹ بند پڑی ہے اور فلاں پارٹی اس کے کھلنے کے سلسلے میں مزاحمت کر رہی ہے اسے کھلوانا ہے اور فلاں پارٹی کے حوالے کرنا ہے وغیرہ وغیرہ۔"

"اور اس کے عوض تمہیں ملتا کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سب کچھ ملتا ہے۔" اس نے گویا کر کہا۔ "میرا مطلب ہے میری ہر ضرورت پوری ہوتی ہے۔ واٹر گیٹ میں فلیٹ ہے جس میں ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔ گاڑی ہے' نوکر ہے' دکانداروں کے ہاں سے سودا سلف آتا ہے جس کا بل مجھے نہیں معلوم کون ادا کرتا ہے اور اس کے علاوہ پانچ سو روپے نقد ہر مہینے خرچہ پانی کے لئے مل جاتے ہیں۔ وہ بھی میرے لئے زیادہ ہی رہتے ہیں کیونکہ شراب نہ سگریٹ میں نہیں پیتا کسی کے کوٹھے پر میں نہیں جاتا' عورت کے قریب پھٹکنے کی مجھ میں جرات نہیں رہی۔"

"اپنی جان کو سولی پر لٹکائے رکھنے کا تمہیں بس اتنا سا صلہ ملتا ہے کہ گزر بسر اچھی ہوتی رہے۔ تم دراصل بہت سیدھے ہو چندن بابا! اور بے وقوف بن رہے ہو۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "تمہارے اس نام نہاد "باس" کا درحقیقت کوئی گروہ وغیرہ نہیں۔ گروہ تم خود ہی ہو۔ وہ صرف کوئی اعلیٰ درجے کا بلیک میلر یا فلم مین ہے جو پارٹیوں سے ڈھیر ہوئے کاموں کے معاہدے کرتا ہے۔ خود لمبی رقمیں کھینچتا ہے اور تم سے محنت مزدوری میں سارا کام لیتا ہے اور خود اس منتظر میں ہی رہتا ہے کہ کل کو برا وقت آئے تو خود غائب ہو جائے اور تم پھنس جاؤ گے۔"

"یہ بات نہیں ہے۔" چندن نے اپنے باس کی وکالت کرتے ہوئے کہا۔ "میں کئی بار پھنسا ہوں لیکن کسی غائبانہ ہاتھ نے ہی مجھے بچایا ہے۔ جو ظاہر ہے باس ہی کا تھا۔"

"یہ تو چھوٹے موٹے معاملوں میں پھنسنے کی بات ہے نا۔ کبھی کسی بڑے چکر میں پھنسو تب دیکھنا۔" میں نے کہا۔

"لیکن جہاں تک روپے پیسے کا معاملہ ہے تو اب بھی ایک طرح سے میں باس کا ایک

لاکھ روپے کا مقروض ہوں۔ میں ایک بار ایک پارٹی سے ایک لاکھ روپیہ لے کر آرہا تھا کہ رات کے وقت کچھ لوگوں نے دھوکے سے مجھے روک کر میرے سر پر کوئی چیز مار کر مجھے بے ہوش کر دیا اور روپیہ لے اڑے۔ باس کو میں نے یہ بات بتائی تو اس نے صرف ایک لمحے کے لئے فون پر خاموشی اختیار کی پھر کہنے لگا روپے کی کوئی بات نہیں ..... غنیمت یہ ہے کہ تمہاری جان بچ گئی۔ پھر اس نے ہنستے ہوئے کہا..... ویسے اب تم میرے ایک لاکھ کے مقروض ہو گئے ہو کیونکہ یہ رقم تمہاری بے وقوفی اور بے احتیاطی سے ضائع ہوئی ہے۔ بہرحال اب تم میرا ساتھ چھوڑنے کا خیال بھی دل میں نہ لانا ورنہ میں نے تمہارے بعض کارناموں کے جو تصویری ثبوت محفوظ رکھے ہوئے ہیں ان کی بدولت تم باقی زندگی جیل میں ہی گزار دو گے۔ بات ختم" باس نے اس لئے جتائی بھی کہ کچھ عرصہ پہلے میں کسی بات پر روٹھ کر کہہ چکا تھا کہ یہ دھندے میرے بس کی بات نہیں اور میں اب انہیں ترک کر کے کوئی شریفانہ کام کروں گا۔"

"میں اب بھی یہی کہوں گی چندن بابا کہ تم بے حد سیدھے انسان ہو..... اور باس جیسے شاطر آدمی کو تمہاری رفاقت میسر آجانا بلاشبہ اس کی خوش قسمتی کی دلیل ہے" میں نے کہا۔ "تمہیں شاید یہ شبہ تک نہیں گزرا ہو گا کہ تمہارے قبضے سے روپیہ چھینا جانا دراصل باس ہی کی چال بھی ہو سکتی ہے۔ تمہیں اپنا ممنون احسان کر کے ہمیشہ کے لئے زیر دام رکھنے کی غرض سے۔"

اس کی چوڑی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ وہ کم از کم ذہن پر زور دینے کے لئے تو تیار ہو گیا تھا۔ "ہو سکتا ہے۔" چند لمحے بعد بالآخر اس نے قدرے نیچے میں کہا۔ "مگر تم یہ ساری باتیں کیوں کر رہی ہو؟"

"میں تمہیں اس سے بہتر زندگی کی پیشکش کرنا چاہتی ہوں جس میں تمہارا بھی فائدہ ہے اور میرا بھی۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "آخر تم کب تک اس غیر یقینی اور خطرناک انداز سے زندگی گزارتے رہو گے؟ کب تک خوف و ہراس اور ہنگاموں سے الجھتے رہو گے؟ کبھی تمہیں کوئی حادثہ بھی پیش آسکتا ہے..... کسی تصادم میں تمہیں بھی کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ انسان تمام عمر جوان تو نہیں رہتا۔ بالفرض تم اپنے کسی عضو سے محروم ہو جاؤ اور لڑنا بھڑنا تو درکنار روزمرہ کے معمولات میں ہی دوسروں کے محتاج ہو جاؤ' تو کیا تمہیں یقین ہے کہ تب بھی تمہاری گزر بسر اسی طرح ہوتی رہے گی؟ تمہیں اسی طرح آنکھوں پر بٹھایا جاتا رہے گا اور تمہارے ہاتھوں زک اٹھانے والوں میں سے کوئی تم سے حساب برابر کرنے نہیں آئے گا؟"

"یہ سارے خطرات تو بجا ہیں لیکن بہرحال انسان کو کسی نہ کسی طرح زندگی گزارنی ہی ہوتی ہے اور خطرات سے تو کوئی بھی محفوظ نہیں۔ اچھا بھلا شریف اور امن پسند انسان راہ

چلتی کسی گاڑی سے ٹکرا کر مر جاتا ہے۔ عمارتیں گرنے یا آتشزدگی کے حادثوں میں کتنے انسان مر جاتے ہیں۔ موت تو ایک دن آنی ہی ہے۔" چندن نے فلسفہ پیش کیا۔

"احمقانہ سی بات ہے۔" میں نے بلا تامل کہا۔ "اگر سب تمہاری طرح سوچنے لگیں تو سب چور ڈاکو اور قاتل بن جائیں کہ موت تو ایک دن آنی ہی ہے کیوں نہ جی بھر کے ہنگامے مچا لیں۔ لیکن یہ جو دنیا کے ننانوے فیصد افراد پرسکون اور بے خطر زندگی کے لئے کوشاں رہتے ہیں کیا یہ سب پاگل ہیں؟ حادثوں میں مرجانا اور بات ہے لیکن حادثے کی موت میں بھی انسان کی موت اور کتے کی موت میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے۔ آپ بے شک حادثاتی طور پر مر جائیں لیکن کوئی تو آپ کو اچھے لفظوں میں یاد کرنے والا دنیا میں باقی رہے، کوئی تو ہو جو آپ کا ذکر احترام سے کرے' کوئی تو ہو جسے آپ کی موت کا دکھ ہو۔ یہ بھی ایک بہت بڑی انسانی ضرورت ہے لیکن عموماً ہمیں اس کا احساس تاخیر سے ہوتا ہے۔ کبھی وقت ایسا ضرور آئے گا جب تمہیں میری باتیں یاد آئیں گی لیکن اس وقت شاید تاخیر ہو چکی ہو اور تمہیں میرے جیسی پیشکش کرنے والا کوئی نہ ملے۔"

"تم بتاؤ تو سہی آخر چاہتی کیا ہو؟ انکار یا اقرار تو بعد کی بات ہے سوچ کر بھی جواب دیا جا سکتا ہے۔" چندن بابا نے کہا۔

"میرا ایک بیٹا ہے ابھی چھوٹا ہے نا سمجھ ہے۔" میں نے سر جھکا کر دھیمے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "میں نہیں چاہتی کہ وہ یہاں اس ماحول میں ہوش سنبھالے بلکہ میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ اسے معلوم ہو سکے کہ وہ ایک بازاری عورت کا بیٹا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میں اسے ہر اعتبار سے ایک طاقتور انسان بنانا چاہتی ہوں۔ میرے ذہن میں تجویز یہ ہے کہ میں اسے بمبئی سے دور کسی اور شہر میں منتقل کر دوں۔ اس کے کام کاج اور نگہداشت کے لئے ایک گورنس موجود ہو گی۔ اس کے علاوہ مجھے اس کی تربیت اور حفاظت کے لئے تم جیسے ایک شہ زور کی ضرورت ہو گی جو بچپن سے ہی اسے ایک خاص نہج پر تربیت دے اور دل سے اپنی نگرانی میں اس کی پرورش کرے۔ اپنی اولاد کی طرح لگن اور محبت سے اپنی شہ زوری کا سارا اثاثہ اس میں منتقل کر دے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟ اس مقصد کے لئے تمہیں میری پیشکش یہی ہے کہ میں تم لوگوں کو یعنی اپنے بیٹے، گورنس اور تمہارے لئے کسی اور شہر مثلاً" پونا میں کسی خوبصورت اور پرسکون علاقے میں بنگلہ لے دوں گی۔ سب اخراجات میرے ذمے ہوں گے۔ جیب خرچ کے لئے تمہیں اب پانچ سو ماہانہ ملتا ہے اس سے چھ سو لے لینا اور اصل اہمیت ان چیزوں کی نہیں ہے بڑی بات تو یہ ہے کہ وہ ایک پرسکون اور شریفانہ زندگی ہو گی۔ تمہیں روز روز لوگوں سے لڑنے جھگڑنے اور خطرناک کاموں میں ہاتھ ڈالنے کے لئے نہیں جانا پڑے گا کوئی پولیس والا تمہاری ٹوہ میں نہیں رہے گا۔ اپنی نیند سوؤ گے اور اپنی مرضی سے جاگو گے۔ کوئی تم پر حکم چلانے والا نہیں ہو

گا۔ البتہ تمہارے ہر آڑے وقت میں کام آنے کے لئے میں موجود ہوں گی۔ اس تجویز کی مزید تفصیلات بھی ہم طے کر لیں گے۔ بہرحال تم صرف یہ بتاؤ کہ بات تمہارے دل کو لگتی ہے یا نہیں۔۔؟"

"دل کو تو لگتی ہے۔" اس نے کچھ سوچ کر کہا۔ "لیکن میں ابھی کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ مجھے اس پر کچھ غور کرنے کی مہلت دو حالانکہ میں غور و فکر کرنے والا آدمی نہیں ہوں لیکن یوں اچانک تم سے ملاقات ہونے اور اس طرح بے ساختہ یہ ساری باتیں ہونے کے بعد میری عقل کچھ الجھ کر رہ گئی ہے۔ دوسرے جس طرح کی زندگی گزار رہا ہوں شاید یہ مجھے راس آگئی ہے میں اس میں رچ بس گیا ہوں۔ اس سے نکلنے کا سوچتے ہوئے مجھے بڑا عجیب سا لگتا ہے اس میں مجھے بڑا مزہ آتا ہے۔"

"میرے بتائے ہوئے ڈھنگ سے زندگی گزارو گے تو کچھ دن بعد تمہیں وہ اچھی راس آئے گی کہ بعد میں آج کل کے زمانے کی باتیں سوچو گے تو کراہت آئے گی جب تم ایک ننھے اور معصوم بچے کی محبت میں رہو گے اور ابتداء سے اس کی پرورش اور تربیت کرو گے تو تمہیں محسوس ہو گا کہ تمہاری زندگی کا کچھ مقصد ہے' تم کچھ تخلیق کر رہے ہو۔ تمہیں پہلے سے زیادہ مزہ آئے گا۔"

"تمہاری باتیں مجھے بڑی درست اور اچھی لگ رہی ہیں خاتون۔ لیکن بہرحال مجھے کچھ مہلت دو۔ ایسے اہم معاملات دو اجنبیوں کے درمیان اتنی جلدی تو طے نہیں پاتے۔ گو کہ تم مجھے اتنی اجنبی نہیں لگ رہیں۔ تمہاری شخصیت میں کوئی سحر ہے جبھی میں نے یوں بلاجھجک و جھجک تمہیں اپنی ساری زندگی کی کہانی سنا ڈالی۔ بہرحال جیسی کی شہری زندگی میں میں نے جہاں اور بہت کچھ سیکھا ہے وہاں یہ بھی سیکھا ہے کہ جب کسی معاملے میں انسان الجھن میں پڑ جائے تو اسے فوری طور پر فیصلہ کرنے کے بجائے بات کسی اور وقت پر ٹال دینا چاہیے۔ چنانچہ میں کسی اور وقت آکر جواب دوں گا۔ اب میں چلتا ہوں۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے مزید کچھ نہ کہا اور اس کے ساتھ سیڑھیوں تک آئی۔ پہلی سیڑھی پر قدم رکھنے سے پہلے وہ مڑا اور گہری سنجیدگی سے بولا۔ "تم سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے مدت بعد ایک شریف عورت سے ملاقات ہوئی بھی تو کہاں بالاخانے میں۔" پھر وہ بڑی ملامت سے مسکرایا۔ اب وہ ایک قطعی بدلا بدلا سا آدمی لگ رہا تھا۔ مہذب شائستہ اور نرم خو۔

"اتنی گہری گفتگو ہونے کے باوجود مجھے تمہارا نام اب تک معلوم نہیں ہو سکا خاتون!" اس نے ایک سیڑھی اتر کر کہا۔ اب بھی اس کا قد مجھ سے اونچا لگ رہا تھا جب کہ میں خود بھی کم قد و قامت کی عورت نہیں تھی۔

"مجھے عزیزہ خانم کہتے ہیں۔" میں نے اسے بتایا۔

"میری اس بازار میں کچھ زیادہ آمدورفت تو نہیں اس لئے مجھے یہاں کے معاملات میں کچھ زیادہ تجربہ نہیں۔" اس نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ "لیکن میں یقین سے اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ تم اس بازار کی مخلوق نہیں لگتیں۔ عزیزہ خانم! تمہاری ذات کے پیچھے بھی یقیناً کوئی طویل اور انوکھی داستان ہو گی۔ میں جب دوبارہ آؤں گا تو تم سے اس کہانی کے سننے کی فرمائش کروں گا۔ خدا حافظ۔" وہ رخصت ہو گیا۔

مجھے توقع تھی کہ وہ جلد دوبارہ آئے گا۔ اقرار کرنے کے لئے نہ سہی' انکار ہی کرنے۔ اس نے وعدہ بھی کیا تھا۔ مگر وہ نہ آیا۔ ڈھائی ماہ گزر گئے۔

میں اس کی طرف سے مایوس ہو گئی اور اس کی آمد کی آس چھوڑ بیٹھی اور اسی ناامیدی میں میری تشویش' اضطراب اور بے چینی انتہا کو پہنچ گئی۔ مائیں اپنے لڑکوں کو ہوش سنبھالتے اور بڑھتے دیکھ کر خوشی سے پھولی نہیں سماتیں لیکن میں تمہیں اکثر اسی طرح ویران نظروں سے دیکھا کرتی تھی جیسے تم میری وہ بیٹی ہو جس کی جوانی ڈھلتی جا رہی ہے اور کوئی رشتہ نہیں آرہا۔ میرا دل بیٹھا سا جاتا تھا۔

پھر ایک روز جبکہ بازار کی رونق دم توڑ چکی تھی۔ لڑکیاں اپنی اقامت گاہوں میں جا چکی تھیں اور سب سے آخر میں رات کے پچھلے پہر میں بالاخانے کی سیڑھیاں اتر رہی تھی کہ گلی کی روشنی میں ایک چوڑا چکلا ہیولا سا اوپر آتا دکھائی دیا۔ وہ کمبل میں لپٹا ہوا بھاری بھرکم آدمی تھا جس نے اپنے چہرے کا بیشتر حصہ بھی بظاہر لاپروائی سے مگر درحقیقت نہایت سوچے سمجھے طریقے سے چھپا رکھا تھا تاکہ کوئی اسے پہچان نہ پائے۔ مگر میں نے اسے دور سے ہی پہچان لیا تھا اس لئے مجھے کوئی خوف محسوس نہ ہوا۔ بوڑھی خادمہ میرے ساتھ تھی میں نے اس سے کہہ دیا کہ وہ گھر چلی جائے۔ میں اس شخص سے بات کر کے آؤں گی۔

میرے قریب پہنچ کر چندن بابا نے چہرے سے کمبل ہٹا دیا۔ "تم نے مجھے پہچان لیا نا؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"دور سے ہی پہچان لیا تھا۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "مگر یہ مصیبت پڑی ہے جبھی آئے ہو ورنہ اپنے وعدے پر تو نہیں آئے۔"

"میں تم سے شرمندہ ہوں۔ میں بہت الجھا ہوا تھا۔" وہ ایک بار پھر گویا کسی الجھن کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے مسکرایا۔ "ویسے تم نے کیسے جانا کہ میرے سر پر مصیبت پڑی ہے؟"

"میں تو پھر بھی ایک جہاندیدہ عورت ہوں چندن بابا میں نے کہا۔ اس وقت تمہیں دیکھ کر کوئی عقل کا اندھا بھی کہہ سکتا ہے کہ تم کسی پریشانی میں مبتلا ہو۔"

"بہت بڑی پریشانی میں۔" اس نے تسلیم کیا۔ "کیا ہم یہاں سیڑھیوں ہی میں کھڑے باتیں کرتے رہیں گے؟"

میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ اسے گھر لے جاؤں پھر بہتر یہی سمجھا کہ پہلے بیٹھ

اپنے اس مقصد حیات کی تکمیل کے نتے میں نے جو کچھ سوچ رکھا تھا اس پر عملدرآمد کا آغاز ہو چکا تھا۔ چند دن بعد تمہارا معصوم سا ذہن بھی نئے ماحول سے مانوس ہو گیا اور میری بے قراری کو بھی قرار آگیا۔ چندن بابا بھروسے کا آدمی ثابت ہوا تمہاری پرورش بالکل اسی انداز میں ہو رہی تھی جس طرح میں چاہتی تھی۔

ہوش سنبھالنے کے بعد کی باتیں تو تمہیں بھی یاد ہوں گی منصورا جن دنوں میں یہ واقعات قلمبند کر رہی ہوں' تم دس سال کے ہو چکے ہو۔ تمہاری اٹھان دیکھ کر میرا رواں رواں مسرت سے نہال ہو جاتا ہے لیکن گزرے ہوئے ان آٹھ' دس برسوں نے اندر ہی اندر نہ جانے کیا ستم ڈھایا ہے کہ اپنا وجود مجھے کھوکھلا' کھوکھلا سا محسوس ہونے لگا ہے۔ سینے میں درد کی شکایت رہنے لگی ہے رقص بھی میں نے ترک کر دیا ہے ویسے بھی اس بازار میں عورت کا شباب پانچ سات سال سے زیادہ نہیں رہتا۔

اب نہ جانے کیوں مجھے دھڑکا سا لگا رہتا ہے کہ خبر نہیں زندگی کسی موڑ پر دغا دے جائے' کوئی حادثہ پیش آ جائے۔

اسی لئے میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر اپنی یہ داستان لکھنی شروع کر دی تھی ورنہ یہ سب کچھ ایک خاص وقت میں میں نے بہ زبان خود تمہیں سنانا تھا لیکن جیسا کہ میں پہلے بھی خیال ظاہر کر چکی ہوں کہ ایک لحاظ سے اسے لکھنا ہی زیادہ بہتر تھا زبانی شاید میں یہ سب کچھ اس طرح من و عن بیان نہ کر پاتی اور اس کے کئی پہلوؤں کی سنگینی کو تم صحیح طور پر محسوس نہ کر پاتے اور یوں تمہاری شدت انتقام میں کچھ کمی آ جاتی۔

میرے ذہن میں تمہارے مستقبل کا نقشہ یہ ہے کہ تم ہر اعتبار سے ایک غیر معمولی انسان ہو اور تمہاری طبیعت مجموعہ اضداد ہو۔ تم میں شیر کی سی طاقت اور خونخواری بھی ہو اور لومڑی کی سی عیاری اور مکاری بھی۔ تمہارا اشتعال اور غیظ و غضب مخالفوں کا سینہ چاک کر کے رکھ دے اور جہاں مصلحت کا تقاضا ہو وہاں تمہاری سرد مزاجی ہمالیہ کی برف پوش چوٹیوں کی یخ بستگی کو بھی مات کر دے۔ تم انتہائی حکمت و ذہانت سے بھی مالا مال ہو اور خدا بے خوفی و شجاعت سے بھی۔ تمہارے اندر چھپکلی کی سی تیزی اور کھردرا پن بھی ہو ربڑ کی سی لچک بھی تاکہ ہر طرح کے حالات میں باعمل جاؤ ڈٹ جاؤ ہر آزمائش سے گزر جاؤ۔

اس طرح کی چند متضاد خصوصیات اگر ایک انسان میں جمع ہو جائیں تو اس کے سامنے بڑے بڑے لشکر بھی ہیچ ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی ذات میں خود ایک بہت بڑا لشکر ہوتا ہے۔ اس طرح کا انسان قدرت ہی چاہے تو پیدا کر سکتی ہے۔ لیکن اگر قدرت کے کچھ اصولوں کو مدنظر رکھا جائے تو خود انسان کی کوشش بھی بڑے بڑے کرشمے دکھا سکتی ہے۔ میں تمہیں ایسا ہی بے مثال انسان بنانا چاہتی ہوں منصورا اور اگر میں زندہ رہی تو اس ناممکن کو ممکن

کر دکھاؤں گی۔

میں تمہیں کسی بھی اعتبار سے کمزور نہیں رہنے دوں گی جب تم تربیت کی اس منزل پر پہنچ گے جو میری نظر میں ہے تو میں ایک اور طاقت بھی تمہیں مہیا کروں گی۔ جس کے بغیر دنیا میں طاقتور کہلانے کا تصور مکمل نہیں ہوتا اور وہ طاقت ہے دولت! میں تمہیں بے اندازہ تو نہیں لیکن اتنی دولت ضرور مہیا کروں گی کہ ضرورت پڑنے پر تم ہمت سے انسانوں کے ضمیر بھی خرید سکو گے اور اس کے بعد بھی تمہارا ہاتھ تنگ نہیں ہو گا۔ اپنی دہائی میں میں نے تمہارے لئے ایک چھوٹا سا خزانہ محفوظ کر رکھا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس خزانے میں اضافہ ہی ہوتا جائے گا اسی لئے میں نے اب تک بازاری بنے رہنا قبول کر لیا ہے لیکن یہ سب کچھ تو میری اپنی منصوبہ بندی ہے ناممکن ممکن ہے کہ میرے بے عنوان سے اندیشے درست ثابت ہو جائیں۔ کوئی حادثہ پیش آ جائے تمہیں مکمل اور وقت پر میری حقیقت کا علم ہو جائے اور تمہارا ردعمل نہ جانے کیا ہو ممکن ہے جس وقت تم اپنی آنکھوں میں بیشتر سوال لئے میرے سامنے آ کھڑے ہو اس وقت باتیں کرنے کی مہلت ہی نہ ملے حالات یا زندگی اتنا موقع ہی نہ دے تب تم از کم میں اپنے بیٹے کا یہ بوجھ تحریر کی شکل میں تمہیں سونپ تو سکوں گی۔

بیٹے! یہ بھی ممکن ہے کہ میں تمہیں وہ نہ بنا سکوں جو میں چاہتی ہوں میرا مشن ادھورا رہ جائے۔ تمہاری ذات کی تکمیل نہ ہو سکے میرا تراشا ہیرا نہ بن سکے لیکن اس صورت میں بھی اسے میری التجا سمجھو' میرا حکم سمجھو یا اپنا فریضہ کہ تم میری بربادیوں کا انتقام ضرور لو گے۔ میں تمہاری ماں ہوں اور میرے ساتھ جو کچھ ہوا وہ میں نے بلا کم و کاست تمہیں بتا دیا۔ اب یہ فیصلہ میں تم پر چھوڑتی ہوں کہ یہ سب کچھ جاننے کے بعد تمہارے انتقام کی حدیں کہاں تک پہنچنی چاہئیں۔ اس کا آغاز کہاں سے ہونا چاہیے اور انجام کی صورت کیا بننی چاہیے۔

میں اتنا ضرور کہوں گی کہ جوش سے زیادہ ہوش سے کام لینا۔ باپ کی طرح پہلی پرواز میں ہی کچھ نہ گنوا لینا اور تمہارے انتقام کی صورت خواہ کچھ بھی ہو لیکن اس کہانی کو دنیا میں ایک مثال بنا جانا کہ آئندہ کوئی بھی طاقتور کسی کمزور کو پاؤں تلے کچلتے وقت ایک بار ضرور یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ شاید کل اسے اسی دنیا میں اپنی خباثت کا حساب دینا پڑ جائے۔ اس کے سامنے تمہارے انتقام کی کہانی کی ایک مثال ضرور موجود ہو کہ اس کی روح کانپ اٹھے۔

اس کے علاوہ مجھے تم سے کچھ نہیں کہنا' کچھ نہیں مانگنا' میں نے اپنی زندگی میں تمام تکلیفیں اپنی جان پر سہی ہیں اور تم پر بھی کوئی آنچ نہیں آنے دی لیکن اب جو کام تمہارے ذمے لگا رہی ہوں اس میں شاید تمہیں بے شمار صعوبتیں اٹھانی پڑیں۔ اب یہ

www.paksociety.com

تمہاری مرضی ہے کہ صعوبتوں کی یہ راہ اختیار کر کے دوسری دنیا میں ماں کے سامنے سرخرو پہنچو یا آرام و آسائش کی زندگی گزار دو اور بے غیرت کہلاؤ۔

آخر میں دو اہم باتیں اور بتاتی چلوں۔ میں نے اپنی جس جمع پونجی کا ذکر کیا ہے وہ پتا میں تمہارے مکان ہی میں موجود ہے۔ باغ میں فوارے کے لئے جو چھوٹا سا تالاب بنایا گیا ہے اسے جان بوجھ کر ادھورا چھوڑ دیا گیا ہے اور اس میں پانی پہنچانے کا بندوبست بھی نہیں کیا گیا۔ اس میں لگے ہوئے فوارے کو گھما کر نکالو گے تو نیچے ایک خانہ نظر آئے گا۔ اس میں وہ سوئچ موجود ہے جسے دبانے سے نیچے موجود فولادی چادر سرک جائے گی اور واٹر پروف تجوری نظر آنے لگے گی۔

○

بیٹھنے کا موقع دیئے بغیر ہڑپ کر سکتا ہے۔ ان مگرمچھوں پر غالب آنا ہے تو بال برابر فاصلہ طے کرتے وقت بھی آنکھیں کھلی رکھو اور جذباتیت کا خانہ اپنے دل سے نکال دو۔

جب میں نے اس فارمولے پر عمل کرتے ہوئے سوچا تو مجھے روپا سے اپنی کچھ دیر پہلے کی گفتگو بڑی بے جواز سی محسوس ہوئی۔ آخر میں یوں منہ اٹھا کر کہاں جانا چاہتا تھا اور کیا کرنا چاہتا تھا؟ میں نے سوچا مجھے کوئی لائحہ عمل بنا کر چلنا چاہئے اور اس کے لئے وقت درکار تھا۔۔۔ اس دوران روپا سے وابستہ رہنے میں کوئی حرج نہیں تھا... اور اسی دوران کسی تدبیر سے اگر جلد از جلد روپا کے دشمنوں پر بھی ہاتھ ڈالا جا سکتا تو اور بھی بہتر تھا۔

ان سے نمٹنے کے بعد بہرحال میں روپا کی طرف سے بے فکر ہو کر کہیں بھی جا سکتا تھا اور اس کے لئے بہرحال میرے دل میں نرم گوشہ موجود تھا' خواہ میں کتنا ہی غیر جذباتی ہو کر سوچتا۔۔۔ اسے میں کم از کم ناگہانی اور دوسروں کی مسلط کردہ موت میں گرفتار چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا۔

اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد میں نے اپنے آپ کو بے حد پر سکون اور پر اعتماد محسوس کیا۔ حتّیٰ کہ اسٹوڈیو میں پہنچنے کے بعد دوپہر کو کھانے کے وقفے میں جب روپا سے میری دوبارہ ملاقات ہوئی اور ہم پروڈکشن کے دوسرے آدمیوں کی ساتھ ذرا ستانے کے لئے بیٹھے تو میرا موڈ اس حد تک خوشگوار ہو چکا تھا کہ میں نے انہیں کئی لطیفے بھی سنائے۔

کسی کو نہیں معلوم تھا کہ میں نے کتنے بھیانک شعلوں کو بجھی کے آبشار تلے دفن کر دیا ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ میرا ایک نیا جنم شروع ہو گیا ہے۔ ایک اصلاح شدہ جنم' جس میں میں اپنی بہت سی خامیوں اور فطری خصائل پر غالب آچکا تھا یا پھر میری شخصیت پر ایک اور ہی شخصیت کا خول چڑھ چکا تھا۔ پرانا منصور اس میں مقید ہو چکا تھا اور اس کی سلگتی مدوج کا دھواں اندر ہی اندر گھٹ کھا رہا تھا' شعلے طاقت پکڑ رہے تھے اور آگ کا ایک سمندر تخلیق کر رہے تھے جو ایک حقیر سے کوزۂ جاں میں بند تھا۔

روپا میری شگفتگی پر سب سے زیادہ خوش تھی۔ بات بات پر ہنسی سے اس کی آنکھوں میں پانی آئے جا رہا تھا۔ میری صبح کی "گفتگو کو غالباً" اس نے میری نوجوانی کے کسی ناپختہ جذباتی تغیر کا مظاہرہ سمجھ کر بھلا دیا تھا اور پہلے سے تعلق خاطر کی فضا میں گہری گہری سانسیں لینے کی کوشش کر رہی تھی۔

اسٹوڈیو سے واپسی پر ہمیں کافی تاخیر ہو گئی... کشمیر میں پکچرائز کئے گئے چند مناظر میں روپا کا ڈبنگ کا کام باقی تھا وہ کچھ طول کھینچ گیا... اور ہم نائٹ شفٹ کے اختتام سے ذرا پہلے ساڑھے بار بجے کے قریب اسٹوڈیو... کے ریکارڈنگ روم سے نکلے۔

کار میں بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کرنے سے پہلے میں نے لیور دبا کر کنور ٹیبل شیورلیٹ کی کینوس کی چھت کھول دی۔ حالانکہ موسم میں ابھی خنکی تھی۔

"اسے کیوں کھول دیا تم؟" روپا نے غیر ارادی سے انداز میں اپنے جھالر دار لبے سے لبادے کو زیادہ احتیاط سے جسم کے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔ "مجھے سردی لگے گی۔"

"کوئی بات نہیں" میں نے اگنیشن میں چابی گھماتے ہوئے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ "تمہاری گاڑی کے تو کمپارٹمنٹ میں بھی وہسکی اور برانڈی کے پوے موجود رہتے ہیں۔ ایسی صورت سے نمٹنے کے لیے... ویسے آپس کی بات ہے... سردی کچھ ایسی زیادہ بھی نہیں۔ یہ بمبئی ہے شملہ، مسوری یا کشمیر تو نہیں۔"

گاڑی گیٹ سے نکل کر پرائیویٹ روڈ عبور کر کے بڑی سڑک پر آئی تو روپا نے بچوں کی طرح بغلوں میں ہاتھ دے لیے۔ "دیسے تمہارا کوئی نہ کوئی مقصد ہے ضرور، چھت کھول کر چلنے کا۔ تم مجھے بتاؤ یا نہ بتاؤ۔" چند لمحے بعد اس نے مضافاتی سڑک پر ادھر ادھر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

"ہاں!" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ جنہیں تمہاری جان کی ضرورت ہے انہیں راہ چلتے بھی تمہاری شناخت میں دشواری پیش نہ آسکے۔" میری خواہش ہے کہ یہ قصہ جلد از جلد ختم ہو۔ چوہے بلی کا یہ کھیل آخر کب تک جاری رہے گا؟"

"گویا اب تمہاری کوشش یہ ہے کہ وہ لوگ مجھے دیکھیں اور جلد از جلد یہ قصہ پاک کر دیں تاکہ تمہاری جان چھوٹے؟" اس نے مجروح سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں اندازہ نہیں کر سکا کہ اس کا یہ انداز اداکاری کا کمال تھا یا حقیقت کا مظہر۔

"نہیں۔" میں نے قدرے ترمیم سے کہا۔ "میری کوشش ہے کہ وہ لوگ جلد از جلد تمہیں کہیں دیکھ کر سامنے آجائیں تاکہ میں جلد از جلد ان کا قصہ پاک کروں۔" آخری الفاظ کہتے وقت نہ جانے کیوں میرے دانت بھنچ کر رہ گئے۔

"اوہ منصور! تم یکایک کتنے بدلے بدلے لگے ہو اور اپنی عمر سے کچھ بڑے بھی۔" میں روپا کی حیرت بھری آواز سن کر اس کی طرف دیکھا وہ قدرے پھیلی پھیلی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس عالم میں وہ بہت معصوم دکھائی دینے لگی تھی۔ میں نے مسکرانے کی کوشش کی تاکہ میرے جبڑوں کے تنے ہوئے عضلات معمول پر آجائیں۔ میری کوشش غالباً کامیاب رہی۔ کیونکہ میں نے روپا کو اطمینان کی ایک گہری سانس لیتے سنا۔ میرا چہرہ اس وقت تک تاریکی کی زد میں آچکا تھا۔ کیونکہ ہم ایک الیکٹرک پول کی روشنی کے ہالے سے نکل چکے تھے... اور دوسرے کی روشنی کی حدود میں داخل ہونے والے تھے۔

ایک لمحے کی تاریکی گزر جانے کے بعد میں نے دوبارہ روپا کی طرف دیکھا۔ وہ اب سیٹ سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی اور اس کے کھلے سیاہ بال دور تک ہوا میں لہرا رہے تھے۔ پھر پھڑپھڑاہٹ سے تنگ آکر اس نے انہیں سمیٹ کر جوڑا بنا لیا۔ میں کن

انکھیوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور میرے خیال میں وہ ہرگز میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی مگر نہ جانے کیونکر اس نے میری دزدیدہ نگاہی کو محسوس کر لیا اور دھیرے سے بولی۔ "آگے چوراہا آرہا ہے اور وہاں سے اس وقت دودھ کے ٹرک گزرتے ہیں... اگر مارنا ہی ہے تو کسی اچھی سی چیز سے ٹکرا کر مارنا... دودھ کے ٹرک سے ٹکرا کر مرنا تو نہایت غیر رومانی سی حرکت ہوگی۔"

میں محتاط ہو کر ڈرائیو کرنے لگا۔

اس رات بلکہ اس کے کئی دنوں بعد تک کوئی واقعہ پیش نہ آیا۔ اب مجھے اکتاہٹ سی ہونے لگی۔ اس سے پہلے مجھے روپا کے ساتھ برتے ہوئے شب و روز کی یکسانیت کا اس بری طرح احساس نہیں ہوا تھا اس دوران کوئی آؤٹ ڈور شوٹنگ بھی نہیں آئی تھی کہ کچھ تبدیلی کا احساس ہوتا۔

ایک روز ہم اسٹوڈیو سے واپس آئے تو ہال میں ٹیلی فون کے پاس رکھی ہوئی پیغامات کی کتاب میں ملازمہ کا نوٹ کیا ہوا ایک پیغام نظر آیا جو ضروری پیغامات کے خانے میں تھا۔

"چار بج کر تیس منٹ پر کنور میسوری آف نیپال کا فون آیا تھا وہ امیسڈر ہوٹل ڈی لکس سویٹ نمبر چودہ سو دس میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ جیسے ہی آپ آئیں انہیں فون کر لیں۔"

یہ پیغام دن کی ملازمہ کا نوٹ کیا ہوا تھا اور وہ جا چکی تھی۔ روپا نے باقی پیغامات پر بھی سرسری سی نظر ڈالی اور کہا۔ "میں کپڑے بدل لوں پھر دیکھتے ہیں یہ کنور میسوری آف نیپال کون ذات شریف ہیں۔"

یہ ہمارا معمول تھا کہ اسٹوڈیو سے واپسی پر ایزی ہونے کے بعد پہلے ہال میں بیٹھ کر چائے پیتے تھے۔ اس دوران روپا ضروری ٹیلی فون کرتی تھی۔ میں تازہ دم ہو کر نیچے آیا تو روپا مجھ سے پہلے ہال میں پہنچ چکی تھی۔ وہ فون کے قریب ایزی چیئر پر بیٹھی تھی اور اس کے سامنے تپائی پر چائے رکھی تھی۔ وہ گود میں کچھ کاغذات رکھے انہیں الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ "ایک تو اس شیلا کی بچی نے ابھی تک مجھے نئے معاہدوں کی فائل ہی بنا کر نہیں دی۔" وہ ایک نظر میری طرف دیکھ کر بڑبڑائی۔ "مجھے تو سیکریٹری رکھنے کا کوئی فائدہ ہی نہیں ہے۔"

"تمہیں اس نام نہاد منیجر کو رکھنے کا اب تک کیا فائدہ ہوا ہے۔" میں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ دوسری ایزی چیئر پر بیٹھ گیا۔ اس نے کاغذات سمیٹ کر تپائی پر رکھے اور ایک نظر میری طرف دیکھ کر چائے کی ٹرے اپنی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔ "یہ تو کوئی میرے دل سے پوچھے۔"

چائے پینے کے بعد میں نے کپ تپائی پر رکھا تو روپا بولی۔

"ذرا فون کر کے دیکھو تو سہی یہ کنور میسوری کون ہے اور کیا چاہتا ہے میں نے تو اس سے پہلے کبھی یہ نام نہیں سنا۔"

میں نے ڈائریکٹری میں امبیسڈر کا نمبر دیکھا اور سوئٹ نمبر چار سو دس سے رابطہ قائم کیا۔ ایک کھردری سی مردانہ آواز نے ہیلو کہتے ہی پوچھا۔ "آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟"

"کنور میسوری سے۔" میں نے پروقار لہجے میں کہا۔

"آپ کا اسم گرامی؟" دوسری طرف بولنے والا کچھ سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"میں میڈم روپا کا منیجر ہوں.... میرے خیال میں آپ کے لئے اتنا ہی جان لینا کافی ہے.... آپ کی تعریف؟" میں نے پوچھا۔

"میں کنور میسوری کا سیکریٹری ہوں.... میں ابھی ان سے آپ کی بات کراتا ہوں۔ ایک منٹ ہولڈ کیجئے۔" میں نے اس کے لہجے میں دبا دبا سا جوش محسوس کیا۔ سکوت چھا گیا۔ پھر خاصے فاصلے پر جیسے کوئی دروازہ کھلا اور بند ہوا۔ چند لمحے بعد ایک بھاری بھرکم آواز ابھری۔

"ہیلو.... مسٹر منیجر!" کنور میسوری نے بغیر کسی تعارف اور تمہید کے کہا۔ "کیا یہ ممکن نہیں کہ میڈم روپا سے میری براہ راست بات ہو سکے؟"

"نہیں کنور میسوری! میں نے رکھائی سے کہا۔ "آپ کا مقصد معلوم ہوئے بغیر یہ ممکن نہیں ہے۔"

"ایک بہت بڑی فلم کا سلسلہ ہے جسے ہم جی ایم فلمز والوں کے اشتراک سے پلان کر رہے ہیں.... اس میں میڈم روپا کو کاسٹ کرنے کی بات کرنی ہے.... یہ تو خیر ابتدائی معاملہ ہے۔ ہماری اصل دلچسپی ایک دوسرے پروجیکٹ میں ہے جو بین الاقوامی نوعیت کا ہے۔ ہم اس میں بعض مصلحتوں کی بنا پر میڈم روپا کو پارٹنر شپ آفر کرنا چاہتے ہیں۔" کنور میسوری نے بتایا۔

"چند سیکنڈ ہولڈ کیجئے میں میڈم سے بات کرتا ہوں۔" میں نے ریسیور پر ہاتھ رکھتے ہوئے روپا کو آنکھ ماری اور دھیمی آواز میں اسے بتایا کہ کنور میسوری کیا کہہ رہا ہے۔

"میں بات کر کے دیکھ لیتی ہوں۔" روپا نے سرگوشی میں کہا۔ "ویسے تم بھی سنتے رہو۔" اس نے ٹیلی فون کے ایکسٹنشن کی طرف اشارہ کیا۔ اس نمبر کی ایک ایکسٹنشن روپا کی خوابگاہ میں تھی اور دوسری اسی سیٹ کے قریب روپا نے ہال میں رکھوائی تھی کیونکہ فون پر کسی سے گفتگو کرتے وقت وہ کبھی "شرارتاً" اور کبھی "مصلحتاً" مجھے سنواتی تھی۔ میں نے فون کا ریسیور اٹھا چکا تو روپا نے ہیلو کیا۔

"گڈ ایوننگ میڈم!" کنور کا لہجہ پہلے سے زیادہ شائستہ ہو گیا۔

"مجھے کنور میسوری آف نیپال کہتے ہیں.... شاید آپ نے کبھی میرا نام سنا ہو۔"

"جی نہیں۔" قدرے توقف کے بعد روپا نے صاف گوئی سے کہا۔ "میں نے کبھی نہیں سنا۔"

"بڑا افسوس ناک اتفاق ہے.... خادم کا تعلق نیپال کی بڑی امیر ترین فیملی سے ہے.... بہرحال اسے چھوڑیئے۔" اسے گویا انکساری ظاہر کرنے کا خیال آ گیا۔ "اصل بات یہ ہے کہ فیملی کا واحد وارث ہونے کی بنا پر میں نے محض خاندانی دولت پر تکیہ کر کے بیٹھ جانے کی بجائے ہاتھ پاؤں ہلانے کی کوشش کی ہے۔ پچھلے ایک سال سے میں نے ایک کثیر المقاصد قسم کا تجارتی ادارہ بنا رکھا ہے۔ 'کوئین نٹ کارپوریشن' کے نام سے کینیڈا، انگلینڈ، ہانگ کانگ وغیرہ میں اس کے دفاتر ہیں۔ حال ہی میں فلمسازی کو بھی میں نے اپنے تجارتی منصوبوں میں شامل کیا ہے اور جی ایم فلمز کے ساتھ اشتراک کا معاہدہ کیا ہے۔ انہوں نے ہمیں پہلے تو صرف ہندوستان کی مارکیٹ کے لئے ایک بڑی کاسٹ کی فلم کا منصوبہ دیا ہے۔ اس کے بعد بین الاقوامی مارکیٹ کے لئے بیک وقت چار فلموں کا پلان تیار کیا ہے۔" وہ سانس لینے کے لئے ایک لمحے کو خاموش ہوا۔

"ہمارا ادارہ آپ کو اپنی مستقل اسٹار رکھنا چاہتا ہے۔ ہندوستانی فلم کے لئے تو ہم آپ کو وہی معاوضہ دیں گے جو آپ طلب کریں گی۔" اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "البتہ بین الاقوامی فلموں میں ہم آپ سے پارٹنر شپ کرنا چاہیں گے۔ آپ چاہیں تو نفع نقصان میں شریک ہوں یا کچھ سرمایہ لگا لیں.... ویسے ہمارے منصوبوں کے بارے میں آپ غالباً کچھ نہ کچھ تو اخباروں میں پڑھ ہی چکی ہوں گی۔"

ڈپلومیسی تو روپا کو آتی ہی نہیں تھی۔ ایسے موقعوں پر اس کا جواب فلمی عورت کی روایات کے خلاف ہوا کرتا تھا۔ "جی نہیں۔" اس نے بلا تامل کہا۔ "میں اخبار وغیرہ پڑھتی ہی بہت کم ہوں۔ ہم جیسے لوگوں کے بارے میں ان میں جانے کیا کچھ لکھا ہوتا ہے۔ خواہ مخواہ پڑھ کر دل دکھتا ہے۔ ویسے جتنا میں پڑھتی ہوں اس میں بھی اس قسم کی کوئی خبر نظر سے نہیں گزری۔"

"اوہ خیر...." کنور میسوری نے ایک گہری سانس لی۔ "مجھے افسوس ہے کہ آپ ہمارے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتیں۔ بہرحال اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بمبئی کے میرے موجودہ دورے کا سب سے اہم مقصد آپ سے معاملات طے کرنا ہی ہے میں جلد از جلد آپ سے شرف ملاقات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

روپا نے ایک لمحے توقف کیا پھر نہایت متانت سے بولی۔ "میں اپنی سیکریٹری سے اپنی مصروفیت کا شیڈول معلوم کرنے کے بعد ہی آپ کو کوئی وقت دے سکتی ہوں اور سیکریٹری اس وقت موجود نہیں ہے۔"

"لیکن پلیز مجھے کوئی یقینی جواب ضرور دیجئے۔ میرا یہاں قیام صرف کل شام تک کا ہے۔" کنور میسوری کے لہجے میں ایک وقار آمیز التجا تھی۔ "کل شام مجھے ہر حال میں لندن کی پرواز پکڑنی ہے میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔"

"اچھا ٹھہریئے... میں اپنی ڈائری دیکھ کر کچھ بتاتی ہوں۔" روپا نے متذبذب لہجے میں کہا اور ریسیور پر ہاتھ رکھ کر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا... میں نے اشارہ دیا کہ وہ ملاقات کا وقت دیدے۔

اس نے مزید چند لمحے توقف کیا پھر ماؤتھ پیس سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔ "کل تو میں اسٹوڈیو جانے سے پہلے ہی وقت نکال سکتی ہوں۔ آپ صبح نو بجے آجائیں۔ ہم ایک گھنٹہ گفتگو کر سکتے ہیں یا پھر آپ ڈھائی بجے اسٹوڈیو آجائیں، دو شوٹنگوں کے درمیان میرے پاس ڈھائی گھنٹے کا بریک ہے۔ بشرطیکہ شوٹنگیں وقت پر ہوئیں۔ جو کہ عموماً وقت پر نہیں ہوتیں۔"

"گھر پر ہی گفتگو ٹھیک رہے گی۔ لیکن کیا آپ واقعی صبح اتنی جلدی تیار ہو جاتی ہیں؟"

"جی ہاں! کیونکہ میں شوٹنگ کے لئے کبھی رات کا وقت نہیں دیتی۔" روپا نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

"فلمی دنیا کے ہاتھ میں نے صرف اپنے دن فروخت کئے ہیں۔ راتیں اپنے ہی تصرف میں رکھی ہیں۔"

"بہت خوب بہت خوب میڈم!" کنور میسوری کا لہجہ کچھ خوشامدانہ سا ہو گیا۔ "مجھے کسی نے بتایا تھا اور ٹھیک ہی بتایا تھا کہ آپ روایتی فلمی عورتوں سے بہت مختلف ہیں۔ آپ سے ملاقات یقیناً میرے لئے ایک خوشگوار تجربہ ہو گی۔"

"شاید۔" روپا نے خشک لہجے میں کہا۔ "خدا حافظ" اس نے ریسیور رکھ دیا لیکن دوسری طرف سے میں نے کئی سیکنڈ بعد سلسلہ منقطع ہونے کی آواز سنی... تب میں نے بھی ریسیور رکھ دیا۔ روپا اپنی آرام دہ کرسی پر جا بیٹھی تھی اور ٹانگ پر ٹانگ رکھے دھیرے دھیرے ایک پاؤں ہلا رہی تھی۔

"کیا بات ہے ملاقات کے لئے وقت دینے میں تم بہت ہچکچا رہی تھیں؟" میں نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"الجھن میں پڑ گئی تھی منصور!" اس نے ہاتھوں کی مرمریں اور مخروطی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنساتے ہوئے کہا۔ "میں نے آج تک کوئی ایسا نیپالی نہیں دیکھا جو میسوری کی طرح اتنی صاف اردو بولتا ہو۔"

"ہو سکتا ہے اس نے ہندوستان ہی میں پرورش پائی ہو" میں نے خیال ظاہر کیا۔"

ویسے بھی امراء میں شمار ہونے والے لوگ عموماً کئی کئی زبانوں پر عبور رکھتے ہیں۔

"بہرحال ہمیں بہت محتاط رہنا پڑتا ہے۔" روپا نے کہا... "درجنوں لوگ لڑکیوں کے مراسم بڑھانے کے لئے عجیب عجیب روپ دھار لیتے ہیں... کوئی نواب بن جاتا ہے کوئی کسی راجے مہاراجے کا وارث بن بیٹھتا ہے اور کوئی کسی ایسے بزنس گروپ کا مالک بن کر... آجاتا ہے جس کی شاخیں پوری دنیا میں پھیلی ہوتی ہیں۔ بعد میں پتہ چلتا ہے کہ موصوف کسی دہقان کے صاحبزادے ہیں جو حال ہی میں دس بیس ایکڑ زمین چھوڑ کر مرا ہے اور یہ اس زمین کو بیچ کر دس بیس دنوں بڑے ٹھاٹ کی زندگی بسر کر کے دل کی حسرتیں نکال رہے ہیں۔ گلزار بانو سے تم واقف ہو نا؟"

میں نے ذہن پر زور دیا کہ یہ گلزار بانو کون تھی؟ نام تو کچھ مانوس لگ رہا تھا۔

"لیکن پلیز مجھے کی ...
ہے۔" کنور میسوری کے ...
لندن کی پرواز پکڑنی ہے ...
"اچھا شکریہ"
کہا ... لیو ... گیا ... نا جا سکی

دوسرے ہی لمحے مجھے یاد آگیا کہ گلزار بانو کون تھی۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا گلزار بانو کسی زمانے میں صف اول کی ہیروئن تھی۔ آج کل اس کے عروج کا ستارہ کچھ ماند پڑ چکا تھا۔

"گلزار بانو تو اس قسم کے ایک نوجوان کے چکر میں کچھ زیادہ ہی پھنس گئی تھی۔" روبی نے بتایا۔ "اور تقریباً" دو سال پہلے اس سے شادی بھی کر بیٹھی تھی۔ اس کا زوال تو درحقیقت اسی وقت سے شروع ہوا ہے بالآخر بے شمار پیسہ دولت اور ساکھ برباد کر کے طلاق لے کر ہی جان چھوٹی تھی۔"

"تمہیں کوئی اس طرح کا چکر نہیں دے سکتا۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "تمہارے پاس تو کالے جادو سے زیادہ خطرناک علم موجود ہے.... انسان کو پڑھ لینے کا علم!"

"وہی علم تو مجھے اب تک بچائے ہوئے ہے۔" وہ بھی مسکرائی۔ "ورنہ تمہیں کیا معلوم ہماری لائن میں کیسے کیسے جادوگر پڑے ہیں۔ اسکرین پر تمہیں جو نظر آتے ہیں اس سے کہیں زیادہ فنکار تو پس پردہ پڑے ہوئے ہیں۔ انسان کو پلک جھپکتے میں کوہ قاف لے جانے والے۔"

"میں نے اسی لئے تو تمہیں کنور میسوری سے ملاقات کر لینے کا مشورہ دیا تھا کہ دل میں جو خلش ہو وہ نکل جائے۔" میں نے کہا۔ "یہ کھٹک نہ رہے کہ شاید وہ کام کا آدمی تھا جس سے ہم نے ملاقات نہیں کی۔"

"مجھے اب اس امر سے کوئی دلچسپی نہیں رہی کہ وہ کون ہے کیا چاہتا ہے اور نہ ہی اس بات کی کوئی پروا ہے کہ اس سے مل کر مجھے فائدہ ہو گا یا نقصان۔ بس تم قریب موجود رہو تو میں جنوں کے سردار سے بھی ملاقات کے لئے تیار ہوں۔" اس نے مسکرا کر خوابناک سے لہجے میں کہا اور ایک طویل انگڑائی لے کر یک لخت جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ پھر یک جھٹکے سے اٹھتے ہوئے بولی۔ "اب تو موسیقی سننے کو جی چاہ رہا ہے تمہارا موڈ ہے تو تم بھی میرے کمرے میں آجانا۔"

"شکریہ!" میں نے آداب بجا لانے والے لہجے میں کہا۔ "بندہ بغیر موسیقی کے ہی ٹھیک ہے۔" پھر میں نے سنجیدہ ہو کر ایک لمحے کے توقف سے کہا۔ "دراصل میں آج کل کچھ لکھنے پڑھنے کا کام کر رہا ہوں۔"

مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنی خوابگاہ میں جا کر تمام روشنیاں بجھا دے گی' کھڑکیوں کے پردے کھینچ دے گی۔ ایک گوشے میں صرف ایک ننھا سا بلب روشن رہے گا جس کی پراسرار سی برائے نام روشنی میں ہر چیز دھندلے دھندلے سائے کی طرح نظر آئے گی۔ پھر وہ مختلف فلموں کے' جن میں اس کی اپنی فلمیں بھی شامل ہوں گی' المیہ نغموں کے ریکارڈ گراموفون پر لگاتی رہے گی اور دنیا مافیہا سے بے خبر ہو کر چھت پر نظر گاڑ کر سنتی رہے گی۔ پھر کسی لمحے پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے گی اور دنیا کی کوئی طاقت اسے چپ نہیں کرا سکے گی۔ حتیٰ کہ وہ یونہی روتے روتے تکیے میں منہ چھپائے سو جائے گی اور ریکارڈ ختم ہو جانے کے بعد بھی صبح تک اسی طرح سوئی تلے سر بجاتا رہے گا۔

جن دنوں میں نیا نیا آیا تھا' اسے موسیقی سننے کے یہ دورے اکثر پڑتے تھے اب ان میں بہت کمی آچکی تھی۔ پینے پلانے کی رفتار بھی بہت کم ہو چکی تھی۔ بقول اس کے اپنے' وہ سینے میں بکھری ہوئی کرچیوں کو جمع کرنے میں کامیاب ہوتی جا رہی تھی۔

میں نے اس سے پڑھنے لکھنے کے کام کا درحقیقت بہانہ ہی کیا تھا دنیا سے جدا ہونے کے بعد آج کل ایک ہی مشغلہ ہوتا تھا جسے میں فریضے کی طرح انجام دیتا تھا اور یہ کام تھا سوچنا..... صرف سوچنا۔

میں گھنٹوں اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑا رہتا اور ملگجی تاریکی میں نظریں گاڑے سوچتا رہتا۔ پلنگ پر لیٹتا تب بھی یہ سوچیں میرے ذہن کی نس نس میں سنگریزوں کی طرح چبھتی رہتیں۔ حتیٰ کہ خواب بھی مجھے کچھ ملتے جلتے سے ہی نظر آتے میری سوچوں کا عنوان بھی ایک ہی تھا ذہن خواہ کیسے بھی بیکراں جزیروں میں بھٹکتا رہتا' مگر سوچ کا رخ ایک ہی رہتی۔ ذہن جیسے قطب نما کی سوئی بن گیا تھا۔

سوچ بچار کی یہ ریاضت بے مقصد نہیں تھی۔ میں اپنے آپ کو یاسیت کے سمندر میں نہیں ڈبو رہا تھا۔ میرے ذہن میں تو بہت بڑی بساط بچھی ہوئی تھی اور میں دھیرے دھیرے اس پر مہرے سجا رہا تھا۔ میں اپنی ذات کے لئے خود ہی استاد بنا ہوا تھا اپنی تربیت کر رہا تھا۔ بڑی عمدگی سے اپنی ذہنی تراش خراش کا کام انجام دے رہا تھا۔ کسی کی ڈائری کو میں نے جلا دیا تھا۔ مجھے اب اس کی ضرورت نہیں تھی اس کا ایک ایک لفظ میرے ذہن پر نقش تھا۔

دوسرے روز ہم ناشتے سے "تقریباً" فارغ ہو کر کافی پی رہے تھے جب پٹھان چوکیدار اشفاق خان نے ایک سنہری وزیٹنگ کارڈ طشتری میں رکھ کر پیش کیا۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ سنہری کارڈ پر نہایت نفیس اور باریک حروف میں صرف کنور میسوری آف نیپال چھپا ہوا تھا۔ کوئی ایڈریس یا فون نمبر وغیرہ نہیں تھا جیسا کہ "عموماً" نہایت اہم اور بڑی

شخصیتوں کے کارڈ پر ہوتا ہے کہ صرف ان کا نام کافی سمجھا جاتا ہے۔

"نہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ میں آرہی ہوں۔" روپا نے وزیٹنگ کارڈ پر نظر ڈال کر کافی کا گھونٹ بھر کر کہا۔

میں کھڑکی میں جا کھڑا ہوا جس میں نیلے رنگ کا ٹینٹڈ گلاس لگا ہوا تھا۔ اس سے باہر کا منظر نظر آتا تھا' اندر کا نہیں۔ اس کھڑکی سے گیٹ دکھائی دیتا تھا.... میں نے اسحاق خان کو گیٹ کی طرف جاتے دیکھا۔ اندر آتے وقت وہ گیٹ کو تالا لگا کر آیا تھا.... تالا کھولنے کے بعد اس نے چوڑے چکلے گیٹ کے دونوں پٹ گھومنے ساتھ ہی چکیلے نیلے رنگ کی ایک کیڈلک بے آواز عفریت کی طرح اندر پھسل آئی۔ اس کے شیشے بھی گہرے رنگ کے تھے... اور کار کی جو سائیڈ مجھے نظر آرہی تھی اس طرف کی کھڑکیوں میں مکمل طور پر شیشے چڑھے ہوئے تھے.... کار برآمدے کے قریب آکر رکی ہو گی.... اور برآمدہ چونکہ مجھے نظر نہیں آرہا تھا اس لئے میں کار سے اترنے والوں کو بھی نہیں دیکھ سکا۔

میں نے پلٹ کر روپا کی طرف دیکھا وہ کافی ختم کر چکی تھی مگر بدستور اپنی جگہ بیٹھی تھی مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر گھڑی دیکھتے ہوئے بولی۔ "نو بج کر دو منٹ .... یہ کنور میسوری وقت کا تو بڑا پابند معلوم ہوتا ہے۔ یہ صحیح معنوں میں بزنس مین ہونے کی نشانی ہوتی ہے۔"

"چلو پھر اس سے مل ہی لیں.... دیکھیں اس کا بزنس کیا ہے ٹھاٹ باٹ تو بڑے نظر آرہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"اسے چند منٹ انتظار کرنے دو.... ابھی تو وہ ڈرائنگ روم میں اپنے لئے نشست کا انتخاب بھی نہیں کر پایا ہو گا۔" روپا نے ایک چھوٹے سے میک اپ مرر میں اپنے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"انتظار کرانا بھی حسینوں کی ایک ادائے دلبری ہوتی ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"حسینوں کی ادائے دلبری نہیں۔" اس نے بے نیازی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یہ اپنی ہیبت بڑھانے کا ایک حربہ ہوتا ہے۔"

میں ایک کرسی پر بیٹھا تو وہ اٹھ کر ٹہلنے لگی... ساتھ ہی بڑی لاپروائی سے وہ کچھ گنگنا بھی رہی تھی۔ ایک مرتبہ اس نے میری طرف مڑ کر بچوں کی سی معصومیت سے پوچھا۔ "میرے کپڑے تو اچھے ہیں نا؟"

میں اسے بتا نہ پایا کہ اس وقت بڑے بڑے کاسنی پھولوں والی بنگالی اسٹائل کی ساڑھی اور اسی طرز کے بڑے بڑے چاندی کے زیورات میں وہ کس قدر خوبصورت لگ رہی ہے.... کہنے کو یہ زیور چاندی کے تھے مگر ان میں کئی ہیرے جڑے ہوئے تھے.... روپا معمولی

پڑھی لکھی تھی مگر زندگی نے جہاں اسے اور بہت کچھ سکھایا تھا لباس کا سلیقہ بھی غضب کا دیا تھا۔ وہ ہمیشہ دوسری عورتوں سے الگ نظر آتی تھی' اور پارٹیوں میں میں نے دیکھا تھا کہ وہ سماجی یا مالی اعتبار سے اپنے سے کہیں بڑی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور کلچرڈ عورتوں پر بھی چھائی رہتی تھی۔

میرے تاثرات سے اسے اپنے سوال کا جواب مل گیا اور مطمئن ہو کر دوبارہ ٹہلنے لگی۔ پانچ منٹ بعد اس نے مجھے چلنے کا اشارہ کیا اور ہم ڈرائنگ روم کی طرف چل دیئے۔

روپا نے ڈرائنگ روم میں داخل ہونے کے لئے پردہ ایک طرف کو ہٹایا تو میری نظر آراستہ و پیراستہ اور طویل و عریض ڈرائنگ روم میں سامنے ہی صوفے پر بڑے بارعب انداز میں بیٹھے ہوئے ایک شخص پر پڑی۔ پہلی نظر میں وہ مجھے کوئی منگول شہزادہ دکھائی دیا اس کے لمبے لمبے بھورے بالوں کی لٹیں اس کے کندھوں کو چھو رہی تھیں.... چپٹی ناک تلے پتلی پتلی چنگیزی طرز کی مونچھیں ڈھیلے ڈھالے انداز میں لٹکی ہوئی تھیں.... آنکھوں پر طلائی فریم کی تاریک شیشوں والی عینک تھی' چہرہ خاصا چوڑا اور رنگت تپتے ہوئے تانبے سے مشابہ تھی۔ رخساروں پر جیسے گوشت میں گرہیں سی پڑی ہوئی تھیں۔

وہ سفید چمکیلے ساٹن نما کسی کپڑے کا چینی طرز کا بند گلے کا کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ کوٹ کے ساتھ اس نے چوڑی دار پاجامہ پہن رکھا تھا پیروں میں مخملیں جوتے تھے جن پر سفید موتی لگے ہوئے تھے۔ اس کے گلے میں موٹے موٹے سبز پتھروں کی مالا تھی ان پتھروں میں بڑی مدھم قسم کی چمک تھی۔

مجموعی طور پر وہ بھاری تن و توش کا آدمی تھا اور کچھ اس انداز سے بیٹھا ہوا تھا جیسے زمانہ قدیم کا کوئی بادشاہ اپنے درباریوں سے خطاب کرنے لگا ہو.... روپا کو دیکھتے ہی وہ اٹھا اور کورنش بجا لانے کے سے انداز میں جھک کر اس نے گویا اسے خوش آمدید کہا۔ اس کی آنکھوں پر گو کہ تاریک شیشوں کی عینک تھی مگر میں نے محسوس کیا کہ سیدھا کھڑا ہوتے وقت اس نے گہری نظروں سے روپا کا سر تا پا جائزہ لیا تھا اور اسی وقت میری نظر ایک اور شخص پر پڑی جو غالباً" مدد گار کے طور پر کنور میسوری سے کافی فاصلے پر ایک اور کرسی پر بیٹھا تھا۔

روپا کو دیکھ کر وہ بھی پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور "اٹنشن" جھکا تھا۔ اس کے پیروں کے قریب چمڑے کا ایک نفیس بریف کیس رکھا تھا یہ شخص نہایت دبلا پتلا تھا مگر اس کے بازو' ٹانگیں اور ہاتھوں کی انگلیاں غیر معمولی طور پر لمبی تھیں۔ اس کے چہرے کے خطوط کھنچے کھنچے سے تھے اور آنکھیں مینڈک کی طرح ابھری ہوئی تھیں۔ تاہم اس کے بال اچھے تھے' اور سلیقے سے بنے ہوئے تھے۔ وہ سوٹ میں ملبوس تھا اور سوٹ کی عمدہ تراش خراش کی وجہ سے اس کی شخصیت کچھ غنیمت نظر آرہی تھی۔ "یقیناً" وہ کنور میسوری کا سیکرٹری

تھا۔

تعارف کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی کیونکہ ہم چاروں ہی ایک دوسرے کو جان چکے تھے..... روبا نے سر کی خفیف سی جنبش سے ان کے سلاموں کا جواب دیا' اور انہیں بیٹھنے کے لئے کہہ کر مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بھی بیٹھ گئی۔

"آپ کیا پینا پسند کریں گے کنور؟" اس نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

"تکلف کی ضرورت نہیں میڈم!" یہ جملہ اس نے نہایت شستہ انگریزی میں ادا کیا تھا اور گویا میرے اس خیال کی تصدیق کر دی تھی کہ غیر معمولی طور پر اونچے خاندانوں کے لوگ عموماً کئی کئی زبانوں پر عبور رکھتے ہیں۔ اس کی آواز خاصی گونج دار تھی۔

"میں چاہتا ہوں کہ آپ کا کم سے کم وقت لوں۔"

اس نے مسکراتے ہوئے کہا..... اس مسکراہٹ کے دوران اس کی الجھی ہوئی چنگیزی مونچھوں کے درمیان فاصلہ بڑھ گیا۔

"آپ اطمینان سے بات کریں..... میرے پاس ایک گھنٹہ فاضل ہے۔" روبا نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے اس سے بھی زیادہ شستہ انگریزی میں کہا۔ اسے انگریزی بولتے سن کر بھی کوئی اس کی اصلی تعلیمی استعداد کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔

"سب سے پہلے تو آپ یہ بتائیں کہ کیا آپ ہماری اس فلم میں کام کرنے کے لئے تیار ہیں۔ جو ہم بی ایم والوں کے اشتراک سے ہندوستانی مارکیٹ کے لئے بنا رہے ہیں؟" کنور میسوری نے اب اردو میں بات شروع کر دی۔

روبا کی پیشانی پر ہلکی سی شکن نمودار ہوئی۔ "کیا بی ایم والوں نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ میں پہلے اسکرپٹ پڑھتی ہوں اس میں اپنا رول دیکھتی ہوں' باقی کاسٹ دیکھتی ہوں پھر معاوضے کی بات کرتی ہوں اور جب یہ سب چیزیں طے ہو جائیں تب حامی بھرتی ہوں۔"

"بتایا تھا..... میں اسکرپٹ ساتھ لے آیا ہوں۔ ملک کے ایک نامور مصنف رہبر ہانی نے اسے لکھا ہے۔ تھیم انگریزی ناول سے ہے۔"

پھر کنور نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "یہ میں ابھی آپ کی خدمت میں پیش کروں گا مگر آپ سے صرف یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ اگر اسکرپٹ' آپ کے رول' کاسٹ اور معاوضے وغیرہ کی طرف سے آپ کا اطمینان ہو گیا تو آپ کا [illegible] وقت مل سکے گا یا نہیں' آپ کا شیڈول بہت زیادہ ٹائٹ تو نہیں ہے؟"

اب اگر روبا کی جگہ کوئی اور ہیروئن ہوتی تو خواہ اس کی صرف ایک فلم سیٹ پر ہوتی مگر کاروباری مصلحت کے تحت اس کا جواب کچھ اس قسم کا ہوتا۔ "وہ جی شیڈول میں تو بالکل گنجائش نہیں ہے بلکہ اب آپ آ ہی گئے ہیں' اور پھر آپ کا بی ایم والوں سے بھی معاملہ ہے..... ان کا لحاظ تو کرنا ہی پڑے گا میں کسی نہ کسی طرح گنجائش نکال دوں گی۔"

اس کی بجائے روبا نے نہایت دیانتداری سے کہا۔ "[illegible] سائن کرتی ہوں۔ اس لئے میں مشین کی طرح دن رات مصروف [illegible] کچھ اور ہے۔" بھی نہیں۔ اس پورے سال میں میرے پاس بہت کم ڈیٹس ہیں۔" [illegible] روبا اس تھی لیکن بہت معمولی حد تک۔

"خیر..... یہ باتیں تو طے ہو ہی جائیں گی۔" کنور میسوری نے کہا۔ "پہلے آپ کو فلم اسکرپٹ اور [illegible] مصنفوں کی رپورٹ پیش کرتا ہوں..... آپ نظر ڈال کر ہی شاید کسی فیصلے پر پہنچ سکیں۔ اس نے اپنے سیکریٹری کو اشارہ کیا..... سیکریٹری نے بریف کیس اٹھا کر نہایت ادب سے اس کے سامنے جا کر پیش کیا۔

"گاڑی سے بڑی فائل بھی نکال لاؤ۔" کنور میسوری نے اسے حکم دیا..... وہ مودبانہ مستعدی سے گھوما اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا' میرے قریب سے گزر کر دروازے کی طرف چلا گیا..... ڈرائنگ روم میں تو نہایت دبیز ایرانی قالین بچھا ہوا تھا' لیکن میرا اندازہ تھا کہ ننگے فرش پر چلتے وقت بھی اس شخص کے قدموں کی آہٹ پیدا نہیں ہوتی تھی..... ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چلتے وقت اس کے جوتے فرش کو چھوتے ہی نہیں تھے۔

کنور میسوری نے بریف کیس گھٹنوں پر رکھا اور کوئی بٹن دبا کر کھٹکے سے اس کا تالا کھولا' اور اس پر جھک گیا..... چند لمحے بعد اس نے بریف کیس میں ہاتھ ڈال کر جو چیز نکالی وہ خوفناک سی ساخت کا ایک دونالی ریوالور تھا جس پر سائلینسر بھی لگا ہوا تھا اور جس کا رخ ہماری ہی طرف تھا۔

مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا کیونکہ اس سانپ نے اس وقت پھن نکالا تھا جب ہمیں اس پر سانپ ہونے کا شبہ تک نہیں رہا تھا۔ تاہم میں نے اپنی حیرت ظاہر نہیں ہونے دی تھی۔ البتہ ایک نظر روبا کی طرف ضرور دیکھ لیا۔ اس کا چہرہ یک لخت سپید پڑ گیا تھا۔ مگر پھر شاید میری موجودگی کے احساس سے وہ کچھ سنبھل گئی۔

"یہ ایک ایسا اسکرپٹ ہے میڈم روبا۔" کنور میسوری نے ریوالور کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔ "جسے کوئی بھی زبان بولنے والے با آسانی سمجھ سکتے ہیں غالباً آپ بھی سمجھ گئی ہوں گی کہ میں آپ کو لینے آیا ہوں۔"

میرا ہاتھ [illegible] میں لگا ہوا تھا..... غیر محسوس طور پر میری جیکٹ کی جیب کی طرف بڑھ رہا تھا جس میں میرا مشین پسٹل موجود تھا۔ کنور ہم سے اتنے فاصلے پر بیٹھا تھا کہ اگر میں انتہائی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بھی پستول نکالتا' تب بھی زیادہ امکان یہی تھا کہ اس کے ریوالور سے نکلنے والی گولیاں مجھے بیچ راستے ہی میں ڈھیر کر دیتیں اور یہ شخص کنور میسوری... جو بھی اس کا اصلی نام تھا..... ریوالور کو کھلونے ہی کی طرح استعمال کرنے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔

تھا۔

تعارف کی ضرورت نہ تھی۔ خطرناک اور سخت جان شخص تھا مجھے معلوم تھا کہ مینڈک کے سے...... روپا نے سچ کہا، چھپی ہوئی اس کی آنکھیں روپا کو کم اور مجھے زیادہ دیکھ رہی ہیں۔ سب لمحے میں بہت ہی آہستگی سے جیب کی طرف ہاتھ بڑھا رہا تھا کنور میسوری بھی عجلت میں کوئی قدم اٹھانے کا عادی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس کا انداز کسی بھاری بھرکم اور سست الوجود اژدھے سے مشابہ تھا جو بڑی کاہلی سے رینگتا ہے مگر جب کسی جاندار کے جسم کے گرد لپٹ جاتا ہے تو چند سیکنڈ میں اس کی ہڈیاں چور چور کر کے رکھ دیتا ہے...... اس کا انداز کوبرا جیسا نہیں تھا جو بجلی کی سی تیزی سے ڈستا ہے۔

"نہیں...... نہیں برخوردار......" دفعتاً اس کی غراہٹ سن کر میرا دل کچھ زیادہ تیزی سے دھڑک اٹھا۔ "ہاتھ اپنی جگہ ساکت رکھو ورنہ یہ جسم سے الگ بھی ہو سکتا ہے اس ریوالور کی گولی بڑی ظالم ہے اور ذرا ایک نظر پیچھے بھی دیکھ لو۔"

میں نے گردن ترچھی کر کے دیکھا کنور کا سیکریٹری جو گاڑی سے بڑی فائل نکالنے گیا تھا اور اس کے ہاتھ میں بھی ویسا ہی ریوالور تھا جس کا رخ میری گدی کی طرف تھا۔ مینڈک کی آنکھوں سے مشابہ اس کی آنکھیں بالکل ساکت تھیں اور ان میں بے رحم موت اپنے خوفناک پر پھیلائے بیٹھی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ محض ایک ریوالور کے اضافے سے وہ مجہول سا شخص کس قدر سفاک نظر آنے لگا تھا۔

"رنگی!" کنور نے اپنے نام نہاد سیکریٹری کو مخاطب کیا۔ "برخوردار کو غیر ضروری وزن سے نجات دلا دو۔" میں نے پیچھے دیکھے بغیر محسوس کر لیا کہ وہ عقب میں میرے قریب پہنچا ہے۔ پھر اس کا استخوانی ہاتھ مجھے اپنی پتلون کی جیب کی طرف بڑھتا نظر آیا اور دوسرے ہی لمحے میرا مشین پسٹل اس کی غیر معمولی طور پر لمبی انگلیوں کی گرفت میں تھا۔

"بڑی عمدہ چیز ہے۔" ساتھ ہی اس کا تبصرہ سنائی دیا۔ اس کی آواز کچھ ایسی ہی تھی جیسے مینڈک کا گلا بیٹھ گیا ہو۔ مجھے حیرت تھی کہ اس کی شخصیت میں مینڈک سے اتنی مشابہت کہاں تھی۔

مشین پسٹل اس نے غالباً اپنی جیب میں رکھ لیا اور اسی ہاتھ سے میری دوسری بغلوں کو تھپتھپایا۔ یقین کر لیں کہ کہیں ہولسٹر تو موجود نہیں' پھر وہ پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے غالباً کنور میسوری کو کوئی اشارہ کیا کیونکہ وہ ایک ہاتھ میں بریف کیس اور دوسرے میں ریوالور سنبھالے اٹھ کھڑا ہوا۔

"چلئے میڈم!" کنور نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ اس مرتبہ میڈم اس نے زنانے لہجے میں کہا تھا۔

"کہاں لے جانا چاہتے ہو تم مجھے؟" روپا نے سرسراتی آواز میں پوچھا۔

"[illegible] ہیں آپ کو جانا [illegible] چلیں۔" کنور نے [illegible] انداز میں مسکراتے

ہوئے کہا پھر ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "لیکن افسوس کہ میرا معاہدہ کچھ اور ہے۔"

"کس سے ہے تمہارا معاہدہ؟" یہ سوال میں نے کیا۔

"اوہ...... چچ...... چچ......" اس نے گویا کسی دودھ پیتے بچے کو پچکارا۔ "لونڈے بالے! اس قسم کا سوال نہیں کیا کرتے۔" پھر وہ روپا سے مخاطب ہوا۔ "مجھے اطلاع ملی ہے کہ میڈم آج کل تم نے کثیر المقاصد قسم کا یہ لونڈا رکھا ہوا ہے۔ یہ کافی خطرناک ہے محض اس کی شہرت سن کر ہی میں آپ کے ساتھ اسے بھی لپیٹے لئے چل رہا ہوں ورنہ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔"

اس کے اس تضحیک آمیز انداز پر بھی میں نے معمولی سا بھی رد عمل ظاہر نہیں کیا اور نہایت پرسکون لہجے میں کہا۔ "یہ آپ کی نوازش ہے حضور والا! ویسے آپ یہ زحمت نہ کرتے تب بھی میں آپ کے ساتھ چلنے کی درخواست ضرور کرتا آپ جیسے بزرگوں کی صحبت روز روز تو نصیب نہیں ہوتی۔"

"ضرور...... ضرور چلو برخوردار!" اس نے سفاک مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "تمہیں بھی پتا تو چلے کہ کنور میسوری درحقیقت ہے کس چڑیا کا نام۔" پھر یک لخت اس کے لہجے میں کرختگی آ گئی۔ "اب اٹھ بھی چکو۔" ساتھ ہی اس نے ریوالور کو حرکت دی۔

اس وقت میرا ارادہ تھا کہ کوئی ہاتھ دکھاؤں لیکن ایک تو روپا کی وجہ سے باز رہا میں اپنا بچاؤ کر سکتا تھا لیکن اسے نقصان پہنچنے کا احتمال تھا۔ دوسرے میں نے یہ سوچ کر ارادہ تبدیل کر دیا تھا کہ اب ڈور ہاتھ آئی ہے تو سرا بھی تلاش کر ہی لیا جائے۔

میرے چہرے پر سرد مہری دیکھ کر روپا نے نظر پھیرلی۔ اور گویا صرف اپنے آپ پر ہی تکیہ کرتے ہوئے قدرے تلخی سے کنور کو مخاطب کیا۔ "ویسے تم ہو کون؟"

"میں بس آپ جیسے کچھ بڑے بڑے لوگوں کا خادم ہوں...... آڑے وقت میں ان کے کام آتا ہوں۔ ان کے چھوٹے موٹے کام جن کے سلسلے میں وہ خواہ مخواہ ادھر ادھر جھک مارتے رہتے ہیں مختصر سے وقت میں انجام دیتا ہوں اور اپنی راہ لیتا ہوں۔ مسافر ہوں' آج یہاں کل وہاں۔" کنور نے خوشگوار لہجے میں جواب دیا۔

"کرائے کے قاتل ہو۔" روپا نے اپنے لہجے میں حقارت ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

"نہیں...... میں اس سے کافی اونچے درجے کا فنکار ہوں۔" اس کا لہجہ کھردرا سا ہو گیا۔ "اب تم دونوں دروازے کی طرف گھوم جاؤ اور شانہ بشانہ پورچ کی طرف چلو۔" میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کے بعد روپا بھی میرے ساتھ قدم اٹھانے لگی۔ رنگی دروازے سے ہٹ کر ایک طرف کو کھڑا ہو گیا۔ ریوالور کا رخ ہماری طرف تھا۔ ہم اس کے قریب پہنچے تو وہ ریوالور کوٹ کی جیب میں اس طرح رکھ کر کہ اس کی نال کا ابھار نظر آتا رہے۔ میرے ساتھ چلنے لگا۔ کنور میسوری ہمارے پیچھے تھا۔

چوکیدار گیٹ سے باہر بیٹھا تھا اس لئے وہ ہمیں کار میں سوار ہوتے نہیں دیکھ سکا۔ اسٹیئرنگ پر ڈرائیور موجود تھا کنور نے پہلے روپا کو پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ اس کے ساتھ ہی رشی اس کے پہلو سے ریوالور لگائے بیٹھ گیا۔

کنور نے مجھے دوسرے دروازے کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔ میں پچھلی ہی سیٹ پر روپا کے برابر بیٹھ گیا تو کنور میری پسلیوں پر ریوالور رکھے میرے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ گاڑی کی پچھلی سیٹ اتنی کشادہ تھی کہ ہم چاروں بغیر کسی تکلیف کے بیٹھے تھے۔ حالانکہ ہم میں سے دو افراد عام تن و توش کے مالک نہیں تھے یعنی میں اور کنور میسوری۔

کنور کا لمس محسوس کر کے مجھے ایک اور حقیقت کا احساس ہوا بظاہر یہ تھل تھل کرتے پلپلے جسم کا مالک محسوس ہوتا تھا..... لیکن درحقیقت وہ اتنا ہی ٹھوس اور مضبوط تھا جتنی اس کے ریوالور کی نال جو میری پسلیوں میں چبھ رہی تھی۔

ڈرائیور صورت حال سے مکمل طور پر لاتعلق نظر آرہا تھا۔ اس نے نہ تو پیچھے مڑ کر دیکھا اور نہ ہی کچھ پوچھا' خاموشی سے گاڑی اسٹارٹ کی اور گھما کر گیٹ پر لے آیا۔ ہارن سن کر چوکیدار نے گیٹ کھول دیا اور تقریباً" بے آواز انجن والی گاڑی اس کے قریب سے گزرتی چلی گئی۔ اس نے نہ صرف ہمارے لئے گیٹ کھولا تھا بلکہ جھک کر الوداعی انداز میں ہمیں سلام بھی کیا تھا۔ وہ دیکھ ہی نہیں سکا کہ میری اور روپا کی پسلیوں پر ریوالور لگے ہوئے ہیں۔

گاڑی پرسکون رہائشی علاقے سے نکل آئی اور شہر کی بھری پری سڑکوں پر فراٹے بھرنے لگی۔

کئی میل کا فاصلہ یونہی خاموشی سے طے ہوا۔ دفعتا" میرے دائیں ہاتھ پر روپا گویا تڑپ کر اچھلی۔ رشی جو اس کے کندھے سے کندھا جوڑے بیٹھا تھا' نے غالباً" کوئی حرکت کی تھی۔ "ذلیل..... کتوں کے بچے.....!" وہ گھٹی گھٹی روہانسی آواز میں چیخی۔

میری کنپٹیوں میں ایک بار پھر شرارے سے چھوٹے لیکن میں نے انہیں پھیلنے نہ دیا اور ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کنور سے کہا۔ "اس کمینے سے کہو کہ اپنے غلط پنجوں کو قابو میں رکھے ورنہ میں بھول جاؤں گا کہ تم دونوں کے پاس ریوالور موجود ہیں۔ مرنے سے پہلے میں تمہارا نہ اس کا بھیجا ضرور نکال چکا ہوں گا۔"

"بیٹھے رہو رشی۔" کنور نے مرونت سے بجے میرا اپنے ساتھی سے کہا۔ اس نے قدرے آگے جھک کر مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ اس کی مینڈک جیسی آنکھوں میں تفرامیش کی رمق تک نہیں تھی' صرف پتلے پتلے ہونٹ عجیب سے انداز میں کھنچ کر رہ گئے تھے۔ وہ کوئی جواب دیئے بغیر سنبھل کر بیٹھ گیا۔

کار میں اتنی خاموشی چھا گئی تھی کہ جیسے سب ہی گونگے ہوں۔ انجن کی مدھم ی

سرسراہٹ کے علاوہ کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

تیس پچیس منٹ کے مزید سفر کے بعد جب کار ایک تنگ اور نیم پختہ گلی میں رکی تو وہ علاقہ مجھے اجنبی ہی دکھائی دیا۔ تاہم کار سے اتر کر یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ ہم شہر کے کسی اچھے علاقے میں تھے۔ ہمارے دونوں طرف متوسط درجے کی کوٹھیوں کی قطاریں تھیں لیکن یہ درحقیقت ان کوٹھیوں کی عقبی گلی تھی جہاں کہیں کہیں لوگوں نے کوڑا کرکٹ بھی پھینک رکھا تھا۔

کنور نے جیب سے چابیوں کا ایک بڑا سا گچھا نکال کر ڈرائیور کی طرف اچھالا اور اس نے آگے بڑھ کر ایک کوٹھی کا پچھلا گیٹ کھول دیا۔ یہ ایک خاصی کشادہ دو منزلہ کوٹھی تھی جس کے عقبی حصے میں بھی لان تھا۔ تالا گیٹ میں لگانے کے بعد کنور نے چابیوں کا گچھا جیب میں ڈالا اور ہمیں اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ اب رشی ہمارے پیچھے تھا اور کنور میرے پہلو بہ پہلو چل رہا تھا۔ ڈرائیور نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا گھاس کے درمیان ایک پختہ روش پر چلتے ہوئے ہم قدرے اونچائی پر بنی ہوئی اصل عمارت تک پہنچے مگر کنور کسی دروازے کے قریب سے گزرتا چلا گیا۔ عمارت کے ایک کونے پر تیج ترسیمنٹ ہی کی کشادہ سیڑھیاں نیچے جاتی دکھائی دیں۔

ہم سیڑھیاں اترنے لگے چاروں طرف گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا کوٹھی میں یقیناً" کوئی ذی روح موجود نہیں تھا۔ سیڑھیوں کے اختتام پر لکڑی کا دروازہ تھا کنور نے ایک بار پھر چابیوں کا گچھا نکال کر ایک چابی منتخب کی اور دروازہ کھول کر اندر قدم رکھتے ہی بایاں ہاتھ بڑھا کر ریوالور سے بجلی سوئچ دبایا اور تاریک تہہ خانہ یکایک جگمگا اٹھا۔

یہ نہایت طویل و عریض' غالباً" بالائی عمارت ہی جتنا تہہ خانہ تھا۔ دائیں طرف دیوار کے ساتھ نئے اور صاف ستھرے گتے کے کارٹن بہت بڑی تعداد میں دیوار کے ساتھ چنے ہوئے تھے۔ ان پر مختلف صابنوں اور ڈیٹرجنٹ کے دیگر سامان کے بڑے بڑے لیبل نظر آرہے تھے۔

ایک گوشے میں ایک صاف ستھری آفس ٹیبل لگی ہوئی تھی جس پر ٹیبل لیمپ' کئی فائلیں اور دیگر دفتری سامان بھی موجود تھا میز کے گرد چند کرسیاں بھی موجود تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس تہہ خانے کو گودام اور دفتر کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا چھت میں تین پنکھے بھی موجود تھے اور لوہے کے ایک فالتو گاڈر سے میں ایک لمبا سا نوکیلا' بہت بڑا ایک ہک لٹکا ہوا تھا جیسے عموماً" قصاب گوشت کے نہایت وزنی پارچے لٹکانے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ پھر اس ہک کی موجودگی کی وجہ بھی میری سمجھ میں آ گئی۔ گتے کے بڑے بڑے کارٹنوں کی قطار کے ساتھ ہی ایک بہت بڑی لوہے کی ترازو اور مختلف اوزان کے باٹ پڑے تھے۔ غالباً" یہاں ایسا مال بھی آتا تھا جسے تولنے کی ضرورت پڑتی تھی اور اس مقصد

کے لئے تراؤ اس بڑے سے ہک میں لٹکا دیا جاتا ہو گا۔

رشی ہمارے عقب میں موجود رہا اور کنور میز پر جا بیٹھا۔ ریوالور اب اس نے میز پر رکھ دیا تھا تاہم نال اب بھی ہماری طرف اٹھی ہوئی تھی۔ میں اور روپا میز سے کچھ دور کنور کے سامنے یوں کھڑے تھے گویا کسی جوڑے کو کسی جھوٹے الزام میں گرفتار کر کے تھانے دار کے سامنے پیش کیا گیا ہو۔ رشی اس سپاہی کی طرح ہمارے عقب میں تنا کھڑا تھا جس نے یہ کارنامہ انجام دیا ہو۔

میں نے کارٹنوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تو تم دکھاوے کے لئے کوئی کاروبار بھی کرتے ہو؟"

"ارے نہیں۔" اس نے گویا کسی اور خیال سے چونک کر قدرے آرام سے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "یہ تو کسی شریف اور معزز قسم کے ہلکنے تاجر کا گھر اور خفیہ گودام ہے جو اپنی نیک کمائی سے اپنے بیوی بچوں کو سوئٹزرلینڈ کی سیر کرانے گیا ہے۔ ہم اس طرح کی دو تین ماہ کے لئے خالی رہنے والی محفوظ قسم کی کوٹھیوں کی تاک میں رہتے ہیں اور ان میں اپنا کیمپ لگا لیتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مکینوں نے کب آنا ہے۔ اس سے دو ایک دن پہلے ہی ہم اپنا مختصر سا سامان سمیٹ کر کوچ کر جاتے ہیں اگر کبھی کبھار ہمارے کسی معرکے کے سلسلے میں سراغ لگاتی ہوئی پولیس اس کوٹھی تک آ بھی پہنچتی ہے تو گردن بے چارے مالک کی پھنستی ہے۔ تمہیں کچھ پتا نہیں ہوتا...... کیسا ہے؟" وہ داد طلب لہجے میں بولا اور جواب کا انتظار کئے بغیر بے آواز سے طریقے سے ہنسنے لگا۔ اسی ہنسی میں کئی بار بھیڑیئے کی غراہٹ سی در آئی۔ اس کے علاوہ کوئی آواز سنائی نہ دی۔

"ویسے مجھے اپنے اب تک کے کیمپوں میں یہ کیمپ سب سے زیادہ پسند آیا ہے۔ معلوم ہے کیوں؟" اس نے اپنا چند ھی چند ھی لیکن خون آشام آنکھوں کو ایک بار بھی جھپکایا نہیں تھا۔ "محض اس ایک ہک کی وجہ سے۔" اس نے چھت میں لٹکے ہوئے بڑے سے نوکیلے آہنی ہک کی طرف اشارہ کیا اور اس کے ہونٹوں پر اس کی مخصوص حیوانی سی مسکراہٹ ایک بار پھر رینگ آئی۔

"اس ہک کی وجہ سے مجھے ایک نیا تجربہ کرنے کا موقع ملا۔" اس نے گویا چٹخارے لیتے ہوئے کہا۔ "واہ کیا منظر تھا...... اپنے سابقہ شکار کو جو تمہاری ہی طرح بڑی اکڑ فوں والا آدمی تھا میں نے جان کے تکلف سے نجات دلائی۔ ہاتھ پاؤں باندھے اور اس کا حلقوم اس ہک پر ٹکا کر لٹکا دیا۔ پھر ایک سوئی لے کر میں اس کے جسم کے نازک حصوں پر چبھونے لگا...... ہر مرتبہ سوئی چبھونے پر وہ تڑپتا تھا اور ہک اس کی حلق میں اور گہرا اتر جاتا تھا۔ بڑی دیر میں جا کر ہک میں لٹکا ہوا اس کا جسم ساکت ہوا۔"

چند لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی اور ہمارے پیچھے کھڑے رشی سے مخاطب ہوا۔ "ابھی تو صرف پونے بارہ ہوئے ہیں...... وکرم کے آنے میں پورا سوا گھنٹہ باقی ہے تب تک کیا ہمارے یہ حسین مہمان یونہی کھڑے رہیں گے؟"

رشی نے کوئی جواب نہ دیا...... وہ گویا صرف احکامات پر عملدرآمد کرنے کی مشین تھا۔

کنور میسوری چند لمحے پر خیال نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر اس نے سر پر ہاتھ پھیرا اور دوسرے ہی لمحے وہ مجھے گنجا نظر آیا...... بڑے سے بلب کی تیز روشنی میں اس کی چندیا چمک رہی تھی۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ اب تک وہ وگ پہنے ہوئے تھا۔ وگ اب اس کے ہاتھ میں تھی جسے اس نے بڑی احتیاط سے میز پر رکھ دیا۔ سر گنجا نظر آنے سے اس کی شخصیت کا تاثر بہت بدل چکا تھا۔ وہ کچھ اور زیادہ خوفناک نظر آنے لگا تھا۔ گردن بھی گویا بھینسے کی طرح گٹھی ہوئی اور مضبوط دکھائی دینے لگی تھی۔

بڑے آسودہ سے انداز میں کئی مرتبہ چندیا پر ہاتھ پھیرنے کے بعد وہ ایک بار پھر رشی سے مخاطب ہوا۔ "ایسا کرو کہ الماری سے لوہے کی تار کا وہ لچھا نکال لاؤ اور اس لونڈے کے تو ہاتھ پاؤں باندھ کر ایک طرف ڈال دو اور اس سپر اسٹار حسینہ کو ذرا میرے پاس بھیجو۔ میں اس کے آٹو گراف لیتا ہوں۔ آخری الفاظ ادا کرتے وقت اس کے ہونٹوں پر اس کی مخصوص شیطانی مسکراہٹ رینگ آئی جس میں ایک خوفناک قسم کی بھوک بھی شامل ہو چکی تھی۔ غیر محسوس طور پر اس نے چٹخارہ سا لے کر بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "وکرم نے تو اس مال کو ایکسپورٹ کر ہی دینا ہے ہم ذرا نمونہ ہی دیکھ لیں۔"

میں نے اپنے عقب میں رشی کی آہٹ نہیں سنی لیکن کن انکھیوں سے دیکھ لیا۔ وہ ایک دیوار گیر الماری سے لوہے کے باریک اور نرم تار کا لچھا لے کر میری پشت پر پہنچ چکا تھا۔ فیصلہ کن لمحہ آپہنچا تھا مجھے معلوم تھا کہ لوہے کی یہ نرم اور باریک تار ایک مرتبہ میری کلائیوں اور ٹخنوں کے گرد کس دی گئی تو پھر میں اپنی نسیں اور گوشت تو کٹوا سکوں گا لیکن اس بندش سے ہاتھ پاؤں آزاد نہیں کرا سکوں گا۔

"ہاتھ پشت پر لے جاؤ۔" کنور نے ریوالور کو حرکت دیتے ہوئے مجھے حکم دیا۔

میں نے ہاتھ پیچھے کئے اور جیسے ہی...... رشی نے میرے ہاتھوں کو چھوا میں اس کی استخوانی کلائیوں کو گرفت میں لیتے ہوئے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ دوسرے ہی لمحے رشی پرندے کی طرح میرے سر پر سے گزرتا ہوا کنور کی طرف جا رہا تھا۔ اسے ہوا میں اچھالتے ہی میں نے روپا کی ٹانگ پکڑ کر اسے ایک طرف کو گھسیٹ کر فرش پر گرا دیا تھا اور اس کی طرف دیکھے بغیر چلا کر اسے ہدایت دی تھی کہ وہ فرش سے ہرگز نہ اٹھے۔

یہ عمل گو کہ دو یا تین سیکنڈ کے وقفے پر محیط تھا مگر کنور اس دوران ساکت بیٹھا تماشا نہیں دیکھتا رہا تھا اور نہ ہی اس نے بوکھلاہٹ میں اندھا دھند فائرنگ شروع کی تھی۔ وہ چھٹا ہوا ایک بے مثال بندوق باز تھا۔ میرے حرکت میں آتے ہی اس نے گولی چلا دی تھی

لیکن اس وقت وہ یہ نہیں جان سکا تھا کہ میری حرکت کس سمت میں ہو گی۔ اس نے یقیناً میری پیشانی کا نشانہ لیا تھا لیکن میرے بجلی کی سی تیزی سے گھٹنوں کے بل بیٹھنے کی وجہ سے دونوں ریوالور کی گولیاں میرے بالوں کو چھوتی ہوئی گزریں اور غالباً" رشی کے جسم سے پار ہو گئیں۔ کیونکہ اس کی کریناک چیخ گونجی تھی' مگر دوسرے ہی لمحے چونکہ وہ اڑتے پرندے کی طرح میز پر پھسلتا ہوا کنور سے جا ٹکرایا تھا۔ اس لئے وہ چیخ ادھوری ہی رہ گئی۔

فائر کی آواز محض ایک ہلکی سی "ٹھک" تک محدود رہی تھی جیسے کسی ایئر ٹائٹ بوتل کا کارک کھولا گیا ہو۔ کنور نے ایک ہی فائر پر اکتفا نہیں کیا تھا اس نے مزید کئی فائر کئے تھے۔ مگر اس دوران چونکہ وہ کرسی سمیت الٹ گیا تھا اس لئے گولیاں چھت سے ٹکرائیں اور بہت سا پلستر ادھر کر نیچے گرا۔

میں نے کنور کی طرف جھپٹنے میں دیر نہیں کی تھی مگر وہ میرے اندازے سے کہیں زیادہ پھرتی سے رشی کو ایک طرف اچھال کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے جیسے ہی میز کے عقب سے اس کا سر ابھرتے دیکھا' میز اس پر الٹ دی مجھے اس تک پہنچنے میں تاخیر ہو چکی تھی لیکن میز الٹنے سے میرا مقصد حل ہو گیا۔ مجھے چند لمحے کی مہلت مل گئی میز بہت وزنی تھی۔ میرا خیال تھا کہ کنور اس کے تلے دب کر کچھ دیر کے لئے ضرور بے بس ہو جائے گا مگر ایسا نہیں ہوا تاہم اس کا ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر ضرور کچھ دور جا گرا۔ میز کو اس نے کھلونے کی طرح ہوا میں اچھال دیا۔ وہ ایک دھماکے سے کچھ دور جا گری اور اس کے ساتھ ہی جیسے میرے اور کنور کے درمیان سے کوئی فصیل ہٹ گئی۔

اب ہم ایک دوسرے کے سامنے تھے کنور فرش پر چت تھا اور میں گھٹنوں کے بل کھڑا تھا میں نے اس کے سینے پر کراٹے کے وار کے لئے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ ناقابل یقین پھرتی سے اس نے میرے سینے میں لات رسید کر دی۔ میں الٹ کر پیچھے جا گرا..... ضرب اتنی شدید تھی کہ عام آدمی کی شاید پسلیاں دوہری ہو جاتیں۔ ایک لمحے کے لئے تو میں بھی چکرا گیا۔ دل جیسے اچھل کر حلق میں آ گیا تھا لیکن مجھے فوراً" سنبھلنا پڑا۔ کنور چیتے کی سی پھرتی سے ریوالور پر جھپٹا تھا۔ اس بار میں نے اس کے جبڑے پر ٹھوکر رسید کی۔ وہ الٹتے الٹتے سنبھل گیا۔ اسی دوران میں نے دوسری ٹھوکر سے ریوالور کو کافی دور پہنچا دیا۔

کنور نے ریوالور کا خیال چھوڑ دیا اور اٹھ کر بھوکے درندے کی طرح مجھ پر جھپٹا۔ گوشت کے ابھاروں میں گھری ہوئی اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ اس کی پیشانی اور باچھوں سے خون بہنے لگا تھا' مگر اس کے ہونٹ مسکراہٹ کے سے انداز میں کھنچے ہوئے تھے اور اس عالم میں اسے دیکھ کر..... اندازہ ہوتا تھا کہ اس شخص کی نفرت میں خون کی پیاس رچی ہوئی ہے۔

وہ بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح مجھ سے ٹکرایا اور دھکیلتا ہوا مجھے دور تک لے گیا۔

دیوار کے ساتھ چپکا کر اس نے پوری قوت سے میری پسلیوں کے نیچے گھونسہ رسید کرنا چاہا مگر میں اس کی گرفت سے پھسل گیا اور اس کا گھونسہ ہتھوڑے کی طرح دیوار سے ٹکرایا۔ یہ چوٹ اچھے بھلے مضبوط آدمی کا ہاتھ بیکار کر دینے کے لئے کافی تھی..... مگر اس نے ایک ہلکی سی غراہٹ کے بعد پہلے سے زیادہ مشتعل ہو کر اسی ہاتھ سے میرے منہ پر گھونسہ رسید کرنے کی کوشش کی۔ اس مرتبہ بھی میں جھکائی دے گیا۔ یہ سب کچھ وہ اتنی پھرتی سے کر رہا تھا کہ مجھے اپنی تمام صلاحیتوں کے باوجود اس پر حملہ کرنے کی مہلت نہیں مل رہی تھی۔

اچانک اس نے مجھے فلائنگ کک رسید کی جو میرے لئے بالکل ہی غیر متوقع چیز تھی۔ میں گرا اور گرتے گرتے دیوار سے جا ٹکرایا۔ ایک لمحے کے لئے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ چھت فرش پر لڑتے ہوئے فلائنگ کک برداشت کرنا اور لگانا دونوں ہی آسان کام نہیں ہیں۔ مگر میں نے دیکھا کہ میری آنکھوں کے سامنے ایک لمحے کے لئے چھانے والا اندھیرا دور ہونے تک کنور ایک بار پھر مجھ پر ٹوٹ پڑا تھا۔ اس نے مجھے بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور غالباً" سر سے اونچا اٹھا کر فرش پر پٹخنا چاہتا تھا جب میں نے یا.....اوہ..... کی زوردار چیخ کے ساتھ اس کی ہنسلی کی ہڈی پر کراٹے کا ایک ہاتھ رسید کیا۔ اس مرتبہ اس کے حلق سے اذیت بھری کراہ خارج ہوئی جو اس بات کی نشانی تھی کہ ہنسلی کی ہڈی ٹوٹ چکی ہے اس سے کم تکلیف پر تو کنور جیسا آدمی نہیں کراہ سکتا تھا۔

وہ ایک لمحے کے لئے لڑکھڑایا اور سنبھل گیا اور ایک بار پھر اس نے فلائنگ کک لگانے کی کوشش کی۔ اس کا انداز بتاتا تھا کہ وہ جوڈو کی شد بد رکھتا ہے کیونکہ اس کی فلائنگ دراصل "تاپ سوئی" کی ایک کوشش تھی۔ میرا غم و غصہ اور اشتعال اب میرے قابو سے باہر ہو چکا تھا۔ ہر بات کی مصلحت میرے ذہن سے نکل چکی تھی۔ صرف اس شخص کو سبق سکھانے اور سزا دینے کا تصور رہ گیا تھا۔

فلائنگ کک کے لئے جو وہ ہوا میں بلند ہوا تو میں نے اس کے نشانے سے ہٹ کر اس کی پنڈلی پر کراٹے کا ایک ہاتھ مارا اس وار نے یقیناً" اس کی پنڈلی کا گوشت دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا ہو گا۔ وہ فرش پر گرا تو فوری طور پر اٹھ نہیں سکا۔ اسی دوران میں نے اس کی کنپٹی پر ٹھوکر رسید کی۔ وہ بلبلاتا ہوا اٹھا مگر اس کی ٹانگ میں لنگڑاہٹ تھی۔ اس کے حلق سے اب جو آوازیں نکل رہی تھیں وہ کئی درندوں کی غراہٹ سے مشابہہ تھیں۔

اس کا چہرہ خون سے لتھڑ چکا تھا۔ میں نے اس کی چندیا کے عین وسط میں چاپ لگائی۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا ایک لمحے کے لئے اس کا سر ادھر ادھر کو ڈولا مگر دوسرے ہی لمحے وہ اچھل کر مجھ پر جھپٹا۔ میں نے اس کے چہرے پر اتنی طاقت سے گھونسہ رسید کیا کہ اس کی چھوٹی سی ناک بالکل ہی چپٹی ہو گئی اور اس کے چہرے پر خون کی تہہ گہری ہو گئی۔

اس بار وہ میری طرف آیا تو میری انگلیوں کے ایک ہلکے سے وار نے اس کی ایک

آنکھ کو ملغوبے میں تبدیل کر کے رکھ دیا۔ ایک لمحے پہلے جہاں آنکھ نظر آرہی تھی وہاں اب محض خون اور شفاف جیلی نما مادے کا ملغوبہ نظر آرہا تھا۔

میں نے اس کے سنبھلنے سے پہلے اسے اٹھایا اور پھر فرش پر پٹخ دیا اور ساتھ ہی زخرے پر پاؤں رکھ دیا۔ اس مرتبہ وہ ساکت پڑا رہ گیا اور اپنی اکلوتی رہ جانے والی آنکھ کو تیزی سے جھپکاتے ہوئے یوں خاموشی سے چھت کو دیکھنے لگا جیسے اس آنکھ کی بینائی بھی تیزی سے غائب ہو رہی ہو...... اس کی نظر میں شکست خوردگی جھلک آئی تھی۔

"اٹھو۔" میں نے اس کے کولہے پر ٹھوکر رسید کی۔ "ابھی تو تمہیں مجھ لونڈے کو ککڑی کی طرح بیچ میں سے توڑنا ہے۔ اٹھو میرے شیر جوان میرے رستم زماں!" میں نے اسے ایک اور ٹھوکر رسید کی وہ نحیف سے انداز میں بلبلایا اور اس نے رحم طلب سے انداز میں ہاتھ اٹھایا۔ پھر اس کا بازو دوبارہ ڈھیلے ڈھالے انداز میں فرش پر جا لگا۔ میں نے اسے ایک بار پھر گریبان سے پکڑ کر کھڑا کرنے کی کوشش کی اس سے صحیح طور پر کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔

"جس شخص کو تم نے اس ہک پر لٹکا کر اس کے جسم کے نازک حصوں پر سوئیاں چبھو چبھو کر اسے اذیت کی موت مارا تھا اس کا جرم کیا تھا؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو اس کو ٹھکانے لگانے کے ایک لاکھ روپے ملے تھے اور ساتھ ہی ہدایت کی گئی تھی کہ اسے جلدی مگر حتی الامکان تکلیف دہ طریقے سے مارا جائے۔"

"اب میں تمہیں اسی ہک پر لٹکانے لگا ہوں۔" میں نے اسے ہک کی طرف گھسیٹتے ہوئے کہا۔ "اور میں تمہارے ہاتھ بھی نہیں باندھوں گا کیونکہ تمہارا وزن اتنا ہے کہ ہک پر لٹکتے ہی تمہاری یہ موٹی گردن اتنی گہرائی تک ہک میں پھنس چکی ہوگی کہ تم میں ہلنے کی سکت ہی نہ رہے گی...... اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ میں یہ خدمت بلا معاوضہ انجام دوں گا۔

تمہاری طرح کسی سے ایک لاکھ تو کیا ایک روپیہ بھی نہیں لوں گا۔"

چند قدم تو وہ گھسٹتا چلا گیا مگر ہک کے قریب پہنچ کر اڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ تب میں نے پوچھا۔ "مرنا نہیں چاہتے...... خصوصاً" ہک پر لٹک کر؟" اس نے نفی میں سر ہلایا اور ہنسلی کی ہڈی ٹوٹی ہونے کی وجہ سے بری طرح کراہ اٹھا۔

"تو پھر جو کچھ میں پوچھوں وہ بتانا پڑے گا۔ بتاؤ گے؟" میں نے اسے دوبارہ اپنے قریب گھسیٹتے ہوئے کہا۔

"بتاؤں گا۔" اس نے خرخراتی سی آواز میں جواب دیا۔

میں نے مناسب سمجھا کہ کنور میسوری سے پوچھ گچھ شروع کرنے سے پہلے روپا کو گھر بھیج دوں۔ یہاں کسی وقت بھی کوئی نیا خطرہ نازل ہو سکتا تھا۔ میں نے اسے اس کیڈلک کی چابیاں دے دیں جس میں وہ لوگ ہمیں یہاں لائے تھے۔

"تم فوراً اس گاڑی میں بیٹھ کر گھر روانہ ہو جاؤ۔ چاہو تو راستے میں کہیں یہ گاڑی چھوڑ دینا اور ٹیکسی لے لینا۔" میں نے ہدایت کی۔

روپا مجھے وہاں چھوڑ کر جاتے ہوئے ہچکچائی لیکن میرے سمجھانے پر رخصت ہو گئی۔ تب میں دوبارہ کنور میسوری کی طرف متوجہ ہوا۔ مجھے وہیں الماری سے ایک چھوٹی سی کلہاڑی بھی مل گئی تھی جو اب میرے ہاتھ میں تھی۔ کنور میسوری بالکل نڈھال اور بے دم تھا۔

"سب سے پہلے تو یہ بتاؤ کنور میسوری کہ تم کون ہو؟ تمہارا اصل نام کیا ہے؟" میں نے اس کا بازو کھینچ کر اس کے ہاتھ کی انگلیاں فرش پر پھیلاتے ہوئے پوچھا۔ "یاد رکھو کہ اگر تم نے میرے سوالوں کا جواب دینے میں حیل و حجت کی تو میں پہلے ایک ایک کر کے گاجر مولی کی طرح تمہاری انگلیاں کاٹنی شروع کروں گا۔ پھر ہاتھ...... پھر پاؤں......"

"میرا اصل نام نشیطل ہے۔" وہ تیزی سے بول اٹھا۔ "قومیت کے اعتبار سے لیبانی ہوں۔ لیکن پلا بڑھا بمبئی میں ہوں......" چند لمحے تک ہانپنے کے بعد اس نے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ "نوجوانی کے زمانے سے ہی مجھے اونچے درجے کے بدمعاشوں کی صحبت میسر آگئی تھی اور زیر زمین سرگرمیوں میں میں نے بڑی تیزی سے ترقی کی لیکن میری اپنی ایک الگ سی لائن بن گئی اور وہ یہ کہ میں صرف ایسے معروف اور ممتاز افراد کے قتل یا اغواء کے لئے مخصوص ہو کر رہ گیا جن پر عام بدمعاش یا تو ہاتھ ڈالتے ہوئے ڈرتے تھے یا وہاں تک ان کی رسائی ہی نہیں تھی۔"

وہ ایک بار پھر ہانپنے لگا اور چند لمحے تک کچھ نہ بولا تو میں نے پوچھا "روپا کو تم کس کے لئے اغوا کر رہے تھے؟"

"وکرم کے لئے۔" وہ سانس کو اعتدال پر لانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "لیکن حقیقت یہ ہے کہ وکرم بھی یہ کام کسی اور کے لئے کر رہا تھا۔ چکر یہ ہے کہ ہماری زیر زمین

دنیا میں مشہور آدمیوں کے قتل یا اغوا کے بھی ٹھیکے چلتے ہیں۔ روپا کے قتل کا ٹھیکہ وکرم کو کافی عرصہ سے ملا ہوا ہے۔ کام کرانے والی پارٹی کون ہے یہ مجھے بھی معلوم نہیں۔ وکرم نے اپنے کئی گرگے آزمائے لیکن روپا کی یا تو قسمت اچھی تھی یا حملے غلط وقت اور غلط جلسوں پر ہوتے رہے کہ ہر مرتبہ وہ بچ گئی۔ پھر سننے میں آیا کہ اس نے ایک کام کا آدمی رکھ لیا ہے۔ وہ آدمی تم تھے۔ ٹھیکہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ حالانکہ وکرم ایڈوانس کے طور پر ایک بڑی رقم لے کر خرچ بھی کر چکا تھا۔ اس دوران حالات میں ایک تبدیلی یہ آئی کہ وکرم کو پتہ چلا کہ ایک افریقی ریاست کا شہزادہ لندن میں کہیں روپا کی ایک فلم دیکھ بیٹھا ہے اور اس پر پاگل پن کی حد تک عاشق ہو گیا ہے۔ اس نے چند ایک نہایت اونچے درجے کے ایجنٹوں سے بات کی کہ اگر روپا کو اس کے شبستان کی زینت بنوا دیا جائے تو وہ روپا کو پانچ لاکھ پاؤنڈ اور ایجنٹوں کو معقول کمیشن ادا کر سکتا ہے۔ ایجنٹوں نے ٹوہ لگائی اور حتمی طور پر اس نتیجے پر پہنچے کہ روپا ان فلمی اداکاراؤں میں سے نہیں ہے جو غیر ملکی والیان ریاست یا شہزادوں وغیرہ کی اس قسم کی پیشکش قبول کر لیتی ہیں۔ تم چاہو تو روپا سے تصدیق بھی کر سکتے ہو کہ ۔۔۔ ایک مرتبہ افریقی شہزادے شوبی کی طرف سے اسے اپروچ کرنے کی کوشش کی گئی تھی یا نہیں۔ مختصراً یہ کہ وکرم کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس قسم کا کوئی موقع موجود ہے اور کوئی اس سے فائدہ نہیں اٹھا پا رہا ہے تو اس نے ایک تیر سے دو شکار کرنے کی ٹھانی کہ روپا کو مارنے کی بجائے اغوا کر کے مالتی مندر پہنچا دے جہاں سے افریقی شہزادہ شوبی اسے خود ہی اپنی ریاست انگازو بھی لے جائے گا۔"

میں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ مالتی مندر ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا۔ ماہم کریک کی طرف سے سمندر میں مالتی مندر تک کا سفر تقریباً آٹھ میل کا تھا۔ میں کبھی اس طرف گیا نہیں تھا لیکن میں نے سنا تھا کہ جزیرے کا کچھ حصہ کسی افریقی شہزادے کی ملکیت ہے۔ جس نے وہاں تقریباً پچاس ایکڑ پر ایک خوبصورت محل بنوا رکھا ہے اور ہندوستان میں قیام کے دوران وہیں ٹھہرتا ہے لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کونسی افریقی ریاست کا شہزادہ ہے اور اس کا نام کیا ہے۔

"اچھا تو وکرم نے روپا کو فروخت کرنے کا پروگرام بنا رکھا ہے؟" میں نے پوچھا۔

نشچل نے اثبات میں اشارتاً جواب دینے کی کوشش کی اور ایک بار پھر کراہ کر رہ گیا۔ "وہ دونوں پارٹیوں سے پیسے کھرے کرنا چاہتا تھا۔ جس پارٹی نے روپا کو مروانے کا ٹھیکہ دیا تھا اس سے وکرم نے پچاس ہزار ایڈوانس لے رکھا ہے اور کام مکمل ہونے پر دو لاکھ کا وعدہ ہے۔ اگر اس نے شوبی سے بھی پیسے کھرے کر لئے ہوتے تو اس کی کئی نسلوں کے لئے ... مالدار ہو جاتے بشرطیکہ اس کی نسلیں اس دنیا میں آنے میں کامیاب ہو جاتیں۔ آج کل وہ سختی سے پولیس اور سی آئی ڈی کی نظر میں ہے۔ اس لئے خود کسی کام میں ہاتھ

نہیں ڈال رہا۔ ٹھیکہ در ٹھیکہ والے سسٹم سے کام چلا رہا ہے اور اس میں بھی لمبے نوٹ کما رہا ہے۔ دنیا کے ہر ملک کی کرنسی اس کی بریف کیس میں موجود ہوتی ہے۔ شملہ کے ایک شراب خانے میں میری جب اس سے ملاقات ہوئی اور اس نے مجھے اس ٹھیکے کی پیشکش کی تو کم از کم ایک لاکھ روپیہ کی تو اس نے دونوں ہاتھوں میں ہیروں کی انگوٹھیاں پہن رکھی تھیں پچیس ہزار کا گلے میں لاکٹ ہو گا۔ فرالس کا سلا ہوا سوٹ تھا اور ۔۔۔۔"

"بس کرو۔" میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "اس کے سارے زیورات وغیرہ کی تفصیلی رپورٹ بتانے کی ضرورت نہیں۔ وہ مرد ہے یا کوئی نویلی دلہن۔"

"یہ تو تمہیں تب معلوم ہو گا جب اس سے سامنا ہو گا۔" نشچل نے قدرے مرعوبیت زدہ لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھ بند ہوئی جا رہی تھی اور وہ بصد کوشش اسے کھلی رکھ رہا تھا۔ دفعتاً وہ نہایت نحیف لہجے میں بولا۔ "مجھ پر بے ہوشی طاری ہو رہی ہے۔ تمہیں تمہارے خدا کا واسطہ مجھے جلد اس جگہ پہنچا دو جہاں مجھے امداد مل سکے۔"

"طبی امداد لینے کا اتنا ہی شوق تھا تو لڑنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا پھر قدرے تشفی آمیز لہجے میں کہا۔ "بے فکر رہو میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔ یہ رشی کون تھا؟"

اس نے گردن ترچھی کر کے ایک نظر اوندھے پڑے رشی کو دیکھنے کی کوشش کی جس کے منہ سے لہو ایک پتلی سی لکیر کی شکل میں بہہ کر اب خشک ہو چلا تھا۔

"تھا تو یہ میرا ہی آدمی لیکن بہت دنوں سے اس کے دل میں آزادانہ کام کرنے کی خواہش مچل رہی تھی۔" اس کے کچلے ہوئے ہونٹوں میں حرکت سی ہوئی۔ میں نے ایک نظر گھڑی پر ڈالی۔ "وکرم ایک بجے آئے گا نا؟"

"ہوں۔" اس کا جواب اثبات میں تھا۔ مگر نقاہت کے مارے صرف ہنکارا سا بھر کر رہ گیا تھا۔ اس کی آنکھ اب بند ہوتی جا رہی تھی اور اسے کھلی رکھنے کی اب اس میں سکت نہیں رہی تھی۔

"وہ تنہا ہی ہو گا؟" میں نے اس کا کندھا ہلاتے ہوئے پوچھا۔ اس کا جسم اب بالکل ڈھیلا پڑ چکا تھا۔ بھیگی ہوئی روئی کی طرح۔

"ہوں۔" اس نے پہلے سے مدھم ہنکارا ابھرا۔

"میں آ گیا ہوں دوست۔" دفعتاً میرے عقب سے ایسی مردانہ آواز سنائی دی جس میں حد سے زیادہ مٹھاس تھی۔ میرے اعصاب ایک لمحے کے لئے جھنجھنا کر رہ گئے مگر میں نے اپنے آپ کو کوئی ردعمل ظاہر کرنے سے باز رکھا اور فوراً ہی اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ کسی خوش فہمی میں مبتلا ہوئے بغیر میں نے اپنے آپ کو یقین دلایا کہ یہ وکرم آ پہنچا ہے۔ نشچل نے کم از کم دو باتیں تو غلط ہی بتائی تھیں۔ ایک تو وکرم کی آمد کے وقت کے بارے میں

کیونکہ ابھی ساڑھے بارہ بجے تھے۔ دوسرے اس کے تنہا آنے والی بات بھی غلط تھی کیونکہ میں نے غیر محسوس انداز میں گردن ترچھی کرتے ہوئے کن انکھیوں سے اپنے پیچھے کم از کم تین آدمیوں کی جھلک تو دیکھی تھی' عین ممکن تھا کہ وہ اس سے بھی زیادہ ہوں۔

"تمہیں میرا ہی انتظار تھا ناں؟" وہی شیریں آواز ایک لمحے کے توقف کے بعد سنائی دی۔ "اب بالکل اسی طرح ہاتھوں کو ساکت رکھتے ہوئے سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔ کوئی ہتھیار وغیرہ نکالنے کی کوشش نہ کرنا' زندگی اور مختصر ہو جائے گی۔" پھر اس کے ایک طویل سانس لینے کی آواز سنائی دی۔ شاید اس کی نظر اب نشچل پر پڑتا تھی کیونکہ اس نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔ "نشچل زندہ..... ہے یا مر گیا؟"

میں کوئی جواب دیئے بغیر آہستگی سے سیدھا کھڑا ہو گیا تب اس نے خود نشچل کو پکارا مگر اس کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔

"نشچل کا یہ حشر تم نے ہی کیا ہے؟" مجھ سے پوچھا گیا۔ لہجے میں تحیر یا بے چینی کی جھلک نہیں تھی۔ یہ محض ایک سیدھا سادا سا سوال تھا۔

میں نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا تو اس کے لہجے کی شیرینی قدرے کم ہو گئی۔ "کیا بندر کوبی کی طرح منہ پھلائے کھڑے ہو۔ ذرا ادھر گھوم جاؤ۔ میں بھی تو تمہارے درشن کروں۔ باتیں تو باتیں سنی ہیں۔"

میں ابھی تک دل ہی دل میں اپنے آپ کو اس بات پر کوس رہا تھا کہ نشچل سے پوچھ گچھ کرنے میں اتنا منہمک ہو گیا تھا کہ تین افراد کی آمد کا مجھے احساس تک نہ ہو سکا۔ اگر اپنے حواس سے کام لینے میں میری مستعدی کا یہی عالم تھا تو پھر میرا اللہ ہی حافظ تھا۔

آہستہ آہستہ میں ان لوگوں کی طرف گھوما۔ تعداد میں وہ تین ہی تھے وکرم ایک گہرے رنگ کے سوٹ میں ملبوس تھا۔ ٹائی ہیٹ حتیٰ کہ کوٹ کی سامنے والی جیب سے جھانکتے ہوئے رومال تک کے لوازمات مکمل تھے۔ اپنے صاف ستھرے' ظاہری حلیے کی بدولت وہ پڑھے لکھے خوشحال تاجر نظر آتے تھے۔ خاص بات یہ تھی کہ ان میں سے دو کے ہاتھوں میں بدصورت قسم کے ریوالور تھے۔ ایک کی نال میرے پیٹ کی سیدھ میں تھی اور دوسرے کی میرے سینے کی سیدھ میں۔

درمیان والے کے ہاتھ میں ریوالور کے بجائے نہایت نفیس قسم کا بریف کیس تھا۔ یہ شخص یقیناً وکرم تھا۔ اسے میں نے اس کے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں چمکتی ہوئی چار بیرے جڑی انگوٹھیوں کی مدد سے پہچانا۔ وہ قد میں اپنے دائیں بائیں کھڑے ریوالور بدست دونوں ساتھیوں سے اونچا تھا۔ کلین شیو' لمبوترا چہرہ باریک بھنویں' نیلی آنکھیں اور گوری رنگت' چلنے اور قد کاٹھ کے اعتبار سے وہ ایک دھائی پہلے کی فلموں کا ہیرو نظر آتا تھا۔ مگر اس کی کشادہ پیشانی پر زخم کے ایک بڑے سے نشان نے اس کی شخصیت کو گہنا دیا

رہا تھا۔

"ماشاء اللہ چندے آفتاب چندے ماہتاب۔" وکرم نے گویا کسی تو سو ور کی بلائیں لیتے ہوئے کہا۔ "تو آخر تم نے یہاں بھی بازی پلٹ ہی دی۔ روپا کہاں ہے؟"

میں نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے چہرے پر قدرے جھنجلاہٹ کے آثار دکھائی دیئے۔ مگر دوسرے ہی لمحے وہ پہلے کی طرح نارمل نظر آنے لگا۔ بڑے مطمئن انداز میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا وہ میری طرف بڑھا۔ میرا ارادہ یہی تھا کہ جیسے ہی وہ تلاشی کے لئے مجھے چھوئے گا عین اسی لمحے اپنی کارروائی شروع کر دوں گا۔ بعد میں بات بگڑ بھی سکتی تھی۔ وکرم اور اس کے دونوں ساتھی مجھے عام بدمعاش نظر آ رہے تھے۔ وہ ہاتھا پائی کے عادی معلوم نہیں ہوتے تھے۔ ان کا انحصار اسلحے پر محسوس ہوتا تھا۔

میں منتظر ہی رہ گیا کہ وکرم قریب آ کر میری تلاشی لے گا لیکن وہ مجھ سے دو قدم کے فاصلے پر ہی رک گیا اور پھر اس کی لات اتنی تیزی سے چلی کہ میں محض اس کی ایک جھلک ہی دیکھ سکا..... میری آنتیں گویا یک لخت ایک گولے کی سی شکل میں سمٹ کر میرے حلق میں آ پھنسیں اور میں مزاحمت کی تمام تر کوشش کے باوجود شہتیر کی طرح دیوار سے جا ٹکرایا۔ غنیمت تھا کہ میرا سر دیوار سے نہیں ٹکرایا ورنہ شاید میں چکرا کر گر پڑتا' اس تکلیف کے عالم میں بھی میں اس بات پر حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکا کہ تقریباً عام سی جسامت کے اس انسان میں اتنی طاقت کیونکر تھی کہ اس کی ٹانگ کی ضرب نے میری آنتیں الٹ کر رکھ دی تھیں بلکہ مجھے اتنی قوت سے کئی گز پیچھے دیوار سے اس طرح ٹکرا دیا تھا کہ میری کمر مفلوج سی ہو کر رہ گئی تھی۔

وکرم نے اسی پر بس نہیں کی۔ میں جیسے تیسے دیوار سے لگا ابھی سیدھا بھی نہیں ہو پایا تھا کہ اس نے میرے سر کے پیچھے گھونسا رسید کیا۔ پہلے مجھے یہ شبہ گزرا کہ شاید اس کے ہاتھ میں کوئی ہتھوڑا تھا۔ جس سے اس نے ضرب لگائی ہے مگر جب میں سنبھل کر سیدھا ہوا تو اس کے ہاتھ مجھے خالی نظر آئے۔

میری حالت دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر متکبرانہ مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔ اور وہ شیخی میں آ کر شاید مجھے سنبھلنے کا موقع دے رہا تھا۔ میں نے سر جھٹک کر کئی مرتبہ آنکھیں جھپکائیں تو اس کی متکبرانہ مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی۔

اس نے کسی باکسر کی سی تیزی اور مشاقی سے میری ناک پر گھونسا رسید کرنے کی کوشش کی جو میری پیشانی پر پڑا۔ اس شخص کے ہاتھ پیروں میں واقعی فولاد کی سی سختی تھی۔

اب بہت ہو چکی تھی۔ اتنی مار میں نے پہلی مرتبہ کھائی تھی لیکن ایک حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ان چند ضربوں نے جہاں مجھے تکلیف پہنچائی تھی وہاں جیسے میری جان کی نامعلوم گہرائیوں میں سوئی ہوئی کچھ عجیب سی قوتوں کو بھی بیدار کر دیا تھا۔ اندر ہی اندر جیسے

کسی آتش فشاں کا دہانہ کھل گیا تھا۔

وکرم میری آنکھوں میں طوفان کی آمد کے آثار نہیں دیکھ سکا کیونکہ اس کی آنکھوں پر اس وقت تکبر کی پٹی چڑھی ہوئی تھی۔ میرے بازو کی حرکت بھی وہ نہیں دیکھ سکا ہو گا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار شاید اتنی قوت سے کراٹے کا وار کیا تھا۔ میرا ہاتھ بیلچے کی طرح اس کی پیشانی کے وسط میں پڑا اور یہ دیکھ کر مجھے افسوس ہوا کہ اس ایک وار نے ہی کم از کم وکرم کی حد تک معرکہ آرائی کا فیصلہ کر دیا۔ کچھ لوگ صرف مارنے کی حد تک طاقتور ہوتے ہیں برداشت کی طاقت ان میں کم ہی ہوتی ہے۔ وکرم شاید اسی قبیل کے شہ زوروں میں سے تھا۔

پھر پیشانی پر ہاتھ پڑتے ہی وہ بے بنیاد دیوار کی طرح آگے کو جھک گیا اور قریب تھا کہ مجھ پر گر پڑتا۔ میں نے اسے تھام کر گردن کے گرد بازو کستے ہوئے اس طرح روک لیا کہ اس کا چہرہ اس کے ساتھیوں کی طرف ہو گیا اس کی پیشانی کی کھال پھٹ چکی تھی اور اس کا جسم جس ڈھیلے ڈھالے انداز میں میری گرفت میں "تقریباً" جھول رہا تھا اس سے مجھے اندیشہ محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی کھوپڑی کی ہڈی ٹوٹ گئی ہو۔

اس کے ساتھیوں کو شاید صحیح معنوں میں اندازہ ہی نہ ہو پایا تھا کہ ان کے باس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ وہ غالباً اسی خیال سے قدرے مطمئن کھڑے تھے کہ باس کے ہاتھوں مار کھاتے کھاتے وہ مجھے چند لمحوں پر فرش پر ڈھیر ہوتے دیکھیں گے لیکن جب انھوں نے باس کو بے بسی کے عالم میں میری گرفت میں دیکھا اور اس کا خون آلود چہرہ ان کے سامنے آیا تو وہ جیسے کسی خواب سے ہڑبڑا کر بیدار ہو گئے۔

ان میں سے ایک نے نہایت پھرتی سے اپنے ریوالور والے ہاتھ پر ہاتھ رکھا اور دائیں ٹانگ کو ذرا خم دے کر وہ فائر کرنے ہی لگا تھا کہ اس کے ساتھی نے اس کے ریوالور کی نال پر ہاتھ رکھ کر اسے جھکا دیا اور تب اسے احساس ہوا کہ اگر وہ فائر کر دیتا تو گولی پہلے اس کے باس کے جسم میں پیوست ہوتی۔ میں نے مکمل طور پر اسے اپنی ڈھال بنا رکھا تھا۔ ان ریوالور برداروں کی غلطی یہ تھی کہ وہ دونوں قریب ہی کھڑے تھے۔ اگر وہ ایک دوسرے سے کچھ ہٹ کر کھڑے ہوتے تو ان میں سے کوئی ایک تو مجھ پر کسی پہلو سے فائر کر سکتا تھا۔

"ریوالور پھینک دو۔" میں نے اپنی سانس کے بلکے سے ارتعاش پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "ورنہ چشم زدن میں اس غلام کی گردن ٹوٹ جائے گی۔" غیر ارادی طور پر میرے لہجے میں ایک لوفرانہ سی شوخی بھی تھی۔

میں نے دونوں ریوالور برداروں کے چہروں پر الجھن کے آثار دیکھے تو وکرم کی گردن کو ایک خاص انداز میں ہلکا سا جھٹکا دیا۔ ہڈی کی کڑکڑاہٹ انھوں نے بھی سن لی۔

"اس کی گردن ٹوٹنے لگی ہے۔" میں نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ "اور شاید تمہیں

علم نہ ہو اس لئے بتا دوں کہ گردن ٹوٹنے کے بعد آدمی مر جاتا ہے۔"

انھوں نے مشورہ طلب نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تو میں نے وکرم کی گردن کو اسی مخصوص انداز میں ایک ہلکا سا جھٹکا اور دے دیا۔ اس مرتبہ ہڈیاں کڑکڑانے کی آواز کے ساتھ مجھے وکرم کے جسم میں ہلکا سا تناؤ بھی محسوس ہوا اور مجھے قدرے اطمینان ہوا کہ اس کے دماغ کو اتنی چوٹ نہیں پہنچی تھی کہ وہ مر جاتا۔ ابھی وہ زندہ تھا مگر نہ جانے کتنی دیر کے لئے دنیا مافیہا سے بے خبر ہو چکا تھا۔

ان دونوں کے ہاتھوں میں ریوالوروں کا رخ فرش کی طرف ہو گیا۔ "ذرا آگے کو پھینکنا میرے قریب۔" میں نے فوراً ہدایت دی۔ ان کے چہروں کو دیکھتے ہوئے میں شبہ بھی نہیں کر سکتا ہے۔ مگر یہ میری خام خیالی تھی کہ موت کے منہ میں پھنسا ہوا انسان بھی اپنی سی کوشش تو کرتا ہے۔ ان میں سے ایک نے بظاہر نہایت مایوسی کے عالم میں ریوالور میری طرف پھینکتے پھینکتے اچانک فائر کر دیا جبکہ دوسرے کا ریوالور میرے قدموں میں آن گرا تھا۔

شاید میری قسمت ہی اچھی تھی کہ میں نے بروقت اس کی انگلی ٹریگر پر کھنچتے دیکھ لی تھی اور میں گھٹنے کے بل ایک طرف کو گر گیا تھا۔ اس نے اندھا دھند اسی سمت میں دو فائر اور کر دیئے تھے۔ میں بغیر کسی اندازے کے ہی ایک طرف کو گرا تھا۔ بہرحال اس کوشش نے مجھے بچا لیا ورنہ شاید میرے آدھے جسم کے پرخچے اڑ گئے ہوتے۔ فائر کرنے والا کچھ نروس سا ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ ریوالور کا رخ درست کر سکتا میں نے اس پر دوسرے ریوالور سے فائر کر دیا۔ وہ ہوا میں "تقریباً" ایک فٹ اچھلا اور کوئی آواز نکالے بغیر الٹ کر کافی پیچھے جا پڑا۔

میں نے اس کے ساتھی کا جائزہ لیا۔ وہ مجسمے کی طرح ساکت کھڑا تھا اور لاش کی بجائے ہوا میں کسی غیر مرئی چیز کو ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ زندگی سے محروم نظر آ رہا تھا۔ یک لخت ہی جیسے کسی نے اس کا سارا خون چوس لیا تھا۔

میں نے ایک ریوالور جیب میں رکھ کر وکرم کا بریف کیس اٹھایا اور ریوالور سے وکرم کے ساتھی کو اس طرف چلنے کا اشارہ کیا جدھر چند کرسیاں بے ترتیبی سے پڑی تھیں۔ اس نے خاموشی سے میرے اشارے کے مطابق عمل کیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے کوئی لاش کسی طاغوتی طاقت کے اشارے پر اٹھ کھڑی ہوئی ہو اور اس کے احکامات کی پابندی کر رہی ہو

وہ ایک کرسی پا جا بیٹھا۔ اب اس کے اور میرے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ میں نے مطمئن ہو کر بریف کیس کا جائزہ لیا۔ وہ مقفل تھا۔ میں نے وکرم کی جیبوں کی تلاشی لی تو کوٹ کی ایک چھوٹی سی جیب میں مجھے ایک ننھی سی چابی مل گئی۔

میں نے بریف کیس کھولا اس میں صرف دو ہی چیزیں تھیں۔ ایک اسٹین گن جس کے مختلف حصے علیحدہ کر کے رکھے گئے تھے۔ بریف کیس میں ہر حصے کے لئے باقاعدہ ایک خانہ

بنا ہوا تھا۔ دوسری چیز نقدی تھی۔ سو سو کے نوٹوں کی چند گڈیاں اس کے علاوہ اس میں کچھ بھی نہیں تھا۔

بریف کیس بند کر کے میں نے ایک طرف رکھ دیا۔ اسے میں نے استعمال کے لئے منتخب کر لیا تھا۔ سیدھے کھڑے ہو کر میں نے تہہ خانے کا جائزہ لیا۔ طویل و عریض تہہ خانہ اس وقت میدان کار زار کا منظر پیش کر رہا تھا۔ ایک طرف میز الٹی پڑی تھی۔ ایک کرسی کی دو ٹانگیں ٹوٹی ہوئی تھیں دیوار کے ساتھ چنے ہوئے کئی کارٹن گر چکے تھے۔ دیواروں اور چھت میں سے متعدد جگہوں سے پلستر اکھڑ کر فرش پر بکھرا ہوا تھا اور ان جگہوں پر گولیوں کے گہرے گہرے نشانات نہایت بدنما لگ رہے تھے۔

ایک طرف نشچل چاروں خانے چت پڑا تھا۔ لہو میں لتھڑے ہوئے چہرے کے ساتھ وہ کوئی مردہ دیو نظر آ رہا تھا۔ اس کا سینہ نہایت آہستگی سے پھول اور پچک رہا تھا۔ لگتا تھا کہ سانسوں کی آمدورفت بہت سست پڑ چکی ہے۔ اس سے کچھ دور رشی اوندھا پڑا تھا۔

ایک طرف وکرم پڑا تھا۔ پیشانی کی کھال پھٹنے کے باعث اس کا چہرہ بھی خون میں تر تھا۔ اس کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ سانس اٹک اٹک کر آ رہی تھی۔ جب اس شخص نے لگاتار تین چار وار کر کے میرے حواس مختل کر دیئے تو مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ وہ کراٹے کا ایک ہاتھ کھا کر قریب المرگ ہو جائے گا۔

دروازے سے کچھ ادھر وکرم کا ساتھی تھا۔ وہ بھی اس طرح چت پڑا تھا کہ ایک ٹانگ مڑ کر اس کے اپنے ہی جسم تلے دبی ہوئی تھی۔ اس کی اردگرد خون کا تالاب سا پھیلتا جا رہا تھا۔ ان مردہ یا نیم مردہ انسان نما حیوانوں کے لئے میرے دل میں تاسف رحم یا پشیمانی کی کوئی رمق نہیں تھی۔

ریوالور کو ایک انگلی پر گھماتے ہوئے میں اس شخص کے قریب پہنچا جو اب تک کی کشمکش میں نہ صرف زندہ تھا بلکہ اس کے سوٹ پر شکن تک نہیں آئی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے کرسی پر بیٹھا ایک دیوار کو گھور رہا تھا۔ اس کی پلکیں شاید مستقل طور پر جھپکنا بھول گئی تھیں۔ اس کی حالت میں یہ تبدیلی مجھے کچھ حیرت انگیز سی لگ رہی تھی۔

میں اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ تب بھی اس نے آنکھ نہ جھپکی۔

"تمہارا نام؟" میں نے پوچھا۔

"درشن رام" اس کے ہونٹ مشینی انداز میں ہلے۔ میری طرف اس نے اب بھی نہ دیکھا تھا۔

"درشن رام۔" میں نے جوتے کی نوک اس کی کرسی پر ٹکاتے ہوئے کہا۔ "مجھے نہ تو زیادہ کچھ جاننے سے دلچسپی ہے اور نہ ہی میرے پاس بہت سے سوالات کرنے کے لئے وقت ہے۔ مجھے صرف یہ جاننے سے دلچسپی ہے کہ روپا کو ہلاک کرنے کے لئے وکرم کی

خدمات کس نے حاصل کر رکھی تھیں؟"

"وہ ایک امیر کبیر اور فیشن ایبل بڑھیا ہے۔ اس کا نام..... پورا نام تو معلوم نہیں کیا ہے سب لوگ اسے متوبرما کہہ کر بلاتے ہیں۔" اس کے ہونٹ کل پرزوں کی طرح یکساں رفتار سے ہل رہے تھے اور بہت ہی مدھم سی آواز برآمد ہو رہی تھی۔ مجھے کان لگا کر سننا پڑ رہا تھا۔ جس بے ساختگی سے وہ بول رہا تھا اس سے مجھے یقین ہو رہا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا۔

"میں نے وکرم کے ساتھ صرف ایک ہی مرتبہ اسے اس کے گھر پر قریب سے دیکھا ہے۔" وہ کہہ رہا تھا "جب ہم ایڈوانس کی رقم لینے گئے تھے۔"

"گھر کا پتا کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تھرٹین کشمیر بلیو وارڈ۔" اس نے رٹے رٹائے سبق کو دہرایا۔

ایڈریس بہت مختصر اور آسانی سے یاد رہنے والا تھا کشمیر بلیو وارڈ اور اس سے ملحقہ علاقہ اس لحاظ سے منفرد تھا کہ یہاں صرف ایسی کوٹھیاں تھیں جن کا رقبہ قطعوں یا گزوں میں نہیں ایکڑوں میں تھا۔ اونچے اونچے درختوں میں گھری ہوئی ان کوٹھیوں کی اصل عمارات یوں چھپی رہتی تھیں کہ سڑک سے گزرنے والوں کو یہ علاقہ محض ایک خوبصورت جنگل معلوم ہوتا تھا جس میں بہت سی طویل و عریض چار دیواریاں کھینچ دی گئی تھیں۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اب تمہارا کیا کروں؟" میں درشن رام کی طرف دیکھتے ہوئے خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑایا۔

"تم مجھے بھی مار ہی ڈالو۔" اس نے اب اچٹتی سی نظر مجھ پر ڈال کر اپنے مردہ ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کرشن رام کے بغیر جینے کا کیا فائدہ۔"

"بڑا پیارا تھا تمہیں اپنے ساتھی سے؟" میں نے اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی ویرانی کو قدرے حیرت سے دیکھا۔

"وہ میرا ساتھی نہیں سگا بھائی تھا۔ دفعتہً" جیسے وہ پھٹ پڑا..... "بچپن سے اب تک ہم ہمیشہ اکٹھے رہے تھے۔ ہر اچھا برا کام ہم نے مل کر ہی انجام دیا تھا اور ہمارا عہد تھا کہ ساتھ جئیں گے ساتھ مریں گے۔" وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔

"اوہ....." میرے ہونٹوں سے سیٹی کی سی آواز نکل گئی۔ میں اس کی ہچکیوں کے ساتھ لرزتے ہوئے جسم کو دیکھ رہا تھا۔ مگر میرے دل میں اس کے لئے کوئی نرم گوشہ پیدا نہیں ہوا تھا۔

"پھر تو مجھے بھی بڑا افسوس ہے کہ میں نے ایسی عدیم المثال جوڑی توڑ دی۔" میں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ "تم دونوں کا شمار تو شاید عنقریب دنیا کے آٹھویں عجوبے کے طور پر

ہونے لگتا۔ کم از کم میں نے تو آج تک دو بھائیوں میں اتنی یگانگت نہیں دیکھی۔" پھر میں نے جیسے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "بہرحال اگر تمہیں اتنا ہی دکھ ہے تو میں تمہاری ایک مدد کر سکتا ہوں۔ یہ لو ریوالور اور خودکشی کر لو۔ بقول تمہارے اب جینے کا کیا فائدہ۔"

میں نے جیب سے ریوالور جو "غالباً" اس کا اپنا ہی تھا نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ ریوالور ملتے ہی وہ بھی اپنے بھائی کی طرح زندگی اور موت کی کشمکش میں ایک آخری اور فیصلہ کن کوشش ضرور کرے گا۔ یعنی مجھ پر گولی ضرور چلائے گا اور میں اس کے لئے بھی تیار تھا۔ اسے ریوالور دیتے وقت میں اپنے بچاؤ کے لئے پوری طرح تیار تھا اور اس کی انگلی ٹریگر تک پہنچنے سے پہلے میں اس کے سینے میں گولی اتار دینے کی پوزیشن میں بھی تھا۔

مگر میں اس کے بچاؤ کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس لئے وہ اپنا کام کر گزرا۔ اس نے واقعی ریوالور کی نال کنپٹی پر رکھ کر بلا تامل ٹریگر دبا دیا۔ اس مرتبہ فائر کا دھماکا پہلے سے بھی کم تھا اور جو تھا اس سے بھی زیادہ آواز اس کی کھوپڑی کی ہڈی کے پاش پاش ہونے کی تھی۔

دوسرے ہی لمحے وہ کرسی سے نیچے میرے سامنے اس عالم میں ساکت پڑا تھا کہ اس کی کھوپڑی کا آدھا بالائی حصہ غائب تھا اور باقی شکستہ حصے سے یوں بھل بھل خون ابل رہا تھا جیسے لاکھوں شریانوں کے منہ کھل گئے ہوں۔

اپنا حلیہ کافی حد تک درست کرنے کے بعد میں نے تہہ خانے پر ایک الوداعی نظر ڈالی اور وہاں سے نکل آیا۔

دکرم کی جیبوں سے مجھے بریف کیس کی ننھی سی چابی کے علاوہ کار کی چابیوں کا ایک گچھا بھی ملا تھا۔ میری توقع کے مطابق کار گلی میں کھڑی تھی۔ یہ ایک سلور گرے جیگوار تھی۔ نہایت شاندار اور باوقار گاڑی تھی۔ اس کی بیڈ لائٹس بڑی سرچ لائٹس سے مشابہ تھیں۔

گاڑی میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کر کے میں سڑک پر لایا۔ یہ علاقہ میرے لئے اجنبی تھا۔ میں نے "اندازاً" گاڑی بائیں طرف موڑ لی کہ کسی بڑی سڑک پر پہنچ سکوں۔ کچھ دیر ادھر ادھر بھٹکنے کے بعد بالآخر میں شیواجی روڈ پر نکل آیا۔ شہر کے گنجان آباد علاقوں سے گزرتے وقت میں نے دیکھا عروسِ شب دھیرے دھیرے انگڑائیاں لیتی بیدار ہو رہی تھی۔ کلبوں، ہوٹلوں اور بڑی بڑی دکانوں کے نیون سائن جھلملانے لگے تھے۔

میرے کشمیر بلیورڈ پہنچنے تک رات اپنا رنگ جما چکی تھی۔ یہ سڑک تقریباً" تین میل لمبی تھی اور اس کے دونوں طرف پھیلی ہوئی بعض کوٹھیوں کی حدود تو اب سڑک سے ہی شروع ہو جاتی تھیں اور اپنی کوٹھیوں کے درمیان کہیں کہیں سے چھوٹی چھوٹی نجی سڑکیں

ان کوٹھیوں تک جا رہی تھیں جو پچھلی طرف واقع تھیں۔

بالآخر وہ کوٹھیوں کی چار دیواری کے درمیان مڑتی ہوئی ایک تھمی سی سڑک پر مجھے ٹریفک کے نشانات کی طرح لوہے کا ایک چھوٹا سا سائن بورڈ نظر آیا۔ جس پر سرخ رنگ سے لکھا تیرہ کا ہندسہ اور تیر کا نشان نظر آ رہا تھا۔ میں نے گاڑی اس سڑک پر موڑ دی۔

انگریز عموماً تیرہ کے ہندسے کو منحوس خیال کرتے ہیں لیکن ابھی میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ ہندسہ کس کے لئے منحوس ثابت ہونے والا تھا۔ میرے لئے یا اس کوٹھی کے مکینوں کے لئے؟

کھلے آسمان تلے مزید کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد مجھے اپنے سامنے ایک کھلا گیٹ نظر آیا جس کی سلاخوں میں تار کی مدد سے ٹین کی ایک چھوٹی سی پلیٹ جھول رہی تھی جس پر تیرہ کا ہندسہ چمک رہا تھا۔ اس کوٹھی کی چار دیواری نسبتاً کافی اونچی تھی اور اسی مناسبت سے گیٹ بھی اونچا اور کشادہ تھا مگر اس کی سلاخوں پر زنگ کی موٹی موٹی تہیں جمی ہوئی تھیں اور ظاہر یہی ہوتا تھا کہ ایک مدت تک یہ یونہی کھلا رہا ہے۔ اس کو بند کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ چار دیواری پر بھی نہ جانے کس زمانے میں زرد چونا پھیرا گیا تھا جس کی تہہ جگہ جگہ سے اکھڑ چکی تھی اور وہاں سیاہ کائی کی سی تہیں جم چکی تھیں۔ طویل و عریض احاطے میں درختوں سے جھڑے ہوئے ان گنت زرد زرد پتے بکھرے پڑے تھے۔

عمارت بدروحوں کا مسکن معلوم ہوتی تھی۔ ماحول پر وہی پراسراریت اور ہیبت ناک سا سکوت طاری تھا جس کی منظر کشی میں نے انگریزی کی خوفناک کہانیوں میں بار بار پڑھی تھی۔ دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ درختوں تلے تاریکی میں دونوں طرف آگے پیچھے مختلف رنگوں اور مختلف ماڈلوں کی گاڑیاں بھی کھڑی ہیں ان کی طرف میں نے دھیان ہی نہیں دیا تھا۔

میں گاڑی سے اترا اور تین سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے میں پہنچا۔ سامنے بلند و بالا چوبی دروازہ نظر آ رہا تھا۔ ابھی میں اس تک نہیں پہنچ پایا تھا کہ دائیں طرف سے ایک شخص اندھیرے کی آغوش سے نکل کر اچانک ہی سامنے آ گیا۔ وہ چھریرے جسم کا ایک طویل القامت اور بظاہر بہت مہذب انسان تھا۔ اس کے چہرے پر ملائمت اور نہایت خفیف مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی مگر اس کی آنکھوں کا گویا اس کے چہرے سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ وہ محض بلور کی دو گولیاں معلوم ہوتی تھیں۔ بجھی سرد اور ہر تاثر سے عاری۔ وہ سوٹ میں ملبوس تھا۔

"کہاں سے تشریف لائے ہیں اور کس سے ملنا ہے؟" اس نے انتہائی شائستہ لہجے میں پوچھا۔ آواز سرگوشی سے کچھ ہی بلند تھی۔

"مجھے دکرم نے بھیجا ہے۔" میں نے آواز کو قدرے بھاری بنانے کی کوشش کرتے

ہوئے دھیمے لہجے میں کہا اور یہ بتانے کی کوشش نہیں کی کہ مجھے کس سے ملنا ہے۔

"اوہ...." اس نے ایک گہری اور آسودہ سی سانس لے کر ایک نظر اس گاڑی کی طرف دیکھا جس میں میں آیا تھا۔ "میں بھی سوچ رہا تھا کہ...." وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر مسکرا دیا اور راستے سے ہٹ کر گردن کو قدرے خم دیتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا اور پھر جیب سے ایک چابی نکال کر اس نے چوبی دروازے کے ایک ایسے سوراخ میں داخل کی جسے شاید میں اس تختے پر کندہ کئے گئے بیل بوٹوں میں کبھی تلاش نہ کر پاتا۔

"میڈم دوسری منزل پر اپنے پارلر میں ہیں۔" اس نے چابی گھماتے ہوئے کہا۔ چابی کو اس نے کئی چکر دیئے جیسے وہ چابی نہیں اسکریو ڈرائیور ہو۔ پھر اس نے ایک ہاتھ سے دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا اور خود ایک طرف کو ہٹ گیا۔ الوداعی انداز میں گردن ہلا کر وہ وہیں کھڑا رہا۔ میں نے اندر قدم رکھا اور دروازہ نہایت ہی ہلکی سی کلک کے ساتھ میرے عقب میں بند ہو گیا۔

میں اب ٹیلیفون بوتھ نما لیکن اس سے خاصی بڑی کوٹھڑی میں کھڑا تھا۔ میرے سامنے دھندلے شیشے کا دروازہ تھا جس کے پار کچھ نظر نہیں آرہا تھا لیکن اتنا ضرور معلوم ہو رہا تھا کہ ادھر تیز روشنی ہے

تب مجھے احساس ہوا کہ دوہرے دروازوں کا یہ سسٹم دراصل ساؤنڈ پروفنگ اور ایئر کنڈیشننگ کے لئے تھا۔

میں نے جیسے ہی شیشے کا دروازہ کھولا میرے ارد گرد جیسے .... خوشبوؤں آوازوں اور روشنیوں کا ایک سیلاب امڈ پڑا۔ وہ دروازے پار کرتے ہی جیسے میں کسی اور دنیا میں آگیا تھا۔ باہر موت کا سا سکوت تاریکی اور سونا پن تھا اور اندر کی تمام تر رنگینی روشنی اور رعنائی کے ساتھ ہنگامہ حیات شباب پر تھا۔ شیشے کے دروازے سے نکل کر چند لمحے کے لئے تو میں اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا۔

یہ ایک طویل و عریض ہال تھا جس میں فرش پر بھڑکیلے سرخ رنگ کا دبیز قالین بچھا ہوا تھا جس میں پاؤں دھنسے جا رہے تھے۔ چھت کے وسط میں ایک بہت بڑا اور اس کے ارد گرد کئی چھوٹے چھوٹے فانوس آویزاں تھے جن کی روشنی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی.... چھت اور فرش کے درمیان قوس قزح کی رنگینیاں بکھری ہوئی تھیں۔

ہال کے وسط میں قدیم رومن طرز کی ایک بہت بڑی ڈائننگ ٹیبل تھی جس کے ارد گرد کرسیاں نہیں تھیں۔ اس پر انواع و اقسام کے کھانے سجے ہوئے تھے۔ دھات کی ڈشوں کے نیچے اسپرٹ لیمپ روشن تھے کہ کھانے ٹھنڈے نہ ہوں۔ ایک خاص اور ادھوری سی یونیفارم میں ملبوس تراشیدہ سے جسم کی مالک دو لڑکیاں اس میز سے خالی پلیٹیں اٹھانے اور مزید ڈشیں رکھنے میں مصروف تھیں۔

میز کے گرد چند جوڑے کھڑے تھے۔ مردوں کے لباس اعلیٰ اور بیش قیمت چہروں پر خوشحالی آسودگی کی چمک مگر آنکھوں میں خمار کی دھندلاہٹ تھی۔ بات بات پر ادھر ادھر کو جھولتے تھے جیسے توازن برقرار رکھنا مشکل ہو رہا ہو۔ ان کی ساتھی لڑکیاں خود بھی خمار کے خلاؤں میں ہلکورے لے رہی تھیں مگر انہیں سہارا دینے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ان میں سے کئی کے ہاتھوں میں اب بھی جام تھے.... نہایت شوخ بھڑکیلے اور بیش قیمت مگر ناکافی لباس والی کوئی لڑکی سر پیچھے کو جھٹک کر پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر کوئی بات کرتی تو اس کی گردن کی مرمریں جلد پر نیلی نیلی رگیں ابھر آتیں۔ آواز تو ماحول کے شور میں مدغم ہو کر معلوم نہیں اپنے مخاطب تک پہنچ پاتی تھی۔ کبھی کبھی ان میں سے کوئی اپنا گلاس بلند کر کے چلا کر کچھ کہتا تو سامعین قہقہے لگاتے لگاتے دوہرے ہو جاتے ایک دوسرے پر گر جاتے۔ لڑکیاں اپنے ساتھیوں کو سنبھالنے کی کوششیں تیز کر دیتیں۔

ہال کے اختتام پر فرش کا کچھ حصہ اونچا تھا جس پر قالین نہیں تھا۔ یہ حصہ اتنا صاف چمکیلا اور چکنا تھا کہ اس کی جھلملاہٹ دور ہی سے واضح تھی۔ اس حصے پر چند جوڑے نیم مجنونانہ سے انداز میں محو رقص تھے۔ پس منظر میں تیز موسیقی گونج رہی تھی۔

یہ گویا ایک نئی طرز کا نائٹ کلب تھا جس میں ڈانس ڈرنکس اور ڈنر سب ایک ہی فلور پر یکجا کر دیا گیا تھا۔ ایک اور عجیب بات میں نے یہ محسوس کی کہ ہال اور ڈانسنگ فلور پر موجود تقریباً تمام ہی جوڑوں میں بیشتر مرد ہندوستانی اور پختہ العمر یعنی بہت سے تو ادھیڑ عمر تھے۔ البتہ لڑکیاں مختلف النسل اور سب کی سب نوجوان تھیں۔ ان کے طرز عمل سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ ان مردوں کی بیویاں نہیں تھیں۔

ماحول کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد میں آگے بڑھا۔ کسی نے میری طرف کوئی توجہ نہ دی۔ میں نہایت اطمینان سے سیڑھیوں کی تلاش میں نظر دوڑاتے ہوئے ہال کو عبور کرنے لگا۔ ہال کے اختتام پر پہنچ کر ڈانسنگ فلور پر بائیں جانب مجھے سیڑھیاں نظر آئیں۔

آخری سیڑھی پر قدم رکھتے ہی مجھے لاؤنج کے پار ایک بڑے دروازے پر پیتل کے حروف میں لفظ "پرائیویٹ" چمکتا نظر آیا۔ اس کے نیچے قدرے چھوٹے حروف میں "میڈم منورما" کی نیم پلیٹ نظر آرہی تھی۔ یقیناً یہی میڈم منورما کا پارلر تھا۔

دروازے پر پہنچ کر میں نے ایک انگلی سے دستک دی۔

"دروازہ کھلا ہے؟" ایک ہلکی سی آواز میرے کانوں تک پہنچی۔

میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا اور ایک لمحے کے لئے وہیں رک گیا۔ یہاں روشنی زیادہ نہیں تھی منظر بہرحال آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا مگر ترتیب و آرائش کے اعتبار سے یہ ایک عجیب جگہ تھی۔ فرش پر یہاں بھی دبیز قالین تھا مگر اس کا رنگ گہرا نیلا تھا۔ کھڑکیوں پر اسی رنگ کے نہایت خوبصورت پردے لٹک رہے تھے ایک طرف دیوار کے

ساتھ نہایت شاندار بلوری ڈبل بلب لگا ہوا تھا۔ جس پر حسین نائیلوں کا چہرہ سا بنا ہوا تھا۔ اس کی ڈوریاں چھت سے منسلک تھیں۔

جہاں میں کھڑا تھا اس سے کچھ ہی دور دائیں ہاتھ پر ایک گوشے میں خاصی بڑی اور بیش قیمت آفس ٹیبل اور سیاہ اسٹیل کی فائلنگ کیبنٹ فٹ تھی۔ میز کے ساتھ صرف ایک مگر بے حد خوبصورت چمڑے کے گدیلوں والی ریوالونگ چیئر بھی موجود تھی۔ میز پر کئی فائلیں کتابیں اور کچھ کھلے کاغذات قدرے بے ترتیبی سے پڑے تھے۔ کھلی فائل پر کسی کے موٹے موٹے عدسوں والی نظر کی عینک بھی پڑی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی لکھنے پڑھنے کا کام کرتے کرتے ابھی ابھی اٹھ کر گیا ہے۔ گویا یہ طویل و عریض کمرہ بیک وقت خوابگاہ ڈرائنگ روم اور آفس کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔

چاروں طرف کا جائزہ لیتے ہوئے میری نظر کمرے کے وسط میں گئی جہاں ایک عورت آرام کرسی پر نیم دراز تھی۔ اس کے مرمریں پاؤں پانی سے بھرے ایک بلوریں برتن میں ٹکے ہوئے تھے۔ اس کے پیروں اور ڈھیلے ڈھالے گاؤن سے ہوتی ہوئی میری نظر اس کے چہرے پر پہنچی۔

اس کی عمر غالباً پچپن سے اوپر ہی تھی مگر رکھ رکھاؤ غضب کا تھا۔ اس کی رنگت حد سے زیادہ سپید تھی اور زندگی سے خالی نظر آتی تھی۔ چہرے پر گہری گہری شکنیں اور ہونٹ مرجھائے ہوئے تھے مگر بڑھاپے کی ان نشانیوں کو نہایت ماہرانہ میک اپ نے بڑی حد تک دبا رکھا تھا۔ چہرے کی مناسبت سے اس کے بال بھی تقریباً سارے سفید ہونے چاہیے تھے مگر وہ گہرے سیاہ اور نہایت چمکیلے تھے۔ یہ کسی بہت ہی نفیس اور بیش قیمت ڈائی کا کمال تھا۔

"اجنبی نظر آتے ہو؟" دفعتاً بڑھیا کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ اس کی آواز میں بڑھاپے کی لرزش کی بجائے اب بھی ایک عجیب سی کھنک اور لوچ تھا۔ "مگر اجنبی یوں بلا اطلاع مجھ تک تو نہیں پہنچ سکتے۔" اس نے ایک نظر اپنے دائیں طرف ایک تپائی پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کی طرف دیکھا اور پھر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

میں نے کمرے کی خنک فضا میں ایک گہری سانس لی اور رکی سے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ "مجھے وکرم نے بھیجا ہے۔"

میرا خیال تھا کہ یہ سن کر وہ خوشی سے کھل اٹھے گی اور نہایت ہی شیریں لہجے میں بیٹھنے کی دعوت دے گی۔ پھر پوچھے گی کہ میں کیا کھانا اور کیا پینا پسند کروں گا اور میں اس سلسلے میں قطعاً کسی تکلف سے کام نہیں لوں گا اور کیونکہ مجھے بھوک بھی شدت سے لگ رہی تھی اور پیاس بھی۔

مگر میری توقعات کے برعکس اس کی سیاہ آنکھوں میں ایک نفرت بھری لہر سرد مہری در آئی۔ پتلے پتلے ہونٹ ایک لمحے کے لیے بے رحمانہ انداز میں بھینچ کر رہ گئے۔ پھر ان میں جنبش ہوئی۔ "اگر وہ خود آیا ہوتا تو اس بار شاید میں تپائی اٹھا کر اس کے سر پہ دے مارتی۔" پھر اس نے ہونٹ چباتے ہوئے گویا خود پر ضبط کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اس دوران کوئی تبصرہ یا صفائی پیش کرنا ضروری نہ سمجھا۔

"میں تو اس خبیث کو ایڈوانس دے کر پھنس گئی۔" بڑھیا نے اب قدرے نرم لہجے میں کہا۔ "اچھے درجے کا بدمعاش بنا پھرتا ہے؟ جب سے بھی ڈر جانے والی وہ احمق عورت تو اس سے اب تک مری نہیں۔ وکرم نے اس معاملے کو جتنا لمبا کھینچ دیا ہے' اس

سے لگتا ہے کہ اس کی کامیابی کا انتظار کرتے کرتے میں شمشان پہنچ جاؤں گی اور
بوڑھی ہو جائے گی اور تب اسے خود ہی زندہ رہنے کی آرزو نہیں رہے گی۔ اس بار اس
نے کوئی نئی کہانی گھڑی ہوگی اور خود آکر وہ کہانی سنانے کی اس میں ہمت نہ ہوگی۔ اس لیے
تمہیں بھیجا ہوگا...."

"روپا مر چکی ہے میڈم!" میں نے آہستگی سے کہا۔
"کیا؟" وہ تقریباً اچھل پڑی۔ پھر اپنے ردعمل کے اس بے ساختہ اظہار پر شرمندہ سی
ہو گئی گویا اس کے نزدیک اپنے محسوسات پر قابو نہ رکھنا باعث شرم عادت ہو۔ وہ یک لخت
ہی نہایت پرجوش نظر آنے لگی تھی مگر اپنے آپ کو پرسکون رکھنے کی پوری کوشش کر رہی
تھی۔ اس نے چٹکی بجا کر اس لڑکے کو جانے کا اشارہ کیا جو اس کے بال بنا رہا تھا۔ وہ
خاموشی سے سر جھکائے باہر چلا گیا۔

"ادھر آؤ.... بیٹھ جاؤ نا...." منورما نے اپنے دائیں ہاتھ پر پڑی ایک اور آرام دہ کرسی
کی طرف اشارہ کیا۔ مسرت اس کے رونگ روئیں سے پھوٹی پڑ رہی تھی مگر اس کی
آنکھوں میں بے یقینی تھی۔
میں آرام دہ کرسی کے ایک سرے پر ٹک گیا تو اس نے بے تابی سے آگے کو جھکتے
ہوئے کہا۔ "کیا کہہ رہے تھے تم؟ کیا واقعی روپا مر چکی ہے؟"
میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہاں۔"
"خیر.... بالآخر میرے من کی یہ پھانس نکل ہی گئی۔" اس نے جسم ڈھیلا چھوڑ کر آرام
دہ کرسی کے پشتے کو ایک لیور کی مدد سے قدرے سیدھا کر کے اس سے ٹیک لگا لی۔ اس کی
نظر بدستور مجھ پر مرکوز تھی۔
"اب مت کس لیے آئے ہو؟ باقی رقم لینے؟" اس نے پوچھا۔
"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "رقم آپ اطمینان ہونے کے بعد دکرم ہی کو ادا کیجئے
گا.... میں تو صرف آپ کو اطلاع دینے آیا تھا۔"
پھر میں نے ایک لمحے کے توقف سے کہا۔ "ویسے کرائے کے قاتل سوالات تو نہیں کیا
کرتے لیکن اگر آپ برا نہ مانیں تو میں پوچھوں کہ روپا سے آپ کی اس حد تک نفرت کی
وجہ کیا تھی کہ آپ نے اسے مروانے کے لیے اتنا تردد کیا؟"
"بظاہر تو کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔" اس نے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔
"اس عورت نے مجھے شکست کا احساس دلایا تھا۔ اس لیے اس کا وجود پھانس کی طرح
میرے دل میں پیوست تھا۔ میں نے اسے اس وقت سہارا دیا جب وہ ایک وقت کی روٹی کی
محتاج تھی۔ میں نے اسے تراش کر پتھر سے ہیرا بنایا اور جب وہ کسی قابل ہوئی تو مجھے ٹھوکر
مار کر چلی گئی.... اور وہ بھی عین اس وقت جب میں اسے ایک سیٹھ کی ساتھی بنانے کے
لیے کچھ رقم بھی لے چکی تھی اور اسے خرچ بھی کر چکی تھی۔ اس وقت ہماری مالی حالت
کچھ اتنی زیادہ اچھی نہیں تھی۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ مجھے کتنی ذلت اٹھانی پڑی تھی۔
میری کتنی بے عزتی ہوئی تھی...." وہ خاموش ہو کر چھت کو گھورنے لگی جیسے اس کی نگاہیں
ماضی کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہی ہوں۔
"گویا آپ کو صرف اس بات کا اتنا غصہ تھا کہ روپا اپنی زندگی کو اپنی مرضی سے بسر کرنا
چاہتی تھی؟" میں نے سرسری لہجے میں کہا۔
"اس دنیا میں بہت کم لوگ اپنی زندگی کو اپنی مرضی سے بسر کرتے ہیں۔" بڑھیا نے
ٹھوس لہجے میں کہا۔ "خصوصاً روپا جیسی کمزور عورت کو تو یہ حق ہرگز نہیں مانگنا چاہیے تھا
جبکہ اسے طاقتور بنانے کی ابتداء بھی میں نے ہی کی تھی۔ اسے زندگی بھر میرے سامنے سر
نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔" دفعتاً اس کی چمکیلی آنکھوں میں شک و شبے کی ہلکی سی پرچھائیں
رینگ کر آئی۔ اس نے قدرے چونک کر آنکھیں سکیڑ کر میری طرف دیکھا۔
"لڑکے! مجھے تمہارے لہجے سے روپا کے قرب کی خوشبو آ رہی ہے۔ تم نے اس کو مار
دیا ہے یا کہیں چھپا لیا ہے؟" دفعتاً اس نے سخت لہجے میں کہا۔
میں نے ایک مصنوعی قہقہہ لگایا اور قدرے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔
"یہ تو آپ کو کل کے اخبارات سے معلوم ہوگا میڈم! ویسے آپ کے تاڑنے کی میں
داد دیتا ہوں۔ سچی بات یہ ہے کہ روپا میری زندگی کی وہ پہلی عورت تھی جسے ہلاک کرتے
وقت میرا دل ہچکچایا اور اس کے لیے مجھے کچھ ہمدردی سی محسوس ہوئی۔ میرا اس سے مراسم
استوار کرنے کو جی چاہا مگر پھر پیشہ ورانہ تربیت غالب آگئی اور ساتھ وہ بے ہودہ سا محاورہ
بھی یاد آگیا کہ گھوڑا گھاس سے محبت کرے گا تو کھائے گا کیا؟ قصائی مویشیوں پر رحم کھانا
شروع کر دے گا تو کھائے گا کہاں سے؟ بس یہی سوچتے سوچتے اس کی کھوپڑی اڑا دی۔ یہ
آپ کا کمال ہے کہ ان سوچوں کا پرتو بھی آپ نے محسوس کر لیا۔"
وہ انتہائی جہاندیدہ اور مکار ہونے کے باوجود اس مدح سرائی کے اثرات سے نہ بچ
سکی۔ بڑے فخریہ انداز میں مسکرائی اور بولی۔ "اگر تمہارا ایک رات کے لیے دنیا جہاں کے
تفکرات کو بھول جانے کا ارادہ ہو تو میں تمہیں اعزازی وزیٹر کے طور پر یہاں ایک رات
قیام کی دعوت دیتی ہوں۔" وہ مسکرائی۔ "تم میرے لیے اتنی اچھی خبر لائے ہو کہ میرا جی
تمہاری خاطر مدارت کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔"
میں نے نفی میں سر ہلایا اور مسکراتے ہوئے کہا۔ "شکریہ! فی الحال میرا دنیا جہاں کے
تفکرات کو بھول جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے تمام مسائل اس وقت
تک میرے سر پر سوار رہیں جب تک میں ان سے نمٹ نہ لوں.... اور پھر ابھی میں نے
دوسری خبر تو تمہیں سنائی ہی نہیں جسے سن کر یقیناً تم اچھل پڑو گی...."

میں آپ سے تم پر اتر آیا تھا۔

"تو کیا؟" اس نے جیسے اشتیاق سے پوچھا۔ "وہ یہ کہ روپا درحقیقت زندہ ہے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اور میری خدمات ایک نجی کی حفاظت سے دراصل تمہیں ٹھکانے لگانے کے لیے حاصل کی گئی ہیں۔"

وہ خوفزدہ ہونے کی بجائے کچھ چڑ سی گئی۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اسے میری بات کا یقین نہیں آیا تھا۔ میں اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہ آنکھیں سکیڑے مجھے گھور رہی تھی۔

"میرے خیال میں ابھی ہمارے درمیان اتنی بے تکلفی پیدا نہیں ہوئی کہ تم اس قسم کا مذاق کرنے لگو۔" وہ ناگواری سے بولی۔

"میں مذاق نہیں کر رہا نانجار بڑھیا۔" میں نے دانت پیس کر کہا۔ "یہ بتاؤ کہ اپنے لیے موت کا کونسا طریقہ پسند کرو گی؟ گولی کھا کر مرنا چاہتی ہو یا ٹینٹوا دبوا کر؟ کھڑکی سے گر کر مرنے کو ترجیح دو گی یا گردن تڑوا کر مرنے کو؟ یہ چاروں طریقے نہایت کم تکلیف دہ ہیں۔ تمہارے جرائم کی فہرست چونکہ زیادہ طویل نہیں' اس لیے میں تمہیں کم سے کم تکلیف دہ موت کا طریقہ منتخب کرنے کی اجازت دے رہا ہوں۔ جلدی بولو۔"

"بکواس مت کرو۔" اس بار وہ ناگن کی طرح پھنکاری۔ وہ براہ راست میری آنکھوں میں جھانک رہی تھی اور غالباً اسے میری بات کا یقین آ گیا تھا کیونکہ اس کا ہاتھ دھیرے دھیرے اپنی کرسی کے پائے میں لگے ہوئے ایک سرخ بٹن کی طرف بڑھ رہا تھا مگر وہ ظاہر یہی کر رہی تھی کہ وہ میرے انداز کو محض بکواس سمجھ رہی ہے۔

میں نے اس کے ہاتھ کو سرخ بٹن کے نزدیک پہنچنے کا موقع دیا اور عین اس وقت جب اس کی انگلی بٹن کو چھونے والی تھی' میں نے اس کے بازو پر کراٹے کا وار کیا اور ساتھ ہی اس کے منہ پر سختی سے ہاتھ بھی رکھ دیا۔ گو کہ کمرہ مجھے ساؤنڈ پروف معلوم ہو رہا تھا' تاہم میں کوئی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

اس کی کلائی گویا دو حصوں میں تقسیم ہو گئی اور بازو بے جان انداز میں پہلو میں جھول گیا۔ وہ میرے ہاتھ کے دباؤ سے بری طرح مچل رہی تھی۔ میں نے دوسرا ہاتھ پھیلا کر اس کی گردن اپنی گرفت میں لے لی اور ایک مخصوص جھٹکا دیا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی اور چہرے کے عضلات تنے رہ گئے۔ چٹ کی صرف ایک ہلکی سی آواز کے ساتھ اس کی گردن ٹوٹ چکی تھی۔ میں نے دونوں ہاتھ ہٹا لیے تو وہ آرام دہ کرسی کے ایک بازو پر لڑھک گئی۔

کمرے میں سناٹا در آیا تھا۔ یہ موت کا سناٹا تھا۔ میڈم متوسا کی پھٹی پھٹی آنکھیں اب بھی مجھے دیکھ رہی تھیں اور میں اس کے سامنے کھڑا سوچ رہا تھا کہ بس اتنی سی بات تھی۔ کہاں وہ مسلح آدمیوں کے جتھے' اسٹین گنوں سے فائرنگ' مکتوم میسودی کی ڈرامہ بازی'

وکرم کی دہشت گردی اور ان سب چیزوں کی وجہ سے روپا کا جیتے جی سولی پر لٹکے رہنا۔ ان سب کے پیچھے محض اسی ناتواں سی بڑھیا کا ہاتھ کام کر رہا تھا۔ معاملہ کتنا خوفناک اور گھمبیر نظر آ رہا تھا کیونکہ اندوہ کی اصل جڑ کا پتا نہیں چل رہا تھا ورنہ بات تو کچھ بھی نہیں تھی۔

بہرحال اسی ناتواں سی بڑھیا تک پہنچنے کے لیے مجھے جن تجربات سے گزرنا پڑا تھا' انہوں نے میرے حوصلے میں اضافہ کیا تھا۔ جن حالات کا مجھے سامنا ہونے کی توقع تھی' یہ شاید ان کی بہ نسبت سہل تھی۔

میں نے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ ادھر ادھر کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں جس خاموشی سے اوپر آیا تھا اسی طرح واپس پہنچ گیا۔ یہ دیکھ کر مجھے قدرے حیرانی ہوئی کہ اب وہاں ایک جوڑا بھی نظر نہیں آ رہا تھا حتیٰ کہ سرو کرنے والی لڑکیاں بھی غائب ہو چکی تھیں۔ تمام جوڑے دراصل کمروں میں جا چکے تھے اور کمرے ساؤنڈ پروف تھے۔

باہر آ کر میں نے محتاط نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ وہ نوجوان مجھے کہیں نظر نہیں آیا جس نے میرے لیے دروازہ کھولا تھا۔ چاروں طرف وہی سناٹا اور سکوت طاری تھا جس سے گزر کر میں یہاں پہنچا تھا۔ درختوں تلے گھنے اندھیرے میں رنگ برنگی کاریں اسی طرح کھڑی تھیں۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سکوت اور دھندلاہٹ میں لپٹی ہوئی اس عمارت کی دیواروں کے پیچھے کیسی دنیا آباد تھی؟ کیا ہنگامہ بپا تھا اور اس کے ہر کمرے میں عیش و طرب اور بے راہ روی کی کیسی کیسی داستانیں رقم کی جا رہی تھیں؟

کار میں بیٹھ کر میں روپا کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ میری اتنی دیر کی غیر حاضری سے وہ بے حد پریشان ہو گی۔ اندیشہ یہ بھی تھا کہ اس گھبراہٹ میں وہ کوئی غیر ضروری قدم نہ اٹھا بیٹھے' اسی لیے میں نے فیصلہ کیا تھا کہ پہلے جا کر اسے تسلی دے دوں۔ اس کے بعد اس قحبہ خانے کا ایک چکر لگا کر آؤں گا جہاں میں نشچل اور وکرم کو نیم مردہ چھوڑ آیا تھا۔

پون گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد جب میں نے گاڑی اس جانب کی طرف موڑی جہاں بچوں کی پلے گراؤنڈ کے قریب روپا کا گھر تھا تو مجھے سڑک پہ ہلچل اور غیر معمولی آمد و رفت نظر آئی ورنہ عام حالات میں اس پوش رہائشی علاقے کی سڑکوں پہ کم ہی آمد و رفت نظر آتی تھی۔

پلے گراؤنڈ کی طرف گاڑی موڑتے ہی میں نے سامنے کا منظر دیکھ کر غیر ارادی طور پہ یک لخت گاڑی روک لی۔ سامنے لوگوں کا بے پناہ ہجوم تھا۔ بیسیوں گاڑیاں ادھر ادھر کھڑی نظر آ رہی تھیں جن میں پولیس اور فائر بریگیڈ کی بھی گاڑیاں شامل تھیں۔ بڑی بڑی سرچ لائٹیں روشن تھیں لیکن ان کے درمیان کیمروں کی فلش لائٹوں کے جھماکے الگ ہی نظر آ رہے تھے۔

جو مقام ان سب کی توجہ کا مرکز تھا وہاں روپا کی کوٹھی ہونی چاہیے تھی جو اب وہاں

نہیں تھی۔ اس کی جگہ اب ٹھن ملبے کا ایک انبار تھا جس سے کہیں کہیں سے دھویں کی لکیریں بلند ہو رہی تھیں۔ مخصوص لباس اور ہیلمٹ وغیرہ پہنے ہوئے فائر بریگیڈ کا عملہ کئی ٹیکنوں سے مستعدی سے ملبہ ہٹانے میں مصروف تھا۔ کئی باوردی اور بے وردی افراد بار بار ہجوم کو ہٹاتے ادھر ادھر آتے جاتے نظر آ رہے تھے۔

میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ روپا کی کوٹھی ملبے کا ڈھیر کیونکر بن گئی تھی اور کیا روپا بھی اس کے ساتھ ہی...؟ ان سوالات نے گویا مجھے چکرا کر رکھ دیا۔ میرے ہاتھ پیروں سے گویا جان نکل گئی۔ اب تک کی ساری مار دھاڑ' بھاگ دوڑ اور جدوجہد نے مجھے اتنا نہیں تھکایا تھا جتنا صرف ایک منظر نے مجھے بے دم کر دیا تھا۔ قریب تھا کہ میں گاڑی سے اتر کر دیوانوں کی طرح دوڑتا ہجوم کے قریب جا پہنچتا اور کسی وردی والے کو جھنجوڑ کر پوچھتا کہ معاملہ کیا ہے؟ روپا زندہ ہے یا...؟ اسے مردہ تصور کرنے پر دل آمادہ ہی نہیں ہوتا تھا۔

صحیح صورتحال جاننے بوجھنے بغیر ہی میرا دل دھاڑیں مار مار کر رونے کو چاہ رہا تھا۔ بہرحال اپنے اعصاب کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے ہجوم سے اتنی دور ہی رہتے ہوئے گاڑی کا انجن بند کیا۔ چابی اگنیشن میں چھوڑی اور گاڑی سے اتر گیا۔

گاڑی اس وقت ایک کوٹھی کی کپاؤنڈ وال کے قریب تھی اور اس کا بیشتر حصہ اندھیرے ہی میں تھا البتہ اس سے اترتے وقت میں روشنی میں آ ہی گیا تھا۔ دفعتاً میں نے سامنے سے زنانہ سائیکل پر ایک لڑکی کو تیزی سے اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس کے تراشیدہ بال اور اسکرٹ ہوا میں لہرا رہا تھا۔ اسٹریٹ لائٹ چونکہ اس سے پیچھے تھی' اس لیے اس کا چہرہ مجھے صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں چوکنا ہو گیا۔

میرے قریب آ کر لڑکی نے سائیکل کی بریک لگائی اور اتر پڑی۔ تب میں نے دیکھا کہ وہ روپا کی سیکرٹری اوشا تھی۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور ستواں ناک پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں چمک رہی تھیں۔ وہ سیاہ اسٹاکنگ اور ٹینس کے جوتے پہنے ہوئے تھی اور اس وقت کالج کی کوئی ایتھلیٹ لگ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے ایک گونہ طمانیت کا احساس ہوا۔ میرے کچھ پوچھنے سے پیشتر ہی وہ بول اٹھی۔

"مسٹر منصور!" اس نے انگریزی میں کہا۔ "آپ فوراً میرے ساتھ چلیے۔ میں کب سے آپ کی تلاش میں یہیں چکرا رہی تھی۔"

"آؤ جلدی سے گاڑی میں بیٹھو۔" میں نے دوسری طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"میری سائیکل..." وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "پلیز اسے ڈکی میں رکھ دیں۔" چھبیس سال کی اس تندرست و توانا اور خاصی حد تک جہاندیدہ لڑکی کے انداز میں سکول کی بچیوں جیسی معصومیت تھی۔ شاید میں اس وقت اس کی سائیکل وہیں پھینک دیتا اور کہتا۔

"میں بعد میں تمہیں دس سائیکلیں لے دوں گا۔" لیکن شاید اس کے لہجے کا اثر تھا کہ مجھے یہی محسوس ہوا جیسے اس کی عمر بھر کی پونجی یہیں رہی جا رہی ہے۔ میں نے اگنیشن سے چابیاں نکال کر ڈکی کھولی اور اس کی سائیکل کو اس میں ٹھونسا اور اسٹیرنگ سنبھالتے ہوئے پوچھا۔ "کدھر چلنا ہے؟"

وہ میرے برابر بیٹھ چکی تھی۔ "گاڑی واپس موڑ لیجیے۔" اس نے کہا۔

اوشا کی ہدایت کے مطابق میں گاڑی دائیں بائیں گلیوں میں موڑنے لگا۔ خاموش رہنا میرے بس سے باہر ہو گیا تو میں نے پوچھا۔ "یہاں کیا ہوا تھا؟"

"میرا گھر تھوڑی ہی دور رہ گیا ہے۔ ابھی آپ کو سب معلوم ہو جائے گا۔" اوشا نے مبہم سا جواب دیا۔

"روپا تو زندہ ہے ناں؟" میں نے قدرے بلند آواز میں منہ پھاڑ کر پوچھا۔

"جی ہاں!" اس نے جواب دیا۔

اس لمحے میرا وجود طمانیت کی ٹھنڈی جھیل میں اتر گیا۔ وائلن کے تاروں کی طرح تنے ہوئے میرے اعصاب کو قرار آ گیا۔ اس وقت میرے لیے سب سے اہم اور سنگین سوال یہی تھا جس کا مجھے جواب مل گیا تھا' باقی باتیں میرے نزدیک بہت کم اہم تھیں۔

ہم ابھی اسی علاقے میں تھے' تاہم ایسے حصے میں پہنچ چکے تھے جہاں بنگلوں اور کوٹھیوں کی بجائے چھوٹے بڑے فلیٹوں پر مشتمل کئی منزلہ عمارتیں سر اٹھائے کھڑی تھیں' انہیں سے ایک نسبتاً پرانی عمارت کے سامنے اس نے گاڑی رکوائی اور اترتے ہوئے مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

زرد روشنی میں ڈوبی ہوئی سیڑھیاں طے کر کے میں اس کی رہنمائی میں دوسری منزل پر ایک فلیٹ تک پہنچا جس کے سبتی دروازے پر ایک دائرے میں سیاہ پینٹ سے آٹھ کا موٹا سا ہندسہ لکھا نظر آ رہا تھا۔ اوشا کی دستک کے جواب میں ایک پتلی دبلی سی بڑھیا نے دروازہ کھولا اور مجھے دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔ بڑھیا' اوشا کے مستقبل کی پرچھائیں معلوم ہوتی تھی۔ یقیناً وہ اوشا کی ماں تھی۔ اب مجھے یہ پوچھنے کی ضرورت نہ رہی کہ یہ کس کا گھر ہے۔ ظاہر سی بات تھی کہ اوشا کا گھر تھا۔

پہلا کمرہ خاصا کشادہ تھا اور اس کی آرائش اوسط درجے کی تھی۔ قالین کا رنگ اڑا اڑا سا تھا اور صوفہ بھی پرانا تھا مگر اس کے گدیلوں پر صاف ستھرے غلاف چڑھے ہوئے تھے اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ اسی کمرے کے ایک گوشے میں قالین پر روپا آرام سے بیٹھی دو نوعمر لڑکیوں کے ساتھ لوڈو کھیل رہی تھی۔ نوعمر لڑکیاں اوشا کی چھوٹی بہنیں معلوم ہوتی تھیں۔

"خدا کا شکر ہے منصور!" روپا مجھے دیکھ کر لوڈو چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ میرے آنے

سے پہلے وہ غالباً تفکرات کو بھلانے کی کوشش میں خاصی کامیاب ہو چکی تھی اور لڑکیوں کے ساتھ قہقہے لگا رہی تھی مگر مجھے دیکھتے ہی جیسے سارے فراموش کردہ اندیشے اس کی آنکھوں میں اتر آئے۔ "تمہارا انتظار کرتے کرتے میں تو پاگل ہو چلی تھی۔"

میں خاموشی سے کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ وہ میرے قریب آ گئی۔

"ہوا کیا تھا؟" بالآخر میں نے پوچھا۔

"صحیح طور پر تو مجھے بھی نہیں معلوم۔" اس نے سادگی سے کہا۔ "میں تمہاری ہدایت کے مطابق کنور میسوری کی بلڈنگ ایک سڑک پر چھوڑ کر کچھ دیر ٹیکسی تلاش کرتی رہی لیکن ٹیکسی نہیں ملی۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ سیاہ چشمے اور عام سے لباس کے باوجود کچھ لوگ مجھے پہچان نہ لیں اور ہجوم اکٹھا نہ ہو جائے، اس لیے میں گلیوں گلیوں سے ہوتی پیدل ہی چل دی۔ گھر کا فاصلہ کچھ زیادہ نہیں رہا تھا۔ اسی وقت میں نیچے گراؤنڈ کے قریب پہنچ چکی تھی۔ جب میں نے زبردست دھماکے کے ساتھ کوٹھی کا مرکزی حصہ منہدم ہوتے دیکھا۔ پلستر، اینٹوں وغیرہ کے کچھ ٹکڑے تو میں نے خس و خاشاک کی طرح ہوا میں بھی اڑتے دیکھے، پھر باقی دیواروں وغیرہ میں بھی دراڑیں پڑیں اور وہ بھی زمین بوس ہو گئیں۔"

روپا نے سسکی سی لی اور قابل رحم سے انداز میں میری طرف دیکھا۔

"میں نے بڑے چاؤ سے خود بنوایا تھا منصور!" اس نے جیسے شکوہ سا کیا۔ جیسے اس کی تباہی میں میرا بھی ہاتھ رہا ہو۔ "اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ یوں نیست و نابود ہو گیا جیسے بادلوں نے کسی پرندے کا آشیانہ اجاڑ دیا ہو۔"

"یہ شکر کرو کہ وہ پرندہ زندہ بچ گیا ہے۔" میں نہ جانے کیوں مسکرا دیا۔ "آشیانے تو پھر بنتے بگڑتے رہیں گے۔" میں نے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ "کوٹھی میں غالباً بے حد طاقتور بم چھپایا گیا تھا۔ مجھے تو یہ سوچ کر جھرجھری آ رہی ہے کہ اگر تمہیں ٹیکسی مل جاتی تو یقیناً تم چند منٹ پہلے گھر پہنچ چکی ہوتیں۔ تب کیا ہوتا؟"

روپا کو واقعتاً جھرجھری سی آ گئی۔ اس دوران جیسے ہم نے کمرے میں موجود دیگر افراد کو قطعی نظرانداز کر دیا تھا۔ بڑھیا تو چند لمحے پہلے ہی دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔ ایشا نے مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تشریف رکھئے میں آپ کے لیے کافی لاتی ہوں۔"

"کافی نہیں۔" میں نے فوراً کہا۔ "میرے پیٹ میں کچھ کھانے کے لیے جگہ ہو جائے گا کوئی بندوبست!؟" میں نے احتیاطاً پوچھا۔

"کیوں نہیں۔" وہ مسکرا دی۔ "چند منٹ انتظار کی زحمت اٹھانا پڑے گی۔" وہ غالباً کچن کی طرف چل دی۔ باہر جاتے وقت اس نے شاید اپنی چھوٹی بہنوں کو بھی اشارہ کر دیا تھا کیونکہ اس کے ساتھ ہی کمرے سے وہ بھی رخصت ہو گئیں۔ میں صوفے پر بیٹھ گیا اور

روپا کو بھی اپنے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا مگر وہ دیوار سے ٹیک لگا کر میرے پیروں کے قریب ہی قالین پر بیٹھ گئی۔ گھر میں بھی وہ اسی طرح ایزی ہو کر بیٹھنا پسند کرتی تھی۔ اس وقت وہ عام سی سادگی میں، بکھرے بکھرے بالوں اور بے نیاز چہرے کے ساتھ بہت مختلف لگ رہی تھی۔ بغور دیکھنے پر اسے کوئی عام آدمی شاید ہی تسلیم کر پاتا کہ یہ وہی روپا ہے جسے وہ فلموں میں ایک سے ایک انوکھی صورت میں دیکھتا رہا ہے۔

"...جب مجھے اپنی آنکھوں پر یقین آیا۔" روپا کہہ رہی تھی۔ "کوٹھی واقعی زمین بوس ہو چکی تھی اور لوگ ادھر ادھر سے دوڑ کر جمع ہونے لگے تھے تو میں خاموشی سے وہاں سے کھسک لی۔ صحیح طور پر مجھے خود بھی نہیں معلوم کہ اس کی وجہ کیا تھی۔ شاید میں یہ سوچ کر گھبرا گئی تھی کہ پولیس والے اور اخباری رپورٹر وغیرہ بھی پہنچ جائیں گے اور مجھ سے طرح طرح کے سوالات کریں گے۔ میں کیا جواب دوں گی؟ مجھے اس تصور سے ہی وحشت ہونے لگی تھی۔ دوسرے شاید میرے تحت الشعور میں یہ خیال بھی آیا ہو کہ میرے جن دشمنوں نے کوٹھی میں بم رکھا ہوگا وہ کچھ عرصے کے لیے یہی سمجھ لیں کہ میں واقعی مر چکی ہوں، جو کچھ بھی ہو..... بہرحال سب سے بڑی گھبراہٹ تنہائی کی تھی۔ ویسے تو میرا خیال ہے کہ میں خاصے مضبوط اعصاب کی عورت ہوں لیکن اس قسم کی صورتحال میں میرے حواس مختل اور عقل خبط ہو کر رہ جاتی ہے۔ میں خوفزدہ بہرحال نہیں ہوئی تھی۔ بس یہ فیصلہ کرنے سے معذور ہو گئی تھی کہ فوری طور پر مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میرے ذہن میں بس ایشا کا نام آیا اور میں اس کے گھر کی طرف دوڑ پڑی۔ اس کا گھر قریب بھی تھا اور چونکہ میں کئی مرتبہ اسے یہاں ڈراپ کرنے گئی ہوں، اس لیے مجھے یاد بھی تھا۔ تبھی سے میں نے اس کو وہاں دوڑا دیا تھا کہ ہجوم کے آس پاس ہی چکر لگاتی رہے اور تم آتے نظر آؤ تو تمہیں بالا بالا ہی یہاں لے آئے۔ اب تم جو کہو گے، میں وہی کروں گی۔" میری طرف دیکھتے ہوئے وہ اتنی دیر میں پہلی مرتبہ مسکرائی۔ پھر فوراً ہی سنجیدہ ہو گئی۔

"تم خیریت ہی سے جا رہے ہو۔" وہ بولی۔ "اپنی تو کچھ سناؤ تم پر کیا بیتی؟ اتنی دیر کہاں لگا کر آ رہے ہو؟"

میں نے مختصراً اسے تمام واقعات سنا دیے۔ پولیس، ڈیبی کا میں نے کوئی تذکرہ نہیں کیا البتہ اتنا ضرور کہہ دیا..... "تمہارا اصل دشمن تو ختم ہو چکا ہے البتہ ایک مختصر باقی ہے جس کی طرف سے شاید ابھی تمہیں کسی قسم کا خطرہ لاحق ہو جائے۔ آج کل میں ہی میں اس کا بھی بندوبست کر دوں گا۔ اس کے بعد تم ہمیشہ کے لیے بے فکر ہو جاؤ گی بشرطیکہ تمہارا کوئی نیا دشمن پیدا نہ ہو جائے....." میں کہنا چاہتا تھا کہ اس وقت بہرحال میں اس کی حفاظت کے لیے موجود نہیں ہوں گا۔ میں اسے الوداع کہہ کر جا چکا ہوں گا..... لیکن میری اسے یہ بتانے کی ہمت نہ پڑی۔

"فی الحال ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" اس نے پوچھا۔

"فی الحال تو سب سے پہلے اوشا جو کچھ پکا کر لائے گی' اسے ہم دونوں چٹ کریں گے۔" میں نے کہا۔ "اس کے بعد کچھ سوچیں گے کیونکہ میں نے سنا ہے' سوچ بچار میں معدہ بھی کافی اہم کردار ادا کرتا ہے۔"

اسی لمحے اوشا واپس آئی اور مسکراتے ہوئے بولی۔ "میں نے پپا اور ونگی کو سینڈوچز تیار کرنے پر لگا دیا ہے۔ میں نے سوچا کہ اتنی دیر میں ہم خبریں ہی سن لیتے ہیں۔ مقامی خبروں کا وقت ہو رہا ہے۔"

اس نے دروازے کے قریب دیوار کے ساتھ لگی تپائی پر رکھا بجلی کا ایک ریڈیو آن کر دیا۔ سٹیشن ٹیون کرنے کے بعد وہ روپا کے قریب ہی قالین پر آبیٹھی۔ نیوز ریڈر غالباً سرخیاں پڑھ چکی تھی' اور اب لگے بندھے اور گھسے پٹے لفظوں میں انتظامیہ کے کسی افسر اعلیٰ کا ایک روایتی سا وعدہ پڑھ کر سنا رہی تھی کہ آنے والے اتنے برسوں میں فلاں جامع منصوبے کے تحت فلاں مسئلہ جڑ سے ختم کر دیا جائے گا۔

چند منٹ ہم خاموشی سے بیٹھے اسی قسم کی بکواس اور کھوکھلی خبریں سنتے رہے جو مجھے زہر لگتی تھیں۔ پھر اس نے نئی خبر شروع کی۔

آج سہ پہر پالی ہل کے علاقے میں معروف و مقبول فلمی اداکارہ میڈم روپا کی کوٹھی ایک زبردست دھماکے سے زمین بوس ہو گئی۔ دھماکہ اس قدر شدید تھا کہ آس پاس کی دو کوٹھیوں کی چار دیواری کو بھی نقصان پہنچا۔ باور کیا جاتا ہے کہ کوٹھی میں موجود افراد میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچ سکا۔ ایک ملازم اور ایک ملازمہ کی لاش ملبے سے نکالی جا چکی ہے۔ مصدقہ اطلاعات کے مطابق میڈم روپا آج شوٹنگ کے لیے کسی بھی سٹوڈیو نہیں پہنچی تھیں جس کی بنا پر اندیشہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ شاید گھر میں موجود رہنے کی وجہ سے وہ بھی حادثے کا شکار ہو چکی ہوں۔

ماہرین نے دھماکے کی وجہ طاقتور بم کا پھٹنا بیان کی ہے۔ ملبہ ہٹانے اور تحقیقات وغیرہ کا کام جاری ہے۔ مزید تفصیلات شاید ہم آپ کو صبح کے بلیٹن میں سنا سکیں۔ مقامی خبریں ختم ہو گئیں۔

میں نے چٹکی بجاتے ہوئے روپا سے کہا۔ "لو..... یہ مسئلہ تو حل ہو گیا کہ تمہیں کیا کرنا چاہیے۔ میرے ساتھ اب تم اپنے گھر..... بلکہ یوں کہو کہ اپنے کھنڈر کی طرف چلو گی اور اپنی تمام تر اداکارانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے یوں ظاہر کرو گی جیسے تم پر حیرت اور صدمے کا شدید حملہ ہوا ہے۔

جب ہم جائے وقوعہ پر پہنچے تو ہجوم کافی کم ہو چکا تھا۔ فائر بریگیڈ اور پولیس والوں کے علاوہ کچھ ہی لوگ نظر آ رہے تھے۔ میں نے ملبے کے ڈھیر کے قریب گاڑی لے جانے کی

کوشش کی تو پولیس والے نے دسل دے کر مجھے روک دیا اور مستعدی سے ہماری طرف بڑھا۔ اسی لمحے روپا گاڑی سے اتر گئی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے ملبے کے ڈھیر کو دیکھنے لگی۔ پولیس کانسٹیبل اسے پہچان کر دوڑا دوڑا گیا اور نجانے کہاں سے ایس پی کو بلا لیا۔ اس دوران وہاں موجود تماشا دیکھنے والوں میں بڑی تیزی سے خبر پھیل چکی تھی کہ میڈم روپا زندہ ہے اور ابھی ابھی کہیں سے آئی ہے۔ لوگ ہمارے گرد جمع ہونے لگے تھے۔ ایس پی نے آکر سب کو ڈانٹا اور کانسٹیبلوں وغیرہ کو ہدایت کی کہ انہیں پیچھے ہٹائیں۔ اس دوران وہیں سڑک کے کنارے ملبے گراؤنڈ کے قریب چند کرسیاں بھی پولیس والوں نے لا کر بچھا دی تھیں۔

"تشریف رکھیں میڈم!" ایس پی نے روپا کو ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا لیکن وہ بڑی کامیابی سے سکتے کی سی کیفیت کا اظہار کر رہی تھی اور بت بنی کھڑی تھی۔ ایس پی کے تیسری مرتبہ مخاطب کرنے پر وہ چونکی' وہ کہہ رہا تھا "ہم تو یہ سمجھ رہے تھے کہ آپ زندہ نہیں..... ہمیں ملبے میں لاش کے کچھ حصے ملے ہیں۔ ان کی بنا پر ہم تو تصدیق کرنے والے تھے کہ آپ بھی....." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور ایک لمحے کے توقف سے پوچھا۔ "ویسے آپ تھیں کہاں؟ ہم نے تمام سٹوڈیوز سے پتا کروایا تھا۔"

"میں ایک عزیز کی بیمار پرسی کے لیے پونا گئی ہوئی تھی۔" روپا نے جھرجھری سی لے کر بڑبڑانے کے انداز میں کہا۔ "لیکن یہ ہوا کیا ہے؟ کیسے ہوا ہے؟" صدمے سے گویا اس کی آواز بیٹھی جا رہی تھی۔ "میں نے تو ریڈیو پر خبر سنی اور دوڑی چلی آئی..... میرے ملازموں کا کیا ہوا؟"

"آپ کا چوکیدار تو بچ گیا ہے' بہرحال اسے کافی زخم آئے ہیں۔ وہ اسپتال میں ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں ایک عورت اور ایک ادھیڑ عمر مرد کی لاش ملی ہے اور تیسری لاش کے چند حصے ملے ہیں۔ شاید وہ عورت اس جگہ کے بہت قریب تھی جہاں بم رکھا گیا تھا۔"

"چوکیدار کے علاوہ دو خادمائیں اور ایک مالی گھر پر تھا۔ گویا ان میں سے کوئی زندہ نہیں بچا۔" روپا بڑبڑائی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اب وہ اداکاری نہیں کر رہی تھی۔ بلکہ واقعی اس پر غلبہ پانے لگا تھا۔ یوں بھی وہ عجیب ہی سی عورت تھی۔ اس کے مزاج کا کوئی پتہ نہیں تھا کہ کب کس سمت سے صدمے کی کوئی لہر آئے اور اس کی تمام سوچوں کو بہا کر لے جائے۔

"آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ یہ حرکت کس کی ہو سکتی ہے؟" ایس پی نے گویا اس کا دھیان ہٹانے کے لئے پوچھا۔

"یہ تو آپ کو معلوم کرنا ہے ایس پی صاحب!" روپا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے نہایت باوقار لہجے میں کہا "میری تو کسی سے دشمنی نہیں لیکن نہ جانے کون میرے خون کا

پیاسا بنا ہوا ہے۔ اور کیوں؟ آپ کے علم میں تو ہو گا کہ مجھ پر بارہا قاتلانہ حملے ہو چکے ہیں۔ مجھے خود حیرت ہے کہ میں کیسے بچتی رہی ہوں۔ یہ اس سلسلے کی سب سے بڑی کوشش تھی۔ اب تو بس یہی کسر رہ گئی ہے کہ یہ نامعلوم لوگ ٹینکوں سے مجھ پر چڑھائی کر دیں۔" روپا کے لہجے میں طنز جھلک آیا۔

"آپ بالکل چنتا نہ کریں۔" ایس پی نے اس کے طنز کو سمجھتے ہوئے کہا۔ "اس بار میں ان نامعلوم بدمعاشوں کو پاتال سے بھی کھود نکالوں گا۔"

"یہی وعدہ کافی عرصہ پہلے ڈی آئی جی صاحب بھی مجھ سے کر چکے ہیں۔" روپا نے نہایت سادگی سے کہا۔

"اب فی الحال آپ کا قیام کہاں ہو گا؟" ایس پی نے قدرے کھسیا کر موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"کچھ دن کے لیے کسی ہوٹل ہی میں قیام کروں گی۔" روپا نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"مجھے مطلع کر دیجئے گا کہ آپ کس ہوٹل میں ہیں۔" ایس پی نے کہا۔ پھر ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "اخباری نمائندے بھی کچھ ہی دیر پہلے اپنے اپنے دفتروں کو روانہ ہوئے ہیں۔ ابھی میں دفتر جاؤں گا تو ان کے فون آنے شروع ہو جائیں گے۔"

"انہیں صرف یہ بتا دیں کہ میں زندہ ہوں۔" روپا نے سرد مہری سے کہا۔ "لیکن میں نہ تو کوئی بیان دوں گی اور نہ ہی کسی سے ملوں گی۔"

"کہاں چلنا چاہیے؟" چند لمحے بعد میں نے اندھیرے میں پارک کی ہوئی گاڑی کو سڑک پر لاتے ہوئے پوچھا۔ روپا میرے برابر بیٹھی کھوئی کھوئی نظروں سے سامنے دیکھ رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ اس پر مخصوص اداسی کا دورہ پڑا ہے۔

"تاج چلو۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

تاج محل ہوٹل کی ان دنوں بڑی شہرت تھی۔ راستے میں روپا نے چونکتے ہوئے کہا۔ "منصور! مجھے پیسوں کی ضرورت ہو گی۔ صبح بینک کی بھی چھٹی ہے۔ میں وہاں سے نئی چیک بک وغیرہ بھی نہیں لے سکوں گی۔"

"پیسوں کی فکر نہ کرو۔" میں نے اس کی سیٹ کے پیچھے پڑے ہوئے بریف کیس کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ نوٹوں سے بھرا ہوا ہے۔ کراچی میں خاصی بڑی رقم چھوڑ آیا ہوں جو [illegible] ادا کر رہی تھی۔"

"تو کیا تم لڑائی بھڑائی کے علاوہ لوٹ مار بھی کرتے ہو؟" وہ مسکرائی۔ اس کے ذہن سے جیسے اداسی کے بادل چھٹنے لگے تھے۔ اس کا مزاج پہاڑی علاقوں کے موسم کی طرح پل میں کچھ پل میں کچھ۔

تاج محل میں ہم نے ایک وی آئی پی سوئٹ میں پہنچ کر نوٹوں کی ایک گڈی اس کے

حوالے کرتے ہوئے میں نے کہا۔ "میں اب چلتا ہوں۔ کچھ کام ادھورا رہ گیا تھا۔ اسے ختم کرنا ہے۔ میری واپسی میں اگر تاخیر ہو جائے تو کوئی فکر نہ کرنا۔"

بریف کیس اٹھائے میں لفٹ کے ذریعے نیچے آیا اور کار میں بیٹھ کر اس تہہ خانے کی طرف روانہ ہو گیا جہاں میں نے نشچل اور وکرم کو ان کے ساتھیوں کی لاشوں کے درمیان نیم مردہ چھوڑا تھا۔ وکرم ہی کی گاڑی ابھی تک میرے استعمال میں تھی۔

تہہ خانے تک واپس پہنچنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی اور جب کنڈی کھول کر اندر پہنچا تو منظر تقریباً ویسا ہی نظر آیا جیسا میں چھوڑ کر گیا تھا۔ صرف ایک فرق پڑا تھا اور وہ یہ کہ نشچل دم توڑ چکا تھا۔ وہ گھسٹتے گھسٹتے دروازے کے قریب پہنچ گیا تھا اور موت نے اسے راستے میں ہی آ لیا تھا۔ مرنے سے پہلے اسے خون کی قے بھی آئی تھی۔ وہ احمق اگر دروازے تک پہنچ بھی جاتا تو اسے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ دروازہ تو باہر سے بند تھا۔

وکرم وہیں پڑا اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہا تھا۔ جہاں میں اسے باندھ کر ڈال گیا تھا۔ میں نے بالوں سے پکڑ کر اسے سیدھا کیا تو اس نے سوجی سوجی سی آنکھیں بمشکل نیم وا کر کے میری طرف دیکھا۔ اس کی پیشانی سے خون بہہ کر اس کے چہرے پر جم چکا تھا اور اس کے درمیان اس کی آنکھیں پیوند کی طرح چمک رہی تھیں۔ میں نے اس کے منہ سے کاغذ کا گولا نکالا۔

"تمہیں تمہارے... خدا کا واسطہ... مجھے چھوڑ دو... میں بڑی تکلیف میں ہوں۔" وہ بڑبڑایا۔ "میں تم سے معافی مانگتا ہوں... میں تمہیں بہت سا پیسہ دینے کو تیار ہوں... تم اگر کہو گے تو میں ہمیشہ کے لیے ملک سے باہر چلا جاؤں گا۔" اس کا لہجہ اس شرابی سے مشابہ تھا جس کا نشہ نہ جانے کب سے ٹوٹ رہا ہو اور اب اذیت اس کی برداشت سے باہر ہو گئی ہو۔

"تم مجھے صرف میرے سوالوں کے جواب دو۔" میں نے کہا۔ "میں تمہیں چھوڑنے پر غور کر سکتا ہوں، وعدہ نہیں کر رہا۔ یہ بتاؤ کہ روپا کی کوٹھی میں بم کس نے رکھا تھا؟"

"رشی نے۔" اس نے بلا تامل جواب دیا۔

"لیکن رشی اور نشچل تو روپا کو اغوا کرنے جا رہے تھے، پھر اس میں بم رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟" میں نے اس کے بالوں کو ایک جھٹکا دیا۔

"یہ بھی نشچل ہی کی تجویز تھی۔" وکرم کراہا۔ "اس نے کہا تھا کہ زیادہ عرصے تک روپا کی گمشدگی سے ملک میں گرما گرمی کی فضا برقرار رہے گی جو ہمارے حق میں خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ اس لیے روپا کو اغوا کرنے کے بعد اگر ٹائم بم کے ذریعے اس کی کوٹھی کو تباہ کر دیا جائے تو یہی سمجھا جائے گا کہ اس دھماکے میں خود روپا کے بھی پرخچے اڑ گئے ہیں اور اگر اس کی تردید کرنے والا کوئی گواہ باقی رہا تو اسے ہم خود ٹھکانے لگا دیں گے۔ ایک بار

جب یہ خبر پھیل جائے گی کہ روپا مر چکی ہے تو پھر رفتہ رفتہ لوگ اسے بھول جائیں گے۔ اس کے مداحوں اور فلم سازوں کو آہستہ آہستہ صبر آجائے گا اور پولیس کی فائلیں بھی بند ہو کر داخل دفتر ہو جائیں گی لیکن اگر معاملہ اس کی گمشدگی کا رہا تو پریس بھی شور مچاتا رہے گا اور عوامی حلقے بھی شور مچاتے رہیں گے۔"

"ہوں۔" میں ہنکارا بھر کر رہ گیا۔ میرے ذہن میں سوچوں کے گھوڑے سرپٹ دوڑ رہے تھے اور میری رگوں میں لہو کی گردش کچھ تیز ہو چکی تھی۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے پوچھا۔ "روپا کے بارے میں تمہارا کیا پروگرام تھا؟" "میرا کام صرف اتنا تھا کہ آج رات دو بجے روپا کو مالتی مندر جزیرے پر پہنچا دوں اور پرنس شومیں سے دو لاکھ پونڈ نقد وصول کر کے واپس آجاؤں۔" وکرم نے بتایا۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ اس وقت پونے بارہ ہو رہے تھے۔

"اور پرنس کا پروگرام کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ روپا کو اپنے ذاتی جہاز میں ڈال کر جزیرے سے پرواز کر کے بمبئی کے ہوائی اڈے پر آتا۔ وہاں اپنا فلائٹ پلان دے کر دو بارہ کوچی کی طرف پرواز کر جاتا۔"

میں نے قدرے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا اور ایک لمحے کی خاموشی کے بعد پوچھا۔ "یعنی تمہیں روپا کو جزیرے پر جہاز تک پہنچانا تھا؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا تو میں نے پوچھا۔ "کیا جزیرے پر رن وے موجود ہے؟"

"میں نے صرف سنا ہے کہ جزیرے پر پرنس نے میل ڈیڑھ میل کے دائرے میں کنکریٹ کی پٹی کھنچوا رکھی ہے جو جہاز کے لیے رن وے کا کام دیتی ہے لیکن میں نے یہ جگہ دیکھی نہیں۔" وکرم بولا۔ "طے یہ پایا تھا کہ میں بوٹ میں روپا کو لے کر ڈیڑھ بجے جزیرے پر پہنچ جاؤں گا اور بوٹ ہاؤس میں داخل ہو کر ٹارچ سے تین مرتبہ کنارے کی طرف سگنل دوں گا۔ کنارے پر ایک کار میں فیروشیا نامی ایک افریقی میرا انتظار کر رہا ہو گا' وہ بوٹ ہاؤس میں آئے گا اور مجھے رن وے تک ساتھ لے جائے گا۔"

"اور بوٹ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میری اپنی بوٹ تو آج کل کوسٹ گارڈز کے قبضے میں ہے۔" وکرم نے پہلے سے زیادہ کمزور لہجے میں کہا۔ "آج میں نے اپنے ایک سمگلر دوست سے بوٹ مستعار لینے کا بندوبست کرنا تھا۔" اس نے رحم طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "میں نے تمہارے ہر سوال کا جواب سچائی اور تفصیل سے دے دیا ہے' کوئی بات نہیں چھپائی۔ اب تو مجھے چھوڑ دو۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا ہے اور پیشانی پھوڑے کی طرح دکھ رہی ہے۔"

"تمہاری آنکھوں کے آگے تو مدتوں سے اندھیرا چھایا ہوا تھا دوست! اور اس اندھیرے میں تمہیں برے بھلے میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا اور جہاں تک تمہاری پیشانی پھوڑے کی طرح دکھنے کا سوال ہے تو حقیقت یہ ہے کہ تم خود معاشرے کی پیشانی پر ایک پھوڑا ہو جس سے غلاظت بہہ رہی ہے۔" میں نے بے رحمی سے کہا۔ "مجھے تم بدمعاشوں کی فطرت کے اسی پہلو سے سب سے زیادہ نفرت ہے کہ اپنے سے کمزور پر ظلم ڈھاتے وقت تم اس کی چیخ و پکار اور فریاد سن کر خوشی کے مارے زمین سے دو فٹ اونچے اچھلتے ہو اور جب تمہیں کوئی گردن ناپنے والا ملتا ہے تو فوراً ہاتھ جوڑ دیتے ہو' زندگی کی بھیک مانگنے لگتے ہو' بدمعاشی کرتے ہو تو کم از کم اتنا حوصلہ تو رکھو کہ اپنی جان پر بھی سختی سہہ سکو۔"

میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کا سر مضبوطی سے پکڑ کے ایک جھٹکا دیا۔ اس کی گردن گو کہ سانڈ کی طرح مضبوط تھی مگر اس وقت کی خاص بات یہ تھی کہ اس کے مقابلے میں گردن کی مضبوطی کچھ خاص کام نہیں آئی تھی۔ وکرم کو تو کچھ سمجھنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی لیکن اس عالم میں بھی وہ گویا ایک ٹک میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کے پپوٹے بند کیے اور بریف کیس اٹھا کر تہ خانے سے باہر آ گیا۔ دروازہ میں نے ایک بار پھر بولٹ کر دیا اور گاڑی میں جا بیٹھا۔ اس وقت بارہ بج رہے تھے۔ اگر میں بروقت کوئی بوٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو مالتی مندر پہنچ کر پرکاش شوبرا سے میری ملاقات ہو سکتی تھی جس کا نام میں نے اپنے نادیدہ دشمنوں کی تازہ ترین فہرست میں درج کر لیا تھا۔

وکرم کے سمگلر دوست کا نہ تو میں نے نام پتا پوچھا تھا اور نہ ہی میں اس سے بوٹ مستعار لینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میرے ذہن میں فشنگ ہاربر کا خیال آیا تھا جہاں مچھیروں کے سینکڑوں ہٹ بھی تھے۔ ان میں سے کئی مچھیروں کے پاس ذاتی لانچیں بھی تھیں جو ماہی گیری میں استعمال ہوتی تھیں۔ میں نے چند لمحے سوچا' پھر گاڑی سٹارٹ کر کے فشنگ ہاربر کی طرف روانہ ہو گیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد میں ساحلی علاقے میں پہنچا.... فشنگ ہاربر کی حدود سے بہت پہلے ہی زرد پتھروں کی ایک نیچی مگر بہت چوڑی دیوار بہت دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے گاڑی سڑک سے اتار کر نیچے حصے میں دیوار کے قریب کھڑی کی اور دیوار پھلانگ کر پیدل فشنگ ہاربر کی طرف روانہ ہو گیا۔ بریف کیس میرے ہاتھ میں تھا۔ میری جیکٹ کی ایک جیب میں مشین پسٹل اور دوسری میں سائلنسر والا پستول موجود تھا۔

کمزور سی چاندنی میں دور سے مچھیروں کے ہٹ یوں نظر آ رہے تھے جیسے کسی نے بڑے بڑے سیاہ اور بے ہنگم صندوق بے ترتیبی سے ادھر ادھر پھیلا دیئے ہوں۔ ان سے کافی فاصلے پر بائیں طرف ایک طویل و عریض اور اونچا پلیٹ فارم پھیلا ہوا تھا جس پر ترپالیں' ٹوکریاں اور بوریوں کے ڈھیر اور نہ جانے کیا کیا کاٹھ کباڑ پھیلا نظر آ رہا تھا۔ اسی پلیٹ فارم سے متصل بہت بڑا ماہی خانہ تھا جس کے سامنے بیسیوں ٹرک کھڑے نظر آ رہے تھے۔

یہاں سمندر کی بھی ایک مخصوص نم آلود سی بو پر مچھلیوں کی بو غالب تھی۔ پلیٹ فارم پر میں نے ایک شخص کا ہیولا دیکھا جس کے کندھے پر بندوق بھی نظر آ رہی تھی۔ اس نے کئی بار ٹہلتے ٹہلتے ٹارچ چمکا کر ادھر ادھر دیکھا' شاید وہ چوکیدار تھا۔

مچھیروں کے ہٹس درحقیقت ہٹس کیا' اچھے خاصے مکانات تھے۔ ایک مرتبہ ہمیں شوٹنگ کے سلسلے میں یہاں آنے کا اتفاق ہوا تھا تو میں نے دیکھا تھا کہ ان میں سے بیشتر کے اندر جدید مکانوں والی سہولتیں موجود تھیں۔ مچھیروں میں سے چند ایک سمگلروں کے آلہ کار بھی تھے۔ کبھی کبھار جیل میں چلے جاتے تھے اور ٹھاٹ سے رہتے تھے۔

میں ابھی ہٹس کے درمیان پھیلی ہوئی ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں سے ایک میں داخل ہی ہونے والا تھا کہ عقب سے آتا ہوا ایک شخص میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ وہ غالباً پلیٹ فارم کی طرف سے آ رہا تھا میں نے اسے دیکھا نہیں تھا۔ وہ درمیانے قد کا ایک پختہ عمر کا سیاہ فام شخص تھا۔ اس کا جسم خوب گٹھا ہوا تھا۔ سردی گو کہ بلا کی تھی مگر اس کے جسم پر صرف بغیر آستینوں کی ایک میلی سی واسکٹ اور ٹخنوں سے اونچی دھوتی تھی۔ پیروں میں ربڑ کے بوٹ تھے جس کی وجہ سے ریت پر اس کے چلنے سے مدھم سی آواز بھی پیدا نہیں ہو رہی تھی۔

مجھے یقین ہو گیا کہ وہ مچھیرا ہے۔ میں اس سے سلسلہ کلام شروع کرنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ اس نے خود ہی پوچھ لیا۔ "کس سے ملنا ہے بابو جی؟"

خلاف توقع اس کے لہجے میں نہایت شائستگی اور ملائمت تھی۔

"کسی خاص آدمی سے تو نہیں۔" میں نے قدرے ہچکچاہٹ سے کہا اور غیر ارادی طور پر میں کچھ اور آہستہ چلنے لگا۔ میرے ساتھ اس کے قدم بھی سست پڑ گئے۔ قدرے توقف سے میں نے کہا۔ "مجھے دراصل چند گھنٹوں کے لیے ایک بوٹ چاہیے۔"

"یہاں بوٹس کرائے پر تو نہیں ملتیں۔" اس کے لہجے میں اب واضح طور پر دلچسپی کی جھلک آ گئی تھی۔

"پیشکش معقول ہو تو نہ ہونے والے کام بھی ہو جاتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "مزید گفتگو کرنے سے پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارے پاس بوٹ ہے؟"

"کیوں نہیں۔" وہ مسکرایا۔ "پینتالیس ہارس پاور کی نئے ماڈل کی بوٹ ہے۔ کیا اب میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ معقول پیشکش کیا ہے جس کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے؟" اس کے لہجے کی شائستگی پر اب مجھے بجا طور پر حیرت ہونے لگی تھی۔ میرے خیال میں تو مچھیروں میں سے کسی کو اس حد تک اردو بولنی نہیں آتی تھی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے شک ہوا کہ خفیہ پولیس کا آدمی تو نہیں لیکن اسی لمحے وہ ایک ہٹ کے سامنے رک گیا۔

"وہ پیشکش پانچ سو روپے فی گھنٹہ ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ میرا گھر ہے۔" اس نے ہٹ کی طرف اشارہ کیا' باقی باتیں اندر چل کر کرتے ہیں' تشریف لائیے۔" وہ ہٹ کی طرف مڑا' اسی دوران ایک عورت نے دروازہ کھول دیا۔ ململ کی ساڑھی میں سڈول جسم کی وہ عورت پکی رنگت کے باوجود بے حد پرکشش نظر آ رہی تھی۔ ڈھائی تین سال کا ایک بے ہنگم سا بچہ اس کی ساڑھی پکڑے ساتھ چلا آ رہا تھا۔

"بس ٹھیک ہے.... تم اندر جاؤ سندری!" مچھیرے نے اپنی بیوی کو حکم دیا۔ "میں ذرا بیٹھک میں بیٹھ کر بابو صاحب سے بات کروں گا۔"

چھیرا مجھے ساتھ لے بیٹھک میں داخل ہوا۔ یہ ایک اچھا بھلا پختہ دیواروں اور فرش والا کمرہ تھا جس میں معقول قسم کی کئی کرسیاں اور ایک تپائی بڑے سلیقے سے رکھی تھی۔

"میرا نام چھنا ہے۔" اس نے مجھے ایک کرسی پیش کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کا نام میں نہیں پوچھوں گا' جب آپ مناسب سمجھیں گے تو خود ہی بتا دیجئے گا۔" پھر جب ہم بیٹھ چکے تو وہ بولا۔ "البتہ میں یہ ضرور پوچھوں گا کہ آپ کو بوٹ کس مقصد کے لیے چاہیے؟ میری بوٹ ابھی نئی ہے اور ایک مرتبہ بھی ادھر کا مال ادھر کرنے میں استعمال نہیں ہوئی۔"

"کیا میں شکل و صورت سے تمہیں سمگلر نظر آتا ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"شکل و صورت سے تو کوئی بھی سمگلر نظر نہیں آیا۔" چھنا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کون کہہ سکتا ہے کہ یہ جو شریف شہری امپورٹ ایکسپورٹ کے بڑے بڑے عالیشان دفتر کھولے بیٹھے ہیں' ان کے مال کے ساتھ کیا کچھ جاتا اور کیا کچھ آتا ہے اور تو اور مختلف نوعیت کے وردیوں والوں میں نہ جانے کتنے یہ دھندہ کرنے والوں کے دادا باپ ہیں۔ اس لیے شکل و صورت کی بات تو چھوڑیں۔"

"بہرحال میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں اور نہ ہی مجھے اس قسم کا کوئی تجربہ ہے۔" میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور تم یہ بھی دیکھ رہے ہو کہ میرے پاس اس وقت اس بریف کیس کے سوا کچھ نہیں ہے۔"

"اس بریف کیس میں بھی ستر' اسی لاکھ کی ہیروئن سما سکتی ہے بابو صاحب!" چھنا مسکرا دیا۔ "لیکن خیر' ان باتوں کو چھوڑیئے' میں تسلیم کر لیتا ہوں کہ آپ کو اس مقصد کے لیے بوٹ نہیں چاہیے۔ آپ کو جانا کہاں ہے؟"

"مالتی مندر۔" میں نے اسے بتا دینے میں کوئی حرج محسوس نہیں کیا۔

"جواب تو درحقیقت میرا ہاں ہی ہے۔" وہ سر کھجاتے ہوئے بولا۔ "یہ ساری بحث و تمحیص اس لیے تھی کہ آپ مجھے بھی اپنے ساتھ کیوں نہیں لے جاتے؟ اگر آپ مجھ پر بھروسہ کریں تو میں اچھا ساتھی ثابت ہو سکتا ہوں۔ میری بڑے عرصے سے خواہش ہے کہ میں کبھی کسی حوصلہ مند آدمی کے ساتھ کسی مہم پر جاؤں۔ معلوم نہیں کیوں یہ شوق اکثر مجھے بے چین رکھتا ہے اور جب سے میں نے نئی بوٹ خریدی ہے تب سے تو یہ بے چینی بہت ہی بڑھ گئی ہے۔ خالی مچھلیوں کی بار برداری کرنے میں مزا نہیں آتا۔ آپ سے گفتگو کرکے نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہوا کہ درحقیقت مجھے آپ ہی جیسے کسی شخص کا انتظار تھا۔"

میں ہنس دیا۔ "اس قسم کے مکالمے تو رومانی افسانوں میں ہوتے ہیں۔"

میرے تبصرے پر کوئی دھیان دیئے بغیر اس نے بات جاری رکھی۔ "مجھے لگتا ہے کہ میرے اندر کوئی خاص صلاحیت' کوئی خاص طاقت موجود ہے جسے استعمال کرنے کا موقع

نہیں مل رہا۔" اس کے لہجے میں دبا دبا سا جوش جھلک آیا تھا۔ "پیسے کی مجھے اتنی پروا نہیں' ایک بار آپ مجھے اپنے ساتھ کسی بھی کام میں شریک کرکے دیکھیں شاید میں ہمیشہ کے لیے آپ کا اچھا دوست ثابت ہو سکوں۔"

اس کے لہجے میں اخلاص کی جو خوشبو تھی' اس نے مجھے سنجیدہ ہونے پر مجبور کر دیا۔

"میرے ساتھ چلتے ہوئے اگر تمہیں کوئی نقصان پہنچا تو اس کے ذمہ دار تم خود ہی ہو گے۔" میں نے کہا۔

"ارے صاحب اس کی فکر نہ کریں۔" اس نے ایک نئے جوش سے کہا۔ "جان بھی چلی جائے تو پروا نہیں اور آپ سے امید تو نہیں..... پھر بھی احتیاطاً واضح کر دوں کہ مجھے دھوکہ مت دیجئے گا ورنہ میں اتنا سیدھا ضرور بھی نہیں جتنا نظر آتا ہوں۔"

"میں دھوکہ دینا اور دھوکہ کھانا دونوں ہی پسند نہیں کرتا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اور میں بھی اتنی سی درخواست ضرور کروں گا کہ مجھے محض لونڈے لپاڑوں میں شمار مت کرنا۔"

"مجھے معلوم ہے صاحب! آپ بڑے گہرے پانی میں ہیں۔ میری آنکھوں نے دنیا دیکھی ہے۔" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"تم کیا توقع کر رہے ہو' میں کسی مہم پر جا رہا ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"اب مجھے یہ سوچنے کی ضرورت ہی نہیں صاحب!" اس نے لاپروائی سے کہا۔ "آپ بے شک ادھر کا مال ادھر کرنے میں ساتھ لے چلیں' کوئی پروا نہیں۔ بس کچھ ہنگامہ' کچھ بھاگ دوڑ اور کچھ مار دھاڑ ہونی چاہیے..... مچھلیاں ڈھوتے ڈھوتے ان کی مخصوص بدبو سے میرا تو دماغ شل ہو کر رہ گیا ہے اور ہاتھ پیروں کو زنگ لگنے لگا ہے۔"

"میں بہت معمولی سے کام پر جا رہا ہوں چھنا!" میں نے اس کی دلچسپی اور جوش و خروش کچھ کم کرنے کی کوشش کی۔

"کوئی بات نہیں..... آج آپ کے ساتھ چھوٹے اور معمولی کام پر چلوں گا' کل کو کسی بڑے کام میں بھی دوستی نبھانے کا موقع ملے گا..... اسی بات پر ملائیں ہاتھ۔" اس نے ہاتھ میری طرف بڑھایا' میں نے گرم جوشی سے اس سے مصافحہ کیا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ اس کا ہاتھ اس قدر سخت ہو گا' لوہے کا پنجہ معلوم ہوتا تھا۔۔۔ ایک عرصے بعد مجھے کسی سے مصافحے کا لطف آیا تھا۔

میں نے ایک بار پھر گھڑی دیکھی اور جیب سے کچھ نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لو' یہ گھر میں دے دو اور بیوی بچوں سے جو بات کرنی ہے' وہ کر کے باہر آ جاؤ' میں باہر کھڑا ہوتا ہے۔"

اس نے ایک نظر نوٹوں کی طرف دیکھا۔ "اتنی رقم کی کیا ضرورت ہے' ایک نوٹ کافی

رہے گا۔" اس نے کہا۔

"آپ اتنے بھی رضاکار مت ہو۔" میں نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ "جس طرح میں کہہ رہا ہوں' اسی طرح کرتے رہو۔ تبھی میرے ساتھی بن سکو گے۔"

اس نے نوٹ لے لیے اور اندر چلا گیا۔ میں ہٹ سے باہر آگیا' چند منٹ بعد ہی وہ بھی آگیا۔ اس کے حلیے میں صرف یہ فرق پڑا تھا کہ سر پر ایک اونی ٹوپی کا اضافہ ہو گیا تھا۔

"تمہیں سردی نہیں لگے گی سمندر میں؟" میں نے پوچھا۔

"آج تک تو کبھی لگی نہیں۔" اس نے میرے ساتھ چلتے ہوئے کہا "اور اگر لگی بھی تو بوٹ میں اس کا بندوبست ہے۔"

چند منٹ بعد ہم پختہ پلیٹ فارم پر آپہنچے جو کسی بھی بڑے سے بڑے ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم سے کہیں زیادہ لمبا چوڑا تھا۔ دور سے ہمارے ہیولے دیکھتے ہی وہاں ٹہلتا ہوا چوکیدار ہمارے قریب آپہنچا۔ اس نے ٹارچ کی روشنی ہم دونوں کے چہروں پر ڈالی اور چھنا کو دیکھ کر خوش دلی سے ہاتھ ہلایا اور ایک ایسی زبان میں کچھ کہا جو میری سمجھ سے بالاتر تھی' غالباً مچھیروں کی زبان تھی۔ چھنا نے بھی اسی زبان میں جواب دیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ محض ایک دوسرے کی خیروعافیت دریافت کر رہے تھے۔

ہم اس کے قریب سے گزرتے چلے گئے تو میں نے چھنا سے پوچھا۔ "رات کے اس پہر ہمیں بوٹ میں جاتے دیکھ کر اسے کسی قسم کا شک تو نہیں ہوگا؟ یہ کچھ پوچھے گا تو نہیں؟"

چھنا نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "یہ غریب کیا پوچھے گا' اس کی ڈیوٹی صرف اتنی ہے کہ کوئی یہاں سے کچھ اٹھا کر نہ لے جانے پائے۔ کوئی کب آرہا ہے' کیا لا رہا ہے' کیا لے جا رہا ہے' ان باتوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی ان معاملات میں اسے لب کشائی کی اجازت ہے۔ بعض مچھیرے تو ایسے ہیں جن سے کوسٹ گارڈ والے بھی یہ سوال نہیں کرتے کیونکہ اس قسم کے سوالات کرنے والوں کے ہاتھ بند ہو جاتے ہیں۔"

ہم پلیٹ فارم کے کنارے تک آپہنچے تھے۔ میں نے دیکھا نیچے پچاسوں موٹر بوٹس قطار در قطار پانی میں دھیرے دھیرے ہچکولے کھا رہی تھیں۔ پلیٹ فارم کا وہ حصہ جس سے سمندر کا پانی ٹکرا رہا تھا' اس پر قطار میں سینکڑوں ہک نصب تھے۔ بوٹس کے رسے یا زنجیروں کے سرے انہی کنڈوں میں بندھے ہوئے تھے۔ چھنا مجھے سیڑھیوں کی طرف لے گیا اور سیڑھیاں اترتے ہوئے بولا۔ "آپ یہیں ٹھہرے ہوں' میں بوٹ یہیں لاتا ہوں۔" ایک بوٹ کا رسا وہ ہک سے علیحدہ کر چکا تھا' دوسری بوٹس پر چڑھ کر انہیں پھلانگتا ہوا وہ اپنی بوٹ تک پہنچا اور اس کے ڈیک ہاؤس میں داخل ہو گیا۔

یہ تقریباً چالیس فٹ لمبی کریم کلر کی ایک خوبصورت موٹر بوٹ تھی جس کے سامنے والے حصے پر ونڈ سکرین کے نیچے سرخ کا ہندسہ اور موٹے موٹے حروف میں اسکا نام "وہائٹ

شارک" لکھا نظر آرہا تھا حالانکہ بوٹ کا رنگ کہیں سے بھی وہائٹ نہیں تھا۔ چند لمحے بعد میں نے اس کا انجن بیدار ہونے کی آواز سنی۔ آواز کسی درندے کی غراہٹ سے زیادہ بلند نہیں تھی اور محض آواز ہی سے اس کے انجن کی عمدگی کا اندازہ ہوتا تھا۔

بوٹ بڑی صفائی سے دوسری بوٹس کے درمیان سے نکلی اور سیڑھیوں کی طرف آگئی۔ چھنا نے ڈیک ہاؤس کی سب سے اگلی کھڑکی سے سر نکال کر مجھے ڈیک پر کودنے کا اشارہ کیا اور میں سیڑھیوں کے قریب سے گزرتی بوٹ کے ڈیک پر کود گیا۔ جب تک میں ڈیک ہاؤس میں چھنا کے پاس پہنچا' بوٹ رفتار پکڑ چکی تھی اور دائرے میں گھوم کر سمندر کا سینہ چیرتی گہرے پانیوں کی طرف چل دی۔ میں چھنا کے قریب جا کھڑا ہوا۔ چاند اب کسی آوارہ بادل کے ٹکڑے کے پیچھے جا چھپا تھا اور جہاں تک بوٹ کی طاقتور ہیڈ لائٹ کی رسائی تھی' صرف وہیں تک سمندر کی لہریں چمکتی نظر آرہی تھیں۔

"آپ جوتے اتار کر اطمینان سے دیوار گیر بستر پر بیٹھ جائیں۔" چھنا نے مجھے مشورہ دیا۔ "ہالتی مندر پہنچنے میں ہمیں تین پچیس منٹ لگیں گے۔"

میں نے اس کے مشورے پر عمل کیا۔ میں واقعی چند منٹ سستانے کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ چند لمحے بعد چھنا بھی وہیل کو لاک کر کے میرے قریب ہی اس زاویئے پر آبیٹھا کہ ونڈ سکرین سے اسے سطح سمندر کا منظر دور تک نظر آتا رہے۔

"کوئی بات کریں..... آپ تو بالکل چپ چپ ہیں۔" چھنا نے دوستانہ سے انداز میں کہا۔

میں اس وقت سوچ بچار میں الجھا ہوا تھا۔ چند لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے کے بعد میں نے کہا۔ "چھنا! اگر کوئی بے انتہا دولت مند غیر ملکی شخص جو سرکاری طور پر بھی اہمیت کا مالک ہو' تمہارے ملک کو محض جسم فروشی کا اڈہ سمجھ کر استعمال کرے' صرف دولت کے بل پر ہی جسم نہ خریدے بلکہ طاقت کے بل پر بھی اپنی من پسند لڑکیاں اور عورتوں کو اٹھوا لے اور اپنے ساتھیوں سمیت انہیں بربریت اور درندگی کا نشانہ بناتے کے بعد ان کی لاشیں سڑکوں یا دریاؤں میں پھنکوا دے اور اس کے باوجود نیک نام رہے' اس کے لیے تم کیا سزا تجویز کرتے ہو؟"

اس نے ایک لمحے کے لیے میری آنکھوں میں جھانکا اور کچھ سوچ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں اس کے لیے قتل کی سزا تجویز کروں گا۔"

بڑی گرم جوشی سے مسکراتے ہوئے اس نے دھوتی کی ڈب میں ہاتھ ڈالا اور چھوٹا سا ایک اسپرنگ دار چاقو نکالا۔ اس پر موجود ایک چھوٹا سا بٹن دباتے ہی سانپ کی زبان کی طرح جھٹکے سے اس کا چار' پانچ انچ لمبا دودھاری پھل دستے سے باہر آگیا۔ چھنا نے ڈیک ہاؤس کی زرد روشنی میں نقرئی پھل کی جھلملاہٹ کا جائزہ لیتے ہوئے خودکلامی کے سے انداز

میں کہا۔ "ایک منٹ بھی نہیں لگے گا۔" دفعتاً اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ "ماتی مندو پر ایک افریقی شہزادے کا محل ہے' جہاں وہ کبھی کبھی آکر قیام کرتا ہے۔ آپ کا اشارہ اس کی طرف تو نہیں؟" اس نے پوچھا' اس کی تنگ سی پیشانی پر شکنیں ابھر آئی تھیں۔

"بالفرض میرا اشارہ اسی کی طرف ہو تو کیا تم میرے ساتھ چلنے کا ارادہ ترک کر دو گے؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" وہ فوراً بولا۔ "ایک بار دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا' سو بڑھا دیا۔ اب ہاتھ کھینچنے کا کیا سوال۔ اب تو مقابل شہزادہ ہو یا شہنشاہ' جو ہو گا سو دیکھا جائے گا۔"

اس لمحے وہ مجھے بڑا کھرا اور جی دار آدمی معلوم ہوا۔ اس کے لیے میرے دل میں پسندیدگی کی لہر قوی ہو گئی۔ اسی اثناء میں دور کہیں تاریک سمندر کے سینے پر کچھ روشنیاں جھلملاتی دکھائی دینے لگی تھیں۔

"یہ روشنیاں کیسی ہیں؟" میں نے چھنا سے پوچھا۔

"یہ اسی شہزادے کے محل وغیرہ کی روشنیاں ہیں۔" چھنا نے جواب دیا۔ "میں کبھی جزیرے پر گیا تو نہیں لیکن سنا ہے کہ وہاں کئی طاقتور جنریٹر پر مشتمل ایک چھوٹا سا پاور ہاؤس بھی موجود ہے جس سے شہزادے نے اپنی ضرورت کی جگہوں پر روشنی کا انتظام کر رکھا ہے۔ درختوں وغیرہ کی اوٹ کی وجہ سے بعض اوقات یہ روشنیاں زیادہ دور سے نظر نہیں آتیں۔"

روشنیاں لحہ بہ لحہ واضح تر ہوتی گئیں بالآخر ہم جزیرے تک پہنچے۔ بوٹ ہاؤس کی تلاش میں ہم نے جزیرے کے گرد چکر لگانا شروع ہی کیا تھا کہ ہمیں چند فرلانگ کا فاصلہ طے کرتے ہی وہ نظر آ گیا۔ یہ دراصل سمندر میں کچھ فاصلے تک بڑھی ہوئی کنکریٹ اور پتھروں کی ایک کشادہ سرنگ سی تھی جس میں اس وقت روشنی تھی۔ چھنا نے بڑی مہارت سے بوٹ اس میں داخل کرکے انجن بند کر دیا اور چند لمحے بعد بوٹ ہلکے سے دھچکے سے رک گئی۔ بوٹ ہاؤس میں اس جیسی دو تین بوٹیں برابر برابر کھڑی کرنے کی گنجائش تھی اور کنارے پر ان کی رسیاں یا زنجیریں باندھنے کے پول بھی نصب تھے اور ان سے آگے ایک چوبی دروازہ تھا جس سے گزر کر جزیرے پر پہنچا جا سکتا تھا۔ یہ دروازہ اس وقت کھلا ہوا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ بوٹ ہاؤس میں اس وقت کوئی اور بوٹ موجود نہیں تھی۔

میں نے چھنا سے ٹارچ لی جو ڈیک ہاؤس ہی میں موجود تھی۔ ڈیکرم نے مجھے بتایا تھا کہ ٹارچ سے تین مرتبہ سگنل دینے پر فیروشیا نامی ایک شخص آئے گا جو بوٹ میں آنے والوں کو پرنس شوبین کے جہاز تک لے جائے گا۔ میں نے چھنا کو آنکھ مار کر اسے تیار رہنے کا اشارہ کیا اور ٹارچ کا رخ ساحل کی طرف کرکے اسے تین مرتبہ جلایا بجھایا۔

تیسری مرتبہ میں نے ٹارچ بجھائی ہی تھی کہ ساحل کی تاریکی سے ایک ہیولا بوٹ پر کود آیا۔ بوٹ کنارے سے کافی فاصلے پر تھی اور ہیولے کی جسامت دیکھتے ہوئے مجھے اس کا بوٹ پر کود آنا کسی حد تک ناقابل یقین لگا کیونکہ وہ پورا ہاتھی کا ہاتھی تھا۔ چالیس فٹ لمبی بوٹ بھی اس کے وزن سے ڈول کر رہ گئی تھی۔

وہ ہیولا دھپ دھپ کرتا سیدھا ڈیک ہاؤس میں آ گیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اسے دیکھ کر چھنا کا ردعمل کیا ہوا۔ البتہ میں ضرور کچھ لمحے کے لیے دم بخود رہ گیا' وہ دراصل مرد نہیں عورت تھی اور اتنی کیم شحیم عورت میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھی تھی۔ اس کا قد کم از کم چھ فٹ' رنگ الٹے توے کی طرح سیاہ' آنکھیں انگارے کی طرح سرخ اور صورت انتہائی بھیانک تھی۔ افریقی معیار حسن سے شاید اس کے تیکھے نقش سرمایہ نگاہ عاشقاں رہے ہوں لیکن کم از کم میں نے خواب میں بھی اتنی بھیانک شکل نہیں دیکھی تھی۔ پہلی نظر میں وہ عورت نہیں کسی الف لیلوی جن کی مادہ معلوم ہوتی تھی۔ موٹے موٹے ہونٹ بھینس کی طرح لبوترا منہ اور بھینس ہی کے دانتوں جیسے باہر کو جھانکتے ہوئے چوڑے چوڑے دانت' اس کی بھنویں کسی گبھرو پٹھان کی پلی ہوئی مونچھوں سے بھی زیادہ موٹی تھیں اور پلکیں جیسے تھی ہی نہیں۔ پلکوں سے محروم سرخ انگارہ سی آنکھیں مینڈک کی آنکھ ہی کی طرح باہر کو ابھری ہوئی تھیں۔ پیشانی سے کافی اوپر تک بال نہیں تھے۔ سر کے وسط سے بال شروع ہوتے تھے اور وہ بھی محض بھیڑ کی اون کی طرح کھوپڑی سے چپکے ہوئے تھے۔

اس کے بازو شہتیر اور ہاتھ بیلچے سے مشابہ تھے۔ اس نے اسکرٹ نما جو ایک ڈھیلا ڈھالا لبادہ پہن رکھا تھا' وہ محاورتاً نہیں حقیقتاً بڑے سائز کے ایک خیمے کے برابر تھا۔ اس کے پیروں میں چمڑے کے بوٹ تھے جو یقیناً کسی کاریگر نے خاص طور پر اس کے لیے تیار کیے ہوں گے۔ کم از کم ہندوستان کی کسی دکان پر اس کے سائز کے جوتے دستیاب نہیں ہوں گے۔

اس کا سرتاپا جائزہ لے کر میں نے چھنا کی طرف دیکھا' وہ دیوار گیر بستر پر بیٹھا ایک ٹک اسی عفریت زادی کی طرف دیکھ رہا تھا مگر مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس کی آنکھوں میں خوف کی جھلک کی بجائے دلچسپی کی چمک تھی۔

میں ایک بار پھر عورت کی طرف متوجہ ہو گیا جو اس دوران متلاشی نظروں سے ڈیک ہاؤس کے گوشے گوشے کا جائزہ لے رہی تھی' پھر اس کی نظر مجھ پر مرتکز ہو گئی' میں اس سے چند فٹ کے فاصلے پر ہی کھڑا تھا۔

"ڈیکرم کہاں ہے؟" دفعتاً ڈیک ہاؤس میں جیسے نقرئی گھنٹیاں گونج اٹھیں۔ سوال انگریزی میں کیا گیا تھا اور آواز ایسی ترنم ریز تھی کہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ اس عفریت

زادی کے حلق سے برآمد ہوئی ہوگی۔ لہجہ اتنا شستہ اور لفظ اتنا بے عیب تھا کہ مجھے کالج کے زمانے کی اپنی پروفیسر موہنی شانتا رام یاد آ گئیں جنہوں نے آکسفورڈ میں تعلیم پائی تھی اور اب تک وہاں ٹاپ کرنے والی تین ہندوستانی طالب علموں میں سے ایک تھیں۔

"لڑکی؟" میں نے بے مقصد سے لہجے میں دہرایا۔ میں سوچ رہا تھا کہ شاید اکرم نے کسی غلط فہمی کی بنا پر یا پھر ہوش و حواس ٹھکانے نہ ہونے کی وجہ سے مجھے بتا دیا تھا کہ فیروشیا کوئی مرد ہے ورنہ درحقیقت وہ یہی عورت ہوگی۔

"تم فیروشیا ہو؟" میں نے سنبھل کر پوچھا۔

"فیروشیا کو تو میں باندھ کر اس کے کمرے میں ڈال آئی ہوں۔" اس نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ "اس سے یہ معلوم کرنے کے لیے مجھے اس کے دو دانت توڑنے پڑے کہ آج رات پرنس کے لیے کچھ لوگ بوٹ میں ایک نئی لڑکی لے کر آ رہے ہیں جس کے لیے پرنس دیوانہ ہوا پھر رہا ہے۔ مجھے شام ہی سے پرنس اور فیروشیا کی پراسرار سی حرکات و سکنات دیکھ کر شک پڑ رہا تھا کہ ایک بار پھر دال میں کچھ کالا ہے۔ اس لیے میں نے پرنس کے کمرے سے نکلتے ہی فیروشیا کو دبوچ لیا تھا۔"

"آخر خاتون تم ہو کون؟" میں نے قدرے بلند آواز میں پوچھا۔ میرے حواس اب صحیح طور پر کام کرنے لگے تھے۔

"ہرہائی نس لیڈی سنتالا آف نکاراگوچی۔" اس نے بڑے وقار سے کہا۔ "پرنس شومبی کی بیوی.... مجھے بہت عرصے سے خبریں مل رہی تھیں کہ نکاراگوچی کی لڑکیوں سے دل بھر جانے کے بعد پرنس نے ہندوستان کو اپنی عیاشیوں کا مرکز بنا لیا ہے۔ اس لیے اس مرتبہ وہ نکاراگوچی سے آنے لگا تو میں بھی اس کے ساتھ چلی آئی۔ میں اب مزید برداشت نہیں کر سکتی کہ وہ مجھ کو میری طرف پلٹ کر بھی نہ دیکھے اور دنیا بھر کی نت نئی لڑکیوں کے ساتھ وقت گزارتا پھرے۔ مجھے معلوم ہے کہ شہزادوں وغیرہ کی بیویوں کے لیے ان کے شوہروں کی عیاشی کی خبریں کسی خاص اشتعال کا باعث نہیں بنتیں کیونکہ وہ خود بھی اس قسم کی سرگرمیاں شروع کر کے اپنے اشتعال کا گلا گھونٹ لیتی ہیں لیکن مصیبت یہ ہے کہ میں اس قسم کی جوابی کارروائی بھی نہیں کر سکتی۔ اچھے بھلے مرد مجھے دیکھ کر چیخیں مارتے ہوئے بھاگ جاتے ہیں۔ شروع شروع میں تو خود پرنس کا یہی حال ہوتا تھا...."

"پھر اس نے آپ سے شادی کیسے کر لی؟" بے ساختہ میری زبان پر یہ سوال آ گیا۔

"کیونکہ میرے خاندان کی بدولت ہی اس کے خاندان کی بادشاہت قائم ہے۔" لیڈی سنتالا یعنی مسز شومبی نے نخوت سے جواب دیا۔ "اور انہیں شاہی خاندان کا رتبہ بھی میرے ہی آباؤ اجداد نے دلایا ہے ورنہ یہ لوگ تو معمولی لوہار تھے۔ میرے دادا برٹش آرمی میں کمانڈر جنرل تھے۔ انہوں نے بغاوت کی' اپنے خاندان اور وفادار ساتھیوں میں سے سینکڑوں

کی جانوں کی قربانی دی اور انگریزوں کا تختہ الٹ کر راتوں رات پرنس شومبی کے دادا کو تخت پر بٹھا دیا اور مشہور کر دیا کہ وہ شہزادے ہیں اور نکاراگوچی کے تخت کے اصل وارث تھے۔"

"تو اسی لیے پرنس شومبی تمہاری شوہریت کے بوجھ تلے کراہ رہا ہوگا۔" میں بڑبڑایا۔ "اور شاید اسی بے رحمانہ شادی کے ردعمل میں وہ اتنا بے راہ رو اور انسانی خواہشات کے معاملے میں مطلق العنان ہو گیا ہوگا۔" لیکن فوراً ہی میں نے سوچا کہ اس کے حالات میں ان لڑکیوں کا تو کوئی قصور نہیں تھا جو اس طرح کسی کے ہاتھ بک بھی نہیں تھیں مگر انہیں بھی نہ صرف اس کی اور اس کے ساتھیوں کی بربریت و حیوانیت کا نشانہ بننا پڑا تھا بلکہ زندگی سے بھی ہاتھ دھونے پڑے تھے۔

میری بڑبڑاہٹ عفریت زادی کی سمجھ میں نہ آئی تو وہ کچھ اور آگے کو آ گئی۔ "کیا کہا تم نے؟" اس نے ایک بار پھر مسکرانے کی کوشش میں اپنی شکل کو اور زیادہ بھیانک بنا لیا۔

"کچھ نہیں...." میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"میں نے اتنی باتیں کر ڈالیں' اپنے اور پرنس کے متعلق' سب کچھ بلاکم و کاست بتا دیا۔ اب تم بھی بتا دو کہ لڑکی کو تم نے کہاں چھپا رکھا ہے؟" اپنی دانست میں وہ بڑی لگاوٹ سے مسکرائی۔ "میں صرف اس کا چہرہ تھوڑا سا بگاڑ کر اسے سمجھانا چاہتی ہوں کہ دولت کے عوض اپنا آپ نہیں بیچا کرتے۔"

"اور فرض کرو کہ وہ اپنی مرضی سے نہ آئی ہو' اسے اغوا کر کے لایا گیا ہو تو پھر تم کس کا چہرہ بگاڑو گی؟" میں نے تلخی سے پوچھا۔

"اغوا کرنے والوں کا۔" اس نے بلاتامل جواب دیا۔ "اب تم کہو گے کہ اصل ذمہ دار تو پرنس ہوتا ہے تو تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ اس کا چہرہ تو میں اکثر بگاڑتی ہی رہتی ہوں۔ آج بھی وہ باہر کہیں اپنے کسی ٹھکانے پر لڑکی کا انتظار کرتے کرتے مایوس ہو کر جب گھر واپس آئے گا تو میں خوابگاہ میں گھونسوں اور لاتوں سے اس کا استقبال کروں گی۔"

"خیر.... یہ تمہارا گھریلو معاملہ ہے کہ تم اس کا استقبال کس طرح کرتی ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بہرحال تمہاری گفتگو سے مجھے یہ سبق ملا ہے کہ شہزادہ بن کر بھی انسان کو بیوی کے مظالم سے نجات نہیں۔" پھر میں یک لخت بہت زیادہ سنجیدہ ہو گیا۔ "تاہم تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس بوٹ پر کوئی لڑکی نہیں ہے [illegible] ہم کسی پرنس شومبی وغیرہ سے ملنے آئے ہیں۔ ہمارا دھندہ تو ادھر کا مال ا[illegible] ہم اپنے ایک ساتھی کی تلاش میں ہیں جو لانچ لے کر کہیں غائب ہو گیا ہے۔"

"زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔" عفریت زادی کی آواز سے یک لخت ترنم غائب ہو گیا اور تیوری چڑھ گئی۔ "اگر تم وہی آدمی نہ ہوتے جس کا پرنس کو انتظار ہے تو تم

کبھی بوٹ ہاؤس میں آکر نہ رکتے' تاریخ سے تین مرتبہ۔ مخمل تہ دیتے اور فیوشیا کا نام نہ لیتے۔ خیر۔ تم مت بتاؤ' میں خود دیکھ لیتی ہوں۔"

ہرہائی نس میلڈی مسٹالا' تف نکار' گویا یک لخت بپھری ہوئی ناگنی بن گئی۔ اس نے وہ دیوار گیر بستر الٹ دیا جس پر چھما بیٹھا تھا۔ چھما کچھ دور جا گرا اور ایک کہنی کے بل وہیں لیٹ گیا۔ اس کے تاثرات میں کوئی خاص فرق نہ آیا۔ وہ اب بھی اسی طرح عفریت زادی کی حرکات و سکنات دیکھ رہا تھا جیسے اس کے سامنے کوئی دلچسپ فلم چل رہی ہو۔

غصے سے پھنکارتے ہوئے وہ ہر چیز کو اٹھا کر ادھر سے ادھر پھینکنے لگی۔ چند ہی لمحوں میں اس نے کیبن کی ہر چیز کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ عجیب الٹے دماغ کی عورت تھی۔ بوٹ میں لڑکی کا کوئی نام و نشان نہ پا کر اس کا غصہ ٹھنڈا ہونے کے بجائے بھڑکتا جا رہا تھا۔

"ہرہائی نس!" بالآخر میں نے عقب سے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "لڑکی بہرحال لڑکی ہوتی ہے' لکڑی کا کوئی ٹکڑا نہیں جسے کونے کھدرے میں پھینک کر اوپر سے اس پر کاٹھ کباڑ ڈال دیا جائے اور نہ ہی اسے جیب میں چھپایا جا سکتا ہے۔ اب آپ یہ ہنگامہ ختم کریں اور گھر جا کر آرام سے سوئیں۔"

"بکواس مت کرو۔" وہ غرائی اور نہایت غیر متوقع طور پر اس نے گھومتے ہوئے مجھے الٹے ہاتھ کا تھپڑ رسید کر دیا۔ کچھ دیر پہلے اس کے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے میرے ذہن میں ان کے لیے بیلچوں کی تشبیہ غلط نہیں آئی تھی۔ مجھے یہی محسوس ہوا کہ میرے رخسار اور کنپٹی پر کسی نے بیلچہ پوری قوت سے گھما کر مار دیا ہے۔ میں چوبی دیوار سے جا ٹکرایا اور آنکھوں کے سامنے پھیلتی تاریکی سے مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ اب میں چکرا کر گر جاؤں گا لیکن میں نے فوراً ہی سانس روک کر سر جھٹکا' پھر یوگا کے ایک خاص انداز کے تحت کئی گہری گہری سانسیں لیں۔

وہ گھونسہ بلند کیے میری طرف آرہی تھی۔ "سچ سچ بتاؤ کہ لڑکی کو تم نے کہاں چھپا رکھا ہے؟" اس کی آواز اب نہایت کریہہ محسوس ہو رہی تھی۔ "اس بوٹ میں ضرور کوئی خفیہ خانہ ہے' جلد بتاؤ وہ کہاں ہے۔ دلال کے بچے!" اس نے آگے بڑھ کر بائیں ہاتھ سے میرا گریبان پکڑ لیا اور دایاں ہاتھ گھونسے کی شکل میں میرے چہرے کے سامنے لہرانے لگی۔ مجھے یقین تھا کہ اس کا ایک ہی گھونسا آدمی کی شکل بگاڑ سکتا تھا۔

اب میرے اندر غصے کا ابال اٹھ رہا تھا جو میری کنپٹیوں میں ہوتکڑ رہا تھا۔ میری پیشانی گھڑی کی طرح ٹک ٹک کرنے لگی تھی۔ شاید اس کے وسط میں کوئی رگ پھڑک رہی تھی۔ اس عفریت زادی نے مجھے خاموش پا کر گھونسہ بلند کیا اور جیسے ہی اس کا بازو نیچے آنے لگا' میں نے اسے ہاتھ پر روک لیا۔ اس کی کلائی پوری طرح تو میری گرفت میں نہ آئی لیکن جتنی آئی تھی' اتنی ہی کافی تھی۔ میں نے اسے پوری طاقت سے گرفت میں لیا تھا'

اس سے ایک بار تو اس عفریت زادی کو بھی گمان گزرا ہو گا کہ اس کی کلائی شاید کسی آہنی شکنجے میں پھنس گئی ہے کیونکہ میں نے اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار دیکھے تھے۔

دائیں ہاتھ سے میں نے اس کے پیٹ سے ذرا اوپر ایسے حصے پر پوری طاقت سے گھونسہ رسید کیا جہاں عام آدمی کو اگر اس طرح گھونسہ پڑ جاتا تو وہ خون تھوکتے ہوئے وہیں پھڑک کر رہ جاتا۔ وہ ہتھنی کی بچی بھی اپنی جگہ سے اچھل پڑی اور اس کے جوتوں کی دھمک کیبن میں گونج کر رہ گئی۔ اس نے ابکائی سی لی اور پہلے سے زیادہ غضبناک ہو کر اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔

دوسرا گھونسہ میں نے اس کی کنپٹی پر رسید کیا۔ وہ لڑکھڑائی مگر فوراً ہی سر جھٹک کر اس طرح سنبھل گئی جیسے میں نے سنبھالا دیا تھا۔ اس عورت کی کلائی قابو میں رکھتے ہوئے مجھے دانتوں پسینہ آنے لگا تھا۔ اس کا بایاں بازو آزاد تھا۔ میرا گریبان اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا۔ یہی بازو گھما کر اس نے میرے منہ پر تھپڑ رسید کرنا چاہا لیکن میں بروقت جھک گیا۔ اس کا ہاتھ چوبی دیوار پر پڑا اور وہ بلبلا کر رہ گئی۔

وہ پیچھے کو لڑکھڑائی۔ اگر میں نے اس لمحے اس کی کلائی نہ چھوڑ دی ہوتی تو میں بھی اس کے اوپر جا گرتا۔ وہ کاٹھ کباڑ پر ڈھیر ہونے کے بعد بھی اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی اور اپنا بڑا سا سر بار بار جھٹک رہی تھی مگر پھر وہ بے بسی سے ساکت ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی جیسے کائنات بھی ساکت ہو گئی۔ اس کی اچھل کود اور زور آزمائی سے جیسے بوٹ پر بھونچال آیا ہوا تھا۔

گوشت کے اس پہاڑ کو غصے میں ایک ٹھوکر رسید کر کے میں مڑا تو درمیانی دروازے میں چھما کھڑا نظر آیا۔ وہ تحسین آمیز نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

"واہ صاحب واہ!" وہ مسرور سے لہجے میں بولا۔ "تھی تو عورت مگر اسے زیر کرنا آپ جیسے شہ زوروں ہی کا کام تھا۔ وہ تو قریب آنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ ایک بار سوچا کہ پسلیوں میں چاقو گھونپ کر اس کا کام تمام کر دوں۔ پھر یہ سوچ کر رک گیا کہ شاید آپ اس کا مارا جانا پسند نہ کریں۔ اگر اسے ہلاک ہی کرنا ہوتا تو غالباً آپ خود ہی کوئی ہتھیار استعمال کر لیتے۔" اس نے یقیناً میری جیکٹ کی جیبوں کے ابھاروں سے ریوالوروں کی موجودگی کا اندازہ لگا لیا تھا۔

"مل کر اسے کسی نہ کسی طرح ڈیک کے کنارے تک لے چلتے ہیں۔" چھما نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ "ڈیک کے کنارے سے ساحل تک میں تختہ لگا دوں گا اور اسے تختے پر لڑھکا دیں گے۔ قسمت اچھی ہوئی تو کنارے پر پہنچ جائے گی ورنہ پانی میں ڈبکیاں کھا کر خود ہی ہوش میں آجائے گی اور نکل جائے گی۔"

ہم نے یہی طریقہ استعمال کیا۔ بمشکل تمام اسے کھینچتے ہوئے ڈیک کے کنارے تک

لائے، پھر تختہ رکھ کر اس پر لڑھکا دیا۔

میں نے اپنا بریف کیس اور چھما نے ٹارچ سنبھال اور ہم بھی تختہ ہی کے ذریعے کنارے پر اتر آئے۔ چھما نے بوٹ کو رسی کی مدد سے پل سے باندھ دیا تھا۔ جزیرے پر پہنچ کر چند منٹ کی تلاش کے بعد ہی ہمیں وہ گاڑی مل گئی جس میں مسز شومبی یہاں آئی تھی۔ یہ سفید رنگ کی ایک مخمور مجلی آلر تھی۔ مسز شومبی ایسی ہی گاڑی میں سفر کر رہی تھی۔ بند چھت والی گاڑی میں داخل ہونا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

مسز شومبی کو ہم نے وہیں پڑا رہنے دیا اور خود گاڑی لے کر اندازاً" اس پختہ پٹی کی تلاش میں چل پڑے جو رن وے کا کام دیتی تھی۔ میں نے وقت دیکھا پونے دو بج رہے تھے۔ وکرم نے بتایا تھا کہ اسے روپا کو لے کر دو بجے جزیرے پر پہنچنا تھا' گویا ہم وقت سے کچھ پہلے ہی پہنچ گئے تھے جس کا مطلب تھا کہ ہم اطمینان سے رن وے تلاش کر سکتے تھے۔

رن وے تلاش کرنے میں ہمیں زیادہ دیر نہیں لگی۔ ہم کنکریٹ کی ایک پختہ پٹی پر آپہنچے تھے جو ہمارے دائیں بائیں دور تک پھیلی نظر آرہی تھی۔ میں نے گاڑی روک کر دونوں طرف نظر دوڑائی' طیارے کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ البتہ سڑک دونوں طرف سے دائرے میں گھوم رہی تھی اور اس دائرے کے درمیان بھی چونکہ جھاڑیوں اور اونچے اونچے درختوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا' اس لیے یہ دیکھنا مشکل تھا کہ سڑک کے گھماؤ سے آگے کیا ہے۔ میں نے بغیر کسی ارادے کے گاڑی دائیں طرف موڑ دی۔ رن وے کا نیم دائرہ طے کرتے ہی مجھے طیارہ نظر آگیا۔ تاروں کی مدھم روشنی میں اس کے وہ حصے چمک رہے تھے جن پر پینٹ نہیں تھا اور اس کے دونوں طرف سرخ بتیاں جل بجھ رہی تھیں۔ میں نے غیر ارادی طور پر فوراً" بریک لگا دی کیونکہ طیارے کا رخ ہماری طرف تھا اور ہیڈ لائٹس کی روشنی اس کے پہیوں پر پڑ چکی تھی اور طیارے میں موجود افراد یقینی طور پر ہماری گاڑی کو دیکھ چکے تھے۔

○

میرا ایک ہاتھ اسٹیئرنگ پر اور دوسرا جیب میں موجود مشین پسٹل پر تھا۔ چند لمحے یونہی گزر گئے۔ پھر میں نے گاڑی رن وے سے ہٹا کر جھاڑیوں کے قریب جا روکی۔ اس دوران طیارہ بدستور سکوت میں ڈوبا رہا۔ طیارے کے ساتھ المونیم کی ہلکی سیڑھی لگی ہوئی تھی اور میری نظر اسی پر تھی۔ میں نے گاڑی کی لائٹیں بجھا دیں البتہ انجن اسٹارٹ رہنے دیا۔

چند لمحے بعد میں نے طیارے کی سیڑھی پر ایک ہیولا نمودار ہوتے دیکھا۔ یہ چھریرے جسم کا کوئی دراز قد شخص تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سوٹ کیس بھی نظر آرہا تھا۔ سیڑھی سے اتر کر وہ بڑے مطمئن اور پروقار انداز میں گاڑی کی طرف آنے لگا۔ وہ قریب آپہنچا تو میں نے دیکھا' وہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس ایک دبلا پتلا اور لمبا افریقی نوجوان تھا۔ اس کے رخساروں کی ہڈیاں بدنمائی کی حد تک ابھری ہوئی تھیں' تاہم موٹی موٹی آنکھیں خاصی پرکشش تھیں۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کے ایک ہاتھ میں چھوٹی سی ٹارچ بھی موجود تھی' اس لیے جب اس نے قریب آکر اچانک میرے چہرے پر روشنی ڈالی تو میں گڑبڑا سا گیا لیکن ساتھ ہی میں نے محسوس کیا کہ مجھ سے زیادہ وہ خود گڑبڑا گیا ہے۔

"وکرم کہاں ہے؟" اس نے اضطراری طور پر پوچھا۔ اس کی انگریزی میں فرانسیسی لب و لہجے کی جھلک تھی۔

"مجھے وکرم نے ہی بھیجا ہے۔" میں نے سنبھل کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"فیوشیا کے بغیر تم یہاں کیسے آپہنچے؟" اس نے چھما کی طرف ایک نظر دیکھ کر گاڑی کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "اور یہ میری بیوی کی گاڑی تمہارے پاس کیسے نظر آرہی ہے؟"

اب تعارف کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ میرا اندازہ درست ہی نکلا کہ وہ پرنس شومبی ہے۔ یہ تصور کرکے مجھے عجیب سا احساس ہوا کہ بیوی کے ساتھ اس کی جوڑی کیسی لگتی ہوگی۔ ڈھول اور چھڑی ہی کی مناسبت تھی ان میں۔ آہ بیچارہ شومبی! ایک لمحے کے لیے مجھے اس سے ہمدردی محسوس ہوئی لیکن اس کے کرتوت یاد کرتے ہی اس ہمدردی کی جگہ غصے نے لے لی۔

"تھوڑی سی گڑبڑ ہو گئی تھی۔" میں نے اب نہایت پرسکون لہجے میں کہا۔ "آپ کی

بیوی نے فیزشیا کو قابو کر کے اس سے معلوم کر لیا تھا کہ آج آپ کے لیے کوئی تحفہ پہنچنے والا ہے' اس لیے ساحل پر فیروشیا کے بجائے وہ خود ہی ہمارے استقبال کے لیے موجود تھی۔"

"اوہ... یہ تو بہت برا ہوا۔" شومیا کی آواز سے میں نے محسوس کیا کہ اس کے جسم میں ایک لمحے کے لیے کپکپی سی آ گئی تھی۔ اگر اس کی رنگت اتنی سیاہ نہ ہوتی اور وہاں روشنی کچھ زیادہ ہوتی تو شاید اس کی رنگت کا تغیر بھی نظر آ جاتا۔

"مجبوراً ہمیں ان کے ساتھ تھوڑی سی بدتمیزی کرنی پڑی۔" میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

"کیا تم نے انہیں گولی مار دی؟" اس نے خوفزدہ لہجے میں پوچھا لیکن اس لہجے کی تہہ میں ایک ہلکی سی امید بھی پنہاں تھی۔

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "ہم نے انہیں صرف بے ہوش کیا ہے' اسی لیے ان کی گاڑی ہمارے پاس نظر آ رہی ہے۔"

اس نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔ "تم اسے بے ہوش نہیں کر سکتے' تم نے یقیناً کوئی ہتھوڑا استعمال کیا ہوگا۔" اس نے خیال ظاہر کیا۔

"اس بحث کو چھوڑیے کہ ہم نے کیا استعمال کیا اور کیا نہیں۔" میں نے قدرے بیزاری سے کہا۔ "اور کام کی بات کیجیے۔ کیا آپ اب بھی لڑکی کو لے کر افریقہ کی طرف پرواز کرنے کے لیے تیار ہیں؟"

"اب تو یہ اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔" اس نے خودکلامی کے سے لہجے میں کہا۔ "جب تک مشالا کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہو جاتا' میں اس کا سامنا نہیں کر سکتا۔ لڑکی کہاں ہے؟"

"بوٹ ہی میں ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ رقم لے کر آئے ہیں؟"

"ہاں۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا سوٹ کیس قدرے بلند کر کے مجھے دکھایا۔ "لیکن تم لڑکی کو بوٹ میں کیوں چھوڑ آئے ہو؟ وہیں تمہارے پاس مشالا بھی ہوگی۔"

"ہم نے احتیاطاً ایسا کیا ہے۔" میں نے کہا۔ "اپنی بیوی کی آپ فکر نہ کریں' وہ ساحل سے کافی فاصلے پر ہیں اور کم از کم ایک گھنٹے تک ہوش میں نہیں آئیں گی۔ لڑکی بھی بے ہوش ہے۔ آپ اسے اسی گاڑی میں ڈال کر لے آئیے گا۔ ہم وہیں سے رخصت ہو جائیں گے۔ تشریف رکھیے۔" میں نے ہاتھ بڑھا کر پچھلا دروازہ کھولا۔

اس نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا' پلٹ کر طیارے کی طرف دیکھا۔ پھر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ سوٹ کیس اس نے اپنے پیروں کے قریب رکھ لیا۔ میں گاڑی کو رن وے پر لے آیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہاں آنے کا صحیح راستہ کونسا تھا' میں نے گاڑی کو یونہی دے کر رفتار بڑھا دی۔ پرنس نے راستہ بتانے کی کوشش نہیں کی۔ میں یا تو صحیح راستے کی طرف جا رہا تھا یا پھر پرنس اپنے ہی خیالات میں کھویا ہوا تھا۔

طیارہ عقب میں ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ ایک جگہ مجھے جھاڑیوں اور درختوں کے درمیان پگڈنڈی نظر آئی۔ میں نے گاڑی رن وے سے اتار کر اسی طرف موڑ دی۔ پرنس اب بھی کچھ نہ بولا۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں چھنا کو اشارہ کیا اور چند لمحے بعد ایک مناسب سی جگہ دیکھ کر ایکسیلیٹر کو خاص انداز میں استعمال کرتے ہوئے گاڑی کو پے در پے کئی جھٹکے دیے اور پھر انجن بند کر دیا۔

پرنس اب چونک کر میری طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

"شاید انجن میں کچھ خرابی ہو گئی ہے۔" میں نے ناگواری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا اور دروازہ کھول کر اترتے ہوئے پوچھا۔ "کیا ڈکی میں کچھ ٹولز وغیرہ موجود ہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" اس نے جواب دیا۔ میں نے مزید وقت ضائع نہیں کیا اور گاڑی سے اترتے ہی اس کے منہ پر گھونسا رسید کیا۔ وہ پچھلی سیٹ پر ڈھیر ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی آواز نکالتا' میں نے جھک کر اسے گریبان سے پکڑ کر کھلی چھت کی گاڑی سے باہر کھینچ لیا۔ اس کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئی تھیں اور نچلا ہونٹ پھٹ چکا تھا۔ اس کے حلق سے گھگھیاتی ہوئی سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ مجھے حیرت ہوئی کہ عورتوں کے معاملے میں اتنا درندہ صفت نوجوان اس قدر چھوٹے دل کا مالک تھا۔

اس کے ہاتھ تھر تھر کانپ رہے تھے اور وہ ان کے پیچھے چہرہ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید وہ چیخنا بھی چاہتا تھا مگر آواز ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میرا جی چاہا کہ اس کی پتلی سی گردن ایک جھٹکے سے توڑ دوں لیکن اپنے آپ پر ضبط کرتے ہوئے میں نے اس کی کنپٹی پر ہاتھ رسید کیا۔ وہ بے ہوش ہو کر میری گرفت میں جھول گیا۔

چھنا بھی گاڑی سے اتر آیا تھا۔ اس نے پرنس کو دونوں بازوؤں پر سنبھالتے ہوئے کہا۔ "بس صاحب جی! آپ کا کام ختم' میرا کام شروع۔"

میرے کہنے سے پہلے ہی وہ پرنس کو دونوں بازوؤں پر اٹھائے جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔ کچھ دیر بعد میں نے اسے جھاڑیوں سے برآمد ہوتے دیکھا۔ وہ اپنے بٹن والے چاقو کو دھوتی پر صاف کر کے بند کر رہا تھا۔ چاقو دھوتی کی ڈب میں رکھ کر اس نے میری طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے گاڑی میں آ بیٹھا۔ میں اس وقت اسٹیئرنگ پر بیٹھا تھا۔

لشنگ ہاربر واپس آ کر میں نے چھنا کو اس کے گھر چھوڑا اور اسے مزید کچھ رقم دینے کی کوشش کی مگر اس نے لینے سے انکار کر دیا اور کہا۔ "آپ پہلے جو کچھ دے چکے ہیں' وہی میری توقعات سے بہت زیادہ ہے۔ اتنے پیسے تو اسمگلر بھی نہیں دیتے' آپ تو پھر بھی ایک نیک کام کر کے واپس آ رہے ہیں۔"

"نیک کام کے الفاظ پر میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔" رخصت ہوتے وقت میں نے کہا۔ "اچھا! عنقریب مجھے تمہاری ضرورت پڑے گی۔ میں ایک بڑا منصوبہ بنا رہا ہوں' اس میں تم بھی میرے ساتھیوں میں شامل ہو گے' جلد ہی میں تمہیں لینے آؤں گا۔"

"آپ مجھے ہر وقت تیار پائیں گے۔" اس نے خلوص دل سے کہا۔ "میں خود بھی اس دنیا سے نکلنا چاہتا ہوں بشرطیکہ کسی آپ جیسے بہادر اور مخلص دوست کا ساتھ میسر ہو۔"

"تم پروا ہی مت کرو۔" میں نے اس کا کندھا تھپکا۔ "میں نے تمہارے اندر چھپا ہوا ہیرا دیکھ لیا ہے۔ جلد ہی مجھے تم جیسے کئی انسانوں کی ضرورت پڑے گی۔"

اسے خدا حافظ کہہ کر میں بریف کیس اور سوٹ کیس اٹھائے اپنی گاڑی تک آیا۔ میں سیدھا تاج محل ہوٹل پہنچا۔ اس وقت صبح کے چار بجنے کو تھے۔ میں روپا کے سوئٹ میں نہیں گیا۔ اس کے بجائے استقبالیہ پر رک کر میں نے اپنے لیے ایک سنگل کمرہ حاصل کیا۔ یہ کمرہ تیسری منزل پر تھا جبکہ روپا کا سوئٹ چوتھی منزل پر تھا۔ پورٹر میرا سوٹ کیس اور بریف کیس چھوڑ کر جا چکا تو میں نے تیزی سے جوتے' کپڑے اتار کر پھینکے اور سیدھا باتھ روم میں گھس گیا۔

نہا دھو کر تازہ دم ہو کر میں نے روم سروس کو فون کر کے بے وقت ناشتہ منگوایا۔ ناشتہ کرتے ہی مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی لیکن سونے سے پہلے ایک کام کرنا ضروری تھا۔ میں نے فون پر روپا کے سوئٹ کا نمبر ڈائل کیا۔

دوسری طرف سے ریسیور پہلی ہی گھنٹی پر اٹھا لیا گیا لیکن جب روپا کی آواز آئی تو اس میں غنودگی کا بوجھل پن تھا۔ "ہیلو...." اس نے پراشتیاق لہجے میں کہا۔

"منصور!" میں نے نہایت مدھم آواز میں کہا۔

"میں تمہارے انتظار میں سو نہیں سکی' کہاں ہو تم؟" اس نے بے تابی سے پوچھا۔

"تم سے بہت دور۔" میں نے بدستور مدھم آواز میں کہا۔ "جو کچھ میں کہوں' اسے غور سے سنو اور اس پر عمل بھی کرنا تمہیں باقی زندگی سکون سے گزرے گی ورنہ خواہ مخواہ پریشان رہو گی' اپنے زخموں کے ذخیرے میں اضافہ کرتی رہو گی...." میں نے ایک طویل سانس لی۔ اس دوران روپا نے بولنے کی کوشش کی لیکن میں نے تیزی سے کہا۔ "صرف میں بولوں گا اور تم سنو گی.... تمہارے لیے ایک اچھی خبر یہ ہے کہ فی الحال تمہارا کوئی دشمن باقی نہیں رہا جو تمہیں کوئی نقصان پہنچا سکے اور بری خبر یہ ہے کہ میں اب واپس نہیں آؤں گا۔ دو چار دن تم اسی ہوٹل میں ٹھہر کر کسی پراپرٹی ڈیلر کے توسط سے کوئی کوٹھی یا فلیٹ خرید لینا اور اس میں منتقل ہو کر بالکل اسی طرح معمول کے مطابق زندگی گزارنا شروع کر دینا جس طرح میری آمد سے پہلے تمہارے شب و روز گزرتے تھے۔ اب ایک اچھا پہلو یہ ہوگا کہ تمہارے ذہن پر کسی جانی دشمن کا خوف نہیں ہوگا۔ تم آرام سے کام پر جا سکو گی' آرام سے سو سکو گی اور بے خوفی سے زندگی کے معاملات انجام دے سکو گی۔"

"کیا واقعی تمہارے بغیر میں یہ سب کچھ کر سکوں گی؟" اس نے میری تمام تر تیز گوئی کے باوجود یہ کہنے کا موقع ڈھونڈ لیا۔ کہنے کو یہ محض ایک سادہ سا سوال تھا مگر لہجہ و آواز کچھ ایسی تھی کہ میں نے اپنے دل پر غیر جذباتیت کا جو خول چڑھایا تھا' چٹخنے لگا اور اس سے لہو رسنے لگا مگر میں اندر ہی اندر اس لہو کو پی گیا۔ اگر میں جذبوں اور ناطوں کو پیروں کی زنجیر بنائے رکھتا تو میں وہ بھاری قرض نہیں چکا سکتا تھا جو زندگی نے میرے ذمے لگا دیا تھا۔

"ہاں.... تم میرے بغیر سب کچھ کر سکو گی۔" میں نے اپنے لہجے میں ارتعاش پیدا نہیں ہونے دیا۔ "اور بہت عمدگی سے کر سکو گی۔ کوشش کرو گی تو بہت جلد بھول جاؤ گی کہ تمہاری زندگی میں منصور نامی کوئی شخص آیا تھا...."

"کیا میری زندگی میں پیار کرنے والی ہستیاں صرف اس لیے ہی آتی رہیں گی کہ میرے لہو میں زہر گھول کر' میرے دل کو پارہ پارہ کر کے جاتی رہیں اور میں انہیں بھول جانے کی کوشش کرتی رہوں؟" وہ جیسے پھٹ پڑی۔ اس کا لہجہ جذباتی ہو گیا اور آواز آنسوؤں میں بھیگ گئی۔ "پہلے میں نے اپنی ماں کو بھلایا' باپ کو بھلایا' آنکھوں سے محروم ہو جانے والے شوہر کو بھلا دیا' نمونیے میں بغیر دوا کے مر جانے والے بچے کو بھلایا.... دل پر لگنے والے ہر زخم کو بھلایا.... اور اب تم کہتے ہو کہ میں تمہیں بھی بھول جاؤں.... مجھے نفرت ہے اس لفظ "بھول" سے...." اس کی آواز ہچکیوں میں ڈھل گئی۔ میں خاموش بیٹھا تھا۔

وہ میرے کمرے سے ایک منزل اوپر اور شاید کمرے کے عین اوپر ہی بلک رہی تھی' آنکھوں سے لہو بہا رہی تھی۔ مجھ سے ایسے سوال کر رہی تھی جن کے جواب مجھے آتے ہی نہیں تھے۔ میں اپنے اور اس کے درمیان حائل ایک چھت کے فاصلے کو آسمان اور زمین کے درمیان دوری میں تبدیل کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ میری کوشش کو ناکام بنانے کے درپے تھی مگر میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ مجھے اس آزمائش سے سرخرو نکلنا ہے کیونکہ یہ میری اس تربیت کا پہلا مرحلہ تھا جو مجھے آئندہ کے لیے درکار تھی۔ اگر میں پہلے مرحلے پر ہی کمزور پڑ جاتا تو آئندہ اپنے آپ سے کوئی اچھی توقع نہیں رکھ سکتا تھا۔

"مجبوری ہے روپا!" میں نے اب بھی حتی الامکان ہموار لہجے میں کہا۔ "ہزاروں عفریت میرے تعاقب میں ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تم بھی کسی مصیبت میں پڑو۔"

"اتنی پر تکلف گفتگو کرنے سے بہتر ہے کہ تم اپنا منہ بند ہی رکھو۔" یہ کہہ کر اس نے کھٹ سے فون بند کر دیا۔ یہ شاید زندگی کے ایک اور پر نخش باب کا اختتام تھا۔ معلوم نہیں زندگی اب کبھی اس باب کے اعادے کی مہلت دیتی یا نہیں۔

میں چند لمحے خاموشی سے ریسیور ہاتھ میں تھامے خالی الذہنی کے سے عالم میں اسے

گھورتا رہا۔ پھر آہستگی سے اسے کریڈل پر رکھ کر اسی آہستگی سے بستر پر لیٹ گیا۔

صبح اٹھ کر میں عقبی دروازے سے ہوٹل سے نکلا اور گاڑی میں جا بیٹھا۔ اسٹارٹ کرنے کے بعد میں نے گاڑی سیدھی ہی کی تھی کہ ایک گھٹیا قسم کے چائے خانے سے ایک شخص گویا گرتا پڑتا نکلا اور گاڑی کے سامنے سے گزرتے ہوئے گلی عبور کرنے لگا۔ اس کے لمبے اور مجہول جسم پر ایک اچھا بھلا سوٹ لٹکا ہوا تھا اور اپنے استعمال پر غالباً کافی شرمندہ نظر آرہا تھا۔ سوٹ ایک تو اس شخص کے جسم پر ڈھیلا بہت تھا' دوسرے اس پر لاتعداد شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ شخص کافی دنوں سے سلیپنگ سوٹ کا کام بھی اسی سے لے رہا تھا۔

لیکن اصل بات سوٹ' ٹائی یا جوتوں کی نہیں' اس شخص کی تھی جس کے جسم پر یہ سب چیزیں موجود تھیں۔ یہ شخص عاشق علی عرف طلبہ تھا۔ وہ چائے خانے کے مالک کو کچھ ریزگاری دے کر نکلا تھا مگر یوں حواس باختہ نظر آرہا تھا جیسے عدم ادائیگی کی وجہ سے چائے خانے والے نے اسے دھکے دے کر دکان سے نکالا ہو۔

میں نے گاڑی روکی اور اتر کر اس کے قریب پہنچا۔ "کیا حال ہے طلبہ؟" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ اچھل پڑا۔

"اوہ... تم ہو۔" اس نے اطمینان کی ایک طویل سانس لی۔

"کیا بات ہے' ایک عرصے سے کہیں نظر نہیں آئے۔" میں نے کہا۔ "اسٹوڈیو میں بھی صورت دکھائی نہیں دی۔"

"یہ سالا بمبئی شہر ہی ایسا ہے پیارے۔" اس نے پہلے سے بھی زیادہ طویل سانس لی۔ "ایک مرتبہ جس کا ہاتھ چھوٹ گیا سو چھوٹ گیا۔ پھر وہ دوبارہ مشکل سے ہی نظر آتا ہے۔ خاص کر یہ اپنی فلمی دنیا میں تو اتنی چکاچوند ہے کہ سامنے کھڑے ہوئے آدمی کی شکل بھی پہچانی نہیں جاتی۔"

"طنز کر رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔ "کیا کبھی ایسا اتفاق ہوا ہے کہ اسٹوڈیو میں' میں نے تمہیں دیکھا اور پہچانا نہیں؟"

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔" اس نے اپنائیت سے بازو میری کمر میں حائل کر دیا۔ "میں تو ایسے ہی ذرا فلسفہ بول رہا تھا..... آج کل فلسفے پر ہی زیادہ گزارہ ہے۔"

"ہو کیا رہا ہے؟ کیا سرگرمیاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔ "تمہارے جسم پر سوٹ دیکھ کر تو شبہ گزرتا ہے کہ آج کل تمہیں کچھ زیادہ کام مل رہا ہے۔"

"کام تو اچھا خاصا مل رہا ہے یار!" اس نے ایک اور آہ بھری۔ "اور ہم آدمی بھی کام کے تھے لیکن اپنی حرمستیوں سے اپنا بیڑہ غرق کر لیا۔ پچھلے دنوں ایک پٹھان سیٹھ کو چکر دے بیٹھا تھا کہ آؤ پارٹنر شپ میں فلم بناتے ہیں۔ میرے انڈسٹری میں ایسے تعلقات ہیں کہ

فلاں ہیرو کو کاسٹ کروں گا تو وہ پیسے ہی نہیں لے گا' فلاں ہیروئن کو سائن کرنے جاؤں گا تو وہ میرے گھٹنے چھوئے گی اور ساری ڈیٹس کینسل کر کے مجھے دے دے گی وغیرہ وغیرہ۔ میں نے شاید اس روز تاڑی پی رکھی تھی' اس لیے خوب واہی تباہی بک رہا تھا مگر وہ سیٹھ چکر میں آگیا....."

میں طلبہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے گاڑی کے پاس لے آیا اور ہم دونوں اس سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ "پھر کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"ہونا کیا تھا اس بدبخت نے فوراً دو لاکھ روپے میرے قدموں میں رکھ دیئے۔" طلبہ نے یوں ناگواری سے کہا گویا سیٹھ نے روپے اسے نہیں دیئے تھے بلکہ اس سے چھین لیے تھے۔ "اور کہنے لگا کام شروع کرو' میں باقی کا بھی بندوبست کرتا ہوں۔" طلبہ خاموش ہو گیا۔

"پھر کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"بس پھر میں نے کام شروع کر دیا۔" اس نے سادگی سے کہا۔ فلمسازی کے علاوہ ہر کام۔ ایک سال کا ایڈوانس کرایہ دے کر راج بھون میں دفتر لے لیا۔ قالین اور فرنیچر ڈلوایا جس میں اپنی میز سب سے بڑی بنوائی....." اس نے بات ادھوری چھوڑ کر اچانک پوچھا۔ "یار تمہیں معلوم ہے ہم غریب لوگ غریب ہی کیوں رہتے ہیں؟"

"تمہارا اس سلسلے میں کیا خیال ہے؟" میں نے جواب دینے کے بجائے اسی سے پوچھا۔

"اس لیے کہ ہمارے پاس پیسہ کبھی آ جائے تو ہمیں ہضم نہیں ہوتا۔" اس نے بلا تامل جواب دیا۔ "ذرا تم دیکھو' مجھے یہی گمان گزرا کہ یہ رقم جیسے کبھی ختم ہی نہیں ہو گی۔ بیشتر غریبوں اور ترسے ہوئے انسانوں کی طرح میں نے بھی چار پیسوں پر اختیار حاصل ہوتے ہی سب سے پہلے اپنی وہ حسرتیں پوری کرنی شروع کیں جو مدتوں سے دل میں پل رہی تھیں۔ دفتر میں روزانہ اسکاچ کی بوتل آنے لگی۔ ٹیکسیوں میں سفر شروع ہو گیا۔ کسی ڈھنگ کے ایکٹر یا ایکٹریس کے گھر جانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اس سے پہلے ہی تمام جاننے والی ایکسٹرا لڑکیوں کو بھنک پڑ گئی کہ طلبہ نے کوئی فنانسر پھانسا ہے۔ شہد کی مکھیوں کی طرح وہ سب دفتر میں آن جمع ہونے لگیں۔ اتفاق سے ان میں کئی خوش شکل بھی تھیں۔" طلبہ نے ان میں سے نہ جانے کس کی یاد میں ایک مرتبہ پھر ٹھنڈی سانس لی۔ "اب سب ایکسٹرا گرلز کے ساتھ تقدیر کا ظلم و ستم یک لخت ہی کچھ زیادہ بڑھ گیا۔" طلبہ نے ایک لمحے کے توقف سے کہا۔ "کسی کا باپ اچانک ہی بستر مرگ پر پہنچ گیا' کسی کا بھائی جھوٹے مقدمے میں پھنس کر کسی نامعلوم جیل میں چلا گیا' کسی کی ماں کو یکایک کینسر کے درجے کی کوئی بیماری لاحق ہو گئی' کسی کے مکان کی چھت گر پڑی اور کوئی خود میرے اوپر گر پڑی۔ میرا خیال ہے ان دنوں میں پہلے درجے کا راجہ اندر کہلانے کا مستحق ہو چکا تھا اور جس فیاضی

سے میں ترستے بانٹ رہا تھا' اس سے میں محمد شاہ رنگیلے کا وزیر مالیات معلوم ہوتا تھا۔ ایک روز بالآخر فلم کا نام طے پا گیا۔ "نشانی" نام طے پا جانے کے بعد قدرے فرصت میسر آئی تو سوچا کہ ہیروئن کے طور پر روپا کو سائن کر لیا جائے لیکن عین اس روز انکشاف ہوا کہ بینک میں صرف پچانوے روپے باقی ہیں یعنی اتنی رقم بھی باقی نہیں بچی تھی کہ سائننگ اماؤنٹ کے طور پر کسی ہیروئن کو دی جا سکتی۔ سیٹھ صاحب حالانکہ تمام عرمستیوں میں میرے ساتھ برابر کے شریک رہے تھے لیکن بینک میں پچانوے روپے باقی رہ جانے کا سن کر آپے سے باہر ہو گئے۔

میں نے انہیں سمجھایا کہ اگر وہ پچاس ہزار کا بندوبست اور کر دیں تو فلم سیٹ پر چلی جائے گی اور اگر کسی ڈسٹری بیوٹر سے بات طے ہو گئی تو قسطیں بھی ملنی شروع ہو جائیں گی مگر سیٹھ صاحب نہیں مانے اور غصے میں ایک ایکسٹرا لڑکی کو بغل میں دبا کر مسوری چلے گئے۔ آج کل وہ بمبئی میں ہیں اور پستول لیے میری تلاش میں گھومتے رہتے ہیں۔ فلم "نشانی" کی آخری نشانی میرے جسم پر موجود یہ سوٹ ہی ہے۔"

"کیا فلم کی کہانی لکھی جا چکی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے قدرے شرمیلے لہجے میں کہا۔ "میں نے خود لکھی تھی.... بلکہ کئی سال سے لکھ کر رکھی ہوئی ہے۔ پہلے میں نے اس کا نام "بمبئی بائی نائٹ" رکھا ہوا تھا' پھر میں نے دیکھا کہ ہر چھوٹے موٹے شہر سے تعلق رکھنے والے جن نوجوان اور نوآموز افسانہ نگاروں کے افسانے اخباروں اور رسالوں میں چھپتے ہیں' ان میں سے ہر ایک ہی اس عنوان سے طبع آزمائی ضرور کر چکا ہے۔ چنانچہ میں نے اپنی کہانی کا نام بدل کر "نشانی" رکھ دیا۔"

"اچھا یہ بتاؤ کہ وہ کہاں رہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"اسی کھولی میں۔" اس نے قدرے فخر سے جواب دیا۔ "دراصل وہ کھولی ہی میرا ایک ایسا ٹھکانہ ہے...." اس نے وضاحت کی۔ "جس کا اس پٹھان سیٹھ کو علم نہیں۔"

"اچھا میں چند دنوں تک وہیں تم سے آکر ملوں گا۔" میں نے کہا۔ "اس سیٹھ کا معاملہ میں خود ہی نمٹا دوں گا اور.... دیکھو.... فلم ضرور بنے گی بلکہ ایک نہیں بہت سی فلمیں بنیں گی۔ ایک بہت بڑی فلم کمپنی قائم ہو گی جس کے ڈائریکٹر تم ہو گے.... سمجھے؟"

"تم تم نے بھی تاڑی پی رکھی ہے؟" طلبہ نے مشکوک نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "تم تو اسی طرح کی باتیں کر رہے ہو جیسے میں نے اس پٹھان سیٹھ سے کی تھیں؟"

"تمہیں معلوم ہے میں پیتا نہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اور تاڑی پینے کا میں ساری زندگی تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

"وہ تو مجھے معلوم ہے۔" اس نے ہنکا سا قہقہہ لگایا۔ "میں تو مذاق کر رہا تھا۔"

میں نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ اب میں چلتا ہوں' فی الحال میں تاج محل میں مقیم ہوں اگر اچانک کوئی ضرورت پڑے تو آسکتے ہو۔ ویسے میں بہت جلد خود تم سے رابطہ قائم کروں گا.... اور دیکھو اسٹوڈیو وغیرہ میں کہیں روپا سے سامنا ہو تو میرا ذکر نہ آنے پائے۔"

"بہت بہتر۔" اس نے کہا اور کار سے ہٹ کر ایک طرف کو چل دیا۔

ہوٹل پہنچ کر میں نے روم سروس کو فون کر کے کھانا منگوایا۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں نے اپنا مشین پسٹل اور سائلنسر دوبارہ دیکھا اور اپنے لباس میں جیبوں میں چھپایا۔ خنجر میری کلائی پر بندھے ہوئے ایک ایسے نیام میں رہتا تھا جسے مخصوص انداز میں جھٹکا دیتے ہی وہ میرے ہاتھ میں آجاتا تھا۔ ہتھیاروں کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے چمڑے کی ٹوپی اور رنگین شیشوں کی عینک اٹھائی' بریف کیس ایک ہاتھ میں لٹکایا اور کمرے سے نکل آیا۔

میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ہوٹل کی پارکنگ لاٹ سے نکل کر سڑک پر آگیا۔ کچھ دیر بعد گاڑی اس سڑک پر فراٹے بھر رہی تھی جو پونا کو جاتی تھی۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ میں اسی سڑک کے راستے بمبئی آیا تھا۔ اس وقت میں معصوم اور ہونہار طالب علم تھا۔ مختصر سے عرصے میں' میں نہ جانے کیا بن گیا تھا۔ ماضی کے وہ پرسکون شب و روز اور مستقبل کے معصومانہ خواب جانے کہاں کھو گئے تھے۔

میں جب پونا کی حدود میں داخل ہوا اس وقت رات کے بارہ بجنے کو تھے۔ پہلے پہل مجھے محسوس ہوا کہ یہ شہر میرے لیے اجنبی اور گلی کوچے نامانوس سے ہیں مگر جوں جوں میں اس مکان کی طرف بڑھتا گیا جہاں میں رہا کرتا تھا' توں توں سڑکوں اور گلی کوچوں سے شناسائی اور مانوسیت کی خوشبو پھوٹتی محسوس ہونے لگی۔

وہ گلی جو کبھی اپنی محسوس ہوتی تھی' اس میں داخل ہوتے وقت میری دھڑکنیں کچھ تیز ہوئیں مگر میں نے فوراً ہی سردمہری کا ہتھیار استعمال کر کے انہیں اعتدال پر لانے کی کوشش کی اور اپنے مکان کے سامنے گاڑی روکنے کے بجائے سست رفتاری سے گزرتا چلا گیا۔ مکان کے گیٹ پر تالا پڑا تھا اور باغیچے کی گھاس وغیرہ اتنی اونچی ہو چکی تھی کہ چار دیواری سے باہر جھانکنے لگی تھی۔

مکان میرا اپنا تھا' ممی کا خریدا ہوا تھا مگر میں پچھلی دیوار پھلانگ کر چوروں کی طرح اس میں داخل ہوا۔ یہاں ہر طرف وحشت اور ویرانی میری منتظر تھی۔ اس مکان کا فرش کبھی شیشے کی طرح چمکتا تھا۔ اس پر مٹی کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ میں برآمدے ہی میں رک گیا اور ٹارچ بجھا دی۔ کمروں میں سے کسی کا دروازہ کھلا تھا اور کسی کا بند مگر ان میں جانے کی ہمت ہی نہیں پڑی۔ اس گھر کے در و دیوار نے بچپن سے جوانی تک میری زندگی کا تماشا دیکھا تھا اور خاموش ساتھی کی طرح میری ہر آہ' میرے ہر آنسو اور میرے ہر قہقہے میں شریک رہے

وہ باغیچہ جس کے ایک حصے میں اکھاڑا تھا اور جہاں چندن بابا نے میری اولین جسمانی تربیت گاہ قائم کی تھی، جھاڑ جھنکار کا مجموعہ بن چکا تھا اور وہاں بکھرے ہوئے خشک پتوں نے اداس چاندنی کا کفن اوڑھ رکھا تھا۔ گلاب اور رات کی رانی کے پودے پانی نہ ملنے سے سوکھ کر کانٹا کیوڑہ اور جھاڑ جھنکار ہی میں مدغم ہو چکے تھے۔

میں نے سوچا کہ احتیاط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے برآمدے کی بتی جلا لوں کہ شاید وحشت کا احساس کچھ کم ہو سکے لیکن سوئچ کے کھٹکے کا کوئی ردعمل ظاہر نہ ہوا۔ میں نے دوسرا سوئچ دبایا، پھر تیسرے کو آزمایا مگر کوئی بلب روشن نہ ہوا شاید بتی کٹ چکی تھی۔

خشک پتے اور شکستہ ٹہنیاں میرے قدموں تلے چرچرا رہی تھیں۔ ان پتوں اور ٹہنیوں تلے زمین مجھے بے حد نرم محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے پاؤں سے ایک جگہ سے کباڑ ہٹا کر دیکھا تو اندازہ ہوا کہ یہاں سے زمین حال ہی میں کھودی گئی ہے۔ پھر اسے برابر کرکے دوبارہ خشک پتے وغیرہ اوپر ڈال دیئے گئے ہیں۔ میں نے کئی جگہ سے کوڑا کرکٹ ہٹا کر دیکھا اور خاصی حد تک حیران ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ طویل و عریض باغیچہ سارے کا سارا ہی کھود ڈالا گیا تھا۔

ایسا کون کر سکتا ہے اور کسی کو اس کی ضرورت پیش آ سکتی تھی؟ یہ سوچتے ہوئے میں فوارے تک پہنچا تو اس کی چار دیواری مسمار شدہ نظر آئی۔ پختہ فرش کھدا پڑا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو میں ششدر رہ گیا۔ اب مجھے امید نہیں رہی تھی کہ ممی کا چھپایا ہوا سونا خزانہ یہاں باقی رہ گیا تھا لیکن سوال یہ تھا کہ اس پر ہاتھ کس نے صاف کیا؟ ممی نے اپنی ڈائری میں جس انداز میں اس کا تذکرہ کیا تھا، اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ انہوں نے کسی کو اس بات کی بھنک نہیں پڑنے دی کہ انہوں نے اپنی عمر بھر کی جمع پونجی سونے اور جواہرات کی شکل میں منتقل کرکے کہاں چھپائی ہے۔ اس راز میں انہوں نے اپنی قریب ترین اور قابل اعتماد ہستیوں میں سے بھی کسی کو شریک نہیں کیا تھا۔ پھر کوئی یہاں تک کیسے آ پہنچا تھا؟

ویسے تو کچھ رقم مجھے ڈرم کے بریف کیس سے مل چکی تھی۔ دو لاکھ پاؤنڈ مجھے بے لنس شومئی کی بدولت میسر آ گئے تھے۔ اس دور کے لحاظ سے یہ بہت بڑی رقم تھی اور زر مبادلہ کی صورت میں ہونے کی وجہ سے تو اس کی اہمیت اور بھی زیادہ تھی لیکن ممی کا خزانہ شاید اس ساری رقم پر بھاری ہوتا۔

فوارے کی چار دیواری اور شکستہ فرش کے ملبے کے قریب کھڑے کھڑے دفعتاً مجھے خیال آیا کہ مجھے ایک کوشش تو کرکے دیکھ ہی لینی چاہیے۔ اصل فوارہ تو محفوظ ہی تھا۔ کھدائی کرنے والے، والوں نے شاید ممکن ہی نہ سمجھا ہو کہ فوارے کے نیچے بھی کچھ ہو سکتا ہے

یا میکنزم کا علم نہ ہونے کی وجہ سے خزانے تک ان کی رسائی نہ ہو سکی ہو جس انداز میں سارے باغیچے کو جگہ جگہ سے کھودا گیا تھا، اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ کھودنے والوں کو درحقیقت مطلوبہ جگہ کا علم نہیں تھا۔

میں ملبے پر پاؤں رکھتا آگے پہنچا۔ فوارے کے گرد بھی خاصا ملبہ جمع تھا۔ میں جھک کر اسے ہٹانے لگا۔ ملبہ ہٹ جانے کے بعد میں نے دیکھا کہ فوارہ نیچے تک صحیح سالم تھا۔ اس کا سیمنٹ کا مینار نما حصہ لوہے کے ایک گول پلیٹ فارم پر ایستادہ تھا جو دھات ہی کے ایک گنبد نما حصے کے ساتھ بولٹوں کی مدد سے جڑا ہوا تھا۔ گنبد نما حصہ زمین میں پیوست معلوم ہوتا تھا۔ میں نے ڈائری میں پڑھی ہوئی ہدایت کے مطابق فوارے کے ڈھکن نما گول پلیٹ فارم کو گھمانے کی کوشش کی۔ بظاہر فوارے کے کسی بھی حصے کو گھمانے کی کوشش احمقانہ ہی معلوم ہوتی تھی لیکن جب میں نے غیر معمولی طاقت صرف کی تو پلیٹ فارم کے ساتھ گنبد نما حصہ بھی گھوم گیا اور مزید ایک چکر دینے پر دو تین انچ اوپر آ گیا۔ اب اس کے نیچے ایک خانہ نمودار ہو چکا تھا جس میں اب پورا فوارہ لوہے یا کسی اور دھات کی راڈ پر کھڑا تھا۔

میں نے جھجکتے ہوئے اس خانے میں ہاتھ ڈالا۔ خانہ زیادہ گہرا نہیں تھا۔ اس میں مجھے ایک کنڈا سا ابھرا محسوس ہوا۔ میں نے اسے کھینچا تو یوں لگا جیسے کوئی چھوٹا سا دروازہ کھل گیا اور فوارہ مزید اوپر چلا گیا۔ وہ راڈ جس پر فوارہ اب کھڑا تھا، جیسے ایک جھٹکے کے ساتھ زمین سے نکل آئی تھی۔ اب میں خانے میں جھک کر دیکھ سکتا تھا۔ جھانک کر دیکھنے پر مجھے کچھ نظر نہ آیا تو میں نے ٹارچ کی روشنی ڈالی اور میری دھڑکن ایک لمحے کے لیے بے قابو ہو کر رہ گئی۔

خانے کی تہہ میں واقعی ایک چھوٹا سا دروازہ کھل چکا تھا اور اس دروازے کے نیچے ایک اور کافی کشادہ، پختہ اور صاف ستھرا خانہ نظر آ رہا تھا۔ اس خانے میں سیاہ رنگ کا ایک نہایت عمدہ اسٹرانگ بکس رکھا تھا۔ اسٹرانگ بکس کو اٹھانے کے لیے مجھے گھٹنوں کے بل جھکنا پڑا۔

اس عمل میں شاید میں اتنا منہمک ہو گیا تھا کہ مجھے کوئی آہٹ وغیرہ سنائی نہیں دی تھی لیکن جیسے ہی میں اسٹرانگ بکس اٹھا کر سیدھا ہوا، ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”اس صندوقچے کو زمین پر ہی رکھ دو اور سیدھے کھڑے ہو جاؤ دوست!“ آواز میں ملامت بھی تھی، تحکم اور ایک دبی دبی مسرت بھی۔ ”تمہارا بہت بہت شکریہ۔ تم نے میری مشکل آسان کر دی۔ اس خزانے کی تلاش میں، میں کئی ہفتے سے اس مکان میں چھپا ہوا تھا اور ایڑی چوٹی کا زور لگا چکا تھا لیکن کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم یوں میری مدد کو آ پہنچو گے.....اور ہاں.....دیکھو زیادہ پھرتی دکھانے کی کوشش نہ

کرتا۔ میرے ہاتھ میں ریوالور ہے اور اب خزانہ دریافت ہو جانے کے بعد میں اس بات کی پروا نہیں کروں گا کہ فائر کی آواز کوئی سن لے گا۔"

میں نے اسٹرانگ بکس زمین پر رکھ دیا۔ اس آواز نے بلاشبہ مجھے حیران کر دیا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی شخص اس خزانے کی تاک میں بیٹھا ہوگا۔

"اب میری طرف گھوم جاؤ لیکن اپنی جگہ سے قدم نہ بڑھانا۔ میں تمہاری شکل دیکھنا چاہتا ہوں۔" نادیدہ شخص نے کہا۔

میں آہستگی سے اس کی طرف گھوم گیا۔ دھندلی چاندنی میں، میں نے دیکھا کہ وہ ایک میانہ قامت مگر مضبوط اور پختہ العمر شخص تھا۔ اس کی آنکھوں میں مکارانہ چمک تھی اور ہونٹوں پر شاطرانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ بھی گہری نظروں سے میرا جائزہ لے رہا تھا۔

"اندر چلو۔" چند لمحے بعد اس نے ریوالور سے کمروں کی طرف اشارہ کیا اور خود ایک طرف کو ہٹ گیا تاکہ میں اس کے سامنے سے گزر کر مکان کی طرف جا سکوں۔ میں نے سردست اس کی ہدایت پر عمل کرنے ہی میں مصلحت سمجھی۔

میں برآمدے کی طرف چل دیا۔ وہ مناسب فاصلہ رکھ کر ایک ہاتھ میں اسٹرانگ بکس اٹھائے اور دوسرے میں ریوالور سنبھالے میرے پیچھے آ رہا تھا۔ اس طرف سے برآمد کی سیڑھیاں چڑھ کر سب سے پہلے اس کمرے کا بغلی دروازہ سامنے پڑتا تھا جو کبھی میرا بیڈ روم ہوا کرتا تھا۔ میں اس کی طرف بڑھا تو ریوالور بردار نے مجھے منع کرتے ہوئے اس کمرے کے دروازے کی طرف بڑھنے کی ہدایت کی جو کسی زمانے میں میری گورنس کے استعمال میں ہوا کرتا تھا۔ اس کمرے سے بچن ملحق تھا۔

دروازہ بند تھا لیکن مقفل نہیں تھا۔ اسے کھول کر میں نے اندر قدم رکھتے ہوئے دیکھا کہ کمرے کے ایک گوشے میں کیروسین لیمپ روشن تھا جس پر ایسا شیڈ لگایا گیا تھا کہ اس کی روشنی ایک دائرے میں محدود رہے، تاہم ملگجی روشنی میں کمرے کے باقی حصے کا بھی جائزہ لینا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ بیڈ پر کافی حد تک صاف ستھرا بستر لگا ہوا تھا اور کمرے کی حالت بھی بتا رہی تھی کہ یہاں کوئی کافی عرصے سے مقیم ہے۔

"روشنی کے دائرے میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ جاؤ۔" مجھے حکم ملا۔ میں نے اس حکم کی تعمیل کی۔ ریوالور بردار کا ہیولا ملگجے اندھیرے میں مجھے بیڈ کی پٹی پر بیٹھتا دکھائی دیا۔ اسٹرانگ بکس اس نے بیڈ کے نیچے کھسکا دیا تھا۔

"اب میں تمہارا نام جاننا چاہوں گا۔" اس نے اب نہایت پرسکون لہجے میں کہا۔

"تمہارے خیال میں، میں کون ہو سکتا ہوں؟" میں نے اس سے سوال کر دیا۔

"مجھے شبہ پڑتا ہے کہ ......" وہ جیسے ذہن پر زور دیتے ہوئے بولا "کہ تم عزیزہ خانم

کے لڑکے ہو گو کہ یہ بات صحیح طور پر کسی کو بھی معلوم نہیں کہ اس کی کوئی اولاد تھی یا نہیں۔"

"اور تمہیں یہ علم کیونکر ہوا کہ اس مکان میں کوئی خزانہ بھی موجود ہے؟" میں نے نہایت ملائمت سے پوچھا۔

"آپس کی بات ہے......" اس نے قدرے شرمیلے لہجے میں کہا۔ "کہ اگر تم عزیزہ کے لڑکے ہو تو کچھ زیادہ باعزت آدمی میں بھی نہیں۔ میرا تعلق بھی بازار سے ہے۔" وہ خاموش ہو گیا۔

"میں نے پوچھا تھا کہ تمہیں اس مکان میں خزانے کی موجودگی کا علم کیونکر ہوا؟" میں نے اپنا سوال دہرایا۔

"ایک روز میں بے دھیانی میں بلا اجازت عزیزہ خانم کے رہائشی کمرے میں داخل ہو گیا۔" اس نے گویا کسی بچے کے اصرار پر کوئی کہانی شروع کرتے ہوئے کہا۔ "وہ کمرے میں نہیں تھیں۔" میں نے محسوس کیا کہ وہ شخص کسی کا ذکر بڑے احترام سے کر رہا تھا۔ "ان کے بیڈ کے قریب ہی تپائی پر چمڑے کی سیاہ جلد والی ڈائری کھلی لیکن الٹی رکھی تھی۔ قریب ہی قلم پڑا تھا۔ وہ غالباً لکھتے لکھتے اٹھ کر باتھ روم میں چلی گئی تھیں۔ باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے یونہی بے مقصد سے انداز میں ڈائری اٹھا لی اور جو صفحہ میرے سامنے آیا، اس پر پوتا کے کسی مکان اور خزانے کا تذکرہ تھا۔ عزیزہ خانم کسی کو مخاطب کرتے ہوئے کچھ لکھ رہی تھیں۔ اب مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ وہ شاید تم ہی تھے۔" اس نے ایک لمحے کے لیے خاموش ہو کر گہری سانس لی۔

بہرحال میں نے جب ڈائری اٹھائی تھی تو مجھے اس قسم کی کوئی تحریر نظر آنے کی توقع نہیں تھی۔" اس نے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا "اس لیے میں محض اتفاقی نظر سے صفحہ کو دیکھ رہا تھا۔ دفعتہً باتھ روم کے دروازے کی ناب گھومنے کی آواز آئی اور میں نے ہڑبڑا کر ڈائری وہیں رکھ دی، تاہم پوتا...... خزانہ بوارسو...... باغیچہ......" یہ الفاظ میرے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئے۔ اس دن کے بعد کبھی مجھے اس ڈائری کو دوبارہ دیکھنے کا موقع کوشش کے باوجود نہیں مل سکا لیکن میں بہرحال تگ و دو میں لگا رہا۔

"مجھے پتا چلا کہ عزیزہ خانم ہفتے میں ایک مرتبہ چند گھنٹے کے لیے کہیں جاتی ہیں۔ ڈرائیور ان کا وفادار تھا۔ اسے کریدنے کے باوجود مجھے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ بالآخر ایک روز میں ان کا تعاقب کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے انہیں یہاں آتے دیکھا اور میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ رہا کہ خزانے کے سلسلے میں ڈائری میں پوتا کے جس مکان کا ذکر تھا، وہ یہی ہے۔

میں نے بعد میں اس مکان کے کئی چکر لگائے لیکن مجھے خزانہ تلاش کرنے کا موقع

نہیں ملا۔ اپنے انہی چکروں کے درمیان میں نے یہاں تمہیں بھی دیکھا تھا۔ اس وقت تمہارے داڑھی نہیں تھی۔ پھر پراسرار سے انداز میں عزیزہ خانم کی موت واقع ہو گئی اور میں نے سنا کہ ان کی موت سے قبل ایک نوجوان ان کے بارے میں پوچھتا ہوا آیا تھا اور عزیزہ خانم کے کمرے میں دو آدمیوں کو بھی قتل کر دیا گیا تھا۔ مجھے فوراً خیال آیا کہ وہ نوجوان غالباً تم ہی تھے اور تم شاید عزیزہ خانم کے بیٹے ہو لیکن میں نے زبان بند رکھی۔ میں کسی بھی الجھن میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے صرف خزانے کی فکر تھی۔

کچھ عرصے بعد میں نے اس مکان کا چکر لگایا تو یہاں تالا لگا ہوا دیکھا۔ اپنے اطمینان کی خاطر میں نے مزید کچھ انتظار کیا' پھر ایک رات پچھلی دیوار سے اس مکان میں کود گیا۔ یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ باغیچے اور فوارے کے تالاب میں کہیں کھدائی نہیں کی گئی تھی یعنی ابھی کسی نے خزانے کو نکالنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں کچھ ضروری سامان اور خشک خوراک وغیرہ لے کر یہیں آ چھپا اور محفوظ اوقات کے دوران خزانے کی تلاش کا کام کرنے لگا۔ مجھے صحیح طور پر معلوم نہیں تھا کہ خزانہ کس جگہ دفن ہے۔ بس اتنا ہی پتا تھا کہ وہ باغیچے میں اور غالباً فوارے ہی کے آس پاس کہیں مدفون ہے۔ میں نے اندازاً ایک سرے سے کھدائی شروع کی اور اس وقت سے لے کر اب تک کھدائی کرتے کرتے میرا تیل نکل چکا تھا مگر خزانہ تو کیا کہیں سے ایک کھوٹا سکہ بھی برآمد نہیں ہوا تھا......"

وہ ایک گہری سانس لے کر مسکرایا اور گویا بات ختم کرتے ہوئے بولا۔ "اور پھر تم فرشتہ رحمت بن کر آ گئے۔"

"میں تمہارے لیے فرشتہ اجل بھی تو ثابت ہو سکتا ہوں۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

O

میرے لہجے میں موت کی دھمکی تو پوشیدہ تھی لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں کیسے صورتحال کو پلٹ سکتا تھا۔

"میں اس پہلو پر غور کر رہا ہوں۔" اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ یک لخت غائب ہو گئی اور چہرے پر تناؤ چھا گیا۔ "اس لیے مناسب یہی ہے کہ......" اس نے ریوالور زیادہ صحیح طور پر سنبھال لیا۔ "میں تمہیں گولی مار کر یہیں باغیچے میں دفن کر جاؤں۔"

"اتنی سی بات کے لیے اتنی لمبی تمہید باندھ رہے تھے۔" میں نے ناگواری سے کہا۔ "گولی مارنی ہے تو مار بھی چکو کیونکہ میری لاش اگر باغیچے ہی میں دفن کرنی تھی تو وہیں گولی مار دیتے۔ یہاں تک لانے کی زحمت کیوں کی؟ لاش کو گھسیٹتے ہوئے پھر باغیچے تک لے جاؤ گے؟" میرا انداز ایسا ہی تھا جیسے میں اپنی نہیں کسی اور کی لاش کی بات کر رہا ہوں۔ وہ کچھ گڑبڑا سا گیا مگر پھر سنبھل کر بولا۔ "انسان جسے جان سے مارنے لگا ہو' اس سے دو دو باتیں تو کر لینی چاہئیں اور کچھ نہیں تو کم از کم اس کا نام تو پوچھ لینا چاہیے۔"

"میرا نام بلبل کشمیر ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "خوبصورت نام ہے ناں؟"

"ہیرو بننے کی کوشش کر رہے ہو؟" اس کی آواز میں تلخی در آئی۔

"دراصل مجھے مرنے کی بہت جلدی ہے اور تم دیر کیے جا رہے ہو۔" میں نے گویا شکوہ کیا۔

"یہ لو......" اس نے ٹریگر دبا دیا۔

میرا اب تک کا ذاتی تجربہ یہ تھا کہ گولی صرف وہ خطرناک ہوتی ہے جو ناگہانی میں کسی سمت سے آئے۔ اس گولی کے لیے میں بہت دیر سے تیار تھا۔ میں کرسی سے پھسلا اور ساتھ ہی میری لات اس تپائی پر پڑی جس پر کیروسین لیمپ رکھا تھا۔ لیمپ کہیں دور جا گرا اور بجھ گیا ورنہ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ بجھنے کے بجائے کہیں مٹی کا تیل بکھر جانے کی وجہ سے زیادہ آگ نہ پکڑ لے۔

اس شخص نے دوسرا فائر کرنے میں تاخیر نہیں کی مگر اس وقت تک اندھیرا چھا چکا تھا۔ گولی غالباً اس کرسی میں لگی تھی جس پر ایک سیکنڈ پہلے میں بیٹھا تھا کیونکہ لکڑی کے پرخچے اڑنے کی آواز آئی تھی۔

مجھے احساس ہو رہا تھا جو میری خوش فہمی بھی ثابت ہو سکتا تھا کہ وہ شخص اندھیرے میں مجھ سے بہتر نہیں دیکھ پا رہا تھا حالانکہ وہ کافی دنوں سے کم روشنی میں رہنے کا عادی ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ وہ خوفزدہ بھی ہو چکا تھا۔ میں نے تاریکی میں اس کی شبیہ کو بیڈ کے نیچے کھسکتے دیکھا۔ پھر میں نے اسے اسٹرانگ بکس سینے سے لگائے ایک کہنی اور پیٹ کے بل کھسکتے ہوئے بیڈ کے دوسری طرف سے نکل کر دروازے کی طرف بڑھتے دیکھا۔

اپنی دانست میں خوفزدہ کرنے کے لیے اس نے اندھیرے میں ایک فائر اور جھونک دیا۔ میں دیوار کے ساتھ لگ کر فرش سے چپکا ہوا تھا اور سائیلنسر والا ریوالور میرے ہاتھ میں آ چکا تھا۔ اس نے دروازے کے قریب رک کر غالباً ایک لمحے کے لیے سوچا کہ دروازہ کھلنے پر اس کا ہیولا مجھے نظر آ جائے گا۔ اس نے حتی الامکان پھرتی سے کام لیتے ہوئے پہلے دو فائر کیے، پھر تیزی سے دروازہ کھول کر اسٹرانگ بکس اٹھا کر باہر چھلانگ لگا دی۔

اس کا خیال رہا ہو گا کہ وہ برآمدے کو پھلانگتا ہوا سیدھا باغیچے کی کچی زمین پر جا گرے گا اور وہاں سے اٹھ کر بھاگ لے گا۔ وہ باغیچے کی کچی زمین پر گرا ضرور لیکن مردہ حالت میں کیونکہ چھلانگ لگاتے وقت میرے ریوالور کی دو گولیاں اس کے جسم میں دھنس گئی تھیں۔

میں نے باہر آ کر دیکھا، وہ خزاں رسیدہ پتوں کے بستر پر پڑا تھا اور زندگی سے محروم ہو چکا تھا۔ اس کے جسم سے بہتا ہوا خون زرد پتوں کو سرخ بنا رہا تھا۔ میں نے دوبارہ کمرے میں جا کر بیڈ کے نیچے سے اسٹرانگ بکس اٹھایا اور مزید وقت ضائع کیے بغیر مکان سے نکل آیا۔ مجھے اندیشہ محسوس ہو رہا تھا کہ اس شخص کے ریوالور سے فائرنگ کی آواز یقیناً دور تک سنی گئی ہو گی۔ رات کے سکوت میں تو ویسے بھی معمولی آواز بھی بلند محسوس ہوتی ہے۔ میں اپنے مکان میں لاش چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا لیکن اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

میں نے براہ راست ہائی وے کا رخ نہیں کیا بلکہ مختلف رہائشی علاقوں سے گزرتے ہوئے ادھر جانے کا فیصلہ کیا۔ ایک گلی میں دھیرے دھیرے کار ڈرائیو کرتے وقت نہ جانے کیوں ذہن میں یک لخت ہی ٹک ٹک سی ہونے لگی۔ شاید یہ گردش ایام کی گھڑی تھی جو الٹی چلتی تھی۔ اس گلی سے کوئی مانوس سی خوشبو آ رہی تھی جس نے لاشعور کی گرہیں سی کھول دی تھیں۔ یادوں کے اجڑے ہوئے صنم خانوں میں گھنٹیاں سی بج اٹھی تھیں۔ اس گلی میں ایسی کیا بات تھی؟ یہاں کی ہوا کیوں دامن گیر ہوئی جا رہی تھی؟ راستہ کیوں زنجیر بنا جا رہا تھا؟ در و دیوار کیوں سرگوشیاں کر رہے تھے؟ یہ کیا ماجرا تھا؟

میں اپنے آپ سے پوچھتا رہا اور ایکسیلریٹر سے میرا پاؤں بالکل ہی ہٹ گیا۔ پھر خودبخود ہی بریک پر جم گیا۔ تب یک لخت جیسے لاشعور کے اندھیروں میں سینکڑوں آفتاب

طلوع ہو گئے۔ دیر سے سہی، سب کچھ یاد تو آ گیا۔

جی ہاں... یہی وہ گلی تھی جہاں ماہتاب رہتی تھی۔

حالات خواہ کچھ بھی تھے، میرے محسوسات میں خواہ کتنی ہی تبدیلیاں آ چکی تھیں اور میں نے اپنی ذات کے کھنڈر پر بلاشبہ ایک نئی عمارت تعمیر کر لی تھی لیکن آج جب تقدیر نے ایک بار پھر کوچہ جاناں میں پہنچا دیا تو جیسے سارے زخموں کے منہ کھل گئے۔ ساری مدفون تمنائیں انگڑائیاں لے کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ تمام بھولے بسرے خواب ایک بار پھر آنکھوں میں جھلملا اٹھے۔ بے اختیار اس حاصل حیات سے ملنے کو دل مچل اٹھا۔

میں گاڑی سے اترا اور اس مکان کی طرف بڑھتا ہو گیا۔ تمام آرزوؤں اور امنگوں کا مسکن ہوا کرتا تھا اور کبھی جس کے دروازے پر پہنچ کر دھڑکنیں اتنی تیز ہو جایا کرتی تھیں کہ دھمک کنپٹیوں میں سنائی دینے لگتی تھی۔ آج نجانے کیوں اس کے در پر پہنچ کر جسم سرد سا پڑ گیا۔ پھر یہ دیکھ کر تو جیسے دل دھڑکنا ہی بھول گیا کہ لوہے کے گیٹ پر بڑا سا تالا جھول رہا تھا۔

مجھ پر یک لخت خفقان سی طاری ہو گئی۔ پہلے تو جی چاہا کہ فوراً اپنے راستے پر چل پڑوں اور ایک بار پھر ذہن سے یہ خیال جھٹک دوں کہ اس دنیا میں کوئی ماہتاب بھی ہوتی تھی مگر یار کے گھر کے سامنے کھڑے ہو کر اس طرح سوچنا اپنے بس میں نہ رہا۔ میں نے پاگلوں کی طرح ادھر ادھر دیکھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ پھر اس کے سوا کوئی طریقہ نہ سوجھا کہ کسی پڑوسی سے معلوم کرنے کی کوشش کروں۔

میں نے برابر والی کوٹھی کی کال بیل بجائی۔ تین چار مرتبہ طویل طویل وقفوں تک بیل دینے کے باوجود کوئی جواب نہ آیا۔ میں مایوس ہو کر ماہتاب کی کوٹھی سے متصل دوسری کوٹھی کی طرف بڑھنے لگا تھا کہ اندر پختہ روش پر آہٹ سنائی دی۔ کوئی سلیپر گھسیٹتا آ رہا تھا۔ پھر آہنی گیٹ میں بنی ہوئی چھوٹی سی کھڑکی ذرا کھلی اور ایک پھولے پھولے سے مردانہ چہرے کا کچھ حصہ نظر آیا۔

"معاف کیجیے گا... میں نے آپ کو بڑی زحمت دی۔" میں نے نہایت معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "کیا براہ کرم آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ آپ کے یہ پڑوسی کہاں گئے ہوئے ہیں؟" میں نے ماہتاب کی کوٹھی کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے اس شخص کی غنودگی بھری آنکھوں میں کسی بے عنوان سے جذبے کی پرچھائیاں اترتے دیکھیں۔ شاید یہ خوف تھا لیکن میں اس وقت کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔

"تم کون ہو؟" اس نے کھڑکی مزید وا کیے بغیر کھردرے لہجے میں پوچھا۔

میں کہنے لگا تھا کہ کیا یہ جاننا ضروری ہے؟ مگر میں نے حتی الامکان تحمل سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "میں ان کا ایک فیملی فرینڈ ہوں۔ کافی عرصے بعد لندن سے واپس آیا ہوں۔"

اس شخص کی آنکھوں سے میں صاف پڑھ سکتا تھا کہ اسے میری بات پر قطعاً یقین نہیں آیا' تاہم اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "وہ لوگ کوٹھی بیچ گئے ہیں اور نیا مالک ابھی اس میں شفٹ نہیں ہوا۔ وہ کہیں گیا ہوا ہے۔"

"یہ کب کی بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کافی عرصہ گزر گیا۔" اس نے مبہم سا جواب دیا۔

"آپ کو ان کے نئے ایڈریس کا کچھ علم ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی نہیں... ان کے نئے ایڈریس کا یہاں کسی کو بھی کچھ علم نہیں۔" اس نے ایک بار پھر کھردرے لہجے میں کہا اور کھڑاک سے کھڑکی بند کر لی۔ وہ مزید کسی سوال کا جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔ میرا جی چاہا کہ گیٹ پھلانگ کر اس شخص کی گردن مروڑ ڈالوں۔ لوگ نہ جانے کیوں اتنے بے حس' بے مروت اور روکھے ہوتے جا رہے تھے۔ کسی کی بات کا تسلی بخش جواب بھی نہیں دے سکتے تھے۔ جو کچھ انہیں معلوم ہوتا تھا' وہ بھی کسی پریشان حال کو نہیں بتا سکتے تھے۔ بغیر کسی وجہ کے مہتاب کے والدین کا یوں کوٹھی بیچ کر کہیں چلے جانا میری سمجھ سے بالاتر تھا لیکن فی الحال خاموشی سے لوٹ جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

پیراماؤنٹ ٹریڈرز وہ کثیر المقاصد کاروباری ادارہ تھا جس نے چھ ماہ کے قلیل عرصے میں صرف بمبئی میں نہیں ہندوستان کے ایک بہت بڑے حصے میں پھیلے ہوئے کاروباری حلقوں میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ بمبئی کے سب سے مہنگے کاروباری مرکز "پدلا چیمبرز" کے تین فلورز پر اس کے دفاتر پھیل چکے تھے اور نہ صرف بمبئی کے دیگر علاقوں میں بھی ذیلی دفاتر موجود تھے بلکہ کلکتہ' مدراس اور دہلی تک اس کی شاخیں پہنچ چکی تھیں۔ اس ادارے کے کنسٹرکشن کمپنیوں میں بھی شیئرز تھے۔ بنارس ٹیکسٹائلز کے نام سے ایک مل بھی اس ادارے نے خریدی تھی جو دیوالیہ ہو کر بند ہونے کو تھی مگر اب نئی انتظامیہ کے تحت اس کے شیئرز کی قیمت میں زبردست اضافہ ہو گیا تھا۔

پیراماؤنٹ ٹریڈرز ہی کے زیرِ انتظام ایک فلم کمپنی بھی قائم کی گئی تھی جس کے شیڈول پر چار فلمیں تھیں اور دو کا آغاز ہو چکا تھا۔ فلموں کی ڈسٹری بیوشن کا ایک ادارہ بھی قائم کیا گیا تھا۔ پیراماؤنٹ ٹریڈرز ہی کے الحاق سے ایک ادارہ سرمایہ کاری کا بھی قائم کیا گیا تھا۔ اس میں بمبئی کے چار بڑے سیٹھوں نے خاطر خواہ سرمایہ فراہم کیا تھا جو بہترین منافع کی شرح پر دوسرے پراجیکٹس میں لگنا شروع ہو چکا تھا۔ صرف یہی نہیں اس ادارے نے فشنگ کے کام میں بھی ہاتھ ڈالا تھا اور پیراماؤنٹ فشریز کے نام سے ایک ذیلی کمپنی قائم کی تھی جس نے حکومت کے ساتھ فشنگ کے کام میں شراکت کر لی تھی۔

کاروباری ادارے تو انڈیا میں اس سے بھی کہیں بڑے بڑے موجود تھے لیکن پیراماؤنٹ ٹریڈرز کی سب سے اہم اور قابلِ ذکر خصوصیت یہ تھی کہ اس کا منجنگ ڈائریکٹر میں تھا۔

اس کے اٹھتر فیصد شیئرز کا میں تنہا مالک تھا اور باقی تین فیصد بمبئی کے چار سیٹھوں میں تقسیم تھے جن کا میں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے۔

میں نے جب کاروبار کی دنیا میں قدم رکھنے اور یک لخت اتنے پاؤں پھیلانے کا فیصلہ کیا تو مجھے پوری طرح یقین نہیں تھا کہ مجھے اتنی جلدی کامیابی نصیب ہو گی۔ بہرحال یہ احساس لاشعوری طور پر ضرور تھا کہ یا تو پتنگ ایک دم ہی آسمانوں پر جا چڑھے گی یا پھر ڈور ہاتھ سے کٹ ہی جائے گی لیکن داؤ سیدھا ہی پڑا۔ بعدازاں میں اس نتیجے پر پہنچا کہ کاروبار میں عقل کا کردار ضمنی ہوتا ہے۔ زیادہ اہم کردار آپ کی قسمت اور پیسے کا ہوتا ہے۔

میں نے جب کاروبار کی منصوبہ بندی کی تو کاغذوں پر مجھے یہ سب کچھ شیخ چلی کا خواب محسوس ہوا تھا۔ یوں تو اس وقت میرے پاس دو کروڑ کے قریب رقم موجود تھی لیکن جس پیمانے پر میں سوچ رہا تھا' اس مناسبت سے اس رقم کی مثال اونٹ کے منہ میں زیرہ والی تھی اور پھر میں یہ رقم بھی لے کر ایک دم کاروبار کے میدان میں نہیں کود سکتا تھا۔ انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ والے پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ جاتے کہ اتنی بڑی رقم میرے پاس آئی کہاں سے؟

گو کہ انڈیا میں اس وقت بھی بلیک منی کاروبار کرنے میں لگانے پر تیار ہو جانے والوں سے حکومت نرمی برتتی تھی لیکن میں کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا۔ ایک چھوٹے سے سیٹھ کی معرفت سب سے پہلے تو میں نے ایک ایجنٹ کو پکڑا جس نے رقم تو خاصی خرچ کرا دی لیکن نہایت مکمل اور بے عیب ایسی دستاویزات انتہائی صفائی سے تیار کرا دیں جن کی رو سے میں نے لندن میں حال ہی میں فوت ہونے والے اپنے ماموں کی خاصی بڑی جائیداد فروخت کی تھی اور پیسہ ہندوستان میں کاروبار کرنے میں لگانے لایا تھا۔

میں نے دفاتر بہت شاندار قائم کیے۔ منصوبے قطعی بے عیب تیار کیے اور ان کے سلسلے میں ایک انگریز بزنس ایڈوائزر سے بھی مدد حاصل کی۔ یوں ایک مرتبہ تو میں نے کم پونجی کے باوجود بمبئی کے اونچے کاروباری حلقے میں کھلبلی مچا دی۔ میں نے بینک آف انڈیا کو چار کروڑ روپے قرض کی درخواست پیش کی۔ لون کمیشن نے ڈیڑھ کروڑ روپے قرض منظور کیا۔

میں نے ایک تجربہ یہ بھی حاصل کیا کہ کاروباری دنیا میں ایک چیز اور بھی اثرانداز ہوتی ہے۔ اسے آپ ایک طرح کی "دہشت" کہہ سکتے ہیں۔ ایک بار آپ کی دہشت پھیل جائے تو راستے خود بخود آپ کے لیے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ سیٹھ لوگ چیک بکس اور نوٹوں سے بھرے بریف کیس لے کر آپ کے دفتر کے چکر لگانے لگتے ہیں۔ اس کے بعد ساکھ کا مرحلہ آتا ہے۔ ایک بار آپ کی ساکھ بن جائے' پھر چاہے کسی کام میں ہاتھ ڈال دیجئے' صرف ذہن حاضر رکھئے۔ بمبئی آپ کو اوپر سے اوپر لے جائے گا۔

آپ کو شاید یہ جان کر بھی حیرت ہو کہ میری فلم کمپنی کا ڈائریکٹر طلبہ تھا گو کہ اب اس کے دفتر پر اے اے لاکھانی (عاشق علی لاکھانی) کی نیم پلیٹ آویزاں تھی۔ وہ معمولی تعلیم یافتہ شخص جو زیادہ سے زیادہ سو روپے روز پہ ایکسٹرا کے طور پہ فلموں میں کام کرتا تھا اور بعض اوقات ڈپلیکیٹ کے طور پر کام کرتے ہوئے جان کو خطرے میں ڈالتا تھا اور جس کے سلام کا کوئی سیدھے منہ جواب نہیں دیتا تھا' فلم کمپنی کو بڑے عمدہ طریقے سے چلا رہا تھا۔ میں نے کام اسے سوچتے وقت ایک لیکچر دیا تھا۔ اب اس کا سابقہ تجربات کو دہرانے یا اپنی ادھوری حسرتوں کو پورا کرنے کا کوئی ارادہ معلوم نہیں ہوتا تھا۔

اس کے دفتر میں اب بھی لڑکیوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ یہ لائن ہی ایسی تھی مگر اب وہ انہیں پچھلے کمرے میں نہیں بلاتا تھا۔ وہ صاف ستھرا سوٹ پہنے اپنی چھوٹی سی گاڑی میں دفتر آتا تھا اور بڑے وقار اور سنجیدگی سے دفتری اور کاروباری معاملات چلاتا تھا۔ چودہ آدمیوں کا مستقل اسٹاف اس کا ماتحت تھا۔

میری فنڈنگ کمپنی کا سربراہ چھتا تھا۔ وہ گو کہ واجبی سا ہی پڑھا لکھا تھا اور اب بھی دھوتی کرتے میں دفتر آتا تھا لیکن اپنا کام نہایت عمدگی سے چلا رہا تھا۔ سہ ماہی آڈٹ سے پتا چلا تھا کہ اس کے شعبے نے سب سے کم مدت میں منافع کی شرح سب سے زیادہ دی تھی۔ وہ بڑا سنجیدہ انسان تھا۔ اس کا ماتحت اسٹاف اس سے بڑا مرعوب رہتا تھا۔

میں نے پیرامائونٹ ٹریڈرز کے اسی طرح کے کئی شعبے بنا کر ان کا ایک ایک سربراہ مقرر کر دیا تھا اور انہیں تقریباً آزادانہ طور پر کام کرنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ اس طرح مجھ پر کام کا دباؤ زیادہ نہیں تھا اور میں منصوبہ سازی اور بھاگ دوڑ میں زیادہ وقت صرف کر سکتا تھا۔

تاہم کاروبار کو میں نے اپنے حواس پر سوار نہیں ہونے دیا تھا۔ یہ تو میرا زاد راہ تھا' منزل کچھ اور تھی۔ کاروبار کو میں نے ایک انجن کی طرح سیٹ کر دیا تھا جو ایک بار اسٹارٹ ہونے کے بعد خود بخود چل رہا تھا۔ میرا کام صرف انجن کی آواز پر دھیان رکھنا تھا کہ کہیں کوئی پرزہ کھڑکھڑاہٹ تو پیدا نہیں کر رہا۔ کہیں کوئی نٹ بولٹ ڈھیلے تو نہیں پڑ رہے؟ کوئی پرزہ تبدیل ہونے والا تو نہیں؟

ایک روز میں دفتر پہنچا تو میری سیکرٹری نے بڑے مسرت بھرے لہجے میں بتایا۔ "سر! میڈم روپا..... آپ سے ملنے آئی ہیں۔ میں نے انہیں اندر آپ کے دفتر میں بٹھا دیا ہے۔"

اپنے ساؤنڈ پروف ایئرکنڈیشنڈ دفتر کا دروازہ کھول کر میں بیرونی حصہ عبور کرکے اندر پہنچا۔ روپا ٹانگ پر ٹانگ رکھے صوفے پر پشتے سے ٹیک لگائے بیٹھی خوابناک سی آنکھوں سے دروازے ہی کی طرف دیکھ رہی تھی' جیسے میری راہ دیکھتی رہی ہو۔ اس نے اپنی جگہ سے جنبش نہیں کی' وہ یوں میری طرف دیکھ رہی تھی جیسے میں ایک خواب ہوں اور اس

سے ذرا پلک جھپکی تو بکھر جاؤں گا۔

وہ موتیا رنگ کے ایک عجیب و غریب کپڑے کی ساڑھی میں ملبوس تھی جو چپکیلی دھند کی طرح گویا اس کے جسم پہ جما ہوا تھا۔ ایسے ہی کپڑے کے کہنیوں تک کے دستانے پہن رکھے تھے' بالوں کا جوڑا بہت ہی خوبصورت تھا۔ اس کے وجود کی مسحور کن خوشبو وسیع کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ سدا بہار عورت تھی' ہمیشہ کی طرح آج بھی بے پناہ حسین' ترو تازہ اور شگفتہ نظر آ رہی تھی۔ بس آنکھوں کی گہرائیوں میں خوابیدہ اداسی کے رنگ کچھ اور گہرے ہو چکے تھے۔

میں نے بریف کیس ریک پر رکھا اور مسکراتے ہوئے اس کی طرف مڑا۔

"معاف کیجئے گا سیٹھ صاحب! میں آپ کا قیمتی وقت ضائع کرنے آئی ہوں۔" اس کے رسیلے ہونٹوں نے حرکت کی' لہجہ سپاٹ تھا مگر الفاظ سپاٹ نہیں تھے۔

"دیکھو..... اب طنز و تشنیع کرنے کی کوشش نہ کرو۔" میں اس کے قریب جا بیٹھا اور اس کے ہاتھ تھام لیے۔ "اچھے دوست جب ایک طویل عرصے کی جدائی کے بعد ملتے ہیں تو ایک دوسرے پر زہریلے لفظوں کے تیر نہیں برساتے۔"

"خصوصاً جبکہ ایک ہی شہر میں رہ کر جدا رہنے کی مردانہ کوشش کی گئی ہو۔" اس کا لہجہ پہلے جیسا ہی رہا۔ "جس انداز میں آپ نے الوداع کہا تھا' اس سے آپ کی مراد غالباً یہی تھی کہ میں آئندہ آپ سے ملنے کی کوشش نہ کروں سیٹھ صاحب! مگر افسوس کہ میں نہ جانے کس جذبے سے شکست کھا کر چلی آئی حالانکہ میں بڑی خوددار عورت تھی سیٹھ صاحب!" "اوہ..... خدا کے لیے سیٹھ صاحب' سیٹھ صاحب کی گردان بند کر دو۔" میں نے اپنائیت بھرے غصے سے اس کے بازو کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور فوراً ہی انتہائی ملائمت اور انکساری سے کہا۔ "میں آج بھی تمہارا ایک حقیر غلام ہوں' دوست ہوں' رازدار ہوں' خیرخواہ ہوں' پیار کرنے والا ہوں لیکن میں روایتی عاشق نہیں۔ میں محبت کا ثبوت اسے ہی نہیں سمجھتا کہ تمہارے در پہ پڑا رہوں یا باقاعدہ تم سے ملتا رہوں۔ میری محبت کو میرے ہی انداز کا اسیر رہنے دو' میں خواہ کہیں بھی رہوں۔ کتنا ہی عرصہ تم سے نہ ملوں لیکن تم مجھے ہمیشہ یاد رہو گی' محترم رہو گی' محبوب رہو گی..... اس سے زیادہ مجھ سے کچھ نہ مانگو۔"

"میں تو تم سے کچھ بھی نہیں مانگتی۔" وہ یک لخت ٹوٹ گئی' اس کی آنکھیں چھلک آئیں..... گویا سمندر روپنے کو تھا۔ "لیکن تم ہی کہو کہ یہ کوئی انداز ہے تعلق داری کا؟ مجھے یوں خدا حافظ کہہ کر اچانک روپوش ہو گئے جیسے پاتال میں اتر گئے ہو..... اسی شہر میں بزنس کرتے رہے..... اتنی ٹانگیں پھیلا لیں' فلم کمپنی بھی قائم کر لی لیکن تمہیں کبھی بھول کر بھی میرا خیال تک نہ آیا؟ کبھی ایک فون ہی کر لیا ہوتا۔ تمہاری کمپنی کا کوئی نمائندہ مجھے سائن کرنے آیا اور باتوں باتوں میں تمہارا ذکر نکل آیا۔ میرے کرید کرید کر پوچھنے پر وہ

تمہارے متعلق بتاتا رہا اور مجھے یقین ہو گیا کہ یہ تم ہی ہو۔ تمہارا خیال تھا کہ اسی شہر میں رہ کر اتنا کاروبار پھیلا کر اور خصوصاً فلم کے دھندے میں بھی ٹانگ اڑانے کے باوجود تم میری نظروں سے اوجھل رہو گے؟ میں نے کنٹریکٹ تو سائن کر دیا لیکن ایک حسرت سی محسوس ہوئی کہ کاش یہ کنٹریکٹ سائن کروانے تم آئے ہوتے.....“ اس نے سوتیا رنگ کے ہی ایک چھوٹے سے نفیس رومال سے آنکھیں پونچھیں اور جھرجھری سی لے کر یوں سنبھل گئی گویا اپنی اس کیفیت پر شرمندہ ہو۔ اسے ندامت ہو کہ وہ اپنے آپ پر قابو کیوں نہیں رکھ پا رہی۔

”یہ تو ایک غیر اہم چھوٹا سا کاروباری معاملہ تھا جس کے متعلق مجھے علم بھی نہیں کہ کوئی نمائندہ تمہارے پاس آیا تھا۔“ میں نے اس کے گداز ہاتھ تھپکتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں حسرت محسوس ہوئی کہ کنٹریکٹ سائن کروانے میں تمہارے پاس آیا ہوتا۔ بالکل بیکار کی بات کی تم نے' خدا نہ کرے جو میں کسی کاروباری اور وہ بھی اتنے معمولی کام کے لیے تمہارے پاس آیا ہوتا۔ تم سے میرا تعلق کاروبار کا نہیں' جذبوں کا ہے۔ تم سے میرا معاملہ لین دین کا نہیں' دل کا ہے۔ میں تمہارے پاس اگر آتا تو کسی جذبہ دل کی تجدید کے لیے آتا.....“

”اور وہ دن شاید کبھی نہ آتا۔“ اس نے میری بات کاٹ دی۔

”چلو میں نہیں آسکا' تم آگئیں۔ تم نے مجھے عزت بخشی' میرا مان بڑھایا۔“ میں نے خلوص سے کہا۔ ”میں پہلے بھی تمہارا زیر بار تھا' اب تمہاری اچھائیوں کے بوجھ تلے کچھ اور دب گیا ہوں۔ اب ان گلے شکووں کو چھوڑو..... یہ بتاؤ کیا پیو گی؟ جو کچھ تم پیتی ہو' وہ بھی یہاں دستیاب ہے۔“

”تمہیں پتہ ہے گھر سے نکلنے کے بعد میں نہیں پیتی۔“ وہ مسکرائی۔ ”میں صرف کافی پیوں گی لیکن پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ آخر اس ڈرامائی قطع تعلق میں کیا مصلحت تھی؟ اس کی تہہ میں کوئی بھید ہے جو میں کھولنا چاہتی ہوں۔“

”کوئی بھید نہیں۔“ میں نے تیزی سے ہاتھ ہلایا۔ ”میں محسوس کر رہا تھا کہ تمہارا میرا تعلق عشق بنتا جا رہا ہے۔ بہت سے کاموں میں عشق مہمیز ثابت ہوتا ہے۔ آپ کو تحریک دیتا ہے' تیزی سے آگے بڑھاتا ہے۔ اس کی بدولت انسان سے معجزے سرزد ہونے لگتے ہیں لیکن بعض کاموں کے راستے میں عشق دیوار بن جاتا ہے۔ افیون کی تاثیر دکھانے لگتا ہے' آدمی کو سست کر دیتا ہے۔ میں زندگی میں جو کچھ کرنا چاہتا ہوں' اس کے سلسلے میں بھی مجھے اندیشہ تھا کہ عشق میرے لیے مہمیز ثابت نہیں ہو گا' افیون بن جائے گا۔ عشق کے سوا میں کچھ نہیں کر سکوں گا..... اور تعلق داری کی ڈور چونکہ بہت الجھی ہوئی تھی اور اسے آہستہ آہستہ سلجھانے میں مجھے کامیابی نہیں ہو رہی تھی اس لیے میں نے جھٹکے سے اسے

توڑ ڈالا لیکن یہ مت سمجھو کہ اس کے ساتھ تعلق خاطر بھی ٹوٹ گیا..... میں نے کہا ناں کہ یہ میرا اپنا انداز ہے..... اور میری محبت کو میرے ہی انداز کا اسیر رہنے دو۔“

”تم تو اپنا فلسفہ گھڑ کر سکون سے اپنی دنیا میں مگن ہو گئے۔“ اس کے لہجے میں شکست خوردہ سا شکوہ تھا۔ ”دوسرے کی زندگی تہہ و بالا ہو گئی' تمہیں اس سے کیا غرض۔“

میز کے قریب جا کر میں نے انٹرکام پر کرسٹینا کو کافی بھجوانے کے لیے کہا اور دوبارہ روپا کے قریب آبیٹھا۔ ”اور سناؤ' نیا گھر بنوا لیا تم نے؟“ میں موضوع بدلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”بنوایا نہیں.....بنا بنایا لے لیا تھا' باندرہ میں ہے۔ انشورنس کمپنی نے خاصی حیل حجت کے بعد بہرحال کلیم ادا کر دیا تھا۔ میرا کوئی خاص نقصان نہیں ہوا۔ سوائے اس کے کہ ذہنی دھچکے سے سنبھلنے میں خاصی دیر لگی اور بہت سے ضروری کاغذات اور ماضی کی کچھ نشانیاں ضائع ہو گئیں۔“ وہ دھیرے دھیرے بتا رہی تھی..... موضوع بدلنے سے اس کا لہجہ بھی معمول پر آگیا تھا اور میں یہی چاہتا تھا..... ذاتیات بڑا تکلیف دہ موضوع بھی ہے اور بڑا حیرت انگیز بھی۔

”بہرحال..... نیا گھر بنوانے کو جی نہیں چاہا۔“ وہ بتا رہی تھی۔ ”لیکن جو خریدا ہے یہ بھی خاصا خوبصورت ہے۔“

میں نے کوئی تبصرہ نہ کیا تو وہ میری طرف دیکھتے ہوئے ہچکچاہٹ آمیز اور قدرے شرمیلے سے انداز میں مسکرائی..... ”تم کب آ رہے ہو' اسے اپنے وجود کی روشنی سے جگمگانے؟“

”روپا! ایک تو تم میری اتنی عزت افزائی کرتی ہو کہ میرا دماغ ساتویں آسمان پر جا پہنچا ہے۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”ویسے مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ مجھے جلد ہی تمہارے گھر آنا پڑے گا۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”میں تمہیں بھی کسی ایسے دھندے سے لگانے کے بارے میں سوچ رہا تھا جس میں الجھ کر زندگی کے بارے میں تمہاری بے دلی اور لاتعلقی ختم ہو جائے گی۔“

”تمہارا خیال ہے کہ میری فلمی مصروفیات کم ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”مجھے معلوم ہے کہ تم تین مصروف ترین ہیروئنوں میں سے ایک ہو۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”لیکن فلمی مصروفیتیں تھکا دینے والی ہوتی ہیں' میں تمہارے لیے کوئی ایسی مصروفیات پیدا کرنا چاہتا ہوں جو تمہیں تھکانے کے بجائے تمہارا دل جوش و خروش سے بھر دیں اور اس وقت بھی برقرار رہیں جب فلمی دنیا میں تمہاری مصروفیت گھٹ جائیں گی اور جھنجلاہٹ بڑھ جائے گی..... میں دراصل بہت دور کی سوچنے لگا ہوں۔“

”گویا تم شادی کے سلسلے میں آئیڈیل مرد بنتے جا رہے ہو۔“ وہ ایک بار پھر شرارت سے

مسکرائی..... "کاش تم مجھے اس وقت ملے ہوتے جب میں شادی کی حماقت کو دہرانے کے سلسلے میں پوری طرح سنجیدہ ہو رہی تھی مگر قدرت نے بال بال بچا لیا۔"

اور کاش تم اس وقت بھی میرے قریب موجود ہو جب میرے دل میں شادی کی خواہش پیدا ہو جائے۔" میں نے بھی شرارتاً کہا۔

"وہ دن آنے تک اپنے تو نہ منہ میں دانت ہو گا' نہ پیٹ میں آنت۔" اس نے مصنوعی آہ بھر کر کہا۔

"مجھے تم اس وقت بھی "جہاں ہے اور جیسی ہے" کی بنیاد پر قبول ہو گی۔" میں نے کہا "ویسے حال اپنا بھی تم سے کچھ مختلف نہیں ہو گا۔"

دفعتاً دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی' غالباً کافی آگئی تھی۔

آفس بوائے کافی کی ٹرالی لیے اندر آیا اور دو مگ تیار کر کے ہمیں دے کر خاموشی سے واپس چلا گیا۔ کافی پینے کے بعد روپا بھی بادل نخواستہ سے انداز میں رخصت ہو گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں دیر تک اپنی جگہ ساکت بیٹھا گہری گہری سانسیں لیتا رہا۔ میرے اعصاب میں کچھ ارتعاش سا پیدا ہو چکا تھا جو میرے نزدیک کوئی اچھی علامت نہیں تھی۔ میں جذباتی ہلچل وغیرہ سے اپنے آپ کو حتی الامکان محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے کام شروع کر دیا' پھر چند منٹ بعد کرشنا کو بلایا۔

"انگریزی کے دو تین بڑے اخباروں میں صبح کے لیے ایک اشتہار دے دو کرشنا!" مجھے ایک اسٹینو ٹائپسٹ کی ضرورت ہے جو بطور اسٹینو ٹائپسٹ خواہ اچھی نہ ہو لیکن نہایت خوبصورت' بے عیب اور گرامر کی غلطیوں سے پاک انگریزی لکھ سکتی ہو۔ اسے ہر بات وضاحت سے نہ سمجھانی پڑے' میرا مطلب سمجھ رہی ہو ناں؟"

"جی سر! مجھے بھی تو اسی صلاحیت کی بنا پر آپ نے ترجیح دی تھی۔" اس نے محتاط انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"دو' کسی اچھے ادارے کی تعلیم یافتہ ہو۔" میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ جتنی لڑکیاں بھی انٹرویو کے لیے آئیں' ان میں سے دو یا تین لڑکیاں منتخب کر کے انہیں ان کی فائلیں دے کر میرے پاس بھیج دینا۔ ان میں سے ایک کو میں خود منتخب کروں گا۔ یہ کام پیر کو رکھ لو۔ آج سے ٹھیک پانچ دن بعد۔"

"او کے سر!" اس نے مستعدی سے کہا اور سمجھ گئی کہ اب مجھے مزید کچھ نہیں کہنا ہے' اس لیے تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

پیر کو میں دہلی میں ایک میٹنگ میں شرکت کر کے تیار؛ بجے کی فلائٹ سے بمبئی واپس پہنچا اور ایئرپورٹ سے سیدھا دفتر چلا گیا۔ ابھی میں بریف کیس رکھ کر بیٹھا ہی تھا کہ انٹرکام پر سگنل ملا۔ میں نے ریسیور اٹھایا..... دوسری طرف کرشنا تھی۔

"سر! شیڈول کے مطابق آج آپ کو اپنے لیے اسٹینو ٹائپسٹ کا انتخاب کرنا تھا۔" کرشنا بولی۔ "میں صبح سے کانفرنس روم میں ان لڑکیوں کے ساتھ مغز کھپا رہی تھی' چوبیس لڑکیاں آئی تھیں۔"

"تم نے ان میں سے کتنی منتخب کی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"صرف دو۔" کرشنا نے جواب دیا۔ "بلکہ سچ پوچھئے تو میرا ووٹ صرف ایک ہی کے حق میں تھا لیکن میں نے اپنے طور پر اس اکیلی پر انحصار نہیں کیا کہ آپ شاید اس کی صلاحیتوں کے باوجود اسے منتخب کرنے کا فیصلہ نہ کریں' اس لیے میں نے ایک اور بہترین لڑکی کو ساتھ رکھا ہے اور دو لڑکیوں کو ویٹنگ لسٹ پر بھی رکھا ہے۔"

"اس لڑکی کے بارے میں تم نے یہ کیوں سوچا کہ میں شاید اس کی صلاحیتوں کے باوجود اسے منتخب نہ کروں؟" میں نے پوچھا۔

"سر!" کرشنا نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ اس بری طرح برقعے میں لپٹی ہوئی ہے کہ صرف آنکھیں نظر آتی ہیں' دوسرے یہ کہ مجھے اس کی وجہ بھی اتفاقاً معلوم ہو گئی اس کی شکل اتنی خوفناک ہے کہ شاید آپ اسے سامنے بیٹھے دیکھ کر ڈرتے رہا کریں۔ ویسے اس کا اصرار ہے کہ وہ دفتر میں بھی اسی طرح برقع لپیٹے رکھا کرے گی لیکن یہ بھی عجیب لگے گا۔"

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے' ہوش سنبھالنے کے بعد سے اب تک میں کسی دنیاوی چیز سے نہیں ڈرا۔" میں نے کہا۔ "بہرحال تم پہلے اس لڑکی کو اندر بھیج دو جو بدصورت نہیں ہے۔" میں نے ریسیور رکھ دیا اور بٹن دبا کر دروازے پر سبز بلب روشن کر دیا۔

چند سیکنڈ بعد جو لڑکی اندر آئی' وہ مجھے پہلی ہی نظر میں بھلی لگی وہ سرخ و سپید اور دراز قد تھی۔ عمدہ تراش خراش کے لباس میں تھی۔ اس نے بہت ہی ہلکا میک اپ کیا ہوا تھا۔ اسے خوبصورت لڑکیوں میں شمار کیا جا سکتا تھا۔ وہ روانی سے انگریزی بول سکتی تھی اور اس کی حرکات و سکنات سے سلیقہ جھلکتا تھا۔ اس میں سستے پن کی کوئی علامت نہیں تھی۔ وہ کسی اچھے گھرانے کی فرد معلوم ہوتی تھی۔ تعلیم بھی اس نے اچھے اور معروف تعلیمی اداروں میں پائی تھی۔

میں نے چند نکات بتا کر اسے ایک لیٹر ٹائپ کرنے کے لیے کہا' وہ میرے دفتر ہی کے ایک گوشے میں پڑے آئی بی ایم الیکٹرک ٹائپ رائٹر پر ٹائپ کرنے لگی اور میں کچھ فائلیں دیکھنے لگا۔

چند ہی منٹ میں جو خط ٹائپ کر کے لائی' اسے پڑھ کر میں دل ہی دل میں عش عش کر اٹھا۔ میں اس کے تقرر کا فیصلہ تقریباً کر ہی چکا تھا۔ جب مجھے یاد آیا کہ کرشنا نے ایک اور لڑکی کا تذکرہ کیا تھا جو حد سے زیادہ بدصورت مگر اس کے خیال میں بہت زیادہ اہلیت کی

مالکہ تھی۔

میں نے اس لڑکی کو جس کی تحریر کا نمونہ میں دیکھ چکا تھا' یہ کہہ کر رخصت کر دیا کہ کل تک ٹیلی فون پر اسے حتمی فیصلے سے مطلع کر دیا جائے گا' پھر میں نے کریمینہ کو ہدایت کی کہ وہ نقاب پوش بدصورت لڑکی کو اندر بھیج دے۔

سر سے پاؤں تک سیاہ برقعے میں لپٹی ہوئی وہ سرو قد لڑکی اندر آئی۔ اس کی ناک اور پیشانی تک نقاب میں چھپی ہوئی تھی۔ صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ ساحر آنکھیں' جھیل آنکھیں' غزالی آنکھیں' یہ سب تشبیہات ان آنکھوں کے لیے ہیچ تھیں۔ وہ شاید دنیا کی حسین ترین آنکھیں تھیں' کم از کم میں نے اپنی زندگی میں ان سے زیادہ حسین آنکھیں نہیں دیکھی تھیں۔

مگر تمام تر حسن و کشش سے قطع نظر یہ آنکھیں اس قدر سوالی تھیں کہ ان میں جھانکتے ہوئے مجھے اندر ہی اندر جھرجھری سی آ گئی۔ اس نے اپنے کوائف کی فائل نہایت آہستگی سے میز پر رکھ دی اور سیدھی کھڑی پلکیں جھپکائے بغیر میری طرف دیکھتی رہی... پلکیں جھپکانے میں مجھے بھی کامیابی نہیں ہو رہی تھی... میرا رواں رواں جیسے پتھرا گیا تھا۔

وہ بھی اپنی آنکھوں میں تڑپتے پھڑکتے کسی جذبے کو مدفون رکھنے کی کوشش کر رہی تھی اور مجھے یقین تھا کہ اس کوشش میں دل اس کا بھی خون ہو رہا ہو گا مگر بڑا حوصلہ تھا اس کا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ شروع ہی سے ایک غیر معمولی لڑکی تھی' اس لیے ابھی تک اپنے پیروں پر کھڑی تھی۔ اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا تھا۔ میرے سکوت کو دیکھتے ہوئے شاید وہ سمجھ رہی تھی کہ میں اسے پہچانا نہیں' شاید اس سے اس کی انا بھی مجروح ہوئی تھی اور تبھی شاید وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ خود بھی کچھ نہیں کہے گی۔ نوکری کی تلاش میں آئی ہوئی امیدوار ہی بنی رہے گی۔

شاید اس کا خیال تھا کہ جن آنکھوں سے ٹکر ٹکر میری طرف دیکھ رہی تھی' محض ان کی مدد سے میں اسے نہیں پہچان سکتا۔ کتنی بھولی تھی وہ۔ ان ساحر آنکھوں کو بھلا میں کیسے بھول سکتا تھا؟

یہ میری ماہتاب کی آنکھیں تھیں۔

"میرے سامنے بیٹھ جاؤ ماہتاب! اور چہرے سے نقاب ہٹا دو۔" میرے سینے کی قبر سے یہ آواز اس مردے کی کراہ کی طرح برآمد ہوئی جسے کسی معجزے کے تحت دھیرے دھیرے زندگی مل رہی ہو۔

اس کی آنکھوں میں زلزلہ سا آیا' آنسوؤں کا ایک سیلاب تھا جسے اس نے روکنے کی کوشش کی تھی۔ "تو تم نہیں جاؤ گے؟" اس نے کسی روح کی طرح سرگوشی کی۔

"یہ پوچھو کہ خوشی سے مر تو نہیں جاؤ گے۔" میں نے اب قدرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ "گویا میرا مسخ شدہ چہرہ دیکھ کر تمہیں خوشی ہو گی۔" اس کی سرگوشی میں اس مرتبہ کند خنجر کی سی چبھن تھی۔

"نہیں... خوشی تو تمہارے مل جانے کی ہو گی' کسی بھی عالم میں سہی' مل تو گئیں۔" میری آواز اب پرسکون ہو چکی تھی۔ "مسخ شدہ چہرے پر غور کرنے کا مرحلہ بعد میں آئے گا۔ پہلے ملن کی لذت سے تو لطف اندوز ہو لینے دو۔" میں نرم نرم چمڑے کی پوشش والی گدے دار کرسی میں یا تو دھنسا جا رہا تھا یا پھر کرسی سمیت فضا میں بلند ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے اس موقع پر بھی اپنے محسوسات کو اعتدال پر رکھنے کی کوشش کی۔

میں اٹھ کر اس کی طرف دوڑا نہیں...... میں نے اس کے بکھرے بکھرے وجود کو بازوؤں کے حلقے میں سمیٹنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھام کر یہ نہیں کہا کہ جو آنسو انگارے بن کر اسے اندر ہی اندر جھلسا رہے ہیں' انہیں وہ میرے دامن میں ڈال دے' میں موتیوں کی طرح انہیں سنبھال کر رکھوں گا۔ یہ سب کچھ کرنے اور کہنے کو میرا دل چاہ رہا تھا مگر میں اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہا۔

ماہتاب میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی... پھر دھیرے دھیرے اس نے نقاب چہرے سے ہٹا دیا۔ مجھے نہ تو حیرت کا جھٹکا لگا اور نہ ہی خوف آیا۔ میں نے ایک فوٹوگرافر کی سی باریک بینی سے اس کھنڈر چہرے کا جائزہ لیا۔ آنکھوں کے سوا اس چہرے پر کچھ بھی سلامت نہیں تھا۔

جلد جگہ جگہ سے پھٹ چکی تھی۔ کہیں سے سیاہی جھانک رہی تھی اور کہیں سے ہڈیوں کی سفیدی۔ وہ رخسار جو کبھی گلاب کو شرماتے تھے' جیسے انگاروں پر جھلس چکے تھے۔ وہ ہونٹ جن سے یاقوت کی سی سرخی چھلکتی تھی' چیتھڑے ہو چکے تھے اور نچلا ہونٹ تو آدھا غائب ہی تھا۔ اس جگہ سے نظر آتے دانت حسین ہونے کے باوجود ڈراؤنے لگ رہے تھے... ستواں ناک کے آس پاس گوشت کھنچ چکا تھا جس کی وجہ سے ناک قدرے ٹیڑھی لگ رہی تھی۔ ناک کی پھلنگ بھی غائب تھی اور ماتھے پر بھی سیاہ داغ تھے۔

یہ وہی ماہتاب تھی جس کے حسن نے کالج میں تہلکہ مچا رکھا تھا جسے دیکھ کر نوجوانوں کے دل دھڑکنا بھول جاتے تھے اور بڑے بڑے سنجیدہ اور معمر پروفیسروں کے چہرے پر بھی رونق آ جاتی تھی۔

یہ وہی ماہتاب تھی جس کی محبت میری زندگی کا حاصل تھی' جسے میں نے پوجنے کی حد تک چاہا تھا۔

چند لمحے کے لیے ہم دونوں خاموش رہے اور یہ چند لمحے گویا صدیوں پر محیط تھے' پھر میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ "اب مجھے سب کچھ بتاؤ کہ یہ کیسے ہوا... کوئی پہلو

تشنہ نہ رہنے پائے۔"

"کیا کرو گے سن کر؟" اس کے لہجے میں اب بھی زہر تھا۔ "سانپ نکل جائے تو لکیر پیٹنے کا فائدہ؟" میں نے جب تمھیں آوازیں دے کر روکنا چاہا تھا کہ تم مجھے کن خطرات میں گھری ہوئی چھوڑ کر جا رہے ہو؟ اس وقت حد سے زیادہ جذباتی بنے ہوئے تھے' اب حد سے زیادہ سرد مزاج بنے ہوئے ہو۔"

"تم مجھ پر زہر میں بجھے ہوئے چبھتے بھی تیر برساؤ... بلکہ زندگی بھر برساتی رہو گی تب بھی اس زیاں کا حساب پورا نہیں ہوگا جو میری وجہ سے تمھیں پہنچا ہے لیکن جو کچھ میں پوچھ رہا ہوں' خدا کے لیے اس کا جواب ضرور دو...... یہ بہت ضروری ہو گیا ہے۔" میں نے یہ سب کچھ اتنے دھیمے پن سے کہا تھا کہ ایک ایک لفظ اس کے ذہن میں اتر جائے۔

چند لمحے وہ میرے پیچھے کسی چیز پر نظر جمائے بیٹھی رہی۔ پھر میری طرف دیکھے بغیر دھیرے سے بولی۔ "سب کچھ ایک ڈراؤنا خواب لگتا ہے۔ کتنی جلدی سب کچھ ہو گیا۔ آشیاں بنانے میں بڑا وقت لگتا ہے..... تنکا تنکا چنتے چنتے عمر بیت جاتی ہے لیکن اجڑنے میں کچھ دیر نہیں لگتی۔"

وہ چند لمحے خاموش رہی گویا اس کی سمجھ میں نہ آرہا ہو کہ بات کہاں سے شروع کرے۔ آخر اس نے دھیمے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "تمھارے غائب ہونے کے چند روز بعد ہی ابو کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا۔ وہ دکان کے سامنے اپنی گاڑی پارک کر کے سڑک پار کر رہے تھے کہ ایک تیز رفتار ٹرک اچانک نمودار ہوا اور انھیں کچلتا ہوا گزر گیا۔ ہم نے اسے محض ایک حادثہ ہی سمجھ کر جس طرح بن پڑا' برداشت کیا لیکن بعد میں کہیں زیادہ اذیت اس وقت ہوئی تھی جب پتا چلا کہ یہ حادثہ نہیں تھا...... یہ جاننے کی تو کوئی ضرورت نہیں کہ اس ٹرک کا کوئی سراغ نہیں لگ سکا تھا۔ ابھی میں اور امی چالیسویں کے بعد ایک دوسرے کے آنسو پونچھنے ہی میں مصروف تھے کہ صراف بازار میں رات کو گشتی پولیس کے کئی سپاہیوں اور صراف بازار کے اپنے چوکیداروں کی موجودگی میں ہماری دکان پر ڈاکہ پڑا اور ڈاکو گویا دکان میں جھاڑو پھیر گئے۔ لاکھوں کے قیمتی زیورات اور ہیرے موتیوں میں سے ایک ذرہ بھی نہیں چھوڑا بلکہ ایک سیف ان سے نہیں ٹوٹا تو سیف ہی دیوار سے اکھاڑ کر لے گئے۔ ہم نے اب بھی یہی سمجھا کہ تقدیر ہمارے خلاف سازش کر رہی ہے اور ہم نے محض اس مقولے سے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ مصیبت تنہا نہیں آتی۔ جواہرات اور زیورات کی دکان میں ابو کی ایک ہندو سیٹھ ارجن داس سے پارٹنرشپ تھی' وہ بہت ہی اچھا اور ہمدرد قسم کا آدمی تھا۔ ابو اپنی زندگی میں اس پر بہت اعتماد کرتے تھے' اس لیے ظاہر ہے امی کی نظر میں بھی اس کا مقام محترم تھا۔ ڈاکے کے چند روز بعد وہ امی کے پاس آیا' نہایت افسردہ و ملول تھا لیکن اس نے مجھے اور امی کو بہت ڈھارس دی۔ اس کی شیریں بیانی کا کوئی جواب ہی نہیں تھا۔

سیٹھ ارجن داس نے امی کو بتایا کہ دکان کے بیمے کی رقم اور ابو کا بینک بیلنس وغیرہ حاصل کرنے میں انھیں بہت وقت لگے گا اور بہت سے قانونی نقائص کی وجہ سے شاید انھیں کسی ایک یا دونوں چیزوں سے محروم ہونا پڑ جائے اور چونکہ انھیں قانونی معاملات کا اوراک نہیں ہے اور وہ محض وکیل پر انحصار کر کے سارے معاملات سے نہیں نمٹ سکتیں' اس لیے بہتر یہی ہے کہ امی اس کے نام پاور آف اٹارنی لکھ دیں' وہ خود ہی سارے کام سیدھے کر لے گا۔

امی کاروباری معاملات میں بالکل اناڑی تھیں، سیٹھ ارجن داس کی شیریں بیانی کے جال سے نہ بچ سکیں۔ انہوں نے نہ صرف پاور آف اٹارنی لکھ دی بلکہ وصیت نامہ بھی اس کے حوالے کر دیا کیونکہ اس کا کہنا تھا کہ پاور آف اٹارنی کے کاغذات کے ساتھ وصیت کی ایک مصدقہ نقل بھی منسلک ہوگی۔ مصدقہ نقل تیار کرنے کے بعد وہ اصل وصیت نامہ واپس کر دے گا۔

اس کے بعد سیٹھ ارجن داس کا کوئی پتا نہیں چلا۔ امی کے اکاؤنٹ میں کچھ رقم تھی لیکن وہ کب تک ساتھ دے سکتی تھی؟ ہاتھ تنگ ہونے پر امی نے انشورنس کمپنی اور بینک وغیرہ سے رابطہ قائم کیا تو معلوم ہوا کہ سیٹھ ارجن داس انشورنس کا کلیم اور بینک بیلنس وغیرہ سب وصول کر چکا ہے۔ امی نے اس کے گھر فون کیا، وہ رینٹڈ تھا۔ اس کے دو بیٹے اپنی بیویوں کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ان کا باپ تو انگلینڈ چلا گیا ہے اور وہاں کوئی کاروبار سیٹ کرنے کے چکر میں ہے، اس لیے دو سال تک واپس نہیں آئے گا۔

امی نے حواس باختگی کے عالم میں اپنے اور اس کے مشترکہ وکیل سے رابطہ قائم کیا تو وہ نہایت رکھائی سے پیش آیا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی ارجن داس سے مل چکا ہے۔ اس نے بتایا کہ ارجن داس کے خلاف مقدمہ قائم کرنے کے لیے کوئی ٹھوس بنیاد موجود نہیں ہے اور اگر مقدمہ کیا بھی گیا تو سالوں چلے گا اور امی کو کچھ ملنے کے بجائے اپنا مقدمہ کے اخراجات ادا کرنے پڑ جائیں گے۔

ادھر سے مایوس ہو کر ہم ابھی کوئی دوسرا راستہ تلاش بھی نہ کر پائے تھے کہ ایک روز مدن موہن دو بدمعاشوں کے ساتھ ہمارے ہاں آیا۔ پہلے اس نے بڑے مہذبانہ انداز میں ہمارے حالات پر اظہار ہمدردی کیا۔ پھر امی سے کہنے لگا کہ اگر وہ اپنی بیٹی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھما دیں تو سارے مسئلے حل ہو سکتے ہیں۔

مجھے شبہ تو پہلے ہی تھا، اب یقین ہو گیا کہ ٹرک والے حادثے اور دکان کی ڈکیتی کے پیچھے اسی کا ہاتھ تھا۔ امی ظاہر ہے، اس کی بات سن کر آگ بگولہ ہو گئیں۔ تب اس کا انداز تخاطب یکسر بدل گیا۔ اپنے مخصوص دہقانہ لہجے میں بولا۔ "بڑھیا! رسی جل گئی مگر بل نہیں گیا۔ میں چاہوں تو ابھی تمہاری بیٹی کو اٹھا کر لے جاؤں لیکن میں تم دونوں کو اپنے قدموں پر جھکانا چاہتا ہوں۔ وہ دن دور نہیں جب تم خود اپنی بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر اسے میری جھولی میں ڈالنے آؤ گی اور یہ خود بھی میری نظر کرم کے لیے سو سو جتن کرے گی۔ میری نوازشات کے لیے ترسے گی۔

امی نے اس کے منہ پر طمانچہ رسید کر دیا۔ تب وہ غصے سے لال پیلا ہو گیا، اس نے اپنے ایک ساتھی کو اشارہ کیا اور اس نے پنڈلی پر بندھا ہوا خنجر نکال کر امی کے سینے میں

اتار دیا۔۔۔

ماہتاب کی آواز ضبط کی تمام تر کوششوں کے باوجود بھرا گئی اور آنکھوں کا سونا پن بڑھ گیا۔ چند لمحے تک وہ کٹے پھٹے ہونٹوں کو بھینچے بیٹھی رہی۔ پھر جھرجھری سی لے کر ایک طویل سانس لیتے ہوئے بولی۔ "تم اس وقت کا تصور نہیں کر سکتے، ایک جوان لڑکی کے گھر میں رات گئے تین درندہ صفت بدمعاش گھسے ہوئے ہوں، سامنے خون میں لت پت ماں کی لاش پڑی ہو اور پاس پڑوس میں ایسا کوئی بھی نہ ہو جو آپ کی آواز سن کر دیکھنے کے لیے آ جائے کہ معاملہ کیا ہے۔ اس لڑکی کا اس وقت کیا عالم ہوگا، یہ تم نہیں جان سکتے۔

مدن موہن نے قہقہہ لگاتے ہوئے خباثت بھری نظروں سے میری طرف دیکھ کر کہا۔ "میں چاہوں تو ابھی تمہیں اٹھا کر لے جاؤں لیکن اب بات انا سے بڑھ گئی ہے، تم میری ضد بن گئی ہو۔ اب میں اس وقت کے لیے تھوڑا سا انتظار کر لوں گا جب تم گھٹنوں کے بل رینگتی ہوئی آؤ گی اور پالتو بلی کی طرح میرے قدموں میں لوٹا کرو گی۔۔۔ میں جب چاہوں گا تمہیں تھپکی دوں گا اور جب چاہوں گا ٹھوکریں ماروں گا۔"

مدن اور اس کے ساتھی بڑے اطمینان سے رخصت ہو گئے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

میں دیر تک امی کا سرد ہاتھ تھامے ان کے سرہانے گم صم بیٹھی رہی۔ اس امید پر کہ شاید یہ کوئی ڈراؤنا خواب ہے، جلد ہی ٹوٹ جائے گا۔۔۔۔۔ لیکن پھر مجھے یقین کرنا ہی پڑا۔۔۔ مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ہمارے علاقے کا تھانہ کس طرف ہے۔ آدھی رات کے قریب میں پوچھتی پاچھتی گرتی پڑتی تھانے پہنچی۔ وہاں پر موجود ہر پولیس والا اپنے اپنے عہدے کے مطابق میرے جسم کے مختلف حصوں تک رسائی کی کوشش کرنے لگا۔ بالآخر میں نے جب انگریزی میں انہیں گالیاں دیں تو وہ کچھ پیچھے ہٹے۔۔۔۔ پھر ایس ایچ او نے آ کر ڈانٹ ڈپٹ کر سب کو ان کے کاموں پر لگایا۔۔۔۔ بڑی توجہ اور ہمدردی سے میری کہانی سنی۔

میرے حواس معطل اور اعصاب منتشر تھے لیکن جیسے بھی مجھ سے بن پڑا، میں نے مدن موہن کے متعلق سب کچھ تفصیل سے بتانے کی کوشش کی، اس نے مجھے بڑی تسلیاں دیں۔ مجھے انصاف بہم پہنچانے کا وعدہ کیا۔ اس قسم کے کئی ڈائیلاگ بھی بولے جو ہندوستانی فلموں میں عموماً بولے جاتے ہیں۔ قانون کی بالادستی، مظلوم کی دادرسی اور اس قسم کی دوسری باتیں۔ محض بکواس۔۔۔۔

پولیس آ کر میری امی کی لاش لے گئی۔۔۔۔ دوسرے روز پوسٹ مارٹم کے بعد لاش ملی اور تقریباً لاوارثوں کے سے انداز میں دفن کر دی گئی۔ کالج سے میں فارغ ہو چکی تھی۔ کلاس فیلوز سب ادھر ادھر بکھر چکے تھے۔

میں تمہیں مختصراً سب کچھ بتا رہی ہوں۔۔۔ تھانے کچہری کے ذریعے مدن موہن کا کچھ نہیں بگڑا۔۔۔ میں اپنے آپ کو بے حد غیر معمولی لڑکی سمجھتی تھی لیکن ان حالات میں سارا

غیر معمولی پن دھرا رہ گیا تھا۔ بالآخر میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے اس شہر سے کہیں چلے جانا چاہیے' چپ چاپ نکل لینا چاہیے۔ یہاں زندگی میرے لیے حرام کر دی گئی تھی۔ یہ بات طے تھی کہ میرے لیے حالات اس سے برے ہی ہو سکتے تھے' اچھے نہیں۔۔۔چنانچہ میں نے بمبئی آنے کا فیصلہ کر لیا۔ دل میں ایک موہوم سی امید یہ بھی تھی کہ شاید یہاں کہیں زندگی کے موڑ پر تم سے بھی سامنا ہو جائے۔

اس نے اداس سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں کی یاسیت کچھ اور بڑھ گئی۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ "راجہ نامی ایک پراپرٹی ڈیلر نے مجھے تنہا و لاوارث دیکھ کر مکان بھی چند ہزار میں مجھ سے ہتھیا لیا۔ اس نے مجھے ایسے چکر دیئے کہ میں چند ہزار کی رقم ہی قبول کرنے پر تیار ہو گئی۔ میں نے کوٹھی کی چابی راجہ صاحب کے حوالے کی اور ٹیکسی کر کے سٹیشن پہنچ گئی۔۔۔۔ میں ابھی پلیٹ فارم پر قلی کی تلاش میں نظریں دوڑا رہی تھی کہ ایک شخص جانے کس سمت سے مجھ سے آ ٹکرایا۔ میں نے صرف اس کا ہاتھ حرکت میں آتے دیکھا جس میں شیشے کا کوئی برتن سا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ شخص ہجوم میں غائب ہو گیا۔ مجھے یہی محسوس ہوا تھا جیسے کسی نے میرے چہرے پر انگارے پھینک دیئے ہیں جو وہیں چپک کر رہ گئے ہیں۔

میرے حلق سے شاید اذیت بھری چیخیں نکل رہی تھیں اور میں پلیٹ فارم پر گر کر ایڑیاں رگڑنے لگی تھی۔ میری آنکھیں بند تھیں' مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ درحقیقت ہوا کیا ہے۔ بس اذیت کا ایک احساس تھا' میں نے اپنے اردگرد لوگوں کے دوڑنے بھاگنے کی آوازیں سنیں لیکن جلد ہی میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔ ماہتاب نے ایک بار پھر خاموش ہو کر خلا میں گھورا گویا اس وقت کے تصور سے اس کی قوت گویائی سلب ہو گئی ہو۔

"مجھے ہوش آیا تو۔۔۔۔" اس نے میری منتظر نگاہوں کو محسوس کرتے ہوئے ایک بار پھر بولنا شروع کیا۔ "میرے چہرے پر برستی ہوئی آگ ٹھنڈی پڑ چکی تھی اور گردن تک چہرہ پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا' صرف آنکھوں پر پٹیوں کے درمیان ایک موٹی لکیر جتنا خلا تھا جس سے میں اپنے گرد و پیش کا منظر دیکھ سکتی تھی۔ سب سے پہلے تو اس احساس سے میری روح کو طمانیت ہوئی کہ میں دیکھ سکتی تھی' میری بینائی محفوظ تھی ورنہ جب میں ریلوے پلیٹ فارم پر گری تھی تو مجھے یہی محسوس ہوا تھا کہ میری بینائی بھی جا چکی ہے۔

ارد گرد دیکھنے پر احساس ہوا کہ میں کسی ہسپتال میں تھی۔ جلد ہی ایک لیڈی ڈاکٹر مجھے دیکھنے آئی۔ اس نے میرے اشاراتی استفسار پر بتایا کہ کسی نے میرے چہرے پر تیزاب پھینک دیا تھا۔ میری آنکھیں معجزانہ طور پر محفوظ رہی تھیں' لوگوں نے مجھے ریلوے کے بعض کارکنوں کی مدد سے ریلوے ہسپتال پہنچا دیا تھا کیونکہ اس وقت قریب وہی تھا۔

میں نے اشاروں ہی اشاروں میں اپنے سامان کے متعلق پوچھا تو پتا چلا کہ میرے قریب صرف ایک سوٹ کیس پایا گیا تھا جو اس وقت پولیس کی تحویل میں ہے۔ بیگ کا کسی کو کچھ پتا نہیں تھا۔ مجھے اپنی آخری پونجی لٹ جانے کا کوئی خاص دکھ نہیں ہوا' شاید بربادی اور مسلسل تباہی کے راستے پر ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جب ہر صعوبت ہیچ ہو کر رہ جاتی ہے یا پھر شاید انسان کا احساس ہی مر جاتا ہے۔

شام کو ایک اے ایس آئی میرا بیان لینے آیا تاکہ ایف آئی آر درج کی جا سکے لیکن لیڈی ڈاکٹر نے اسے بتایا کہ فی الحال میں بولنے سے قاصر ہوں اور ابھی میرے منہ پر پٹی ڈھیلی نہیں کی جا سکتی۔ میں نے اشارے سے اے ایس آئی سے کاغذ اور قلم مانگا اور اسے ایک رقعہ لکھ کر دیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ مجھے کچھ اندازہ نہیں کہ کس نے میرے چہرے پر تیزاب پھینکا اور کیوں پھینکا۔ میں تو ایک کام کے سلسلے میں چند دن کے لیے بمبئی جا رہی تھی۔

میں نے اس سے رقم اور قیمتی اشیاء سے بھرے ہوئے بیگ کے متعلق بھی کچھ نہیں پوچھا بلکہ میں نے تو اس سوٹ کیس کے سلسلے میں بھی کوئی سوال نہیں کیا جو اس کی تحویل میں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے چہرے پر تیزاب پھینکنے والا شخص ملک موہن کے کارندے کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ جھنجلاہٹ میں اس نے آخری قدم اٹھایا تھا اور مجھے موت سے زیادہ بھیانک سزا دی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ جس وقت میں پونا کو الوداع کہنے کی تیاریاں کرتی پھر رہی تھی' اس کا کوئی نہ کوئی کارندہ مجھ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

اب ان سب باتوں کو دہرانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا' خصوصاً پولیس کے سامنے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ دولت اور طاقت کے قانون کے سامنے پولیس اور عدالتیں کسی کو کتنا انصاف فراہم کر سکتی ہیں۔

میں ہسپتال میں سولہ دن زیر علاج رہی۔ آخری پٹی کھلنے کے بعد ڈاکٹروں نے مجھے ہمت و استقامت کے موضوع پر ایک اور اخلاقی لیکچر دیا۔ اس کے بعد مجھے آئینہ دکھایا گیا۔ ان کا خیال تھا کہ میں چیخیں مارنے لگوں گی۔ زار و قطار روؤں گی لیکن ایسا نہیں ہوا شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں ذہنی طور پر اس سے بھی کہیں بدتر صدموں کے لیے تیار ہو چکی تھی یا پھر شاید زندگی سے میری دلچسپی ہی ختم ہو گئی تھی۔ صدموں اور نقصانات کا احساس تو انہیں ہوتا ہے جنہیں زندگی کو زندگی کی طرح بسر کرنا ہو۔ مجھے تو اب صرف اتنی سانسیں پوری کرنی تھیں جتنی میرے مقدر میں لکھ دی گئی تھیں۔

آئینے میں اپنا چہرہ۔۔۔۔۔یا یوں کہو کہ اپنی تقدیر کا چہرہ دیکھ کر میں نے اف تک نہ کی۔ برقعے کا انتظام میں نے پہلے ہی کر لیا تھا۔ اس میں لپٹ کر ہسپتال سے رخصت ہو گئی۔ میرا ارادہ اب بھی بمبئی ہی جانے کا تھا' تاہم اس بار میں بس کے ذریعے روانہ ہوئی اور خیریت سے پونا کی حدود سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی۔ شاید اب مجھے ایک ایسا شکار سمجھ کر چھوڑ دیا

گیا تھا جس میں شادی کے لیے کوئی کشش باقی نہیں رہی تھی۔

یہاں بمبئی میں میری ایک شادی شدہ دوست رہتی تھی جو پونا کے کالج میں میرے ساتھ پڑھتی تھی لیکن تعلیم ادھوری چھوڑ کر کم عمری میں بیاہ دی گئی تھی اور تب سے بمبئی ہی میں تھی۔ کبھی کبھار اس سے میرا خطوں کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ اس کا ایڈریس مجھے یاد تھا' بس سے اتر کر میں سیدھی اس کے پاس پہنچی۔

ظاہر ہے اس نے مجھے نہیں پہچانا اور میرے اصرار کے باوجود وہ مجھے ماہتاب تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوئی اور جب میں نے اسے اپنی چند ایک نشانیاں دکھائیں اور چند ایک ایسی باتیں بتائیں جن کا علم صرف مجھے ہی ہو سکتا تھا' تب اس نے مجھے ماہتاب تسلیم تو کر لیا لیکن اس کی رنگت زرد پڑ گئی اور جب میں نے اس سے کہا کہ مجھے چند دن کے لیے پناہ درکار ہے' اس کے بعد میں اپنا کوئی انتظام کر لوں گی تو اس کی رنگت کچھ اور زیادہ زرد پڑ گئی۔ وہ بالکل گم صم سی ہو گئی۔

اسی دوران اس کا شوہر بھی آ گیا۔ میری دوست نے علیحدگی میں جا کر اس سے کچھ مشورہ کیا اور پھر میرے پاس آ کر بولی۔ تم دیکھ رہی ہو' ہمارا فلیٹ کچھ زیادہ بڑا نہیں' بچے بھی سارا دن انہی کمروں میں کھیلتے ہیں۔ اب تم چہرہ ہمیشہ تو چھپا کر نہیں رکھ سکتیں..... ظاہر ہے بچوں کی نظر تو پڑے گی..... اور اس طرح ان کے ذہن پر برے اثرات مرتب ہوں گے..... تم میرا مطلب سمجھ رہی ہو ناں؟ برا مت ماننا..... آج کی رات تو تم یہاں ٹھہرو' صبح میرے میاں لڑکیوں کے ایک بورڈنگ ہاؤس میں تمہارا بندوبست کر دیں گے..... وہاں رہائش ذرا مہنگی ہے لیکن اتنی جلدی کوئی معقول بندوبست نہیں ہو سکتا۔ بہرحال تم گھبرانا نہیں..... اگر روپے پیسے کی کوئی کمی پڑی تو ہم کسی نہ کسی طرح کوئی بندوبست کرنے کی کوشش کریں گے۔

میں نے اسے بتایا کہ سردست پیسے کا مسئلہ نہیں۔ مجھے صرف رہنمائی کی ضرورت ہے۔ بمبئی میرے لیے نیا شہر ہے' مجھے اپنی دوست کے رویے سے کوئی دکھ نہیں ہوا۔ میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ مجھ میں اب دکھ محسوس کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رہی تھی۔ میں اس سے زیادہ ہمدردی کی توقع ہی لے کر نہیں آئی تھی۔

دوسرے دن میں بورڈنگ ہاؤس میں منتقل ہو گئی جہاں رفتہ رفتہ میری مختصر سی پونجی ختم ہونے لگی۔ میں نے اخباروں میں خالی آسامیوں کے اشتہار دیکھ کر دفتروں کے چکر لگانا شروع کر دیے۔ میں نے ایک ایک دن میں چھ چھ انٹرویو دیے لیکن ہر جگہ سے کچھ اس قسم کا جواب ملتا تھا "آپ کی اہلیت اور قابلیت میں تو کوئی شک نہیں مگر....." اس "مگر" سے آگے کچھ نہیں کہا جاتا تھا لیکن میں جانتی تھی کہ کون سے الفاظ ان کے حلق میں گھٹ کر رہ جاتے ہیں۔

کام کی اہمیت بے شک ان کی نظروں میں مسلم تھی لیکن کام کرنے والی ان کے خیال میں کم از کم ایسی تو ہونی چاہیے تھی کہ اگر دفتر کی دلکشی میں اضافہ نہ بھی ہو تو کم از کم کارکن اور آنے والے دیکھ کر خوف تو نہ کھائیں یا پھر دفتر کی میز پر بھی ناک منہ تک برقعے میں لپٹی ہوئی لڑکی کو دیکھ کر تجسس کے مارے اعصابی تناؤ کا شکار نہ ہوں۔

آج میری جیب میں آخری پانچ کا نوٹ رہ گیا تھا۔ بورڈنگ ہاؤس کا ایک ماہ کا کرایہ اور میس کا بل واجب الادا ہے اور میں مصمم ارادہ کر کے آئی تھی کہ اگر آج بھی ملازمت نہ ملی تو میں بس میں بیٹھ کر سیدھی سمندر پر جاؤں گی۔ سیر کے لئے لانچ میں بیٹھوں گی اور گہرے سمندر میں پہنچ کر چھلانگ لگا دوں گی اور وہ بھی اتنی خاموشی سے کہ لانچ چلانے والے کو پتا بھی نہ چل سکے۔ وہ جب چکر لگا کر واپس آئے اور کیبن میں مجھے موجود نہ پائے تو گھبراہٹ اور خوف کے مارے میں زبان بند ہی رکھنے میں عافیت سمجھے۔

تم سے ملاقات کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اب تو میں نے یہ امید بھی دل سے نکال دی تھی کہ بمبئی میں شاید کبھی راہ چلتے تمہاری صورت نظر آ جائے۔ خصوصاً ان حالات میں تم سے سامنا ہونے کا تو میں خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس نے آفس کے در و دیوار پر نظر ڈالتے ہوئے کہا لیکن تم اگر اس وقت مجھے پہچاننے سے قاصر رہتے تو مجھے کوئی دکھ نہ ہوتا اور نہ ہی میں تمہیں اپنے متعلق کچھ بتانے کی کوشش کرتی لیکن یہاں بھی ملازمت نہ ملنے کا مجھے ضرور دکھ ہوتا۔

اس کے دونوں ہاتھ میز پر ٹکے ہوئے تھے اور انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسی ہوئی تھیں۔ میرے ہاتھ غیر ارادی طور پر آگے بڑھے اور میں نے ان شناسا ہاتھوں کو اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا۔ ان کے انداز میں آج بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ چند لمحے تک وہ ایک ٹک میری طرف دیکھتی رہی' میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کی سانسیں بتدریج تیز ہو رہی ہیں اور جسم میں ارتعاش بڑھ رہا ہے۔

پھر جیسے مدت سے باندھا ہوا ضبط کا بند ٹوٹ گیا۔ ایک گھٹی گھٹی سی چیخ کے ساتھ وہ بلک بلک کر رو دی۔ میں نے اسے چپ کرانے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے معلوم تھا کہ تیزاب نے صرف اس کے چہرے کو جلایا ہے لیکن یہ آنسو اگر اس کے سینے ہی میں رکے رہے تو اس کی روح تک کو خاکستر کر دیں گے۔ یکا یک اس نے میز پر سر ٹیک دیا' ہر سسکی کے ساتھ اس کا جسم بری طرح لرز رہا تھا۔

پھر جیسے جذبوں کے آتش فشاں کو دھیرے دھیرے قرار آنے لگا۔ اس کی سسکیاں مدھم پڑنے لگیں اور ان کے درمیان اس نے تھم رکتے ہوئے بچوں کی طرح اٹک اٹک کر کہا۔ "اس بار ہاتھوں کو تھاما ہے تو پہلے کی طرح چھوڑ کر..... زمانے کی بھیڑ میں نہ کھو جانا..... میں تمہاری خاطر لٹ گئی ہوں..... برباد ہو گئی ہوں..... میرے پاس کچھ باقی نہیں بچا..... مجھ سا تہی

دامن خدا کسی کو نہ کرے....."

میں اٹھا اور میز کے گرد چکر کاٹ کر اس کے قریب پہنچا۔ ایک ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا اور دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے میں دیر تک اس کے بالوں میں کنگھی سی کرتا رہا۔ جب وہ بالکل پرسکون ہو چکی تو میں نے اس کا چہرہ اوپر کیا اور اپنے دل میں موجزن محبت کے سمندر کی تمام تر شدتوں کو سینے ہی میں مقید رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے صرف اتنا کہا۔ "اب سب کچھ بھول جاؤ' سارے غم سارے تفکرات' میرے لیے چھوڑ دو... سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں اور آنسوؤں سے پورا چہرہ بھیگا ہوا تھا لیکن اب وہ مسکرانے پر قادر ہو چکی تھی۔ "کیا یہ مسخ شدہ چہرہ بھی ٹھیک ہو جائے گا؟" اس نے انگلی سے اپنے چہرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اور نیم طنزیہ سے انداز میں مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں.....یہ مسخ شدہ چہرہ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے وثوق سے کہا۔

"غالباً تم پلاسٹک سرجری کی بات کر رہے ہو؟" اس نے گویا میری کوئی غلط فہمی دور کرتے ہوئے..... "لیکن جن ڈاکٹروں نے میرا علاج کیا تھا' انہوں نے باتوں باتوں میں مجھے بتا دیا تھا کہ اتنے بگڑے ہوئے چہرے کی درستی پلاسٹک سرجری کے ذریعے بھی ممکن نہیں۔"

"شاید انہوں نے تمہاری مفلسی کو دیکھتے ہوئے تمہیں مزید معلومات بہم پہنچانا غیر ضروری سمجھا ہو۔" میں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ اس کے پیکر سے آج بھی وہی پراسرار سی خوشبو پھوٹ رہی تھی جو کبھی مجھے دور ہی سے اس کی آمد کا پتا دیا کرتی تھی۔

"پلاسٹک سرجری کی ترقی یافتہ شکل کاسمیٹک سرجری ہے۔" میں نے کہا۔ "اس میں وقت اور پیسہ تو بہت لگتا ہے لیکن یوں سمجھو کہ ناممکنات کو ممکن بنا دیا جاتا ہے۔ بری طرح کٹے پھٹے چہرے درست ہو جاتے ہیں' گنجوں کے سر پر بال اگ آتے ہیں اور بوڑھوں کی جھریاں دور ہو جاتی ہیں۔"

"ہندوستان میں تو میں نے اس قسم کی سرجری کا کہیں تذکرہ نہیں سنا۔" ماہتاب نے کہا۔

"میں ہندوستان کی نہیں' انگلینڈ اور امریکہ کی بات کر رہا ہوں۔ انتظامات مکمل ہوتے ہی تمہیں لندن یا نیویارک کی طرف پرواز کرنی ہوگی۔" میں نے کہا

"تم ساتھ نہیں چلو گے کیا؟" اس نے پوچھا۔ اس کی آنکھوں میں زندگی سے دلچسپی لوٹ آئی تھی۔

"نہیں.... میرا اندازہ ہے کہ تمہارے علاج میں شاید چھ ماہ یا اس سے بھی زیادہ عرصہ

لگ جائے۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں تمہیں بھجوانے' وہاں تمہارے قیام اور واپس آنے کے نہایت تسلی بخش انتظامات کر دوں گا تمہیں بس آنکھیں بند کر کے ہدایات پر عمل کرنا ہوگا اور کچھ نہیں۔"

پھر میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "آؤ اب گھر چلیں۔" نیچے آ کر میں نے پارکنگ لاٹ سے گاڑی نکال لی اور ماہتاب کو ساتھ بٹھا کر روانہ ہو گیا۔

میں نے گھر میں نوکروں کی بھیڑ بھاڑ نہیں رکھی تھی۔ محض اس مصلحت کے تحت کہ میں اپنی نجی زندگی کو کم سے کم افراد تک محدود رکھنا چاہتا تھا۔ گھر میں صرف دو نوکر تھے۔ میاں بیوی' دونوں اس قدر محنتی اور مستعد تھے کہ آج تک مجھے کسی تیسرے ملازم کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ ان میں عام نوکروں والے خصائل نہیں پائے جاتے تھے اور میں انہیں تنخواہ بھی عام گھریلو ملازموں کے مقابلے میں چار گنا دیتا تھا۔ میاں کا نام کرمو تھا اور بیوی کا بشیراں۔ کرمو چھ فٹ سے بھی نکلتا ہوا ایک کڑیل نوجوان تھا اور بشیراں بھی خوبصورتی کے اعتبار سے کچھ کم نہ تھی۔

میں اور ماہتاب ہال میں پہنچے تو بشیراں کچن سے اور کرمو ڈرائنگ روم سے آتا دکھائی دیا۔

"میں بہت جلدی میں ہوں۔" میں نے دونوں میاں بیوی کو مخاطب کیا۔ "تم اپنا اپنا کام کرتے رہو۔ مجھے تمہیں صرف یہ بتانا تھا کہ آج سے بی بی اس گھر میں رہیں گی اور تم نے بالکل اسی طرح ان کے آرام کا خیال رکھنا ہے اور حکم ماننا ہے جس طرح میرا..."

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا اور واپس چلے گئے۔ میں نے نچلی منزل کے تمام کمرے ماہتاب کو دکھا دیئے جن میں دو خوابگاہیں تھیں۔ "جہاں تمہارا دل چاہے ڈیرہ ڈال دو۔ جب جی چاہے سو جایا کرو۔ جب جی چاہے اٹھ جایا کرو۔ کسی بھی سلسلے میں وفاشعار بیویوں کی طرح میرا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں.....کیونکہ ابھی تم صرف وفاشعار ہو' بیوی نہیں۔" میں شرارتاً مسکرایا...."اور میں بھی چونکہ صرف وفاشناس ہوں' شوہر نہیں' اس لیے میرا کوئی معمول نہیں.....اکثر میں راتوں کو بہت دیر سے گھر آتا ہوں اور کبھی کبھی تو کئی کئی راتیں آتا ہی نہیں۔"

"کہاں رہتے ہو؟" اس نے فوراً بے ساختہ پوچھا۔

"دیکھا۔۔بیویوں کی طرح سوال شروع کر دیئے ناں.... ادھر آپ نے کسی لڑکی کو گھر سونپا اور ادھر اس نے سوال شروع کیے۔" میں نے اسے چھیڑا۔

"بہت بدمعاش ہو گئے ہو۔" وہ کچھ جھینپ سی گئی۔ "کیا دولت آنے سے بدمعاشی بھی آجاتی ہے؟" اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا' اسے یک بیک جیسے کوئی خیال اداس کر گیا۔ نقاب میں چھپے ہوئے اپنے چہرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "اس صورت

کے ساتھ کیا میں تمہاری بیوی ہونے کا تصور کر سکتی ہوں؟"

"کیوں' کیا ہوا تمہارے چہرے کو؟" میں نے سادگی سے کہا۔ "مجھے تو تمہارا صرف وہی چہرہ نظر آتا ہے جو شروع سے میرے ذہن پر نقش ہے۔ اس چہرے پر اگر تم نے کوئی اور چہرہ سجا لیا ہے تو وہ یقینی عارضی ہوگا۔"

"دل رکھنے میں تمہارا کوئی جواب نہیں۔" وہ مغموم سے انداز میں مسکرائی۔

"میرا کسی بھی معاملے میں کوئی جواب نہیں۔" میں نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ "تم دیکھتی جاؤ۔"

دوسرے روز میں دفتر میں اخبار دیکھ رہا تھا کہ ایک اشتہار دیکھ کر یک لخت نہ جانے کیوں چونکنا ہو کر بیٹھ گیا۔ یہ اشتہار مانی مندر پر پرنس شومبی کے پیلس کی فروخت سے متعلق تھا۔ پرنس کے اسٹیٹ منیجر نے لکھا تھا کہ محل کو خریدنے کی خواہشمند پارٹیاں چاہیں تو پانچ تاریخ تک اس سلسلے میں پرنس شومبی سے ملاقات کر سکتی ہیں۔ مذکورہ تاریخ تک وہ تاج محل ہوٹل کے وی آئی پی سوئٹ میں مقیم ہوں گے۔

اس کا مطلب تھا' پرنس شومبی زندہ تھا۔ چھما کے ہاتھوں مرا نہیں تھا لیکن اس کے زخمی ہونے یا کہیں زیرِعلاج رہنے کی کہانی کسی اخبار میں نہیں آئی تھی۔ اس نے یقیناً اپنی رسوائی کے ڈر سے سارے قصے کو دبا دیا تھا۔

میرے ذہن میں جیسے کچھ چرخیاں سی تیزی سے گھومنے لگی تھیں۔ میں نے انٹرکام کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن پھر رک گیا۔ کچھ دیر مزید سوچنے کے بعد میں نے ڈائریکٹ لائن والے نیلے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا اور تاج محل کا ڈائریکٹ نمبر ڈائل کیا۔ میں نے پرنس شومبی کے سوئٹ سے رابطہ قائم کرنے کے لیے کہا تو آپریٹر نے مودبانہ لہجے میں پوچھا۔ "آپ کی تعریف؟"

"ان سے بس اتنا کہہ دو کہ پیلس کی خریداری کے سلسلے میں ایک پارٹی بات کرنا چاہتی ہے۔" میں نے اپنی آواز بالکل بدلی ہوئی تھی۔

"بہت بہتر....." آپریٹر نے کہا اور فوراً ہی سلسلہ ملا دیا۔ شاید اس معاملے میں اسے خصوصی ہدایات تھیں۔

فون پرنس شومبی نے خود ریسیو کیا اور پہلے میرا تعارف چاہا۔

"آپ کا یہ خادم بہت گمنام سا آدمی ہے۔" میں نے بدستور بدلی ہوئی آواز اور مدھم سے لہجے میں کہا۔ "حالانکہ بہت سے ناموروں کے نام بنانے یا بگاڑنے کی طاقت رکھتا ہے مگر خود آپ کے اس خادم کو اس کے پاس پڑوس میں بھی کوئی اچھی طرح نہیں جانتا۔"

"سیدھے سادے الفاظ میں اپنا تعارف کراؤ اور اختصار سے اپنا مقصد بیان کرو۔" دوسری طرف سے پرنس شومبی نے قدرے بیزاری اور نخوت سے کہا۔

"سیدھے سادے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ آپ کے اس خادم کا تعلق انڈیا کی ایک بہت بڑی نیوز ایجنسی سے ہے جس کا الحاق فرانس پریس اور ویسٹرن ورلڈ نیوز سے بھی ہے۔ مزید سیدھے سادے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا یہ خادم جب کوئی خاص اور چٹ پٹی خبر اپنی ایجنسی کو فراہم کرتا ہے تو ہندوستان کے علاوہ دیگر کئی ممالک کے بڑے بڑے اخبارات بھی اسے نمایاں انداز میں شائع کرتے ہیں۔"

"گویا تم انٹرویو لینا چاہتے ہو؟" پرنس شومبی نے اب قدرے خفیف لہجے میں کہا۔ "لیکن آپریٹر نے تو بتایا تھا کہ تم پیلس کی خریداری کے سلسلے میں....."

"آپریٹر نے ٹھیک ہی بتایا تھا یور ہائی نس!" میں نے قدرے استہزائیہ لہجے میں کہا..... "لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس سے پہلے آپ سے میرا مفصل تعارف ہو جائے..... آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ رپورٹرز بڑی عجیب ہی مخلوق ہوتے ہیں۔ ہوائیں ان کے کانوں میں سرگوشیاں کرتی ہیں اور دور دراز کی خبریں لا سناتی ہیں۔ کسی ضرورت کے تحت بعض اوقات بڑے بڑے بدمعاش بعض قیمتی راز ان کے کانوں میں ڈال جاتے ہیں اور بعض اوقات یہ خود بھی بڑی عجیب عجیب اور ناقابلِ یقین باتوں کا کھوج نکال لیتے ہیں۔"

"میں اب بھی نہیں سمجھا کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔" پرنس نے الجھن زدہ سے لہجے میں کہا۔

"آپ کیسے سمجھ سکتے ہیں جبکہ میں ابھی اصل موضوع پر آیا ہی نہیں۔" میں نے بیٹھی بیٹھی آواز میں بڑے تحمل سے کہا۔ "میں آپ کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ کافی عرصہ پہلے دو بدمعاشوں نے مجھے ایک بڑی دلچسپ کہانی سنائی تھی۔ کہانی کا مرکزی کردار ایک عیاش شہزادہ تھا جو ایک پرائے ملک میں جا کر دولت یا طاقت کے بل پر اپنی من پسند عورتوں اور لڑکیوں کو اپنی ہوس کی تسکین کے لیے حاصل کیا کرتا تھا۔ اس شہزادے کا ایک دلال اتفاق سے ان بدمعاشوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ بدمعاشوں نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا سو کیا لیکن انہیں جانے کیا سوجھی کہ انہوں نے اپنی سوچ کے مطابق ایک نیک کام کی بھی ٹھان لی۔"

میں ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔ دوسری طرف یوں سکوت طاری تھا جیسے پرنس نے سانس بھی روک رکھی ہو۔

"وہ دونوں بدمعاش رات کے اندھیرے میں مانی مندر پہنچے....." میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا..... "شہزادہ جو اپنے دلال کے انتظار میں تھا' ان بدمعاشوں کو اپنے دلال ہی کے نمائندے سمجھ کر ان کے ساتھ کار میں بیٹھ کر چل دیا اور ان بدمعاشوں نے ایک جگہ جھاڑیوں میں لے جا کر شہزادے کے پہلو میں چاقو گھونپ دیا۔ اپنی دانست میں انہوں نے شہزادے کو سزا دی تھی۔ اب یہ شہزادے کی خوش قسمتی تھی کہ وہ زندہ بچ گیا۔ سنا ہے اس کے بعد سے شہزادے کے خاص خاص آدمی جن کو وہ اکثر دعوت شیراز دیا کرتا تھا' بڑے

پریشان ہیں کہ اب شہزادہ نہ تو دلالوں کے ذریعے کسی حسینہ کو بلواتا ہے اور نہ ہی خونخوار قسم کے کرائے کے بدمعاشوں کے ذریعے کسی شریف زادی کو اٹھواتا ہے۔ وہ حیران ہیں کہ شہزادے کو ہوا کیا ہے۔ کیا خیال ہے..... کیوں نہ اخبارات میں یہ دلچسپ قصہ چھاپ کر ان کی الجھن دور کر دی جائے؟ صرف انہی کا نہیں' اس کے پڑھنے سے اور بھی بہتوں کا بھلا ہوگا۔ بہت سوں کے لیے اس میں عبرت کا سامان ہوگا اور بہت سوں کے لیے تفنن طبع کا..... کچھ لوگوں کو یہ جان کر بھی بڑی حیرت ہوگی کہ شہزادے کی دیوزادی بیوی جس کی وجہ سے شہزادے کی شہزادگی قائم ہے' اب شہزادے کو گھونسوں اور لاتوں سے پیٹتی ہے جبکہ پہلے وہ صرف تھپڑوں پر اکتفا کرتی تھی۔"

دوسری طرف چند لمحے کے لیے خاموشی رہی..... پھر شہزادے کی سانسوں کی آواز سنائی دی اور خودکلامی کے لہجے میں بڑبڑایا..... "بلیک میلنگ....." پھر قدرے بلند آواز میں بولا۔ "کیا چاہتے ہو..... روپیہ؟"

"نہیں..... روپے پیسے کی ضرورت ہوتی تو بہت پہلے تم سے رابطہ قائم کیا ہوتا۔" میں نے قدرے حقارت سے کہا۔ "مجھے خود تم سے کچھ نہیں چاہیے۔ میرا ایک محسن ہے جسے شاید اب میرا نام بھی یاد نہ ہو' اب جبکہ تم نے پیلس فروخت کرنے کا ارادہ کر ہی لیا ہے تو میں چاہتا ہوں کہ اسے میرے محسن کے ہاتھ بیچو۔" میں نے کہا لیکن اپنی مطلوبہ قیمت پر نہیں بلکہ جتنی بھی رقم وہ تمہیں فوری طور پر آسانی کے ساتھ ادا کر سکے گا' تم اسے ہی کافی سمجھ کر رکھ لو گے' خواہ دوسری پارٹیوں کی طرف سے تمہیں کتنی ہی رقم کی پیشکش ہو چکی ہو..... سمجھ گئے؟"

وہ چند لمحے خاموش رہا..... پھر بدستور ہموار لہجے میں بولا۔ "سمجھ گیا..... کون ہے تمہارا وہ محسن؟ اور اس سلسلے میں تمہارا اس سے کتنا کمیشن طے ہوا ہے؟"

"غیر ضروری باتوں سے اجتناب برتو تو بہتر ہے۔" میں نے اپنی بدلی ہوئی آواز میں غراہٹ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "ورنہ ہو سکتا ہے کہ میں اپنے محسن کا احسان اتارنے کا ارادہ فی الحال ملتوی کر دوں اور اس کہانی کو ٹائپ کرنے بیٹھ جاؤں جس کے اہم نکات پر مشتمل چند کاغذ کب سے میری میز کی دراز میں دبے پڑے ہیں۔"

"اوکے ..... اوکے....." پرنس نے قدرے بیزاری اور عجلت سے کہا۔ "تم اپنے ان محسن صاحب کو میرے پاس بھیج دو....."

"وہ اتنا گرا پڑا آدمی نہیں ہے کہ تم اس لہجے میں اس کا ذکر کرو۔" میں نے گویا برا مناتے ہوئے کہا..... "اور نہ ہی وہ تم سے ملنے آئے گا' تم خود اس کے پاس جاؤ گے..... فون نمبر میں دے رہا ہوں..... پہلے تم اس سے ملاقات کا وقت طے کرو گے۔" میں نے اسے اپنا ہی فون نمبر دیا' نام بتایا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں اطمینان سے فائلیں وغیرہ دیکھنے لگا۔ چند منٹ بعد ہی میرے نام نیلی فون سیٹ کی گھنٹی بجی جس کا نمبر بورڈ کے توسط سے ملتا تھا۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ میرا اندازہ درست ہی نکلا' کرسٹینا کہہ رہی تھی۔ — "سر!..... پرنس شوبی آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

پرنس کے لہجے میں میری توقع کے عین مطابق نخوت و احساس کی برتری کی جھلک نہیں تھی بلکہ وہ حتی الامکان دوستانہ انداز میں بات کرنے کی کوشش کر رہا تھا حتیٰ کہ اس نے اپنا تعارف بھی کرانے کی کوشش کی۔

میں نے خالص تاجروں والی خوش خلقی سے کہا۔ "ہندوستان میں آپ اتنے بھی گمنام نہیں پرنس! فرمایئے اس خادم گمنام سے آپ نے کیونکر رابطہ قائم کیا؟ کیا ضرورت آن پڑی؟"

"یہ تو ملنے پر ہی بتا سکتا ہوں۔" اس نے کہا۔ "بہرحال آپ چونکہ کاروباری آدمی ہیں' اس لیے اطمینان کی خاطر یہ بتا دوں کہ میں آپ کو کچھ دینے ہی آؤں گا' لینے نہیں۔"

اب ایسا بھی نہیں تھا کہ کاروباری ذہنیت پر اس کے طنز کو میں سمجھ نہ پاتا۔ میں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "دیکھو لینا دراصل ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی مسٹر پرنس!" میں نے کہا۔

"درست کہا آپ نے۔" اس نے فوراً تسلیم کر لیا۔ "تو میں کب آپ کی خدمت میں حاضر ہو سکتا ہوں۔"

"کھانے کے وقت تک اب میں فارغ ہی ہوں۔" میں نے کہا۔ "آپ چاہیں تو کھانا میرے ساتھ ہی کھائیں۔"

"کھانا پھر کبھی سہی۔" پرنس نے کہا۔ "فی الحال صرف کاروباری بات ہوگی۔ میں آدھے گھنٹے بعد حاضر ہو جاؤں؟"

"بصد شوق۔" میں نے کہا۔ پرنس نے خدا حافظ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس کے بعد میں محض دستخط وغیرہ کرنے اور نجی اسٹینو کے ٹائپ کردہ خطوط پڑھنے کا کام کرتا رہا۔ تقریباً پچیس منٹ بعد کرسٹینا اندر آئی۔ پرنس شوبی کو اندر بھیجنے کی میں نے اسے پہلے ہی ہدایت دے رکھی تھی۔

"سر! پرنس شوبی کو تو میں اندر بھیجنے لگی تھی لیکن وہ کہنے لگے کہ ان کے دونوں باڈی گارڈ بھی اندر آئیں گے۔" کرسٹینا نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔ "اس سلسلے میں کیا حکم ہے؟"

"پرنس سے کہو کہ باڈی گارڈز کو باہر ہی چھوڑ دیں۔ ہمارے دفتر میں ان کی جان کو کوئی خطرہ نہیں۔" میں نے کہا۔ "دوسرے میں نجی گفتگو کے دوران باڈی گارڈز وغیرہ کی موجودگی کو پسند نہیں کرتا۔"

چند لمحے بعد پرنس شومی اندر آیا۔ کافی عرصہ پشتر میں نے ماتی مندر پر اس رات اسے زیادہ غور سے نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے باوجود اب دیکھ کر احساس ہوا جیسے اس کی عمر میں کئی برسوں کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اس کے رخساروں کی ہڈیاں کچھ اور ابھر آئی تھیں اور آنکھوں کے گوشوں پر شکنیں سی نمودار ہو چکی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں گلابی ڈورے صاف نظر آرہے تھے۔ خودکار دروازہ اس کے عقب میں بند ہو گیا۔ وہ وہیں کھڑا ایک ٹک مجھے دیکھ رہا تھا لیکن میں مطمئن رہا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اس وقت مجھے قطعاً نہیں پہچان سکتا تھا۔

میں نے اٹھ کر اسے خوش آمدید کہا اور مصافحہ کرنے کے بعد اسے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں سے اضمحلال نمایاں تھا اور لمبی لمبی انگلیوں میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔ اس نے ایک لمبوترے سے منقش اور چپٹے سگار بکس سے ایک موٹا سا سگار نکال کر بے رحمانہ سے انداز میں چوڑے چوڑے دانتوں سے اس کا ایک سرا توڑ کر ردی کی ٹوکری میں تھوکا۔ میں نے تیتل لائٹر اٹھا کر لمبی چوڑی میز پر کچھ آگے جھک کر اس کے سگار کو شعلہ دکھایا۔

شکریہ ادا کرکے اس نے طویل کش لیا اور دھوئیں کے مرغولوں کے عقب سے پرخیال نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ میں نے بھی بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اپنی اصل آواز میں کہا۔ "میرے لیے آپ کی آمد نہایت غیر متوقع ہے۔ کیا اب آپ میرا تجسس دور کرنا پسند فرمائیں گے؟"

وہ اب بھی خاموش رہا جیسے گفتگو کے لیے موزوں الفاظ منتخب کر رہا ہو۔ پھر غالباً اپنی دانست میں اس نے نہایت موثر کن انداز میں گفتگو شروع کرتے ہوئے کہا۔ "آج کا دور احسان فراموشی کا ہے لیکن آپ بڑے خوش قسمت ہیں کہ آپ کے احسان کو کسی نے یاد رکھا ہے۔" پھر اس نے ایک لمحہ توقف کرکے ڈرامائی انداز میں پوچھا۔ "کسی نیوز ایجنسی میں آپ کا کوئی دوست رپورٹر ہے؟"

"مجھے تو یاد نہیں پڑتا کہ میرا کوئی دوست اس قسم کے پیشے سے بھی تعلق رکھتا ہے۔" میں نے بظاہر ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا حالانکہ اس وقت مجھے ہنسی آرہی تھی۔

"دوست نہیں ملاقاتی ہی ہوگا جس پر آپ نے کبھی کوئی احسان کیا ہوگا۔" اس نے کہا۔

"ملاقاتیوں کے نام تو مجھے یاد بھی نہیں رہتے اور نہ ہی میں کسی پر احسان کرکے یاد رکھتا ہوں۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ مجھے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرنا پڑے گا۔" اچانک اس کے لہجے میں تلخی در آئی۔

"اس رپورٹر کا پتا چلانے کے سلسلے میں۔ جس کے ساتھ ملی بھگت کے ذریعے تم مجھے بلیک میل کرکے میرا پیلس سستے داموں مجھ سے ہتھیانے کی کوشش کر رہے ہو۔" وہ سانپ کی طرح پھنکار اٹھا۔

"آپ تشریف لے جا سکتے ہیں مسٹر پرنس!" میں نے سکون سے کہا۔ "پہلے آپ شوق سے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر آئیں اس کے بعد آکر مجھے بتا دیجیے گا کہ بات کیا ہے؟ مجھے ابھی تک یہی معلوم نہیں کہ آپ کس رپورٹر، کس پیلس اور کس ملی بھگت کی بات کر رہے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں اس طرح توہین آمیز انداز میں گفتگو کرنے والوں کو اٹھوا کر دفتر سے باہر پھنکوا دیا کرتا ہوں اور یہ تحقیق بعد میں کرتا ہوں کہ وہ پرنس ہیں یا شہنشاہ..... اور جہاں تک اثر و رسوخ کا تعلق ہے تو اس ملک میں چھوٹے موٹے شہزادوں کی صرف عزت ہوتی ہے، اثر و رسوخ نہیں۔ اثر و رسوخ یہاں صرف تاجر کا ہے جو سب سے زیادہ ٹیکس ادا کرتا ہے اور میں صرف تاجر ہی نہیں ایوان صنعت و تجارت کا جنرل سیکرٹری بھی ہوں جس کے ارکان کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے زیادہ ہے جو صرف بمبئی ہی کی نہیں ہندوستان کے اور بھی کئی علاقوں کی معیشت کو چلا رہے ہیں جو میرے ایک اشارے پر اپنی اپنی صنعتوں کا پہیہ جام کرکے تم جیسے شہزادوں کا منہ کالا کرکے..... جو اتفاق سے پہلے ہی کالا ہے، ملک بدر کروانے کا مطالبہ کر سکتے ہیں..... سمجھے؟ اس لیے بہتر ہے کہ جو بات کرنی ہے سیاق و سباق کے ساتھ کرو۔ دھمکیاں دینا تمہارے حق میں نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔"

www.paksociety.com

[illegible]

[illegible]

پرنس چند لمحے تک مخملیں پوشش والی کرسی کے ہتھوں پر سختی سے ہاتھ جمائے گھورتا رہا۔ اس کے نتھنے تیزی سے پھول پچک رہے تھے۔ میں بھی پلکیں جھپکائے بغیر اس کی طرف دیکھتا رہا۔ دفعتاً اس نے مکارانہ انداز میں ہنس دیا۔

"پرنس خوشی سے بلیک میل ہونا نہیں سیکھا۔" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اور اتفاق سے میری عادت بھی یہی ہے کہ میں طاقت پہلے استعمال کرتا ہوں نتائج پر غور بعد میں۔" کہنے کو میں یہ بھی کر سکتا ہوں کہ اپنے باڈی گارڈز کو اندر بلاؤں اور انہیں محض ایک اشارہ کر دوں۔ وہ اسی کرسی پر تمہارا جسم چھلنی کر کے رکھ دیں گے۔ کمانی ہم یہاں سے جانے کے بعد اطمینان سے گھڑ لیں گے۔ زیادہ سے زیادہ اگر ہوا تو یہی ہوگا کہ میرے باڈی گارڈز کو چند ماہ کی سزا ہو جائے گی کیونکہ میرے لیے یہ ثابت کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہوگا کہ کاروباری گفتگو کے دوران مشتعل ہو کر تم نے لفافے کھولنے والی چھری سے مجھ پر حملہ کر دیا تھا۔ چھری کا ذکر مجھے اس لیے کرنا پڑے گا کہ ریوالور تم جیسے سیٹھ اپنے پاس رکھتے نہیں کیونکہ چلانے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔

"اللہ رے خوش فہمی۔" میں نے زیرِ لب اردو میں کہا۔ پھر قدرے بلند آواز میں کہا۔ "یہ بھی تو ممکن ہے کہ اس کمرے میں کہیں ایسے آلات چھپے ہوں جن سے تمہاری گفتگو کسی اور کمرے میں ریکارڈ ہو رہی ہو۔"

ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں سراسیمگی کی سی جھلک آئی لیکن فوراً ہی وہ سنبھل گیا۔ "بلیک میلروں کے یہی تو انداز ہوتے ہیں۔ میں تم سے یہی پوچھنے آیا ہوں کہ مجھے اس رپورٹر کا نام و پتہ بتاؤ جس نے مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کی ہے...... بلکہ مجھے تو یقین ہے کہ تمہارے ہی توسط سے میں ان دو بدمعاشوں تک بھی پہنچ سکتا ہوں جنہوں نے مالتی مندر میں میرے طیارے کے قریب مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا اور میرے دو لاکھ پاؤنڈ چھین کر بھاگ گئے تھے۔ مجھے اب احساس ہو رہا ہے کہ تم، وہ بلیک میلر رپورٹر اور وہ دونوں بدمعاش، تم سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہو...... یہ بزنس...... یہ آفس، سب اصل میں آڑ ہیں جس کے پیچھے تم لوگ مل جل کر بڑی بڑی وارداتیں کرتے ہو۔ بڑے بڑے ہاتھ مارتے ہو۔"

"مالتی مندر میں آپ پر یہ قاتلانہ حملہ اور دو لاکھ پاؤنڈ چھینے جانے کا واقعہ کب پیش آیا تھا پرنس؟" دفعتاً میں نے نرمی سے پوچھا۔

"سال ہو چلا ہے۔" اس نے بے ساختہ جواب دیا۔

"آپ نے اس کی رپورٹ تو درج کرائی ہوگی۔ پولیس نے کارروائی نہیں کی؟" میں نے نہایت سادگی سے پوچھا۔

"رپورٹ؟" وہ ایک بار پھر گڑبڑا گیا لیکن نہایت شاطر انسان تھا، اس لیے اس مرتبہ بھی سنبھل گیا۔ اس قسم کی چھوٹی موٹی باتوں کو منظرِ عام پر لا کر میں سکینڈل بنوانا پسند نہیں کرتا۔ مجھے امید تھی کہ ایک نہ ایک روز میں اپنے ان حقیر دشمنوں کو خود ہی ڈھونڈ نکالوں گا۔ میرا اندازہ درست ہی تھا۔ بالآخر مجھے ان کا سراغ مل ہی گیا یعنی تم! اب تم مجھے بتاؤ گے مسٹر منصور کہ وہ کون تھے؟ اگر تم نے میری بات کا جواب نہ دیا تو تمہیں سزا دینے کے لیے میں اب اپنے باڈی گارڈز کو بھی زحمت نہیں دوں گا کیونکہ وہ ویسے ہی ضرورت پڑنے پر ہر الزام سر لینے کو تیار رہتے ہیں۔ اب تم زبان کھول دو۔" اس نے کوٹ کی اندرونی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا جہاں میں بغلی ہولسٹر کی موجودگی کے آثار پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔

میرے خیال میں خالص کاروباری آدمی بنے رہنا اب کوئی زیادہ ضروری نہیں تھا کیونکہ اب وہ شہزادگی کو بالائے طاق رکھ کر تیسرے درجے کا بدمعاش نظر آنے لگا تھا۔

"مسٹر پرنس! میں نے یک لخت اپنا لہجہ بدلتے ہوئے انتہائی سرد اور سفاک آواز میں کہا۔" ہولسٹر تک ہاتھ لے جانے سے پہلے ایک نظر میز کے نیچے دیکھ لیجیے۔ اس مشورے پر عمل نہ کرنے سے آپ کی زندگی ضائع بھی ہو سکتی ہے۔"

آخری لفظوں میں ایسا اثر تھا کہ نہ صرف ہولسٹر کی طرف بڑھتا ہوا اس کا ہاتھ مشینی انداز میں رک گیا بلکہ اضطراری طور پر اس نے کرسی بھی کچھ پیچھے کھسکائی تاکہ آسانی سے جھک کر میز کے نیچے دیکھ سکے۔ نیچے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور وہ یک لخت سیدھا ہو کر کرسی پر یوں ساکت بیٹھ گیا جیسے تصویر کھنچوا رہا ہو۔ حالانکہ میز کے نیچے کوئی ایسی زیادہ ڈراؤنی چیز بھی نہیں تھی کہ اس کے اوسان یوں خطا ہو جاتے۔

میز کے تختے کے نچلی طرف صرف ایک ہلکی سب مشین گن فٹ تھی جو نیم دائرے میں اس طرح خاموشی، تسلسل اور قدرے تیز رفتاری سے حرکت کر رہی تھی جیسے کسی بہت بڑے ڈائل پر بہت بڑی سیکنڈ کی سوئی حرکت کر رہی ہو۔ میرے سامنے آفس کا جتنا بھی حصہ تھا، وہ پورا کا پورا اس سب مشین گن کی زد پر آتا تھا۔ میرے مقابل چاروں کرسیوں پر بیٹھے ہوئے افراد تو گن کی نالی سے محض چند انچ کے فاصلے پر ہی ہوتے تھے۔

"اس سے فائرنگ شروع کرنے کے لیے صرف ایک بٹن دبانے کی ضرورت ہوتی ہے۔" میں نے مسرت سے لبریز لہجے میں کہا۔ "جس پر اس وقت میرا ہاتھ ہے لیکن اب ہم

اسلحے' دھمکیوں اور بلیک میلنگ سے ہٹ کر کاروبار کی بات کریں گے' صرف کاروبار کی۔"

کمرے میں چند لمحے سکوت رہا۔ پرنس کی ساری تیزی و طراری ہوا ہو گئی تھی۔ اسے احساس ہو گیا تو کہ وہ محض ایک بیوقوف کے سامنے نہیں بیٹھا تھا۔

"ہاں..... وہ رپورٹر میرا دوست ہے جس طرح میرے اور بہت سے لوگ دوست ہیں۔" میں نے گویا اب اصل گفتگو شروع کی۔ "اور اس کا اصرار ہے کہ میں وہ پیلس آپ سے خرید لوں حالانکہ مجھے اس کو خریدنے کی کوئی اتنی خاص خواہش نہیں لیکن میرے اس دوست کا کہنا ہے کہ وہ مجھے آپ سے وہ پیلس برائے نام قیمت پر دلوا دے گا کیونکہ آپ اس کی بات بہت مانتے ہیں۔"

"ہاں.....؟" اس نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر قدرے سنبھل کر تلخی سے کہا۔ ٹھیک ہی تو کہتا ہے وہ۔ میں اس کی بات بہت مانتا ہوں۔ یہ دوسری بات ہے کہ میں اس کا نام نہیں جانتا' اس کی صورت سے ناآشنا ہوں حتیٰ کہ اس کی آواز بھی میں نے آج پہلی مرتبہ فون پر سنی ہے۔"

"خیر..... یہ آپ کا اور اس کا معاملہ ہے۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔

"کیا تمہیں واقعی اس وجہ کا علم نہیں جس کی بناء پر وہ اتنے وثوق سے یہ بات کہہ رہا ہے؟" پرنس نے متجسس لہجے میں پوچھا۔

"نہیں۔" میں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ "وہ میرا دوست ضرور ہے لیکن اپنے کاروباری راز مجھے نہیں بتاتا۔ وہ بلیک میلر شاید ہو لیکن اسے کچھ عجیب ہی قسم کا بلیک میلر کہا جا سکتا ہے۔ اب یہی دیکھ لیں کہ وہ میرے ایک چھوٹے سے احسان کے بدلے میں آپ کے توسط سے مجھے بہت بڑا فائدہ پہنچانا چاہتا ہے۔ بلیک میلر ایسے کہاں ہوتے ہیں؟"

میں نے اس رپورٹر کا کردار اتنی کامیابی سے تخلیق کیا تھا کہ اب تو خود مجھے بھی محسوس ہونے لگا تھا جیسے واقعی اس کا وجود ہے۔

"اب میں آپ کو سیدھے' صاف اور دو ٹوک انداز میں بتا دوں کہ میں آپ کو اس پیلس کی قیمت زیادہ سے زیادہ دو لاکھ روپے دے سکتا ہوں۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"دو لاکھ؟" پرنس کے پہلو میں جیسے کسی نے چھری گھونپ دی۔ "دو لاکھ روپے تو اس میں بجلی اور ایئر کنڈیشننگ کا بندوبست کرنے میں خرچ ہو گیا تھا۔ آج سے چار سال پہلے اس کی تعمیر اور جزیرے کی آدھی زمین کی قیمت کے ضمن میں میرا ایک کروڑ سے اوپر خرچ ہوا تھا۔ اس وقت دو لاکھ سے زیادہ کے تو اس کے صرف گیٹ ہی ہوں گے۔"

"ہوا کریں۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "میں نے آپ کو وہ قیمت بتا دی جو میں فوراً ادا کر سکتا ہوں۔ آگے آپ کی مرضی..... اور ہاں۔ آپ کو ایک ضروری بات بتا دوں

کہ وہ رپورٹر میرا دوست ضرور ہے لیکن میرے کہنے پر وہ اپنے ارادے نہیں بدلتا۔ اگر وہ پیلس مجھے دلانے کا ارادہ کر چکا ہے تو پھر اسے اس سے باز رکھنا ناممکن ہے حتیٰ کہ میں خود بھی اس کے سامنے انکار نہیں کر سکتا۔"

"دو لاکھ لینے سے تو بہتر ہے کہ میں پیلس تحفتاً آپ کی خدمت میں پیش کر دوں۔" پرنس کے لہجے میں اب شکست خوردگی جھلک آئی تھی۔

"تحفے میں قبول نہیں کرتا۔" میں نے فوراً کہا۔ پرنس متجسس آمیز نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ غالباً اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں۔

"آپ نے پیلس غالباً صرف باہر سے دیکھا ہے۔" چند لمحے بعد وہ بولا۔ اب وہ معذرت اور مودبانہ لہجے میں بات کر رہا تھا۔ "آپ ایسا کریں کہ ایک نظر اسے اندر سے بھی دیکھ لیں' شاید اس کے بعد آپ رقم بڑھانے پر آمادہ ہو جائیں۔"

"رقم بڑھانے کا تو میں کسی بھی صورت میں ارادہ نہیں رکھتا۔" میں نے اس کی امیدوں پر پانی پھیرنے کی کوشش کی۔ "البتہ میں ایک نظر اسے دیکھنا ضرور چاہوں گا۔"

"تو پھر کسی بھی روز تشریف لایئے۔" پرنس نے فوراً کہا۔ اس کے لہجے میں کسی حد تک اب بھی امید کی جھلک تھی۔ "دراصل میں نے انڈیا میں بہت نقصان اٹھایا ہے۔ اب جبکہ میں نے اس ملک سے ناطہ توڑنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو میں چاہتا ہوں کہ آخری مرحلے پر تو لٹ کر نہ جاؤں۔"

"کیا کہا مسٹر پرنس!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یہ ممکن ہے کہ آپ انڈیا کو لوٹ کر سکتے جا رہے ہوں۔"

اس نے گہری نظروں سے میری طرف دیکھا لیکن میں نے ایسا ہی تاثر دیا جیسے یہ بات میں نے مذاق میں کی تھی۔ پھر میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "اتوار کو میں چھٹی کرتا ہوں۔ آئندہ اتوار کو میں آپ کے ہاں آنے کا پروگرام رکھ لیتا ہوں۔"

"بالکل ٹھیک ہے' دوپہر کا کھانا آپ میرے ساتھ کھائیں۔" پرنس نے جلدی سے کہا۔

"کھانے کا آپ تکلف نہ کریں۔" میں نے کہا' ویسے بھی شام ڈھلے آؤں گا۔ اتوار کو دن میں میرا کوئی نہ کوئی تفریحی پروگرام پہلے سے طے ہوتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ ہفتہ بھر انسان ڈٹ کر ذہنی و جسمانی کام کرے تو ایک دن اسے بھرپور آرام اور تفریح کرنی چاہیے۔"

"شکریہ۔" میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "لیکن میرا خیال ہے کہ میری اور آپ کی لغت میں تفریحات کے معنی میں بڑا فرق ہے۔"

"اوہ۔" پرنس نے ہونٹ سکیڑے۔ "تو پھر آپ مجھے اپنی آمد کا وقت بتا دیجئے میں پام ہاؤس پر آپ کے استقبال کے لیے موجود ہوں گا۔"

میں نے چند لمحے غور کیا' پھر اسے سات بجے کا وقت دے دیا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ "اتوار' سات بجے ملاقات طے ہوئی۔ میں فروخت کے سلسلے میں تمام کاغذات تیار رکھوں گا۔ اس شام خواہ کچھ بھی طے پائے' بہرحال ہم سودا مکمل کر کے کاغذات پر دستخط کر دیں گے۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔" میں نے اٹھ کر اس سے مصافحہ کیا اور وہ رخصت ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد دیر تک میرے دل میں گدگدی سی ہوتی رہی۔ ابھی تک قسمت ہر موڑ پر میری مدد کر رہی تھی۔ مجھے مستقبل کے مالتی مندر جیسے دور دراز جزیرے پر واقع پرنس شومبی کے چیلس جیسی ایک عمارت کی سخت ضرورت تھی۔ قدرت نے نہ صرف میری مرضی کے عین مطابق جگہ کا بندوبست کر دیا تھا بلکہ وہ مجھے کوڑیوں کے بھاؤ پڑ رہی تھی۔ میں نے تو ایسے ہی اندھیرے میں ایک تیر پھینکا تھا مگر وہ مجھے نشانے پر بیٹھتا نظر آ رہا تھا۔

دوسرے روز اس ملاقات کے لیے گھر سے نکلتے وقت میں نے گھڑی دیکھی اور نہایت کم رفتار سے ڈرائیو کرتے ہوئے میں ساحل کی طرف روانہ ہو گیا۔ غیر ارادی طور پر میں دھیرے دھیرے سیٹی بھی بجا رہا تھا۔ بظاہر جیسے میں کسی تفریح پر جا رہا تھا لیکن اندر ہی اندر میرے اعصاب کسی انجانی سنسناہٹ سے لمحہ بہ لمحہ چوکنا ہوتے جا رہے تھے۔

فشنگ ہاربر پر پہنچ کر میں نے اس موٹر بوٹ کی تلاش میں نظر دوڑائی جو ہماری کمپنی کے **فشنگ** کے شعبے کی ملکیت تھی۔ اس وقت ہماری **فشنگ** کمپنی کے پاس چار بوٹس تھیں۔ ان میں سے ایک وہی تھی جو کبھی چھما کی ذاتی ملکیت تھی۔ اس وقت مجھے اسی کی تلاش تھی۔

بہت دور ایک مقام پر سورج کا کنارا ڈھل کر گویا سمندر ہی میں اترتا نظر آ رہا تھا۔ بار برداری کی بیشتر کشتیاں واپس آ چکی تھیں اور بہت سی آ رہی تھیں۔ وائٹ شارک مجھے جلد ہی نظر آ گئی۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ میرے پاس دس منٹ فاضل تھے۔ میں وقت سے پہلے مالتی مندر نہیں پہنچنا چاہتا تھا۔ دس منٹ میں نے ڈاک پر ٹہلتے ہوئے گزار دیئے اور ٹھیک سات بجے میں نے بیس منٹ پر وائٹ شارک کی بندش کھول اور اس میں مالتی مندر کی طرف روانہ ہو گیا۔

جزیرے کے آثار نظر آنے تک شام کا دھندلکا گہرا ہو چکا تھا' تاہم ابھی روشنیوں کی اتنی ضرورت نہیں تھی لیکن پرنس شومبی کے بوٹ ہاؤس پر مجھے دور سے ہی کئی بڑی بڑی لائٹیں جلتی نظر آئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ اہتمام اس لیے کیا گیا ہے کہ کہیں میں بھٹک کر کسی اور طرف نہ نکل جاؤں۔

میں بوٹ کو سیدھا بڑی سی سرنگ سے مشابہ بوٹ ہاؤس میں لے گیا۔ بوٹ ہاؤس کا

دروازہ کھلا تھا۔ پرنس شومبی کو میں نے دور ہی سے ساحل پر کھڑے دیکھ لیا۔ اس کے دائیں بائیں دو اور اشخاص بھی مودبانہ انداز میں کھڑے تھے۔ دونوں ہی سوٹوں میں تھے۔ پرنس بھی سوٹ میں تھا لیکن اس کے ساتھ ہیٹ کے بجائے نہ جانے کیوں اس نے ترکی ٹوپی سر پر رکھی ہوئی تھی۔ مسلمان افریقی عموماً یہ انداز اختیار کرتے تھے کہ سوٹ کے ساتھ ترکی ٹوپی پہن لیتے تھے مگر پرنس شومبی **کرسچن** تھا۔

وہ غالباً مجھے ساحل پر اترتے دیکھ کر کچھ اس انداز سے آگے بڑھے جیسے پروٹوکول کے مطابق کسی ملک کے سرکاری مہمان کو ریسیو کرنے آئے ہوں۔ پرنس نے نہایت باوقار انداز میں مجھ سے ہاتھ ملایا اور پھر سے اپنے دائیں طرف کھڑے ہوئے شخص کا تعارف کرایا۔ "مسٹر موگا بے شوٹا۔ میرے پرنسل سیکرٹری۔"

اس شخص نے ضرورت سے زیادہ منہ چوڑا کر کے مسکراتے ہوئے مجھ سے مصافحہ کیا۔ وہ درمیانے قد کا ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا' باریک فریم کی نظر کی عینک لگائے ہوئے تھا۔

"مسٹر طورنے گانا۔ میرے **اسٹیٹ منیجر**۔" پرنس نے بائیں طرف کھڑے ہوئے شخص کا تعارف کرایا۔ یہ گٹھے ہوئے جسم کا ایک دراز قد نوجوان تھا لیکن آنکھوں سے نہایت تجربہ کار اور شاطر معلوم ہوتا تھا۔

میں نے پرنس کے پیچھے جھاڑیوں کے قریب دو اور سیاہ فام نوجوانوں کو کھڑے دیکھا۔ پرنس نے ان کے تعارف کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ وہ دونوں بھی سوٹوں میں ملبوس تھے اور ہاتھ پشت پر کیے کھڑے تھے۔ مجھے ان کے بارے میں اندازہ لگانے میں دقت نہیں ہوئی کہ وہ پرنس کے باڈی گارڈ تھے۔

پرنس نے بوٹ ہاؤس کے اندر اور دور تک سمندر کی سطح پر نظر دوڑاتے ہوئے اپنے لہجے کو سرسری بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "آپ تنہا ہی آئے ہیں؟" اس کے لہجے میں دبی دبی حیرت بھی تھی۔

"جی ہاں۔ کیوں؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔ "کیا مجھے کسی کو ساتھ لانا چاہیے تھا؟"

"نہیں۔ نہیں۔" پرنس نے جلدی سے کہا۔ "میں تو ویسے ہی پوچھ رہا تھا۔ آیئے تشریف لایئے۔" اس نے مجھے ساتھ ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ چند قدم دور نیم پختہ پگڈنڈی پر ایک سیاہ مرسیڈیز اور اس کے پیچھے شیورلیٹ کھڑی تھی۔

میرا خیال تھا کہ بلیس پہنچ کر بھی مجھے پرنس کے ملازم خاصی تعداد میں نظر آئیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔

ہمارا بیس کر لوہے کا اونچا سا گیٹ جس سیاہ فام شخص نے کھولا' اس کا قد کاٹھ اور جسم کی ساخت غیر معمولی تھی۔ وہ بے شمار سلوٹوں والی مصری غلاموں کی سی شلوار اور انہی کے طرز کی مختصر سی واسکٹ پہنے ہوئے تھا جو آگے سے کھلی تھی۔ کمبخت کا جسم گویا آبنوسی

پتھر سے تراشا گیا ایک شاہکار مجسمہ تھا۔ اس کا قد اتنا اونچا اور چھاتی اتنی چوڑی تھی کہ عام قسم کے دروازے تو اس کے گزرنے کے لیے کافی نہیں رہتے تھے۔ ذرا سی حرکت کے ساتھ اس کے بازوؤں کی مچھلیاں یوں پھڑکتی تھیں جیسے ابھی جلد پھاڑ کر باہر آجائیں گی۔

نہایت کشادہ ڈرائیو وے میں پرنس نے گاڑی روکی اور اتر کر مصری غلاموں جیسے حلیے والے اس شخص سے اشاروں میں کچھ پوچھا۔ اس نے اشاروں میں چند بے معنی سی آوازوں کے ساتھ کچھ جواب دیا اور تب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ گونگا تھا۔

اس سے بات ختم کر کے پرنس نے گویا مزید وضاحت کے لیے مجھے بتایا۔ "گونگا ہے بے چارہ...... لیکن طاقتور اتنا ہے کہ میرے اور آپ جیسے آدمیوں کو صرف ایک گھونسے میں ہلاک کر سکتا ہے۔" میں مسکرا دیا۔ پرنس نے مجھے بھی اپنے ہی جیسے آدمیوں میں شمار کر لیا تھا۔ "کلہاڑی کے سوا یہ کوئی ہتھیار استعمال کرنا نہیں جانتا لیکن صرف کلہاڑی ہی سے ایک ہاتھی کا سر تن سے جدا کر سکتا ہے اور شیر کو ٹکڑوں میں تقسیم کر سکتا ہے۔ دیکھنے میں یہ انسان ہے لیکن میری نظر میں ایک بڑا نایاب قسم کا حیوان ہے۔"

میں ستائشی انداز میں مسکرا دیا۔

باڈی گارڈز اسٹیٹ منیجر اور سیکرٹری بھی گاڑیوں سے اتر آئے تھے۔ میں نے سرسری نظروں سے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ محل دو منزلہ تھا اور مشرقی و مغربی طرز تعمیر کا ایک خوبصورت امتزاج تھا۔ اس کی بالائی منزل پر سامنے کی طرف مغلیہ طرز کی ایک لمبی سی بالکونی تھی جس کی دیوار درحقیقت ماربل کے خوبصورت' چھوٹے چھوٹے ستونوں کی ایک لمبی قطار تھی۔ محل کی تعمیر میں بے حساب ماربل استعمال ہوا تھا۔ اونچی سی بیرونی چار دیواری پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بڑی بڑی فلڈ لائٹس نصب تھیں۔

چار دیواری کے وسط میں اصل عمارت تھی اور اس کے تین اطراف میں سرسبز لان پھیلا ہوا تھا جس کے ایک حصے میں سوئمنگ پول نظر آ رہا تھا۔ لان پر مجھے دور ایک جگہ پھولدار پودوں کی کیاریوں پر دو مالی کام کرتے نظر آئے۔ انہوں نے کن انکھیوں سے ہماری طرف دیکھا اور دوبارہ کام میں لگ گئے۔ مجھے ان کا کام کرنے کا انداز مصنوعی سا لگا۔

پرنس نے باڈی گارڈز سمیت اپنے چاروں ملازموں کو مخاطب کیا۔ "آپ لوگ اپنے اپنے کمروں میں جائیں' جس کی ضرورت ہوئی' میں اسے بلوا لوں گا۔"

سب نے تعظیماً سر جھکایا اور مختلف سمتوں میں چلتے ہوئے عمارت کے پہلوؤں میں پہنچ کر غائب ہو گئے۔ اس طرف شاید بغلی دروازے تھے۔ باتیں کرتے کرتے ہم مرکزی دروازے سے محل میں داخل ہو چکے تھے اور ایک طویل و عریض لابی سے گزر رہے تھے جس کا ماربل کا پالش شدہ فرش آئینے کی طرح چمک رہا تھا اور ہماری ایڑیوں کی بازگشت یہاں یوں گونج رہی تھی جیسے ہم کسی بڑے سے گنبد کے نیچے چل رہے ہوں۔

"خالباً ہم اپنے اصل مقصد کی طرف تو توجہ ہی نہیں دے رہے۔" شہزادے نے ملامت سے کہا۔ "محض نہ میں آپ کو محل دکھا رہا ہوں اور نہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ ہم دونوں ہی ناک کی سیدھ میں چلے جا رہے ہیں۔ ذرا پیچھے آیئے' دو کمرے ہم پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔"

ہم چند قدم پیچھے آئے۔ لابی کے اختتام پر دونوں گوشوں میں دو کمروں کے دروازے آمنے سامنے نظر آ رہے تھے۔ دونوں کی بیرونی دیوار گولائی میں تھی۔ "یہ نچلی منزل کا ڈرائنگ روم ہے۔" شہزادے نے دائیں ہاتھ والا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ اس نے مجھے اندر چلنے کا اشارہ کیا لیکن میں نے دروازے پر ہی کھڑے ہو کر اندر کا جائزہ لیا۔ کمرہ آراستہ و پیراستہ تھا۔ اس میں اعلیٰ درجے کے ڈرائنگ روم کے تمام لوازمات موجود تھے۔

"پورا محل مرکزی طور پر ایئرکنڈیشنڈ ہے۔ سردیوں میں گرم رکھنے کا بھی بندوبست ہے۔" پرنس نے بتایا۔ اس کا لہجہ اب واقعی اس شخص کا سا ہو گیا تھا جو اپنی کوئی چیز فروخت کرنے لگا ہو اور اس کی خوبیاں گنوا رہا ہو۔

اس نے دوسرے کمرے کا دروازہ کھولا۔ یہ اسٹڈی ہے...... اس میں بھی تمام فرنیچر وغیرہ موجود تھا۔ اس کا جائزہ لینے کے بعد ہم بائیں ہاتھ پر راہداری میں مڑے جہاں فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔

اس راہداری میں آمنے سامنے دو بہت وسیع بیڈ روم تھے جو لوازمات سے ہی نہیں' تعیشات سے بھی سجے ہوئے تھے۔ ہر ایک کی چھت اور دیواروں میں بیسیوں پہلودار آئینے لگے ہوئے تھے۔ ایک گوشے میں بار بھی موجود تھا۔ پرنس نے کمرے کے وسط میں موجود بہت بڑے گول بیڈ کی طرف اشارہ کیا۔ یہ بیڈ اتنا بڑا تھا اور اس کے دبیز گدے پر بچھی ہوئی بے شکن اور بے داغ چمکیلی' جھالردار چادر اس طرح روشنی میں جھلملا رہی تھی کہ اس پر بیڈ کے بجائے مغل پہلوانوں کے رنگ کا گمان گزرتا تھا۔ صرف اس کے گرد رسے تان دیے جاتے تو اس پر کشتی لڑی جا سکتی تھی۔ اس کے عین اوپر چھت میں ایک چھتری سی لٹکی ہوئی تھی۔ یہ دوسرا بیڈ روم تھا جو ہم دیکھ رہے تھے۔

"ان بیڈ رومز کی تمام روشنیاں ریموٹ کنٹرول سے جلتی بجھتی ہیں۔ بستر پر لیٹے ہوئے کوئی سی بھی بتی بجھا دیجئے" پرنس بتا رہا تھا۔ ریموٹ کنٹرول ہی سے چھت میں لٹکی ہوئی یہ ساٹن کی چھتری کھل کر آپ کے بیڈ کو ڈھانپ لیتی ہے اور آپ محسوس کرتے ہیں کہ آپ بادلوں کے دوش پر پرواز کر رہے ہیں۔ چھتری ہٹا دی جائے تو آپ تمام آئینوں میں اپنے آپ کو دیکھ سکتے ہیں۔ بیڈ رومز میں ریموٹ کنٹرول پر تمام انتظامات ابھی صرف فرانس کے کروڑ پتیوں تک ہی محدود ہیں۔ انڈیا میں بڑے سے بڑے سیٹھ کے گھر میں اس طرز کا بیڈ روم نہیں ہو گا۔"

"خیر.... میرے لیے ان آسائشوں میں کوئی خاص کشش نہیں ہے۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔ "اگر مجھے یہاں رہنا ہوتا تو بہت سی چیزیں مجھے یہاں سے ہٹانی پڑتیں۔"

"تو کیا آپ رہنے کے لیے پیلس نہیں خرید رہے؟" پرنس نے حیرت سے پوچھا۔

"جی نہیں۔" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ "میرا بزنس شہر میں ہے اور روزانہ مجھے شہر کے مرکز سے یہاں تک آنے کے لیے ڈیڑھ گھنٹہ اور پھر جانے کے لیے ڈیڑھ گھنٹہ درکار ہوگا۔ کبھی سمندر کا مزاج اچھا ہوتا ہے اور کبھی غیر متوقع طور پر برہم ہو جاتا ہے۔ ایسے موقعوں پر میں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بھی نہیں بیٹھ سکتا۔ یہ جگہ یا تو ریٹائرمنٹ کے بعد رہنے کے لیے مناسب ہے یا پھر آپ جیسے شہزادوں کے لیے موزوں ہے۔"

"تو پھر اسے کس لیے خریدنا چاہتے ہیں؟" پرنس نے پوچھا۔

"ابھی تو مجھے خود بھی معلوم نہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کاروباری لوگوں کی ویسے ہی عادت ہوتی ہے کہ سستے داموں کوئی چیز مل رہی ہو تو لے کر ڈال دیتے ہیں۔ کبھی نہ کبھی کام آجاتی ہے یا پھر اچھا منافع دے جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ میں ریٹائرمنٹ کے بعد یہاں رہنا پسند کروں۔"

پرنس نے صرف ہنکارا بھرنے پر اکتفا کیا۔ اب ہم پیلس کے عقب میں آپہنچے تھے۔ یہاں بھی لالی فی کی طرز کا ایک ہال تھا جس کے وسط میں ایک بہت موٹے ستون کے گرد گولائی میں نفیس قسم کی مخملیں گدوں والے کاؤچ لگے ہوئے تھے۔ بظاہر اس ہال کا کوئی مصرف نظر نہیں آتا تھا۔ یہ ایک طرح کی انتظار گاہ معلوم ہوتی تھی۔

"بالائی منزل بھی بالکل ایسی ہے۔" پرنس نے بتایا۔ "اسے دیکھنے سے بہتر ہوگا کہ پہلے آپ تہہ خانہ دیکھ لیں۔"

تہہ خانے میں داخل ہو کر ہم ایک قدم آگے بڑھے۔ پرنس نے دروازہ کھلا ہی چھوڑ دیا تھا اور ایک لائٹ بھی آن کی تھی۔ اس کے باوجود یہاں روشنی ناکافی تھی۔ اندر قدم رکھتے ہی خنکی زیادہ محسوس ہونے لگی تھی۔ یہاں نمی اس قدر تھی کہ دیواروں پر بوندیں سی چمکتی نظر آرہی تھیں جیسے انہیں پسینہ آگیا ہو۔

"یہاں روشنی کا کوئی معقول انتظام کروانے کے سلسلے میں آج تک توجہ ہی نہیں دے سکا۔" پرنس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "کیونکہ اسے کبھی استعمال کرنے کی کبھی نوبت نہیں آئی' حالانکہ یہ بڑے کام کی جگہ۔"

"یہاں ہے ہی کیا جسے ہم دیکھنے آئے ہیں؟" میں نے کہا۔ "بس یہ ایک سیدھا سادہ تہہ خانہ ہے۔"

"اتنا سیدھا سادہ بھی نہیں ہے۔" پرنس نے کہا۔ "میں ابھی آپ کو دکھاتا ہوں۔" دفعتاً تہہ خانے میں روشنی کچھ اور کم ہو گئی کیونکہ دروازہ ایک زوردار کھٹکے کے ساتھ بند ہو گیا تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھنا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی چند طاقتور بازوؤں نے میرے بازوؤں کو گرفت میں لے کر پشت کی طرف موڑ دو۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ جس پوزیشن میں میرے بازو پہنچ چکے ہیں' میں پوری طاقت بھی صرف کروں تو انہیں چھڑا نہیں سکتا۔ ان پر کم از کم دو طاقتور آدمیوں کی مضبوط گرفت تھی۔ انہوں نے میرے لیے اتنی چھلانگ لگانے کی بھی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔ میں نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔

میرا خیال تھا کہ اب پرنس فلمی ولن کی طرح فاتحانہ قہقہہ بھی لگائے گا مگر وہ خاموش رہا' وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر روشنی کے قریب جا کھڑا ہوا تھا اور پرخیال نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا جیسے کوئی سائنس دان اس چوہے کا جائزہ لے رہا ہو جس پر وہ تجربہ کر چکا ہو یا تجربہ کرنے کا ارادہ کر رہا ہو۔

سامنے اندھیرے گوشے سے دو اور آدمی نکل کر میری طرف بڑھے۔ یہ درمیانے قد کے گٹھے ہوئے سیاہ فام نوجوان تھے' وہ خاموشی سے میرے قریب آئے اور مشاقانہ سے انداز میں میرے لباس پر ہاتھ پھیر کر انہوں نے غالباً اطمینان کیا کہ میرے پاس کوئی ہتھیار موجود نہیں ہے اور غالباً یہی بات انہوں نے اپنی زبان میں پرنس کو بتائی۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" پرنس نے میری طرف دیکھتے ہوئے اپنے مخصوص فرانسیسی لب و لہجے میں انگریزی میں بڑبڑایا۔ "تم یہاں تنہا آئے ہو اور بغیر ہتھیار کے آئے ہو..... یہ ناممکن ہے۔" پھر وہ قدرے جھنجلائے لہجے میں غالباً اپنی مادری زبان میں انہی دونوں نوجوانوں سے کچھ کہنے لگا۔ نوجوانوں نے اب باقاعدہ میری تلاشی لینا شروع کر دی۔ انہوں نے میری ہر جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھا' بغلیں ٹٹولیں۔ ٹانگوں پر ہاتھ مار کر دیکھا' پھر پرنس کی طرف دیکھتے ہوئے بے بسی سے نفی میں سر ہلایا۔

اس دوران میری توجہ انہی کی طرف رہی اور میں اس وقت چونکا' جب عقب سے ایک جھٹکے کے ساتھ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی گئی۔ مجھے احساس ہوا کہ میرے ہاتھوں میں یوں ہتھکڑی لگ جانا میرے حق میں مہلک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔

وہ دونوں آدمی بھی میرے دائیں بائیں آکھڑے ہوئے جنہوں نے میرے بازو پشت پر جکڑ رکھے تھے... تہہ خانے میں گہرا سکوت طاری تھا جیسے وہاں کوئی مقدس فریضہ انجام دیا جا رہا ہو۔ دفعتاً میرے عقب میں بھاری قدموں کی دھپ دھپ سنائی دی۔ میں گردن ذرا سی گھمائے بغیر نہ رہ سکا۔ میرے پیچھے کسی تاریک گوشے سے وہی قوی ہیکل گونگا نکل کر روشنی کی طرف آرہا تھا۔ وہ کندھے پر بہت بڑے اور بھاری پھل کی کلہاڑی اٹھائے ہوئے تھا۔ اتنے چوڑے اور موٹے پھل کی کلہاڑی میں نے آج تک نہیں دیکھی تھی۔

گونگے کے موٹے موٹے بھدے ہونٹوں پر احمقانہ مسکراہٹ تھی لیکن اس میں ایک عجیب سی سفاکی بھی شامل تھی۔ اس کی ابلی ہوئی آنکھوں سے خون کی پیاس جھلک رہی

تھی۔ میری طرف دیکھتے ہوئے اس نے کسی درندے کی طرح ہونٹوں پر زبان پھیری۔

پرنس نے ایک دیوار کے قریب جا کر کوئی سوئچ دبایا اور پورے تہ خانے میں روشنی پھیل گئی۔ اب میں نے دیکھا کہ تہ خانے کا ایک حصہ عجیب و غریب کاٹھ کباڑ سے بھرا ہوا تھا۔ رسے، ہتھوڑے، چھریاں، چھوٹی بڑی کلہاڑیاں۔ لکڑی کا ایک بہت بڑا چوکور ٹھوس ٹکڑا۔ ایک کونے میں زمین میں کموڈ سے مشابہ ایک بہت بڑا پیالہ سا نصب تھا جس کے ساتھ فلش کی ٹنکی کی طرح بڑی ٹنکی بھی منسلک تھی۔ ٹنکی کے ساتھ بڑے ہینڈل والی زنجیر بھی لٹکی ہوئی تھی۔ یہ گوشہ کسی جناتی مخلوق کا باتھ روم معلوم ہوتا تھا جو انسان سے کم از کم دس گنا بڑی ہو سکتی تھی۔

"پرنس!" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "میں ایک بار پھر تمہیں خبردار کر رہا ہوں کہ تم نقصان اٹھاؤ گے۔ ابھی وقت ہے کہ تم مکاری سے مجھ پر قابو پانے کا خیال ترک کر دو تو میں تمہیں معاف کر دوں گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں پھر چاہوں بھی تو تمہیں معاف نہ کر سکوں۔"

"گویا ابھی تمہیں کوئی خوش فہمی باقی ہے؟" پرنس نے قدرے حیرت سے کہا۔ "میں اس مرتبہ کچا کام نہیں کر رہا۔ تم جزیرے پر تنہا آئے ہو اور تمہارے پاس کوئی ہتھیار بھی نہیں، اس کے باوجود تم اتنے پر اعتماد کیوں ہو؟ میں یہ راز جاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"اس میں راز کی کوئی بات نہیں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں چاہوں بھی تو خوفزدہ نہیں ہو سکتا۔ موت میرے لیے ایک سادہ سی حقیقت ہے۔ اس کے تصور سے میں خوفزدہ نہیں ہو سکتا۔ مرنا تو بہرحال سب ہی کو ہے۔ کسی کو گھر کے آرام دہ بستر پر، کسی کو میدان جنگ میں اور کسی کو تم جیسے کمینے دشمنوں کے ہاتھوں سیلن زدہ تہ خانوں میں۔ اس لیے یہ تو کوئی تشویش کی بات نہیں مگر تم سوچ لو کہ اگر اچانک موت تمہارے سامنے آ کھڑی ہوئی تو تم کیا کرو گے؟"

"فی الحال میں محض باتوں سے خوفزدہ ہونے کے موڈ میں نہیں ہوں۔" پرنس نے لاپروائی سے کہا۔ "اور تم جتنی چاہے شیخی بگھار لو۔۔۔ ابھی جب صحیح طور پر موت کو سامنے کھڑا دیکھو گے تو چیخیں مارو گے۔ رحم کی بھیک مانگو گے۔ تم جوان ہو، خوبصورت ہو، صحت مند ہو، تم جیسے نوجوانوں سے مجھے نفرت ہے۔ تمہارے ٹکڑے ہوتے دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہو گی۔" اس نے ایک لمحہ توقف کیا۔ "ویسے اگر تم مجھے اپنے اس رپورٹر دوست کا نام و پتہ بتا دو جسے میرا ایک راز معلوم ہے اور جس نے مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کی تھی تو میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔ تمہارے حصے کی موت اس کی طرف منتقل ہو جائے گی۔ اس کا مقدر بن جائے گی۔"

"ورنہ؟" میں نے پوچھا۔

"ورنہ سیدھا طریقہ ہے۔۔۔ پرانے زمانوں سے استعمال ہوتا آرہا ہے۔" پرنس نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں نے اس میں صرف تھوڑا سا اضافہ کیا ہے، وہ بھی لاش کو ٹھکانے لگانے کے سلسلے میں۔ طریقہ یہ ہوگا کہ یہ چاروں آدمی تمہیں پکڑ کر لکڑی کے اس چبوترے پر جھکائیں گے اور یہ گونگا جس کا نام حباش ہے، کلہاڑی کے ایک ہی وار سے تمہاری گردن اڑا دے گا۔ یہ اتنی طاقت سے وار کرتا ہے کہ ممکن ہے تمہاری گردن تہ خانہ کی دیوار سے جا ٹکرائے۔"

"اس کے بعد یہ اسی چبوترے پر چند منٹ کے اندر اندر تمہارے اعضاء الگ الگ کر کے اس بڑے کموڈ میں ڈالے گا اور ٹنکی کی زنجیر کھینچے گا، دوسرے ہی لمحے تم فلش ہو جاؤ گے۔ جس طرح لوگ باتھ روم میں غلاظت فلش کر دیتے ہیں، اسی طرح یہ تمہارے اس تندرست توانا جسم کے ٹکڑوں کو فلش کر دے گا۔ فرش، کلہاڑی اور چوبی چبوترا دھو ڈالے گا اور یہاں تمہارا نام و نشان تک نہیں رہے گا۔ اس کموڈ کی نکاسی کا بہت بڑا پائپ سمندر میں جا کر کھلتا ہے۔ تمہارے اعضاء سیدھے سمندر میں جائیں گے۔ ان پر سے گوشت مچھلیاں نوچ کر کھا جائیں گی اور ہڈیاں ڈوب جائیں گی اور اگر تم اپنے آپ کو ان مراحل سے محفوظ رکھنا چاہتے ہو تو صرف اتنا کرو کہ مجھے اس رپورٹر کے بارے میں بتا دو تاکہ میں اسے صرف اتنا بتا دوں کہ بڑے لوگوں کو بلیک میل کرنے میں بے شک دولت بھی ہاتھ آتی ہے لیکن کبھی کبھی ایسی غلط جگہ ہاتھ پڑ جاتا ہے کہ زندگی بھر کی کمائی کا حساب برابر ہو جاتا ہے۔"

خدا نہ کرے کہ مجھ پر کبھی ایسا وقت آئے کہ میں اپنے دوستوں کی زندگی کا سودا کر کے اپنی زندگی بچاؤں۔" میں نے کہا۔ "تم اپنا کام شروع کرو۔"

پرنس نے چاروں آدمیوں کو اشارہ کیا۔ وہ میرے کندھوں اور بازوؤں پر گرفت مضبوط کر کے مجھے چوبی چبوترے کی طرف لے چلے۔ اب مجھے اضطراب محسوس ہونے لگا تھا۔ مجھے اگر کوئی اطمینان تھا تو صرف یہ کہ میری ٹانگیں آزاد تھیں۔ جوڈو کے استعمال کے سلسلے میں بعض اوقات ٹانگوں کا آزاد ہونا ہاتھوں کے آزاد ہونے سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

حباش کلہاڑی کندھے پر رکھے میرے آگے آگے چل رہا تھا۔ کلہاڑی کا پھل تیز روشنی میں چمک رہا تھا۔ اونچے سے چوبی چبوترے کے پاس پہنچ کر ان چاروں نے طاقت صرف کر کے مجھے چبوترے پر جھکا دیا۔ میں صرف دکھاوے کے لیے تھوڑی بہت مزاحمت کر رہا تھا۔ میں چاہتا تو ان چاروں کی گرفت سے نکل سکتا تھا لیکن میرا اصل مسئلہ یہ نہیں تھا کہ میں ان کی گرفت سے نکل جاؤں بلکہ میری سب سے بڑی ضرورت یہ تھی کہ کسی طرح اس دیوزاد حباش کے ہاتھوں سے کلہاڑی نکل جائے۔ سب سے زیادہ خطرہ مجھے اس کی گرفت میں کلہاڑی کی موجودگی سے ہی تھا۔

www.paksociety.com

اس مقصد کے لیے میں جان پر کھیل کر ایک داؤ آزمانے جا رہا تھا۔ خطرہ مول لیے بغیر تو ویسے بھی چارہ نہیں تھا۔ چاروں آدمی مجھے چبوترے پر اس عالم میں جھکا چکے تھے کہ میری ناک اور پیشانی چوبی چبوترے کو چھو رہی تھی اور میں چبوترے میں رچی ہوئی لہو کی بو محسوس کر سکتا تھا۔ ویسے تو اسے نہ جانے کتنی مرتبہ کن کن طریقوں سے دھویا گیا ہوگا لیکن لہو کی بو شاید کسی بھی طریقے سے نہیں جاتی یا پھر میری قوت شامہ کو ہی اس کی کوئی خاص پہچان ہو گئی تھی حالانکہ ابھی میں نے اپنی زندگی میں تو وہ خونریزی نہیں دیکھی تھی۔

حباش نے پوزیشن سنبھال لی۔ ماحول پر ہو کا سکوت طاری تھا۔ اس سکوت میں، میں نے "شائیں" کی تیز آواز سنی اور پوری قوت صرف کرتے ہوئے بجلی کی سی تیزی سے اپنا سر چبوترے پر سے ہٹا لیا۔ وہ چاروں آدمی بری طرح لڑکھڑا گئے جنہوں نے مجھے قابو کیا ہوا تھا۔ کلہاڑی ایک زوردار آواز کے ساتھ چوبی چبوترے میں اتنی گہری گڑ گئی کہ فوری طور پر اسے نکالنا حباش کے لیے بھی ممکن نہ رہا۔ اگر کلہاڑی کو میری گردن سے گزرنا پڑتا تو شاید اس کی رفتار میں اتنی تیزی نہ رہتی اور وہ چوبی چبوترے میں اتنی نہ دھنستی البتہ میرا سر یقیناً ایک حقیر گاجر کے سرے کی طرح کٹ کر دور جا گرتا۔

حباش قدرے جھک کر کلہاڑی کو نکالنے کے لیے زور آزمائی کر رہا تھا۔ تب میں نے اس کی پسلیوں پر لات رسید کی۔ جوڈو کی اصطلاح میں یہ "جاپ سوئی" تھی۔ حباش کی ایک دو پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں لیکن وہ الٹ کر گرا اور نہ ہی زیادہ پیچھے ہٹا۔ محض ذرا سا لڑکھڑا کر سنبھل گیا۔ اس کے حلق سے غصیلے سانڈ کی سی ڈکراہٹ خارج ہوئی اور وہ کلہاڑی کا خیال ترک کر کے مجھ پر جھپٹا۔ میں جھکائی دے کر درمیان سے نکل آیا اور وہ بیک وقت ان چاروں آدمیوں کو ساتھ لیتے ہوئے فرش پر ڈھیر ہو گیا جنہوں نے چند لمحے پہلے تک مجھے گرفت میں لے رکھا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ اٹھ سکتا، جیل میں کہیں گولیوں کے دھماکے گونجنے لگے۔ سب اپنی اپنی جگہ ساکت ہو گئے۔ دفعتہ" پرنس کے دو گارڈوں نے ہولسٹروں سے پستول نکالے اور دروازے کی طرف لپکے۔ باقی دو گارڈوں کو حباش کے ہاتھوں نہ جانے کہاں ضرب پہنچ چکی تھی کہ وہ تقریباً دہرے ہو چکے تھے اور بری طرح کراہ رہے تھے۔

"ٹھہرو۔" پرنس نے ان دونوں کو حکم دیا جو ریوالور لیے دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ پرنس سخت تذبذب میں نظر آتا تھا۔ دونوں سیاہ فام گارڈ رک کر پلٹے لیکن اس سے پہلے کہ پرنس انہیں کوئی حکم دے پاتا، تہہ خانے کی بتیاں بجھ گئیں اور گھپ اندھیرا چھا گیا۔ میں فوراً ہی رینگ کر چوبی چبوترے کی آڑ میں چلا گیا۔ تہہ خانے میں گہرا سکوت چھا گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے سب نے سانسیں تک روک لی ہیں۔

اوپر فائرنگ بھی تھم چکی تھی۔ دفعتہ" تہہ خانے کی سیڑھیوں پر دھڑ دھڑ کی آواز آئی۔

پھر کسی نے دروازے کو ٹھوکر ماری اور کہا۔ "ہٹ جاؤ! ہوشیار۔۔۔"

دوسرے ہی لمحے نہایت مضبوط اور موٹا چوبی دروازہ ایک زبردست دھماکے کے ساتھ ٹکڑوں میں تبدیل ہو کر فرش پر آگرا اور تہہ خانے میں بارود کی بو پھیل گئی۔ دروازہ گرینیڈ سے اڑا دیا گیا تھا۔ اسی لمحے تہہ خانے کی بتیاں روشن ہو گئیں اور میں نے چھنا کو بلا خوف و خطر، آندھی طوفان کی طرح اندر آتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں اسٹین گن تھی۔ پرنس کے دونوں گارڈ جنہیں میں نے ریوالور نکال کر دروازے کی طرف لپکتے دیکھا تھا، ابھی تک اپنی جگہ سلامت ہی کھڑے تھے لیکن ان کی عقل گویا خبط ہو کر رہ گئی تھی۔

پھر انہوں نے بے مقصد سے انداز میں ریوالور بلند کرنے کی کوشش کی لیکن چھنا نے بلاتوقف اسٹین گن سے برسٹ مارا۔ ان میں سے ایک کا جسم تو گویا دھڑ پر سے دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ دوسرا ہوا میں کئی فٹ اچھلا اور فرش پر گر کر ساکت ہو گیا۔ دوسرے جو فرش پر ڈھیر ہے تھے، ان میں سے ایک پناہ کی تلاش میں میرے قریب ہی آپہنچا۔ میں نے اس کی کنپٹی پر ٹھوکر رسید کی تو وہ بلبلا کر دور جا گرا۔ دوسرے ہی لمحے اسٹین گن کی گولیاں اسے اور اس کے ساتھی کے علاوہ حباش کو بھی چاٹ گئیں۔

○

[illegible]

[illegible]

چھنا اسٹین گن کا کچھ زیادہ ہی آزادانہ استعمال کر رہا تھا۔ میں نے اسے اتنی خونریزی کی ہدایت نہیں کی تھی لیکن پھر مجھے یاد آیا کہ پرنس میرا کیا حشر کرنے لگا تھا اور اس سے پہلے یہاں نہ جانے کتنے انسانوں کو زمانہ قدیم کے جابر صفت حکمرانوں کے روایتی انداز میں موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ تب میں نے چھنا کو اس سلسلے میں تنبیہہ کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

میں نے چبوترے کی آڑ سے دیکھا... چھنا اسٹین گن تھامے تہہ خانے کے وسط میں تنہا کھڑا تھا اور پرنس شوبیں اس کے سامنے چند قدم کے فاصلے پر فرش پر اوندھا لیٹا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ گدی پر رکھے ہوئے تھے جس کا مطلب تھا کہ وہ کوئی مزاحمت نہ کرنے کا اعلان کر رہا ہے۔ اس کے حلق سے عجیب گھگھیائی ہوئی سی آوازیں نکل رہی تھیں۔

"باس! تم کہاں ہو؟" چھنا نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پکارا۔

میں چبوترے کی آڑ سے نکل آیا۔

"دلدار کہاں ہے چھنا؟" میں نے پوچھا۔

"باس! وہ پرنس کے محافظوں کی لاشیں کار میں ڈال کر سمندر میں پھینکنے جا رہا ہے۔" چھنا نے جواب دیا۔

دلدار یوں تو میری کمپنی میں سپروائزر تھا لیکن درحقیقت میرے جانثار ساتھیوں کے اس دستے میں شامل تھا جو میں اور چھنا مل کر تیار کر رہے تھے۔

ابھی تک میں اور چھنا ایسے صرف دو ساتھی ڈھونڈ پائے تھے۔ ایک کا نام دلدار اور دوسرے کا نام تحسین تھا۔ دلدار تو چوڑا چکلا اور خوبصورت جوان تھا۔ اس کی مضبوطی اس کی جسمانی ساخت سے ہی نمایاں تھی لیکن تحسین چھوٹا رستم تھا۔ بظاہر وہ فاقوں کا مارا کوئی منحنی سا شاعر نظر آتا تھا لیکن اس کے دبلے پتلے جسم میں قدرت نے حیرت انگیز خوبیاں بھر دی تھیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ بنیادی طور پر وہ الیکٹرک انجینئر تھا مگر اب یہ بات شاید اسے خود بھی صرف ضرورت پڑنے پر ہی یاد آتی تھی۔ اس بنیادی ہنر سے قطع نظر خنجر زنی، پیراکی، جمناسٹک، نشانے بازی اور شکار میں استعمال ہونے والے مختلف قسم کے شکنجے تیار کرنے میں اس کا ثانی ملنا مشکل تھا۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ اس قدر دبلا پتلا ہونے کے باوجود وہ کافی طاقتور اور سخت جان تھا۔ آکٹوپس کی طرح اگر کسی کو گرفت میں لے لیتا تو وہ اپنے آپ کو چھڑا نہیں سکتا تھا... اور سخت جان اتنا کہ تین چار دن مسلسل بھوکا رہنے کے باوجود اس کی جسمانی پھرتی اور صلاحیتوں میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔

"لاشیں سمندر میں پھینکوانے کا تو تم نے ناحق تردد کیا۔" میں نے چھنا سے کہا اور جہازی سائز کے کنویں کی طرف اشارہ کیا۔ "لاشیں سمندر میں پہنچانے کا تو یہاں نہایت اعلیٰ انتظام ہے۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے پوچھا۔ "اور تحسین کہاں ہے؟"

"وہ سوئچ بورڈ میں گھپلا کر رہا تھا... آتا ہوگا۔" چھنا نے جواب دیا۔

"اچھا... پرنس کو تو میں سنبھالتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم ان چاروں سیاہ فاموں کی تلاشی لو... ان میں سے کسی کی جیب میں اس ہتھکڑی کی چابی ہوگی جو میرے ہاتھوں کو لگی ہوئی ہے۔"

چھنا چابی کی تلاش میں لاشوں کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ میں نے پرنس کی ٹھوڑی پر ہلکی سی ٹھوکر رسید کی۔ "کیا حال ہے پرنس؟" میں نے پوچھا۔ "تم نے واقعی یقین کر لیا تھا کہ میں تم جیسے کمینے دشمن سے نمٹنے کے لیے بغیر کسی انتظام کے نکل کھڑا ہوں گا؟"

"مجھے مت مارنا... خدا کے لیے..." پرنس نے میری بات پر دھیان دیے بغیر گھگھیاتے ہوئے کہا۔

"تمہیں مارنا ہی تو میں نہیں چاہتا۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "ورنہ پہلی ملاقات پر ہی تمہارا قصہ پاک کر دیتا۔"

چھنا نے ہتھکڑی ایک طرف پھینک دی اور پرخیال نظروں سے پرنس کی طرف دیکھا... وہ بوکھلا کر بولا۔ "اب تم میرے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟"

"سلوک؟" میں نے ملائمت سے کہا اور چھنا کی طرف دیکھا۔ "پرنس کو بتاؤ کہ ہم انہیں ایک معمولی سی زحمت دینا چاہتے ہیں۔" چھنا نے تھیلے سے ٹائپ شدہ عدالتی اور سادہ کاغذات کا ایک پلندا نکال کر پرنس کے سامنے رکھ دیا اور ایک قلم اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ان سب پر دستخط کر دو... باقی کارروائیاں ہمارے وکیل نمٹاتے رہیں گے۔ ان کاغذات پر دستخط کے بعد یہ جزیرہ ہماری کمپنی کے کنسٹرکشن ڈویژن کی ملکیت ہو جائے گا۔"

اس نے فرش سے قلم اٹھایا اور جھک کر تیزی سے کاغذات پر دستخط کرنا شروع کر دیے۔ چھنا اسٹین گن کی نال سے اسے بتاتا جا رہا تھا کہ اسے کہاں دستخط کرنے ہیں۔

"اب...؟" دستخطوں سے فارغ ہو کر اس نے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔

"اب تم زیرو پلر کے... اپنی ضرورت کی چیزیں ایک سوٹ کیس میں ڈال لو... اس کے بعد ہم تمہیں تمہارے ملبوسے تک چھوڑنے چلیں گے۔" میں نے اس کے [illegible]

سے نہ سے متعلق کیں۔ "ایئرپورٹ پر تم نیتش سے ویڈیو کے ذریعے اپنی فلائٹ پلان دو گے اور اپنی ریاست کی طرف پرواز کر جاؤ گے..... اور اگر زندہ رہنا چاہو گے تو کبھی ہندوستان کا رخ نہیں کرو گے۔"

"میں... میں کبھی نہیں آؤں گا..... میرا تو پہلے ہی سے یہی ارادہ تھا..." وہ جلدی سے بولا۔

"اگر تم نے خوامخواہ چالاک بننے کی کوشش نہ کی ہوتی تو تمہیں یہ لاکھ روپیہ بھی مل جاتا اور اتنے ساتھیوں سے ہاتھ بھی نہ دھونے پڑتے۔" میں نے کہا۔

"دراصل..... مجھے اندازہ نہیں تھا..... کہ یہاں اس پائے کے لوگ بھی پائے جاتے ہیں۔" اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

چیس میری مرضی کے مطابق سیٹ ہو چکا تھا اور ماہتاب' ایک گورنس اور ایک باڈی گارڈ کے ساتھ علاج کے لیے لندن جا چکی تھی۔ اب میں سوچ رہا تھا کہ کسی بھی روز ایک دن کے لیے پونا جاؤں۔ اپنے کالج فون کر کے میں نے مدن موہن کے گھر کا ایڈریس معلوم کر لیا تھا۔ میں چاہتا تو چھنا' ابدار یا تحسین میں سے کسی کو بھیج کر بھی مدن موہن کو اسی طرح اٹھوا سکتا تھا جس طرح نوکر کے ہاتھ بازار سے کوئی سودا منگوا لیا جائے۔۔۔ لیکن پھر بھی جانے کیوں یہ کام میں خود کرنا چاہتا تھا۔

پھر ایک روز میں اپنی خوش قسمتی پر خود ہی رشک کیے بغیر نہ رہ سکا۔ میں جس کی تلاش میں اتنے دن سے پونا جانے کا پروگرام بنا رہا تھا' وہ مجھے بمبئی میں ہی نظر آ گیا۔ جس طرح پونا سے آنے کے بعد سے اب تک میری اپنی شکل و شباہت اور رکھ رکھاؤ میں خاصا فرق آ گیا تھا' اسی طرح مدن موہن بھی ظاہری طور پر کافی بدل چکا تھا۔

وہ وقت سے پہلے ہی بڑا پکا پکا سا نظر آنے لگا تھا۔ آنکھوں کے پپوٹے اور جبڑے خاصے بھاری ہو گئے تھے۔ بال اس نے بہت بڑھا رکھے تھے۔ سگریٹ کی جگہ سگار پینا شروع کر دیا تھا۔ بڑی نفیس تراش خراش کا سوٹ پہنے ہوئے تھا اور کوئی معزز کاروباری آدمی نظر آ رہا تھا۔ میں پہلی نظر میں شاید اسے نہ پہچانتا اور اس کے قریب سے گزرتا چلا جاتا۔ مجھے صرف اس کی آواز نے چونکایا حالانکہ وہ بہت دھیمے لہجے میں بات کر رہا تھا اور کچھ اس کی آواز پر خمار کا بھی غلبہ تھا مگر جانے کیوں اس کا لب و لہجہ میری سماعت پر گویا نقش تھا۔

وہ اس وقت نشاط نائٹ کلب کے ریسٹورنٹ ڈور کے ایک طرف سے نکل رہا تھا اور میں دوسری طرف سے اندر جانے لگا تھا۔ ایک امریکی فرم کے دو نمائندوں سے یہاں میری ملاقات طے تھی جس کا وقت ہو چکا تھا۔ میں گھومتے دروازے سے اندر تو چلا گیا لیکن اس وقت میں مدن موہن کو پہچان چکا تھا' اس لیے دوسری طرف سے اس کے پیچھے پیچھے نکل

آیا۔

اس کے ساتھ تیس پینتیس سال کی ایک انتہائی حسین عورت تھی جس کے ماتھے پر تلک چمک رہا تھا۔ وہ کاسنی ساڑھی میں تھی اور اس کا جسم گویا سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ بظاہر وہ سیدھی سادی اور شرمیلی سی عورت نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن میں نے سامنے سے آتے وقت ایک لمحے کے لیے ہی اس کی طرف دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چھپی ہوئی مکاری کا جائزہ لے لیا تھا۔ اب میں اس کے پیچھے چلتے ہوئے اس پر نظر جمائے ہوئے تھا۔ مجھے یقین تھا کہ تعاقب کا شبہ اگر ہوا بھی تو اس عورت ہی کو ہوگا' مدن موہن کو اس کا ہوش نہیں تھا۔ اس کے قدم گو کہ لڑکھڑا نہیں رہے تھے مگر یہ اندازہ لگانا زیادہ مشکل نہیں تھا کہ وہ خاصی پیئے ہوئے ہے۔ اس نے عورت کا بازو تھامنے کے بہانے درحقیقت اس کا سہارا لے رکھا تھا۔

پارکنگ لاٹ میں پہنچ کر وہ سبز رنگ کی ایک چھوٹی سی اسپورٹس کار میں بیٹھ گیا۔ اسٹیئرنگ عورت نے ہی سنبھالا تھا اور وہ اسی کی گاڑی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے قدرے جارحانہ سے انداز میں لیکن نہایت مشاقی سے گاڑی دوسری گاڑیوں کے درمیان سے نکالی۔ اس وقت تک میں بھی اپنی رولز رائس میں بیٹھ چکا تھا۔

سبز اسپورٹس کار سڑک پر پہنچی تو میں نے بھی گاڑی پارکنگ لاٹ سے نکالی اور اس کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ درمیانی فاصلہ میں نے خاصا رکھا تھا کیونکہ ابھی شام کا دھندلکا گہرا نہیں ہوا تھا اور روشنی میں رولز رائس کچھ زیادہ ہی نظر میں آ جاتی تھی۔

چند منٹ کے سفر کے بعد ہی سبز اسپورٹس کار ایک نئی فیشن ایبل سی کالونی میں داخل ہوئی اور چند گلیوں میں چکرانے کے بعد ایک چھوٹے سے خوبصورت بنگلے کے پورچ میں جا رکی۔ اس بنگلے کی دیواروں پر عشق پیچاں کی بیلیں نہایت شاعرانہ انداز میں چڑھی ہوئی تھیں۔ گیٹ کے ستونوں پر صرف بنگلے کا نمبر نظر آتا تھا' کوئی نام نہیں تھا۔ میں آگے گزرتا چلا گیا۔

گلی زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ بنگلے کے آس پاس کہیں رکنا مجھے موزوں نظر نہ آیا لیکن گلی کے نکڑ پر ایک مناسب جگہ نظر آ گئی۔ یہاں درختوں کا ایک چھوٹا سا جھنڈ بھی تھا جس کی وجہ سے تاریکی نسبتاً گہری تھی۔ قریب ہی ایک بنگلہ بھی زیر تعمیر تھا۔ میں نے گاڑی ریورس کی اور درختوں کے نیچے لے جا کر روک دی۔

وہاں گاڑی میں بیٹھے مجھے کافی دیر گزر گئی لیکن مدن کی واپسی کے کوئی آثار نظر نہ آئے بالآخر میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور رینگنے کی سی رفتار سے اس بنگلے کے سامنے سے گزرا۔ بنگلہ یوں سکوت اور تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا جیسے وہاں کوئی ذی روح موجود ہی نہ ہو۔۔ بالائی منزل پر صرف ایک چھوٹی سی کھڑکی میں روشنی نظر آ رہی تھی' وہ بھی شیشوں اور

پودوں کے پیچھے۔ مدن کے نکلنے کے ابھی کوئی آثار نہیں تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس کا رات یہیں بسر کرنے کا ارادہ ہو۔

میں نے دوبارہ گاڑی درختوں کے نیچے لا کھڑی کی۔ ایک گھنٹے کے انتظار کے بعد جبکہ میں مایوس ہو کر بنگلے میں داخل ہو جانے کا ارادہ کر رہا تھا' مدن اچانک ہی مجھے باہر آتا دکھائی دیا۔ وہ عورت یا لڑکی اور اسے گیٹ تک چھوڑنے بھی نہیں آئی تھی اور اس کے پاس کار وغیرہ بھی نہیں تھی۔ وہ جھومتا جھامتا پیدل ہی ایک طرف کو چل پڑا۔ اس کی چال میں اب باقاعدہ لڑکھڑاہٹ تھی۔ بنگلے میں غالباً اس نے اور بھی پی تھی اور شاید اسی چکنی کار اور حسین ساقی کے ہاتھوں سے پی تھی۔

جب وہ دوسری گلی میں مڑ چکا تو میں نے گاڑی کی انجن آن کیں اور اس سے ایک قدم آگے پہنچ کر بریک لگا دیں۔

"ارے.....مدن.....! تم یہاں کیا کرتے پھر رہے ہو؟" نیچے اندھیرے میں' میں نے کھڑکی سے سر نکال کر قدرے بدلی ہوئی آواز میں اسے پکارا۔ وہ ٹھٹکا اور کچھوے کی طرح گردن آگے کر کے مجھے پہچاننے کی کوشش کرنے لگا' حالانکہ وہاں روشنی اس قدر کم تھی اور مدن پر خمار اتنا غالب تھا کہ اس کی یہ کوشش فضول ہی تھی

"ارے بھئی.....پہچانا نہیں.....میں لوٹی ہوں۔" میں نے شگفتہ لہجے میں کہا۔ کالج کے زمانے میں لوٹی' مدن کا کمرا پارٹنر ہوا کرتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آج کل وہ کہاں تھا' بہر حال میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑ دیا تھا۔

"اوہ.....لو.....ٹی!" مدن نے لڑکھڑاتی آواز میں صرف اتنا کہا اور اس سے کہیں زیادہ لڑکھڑاتے قدموں سے میری طرف بڑھا۔ قریب آ کر وہ کھڑکی کے راستے مجھ سے گلے ملنے کی کوشش کرنے لگا لیکن میں نے آہستگی سے اس کے بازو پیچھے کر دیئے۔

"تم.....تم یہاں کہاں.....آج کل.....تو تو امریکہ گیا ہوا تھا۔" اس نے گھوم کر دوسری طرف سے آتے ہوئے کہا۔

"اس پر ہی تو آیا ہوں.....تجھے اطلاع ہی نہیں دے سکا" میں نے اس کے لئے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ دروازہ کھلنے پر چھت کی مدھم سی بتی روشن ہوئی تو اس نے جھجکے جھجکے انداز میں میرے لباس اور کار کا جائزہ لیا۔ اس کی آنکھیں یوں چندھیا رہی تھیں جیسے کمرے میں کوئی بہت ہی تیز روشنی پھیلی ہوئی ہو

"کار تو بڑی شاندار ہے پیارے! کہاں سے مار لایا ہے.....امریکہ سے ہی ساتھ لایا ہے کیا؟" اس نے جملوں کے درمیان ہچکیاں لیتے ہوئے کہا اور میرے برابر سیٹ میں دھنس گیا۔ میں نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر دروازہ بند کر لیا اور کار میں ایک بار پھر اندھیرا پھیل گیا۔ صرف ڈیش بورڈ سے مختلف میٹروں کی نہایت ہی ہلکی سبز سی روشنی میرے

پتھوں اور اس کے ذاکٹنڈ ہاتی پن پر پڑ رہی تھی۔

"یہاں پیدل کہاں دھکے کھا رہے تھے؟" میں نے کار آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"میری گاڑی نشاط کلب میں کھڑی ہے۔" اس نے قدرے سنبھلتے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "یہاں ایک اونچے درجے کی طوائف کے ساتھ آیا تھا۔ پرانی واقف ہے لیکن تمہیں پتا ہی ہے.....یہ کام نکلنے کے بعد نوکر کو بھیج کر ٹیکسی تک منگا کر نہیں دیتیں۔ شکر ہے تم مل گئے.....اس علاقے میں تو دور دور تک ٹیکسی بھی نہیں ملتی....."

ہم اس وقت گلشن میلٹن کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ یہ ایک چوڑی چکلی پر رونق اور روشن سڑک تھی۔ مدن نے کھڑکی کے شیشے سے باہر دیکھتے ہوئے آنکھیں سکیڑیں۔ "تم نشاط کلب کی طرف نہیں جا رہے کیا؟ میں وہاں سے اپنی گاڑی لے لیتا۔"

"بعد میں کسی کو بھیج کر منگا لیں گے.....فی الحال اس عشرت کدے کی طرف چل جو تیرے اس خادم نے دریافت کیا ہے۔" میں نے کہا۔ "وہاں بھی اس قدر حسن و شباب کا ایک چھوٹا سا خزانہ ہمارا منتظر ہے۔"

میں نے جب گاڑی اپنی کوٹھی کے ڈرائیو وے میں موڑی تو برآمدے کے دونوں طرف گلوب روشن تھے۔ میں گاڑی برآمدے کے پیچھے کی طرف لے گیا جہاں روشنی کم تھی۔ مدن نے گاڑی سے اتر کر چندھی چندھی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھا اور مخمور لہجے میں بولا "یہ تو اپنے اڈوں سے بھی کوئی اونچا ہی اڈا معلوم ہوتا ہے.....! تو تو تھوڑے ہی عرصے میں بڑی اونچی چیز بن گیا ہے' اس نے میری کمر پر دھپ رسید کی' پھر حیرت زدہ لہجے میں بولا۔ "اور یہ تیرے جسم کو بھی تو معلوم نہیں کیا ہو گیا ہے.....بالکل پتھر کا ہو گیا ہے.....جدھر ہاتھ مارو' ہاتھ ہی جھنجھنا جاتا ہے.....یار تجھے تو امریکہ کی ہوا بڑی راس آئی ہے۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور اس کا ہاتھ تھام کر بیرونی دروازہ کھول کر جلدی سے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ راہداری میں کرمو تیزی سے آتا دکھائی دیا تھا مگر میں نے دور ہی سے آواز دے کر اسے کہہ دیا کہ وہ اپنا کام کرے' لائٹیں وغیرہ میں خود ہی جلا لوں گا۔

ڈرائنگ روم میں پہنچ کر میں نے بیک وقت ساری لائٹیں آن کر دیں۔ مدن نشے کی وجہ سے پہلے ہی ذرا ذرا سی روشنی میں بھی آنکھیں سکیڑ رہا تھا' اب جیسے اندھا ہی ہو کر رہ گیا۔ ساؤنڈ پروف دروازے کو مقفل کر کے میں عین اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"ارے....." چند لمحے بعد اس نے آنکھیں پٹ پٹاتے ہوئے کہا۔ "تم لوٹی تو نہیں ہو....." پھر جیسے وہ اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا۔ "یہ آنکھیں.....یہ ابرو.....یہ ناک.....تمہارا چہرہ تو کافی حد تک جانا پہچانا لگ رہا ہے.....مطلب یہ ہے انسان ابھی تک زندہ ہے۔ ارے.....تم تو منصور....." باقی الفاظ اس کے حلق ہی میں دم توڑ گئے اور آنکھیں

یوں تکتیں گئیں جیسے اس نے اپنے سامنے کسی عفریت کو دیکھ لیا ہو جس کے بارے میں اس نے صرف قصے کہانیوں میں پڑھا ہو اور جس کے وجود پر اسے کبھی یقین نہ رہا ہو۔

اس کا نشہ یوں یک لخت ہرن ہو گیا تھا جیسے اسے بجلی سے شاک لگا دیا گیا ہو۔ پھر اس نے پھرتی سے کوٹ کی اندرونی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے پاس بغلی ہولسٹر میں ریوالور موجود ہے لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسے نکال پاتا، میں نے اس کے بڑھتے ہاتھ پر چابک رسید کیا۔ وہ ہلکی سی چیخ کے ساتھ دور جا گرا۔ اس کا ہاتھ ایک بار پھر بغل کی طرف بڑھنے ہی لگا تھا کہ میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کی پسلیوں میں ٹھوکر رسید کی۔ بغل کی طرف بڑھتا ہوا اس کا ہاتھ یوں سختی سے پسلیوں پر جم گیا جیسے وہاں خنجر گھونپ دیا گیا ہو۔

میں نے اس کا ہاتھ پسلیوں سے ہٹا کر جوتے تلے دبا لیا اور جھک کر اس کے ہولسٹر سے ریوالور نکال لیا۔ ریوالور اپنی جیب میں رکھ کر میں مدن کو چھوڑ کر ایک طرف ہٹ گیا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی، وہیں پڑا زخمی کتے کی طرح ہانپتا رہا۔

"اٹھو میری جان... مجھ پر حملہ کرو...... بڑی دعاؤں کے بعد تو تم سے ملاقات ہوئی ہے اور تم یوں تھکے ہوئے سور کی طرح لیٹ گئے ہو۔" میں نے ملامت سے کہا۔

"میں تم سے معافی مانگتا ہوں منصور۔" اچانک اس نے لیٹے ہی لیٹے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ "تمہیں تمہارے خدا کا واسطہ مجھے معاف کر دو۔"

"کس بات کی معافی مدن پیارے؟" میں نے پہلے سے بھی زیادہ ملامت سے پوچھا۔

"میں نے تمہارے ساتھ جو بھی زیادتیاں کی ہیں، ان سب کی۔" اس نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

"صرف میرے ساتھ؟" میں نے ہلکی سی حیرت سے پوچھا۔

اس کے چہرے کی زردی کچھ بڑھ گئی۔ "تو کیا جناب سے تمہاری ملاقات ہو چکی......" سرسراتی سی آواز میں وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا، جملہ مکمل نہ کر سکا۔

"ہاں... ماہتاب سے میری ملاقات ہو چکی۔ میں اس کا مسخ شدہ چہرہ دیکھ چکا۔ اس پر جو کچھ بیتی، وہ بھی سن چکا۔ میری ماں بھی مجھ سے اچانک ملاقات کے صدمے کی تاب نہ لا کر مر چکی۔ صرف ایک تمہاری ذات نے، صرف تمہاری خباثتوں نے کتنے انسانوں کو کیسی کیسی ناقابل تلافی تباہیوں سے دوچار کیا ہے... کیا تمہارے خیال میں محض تمہارے معافی مانگنے سے سب زخم بھر جائیں گے مدن؟"

تب اس نے محسوس کر لیا کہ معافی مانگنے سے کچھ نہیں بنے گا۔ موت کے جال میں پھنسے ہوئے درندے کی طرح مایوسی اور دل برداشتگی کی انتہا پر آخری اور بھرپور کوشش کے لیے وہ ساری توانائی مجتمع کر کے اٹھا اور مجھ پر جھپٹا۔ اس نے میری پسلیوں پر گھونسہ

رسید کرنے کی کوشش کی۔ یہ گھونسہ کلائی پر روکتے ہوئے میں نے اس کی کنپٹی پر کراٹے کا نہایت ہلکا سا ہاتھ رسید کیا کہ کہیں وہ مر ہی نہ جائے۔ وہ ایک بار پھر قالین پر جا گرا اور سر کو یوں دائیں بائیں جھٹکنے لگا جیسے بینائی جاتی رہی ہو۔

چند لمحے بعد اس نے دوبارہ اٹھنے کی کوشش کی۔ اس کا چہرہ پسینے میں تر ہو چکا تھا۔ وہ مجھے انسان نہیں، کوئی غلیظ حیوان معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے دیوار گیر الماری سے وہ خاص قسم کا چابک نکال لیا جو نہ جانے کب سے اپنے ایسے ہی کسی موقع کے انتظار میں رہا تھا۔ اس کی دم درحقیقت چمڑے کے ریشوں کو بل دے کر تیار کی گئی تھی اور اگر زور سے ماری جاتی تو گوشت میں اتر سکتی تھی۔

میں نے چابک گھمایا اور دوسرے ہی لمحے شائیں کی آواز کے ساتھ اس کی گردن پر رسید کیا۔ وہ یوں بلبلا کر اٹھ کھڑا ہوا جیسے غلطی سے قالین پر نہیں کانٹوں کی سیج پر گر گیا تھا۔ دوسرا وار میں نے اس کی ٹانگوں پر کیا، وہ ٹانگوں کو پکڑ کر دوہرا ہوتے ہوئے ایک بار پھر قالین پر ڈھیر ہو گیا۔ میں اس کے اوپری دھڑ پر چابک نہیں مار رہا تھا کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ وہاں اس کے دھڑ پر کوٹ کی وجہ سے اسے زیادہ تکلیف دہ ضرب نہیں پہنچے گی۔

"بچاؤ، بچاؤ..." مدن اب باقاعدہ کسی ایسی عورت کی طرح چیخنے لگا تھا جس کی عزت پر حملہ کیا جا رہا ہو۔

"چیخنے کا شوق بھی پورا کر لو میری جان!" میں نے چابک ہوا میں گھماتے ہوئے کہا۔ "تم جیسے مکروہ انسانوں کی آواز کو انہی دیواروں تک محدود رکھنے کا میں نے خاص اہتمام کر رکھا ہے نا۔"

اس بار میں نے چابک اس کے سینے پر ماری جہاں کوٹ کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ وہ تڑپ کر اوندھا ہوا تو میں نے اس کی پنڈلیوں پر وار کیا۔ "چوپایوں کی طرح چاروں ہاتھوں پیروں کے بل چلتے ہوئے اس کونے میں پہنچو مدن!" میں نے کمرے کے اس گوشے کی طرف اشارہ کیا جہاں کوئی فرنیچر وغیرہ نہیں تھا۔

وہ اب ابکائیاں سی لے رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اس کی گردن پر چابک رسید کیا۔ وہ تقریباً سجدے کی سی حالت میں چلا گیا۔ میں نے ایک بار پھر اپنا حکم دہرایا...... اس کی تعمیل کرتے ہوئے چاروں ہاتھوں پیروں کے بل چلتا ہوا کمرے کے گوشے میں پہنچا تو میں نے اسے قالین اٹھانے کا حکم دیا۔ قالین اٹھا کر وہ پیچھے ہٹ گیا تو میں نے سوئچ بورڈ پر ایک سوئچ دبایا جو بجلی کے دیگر سوئچوں سے بالکل مشابہ تھا مگر اسے دبانے کا طریقہ مختلف تھا۔

جہاں سے قالین ہٹا تھا، وہاں فرش میں ایک چوکور خلا نمودار ہو گیا جس میں سیڑھیاں نیچے جاتی دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے ایک اور سوئچ دبایا، سیڑھیوں سے نیچے تک روشنی پھیل گئی۔

"چلو....." میں نے چابک لہراتے ہوئے مدن کو حکم دیا۔ "کسی چوپایوں کی طرح ہی سیڑھیاں اترو۔"

وہ کچھ ہچکچایا تو میں نے اس کی پشت پر پوری قوت سے چابک رسید کیا۔ وہ بلبلا کر خلا کی طرف لپکا اور سرنگ کی سیڑھیوں پر لڑھکتے لڑھکتے بچا۔ ہانپتے ہانپتے وہ چوپایوں کی طرح سیڑھیاں اترنے لگا۔ وہ جو شراب نوشی کے بعد سوٹ میں ملبوس ہوتے ہوئے چوپایوں کی طرح سیڑھیاں اتر رہا تھا عبرت آموز تھا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔

تہ خانے میں پہنچ کر وہ گردن جھکا کر کئی لمحے تک بری طرح ہانپتا رہا، پھر اس نے خوفزدہ نظروں سے اردگرد کا جائزہ لیا۔ یہ ایک چھوٹا سا تہ خانہ تھا جس میں لکڑی کی کچھ سوراخ دار مضبوط پیٹیاں لوہے کی سلاخوں سے بنے ہوئے چند چوکور پنجروں اور کچھ دوسرے ضروری سامان کے علاوہ دیوار گیر الماریاں بھی تھیں۔ یہ بھی میری ضرورت کی چیزوں سے بھری ہوئی تھیں۔

میں نے ایک پنجرہ گھسیٹ کر تہ خانے کے وسط میں رکھا اور چابک جھٹکتے ہوئے مدن کو حکم دیا۔ "اسی طرح چاروں ہاتھوں پیروں کے بل رینگتے ہوئے اس میں داخل ہو جاؤ۔"

"نہیں... نہیں....." وہ دہشت سے پھٹی پھٹی آواز میں چیخ اٹھا۔ "تم کرنا کیا چاہتے ہو؟ مجھے پنجرے میں بند کر کے سمندر میں پھنکواؤ گے؟"

"نہیں میری جان! تمہیں ہلاک کرنا ہوتا تو میں اسی تاریک گلی میں تمہاری گردن توڑ آیا ہوتا۔ تمہارے سینے میں گولی اتار کر آجاتا۔ تمہیں غٹ دے کر یہاں تک نہ لاتا۔" میں نے جواب دیا۔ "موت تو تمہارے گناہوں کی سزا نہیں، وہ تو تم پر ایک احسان عظیم ہوگا اور میں فی الحال تم پر احسان عظیم کرنے کے موڈ میں قطعاً نہیں ہوں۔ تمہیں زندگی سے بڑا پیار ہے نا.....؟ میں تمہیں زندہ رکھوں گا..... بے فکر رہو..... چلو پنجرے میں چلو....."

وہ پھر ہچکچایا، جیسے اس ننگے پنجرے سے فرش پر تڑپ رہا تھا۔ میں نے اس کی پیٹھ پر چابک رسید کیا تو وہ تڑپا لیکن پنجرے کا رخ اس نے اب بھی نہیں کیا۔ کسی بے لگام چوپائے کی طرح ادھر ادھر دوڑنے لگا۔ ایک لمحے میں وہ میرے قریب سے بھی گزرا۔ میں نے اس کے منہ پر ٹھوکر رسید کرنا چاہی لیکن وہ اس کی کنپٹی پر پڑ گئی، وہ دونوں بازو پھیلا کر ہوا میں اچھلا، پھر اوندھے منہ گر کر ساکت ہو گیا۔

چوہے بلی کا کھیل اتنی جلدی ختم ہو جانے پر مجھے افسوس بھی ہوا، تاہم اب چونکہ اس کے جلد ہوش میں آنے کا کوئی امکان نہیں تھا، اس لیے میں نے الماری سے ڈوری اور ٹیپ نکالی، اس کے ہاتھ پشت پر باندھے، ہونٹوں پر چوڑی ٹیپ چپکائی اور اسے تقریباً دوہرا کرتے ہوئے پنجرے میں داخل کیا اور اس کا سلاخوں والا دروازہ بند کر دیا۔

یہ پنجرہ اٹھا کر میں نے لکڑی کی ایک پیٹی میں رکھا جس میں وہ بالکل فٹ آتا تھا۔ پیٹی

میں ہوا کی آمد و رفت کے لیے ننھے ننھے سوراخ موجود تھے۔ پیٹی کو تالا لگانے کے بعد میں نے اسے چینلی سے گھسیٹ کر سیڑھیوں کے قریب رکھا۔ الوداعی نظر تہ خانے پر ڈالی اور اپنا چابک لپیٹ کر کوٹ کی جیب میں پھنساتے ہوئے ہاتھ جھاڑ کر واپس اپنے ڈرائنگ روم میں آگیا۔

چابک الماری میں رکھ کر میں فون کے قریب آبیٹھا اور چھنا کے گھر کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ دوسری طرف ریسیور چھنا نے ہی اٹھایا۔

"یس باس....." میری آواز سنتے ہی اس نے پراشتیاق لہجے میں کہا۔

"ایک پارسل میرے پاس تیار پڑا ہے۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "اسے چرچ کے تہ خانے میں پہنچانا ہے۔"

"ابھی.....؟" اس نے پوچھا۔

"فوری طور پر تو نہیں۔" میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "بہرحال آج رات کسی بھی وقت پہنچ جانا چاہیے۔ میں تو اب کھانا کھا کر سو جاؤں گا، تم کسی بھی وقت آکر لے جانا۔ کرمو دروازہ کھول دے گا اور لیبوری روم میں جانے کا طریقہ تو تمہیں معلوم ہی ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں باس۔" چھنا نے دھیمی آواز میں کہا۔ "اطمینان سے سو جائیں اور سمجھ لیں پارسل پہنچ گیا۔" میں نے فون بند کر دیا۔

دوسرے دن میں شام کو آفس سے فارغ ہو کر ہاتی مندر پہنچا اور سیدھا چرچ کے تہ خانے میں چلا گیا۔ وہ پیٹی ایک طرف کونے میں رکھی تھی جس میں کل میں نے مدن موہن کو بند کیا تھا۔ میں نے پیٹی کا تالا کھولا اور لوہے کا پنجرہ کھینچ کر نکال لیا۔ مدن موہن کسی خوفزدہ لنگور کی طرح دونوں ہاتھوں سے سلاخیں مضبوطی سے پکڑے پنجرے میں اکڑوں بیٹھا تھا۔

اکڑوں بیٹھنے کے علاوہ اس پنجرے میں وہ صرف یہ کر سکتا تھا کہ چوپایوں کی طرح چاروں ہاتھوں پیروں کے بل کھڑا ہو جاتا۔ پنجرے کا سائز ایسا نہیں تھا کہ کوئی آرام دہ پوزیشن اختیار کر سکتا۔ اس کی آنکھیں گویا مستقل طور پر پھیل کر رہ گئی تھیں۔ چہرے پر دہشت تھی، ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ اس کا سوٹ کئی جگہ سے مسک چکا تھا۔ ٹائی ڈھیلی ہو کر مردہ کتے کی دم کی طرح لٹکی ہوئی تھی، بکھرے بالوں نے پیشانی ڈھانپ رکھی تھی۔

ایک ہی رات میں وہ کسی تباہ حال سیارے کی مخلوق بن کر رہ گیا تھا۔ اس مدن موہن کا تو جیسے کہیں نام و نشان نہیں رہا تھا جسے میں جانتا تھا۔ کئی لمحے تک تو وہ ایک ٹک مجھے دیکھتا رہا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر یکلخت ہی اس نے غالباً غیر ارادی طور پر اچھل کر کھڑا ہونے کی کوشش کی لیکن ٹھک سے اس کا سر پنجرے کی سلاخوں سے ٹکرایا

اور وہ کراہ کر پہلے ہی کی طرح آرام سے بیٹھ گیا۔

جب وہ بولا تو اس کی آواز میں بوڑھوں کے مریض سے زیادہ نقاہت تھی۔ "پانی.... دو گھونٹ پانی.... پلا دو...."

"مجھے معلوم تھا تم سب سے پہلے پانی مانگو گے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن درحقیقت تمہیں سنبھلنے کے لیے کسی اور چیز کی ضرورت ہے۔" میں نے جیب سے برانڈی کی ایک چھوٹی اور ایک چپٹی بوتل نکالی۔ "دیکھو میں تمہارے لیے انگلینڈ کی سب سے عمدہ برانڈی لایا ہوں لیکن پلاؤں گا تمہیں قطرہ قطرہ کر کے.... منہ کھولو۔"

اس نے بے تابانہ انداز میں نہ صرف منہ کھولا بلکہ زبان بھی ہانپتے ہوئے کتے کی طرح باہر نکال لی۔ میں نے نہایت احتیاط سے بے رنگ سیال کا ایک قطرہ شیشی کے تنگ راستے سے اس کی زبان پر ٹپکایا اور وہ بری طرح تڑپ کر ایک بار پھر اچھلا اور اس کا سر ایک بار پھر ٹھک کی آواز کے ساتھ پنجرے کی سلاخوں سے ٹکرایا' وہ دوبارہ نہیں اچھلا لیکن تنگ سوراخ میں پھنسے ہوئے چوہے کی طرح اذیت سے تڑپنے لگا۔ اس کے حلق سے عجیب سی چیخیں نکل رہی تھیں۔ کبھی وہ سانپ کی طرح زبان کو باہر نکالتا تھا اور کبھی اندر کر لیتا تھا۔ زبان پر جہاں میں نے قطرہ ٹپکایا تھا وہاں ایک ننھا سا قدرے گہرا داغ پڑ گیا تھا۔

میں نے اطمینان سے شیشی کو ڈھکنا لگایا اور احتیاط سے تہہ خانے کی ایک الماری میں رکھ دیا۔ میں واپس پنجرے کے قریب آیا' مدن موہن اب ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑے سلاخوں سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ گردن بھی ایک طرف کو ڈھلک سی گئی تھی' زبان اب اس نے باہر ہی کو لٹکا لی تھی۔

"کیسی لگی برانڈی مدن موہن؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔ "یہ پوری شیشی میں قطرہ قطرہ کر کے تمہیں استعمال کراؤں گا پیارے! تمہارے لیے یہ بڑا عمدہ ٹانک ثابت ہوگا۔ ایک دم میں تمہیں ساری شیشی استعمال نہیں کرنے دوں گا کیونکہ اس طرح بس تم ایک ہی دن اس کی لذت سے محظوظ ہو سکو گے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم ایک طویل عرصے تک اس کی لذت سے محظوظ ہوتے رہو۔"

مدن موہن ہانپتا رہا اور یوں میری طرف دیکھتا رہا جیسے میری بات سن ہی نہیں رہا تھا' پھر جیسے بمشکل اس کے حلق سے آواز نکلی۔ "یہ.... یہ تیزاب تھا نا؟" اس کی زبان جیسے کچھ تتلا گئی تھی۔

"ہاں.... گندھک کا تیزاب نہایت طاقتور تیزاب۔" میں نے جواب دیا۔ "تمہیں معلوم ہی ہے کہ گندھک انسانی جسم کے لیے خاصا غیر ضروری عنصر ہے۔"

"منصور....!" وہ بدستور ہانپتے ہوئے بولا۔ "اگر تمہیں مجھ سے میری زیادتیوں کا انتقام ہی لینا ہے تو مجھے گولی مار دو' مجھے ہلاک کر دو۔"

"حیرت ہے۔" میں نے کہا۔ "کل تک تو تم موت سے بڑے خوفزدہ تھے۔ آج موت کی فرمائش کر رہے ہو۔"

"مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ تم مجھے بہت زیادہ اذیتیں دے دے کر.... سسکا سسکا کر مارنا چاہتے ہو۔" وہ بدستور توتلی سی زبان میں بولا۔ "اور اس سے یکدم مر جانا بہتر ہے۔"

"اگر تمہیں اتنا اندازہ ہو گیا ہے کہ میں تمہیں بہت زیادہ اذیتیں دے کر اور سسکا سسکا کر مارنا چاہتا ہوں تو تمہیں یہ بھی اندازہ ہو جانا چاہیے تھا کہ میں ارادے کا بہت پکا ہوں اور تمہیں یہ اندازہ بھی لازماً ہو جانا چاہیے تھا کہ میں کوئی ایسا کام نہیں کر سکتا جو تمہارے خیال میں تمہارے لیے بہتر ہو۔" میں نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ "ویسے میں تمہیں ایک بات کا یقین دلا دوں کہ میں تمہیں جان سے کبھی نہیں ماروں گا' تم خود ہی مر گئے تو بات دوسری ہے لیکن تمہیں.... ہلاک کرنا بہرحال میرا مطمع نظر نہیں ہے۔ فی الحال تو اس سبق کا صرف اولین مرحلہ شروع ہوا ہے جو میں نے تمہارے لیے تجویز کیا ہے۔ اس مرحلے میں تم صرف اس امر سے آگاہ ہو سکو گے کہ تیزاب سے جسم کا کوئی حصہ جلنے کی اذیت کیا ہوتی ہے اور احساس بے بسی کسے کہتے ہیں۔ تمہاری زبان پر صرف ایک قطرہ پڑا تو تم نے کٹے ہوئے ڈالر کی طرح پھڑکنا شروع کر دیا۔ تمہیں کچھ اندازہ ہوا کہ ماہتاب کے پورے چہرے پر جب تیزاب پھینکا گیا ہوگا تو اس پر کیا گزری ہوگی؟ رفتہ رفتہ وہ مرحلہ آئے گا جب تم اس امر سے آگاہ ہو سکو گے کہ آج کل ماہتاب جب آئینہ دیکھتی ہوگی تو اس کے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ رفتہ رفتہ تم ان تمام محسوسات سے آشنا ہو جاؤ گے جن سے تمہاری بدولت میں' ماہتاب اور نہ جانے کتنے دوسرے انسان گزر چکے ہوں گے..... اچھا اب میں چلتا ہوں..... آج کا سبق بس اتنا ہی تھا۔"

میں ایڑیوں کے بل گھوما اور تہہ خانے کے دروازے کی طرف چل دیا۔ مدن موہن بری طرح چلانے لگا۔ اس کی آواز پھٹی پھٹی سی تھی اور وہ پنجرے میں اچھلنے کودنے کی کوشش کر رہا تھا مگر یہ سلاخوں سے سر پھوڑنے والی بات تھی۔

"کیا بات ہے؟" میں نے مڑ کر اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"کیا میں.... یہاں.... یونہی بھوکا پیاسا مر جاؤں گا؟" اس نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں.... میں بتا تو چکا ہوں کہ تمہیں مارنا میرا مقصد نہیں ہے' اب کتنی مرتبہ پوچھو گے؟" میں نے بیزاری سے کہا۔

"تو پھر مجھے تھوڑا سا پانی پلا دو نا....؟" اس کے لہجے میں ان گنت التجائیں سمٹ آئی تھیں۔

"اچھا.... ایسا کرو۔" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "تم مجھے اس ایس ایچ او کا نام اور حلیہ وغیرہ بتاؤ؟ جس نے ماہتاب کی ای کے قتل کا کیس بگاڑ کر عدالت میں پیش کیا تھا' یقینی

بات ہے' وہ تمہارا گہرا دوست رہا ہوگا۔"

"وہ اب ترقی پا کر ڈی ایس پی ہو گیا ہے۔" مدن نے بلا تامل کہا۔ "نرمل داس نام ہے اس کا...اب وہ ماہتاب کے علاقے کے تھانے میں نہیں ہوتا' کوتوالی میں بیٹھتا ہے۔ بھاری بھرکم آدمی ہے۔ اس کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ اس کی ناک کی نوک پر موٹا سا مسہ ہے اور...ویسے بھی وہ خاصا معروف آدمی ہے...ذرا سا اتا پتا کرو گے تو تمہیں معلوم ہو جائے گا۔"

مدن موہن کے لہجے سے میں بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا تھا اور وہ دل سے چاہتا تھا کہ میں نرمل داس پر ہاتھ ڈالوں۔ اس کے خیال میں ایک ڈی ایس پی پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش میں میرے اپنے رگڑے جانے کے کافی امکانات تھے۔ درحقیقت میں اس کی اس سوچ پر صرف مسکرا ہی سکتا تھا۔

تیسرا آدمی جس نے ماہتاب کی بربادی میں اہم کردار ادا کیا تھا' اس کی گلی ہی کا پراپرٹی ڈیلر تھا لیکن ماہتاب کی گفتگو سے مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ مدن موہن کا ساتھی نہیں تھا۔ اس نے صرف انتہائی درجے کے ایک مکار اور کمینے دلال کی طرح موقع سے فائدہ اٹھایا تھا۔ ایک مجبور لڑکی کی آخری پونجی لوٹی تھی' بہرحال سزا کا مستحق وہ بھی تھا.....تاہم فی الحال مجھے اس کی فکر نہیں تھی۔

"مدن! مجھے اس آدمی کا نام و پتہ چاہیے جس نے ماہتاب کے چہرے پر تیزاب پھینکا تھا۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

اس بار وہ کچھ ہچکچایا لیکن اس کے اندر کوئی ایسی روح نہیں تھی جو زیادہ مزاحمت کر سکتی' اس لیے جلد ہی از خود بول اٹھا۔ "اس کا نام وشنو ہے' پونا کے چاندنی چوک کے قریب ہی ایک چھوٹی سی بار ہے.....چارلیز...پاس پڑوس میں۔ چارلی کا شراب خانہ کے نام سے مشہور ہے.....وشنو ہر شام وہاں ہوتا ہے.....کاؤنٹر پر کوئی بھی موجود ہو' تم اس سے پوچھ سکتے ہو۔"

"نہیں.....مجھے اس کا حلیہ اچھی طرح بتاؤ تاکہ مجھے کسی سے پوچھنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔" میں نے کہا۔

"وہ تقریباً پینتیس کی عمر کا دبلا پتلا طویل القامت شخص ہے....رنگت گہری سانولی ہے' چہرہ لمبوترا ہے.....آنکھیں اکثر سرخ رہتی ہیں۔ اس کی ایک خاص عادت یہ ہے کہ سگریٹ کا گل ایک انگلی سے جھاڑتا رہتا ہے۔" مدن خاموش ہو گیا۔

میں نے اضطراری انداز میں ہاتھ بڑھایا اور ساتھ ہی اس کے منہ پر تھوک دیا۔ نہ جانے کیوں مجھے اس کا چہرہ انسان کا نہیں کسی غلیظ حیوان کا دکھائی دیتا تھا۔ اس کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہ آئی' بس ساکت بیٹھا ایک ٹک میری طرف دیکھتا رہا۔ میں واپسی کے لیے مڑ

گیا۔

"کیا اب بھی پانی نہیں پلاؤ گے....؟" اس نے کمزور سی آواز میں عقب سے پکارا۔ "تم نے جو کچھ پوچھا' وہ میں نے تمہیں بتا دیا۔"

"پانی خدا کی ایک نعمت ہے۔" میں نے مڑ کر دیکھے بغیر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "اور میرے خیال میں اس نعمت پر تم جیسے ظالموں' فرعونوں اور بے رحموں کا اتنا حق نہیں ہونا چاہیے کہ جب چاہو یوں تمہیں مل جائے۔"

اس کی بڑبڑاہٹ اس وقت بھی جاری تھی جب میں دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ دروازہ بند کرتے ہی اس کی آواز اور میری سماعت کا ناطہ ٹوٹ گیا۔

جزیرے سے جب میں واپس آبھی پہنچا تو میرے ذہن میں ان گنت خیالات ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ وشنو کو تلاش کرنے سے پہلے نیکمر سے مل لیا جائے۔

نہایت کم رفتار سے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے میں آنند نگر پہنچا۔ یہ چھوٹے چھوٹے مکانات اور فلیٹوں پر مشتمل ایک دور افتادہ بستی تھی اور نچلا متوسط طبقہ یہاں آباد تھا۔ یہاں کی گلیاں ایسی بھی تھیں جن سے میری رولز رائس گزری تو لڑکے بالے ہی نہیں' اچھے بھلے سیانے بھی رک کر دیکھنے لگے۔

گلیوں ہی گلیوں میں چند منٹ کی ڈرائیو کے بعد میں قدرے کشادہ سڑک پر پہنچا' پھر ایک جگہ ایک ریستوران کے سامنے میں نے گاڑی روک دی۔ اس علاقے کی مناسبت سے یہ ایک خاصا بہتر قسم کا ریستوران تھا۔ اس کا دروازہ شیشے کا تھا' بورڈ انگریزی میں لکھا ہوا تھا۔

[illegible] ڈنگ سنٹر

[illegible]

مجھے وہ وقت یاد آیا جب یہ ریستوران بہت بری حالت میں تھا۔ یہاں کوئی گاہک نظر نہیں آتا تھا' صرف مکھیاں بھنکتی تھیں۔ اس وقت کا تصور کرتے ہوئے محاورتاً نہیں حقیقتاً کہا جا سکتا تھا کہ اب تو کایا ہی پلٹ چکی تھی۔ باہر لوگوں کو سرو کرنے والا ایک بیرا کچھ دیر تو دور سے میری طرف دیکھتا رہا' شاید وہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ کیا میں بھی اس ریستوران کا گاہک ہو سکتا ہوں؟ پھر وہ جھجکتے ہوئے انداز میں سڑک پار کرکے میری طرف بڑھا۔

"کیا کھانا پینا پسند فرمائیں گے سرکار؟" بیرے نے قریب آکر کھڑکی پر جھکتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے ملائمت سے کہا۔ "ذرا اپنے صاحب کو بھیج دو۔"

کچھ دیر بعد ریستوران سے ایک ادھیڑ عمر شخص برآمد ہوا۔ اس کے لمبے لمبے بال جن میں سفیدی غالب تھی' نہایت سلیقے سے سنورے ہوئے تھے۔ اس کا جسم زوال کی طرف مائل تھا لیکن چوڑا چکلا احاطہ خصوصاً کندھوں کی ساخت اور آدھی آستین کی شرٹ سے جھانکتے ہوئے بازوؤں کی ڈھلکی ہوئی مچھلیاں بتاتی تھیں کہ یہ عمارت کبھی بہت شاندار تھی۔

اس نے سڑک پار کرتے ہی مجھے دیکھ لیا اور مستعدانہ انداز میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا میری طرف بڑھا۔ گزرے ہوئے برسوں نے اس کی شخصیت پر بربادی کے خواہ کتنے ہی نقش چھوڑ دیئے تھے' پھر بھی اس کی حالت اس وقت سے کہیں بہتر تھی جب میں نے آخری بار اسے دیکھا تھا..... اور یہ کوئی پرانی بات نہیں تھی۔

وہ قریب آیا تو میں نے دیکھا کہ وہ حسب معمول ربر سول کے جوتے پہنے ہوئے تھا مگر فرق یہ تھا کہ اب اس کے جوتے نئے اور چمکیلے تھے۔ میں اس کے استقبال کو گاڑی سے اتر آیا۔ وہ لپکتے ہوئے بولا' آپ بیٹھے رہیے مالک..... میں وہیں آپ کے چرن چھو لوں گا....."

وہ میرے پیروں کی طرف جھکنے لگا۔

"خدا کے لیے....." میں نے گھبرائے ہوئے سے انداز میں اسے بازو سے پکڑ کر فوراً سیدھا کرتے ہوئے کہا۔ "یہ تکلفات رہنے دو۔ یہ پرانا دھن چھونے والی حرکت میرے

ساتھ مت کیا کرو۔ مجھ سے برابری کی سطح پر آکر ملا کرو۔"

"یہ تکلفات نہیں سرکار!" وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ "میری آتما کی پکار ہے..... اور میں بھلا آپ کے برابر کیسے آسکتا ہوں..... میں گندی نالی کا کیڑا ہوں اور آپ اوتار ہیں۔۔۔ دیوتا ہیں....."

"اور دیکھو۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "مجھ سے ان ہندی اصطلاحوں کے ساتھ بھی بات مت کیا کرو۔ مجھے یوں معلوم ہونے لگتا ہے جیسے کوئی پجاری مندر میں اشلوک پڑھ رہا ہے۔ ویسے بھی تمہیں تو اچھی بھلی اردو آتی ہے۔"

"کیوں نہیں سرکار!" وہ شرمیلے سے انداز میں ہنسا۔ "اردو تو خیر آپ کی دعا سے انگریزی' فرانسیسی' پنجابی' جرمن اور پرتگیزی بھی آتی ہے۔"

"بلکہ تمہیں انسانوں کی زبانوں کے علاوہ جنگل کے تمام چرند' پرند اور درندوں کی زبانیں بھی آتی ہیں۔" میں نے اس کا کندھا تھپک کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"بس جی..... سب اوپر والے کا کرم ہے۔" وہ انکساری سے بولا۔

"آؤ..... گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔" میں نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "اسی میں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"

وہ گویا میرے برابر بیٹھنے کو گستاخی سمجھتے ہوئے ہچکچا رہا تھا لیکن میں نے اسے سیٹ پر دھکیل دیا اور گھوم کر دوسری طرف سے اس کے برابر آبیٹھا۔

"کچھ کھائیں گے نہیں؟" اس نے پوچھا۔ "کھانے کے لیے تو آپ کے شایان شان کوئی چیز نہیں ہے' اس لیے میں نے نہیں پوچھ رہا۔"

"ارے نہیں..... سب ٹھیک ہے۔" میں نے لاپروائی سے کہا۔ "کھانے کا ویسے بھی وقت نہیں ہے ورنہ جو بھی کاٹھ کباڑ تمہارے ہاں میسر ہوتا' کھا لیتا۔ تم صرف پینے کے لیے دو فریش جوس منگوا لو..... ویسے ریستورنٹ کو تم نے بڑا ٹھاٹ دار بنا لیا۔ میں تو پہچان ہی نہیں پایا تھا۔"

"بس جی..... اچھی نیت سے شروع کیا تھا۔ شاید اس لیے اوپر والے نے نظر کرم کر دی ورنہ لوگوں کا خیال یہی تھا کہ جس طرح پہلے والا مالک مکھیاں مارتا تھا' اسی طرح میں بھی مار کے رخصت ہو جاؤں گا۔ بس دو جوان بھانجیوں کی شادی کی نیت کی تھی' وہ بھگوان نے پوری کر دی۔ انہیں بیاہ دیا ہے۔ اب اپنی تو کوئی فکر نہیں۔ اپنی تو زندگی ہے' نہ بچہ..... نہ فکر نہ فاقہ۔ اب تو صرف شغل کے طور پر اسے چلا رہا ہوں۔ شغل ہی شغل میں پیسا جا رہا ہے....."

"وفا" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے شرمیلے بچے کی طرح جھینپے جھینپے سے انداز میں مسکرایا اور سر جھکا کر بولا..... "میں تو یونہی بکواس کیے جا رہا ہوں جیسے مجھ میں کوئی سرخاب

کا بڑ لگا ہوا تھا جو قسمت مجھ پر مہربان ہو رہی تھی حالانکہ آپ کا اشارہ نہ ہوتا..... آپ نے میرے سر پر ہاتھ نہ رکھا ہوتا تو قسمت بھی مجھے میرے پیروں پر کھڑا نہیں کر سکتی تھی۔۔۔میں راکٹ کھائے اسی نالی میں اوندھا پڑا رہتا جہاں سے آپ نے مجھے اٹھایا تھا۔"

اس کا لہجہ یوں مدھم ہو گیا جیسے اس کا تصور اسے ناگوار ماضی کے خارزار میں کھینچ لے گیا ہو۔ میں بھی ان باتوں کو تقریباً بھول ہی گیا تھا مگر اس نے ذکر چھیڑا تو جیسے ایک بھولی بسری سی کہانی ذہن میں ابھر آئی۔

ان دنوں میں نے نیا نیا ہی کاروبار کی دنیا میں قدم رکھا تھا اور میرے پاس بڑی جیکونر ہوا کرتی تھی جو میں نے وکرم اور اس کے ساتھیوں کو ٹھکانے لگانے کے بعد قبضے میں کر لی تھی۔ ایک روز میں شارٹ کٹ سے چلنے کی غرض سے ایک میدان کی طرف نکلا جہاں کچھ عرصے سے کوئی معروف قسم کا بہت بڑا سرکس لگا ہوا تھا۔ میں میدان سے کترا کر نکلنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ سرکس وہاں سے رخصت ہو چکا تھا اور بے پناہ طویل و عریض میدان میں صرف اس کے پڑاؤ کے آثار باقی رہ گئے تھے۔

میدان کے گرد نیم دائرے میں گھوم کر میں جیسے ہی دائیں طرف مڑا تو پسماندہ سی بستی کی اس گلی میں دائیں طرف ہی ایک مکان کی دیوار کے قریب کوئی شخص یوں اوندھا پڑا دکھائی دیا کہ اس کا سر اور ایک ہاتھ نالی میں تھا۔ دونوں ٹانگیں پھیلی ہوئی تھیں جن پر ایک بوسیدہ سی میلی کچیلی خاکی پتلون منڈھی ہوئی تھی۔ پیروں میں ربڑ سول کے شکستہ سے جوتے تھے اور ربڑ سول میں دو سوراخ تھے۔ بادی النظر میں یہ دونوں سوراخ کسی لاوارث لاش کی آنکھوں کی طرح رحم طلب انداز میں پھیلے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

گلی سے میں نے دو آدمیوں کو گزرتے بھی دیکھا لیکن کسی نے نالی میں اوندھے پڑے ہوئے اس شخص کے قریب رکنے بلکہ صحیح طور پر اس کی طرف دیکھنے تک کی زحمت نہیں کی۔ میں بھی گاڑی تیزی سے آگے نکال لے گیا لیکن اگلے موڑ پر پہنچنے سے پہلے ہی نہ جانے کیوں میرا پاؤں خود بخود بریک پر پڑ گیا۔ کوئی چیز جیسے یکلخت ہی میرے لاشعور میں خنجر کی طرح پیوست ہو کر رہ گئی تھی۔

دراصل مجھے یاد آ گیا تھا کہ کبھی میں بھی اسی طرح بے ہوش ہو کر بمبئی کی کسی گلی میں گر پڑا تھا۔ آٹھ ڈاکو میرے تعاقب میں تھے اور میں بالکل تنہا اور بے یار و مددگار تھا۔ میری کلائی بری طرح زخمی تھی۔ تب مجھے بھی کوئی نیک دل شخص گھسیٹ کر اپنے گھر لے گیا تھا اور اپنی آخری پونجی اس نے میری مرہم پٹی کرانے کے لیے ڈاکٹر کی نذر کر دی تھی۔

میں اب سوچ رہا تھا کہ اگر اس رات طاہر مجھے نہ اٹھاتا اور اپنی کھولی میں نہ لے گیا ہوتا تو آج میں کہاں ہوتا؟ میرا ذہن مجھے اس سوال کا کوئی واضح جواب نہ دے سکا، تاہم مجھے جھرجھری سی ضرور آ گئی۔ میری جلد کے نیچے جیسے بیسیوں سنپولیے سرسرانے لگے۔

بالکل مشینی انداز میں، میں نے گاڑی ریورس کی اور واپس وہیں ے ہاتھ میرا اگر صرف ایک

اوندھا پڑا تھا۔ گاڑی سے اتر کر میں نے اسے سیدھا کیا۔ اس کا چہرہ اور لباس پانی اور مٹی میں لتھڑا ہوا تھا لیکن یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ وہ مکمل طور پر بے ہوش نہیں تھا۔ سیدھا ہوتے ہی اس نے آنکھیں کھول کر مسکرانے کی کوشش کی۔ اس کی آنکھیں چڑھی چڑھی اور انگاروں کی طرح سرخ تھیں۔ میرے دم بھی نہیں ہو

اس کی باچھوں سے کف بھی بہہ رہا تھا جو غلیظ پانی میں مدغم ہو رہا تھا۔

"تم.....نے.....دیو سے کیوں.....نکالا....." وہ تقریباً ناقابل فہم سی آواز میں منمنایا۔ "مجھے مر جانے.....دیتے.....دل کہیں کے.....تم کسی کو مرتے بھی.....نہیں.....دیکھ سکتے۔"

اب مجھے معلوم ہوا کہ موصوف کوئی زبردست قسم کا نشہ کیے ہوئے تھے اور نالی کو دریا سمجھ کر ڈوبنے کی کوشش فرما رہے تھے۔ پہلے تو میں نے ارادہ کیا کہ اسے وہیں چھوڑ کر گاڑی میں بیٹھوں اور اپنا رستہ لوں لیکن اس شخص کے خدوخال اور چہرے پر جو بردباری رقم تھی، اس کی تہہ میں سے مجھے ایک شاندار انسان اور اس کا مدفون ماضی جھلکتا نظر آ رہا تھا۔ دوسرے اس نے اس مدہوشی کے عالم میں بھی جس لہجے میں مرنے کی حسرت کا اظہار کیا تھا، اس سے میرے دل میں بھی خراش سی آ گئی تھی۔ میرا اب جو بلاشبہ آتش فشاں تھا مگر جس پر میں نے غیر جذباتیت کی برفانی تہیں جما رکھی تھیں۔

اس شخص کے ہاتھ پیروں پر رعشہ سا طاری تھا اور وقفے وقفے سے اس کے حلق سے ہلکی ہلکی اور بے معنی سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ نہ جانے کیوں میں اسے چھوڑ کر نہیں جا سکا۔ میں نے اسے اٹھا کر گاڑی میں ڈالا اور گھر لے گیا۔

نوکر کو میں نے ہدایت کی کہ جس حد تک ممکن ہو اس شخص کا حلیہ درست کرکے میرے کپڑوں میں سے کوئی جوڑا پہنا کر اسے گیسٹ روم میں لٹا دیا جائے اور اگر وہ کچھ کھا سکے تو اسے کھلا بھی دیا جائے کیونکہ اس کا پیٹ مجھے کمر سے لگا ہوا نظر آ رہا تھا۔

دوسری صبح جب میں گیسٹ روم میں اسے دیکھنے گیا تو وہ بالکل ہی بدلا ہوا انسان نظر آیا۔ غالباً آج وہ نہایا تھا اور اس نے شیو بھی بنایا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے جسم پر میرا ایک پرانا لیکن صاف ستھرا اور بیش قیمت سلیپنگ سوٹ تھا۔ ۔۔۔ پیچھے رہ جاتی ہے وہ لڑکی نکھرا نکھرا سا نظر آ رہا تھا۔ کل اور آج کے مختصر سے وقفے ۔۔۔ در گھوم کے ۔۔۔ میرے سے تخلیق کیا ۔۔۔ مرطانی گئی تھی۔

میں زمین آسمان کا فرق پڑ چکا تھا اور قدرے حیرت کی ۔۔۔ کا ہاتھ نکلا ۔۔۔ جیسے نگے تار پر پڑ گیا ہو۔ پھر ایک کاغذ پر کچھ لکھ رہا تھا۔ طرف دیکھا جیسے اپنا مطلب مجھے سمجھا نہ سکے

مجھے کمرے میں آتے دیکھ کر اس نے کاغذ تہہ ۔۔۔

اٹھ کھڑا ہوا جیسے رخصت طلب کرنے کے لیے میرا ۔۔۔ کر صاحب۔" چند لمحے بعد اس نے ماتمی سے لہجے

"بیٹھ جاؤ.....ابھی تم کہیں نہیں جا سکتے.....نام

کا پہنا ہوا تھا جو قمیص۔ اس نے بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ لہجہ ہر تاثر سے عاری تھا۔
میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "تم بھی کاغذ پر کیا لکھ رہے تھے؟" میں نے بھی ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ لوگ جنہیں مرگی کے دورے پڑتے ہیں یا جو اس قسم کے نشے کرتے ہیں کہ چلتے چلتے گر پڑتے ہیں' اپنی جیب میں عموماً اس قسم کا رقعہ لکھ کر رکھتے ہیں کہ کوئی صاحب اگر انہیں کہیں پڑا ہوا پائیں تو فلاں ایڈریس پر پہنچا دیں....." اس نے روانی سے کہا۔
"اچھا..." میں نے سر ہلایا۔ "تو اس قسم کا رقعہ لکھنے کا تمہیں بھی خیال آ گیا۔"
"نہیں۔" اس نے جلدی سے نفی میں گردن ہلائی۔ "میں تو یہ لکھ رہا تھا کہ جو شخص مجھے جہاں کہیں بھی پڑا پائے' وہیں پڑا رہنے دے' کہیں لے جانے کی زحمت نہ کرے اور اپنے کام سے کام رکھے۔"
"زندگی سے بہت بیزار ہو؟" میں نے اسے گھورا۔
"زندگی.....؟" دفعتاً اس نے عجیب سے انداز میں قہقہہ لگایا جیسے کسی کھنڈر میں کوئی بدروح کھلکھلا اٹھی ہو۔ ساتھ ہی اسے کھانسی آ گئی۔ اس کے پھیپھڑے بہت کمزور معلوم ہوتے تھے یا پھر ان پر کسی بیماری اور حالات کی ناہمواریوں کا اثر تھا۔
"خدا کے لیے اب کوئی فلمی قسم کا ڈائیلاگ نہ بولنا۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "سیدھی طرح بتاؤ تمہیں تکلیف کیا ہے بلکہ مجھے اپنے متعلق سب کچھ ہی بتا ڈالو۔ تمہارے سینے پر بہت بوجھ معلوم ہوتا ہے۔"
پہلی بار اس کی آنکھوں میں دلچسپی کی چمک پیدا ہوئی۔ "اس نوجوانی میں ہی بڑی مردم شناس نظر پائی ہے آپ نے۔" اس کے خشک ہونٹوں پر مسکراہٹ کی رمق نمودار ہوئی۔ "لیکن کیا آپ کے پاس اتنا وقت ہے؟ آپ بڑے آدمی معلوم ہوتے ہیں اور بڑے آدمیوں کا وقت بڑا قیمتی ہوتا ہے۔ چھوٹے آدمیوں کی زندگی سے بھی زیادہ قیمتی۔"
"زیادہ فلسفہ بگھارنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے پہلو بدل کر کہا۔ "اور میں اس قسم کا بڑا آدمی نہیں ہوں جس قسم کا تم سمجھ رہے ہو۔ تمہید اور ادھر ادھر کی باتوں کو چھوڑو' دراصل مجھے یاد آ گیا ہے جاؤ..... سب سے پہلے میں یہ جاننا چاہوں گا کہ تم کرتے کیا ہو یا گر پڑا تھا۔ ٹھیک ڈالو میرے حساب پر
میری کلائی بری طرح زخمی تھی۔ تب مجھے آ رہا ہے۔ فرض کیجیے میں کچھ بھی بتانا پسند نہ کروں اور اپنی آخری پونجی اس نے میری مرہم پٹی
میں اب سوچ رہا تھا کہ اگر اس رات طوفان..." میں نے پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھتے ہوئے ہوتا تو آج تم کہاں ہوتے؟ میرا ذہن مجھے اس مرنے کی کوشش کر رہے ہو؟ ممکن ہے کہ میں مجھے جھرجھری سی ضرور ہوئی میری مدد سے یہ اسی زندگی کا قرض تمہارے سر سے اتار دوں۔"

"آپ کو شاید یہ سن کر حیرت ہو....." وہ مسکرایا۔ "کہ میرے ہاتھ میں اگر صرف ایک ہنٹر دے دیا جائے تو شیر بھی میرے آگے دم ہلانے لگتا ہے۔"
"مگر تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں شیر نہیں ہوں اور اتفاق سے میرے دم بھی نہیں ہے جسے میں تمہارے آگے ہلا سکوں۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔ "اب شروع ہو جاؤ۔"
"اس کے کندھے گویا سکڑ گئے اور سر جھک گیا۔ چند لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھوں میں گویا صدیوں کی تھکن تھی۔
"میں رنگ ماسٹر ہوں۔" بالآخر اس نے مدھم سے لہجے میں کہا۔ "ہر طرح کے خطرناک جانوروں کو سدھاتا ہوں یا بقول آپ کے یوں کہنا چاہیے کہ سدھایا کرتا تھا کیونکہ اب میرا اس پیشے کو جاری رکھنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ جوانی میں بڑی آوارہ گردی کی۔ تقریباً ساری دنیا دیکھی۔ لیکن پچھلے چند سال سے شہر یگان سرکس سے وابستہ ہو گیا تھا اور چند دن پہلے تک اس سے وابستہ تھا۔
"یہ وہی سرکس ہے ناں جو حال ہی میں بمبئی سے رخصت ہوا ہے اور جس کے اشتہارات اخباروں میں آیا کرتے تھے۔" میں نے پوچھا۔
"جی ہاں۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اور آپ کو شاید اس قسم کی تفریحات سے دلچسپی نہیں ورنہ بمبئی کی تقریباً ساری آبادی ہی یہ سرکس دیکھ چکی ہے۔ بڑی چنچل قسم کی لڑکیاں کام کرتی ہیں اس میں۔ تارا بھی انہی میں سے ایک تھی....."
"اوہ... تو تم اب عشق کی المناک کہانی سناؤ گے؟" میں نے قدرے بیزاری سے کہا۔
"آپ نے تارا کو نہیں دیکھا۔" اس نے ایک طویل سانس لی۔ "ورنہ اس کے ذکر پر آپ اتنی حقارت کا اظہار نہ کرتے۔"
"خیر، تم اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اپنی بات جاری رکھو۔" میں نے کہا۔
"وہ جمناسٹک کے کرتب دکھاتی ہے۔" بھیکھو نے ایک لمحے کے توقف سے کہا۔
"یوں تو تقریباً ہر جمناسٹ کا جسم ہی بے حد سڈول ہوتا ہے مگر تارا کو تو قدرت نے عجیب ہی چیز بنا دیا ہے۔ اسے دیکھ کر اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ جاتی ہے' وہ لڑکی نہیں صاحب.....خوبصورتی کے سانچے میں ڈھلا ہوا ریشم اور موم کے آمیزے سے تخلیق کیا گیا ایک مجسمہ تھا جس میں روح کی جگہ آسمانی بجلی بھر دی گئی تھی۔"
اس نے یوں جھرجھری سی لی جیسے واقعی اس کا ہاتھ بجلی کے ننگے تار پر پڑ گیا ہو۔ پھر اس نے عجیب رحم طلب سی نظروں سے میری طرف دیکھا جیسے اپنا مطلب مجھے سمجھا نہ سکنے پر معذرت خواہ ہو۔
"لڑکیاں تو سرکس میں بہت ہوتی ہیں صاحب۔" چند لمحے بعد اس نے ماتمی سے لہجے

میں گفتگو کا سلسلہ جوڑا۔ "اکا دکا شادی شدہ بھی ہوتی ہیں۔ بعض نے شادی کے بغیر ہی نجی زندگی میں بھی کسی کو جوڑی دار بنا رکھا ہوتا ہے اور اکا دکا ایسی بھی ہوتی ہیں جو اپنی مرضی سے بالکل تنہا اور خود مختار زندگی گزارتی ہیں۔ بہرحال سرکس کی دنیا میں ایک ضابطے کی بہت سختی سے پابندی ہوتی ہے جس پر آپ کے مہذب اور منظم معاشرے میں بیسیوں قوانین کی موجودگی میں بھی عمل نہیں ہوتا...... اور وہ یہ کہ لڑکی کی مرضی کے بغیر کوئی اسے چھو بھی نہیں سکتا۔ راتوں کو لڑکیاں کسی کنڈی تالے کے بغیر محض خیموں میں سوتی ہیں جن کے دروازے پر صرف پردہ جھول رہا ہوتا ہے مگر کیا مجال ہے کہ بلا اجازت کوئی پردہ اٹھا کر اندر جھانک بھی سکے۔ تارا بھی انہی لڑکیوں میں سے تھی جو سرکس کی دنیا میں صرف اور صرف کام سے غرض رکھتی ہیں۔ بڑے اسمارٹ، خوش شکل اور منہ زور نوجوانوں نے اس سے تعلق استوار کرنے کی کوشش کی مگر اس نے کسی کو منہ نہ لگایا...... اور پھر تین سال قبل وہ اچانک ہی مجھ پر مہربان ہو گئی......"

آخری جملے کے ساتھ ٹیکھو نے یوں جھجکتے ہوئے میری طرف دیکھا جیسے اسے اندیشہ ہو کہ میں اس کی بات پر یقین نہیں کروں گا۔ میں بدستور ساکت بیٹھا اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"شروع شروع میں مجھے خود بھی یقین نہیں آیا تھا کہ تارا مجھ پر مہربان ہو گئی ہے۔" وہ گویا نادم ہوتے ہوئے بولا۔ "یہ تو بالکل ایسا ہی تھا جیسے آپ فاقہ کشی کی زندگی گزار رہے ہوں اور بیٹھے بٹھائے اچانک ہی کوئی آپ کی جھولی میں ہفت اقلیم کی دولت ڈال دے۔ وہ عمر میں مجھ سے کم از کم تین برس چھوٹی تھی اور سرکس کا ہر نوجوان اس کے اشارے پر سر کٹانے کو تیار تھا۔ اس صورت میں، میں کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونے کو تیار نہیں تھا مگر آتے آتے یقین آ ہی گیا۔ انسانی ذہن بھی بس ایک معمہ ہی ہے نا۔ کچھ پتا نہیں کب کونسی رنگ کیا تماشا دکھا دے۔ تین سال تک اس پری صفت لڑکی نے اپنا آپ میرے سپرد کیے رکھا...... اس کا کہنا تھا کہ میں جس بے خوفی سے درندوں سے الجھتا رہتا ہوں اور جس طرح انہیں اشاروں پر نچاتا ہوں، یہ سب کچھ اسے بہت اچھا لگتا ہے اور محض اسی وجہ سے میں بھی اچھا لگنے لگا ہوں۔ یوں اس کی رفاقت میں تین سال ایک ہیجان خیز خواب کی طرح گزر گئے۔ پھر ایک روز جس طرح اچانک یہ خواب شروع ہوا تھا اسی طرح یک لخت ٹوٹ گیا......" اس نے مغموم سے انداز میں سر جھکا لیا۔

میں نے اب بھی کچھ نہ پوچھا۔ چند لمحے بعد اس نے کہا۔ "ایک دوسرے سرکس سے ایک جمناسٹ نے آکر ہمارے ہاں ملازمت کر لی۔ وہ لڑکا تھا تو نو عمر ہی، مگر اس کی مشاقی اور انوکھے پن کی دھوم تھی۔ اپنے سرکس والوں سے کسی بات پر ناراض ہو کر کلکتہ سے ہمارے ہاں آ گیا۔ وہ لڑکا کیا تھا حسن...... وجاہت اور مضبوطی کا شاہکار تھا۔ بالکل ویسا ہی

یونانی شہزادہ لگتا تھا جیسے ہم تصویروں میں دیکھتے ہیں۔ اسے دیکھ کر عورتوں کی آنکھوں میں چمک آجاتی تھی مگر حیرت کی بات یہ کہ وہ بے حد شرمیلا تھا۔ مجھے کبھی شبہ تک بھی نہیں گزرا کہ تارا اس پر فریفتہ ہو چکی ہے کیونکہ تماشائیوں کے سامنے شو پیش کرنے کے سوا میں نے کبھی انہیں یکجا نہیں دیکھا تھا۔ میرے سر پر تو پہاڑ اس روز ٹوٹا جس روز میں نے اپنے خیمے میں سے تارا کو اپنا سامان سمیٹتے دیکھا۔ میں نے پوچھا تو اس نے بلا تامل نہایت سرد لہجے میں مجھے بتایا کہ وہ نئے جمناسٹ لڑکے پیرو کے خیمے میں منتقل ہو رہی ہے۔

"پہلے تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں مر گیا ہوں اور میری روح آسمان اور زمین کے درمیان کہیں یخ بستہ خلاؤں میں بھٹکتی پھر رہی ہے۔ میری آنکھیں اس وقت دیکھنے کے قابل ہوئیں جب تارا خیمے کے دروازے تک پہنچ چکی تھی۔ میں نے اسے کلائی سے پکڑ کر کھینچ لیا لیکن اس نے کچھ ایسی سرد نگاہوں سے میری طرف دیکھا کہ میرے ہاتھ سے اس کی کلائی خود بخود ہی چھوٹ گئی اور اس کے بعد میں اس بجلی مشین کی طرح ناکارہ ہو کر رہ گیا جس کا کنکشن کٹ گیا تھا۔ کائنات کی گردش میرے لیے بے معنی ہو کر رہ گئی۔

مجھے یہ بتاتے ہوئے شرم آرہی ہے کہ میں نے تارا کی منت سماجت بھی کی۔ اس کے پیروں کو ہاتھ تک لگایا لیکن وہ ایک لفظ منہ سے نکالے بغیر مجھے ایک طرف دھکیل کر چلی گئی......"

"اور اس کے بعد تم نے قسطوں میں خودکشی شروع کر دی۔" میں نے لقمہ دیا۔

"ہاں۔" اس نے تسلیم کیا۔ "پہلے میں کبھی کبھار صرف شراب پیا کرتا تھا لیکن اس کے بعد شراب میرے لیے بے اثر ہو کر رہ گئی تو میں نے سرکس کے ایک ساتھی سے ایل ایس ڈی کے کیپسول لے کر کھانے شروع کر دیے۔ زندگی سے کوئی دلچسپی ہی نہیں رہی تھی۔ ہر رات جب میں اپنے خیمے میں تارا کا خالی بستر دیکھتا تو میرے ہاتھ پاؤں مرگی کے مریضوں کی طرح تڑپنے لگتے۔ پھر میں ایک رات نشے اور خلاؤں کی سیر کو نکل جاتا اور گھنٹوں ان کے سامنے جانے کیا کیا اول فول بکتا رہتا۔ ایک بار تو میں رات بھر ایک شیر کے گلے میں بانہیں ڈالے...... نشے میں دھت پڑا رہا۔ شیر اپنے ٹرینر کا اس وقت تک ہی احترام کرتا ہے جب تک اس کے ہاتھ میں ہنٹر دیکھتا ہے لیکن اس شیر میں شاید کچھ وضع داری تھی کہ بیچارہ اس عالم میں رات بھر ساکت بیٹھا رہا اور اپنی گردن میرے بازوؤں کے حلقے سے نہیں نکالی۔

"سرکس کے مالکان کی طرف سے مجھے سرزنش اور ڈانٹ ڈپٹ شروع ہو گئی تھی لیکن مجھ پر اب کسی بات کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ مجھے اپنے کام سے بھی کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ میں محض اس لیے سرکس میں پڑا تھا کہ تنخواہ کی صورت میں جو ایک وظیفہ مل جاتا تھا اس سے پیٹ کو ایندھن مل جاتا تھا۔

"پیرو اور تارا شو پیش کرتے تو میں بھی تماشائیوں میں جا بیٹھتا اور پورے شو کے دوران پلک جھپکائے بغیر ان دونوں کو ہی تکتا رہتا۔ اس کے علاوہ میں وحشت زدہ ہو کر کبھی کبھی سرکس کی حدود سے دور بھی چلا جاتا اور مدہوشی کے عالم میں رات رات بھر کہیں گلی کوچوں میں پڑا رہتا۔

"ڈراپ سین اس روز ہوا جب میں نیم ہوش و حواس کے عالم میں ہنٹر لے کر پیرو کے خیمے میں گھس گیا۔ پیرو خیمے میں اکیلا ہی تھا۔ میں نے بے دریغ اس پر ہنٹر برسانے شروع کر دیئے۔" وہ نوجوان پھرتیلا اور مجھ سے کہیں زیادہ طاقتور تھا۔ چاہتا تو میری بڑی پسلی ایک کر دیتا مگر خاموشی سے کھڑا پٹتا رہا۔ وفعتاً" تارا خیمے میں آئی اور اس نے مجھے کمر سے پکڑ کر سر سے اونچا اٹھا کے زمین پر دے مارا۔ میں بے ہوش ہو گیا۔

"وہ کسی تکلیف کا احساس تھا جس کی بدولت میں ہوش میں آیا۔ میں نے دیکھا میں خیموں کے درمیان کھلی جگہ پر اوندھا پڑا تھا اور تارا مجھ پر ہنٹر برسا رہی تھی۔ سرکس کے بہت سے فنکار ہمارے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ جیسے روز تماشائیوں کو کھیل کرتب دکھاتے دکھاتے خود آج کوئی دلچسپ تماشا دیکھنے لگے ہوں۔

"مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر تارا نے گریبان سے پکڑ کے مجھے اٹھایا اور میرے منہ پر تھوکتے ہوئے بولی۔ "تین سال میں میں نے ان گنت سیرلوں سے تیری جھولی بھر دی۔ تو ان پر اکتفا نہیں کر سکتا بڑھے؟ مجھے اپنی زر خرید لونڈی سمجھتا ہے؟ زندگی میری ہے..... میں اسے جس طرح چاہوں گی گزاروں گی۔ جس کے ساتھ چاہوں گی گزاروں گی۔ اگر آئندہ تو نے میری زندگی میں مداخلت کی تو قتل کر کے تیرے ہی سدھائے ہوئے شیروں کے سامنے ڈال دوں گی۔" پھر اس نے مجھے زمین پر پٹخ دیا اور پیرو کے خیمے کی طرف چل دی۔

"پیرو اس کے پیچھے پیچھے سر جھکائے سعادت مند بچے کی طرح چل رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کچھ ایسے تاثرات تھے جیسے اسے اس سارے سلسلے میں سخت تکلیف پہنچی ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حالات کی ماہر ہونے کی وجہ سے تارا کے جسم میں بڑی عجیب و غریب قوتیں پوشیدہ تھیں لیکن میں چاہتا تو اسے زیر بھی کر سکتا تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ میں ایسا چاہ ہی نہیں سکتا تھا۔

"مجھے تارا کی طلب نے اندر سے کھنڈر کر کے رکھ دیا تھا اور راکٹ کے استعمال نے ذہنی طور پر مفلوج کر دیا تھا۔ ہوش و حواس میں رہتے ہوئے مجھے سخت تکلیف محسوس ہوتی تھی۔ اب میں اتنی دیر سے نفس کا بوجھ ہلکا کرنے کے اشتیاق میں آپ سے یہ ساری ہوش و حواس باتیں کیے جا رہا ہوں ورنہ اتنی دیر ہوش میں رہنا مجھے گوارا نہیں ہوتا۔

بہرحال تارا سے یہ میری پہلی اور آخری جھڑپ تھی۔ اس کے بعد سرکس والوں نے مجھے نوکری سے نکال دیا تاہم مجھے سرکس کی حدود سے نہیں نکالا کیونکہ ویسے بھی سرکس

نئے شہر میں قیام کی مدت ختم ہو رہی تھی۔

بالآخر چند روز پہلے سارا سامان ٹرکوں میں لادا گیا اور سرکس کسی اور شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ مجھے بھی چھوڑ کر میں نے بھی ایک ٹرک میں چڑھنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے دھکے دے دے کر مجھے نیچے اتار دیا۔ میں نے اپنی زندگی کے سات طویل برس اس سرکس کے ساتھ گزارے تھے جن میں سے تین برس تو بہت ہی قیمتی تھے کہ ان میں مجھے تارا حاصل تھی۔

"اب کئی دن سے یہی معمول تھا کہ میں ادھر ادھر آوارہ گردی کرتا تھا لیکن گھوم پھر کر اسی میدان کی طرف جا نکلتا تھا جہاں سرکس کے پڑاؤ کے نشانات باقی تھے۔ میں راکٹ کھا کر میدان کے کنارے بیٹھ جاتا۔ پھر میری آنکھیں مجھے بڑے عجیب عجیب منظر دکھاتیں۔ مجھے سرکس جوں کا توں پڑاؤ ڈالے نظر آتا۔ اپنا خیمہ بھی دکھائی دیتا اور پہلو میں تارا بھی۔ پھر دھیرے دھیرے یہ سب کچھ غائب ہو جاتا۔ کوئی ڈراؤنا منظر اس کی جگہ لے لیتا اور میرا جی چاہنے لگتا کہ خودکشی کر لوں۔ پھر میں مرنے کے لیے کوئی موزوں جگہ ڈھونڈنے لگتا..... یہی اپنا معمول ہے اور یہی زندگی کی کل کہانی....." شیکھر خاموش ہو کر میری طرف دیکھتے ہوئے عجیب سے انداز میں مسکرایا اور اٹھتے ہوئے بولا۔ "اب اجازت ہے؟"

"اجازت کے بچے! بیٹھ جاؤ۔" میں نے اپنائیت آمیز تلخی سے کہا۔ "میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔" وہ بیٹھ چکا تو میں نے کہا۔ "کبھی تم نے سوچا ہے کہ اپنے ساتھ تم جو کچھ کر رہے ہو اس سے تمہیں کیا فائدہ ہوگا؟"

"فائدے اور نقصان کا وقت تو اب گزر گیا ہے صاحب!" وہ حقارت سے ہنس دیا۔ "یہ باتیں تو وہ سوچتے ہیں جنہیں زندگی گزارنی ہوتی ہے۔ اپنی نے تو گزار لی جتنی گزارنی تھی۔ اب تو سانسوں کا کچھ فاضل سرمایہ بچ گیا ہے جسے بے دردی سے لٹا رہے ہیں۔"

"باتیں تو بڑی عقلمندوں اور مفکروں والی کرتے ہو لیکن حرکتیں احمقوں والی ہیں۔" میں نے کہا۔ "مجھے صرف یہ بتاؤ کہ اگر تم اسی طرح ذلت و خواری سے زندگی کے بچے کھچے دن گزارتے رہے' راکٹ کھا کھا کر نالیوں میں گرتے رہے تو کیا تمہیں تارا مل جائے گی یا اس کو تمہارے حال کی خبر ملتی رہے گی اور اس کے دل میں تمہارے لیے ہمدردی پیدا ہو جائے گی؟"

"نہیں۔" اس نے تسلیم کیا۔ "لیکن میں اس غرض سے تو یہ سب کچھ نہیں کرتا۔ مجھے تو بس اپنے آپ کو برباد کرتے میں مزا آنے لگا ہے۔"

"بکواس۔" میں نے کہا۔ "اپنے آپ کو برباد کرنے میں کسی کو مزا نہیں آتا۔ یہ فلسفہ صرف اس وقت گھڑا جاتا ہے جب اپنے آپ کو سنوارنے کا کوئی بہانہ' کوئی وسیلہ نہیں رہتا۔ تم ایک ہوش مند انسان ہو اور اس مہلک نشے کا عادی ہوتے بھی تمہیں زیادہ عرصہ

نہیں گزرا۔ تم نے اپنے آپ کو صرف اس لیے اس راہ پر ڈال لیا ہے کہ تمہارے سامنے کوئی اور راہ نہیں رہی یا یوں کہو کہ تمہیں سجھائی نہیں دے رہا۔"

وہ بغور میری بات سن رہا تھا۔ یہ ایک اچھی علامت تھی۔

"ماں کو بھول جاؤ۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ تمہیں بھول گئی۔ اسے اپنے ذہن سے اسی طرح نکال پھینکو جس طرح اس نے تمہیں اپنی زندگی سے نکال پھینکا ہے۔"

"یہ اب اپنے بس کی بات نہیں رہی صاحب!" اس نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد کہا۔

"کیوں نہیں رہی؟" میں نے ملامت سے کہا۔ "ہو سکتا ہے تمہیں صرف کسی کی تھوڑی بہت مدد کی ضرورت ہو۔ وہ تمہیں میں فراہم کروں گا' تم نئے سرے سے زندگی شروع کرو۔"

"اس عالم میں کہ جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں ہے اور تن پر کپڑے بھی پرائے ہیں۔" وہ اپنے سراپا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تلخ انداز میں ہنسا۔

"میں نے تمہاری مدد کا ارادہ ظاہر کیا ہے' اس سے میری مراد مالی مدد بھی ہے۔" میں نے کہا۔ "میں تمہاری اس حد تک مدد کر سکتا ہوں جس حد تک تم سوچ بھی نہیں سکتے لیکن شرط یہی ہے کہ تم چار دن انسانوں کی طرح گزار کر دوبارہ اس راہ پر نہیں چل جاؤ گے۔ نئے سرے سے پرعزم انسانوں کی طرح زندگی شروع کرو گے۔"

"آخر آپ میری مدد کرنے پر کیوں کمربستہ ہو گئے؟" اس نے شکی سے لہجے میں کہا۔

"صرف اس لیے کہ تم جیسے آدمیوں کو میں کام کے آدمیوں میں شمار کرتا ہوں اور انہیں یوں برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔" میں نے جواب دیا۔ "دوسرے عین ممکن ہے کہ کبھی مجھے بھی تمہاری مدد کی ضرورت پڑ جائے۔ تمہارے لیے موجودہ روش کو ترک کرنا کچھ اتنا زیادہ مشکل نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو' صرف کسی تعمیری کام کو اپنا مقصد حیات اور اپنی منزل قرار دے لو۔ کیا تمہیں ایسا کوئی کام یاد نہیں جس کے بارے میں تم نے کبھی حسرت محسوس کی ہو کہ کاش میں ایسا کر سکتا؟"

اس کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔ چند لمحے سوچنے کے بعد وہ بولا۔ "میری ایک بہن ہے' مدراس میں رہتی ہے' جوانی ہی میں بیوہ ہو گئی تھی تب سے محنت مزدوری کر کے گزر اوقات کرتی ہے۔ اس کی دو بچیاں سیانی ہو چکی ہیں اور ان کی شادی بیاہ کا کوئی وسیلہ نظر نہیں آتا۔ کبھی کبھی میں سوچا کرتا تھا کہ کاش میں ان بچیوں کی شادی کا بندوبست کر سکتا لیکن سرکس میں چونکہ مجھے تنخواہ صرف اتنی ہی ملتی تھی کہ تنہا اپنا ہی گزارہ کھینچ تان کر ہوتا تھا' اس لیے میں اس خیال کو ذہن سے جھٹک کر اپنے معمولات میں الجھ جاتا تھا' اب تو میں نے بہن کو خط لکھنا بھی چھوڑ دیا ہے۔"

"یہ تو نہایت عمدہ مقصد حیات ہے۔" میں نے دبے دبے جوش سے کہا۔ "سردست تم صرف اتنا ہی تہیہ کر لو کہ تم ان بچیوں کی شادی کا بندوبست کرنے تک سرگرم عمل رہو گے' اس کے بعد جو جی میں آئے گا کرو گے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے تم کسی چیز کو ناکارہ سمجھ کر پھینکنے کا تہیہ کر چکے ہو لیکن پھر سوچتے ہو کہ اس سے ایک اچھا کام لے لوں' پھر پھینک دوں گا۔"

وہ چند لمحے خاموش رہا پھر یکایک نفی میں بیزاری سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "نہیں صاحب! میں اب زندگی کے جھمیلوں میں الجھنا نہیں چاہتا....." اس نے ایک طویل جماہی لی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "اب میرا نشہ ٹوٹ رہا ہے' مجھے پندرہ روپے عنایت کیجیے اور جانے کی اجازت دیجیے۔ آپ کی مہمانداری اور ہمدردی کا بہت بہت شکریہ۔"

میرے اتنا سمجھانے کے باوجود کتے کی دم ٹیڑھی کی ٹیڑھی ہی تھی۔ میرا جی چاہا کہ واقعی اس کی گردن پر ہاتھ رسید کر کے ایسے ہٹ دھرم اور اتھاہ حد تک مایوسی پرست انسان کا قصہ پاک کر دوں لیکن پھر مجھے ترس آ گیا۔ بدبخت کو اپنی زندگی کی اہمیت کا اندازہ نہیں تھا۔ ایک متاع گراں مایہ کو لوگوں کے قدموں میں بکھیر کر ضائع کر رہا تھا۔

"تمہارا تو باپ بھی سیدھا ہو جائے گا میری جان!" میں نے یکلخت بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں میں خوف جھلک آیا۔ میں نے اپنے ملازم کرمو کو آواز دی اور جب وہ آیا تو اسے حکم دیا۔ "موصوف کو لے جا کر تہہ خانے میں بند کر دو۔" میں نے شنکھو کی طرف اشارہ کیا۔ "ان کو اچھے سے اچھا کھانا کھلانا' پلانا اور ہر طرح سے ان کے آرام و آسائش کا خیال رکھنا اور کوئی ذرا سی بھی خطرناک چیز ان صاحب کے آس پاس موجود نہ رہنے دینا جس سے یہ خودکشی کی کوشش فرما سکیں۔ دوسرے انہیں نشے کی کوئی چیز نہ پہنچنے پائے' نیند کی گولی تک نہیں' خواہ یہ کتنا ہی اچھلیں کودیں' شور مچائیں۔ آواز تو تہہ خانے سے باہر جائے گی ہی نہیں۔ ایک ماہ بعد مجھے یاد دلانا کہ میں نے انہیں تہہ خانے میں بند کروایا تھا' پھر میں ان کا معائنہ کروں گا اور دیکھوں گا کہ کیا حال ہے۔"

"نہیں..... نہیں....." شنکھو دیوانہ وار چلانے لگا۔ "ہیروئن کے بغیر میں مر جاؤں گا۔"

"نشہ نہ ملنے سے شاذ و نادر ہی کوئی مرتا ہے۔" میں نے لاپروائی سے کہا۔ "اور تمہیں تو نشہ شروع کیے چھ ماہ بھی نہیں گزرے۔"

کرمو نے شنکھو کو مجھول اور معمر آدمی سمجھ کر لاپروائی سے ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی لیکن شنکھو اس دیہاتی کتے کی طرح مستعد ہو چکا تھا جو شہری کتوں کے نرغے میں آن پھنسا ہو' اس کی خفیہ صلاحیتیں بھی شاید بیدار ہو گئی تھیں۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپ کر کرمو

کی گرفت سے نکلا اور دروازے کی طرف لپکا۔ کرمو نے اس کا بازو پکڑنے کی کوشش کی لیکن اس نے بازو کو کچھ اس انداز سے جھٹکا دیا جیسے سانپ نے لہرا کھایا ہو اور کرمو اوندھے منہ گر پڑا۔ اب یقیناً اسے غصہ آگیا تھا اور اس کی بھی معرکہ آرائی کی وہ صلاحیتیں ابھر آئی تھیں جن سے میں بخوبی واقف تھا۔

اس نے فرش سے اٹھنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائی۔ شیکھر اس وقت دروازہ پار کر چکا تھا' کرمو نے یوں اس پر چھلانگ لگائی جیسے کوئی عقاب فاختہ پر جھپٹا ہو' پھر اسی انداز میں وہ چاروں ہاتھوں' پیروں کی مدد سے شیکھر کو دبوچ کر فرش پر اوندھا گر گیا۔ شیکھر کے لیے اب ہلنا تو درکنار جنبش کرنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔

"صاحب جی! اس کی کوئی ہڈی وغیرہ تو نہیں توڑنی؟" کرمو نے گردن گھما کر بڑی سنجیدگی سے پوچھا' انداز ایسا ہی تھا جیسے پوچھ رہا ہو۔ "صاحب جی! آپ کی چائے میں چینی زیادہ تو نہیں ڈالنی؟"

"نہیں نہیں، قطعی نہیں۔" میں نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے جواب دیا۔ "میں جو کچھ میں نے بتایا ہے وہی کرو۔"

کرمو نے شیکھر کو اس طرح اٹھایا کہ اس کے دونوں بازو پیچھے کو مڑے ہوئے تھے اور کرمو کی آہنی گرفت میں تھے۔ وہ اسے دھکیلتا ہوا ڈرائنگ روم کی طرف لے گیا جہاں سے تہ خانے کو راستہ جاتا تھا۔ اس کے بعد میں نے وقتی شیکھر کا تصور بھی ذہن سے جھٹک دیا۔

پورے ایک ماہ بعد کرمو نے حسب ہدایت مجھے شیکھر کی یاد دلائی۔ میں نے تہ خانے میں جا کر اسے دیکھا اور حیران رہ گیا' وہ قطعی طور پر بدلا ہوا انسان لگ رہا تھا۔ صحت مند اور چست و چالاک صاف ستھرے کپڑوں میں خوب نکھرا نکھرا دکھائی دے رہا تھا۔

"اب کیا حال ہے؟ دماغ ٹھکانے پر آیا؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل آگیا۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "میں نشہ چھوڑنے اور تارا کے سحر سے آزاد ہونے کو ناممکن سمجھتا تھا مگر یہ تو محض چند دن کی تکلیف ثابت ہوئی۔ مجھے دوبارہ زندگی سے محبت ہو گئی ہے۔"

"اب کیا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں آپ کو زیادہ تکلیف دینا نہیں چاہتا جتنا کچھ آپ نے کیا' یہی مجھ پر اتنا بڑا احسان ہے کہ میں اس کا صلہ نہیں دے سکتا۔" اس نے شائستگی اور ممنونیت سے کہا۔

"تکلفات چھوڑو..... میں ابھی تم سے صلہ مانگ بھی نہیں رہا' میں تمہیں کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کرا کے دے سکتا ہوں' اسے پھیلانے کی کوشش کرنا۔" میں نے کہا۔

"اور تو مجھے کسی کام کا کوئی خاص تجربہ نہیں۔" بالآخر اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ "مجھے

کوئی غریبانہ سا ریستوران کھلوا دیجیے۔ مجھے امید ہے کہ اسے میں چلا لوں گا۔"

میں نے کوئی نئی جگہ لینے اور نئے سرے سے کام شروع کروانے کے بجائے شیکھر کو گاڑی میں ساتھ بٹھا کر دو تین بستیوں کا چکر لگایا۔ ایک دو جگہ بات کی اور بالآخر دس ہزار پگڑی پر ایک ریستوران مل گیا۔ اس کی حالت بہتر بنانے کے لیے میں نے شیکھر کو دس ہزار مزید دیئے اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

اس کے بعد اس سے میری دو مزید طویل ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک مرتبہ میں اس کی طرف جا نکلا تھا جہاں وہ رہتا تھا اور ایک بار وہ میرے دفتر آیا تھا۔ فون وہ مجھے اکثر کرتا رہتا تھا۔ حالات بتاتے تھے کہ وہ بالکل صحیح ڈگر پر جا رہا تھا۔ میرے تجویز کردہ راستے پر چل رہا تھا۔ مجھے خوشی تھی کہ میں نے نہ صرف ایک کار آمد زندگی ضائع ہونے سے بچائی تھی بلکہ ایک ایک کر کے نہایت منتخب قسم کے جو پودے میں لگا رہا تھا' ان میں ایک کا اضافہ ہو گیا تھا۔ ایک قیمتی بیج لوگوں کے پیروں تلے کچلے جانے اور ضائع ہونے سے بچ گیا تھا۔

"آپ کن خیالوں میں کھو گئے؟" شیکھر کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میرا بڑے سلیقے سے ٹرے میں اورنج جوس کے دو گلاس اٹھائے لے آیا تھا اور کار کی کھڑکی کے قریب کھڑا تھا۔ شیکھر نے انتہائی احترام سے ایک گلاس مجھے پیش کیا اور دوسرا خود تھام لیا۔

"شیکھر!" میں نے چند گھونٹ بھرنے کے بعد کہا۔ "تمہیں یاد ہوگا پچھلی ملاقات پر ہم نے ایک موضوع پر بڑی دلچسپ اور تفصیلی گفتگو کی تھی۔ میں نے کہا تھا کہ فطرت کے اعتبار سے کچھ لوگ درحقیقت حیوان کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں لیکن قدرت نے فیاضی سے کام لیتے ہوئے انھیں انسان بنا دیا ہوتا ہے۔ تم نے حیوانوں کو سدھارنے میں زندگی گزار دی ہے' انھیں انسانوں کی سی حرکتیں کرنے کی تربیت دیتے رہتے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے لیے اس تجربے کو الٹے طریقے سے کام میں لانا زیادہ آسان ہوگا یعنی تم انسانوں کو حیوان بننے کی تربیت دو گے۔ بنیادی طور پر تو انسان بھی حیوان ہے اور جن انسانوں کا میں ذکر کر رہا ہوں' ان میں چونکہ حیوانیت کا عنصر غالب ہے' اس لیے تمہیں کوئی زیادہ دقت پیش نہیں آئے گی۔ آزمائشی طور پر میں نے پہلا شکار ایک جزیرے پر پہنچا دیا ہے....."

پھر میں نے اسے مالتی سندر اور اپنے پلاٹ کے متعلق تفصیل سے بتایا اور کہا۔ "وہ جگہ تمہارے کام کے لیے موزوں ترین ہے' تہ خانے میں ابتدائی مراحل مکمل کرنے کے بعد تمہیں بعد کے تجربات وغیرہ کے لیے وسیع و عریض جنگل بھی میسر ہوگا جہاں کوئی تمہیں دیکھنے والا یا تمہارے کام میں مداخلت کرنے والا نہیں ہوگا۔ میرا پہلا شکار جو تہ خانے میں ایک پنجرے میں بند ہے' اس کے مظالم کا میں تمہیں کچھ پس منظر بتا دوں' تاکہ تمہارے دل میں اس کے لیے کبھی رحم کی رمق نہ ابھرے....."

میں نے اسے مدن موہن اور اس کے کرتوت کے بارے میں بتایا۔ ماہتاب کے ساتھ اس نے جو کچھ کیا تھا' وہ بھی بتایا لیکن یہ واضح نہیں کیا کہ ماہتاب سے میرا کیا تعلق تھا' پھر میں نے کہا۔ "اس شخص کو انسان سے بن مانس بنانا ہے۔ تمہیں افریقہ کے شیطانی جراحوں کے طریق کار کے متعلق تو مکمل معلومات حاصل ہیں ناں؟"

"جی ہاں۔" شیکھر نے جواب دیا۔ "بلکہ مجھے ان کے بیشتر فارمولوں کا بھی علم ہے۔ انسان کو بن مانس کے قالب میں ڈھالنے کے لیے وہ اس کی جلد پر ٹچوکے لگا کر ایک محلول ملتے ہیں جس سے کھال کچی پڑ جاتی ہے اور ایک خاص قسم کا لیس چھوڑنے لگتی ہے۔ اس کیفیت کے دوران اس کے جسم پر بن مانس کی کھال منڈھ کر جگہ جگہ سے ایک خاص قسم کے دھاگے سے سی دی جاتی ہے۔ یہ دھاگہ بھی رفتہ رفتہ جزو بدن بن جاتا ہے اور کھال بھی اصل انسانی کھال ہی سے یک جان ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس دوران مختلف مرحلوں میں اس انسان کو غذا کی کے اعتبار سے بھی بن مانس بنانے کا عمل جاری رہتا ہے۔ بالآخر رفتہ رفتہ وہ انسانوں کی طرح چلنا' کھانا' پینا' حتیٰ کہ بولنا تک بھول جاتا ہے اور مکمل بن مانس بن جاتا ہے۔ بعض افریقی قبائل میں جس شخص کو سزا دینا مقصود ہوتا ہے' اسے اس طرح بن مانس بنانے کے لیے شیطانی جراحوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔

○

میں دل ہی دل میں اس کی معلومات کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے بالکل موزوں آدمی کا انتخاب کیا تھا۔

"بالکل درست۔" میں نے ستائشی لہجے میں کہا۔ "بن مانس کی کھال تمہیں جب ضرورت ہو' ایک ہفتے پہلے مجھے مطلع کر دینا۔ وہ تمہیں ایک خاص قسم کے بکس میں محفوظ کی ہوئی بالکل تازہ حالت میں مل جائے گی۔ اس سلسلے میں میرا ان شکاریوں سے معاہدہ ہو چکا ہے جو زیادہ تر سندر بن میں پڑاؤ ڈالے رہتے ہیں۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔" شیکھر نے دلچسپی آمیز لہجے میں کہا۔ "تو پھر میں کب سے اپنا کام شروع کروں؟"

"پرسوں تک تم اپنے یہاں کے معاملات نمٹا کر میرے آفس آجاؤ۔" میں نے کہا۔ "میرا ایک آدمی تمہیں بنگلے میں چھوڑ آئے گا۔ تمہاری ضرورت کی بیشتر چیزیں تو بنگلے میں موجود ہوں گی' پھر بھی اگر تمہیں کسی چیز کی کمی محسوس ہو تو اس کو بتا دینا' وہ تمہیں پہنچا دے گا۔ اس کا نام چھنا ہے۔ میرے اس پہلے شکار کو بن مانس بنانے کا عمل جاری رکھنے کے دوران تم اس کے چہرے کی ساخت تبدیل کرنے کے لیے آلات جراحی تو استعمال کرو گے ہی لیکن ساتھ ساتھ اس کے چہرے پر روزانہ ایک یا دو قطرے تیزاب ضرور ڈالتے رہنا۔ یہ ایک اضافی سزا ہے جو میں اسے دینا چاہتا ہوں۔"

"ایسا ہی ہوگا۔" شیکھر نے معادت مندی سے کہا۔ پھر وہ گاڑی سے اتر گیا۔ وہاں سے میں سیدھا گھر آیا اور چھنا کو فون کیا۔ اس سے میری گفتگو آدھے گھنٹے جاری رہی۔ اسے تمام ضروری ہدایات دیئے اور بعض معلومات پر تبادلہ خیال کرنے کے بعد مطمئن ہو کر فون بند کر دیا۔

چھنا سے گفتگو سے فارغ ہو کر میں نے کھانا کھایا۔ کچھ دیر آرام کیا' پھر اٹھ کر اپنے حلیے میں معمولی سی تبدیلیاں کیں۔ یہ معمولی سی تبدیلیاں بھی مجھے ناقابل شناخت بنا رہی تھیں۔ آئینے میں اپنا تنقیدی جائزہ لینے کے بعد مطمئن ہو کر میں نے اپنا مخصوص سفر میں استعمال ہونے والا بریف کیس اٹھایا اور گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

کچھ دیر بعد میری کار پونا جانے والی سڑک پر رات کی تاریکی میں فراٹے بھر رہی تھی۔

پاتا کے راستے میں جام نگر سے کچھ آگے ایک چھوٹا سا قبرستان تھا۔

میں غالباً اسی قبرستان کے قریب سے گزر رہا تھا جب ایک نہایت خوبصورت سراپا میری کار کی ہیڈ لائٹس کی زد میں آیا۔ لمحہ بھر میں میں نے اس کا سرتاپا جائزہ لے لیا۔

وہ کمسن تو نہیں تھی مگر اس رس بھرے پھل سے مشابہ جو پک کر شاخ سے ٹپک چکا ہو۔ خاصی پختہ کار سی لگتی تھی۔ اگر پختہ کار نہ ہوتی تو رات کے اس پہر ویرانے میں قبرستان کے نزدیک تنہا کیوں پائی جاتی؟ اس کا چہرہ بیضوی اور بال تراشیدہ تھے جو اس کے کندھوں کو چھونے کی کوشش کر رہے تھے۔ سر پر وہ ایک چھوٹی سی پی کیپ رکھے ہوئے تھی۔

وہ تنگ پتلون اور جرسی میں ملبوس تھی۔ پیروں میں جوتے بھی مردانہ تھے اور اپنے لمبے قد اور کسی یونانی دیوی کے مجسمے کی طرح ترشے ہوئے جسم کے ساتھ وہ خاصی پروقار نظر آرہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا سفری بیگ تھا جس کا تسمہ اس نے کلائی کے گرد لپیٹ کر اسے لاپروائی سے انداز میں لٹکایا ہوا تھا۔

اس نے بڑی ادا سے لفٹ کے لیے انگوٹھا ہلایا تھا لیکن میں گزرتا چلا گیا، تاہم غیر ارادی طور پر ایکسیلیٹر پر میرے پاؤں کا دباؤ ضرور کم ہو گیا تھا اور وہ اس لیے کہ اس لڑکی کی صورت مجھے کچھ شناسا محسوس ہوئی تھی۔ ذہن کے کسی گوشے میں کوئی گھنٹی سی بجی تھی۔

میں زیادہ دور نہیں جا سکا۔ رکتے رکتے بالآخر رک ہی گیا، پھر میں نے گاڑی ریورس کی۔ اس کے قریب پہنچ کر میں نے بریک لگایا اور وہ دروازہ کھول کر بغیر کچھ کہے، بغیر کچھ پوچھے میرے قریب آبیٹھی۔ دور سے وہ جتنی صاف ستھری اور ترو تازہ نظر آرہی تھی، اتنی شاید تھی نہیں۔ مجھے اس کے جسم سے پسینے کی ہلکی سی بو چھوٹتی محسوس ہوئی۔ کار میں دروازہ بند کرتے وقت وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ اس کا چہرہ کچھ ستا ہوا سا تھا۔ آنکھوں کے گوشوں کے قریب ہلکی ہلکی شکنیں تھیں۔ ہونٹ بھی خشک تھے، تاہم مجموعی طور پر اس کی ذات زہد شکن اور اس کی قربت راحت جاں تھی۔

"شکر ہے میں نے پہلی کار کو ہاتھ دیا اور اس میں لفٹ مل گئی۔" چند لمحے بعد وہ بولی۔ کچھ دیر پہلے دوڑنے کی وجہ سے ابھی تک اس کی سانسوں میں ارتعاش تھا۔ "ورنہ مجھے تو یہی اندیشہ تھا کہ اس وقت ویرانے میں تنہا لڑکی کو دیکھ کر کوئی شریف آدمی گاڑی نہیں روکے گا۔"

"گویا بالواسطہ طور پر تم نے یہ فیصلہ دے دیا کہ میں کوئی شریف آدمی نہیں ہوں۔" میں نے مدھم آواز میں کہا۔

"ہو سکتے ہو لیکن کچھ زیادہ نہیں۔" اس کے لہجے میں ہلکی سی شوخی تھی۔

"اور اگر تمہارے اندیشے کے مطابق کوئی شریف آدمی گاڑی نہ روکتا تب تم کیا کرتیں؟" میں نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

"کسی ٹرک میں تو لفٹ مل ہی جاتی۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔

"ٹرک والوں سے تمہیں خوف نہ آتا؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

"خوف؟" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا، پھر دھیرے سے ہنس دی۔ اس کی ہنسی میں خمار کا بوجھل پن تھا اور اس کی وجہ نیند کی کمی نہیں تھی۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کوئی نشہ بھی کیے ہوئے تھی۔

"مذاق مت کرو۔" وہ کھنک دار لہجے میں بولی۔ "مجھے یہ تاثر دینے کی کوشش مت کرو کہ تم مجھے کوئی مصیبت ماری شریف زادی سمجھ رہے ہو۔ تمہیں بھی معلوم ہے کہ میں کوئی پاکیزہ بی بی نہیں اور مجھے بھی خاصی حد تک اندازہ ہے کہ تم کتنے پانی میں ہو۔"

"میں دراصل پانی کا نہیں، خشکی کا جانور ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ میں ذہن پر مسلسل زور دے رہا تھا اور یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کیا میں نے زندگی میں کبھی اسے کہیں دیکھا ہے؟

چند لمحے خاموش رہی۔ اس کی طرف دیکھے بغیر میں نے محسوس کیا کہ وہ کبھی سامنے اور کبھی عقب نما آئینے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دور دور تک کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر نہیں آرہی تھیں۔ تب لڑکی نے وہی حرکت کی جس کی مجھے کسی حد تک توقع تھی۔

اس نے نہایت غیر محسوس طور پر اپنے بیگ سے خنجر نکالا اور میری پسلیوں پر ہولے سے ٹکا دیا کہ اس کی نوک میرے کپڑوں سے گزر کر کھال میں چبھنے لگی۔

"کوئی احمقانہ حرکت نہ کرنا۔ خنجر میرے ہاتھ میں آکر بہت حساس ہو جاتا ہے۔ کسی کی ذرا سی بے احتیاطی برداشت نہیں کرتا۔" اس نے میرے قریب یوں سرگوشی کی گویا کوئی فلمی ہیروئن محبت اور جذبات سے بوجھل کوئی مکالمہ بول رہی ہو۔

عین اس لمحے میرے ذہن میں جیسے جھماکا سا ہوا اور اچانک ہی مجھے یاد آگیا کہ وہ کون تھی۔

کئی برس پہلے میں نے نوعمری میں ہی ایک خونخوار مقابلے کے بعد اپنے استاد شانگ تن سے جوڈو اور کراٹے میں بلیک بیلٹ حاصل کی تھی اور تقریب ختم ہونے پر اپنے گھر جا رہا تھا تو احسان مرزا کے جن تین گرگوں نے مجھے اس کے سامنے پیش کرنے کے لیے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی، ان میں سے ایک یہی لڑکی تھی۔ اس کے بارے میں اس کے ساتھیوں نے کہا تھا کہ خنجر استعمال کرنے میں اس کا ثانی ملنا مشکل ہے۔ مجھے یہ بھی یاد آگیا کہ انہوں نے اس کا نام شکنتلا بتایا تھا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ مجھے اس وقت ایک کار کی سخت ضرورت ہے کیونکہ آوارہ گردی میری زندگی کی واحد مصروفیت ہے۔" اس نے بدستور سرگوشی نما لہجے میں کہا۔ "اور

ظاہر ہے رولز رائس میں بیٹھ کر انسان ہوٹلوں سے مفت کھانا وغیرہ کھا تا نہیں پھر سکتا' اس لیے مجھے پیسوں کی بھی ضرورت ہوگی۔ تم ایسا کرو کہ گاڑی ایک طرف روک کر بریف کیس ینہیں چھوڑ کر اتر جاؤ۔"

"جان من! ذرا سوچو تو اس ویرانے میں خالی ہاتھ گاڑی سے اتر کر میرا کیا بنے گا؟" میں نے مصنوعی لجاجت سے کہا..... "تم ایسا کیوں نہیں کرتیں کہ گاڑی بھی لے لو' پیسے بھی لے لو لیکن مجھے پونا تک چھوڑ دو۔"

"یہ تو اسی صورت میں ممکن تھا جب میں پرلے درجے کی احمق ہوتی اور فرض کر لیتی کہ میں پونا تک گاڑی ڈرائیو کروں گی اور اس دوران تم نہایت سعادت مندی سے گردن جھکائے میرے پاس بیٹھے رہو گے۔ پونا پہنچ کر میرا شکریہ ادا کر کے اتر گے اور اپنے راستہ لو گے۔" اس نے خنجر پر دباؤ بڑھا دیا۔ "بس اب زبان روک رہو اور شکاری مردوں کی طرح مزید گفتگو بند کرو۔ مجھے شکاری قسم کے مردوں سے سخت نفرت ہے۔ سیدھے سادھے اور معصوم مرد مجھے بہت اچھے لگتے ہیں مگر بدقسمتی سے ایسا کوئی مجھے مشکل ہی سے نظر آتا ہے اور نظر آتا ہے تو میرے قریب پہنچتے ہوئے بھی ڈرتا ہے۔"

"تم اپنی نظر خاص سے نہیں دیکھ رہیں ورنہ آدمی تو میں بھی خاصا سیدھا سادہ اور معصوم ہوں شکنتلا دیوی!" میں نے قدرے شوخی سے کہا۔

وہ بری طرح چونک پڑی۔ حیرت سے اچھل نہیں' تاہم اس کے ہاتھ میں دبا ہوا خنجر کچھ پیچھے ہٹ گیا۔ چند لمحے تک وہ خاموش رہی۔ گویا فیصلہ نہ کر پا رہی ہو کہ کیا کہے۔ میں نے ہاتھ بڑھایا اور سوئچ دبا کر چھت کی بتی جلا دی۔ کار میں دودھیا سی روشنی پھیل گئی۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا' وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے مجھے گھور رہی تھی۔

"تم کوئی پرانے شناسا معلوم ہوتے ہو۔" بالآخر وہ بڑبڑائی..... "شکنتلا تو میرا اس دور کا نام ہے جب میں احسان مرزا کے پاس ہوا کرتی تھی۔ اب تو میرا نام کافی عرصے سے بدلتا چلا آ رہا ہے۔"

"گویا اب تم احسان مرزا کے پاس نہیں ہو؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے اختصار سے جواب دیا اور ایک لمحے کے توقف کے بعد دوبارہ میری شناخت کے موضوع پر آتے ہوئے بولی۔ "مجھے زندگی میں اتنے مردوں سے واسطہ پڑا ہے کہ میں ان سب کے نام اور صورتیں یادداشت کے خانے میں محفوظ نہیں رکھ سکتی' اس لیے تم خود ہی بتا دو کہ تم کون ہو!"

میں نے اسے بتایا تو یکدم وہ اچھل پڑی..... "ہاں.....ہاں..... مجھے یاد آ گیا۔" وہ پرجوش لہجے میں بولی۔ "اس وقت تم بہت پیارے نوخیز سے' گول سے لڑکے تھے۔ مرے ساتھ پھنسے تو تم سا کوئی نہ تھا لیکن تم کچھ زیادہ ہی بڑے بدصورت سے لگ رہے ہو ورنہ

میں مردوں کے بارے میں یادداشت بے حد کمزور ہونے کے باوجود شاید تمہیں پہچان لیتی کیونکہ پہلی بار جب میں نے تمہیں اسٹیج پر شانتی تن سے مقابلہ کرتے دیکھا تھا تو میرے دل میں کھب کر رہ گئے تھے۔ تمہارے بارے میں' میں نے جانے کیا کیا خواب دیکھے تھے۔ ایک لمحے کے اندر اندر تصور ہی تصور میں تمہیں اپنی ذات میں مدغم کر کے جانے کن فضاؤں کی طرف پرواز کر گئی تھی۔"

"ان خوابوں میں سے کوئی ایک آدھ ٹوٹا پھوٹا خواب بھی اب اسٹاک میں باقی نہیں رہا کیا؟" میں نے کن انکھیوں سے ایک لمحے کے لیے اس کی طرف دیکھ کر شریر لہجے میں پوچھا۔

اس نے اب اپنی طرف کے دروازے سے ٹیک لگا کر جسم ڈھیلا چھوڑ دیا اور خنجر ڈیش بورڈ پر رکھ دیا۔ پھر اس نے اپنی پی کیپ اتار کر قدرے میلے مینے لیکن ملائم بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے تھکے تھکے لہجے میں کہا..... "نہیں.....اب کوئی خواب باقی نہیں رہا۔" میرے لہجے کی شرارت کے برعکس اس کے لہجے میں خمار میں لپٹی ہوئی ایک عجیب سی یاسیت شامل تھی۔ "وقت نے سارے خواب چھین لیے۔ ویسے بھی ہم جیسے لوگوں کو خوابوں کی نہیں' مکروہ حقائق کی دنیا میں رہنا ہوتا ہے۔ وہ تو میں ویسے ہی ذرا دل بہلانے کو خواب دیکھ لیا کرتی تھی۔ اب ان کی بھی عادت نہیں رہی۔"

گرد و پیش پر نہایت بوجھل سا سناٹا چھایا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ رات کے سناٹے میں صرف رولز رائس کے انجن کی آواز سوئی ہوئی بلی کی خرخراہٹ کی طرح ابھر رہی تھی یا پھر کبھی کبھار گونجنے والی کسی جھینگر یا مینڈک کی آواز اس سکوت کو مجروح کر رہی تھی۔

"ویسے تم اتنے زیادہ کیوں بدل گئے ہو؟" اس نے کھڑکی کے شیشے پر سر کا پچھلا حصہ ٹکا کر نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا..... "مجھے کچھ زیادہ ہی اجنبی اجنبی لگ رہے ہو۔ نہ جانے میری کونسی حس کہہ رہی ہے کہ تمہیں ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا؟"

"بس.....تغیرات ہیں زمانے کے"..... میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ میں نے اسے یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ میں نے اپنے حلیے میں معمولی سی تبدیلیاں بھی کر رکھی ہیں۔

میں نے ایک لمحے توقف کے بعد پوچھا..... "احسان مرزا کا ساتھ چھوڑنے کے بعد کیا کرتی رہی ہو؟"

"بس میں عجیب و غریب زندگی گزارتی رہی۔ کٹی پتنگ کی طرح ادھر سے ادھر ڈولتی رہی۔ آوارہ گردی کرتی رہی۔" اس نے تھکی تھکی سی طویل سانس لی۔ "کبھی میں کہیں ملازمت حاصل کر لیتی اور شریفانہ انداز میں شب و روز گزارنے لگتی۔ اس سے دل بھر جاتا تو چوروں کے کسی گروہ میں شامل ہو جاتی۔ اس سے بھی من اکتا جاتا تو کسی سیٹھ کی داشتہ

بن جاتی لیکن سینہ لوگوں سے میری زیادہ نہیں بنتی تھی کیونکہ وہ جلد ہی محسوس کر لیتے تھے کہ میں کوئی خطرناک چیز ہوں اور شرفاء قسم کے سیٹھ بھی بے ضرر قسم کی لڑکیوں کو دوست بناتے ہیں۔"

"کبھی میں یونہی کسی آسودہ حال قسم کے بابوؤں سے دوستی بڑھا لیتی اور اس سے اپنا خرچہ بندھوا لیتی۔ اگر یہ سلسلہ بھی ٹوٹ جاتا اور روپے پیسے کی طرف سے میرا ہاتھ بہت ہی تنگ ہو جاتا تو میں فلم کا آخری شو دیکھ کر آنے والوں میں سے کسی کو کسی تاریک گلی میں روک کر ان کی گردن پر خنجر رکھ کر اس کی جیب میں جو کچھ ہوتا نکلوا لیتی۔ کبھی میں لمبے سفر پر ہوتی اور مجھے کار وغیرہ کی ضرورت ہوتی تو وہ بھی میں اسی طرح لات سے کر کسی سے چھین لیتی اور جب میری ضرورت پوری ہو جاتی تو کہیں چھوڑ دیتی۔"

دفعتاً" وہ عجیب سے انداز میں ہنسی اور خاموش ہو گئی۔ "خاموش کیوں ہو گئی؟" میں نے ایک لمحے کے انتظار کے بعد کہا۔ میں نے پوری کوشش کی تھی کہ میرے لہجے سے خاص تجسس کا اظہار نہ ہو۔

"پھر یہ کہ مجھے عشق ہو گیا اور وہ بھی ایک شکاری سے۔" اس نے پہلو بدل کر ایک بار پھر بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ "بڑا نڈر آدمی تھا۔ اس کے ساتھ رہ کر مجھے زندگی کارآمد محسوس ہونے لگی۔ ہم اکٹھے شکار پر جاتے۔ کیمپنگ کرتے۔ میں گویا بغیر شادی کے اس کی بیوی، بغیر کسی غرض کے اس کی دوست اور بغیر کسی معاوضے کے اس کی اسسٹنٹ بن گئی تھی۔ ایک مدت بعد مجھے کوئی شخص اچھا لگا تھا اور مجھے کئی بار گمان گزرا تھا کہ اب زندگی بس اسی ڈھب سے گزر جائے گی۔ عادت میری یہی ہے کہ جو ہستی اچھی لگتی ہے، اس سے زندگی کا کوئی پہلو خفیہ نہیں رکھتی، اس لیے بھگت سنگھ سے بھی میری کوئی بات پوشیدہ نہیں تھی۔ بھگت سنگھ اسی شکاری کا نام تھا جس کا میں ذکر کر رہی ہوں۔ اس کی نظر میں تو کسی بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اہمیت تھی تو صرف میری۔

"ابھی چند دن پہلے ہم نے وہاں قریب ہی ریشم نگر کے نواح میں کیمپ لگایا جہاں سے تم نے مجھے لفٹ دی ہے۔ وہاں بھگت سنگھ کے بچپن کے دو اور شکاری دوست بھی مل گئے۔ انہوں نے بھی ہمارے قریب ہی خیمہ لگا لیا۔ رات کو انہوں نے ملاقات کا جشن منایا۔ خوب شراب پی۔ بہت سے بھنے ہوئے تیتر کھائے۔ میں اور بھگت سنگھ اپنے خیمے میں پہنچ گئے۔ دو گھنٹے بعد اچانک بھگت سنگھ نے مجھے کلائی سے پکڑا اور اپنے دوستوں کے خیمے میں لے جا کر بولا..... "میاں! ہم تو جب بھی شکار پر نکلتے ہیں، اپنا سامان پورا رکھتے ہیں بلکہ خاطرداری کے لیے رات بھر رات کی خاطر دوستوں کو ادھار بھی دے دیتے ہیں۔ لو موج کرو۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے ان کی طرف دھکیل دیا۔

"میں یکلخت جیسے آسمان سے زمین پر آ گری تھی۔ میں تو بھگت سنگھ کو دیوتا بنا کر پوجنے

کی تیاریاں کر رہی تھی، وہ تو دلالوں سے بھی بدترین بن گیا تھا۔ میں ٹکر ٹکر اس کی طرف دیکھنے لگی تو بولا..... "اتنی حیران کیوں ہو رہی ہے؟ تیرے لیے کوئی مشکل کام ہے کیا؟ یا کوئی نئی بات ہے؟"

"سوال تو اس کا برحق تھا لیکن اس گینڈے کے بچے کو یہ معلوم نہیں تھا کہ عورت کا مان بھی کوئی چیز ہوتا ہے۔ اس نے یہ مان توڑ دیا۔ میں صرف اسی کی ہو کر رہنے کا خواب دیکھنے لگی تھی مگر اس نے میرا یہ خواب توڑ دیا تھا۔ میرے ماضی کی وجہ سے مجھے محض ایک پتھر ہی سمجھا تھا کہ ٹھوکر ماری تو ادھر لڑھکا دیا اور ٹھوکر ماری تو ادھر اچھال دیا۔

"بھگت سنگھ نے مجھے دھکا کیا دیا، میرے سینے میں جیسے کوئی چیز چھن سے ٹوٹ کر رہ گئی۔ میں نے اس سے کہا..... "میں تمہاری باندی ہوں، تمہاری خوشی میری خوشی ہے لیکن پہلے اپنے خیمے میں چل کر میری ایک بات سن لو۔" وہ میرے ساتھ خیمے میں پہنچا تو میں نے اونچی لگا کر اسے گرایا اور اس کے گلے پر خنجر پھیر دیا۔ پھر میں نے باری باری اس کے دونوں دوستوں کو بھی آواز دے کر بلایا اور انہیں بھی قربانی کے بکروں کی طرح ذبح کر دیا....."

"تم نے ان تینوں کو قتل کر دیا؟" میں نے ہلکی سی حیرت سے کہا۔

"ہاں..... فوری طور پر میرا یہی جی چاہا تھا....." اس نے سکون سے جواب دیا۔

"ایک بات بتاؤ شکنتلا.....!"

"مجھے اب شکنتلا مت کہو۔" اس نے میری بات کاٹ دی۔ "یہ نام مجھے اب اجنبی اجنبی سا لگتا ہے اور جب احساس ہوتا ہے کہ مجھے ہی مخاطب کیا جا رہا ہے تو لاکھ بے حس ہو جانے کے باوجود کئی پرانے زخموں کی اذیت جاگ اٹھتی ہے۔

اب میں کیٹی کہلانے کی عادی ہو چکی ہوں۔ اب پوچھو کیا پوچھنے لگے تھے؟"

"میں یہ پوچھنے لگا تھا کیٹی کہ اگر میں تمہیں اپنی دوست، اپنی ساتھی شمار کرنے لگوں تو تم کس حد تک مجھ سے وفادار ثابت ہو سکتی ہو؟"

"میں اب زندگی میں کسی بھی مرد سے کوئی وعدہ نہیں کر سکتی۔" اس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ "لیکن اپنے بارے میں ایک بات میں ضرور جانتی ہوں۔ کچھ عورتیں شہرت کی بھوکی ہوتی ہیں، کچھ محبت کی اور کچھ دولت کی لیکن میں صرف تھوڑی سی عزت کی بھوکی ہوں۔ میں نے دنیا میں سب کچھ دیکھ لیا، ہر چیز سے میرا دل بھر چکا ہے۔ میں نے جو کچھ گنوایا، اس پر مجھے کسی سے کوئی شکوہ نہیں۔ حالات کی مجھے کوئی شکایت نہیں۔ تقدیر سے مجھے کوئی گلہ نہیں۔ کچھ پانے کی کوئی تمنا نہیں۔ شاید میرے اندر مدفون عورت کی کسی رگ میں انا کی کوئی رمق باقی ہے جو مجھے تمام تر لاابالی پن کے باوجود بے چین رکھتی ہے۔ بس اب مجھے تھوڑی سی عزت، تھوڑا سا احترام چاہیے۔ میں چاہتی ہوں کہ میں اب کتوں کے

ٹول میں پڑی ہوئی ہڈی بن کر نہ رہوں..... کوئی ہو جو بے شک میرے وجود سے اپنا تن من پر جائے لیکن اس کے صلے میں مجھے صرف عزت دیئے رکھے۔ میری کچلی ہوئی عزت نفس کو مزید نہ کچلے۔ میری ہی نظروں میں مجھے گرائے نہ رکھے۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا....؟" اس کے لہجے میں الجھن بھی تھی اور ایک موہوم سی امید بھی۔

"خوب سمجھ رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ میرے ذہن کے کل پرزے تیزی سے حرکت کر رہے تھے..... "اور تم مجھے ملی بھی بڑے صحیح وقت پر ہو۔ ایسا وقت جو ہم دونوں ہی کے لیے بہت مناسب ہے۔ میں عام طور پر کسی پر اندھا اعتماد نہیں کیا کرتا لیکن تمہارے معاملے میں میں جوا کھیل رہا ہوں۔ آج سے تم میرے رفیقوں میں ہو..... اور اپنے رفیقوں کو میں اپنے دست و بازو سمجھتا ہوں۔ میں صرف انہی سے جانثاری کی توقع نہیں رکھتا خود کو بھی ضرورت پڑنے پر ان پر قربان ہو جانے کے لئے تیار رکھتا ہوں۔"

"مجھے تمہاری بات پر یقین ہے اور میں نے فرض کر لیا ہے کہ مجھے ہر سوال کا جواب مل گیا ہے۔" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور سیٹ کے خاص ساخت کے پشتے سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ "میں اب سونے لگی ہوں۔ سفر ختم ہو جائے تو مجھے جگا دینا۔"

"سفر اب ختم ہونے ہی والا ہے' اب سونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں پونا آ رہا تھا اور اب ہم پونا کے مضافات میں داخل ہو چکے ہیں۔"

"اوہ..." اس نے تھکے تھکے انداز میں آنکھیں کھول دیں اور میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ زندگی بھر کی جہاں گردی کے باوجود اس کمبخت کا چہرہ کسی لٹے پٹے مسافر کا چہرہ نہیں تھا۔ نہ جانے کتنے نعیدے لٹیروں نے اس خزینہ حسن و کشش کو لوٹا تھا مگر اب بھی اتنا کچھ باقی تھا کہ ایک نظر ڈالنے سے ہوش و خرد کے پاؤں ڈگمگاتے تھے۔ نہ جانے اس کم کردہ راہ لڑکی نے اپنا آپ کیسی بیدردی سے لٹایا تھا مگر خمیر میں دست قدرت نے جو ملاحت جو صباحت گوندھ دی تھی' اسے جدا کرنا شاید کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔

"تمہارا ٹھکانہ آج کل بمبئی میں ہے؟" اس نے پوچھا۔ میں نے سڑک کی طرف دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

"بڑا ذلیل شہر ہے۔" اس نے بلا تامل کہا۔ "لیکن کمبخت کی مٹی میں نہ جانے کونسا مقناطیس چھپا ہوا ہے کہ وہاں کا رہنے والا کہیں بھی چلا جائے' واپس اسی کی طرف کھنچا آتا ہے۔ میں سارا ہندوستان گھومی' مشرقی بنگال بھی چھان مارا۔ نیپال اور تبت تک چلی گئی لیکن گھوم پھر کر وہیں واپس آ جاتی تھی۔ اب بھی میرا ارادہ کسی سے کار چھیننے کے بعد پہلے بمبئی ہی کی طرف جانے کا تھا۔ حالانکہ سردست وہاں میرا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔"

"اور میرا حالانکہ سب کچھ ہی بمبئی میں ہے۔" میں نے کہا۔ "پھر بھی جانے کیوں مجھے اپنا آپ وہاں مسافر مسافر لگتا ہے۔ بمبئی جیسے میرے لیے محض ایک پڑاؤ ہے۔ میری منزل کوئی اور ہے جس کی طرف جلد یا بدیر مجھے جانا ہے۔"

"تم دراصل کوئی اونچی چیز ہو اور کسی لمبے ہی چکر میں ہو۔" وہ ٹانگیں پھیلاتے ہوئے بولی۔ "تمہاری روح ہم جیسوں سے کہیں زیادہ طاقتور ہے اور اتنی ہی مضطرب بھی۔"

میں صرف مسکرا کر رہ گیا۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ جتنی بھی شاطر اور گرگ باراں دیدہ قسم کی شخصیتوں سے میرا واسطہ پڑا تھا' چھوٹتے ہی ان سب نے میرے بارے میں کم و بیش یہی تجزیہ کیا اور یہ وہ سب لوگ تھے جنہیں کسی کو لفٹ دینے کی حاجت یا عادت نہیں تھی۔

اس کے بعد سفر خاموشی سے طے ہوا۔ چند منٹ بعد ہم پونا میں داخل ہوئے اور میں نے ہوٹل شامریس کا رخ کیا۔ شامریس پہنچ کر میں نے ایک ڈی لکس سوٹ کی فرمائش کی جو ریزرویشن نہ ہونے کے باوجود خوش قسمتی سے مجھے مل گیا۔ نینی نے تو سوٹ کے بیڈ روم میں پہنچتے ہی روم سروس سے اسکاچ وسکی کی ایک بوتل منگوائی اور بے صبری سے دو پیگ تیار کر کے پیئے اور دھم سے بستر پر جا گری۔ میں ابھی جوتے بھی نہیں اتار پایا تھا کہ وہ گہری نیند سو گئی۔ اس کے ہونٹ نیم وا تھے اور ناک سے ہلکی ہلکی خراہٹ کی آواز خارج ہو رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک مدت بعد اسے اطمینان اور آرام کی نیند نصیب ہوئی ہے۔

اسے سوتی چھوڑ کر میں کمرۂ نشست میں آیا اور ٹیلی فون اسٹینڈ کے قریب رکھی ہوئی ڈائریکٹری اٹھا کر اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ ڈی ایس پی نرل داس کے آفس اور گھر کا فون نمبر اور ایڈریس مجھے بغیر کسی دقت کے مل گیا۔ اس کے گھر کے ایڈریس سے مجھے اندازہ ہوا کہ موصوف کو سول لائنز میں بنگلہ ملا ہوا تھا۔ سول لائنز زمانہ طالب علمی میں میرا دیکھا بھالا علاقہ تھا۔

اس کے گھر کا نمبر وغیرہ نوٹ کرنے کے بعد میں کپڑے بدل کر بستر پر جا لیٹا اور کچھ دیر سوچ بچار کرنے کے بعد میں سو گیا۔ صبح دن چڑھے میری آنکھ کھلی۔ نینی بدستور بے سدھ سو رہی تھی۔ میں تیار ہو گیا' تب بھی وہ سوتی رہی۔ میں نے اسے جگانا ضروری نہیں سمجھا اور اس کے لیے ایک رقعہ لکھ کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا کہ جب وہ اٹھے تو ناشتہ وغیرہ منگوا لے' میرا انتظار نہ کرے' شام کرنے تک میں موجود رہے۔

میں نے ناشتہ نیچے ڈائننگ ہال میں کر لیا اور پھر بازار روانہ ہو گیا۔ میں بمبئی سے کچھ اور سوچ کر چلا تھا لیکن اب نئے حالات کی مناسبت سے میں نے اپنے لائحہ عمل میں کچھ تبدیلیاں کی تھیں اور اس تبدیلی کی وجہ سے میں نے بازار سے کچھ چیزیں خریدیں جن میں ایک قیمتی برتھ بھی شامل تھا۔

میں ہوٹل واپس آیا تو نینی ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر بیٹھی ہوئی تازہ ترین انگلش اخبار

بڑھ رہی تھی۔ اس کا لباس گو کہ وہی تھا لیکن صرف غسل کرنے سے ہی گویا اس کی شخصیت بدل کر رہ گئی تھی۔ وہ اس قدر نکھری نکھری' تازہ دم اور پرکشش لگ رہی تھی کہ میں ایک لمحے کے لئے اسے سراپا دیکھے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ گویا لڑکی نہیں چاندی کا ایک مجسمہ تھی جو کل تک میل کچیل میں تھتڑا ہوا تھا مگر آج کسی ماہر ہاتھ نے جیسے اسے کسی طلسمی محلول سے دھو دھلا کر چمکا دیا تھا۔ تھکن' اضمحلال اور گزرے ہوئے ظالم لمحوں کے نقش قدم بھی جیسے اس کی شخصیت پر سے یکسر معدوم ہو گئے تھے۔

میں اس کے لیے اندازاً سائز کا تعین کر کے ایک شلوار قمیص اور ایک جینز جیکٹ لے آیا تھا۔ سروست میں نے اسے شلوار قمیص پہننے کے لیے دی۔ پھر میں نے کیٹی کو اس کے حصے کا کام سمجھایا کہ اسے کیا کچھ کرنا ہے۔ اس نے صرف اسے ہی ذہن نشین کیا اور مجھ سے نہیں پوچھا کہ میں کیا کروں گا' یہ کہ اس مسئلے کا سیاق و سباق کیا ہے یا اس کے بعد کیا ہوگا۔ ہر معاملے میں سمجھی ہوئی لڑکی تھی۔ فالتو سوالات نہیں کرتی تھی۔

میری ہدایت کے مطابق پہلے اس نے نرمل داس کے گھر کے نمبر پر فون کیا۔ میں کمرہ نشست کی ایکس ٹینشن پر گفتگو سننے کے لیے موجود تھا۔ دوسری طرف سے ریسیور اٹھانے والی غالباً نرمل داس کی ملازمہ تھی۔ اس نے نہایت کوفت اور اجڈ سے لہجے میں "ہیلو" کہا۔ کیٹی نے انگریزی بولنی شروع کر دی۔ "نرمل داس صاحب کب گھر آئیں گے؟" اس نے شیریں لہجے میں پوچھا۔

"ہندی میں بات کرو بی بی!" دوسری طرف سے عورت نے بدستور اکھڑے اکھڑے لہجے میں کہا۔ "مجھے انگریزی دنگریزی نہیں آتی۔"

"تم کون ہو؟ خادمہ؟" کیٹی نے ہندی میں پوچھا۔

"پتا نہیں کیوں ہر ایک میری آواز سن کر مجھے ملازمہ ہی سمجھتا ہے۔" دوسری طرف سے عورت غالباً اپنی دانست میں بڑبڑائی لیکن یہ بڑبڑاہٹ بھی کچھ کم بلند نہیں تھی۔ "ارے بابا میں نرمل داس کی پتنی ہوں..... گھر والی..... جورو..... بیوی..... سمجھیں؟"

"عام طور پر وہ کس وقت گھر آتے ہیں؟" کیٹی نے پوچھا۔

"اس کا گھر آنے یا گھر سے جانے کا کوئی وقت مقرر نہیں' ویسے رات دس بجے سے پہلے بہرحال وہ زندگی میں کبھی گھر نہیں آیا....." نرمل داس کی بیوی نے کہا۔ پھر اس کے لہجے میں ہلکا سا شک آمیز تجسس در آیا۔ "کیا کام تھا تمہیں اس سے؟"

"وہ جی بس..... جائیداد کا ایک جھگڑا ہے....." کیٹی نے گویا جھجکتے ہوئے کہا۔ "میں ذاتی طور پر نرمل صاحب سے آ کر ملوں گی۔ مجھے ان کے ایک دوست نے ان سے رابطہ قائم کرنے کے لیے کہا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ نرمل صاحب چٹکی بجاتے ہی میرا مسئلہ طے کروا دیں گے....."

"کیوں نہیں' کیوں نہیں....." نرمل کی بیوی نے چہکتے ہوئے لہجے میں کہا..... "اسے اس کا حصہ مل جائے تو وہ واقعی چٹکی بجاتے ہی کام کر دیتا ہے..... خاص کر جوان اور خوبصورت مصیبت زدہ عورتوں کے کام کرنے کا تو اسے زبردست شوق ہے۔" آدھی آدھی رات کو اٹھ کر ان کے ساتھ چل دیتا ہے۔" نرمل کی بیوی نے گویا مزید گفتگو کی ضرورت محسوس نہ کرتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔

پھر میں نے بیڈ روم میں بھی ریسیور کے رکھے جانے کی آواز سنی۔ ساتھ ہی کیٹی کا قہقہہ سنائی دیا۔ "بیچاری بہت ہی دکھیا معلوم ہوتی ہے۔" یہ وہیں سے با آواز بلند بولی۔

میں ایکس ٹینشن کا ریسیور رکھ کر بیڈ روم میں اس کے پاس پہنچا۔ رات ہونے کو ہے۔ میں ایک چھوٹا سا کام کر آؤں' تم تیار رہنا۔ میرے واپس آتے ہی ہمیں نرمل داس سے ملاقات کے لیے روانہ ہونا ہوگا۔"

"میں تمہیں تیار ملوں گی۔" اس نے ادھ کھلی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میرا دل پھر سے بے ایمان ہونے لگا تھا لیکن سر کو جھٹک کر میں سنگھار میز کی طرف بڑھ گیا۔

میں نے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ میرا معمولی سا تبدیل شدہ حلیہ بدستور برقرار تھا۔ میں نے ابھی تک کیٹی کو احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ میں نے اپنے حلیے میں کچھ تبدیلیاں کر رکھی ہیں۔ مطمئن ہو کر میں سوئٹ سے نکل آیا۔

گاڑی میں بیٹھ کر میں چاندنی چوک کی طرف چل دیا۔ دلی کے چاندنی چوک کی طرح پونا کا چاندنی چوک کوئی بارونق یا معروف جگہ نہیں تھی۔ یہ ایک متوسط سی کالونی کا چوراہا تھا۔ پونا میں رہنے کے دوران وہاں سے آتے جاتے میں نے کبھی دھیان نہیں دیا تھا کہ وہاں کوئی شراب خانہ موجود ہے یا نہیں لیکن آج میں نے وہاں پہنچ کر ابھی چورنگی کے گرد چکر بھی مکمل نہیں کیا تھا کہ ایک گلی کے کونے پر مجھے "چارلیز" کا نیون سائن نظر آ گیا۔

چارلی کے بار کی بغلی دیوار کے ساتھ پارکنگ کے لیے خاصی جگہ موجود تھی۔ گاڑی پارک کر کے میں بار میں داخل ہوا تو میرا خیال یہی تھا کہ وہ کوئی معمولی درجے کا شراب خانہ ہوگا لیکن اندر پہنچ کر میری یہ غلط فہمی دور ہو گئی۔ شراب خانے کی آرائش میں نہایت بیش قیمت سامان استعمال کیا گیا تھا۔

ہال کے آخر میں ایک گوشے میں مجھے ایک میز پر ایک سگریٹ کا سلگتا ہوا سرا نظر آیا جسے ایک انگلی بار بار مضطربانہ انداز میں چھو رہی تھی۔ مدن نے مجھے بتایا تھا کہ وشنو بے خیالی کے سے عالم میں بار بار انگلی سے سگریٹ کا گل جھاڑتا رہتا ہے۔ میں سیدھا اس میز کی طرف بڑھ گیا۔

اب میری آنکھیں مدھم روشنی سے مانوس ہو چکی تھیں اور جب میں کرسی کھینچ کر اس

www.paksociety.com

شخص کے سامنے بیٹھ چکا تھا تو مجھے اس کی صورت بھی کافی حد تک صاف نظر آئی۔ مدن کی بتائی ہوئی دیگر نشانیاں بھی اس میں موجود تھیں۔ وہ دبلا پتلا طویل القامت اور سانولا تھا۔ ہال کی مدھم روشنی میں سیاہ فام ہی نظر آ رہا تھا اور اس کی آنکھوں کی سرخی کچھ اور بھی گہری لگ رہی تھی۔

"مجھے مدن نے بھیجا ہے۔" میں نے سرگوشی نما لہجے میں کہا۔

"اوہ!" اس کے ہونٹوں سے اتنی ہلکی آواز نکلی جو بمشکل سنی جا سکتی تھی اور میں نے محسوس کیا کہ اس کے جسم پر چھایا ہوا تناؤ دور ہو گیا ہے۔

"کیا پیو گے؟" اس نے دوستانہ لہجے میں کہا۔

"ٹھنڈا پانی"...... میں نے جواب دیا۔

"اس میں کچھ ملاؤ گے نہیں؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں...... میں ہر چیز خالص پینا پسند کرتا ہوں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"کیا کام ہے...... بولو؟" اس نے مدھم اور سپاٹ لہجے میں کہا اور کچھ آگے کو جھک گیا۔

"یہاں نہیں......" میں نے محتاط انداز میں چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "باہر چلتے ہیں۔ گاڑی میں بیٹھ کر ذرا آوارہ گردی کریں گے اور ساتھ ساتھ بات بھی طے کر لیں گے۔"

"ٹھہرو یہ ختم کر لوں۔" اس نے گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔ اس نے گلاس ایک ہی سانس میں خالی کر دیا اور ہم اٹھ کر باہر آ گئے۔

"مدن آج کل غائب کہاں ہے؟" اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اس وقت بمبئی کے ایک عالیشان بنگلے میں ایک لونڈیا کے ساتھ بیٹھا ہو گا۔" میں نے جواب دیا۔

وہ جیسے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے بولا۔ "تمہیں مجھ سے کس نوعیت کا کام ہے؟ گولی کا، خنجر کا، تیزاب کا یا آتشزنی کا؟"

"بتا تا ہوں، ایسی جلدی بھی کیا ہے۔" میں نے کہا...... ذرا شہر کی بھیڑ بھاڑ سے تو کہیں دور نکل چلیں......" پھر جیسے مجھے کچھ یاد آ گیا۔ "ویسے تم نے اس لڑکی کے بارے میں بڑی صفائی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہی اس پر ریلوے سٹیشن پر تیزاب پھینکا تھا۔"

"وہ...... ہاں......" اس نے مدھم مگر سفاکانہ سا قہقہہ لگایا۔ "اس کام میں لطف بھی کچھ زیادہ ہی آیا تھا۔ لڑکی بہت زیادہ خوبصورت تھی نا...... اور چیز جتنی زیادہ حسین ہو، اسے بگاڑنے یا مٹانے میں اتنا ہی زیادہ مزا آتا ہے مجھے......" وہ اپنے پتلے پتلے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بظاہر سڑک کی طرف دیکھ رہا تھا مگر چشم تصور سے اسی منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس لمحے میرا جی چاہا کہ وہیں گاڑی روک کر

اس بدبخت کو لکڑی کی طرح درمیان سے توڑ دوں لیکن پھر میں نے اپنے آپ کو سمجھایا۔ "جذباتیت تمہارے لیے ممنوع ہے برخوردار! صبر و سکون سے چلتے رہو۔"

کچھ دیر بعد ہم شہر کے کنارے پہنچ گئے۔ سڑک نہر کے کنارے کنارے تین چار فٹ کی بلندی پر تھی جس پر اس وقت آمد و رفت نظر نہیں آ رہی تھی کیونکہ یہ سڑک محض دیہات کو آپس میں ملاتی تھی۔ ایک طرف درختوں کی قطار اور دوسری طرف نہر کی موجودگی نے اس تنگ سی سڑک کو بے حد خوبصورت بنا دیا تھا لیکن دو میل آگے جا کر یہ سڑک گھنے جنگل میں تبدیل ہو گئی تھی اور اس کے ایک کنارے پر جا بجا گھنے درختوں کے بڑے بڑے جھنڈ موجود تھے۔ اس علاقے سے کبھی کبھار کسی لرزہ خیز جرم کی بازگشت سنائی دے جاتی تھی۔ اس ویرانے میں درختوں کے ان بڑے بڑے جھنڈوں میں جرائم پیشہ لوگ اپنا ڈرامہ کھیل جاتے تھے جو عرصے تک زبان زد عام رہتا تھا۔ اسی لیے شرفاء سیر و تفریح کی غرض سے بھی اس سڑک کا رخ نہیں کرتے تھے۔

ایسے ہی ایک جھنڈ کے قریب میں نے گاڑی روکی اور دشنو کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور خود اپنا بریف کیس اٹھاتے ہوئے جھنڈ کی طرف چل دیا۔

ہم آمنے سامنے دو پتھروں پر بیٹھ چکے تو میں نے بریف کیس ایک طرف رکھتے ہوئے دشنو کی سیاہ سرخ آنکھوں میں جھانکا اور یکلخت گویا کوئی غیر مرئی فرد جرم پڑھتے ہوئے کہا۔ "دشنو! اس وقت تم میرے ذاتی بیت الانصاف میں موجود ہو اور میں تمہیں محض تھوڑی سی دولت کی خاطر ایک بے گناہ لڑکی کا چہرہ تیزاب سے مسخ کرنے کے جرم میں موت کی سزا سناتا ہوں۔ میں تمہیں موت سے زیادہ اذیت ناک سزا دے سکتا تھا لیکن میں صرف اس لیے یہ سزا تجویز کر رہا ہوں کہ اس لڑکی کا چہرہ درست ہونا ممکن ہو گیا ہے۔ اگر یہ کام ناممکن ہوتا تو تمہاری سزا موت سے بھی زیادہ اذیت ناک ہو جاتی۔"

وہ ایک ٹک میری طرف دیکھ رہا تھا اور میرے الفاظ گویا اس کی سماعت سے بالا ہی بالا گزر رہے تھے۔ اس نے فوری طور پر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا، تاہم اس کی آنکھوں میں ہلکے سے تمسخر کی چمک جھلک آئی تھی۔

"یہ کس قسم کا مذاق ہے یا کسی فلمی خدائی فوجدار کے مکالمے؟" اس نے پلکیں جھپکائے بغیر سنجیدگی سے پوچھا۔

"میں نے تمہارے لیے موت کا یہ طریقہ تجویز کیا ہے کہ" میں نے گویا اس کے سوال پر دھیان دیے بغیر بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "تمہیں ذبح کر کے تمہاری لاش کے ٹکڑے کر کے نہر میں بہا دیے جائیں۔ اب تم آرام سے ادھر گھاس پر لیٹ جاؤ اور زیادہ اچھل کود مت مچانا تاکہ میرے کپڑے وغیرہ خراب نہ ہوں۔"

میں نے بازو کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور میرا خنجر آستین سے پھسل کر میرے ہاتھ میں آ گیا۔

وشنو نے اب بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ وہ بدستور پلکیں جھپکائے بغیر میری طرف دیکھ رہا تھا' تاہم میں اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں تشویش کی ہلکی سی لہر نمودار ہوتے دیکھ رہا تھا۔

"تم پاگل تو نہیں ہو؟" اس نے پہلے سے زیادہ سنجیدگی سے کہا۔

"ہاں..... اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلے میں میری سنجیدگی میرے شکار کو پاگل پن ہی محسوس ہوتی ہے لیکن صرف چند لمحوں کے لیے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر میں اٹھا اور خنجر ہاتھ میں تھامے اس کے قریب پہنچا۔ اس کا بدستور ساکت بیٹھے رہنا مجھے کچھ عجیب لگ رہا تھا۔

دفعتاً اس نے دونوں پاؤں جوڑ کر اتنی پھرتی سے میرے پیٹ پر مارنے کی کوشش کی جس کی میں اس سے توقع نہیں کر رہا تھا۔ اس کی ٹانگوں کی یہ حرکت ایسی ہی تھی جیسے حد سے زیادہ کھنچا ہوا ربر کا فیتہ اچانک ہی اپنی بندش سے نکل گیا ہو۔

میں نے اپنے آپ کو بچا تو لیا لیکن میری کلائی پر وشنو کے جوتے کے تلے سے خاصی زوردار چوٹ لگی اور خنجر پر میری گرفت اتنی ہلکی پڑ گئی کہ میں نے اسے چھوڑنا ہی بہتر سمجھا۔ وہ اس وقت تک اچھل کر سیدھا ہونے کے بعد مجھ پر چھلانگ بھی لگا چکا تھا۔ شراب کا نشہ اس پر اتنا غالب نہیں تھا جتنا میں سمجھ رہا تھا اور اس کا مجہول جسم بھی لچک' طاقت اور پھرتی سے اتنا عاری نہیں تھا جتنا میں سمجھ رہا تھا۔

اس کے گھٹنے میرے پیٹ سے ٹکرائے اور ساتھ ہی ایک بازو آکٹوپس کے بازو کی طرح میری گردن کے گرد لپٹ گیا۔ اسے اتنا موقع محض میرے اندازوں کی غلطی کی بنا پر ملا تھا۔ پیٹ پر اس کے گھٹنوں کی ضرب نے مجھے زیادہ تکلیف نہیں پہنچائی تھی البتہ گردن کے گرد لپٹے ہوئے بازو کا شکنجہ حیرت انگیز طور پر سخت تھا اور سانس روکنے کے ساتھ ساتھ گویا میری گردن بھی توڑنے ہی والا تھا۔

غالباً ایک سیکنڈ کے لیے میں نے اپنے آپ کو بدحواس بھی محسوس کیا۔ ایک شخص جسے انسان نے چوہے سے زیادہ حقیر سمجھا ہو' ایک لخت عفریت کی طرح جان کو آجائے تو ایسا محسوس ہونا فطری بات تھی۔ تب میں نے جھرجھری سی لی۔ ازسرنو اپنی توانائی مجتمع کی اور اس سانڈ کی طرح جسم کو جھٹکا دیا جس کی گردن سے سانپ لپٹ گیا ہو۔ وشنو دور جا گرا۔ میں نے گردن کو ہلکا سا جھٹکا دے کر کھنچاؤ دور کیا اور عین اس وقت جبکہ وشنو زمین سے اٹھ کر دوبارہ مجھ پر چھلانگ لگانے کے لیے پاؤں زمین سے اٹھا چکا تھا' میں نے اس کی پسلیوں پر ٹھوکر رسید کی۔ وہ کچھ اپنے زور میں اور کچھ میری ٹھوکر کی وجہ سے ہوا میں خاصا اونچا اچھلا اور چاروں شانے چت زمین پر گرا۔

پھر یکلخت وہ ذبح کیے ہوئے بکرے کی طرح چیخنے لگا' شاید ریڑھ کی ہڈی میں درد کی لہر

اب اٹھی تھی۔ اس کا منہ بند کرنے کے بعد میں نے اس کے سینے پر گھٹنا رکھ کر اس کے ہونٹوں پر اچھی طرح ٹیپ چپکائی اور اسے چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

وہ زخمی سانپ کی طرح جسم کو بل دینے کی کوشش کر رہا تھا لیکن شاید کمر اجازت نہیں دے رہی تھی۔ اس کی پیشانی اور گردن پر کی رگیں مسلسل پھول پچک رہی تھیں۔

"تم نے اپنی موت کو مزید تکلیف دہ بنا لیا وشنو!" میں نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔ "ابھی ابھی جبکہ میں تمہارے ہاتھ پاؤں باندھ رہا تھا تو تمہاری سزا پر عمل درآمد کا ایک اور طریقہ اچانک میرے ذہن میں آگیا۔ اب میں تمہیں ایک اور جگہ لے چلتا ہوں۔ اگر اس طریقے پر عمل درآمد نہ ہو سکا تو پھر تمہیں واپس لا کر ذبح کر دوں گا۔"

اس نے بے بسی سے سر کو دائیں بائیں جھٹکے دیئے لیکن میں نے مزید کچھ کہے بغیر اسے گود میں اٹھایا اور گاڑی میں پچھلی سیٹ پر ڈال دیا۔ میں دروازہ بند کرنے لگا تو اس نے بندھی ہوئی ٹانگیں دروازے میں پھنسانے کی کوشش کی۔

"اب اتنا کس لئے مچل رہے ہو۔ اگر اب جسم کے کسی حصے کو جنبش دی تو میں اسے توڑ دوں گا۔" میں نے اسے تنبیہہ کی۔

میں نے جھٹکے سے دروازہ بند کیا۔ واپس جھنڈ میں آکر اپنا بریف کیس اور خنجر اٹھایا' کپڑے جھاڑے اور گاڑی میں بیٹھ کر کریک کی طرف روانہ ہو گیا۔

چلا گیا۔ پار ایک بہت بڑا شمشان تھا جہاں ہندو اپنی ارتھیوں کو نذر آتش کیا کرتے تھے۔ شمشان کا نگراں بھی اندر ہی ایک جھونپڑی میں رہتا تھا۔

میں جب شمشان پر پہنچا تو گیٹ میری توقع کے مطابق کھلا ہی تھا۔ میں نے گاڑی باہر ہی ایک طرف درختوں کی اوٹ میں چھوڑ دی اور دروازے مقفل کرکے اتر آیا۔ شمشان کے اندر مجھے نگراں کی جھونپڑی کی تلاش میں کافی دور تک چلنا پڑا۔ جا بجا لکڑیوں کے اونچے چوکور انبار دیوہیکل ہیولوں کی طرح راستہ روکے کھڑے تھے اور ان کے درمیان ہوا یوں سرسرا رہی تھی جیسے نذر آتش ہو جانے والے جسموں کی روحیں کسی جائے پناہ کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹک رہی ہوں۔

بعض انبار جن پر ارتھیاں جلائی جا چکی تھیں اور مردے کی راکھ گنگا جل میں بہانے کے لیے لے جائی جا چکی تھی' ان کے موٹے موٹے کوئلوں کے ڈھیر ابھی تک بکھرے پڑے تھے۔ کبھی کبھار کوئی کوئلہ میرے پاؤں تلے آکر چیخ جاتا تھا تو رات کے گہرے سکوت میں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی عفریت نے کوئی ہڈی چبا ڈالی ہو۔

جھونپڑی کے قریب پہنچ کر میں نے دیکھا کہ دروازہ بند تھا البتہ کچی دیوار میں موکھا نما ایک کھڑکی کھلی تھی۔ میں نے احتیاط سے اس کے اندر جھانکا۔ میرے سامنے چارپائی پر ایک قوی ہیکل دھوتی پوش جوان نہایت بے ہودہ طریقے سے جھلنگا سی چارپائی پر اوندھا لیٹا تھا۔ اس کے منہ سے رال بہہ بہہ کر تکیے میں جذب ہو رہی تھی۔ چارپائی کے قریب ہی ایک کونڈی' سوٹا اور مٹی کا بڑا سا پیالہ پڑا ہوا تھا۔ کونڈی میں یقیناً بھنگ گھوٹی گئی تھی جو ابھی کافی مقدار میں باقی تھی۔ چارپائی پر نگراں موصوف بھنگ پی کر دنیا و مافیہا سے بے خبر لیٹے ہوئے تھے۔ میں نے اطمینان کی سانس لی۔ مجھ سے پہلے ہی مسئلہ حل ہو گیا تھا۔

جھونپڑی کے قریب ہی مٹی کے تیل کا ایک ڈرم رکھا تھا جس میں پیتل کی ٹونٹی لگی ہوئی تھی اور تیل نکالنے کے لیے ایک ڈبا بھی پاس ہی پڑا تھا۔ میں نے اطمینان سے ڈبا تیل سے بھرا اور جھونپڑی سے دور نکل آیا۔ میں نے لکڑیوں کا ایک انبار تلاش کیا جو میرے مقصد کے لیے موزوں تھا۔ یہ انبار نہ تو جھونپڑی سے زیادہ قریب تھا اور نہ چار دیواری سے۔ میں نے اس کے نچلے حصے پر اچھی طرح تیل چھڑکا اور ڈبا وہیں پھینک کر شمشان سے

باہر آگیا۔ گاڑی سے وشنو کو نکال کر میں نے بریف کیس سے اپنے ہنگامی سامان سے ایک لائٹر نکالا اور وشنو کو گود میں اٹھا کر شمشان میں لے آیا۔

اب وہ یقیناً میرا مقصد سمجھ چکا تھا۔ پہلے اس نے میری گرفت میں مچلنے کی کوشش کی مگر پھر شاید اس کی کمر کی تکلیف حد سے بڑھ گئی یا دہشت کی زیادتی نے اسے مفلوج سا کر دیا کہ وہ بالکل بے حس و حرکت ہو گیا۔ اس کی ٹانگیں بے جان سے انداز میں جھول رہی تھیں۔

لکڑیوں کا جو انبار میں نے منتخب کیا تھا' اس کے قریب لا کر میں نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر وشنو کو ہاتھوں پر اٹھا کر اوپر لٹایا تب اس کے جسم میں گویا زندگی عود کر آئی۔ وہ اس نے زور لگا کر اوپر سے لڑھکنے کی کوشش کی لیکن میں نے اس کے منہ پر نفرت بھرا گھونسا رسید کرکے اسے دوبارہ چوڑائی کے انبار کے وسط میں پہنچا دیا۔ پھر میں نے انبار پر سے ایک بڑی سی لکڑی اٹھائی اور لائٹر سے آگ دکھا کر چند قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ لکڑی میں نے اس خیال سے پکڑ رکھی تھی کہ اگر وشنو نے دوبارہ لڑھکنے کی کوشش کی تو اسے دور ہی سے واپس دھکیل دوں گا مگر اس میں شاید سکت نہیں رہی تھی یا وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ میری خواہش یہی تھی کہ وہ ہوش میں ہو اور شعلوں کو اپنا جسم چاٹتے کچھ دیر کے لیے ہی سہی اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا۔

شعلے بلند ہونے لگے۔ تیل اور خشک لکڑیوں نے اتنی تیزی سے آگ پکڑی کہ میں حیران رہ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وشنو کا جسم سرخ اور نارنجی شعلوں میں چھپ گیا۔ میں نے مزید وہاں رکنا ضروری نہ سمجھا۔

ہوا میں گوشت جلنے کی بو پھیل چکی تھی جو مجھے بے حد فرحت بخش محسوس ہو رہی تھی۔

گاڑی میں بیٹھتے وقت میں نے گھڑی دیکھی گیارہ بج رہے تھے۔ مجھے بہت تاخیر ہو چکی تھی۔ میں کیتی کو دس بجے کا وقت دے کر آیا تھا' میں تیز رفتار سے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔

ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کر مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کیتی سر کے بل بیڈ پر دیوار کے سہارے کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ورزش......" اس نے آنکھیں کھولے بغیر جواب دیا۔

"یہ کونسا وقت ہے ورزش کا؟" میں نے کہا۔

"میں چونکہ وقت کی پابندی نہیں کر سکتی۔" وہ سیدھی ہوتے ہوئے بولی۔ "اس لیے جب بھی وقت ملتا ہے' کر لیتی ہوں۔ ویسے بھی تمہارا انتظار کرتے کرتے نیند آنے لگی

تھی- میں نے سوچا سو ہی نہ جاؤں-"

"چلو..... اب فوراً نکل چلو-" میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا-

اس نے چند سیکنڈ میں بال برش کیے اور ہینڈ بیگ اٹھا کر میرے پیچھے چل دی- سول لائنز جاتے ہوئے راستے میں کیٹی نے برقع پہن لیا اور چہرہ اس طرح نقاب میں چھپا لیا کہ صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں- سول لائنز میں مطلوبہ نمبر کی کوٹھی تلاش کرنے میں ہمیں قدرے دقت پیش آئی کیونکہ درختوں سے گھرے ہوئے بل کھاتے راستوں پر روشنی کم تھی اور بیشتر کوٹھیاں بھی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھیں-

مطلوبہ کوٹھی تلاش کرنے کے بعد میں نے گاڑی اس سے کچھ فاصلے پر کھڑی کی اور ایک کھڑکی کے قریب پودوں کے درمیان پوزیشن سنبھالی ہی تھی کہ اندر سے ایک بھاری اور کھردری مردانہ آواز سنائی دی- "آج تو دن مندا رہا بھگوان! صرف اڑھائی ہزار روپے کی اوپر کی آمدنی ہوئی ہے..... ایک تو آج کل مرغے پھنستے بہت کم ہیں' اوپر سے حصے بخرے زیادہ نکلنے لگے ہیں....."

میں نے کھڑکی کے پٹوں کے درمیان معمولی سی جھری سے جھانک کر دیکھا- ایک بھاری بھرکم شخص جو یقیناً نرمل داس تھا' پولیس کی وردی اتار رہا تھا- چوڑے سے سپاٹ چہرے اور بھری ہوئی ناک والی ایک ادھیڑ عمر عورت جس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی یاسیت تھی' اسے وردی اتارنے میں مدد دے رہی تھی- وہ یقیناً اس کی بیوی تھی- وہ قد میں میاں سے بھی نکلتی ہوئی تھی اور بے حد چوڑے چکلے جسم کی مالک تھی-

کیٹی نے میرا اشارہ پا کر کال بیل بجا دی- نرمل داس چونک اٹھا' اس کی آنکھوں میں اس درندے کی سی چمک ابھر آئی جس نے شکار کی بو سونگھ لی ہو- اس کی بیوی نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی اور نرمل داس اس کی طرف دیکھے بغیر کمرے سے نکل گیا-

میں اندھیرے میں دیوار کے ساتھ چھپ کر چلتا ہوا اس کونے تک پہنچا کہ سر ذرا آگے کو نکال کر دروازے کو دیکھ سکوں- کیٹی سر جھکائے دروازے پر کھڑی تھی- دفعتاً دروازہ کھلا' نرمل داس نے محتاط انداز میں پہلے سر نکال کر باہر جھانکا- پھر ایک تنہا برقع پوش لڑکی کو دیکھ کر جلدی سے باہر آ گیا-

"کیا بات ہے؟ کون ہو تم؟" اس نے بارعب لہجے میں پوچھا-

"میرا نام رشیدہ ہے-" کیٹی نے رومال انگلیوں پر لپیٹتے اور کھولتے ہوئے اور بول اضطراب کی نہایت کامیاب اداکاری کرتے ہوئے کہا- "مجھے مدن نے آپ کے پاس بھیجا ہے..... اس نے کہا تھا کہ جس قسم کے جھگڑے میں' میں پھنس گئی ہوں' اس میں صرف آپ ہی میری مدد کر سکتے ہیں کیونکہ آپ بڑے دھڑلے کے آدمی ہیں....."

"کیا معاملہ ہے؟" نرمل داس کے لہجے کی سختی برقرار تھی-

"تفصیل تو میں دوسرے فریق کے سامنے ہی بتاؤں گی کیونکہ وقت بہت قیمتی ہے- اگر آپ نے اس شخص کو نہ روکا جس سے میرا جھگڑا ہے تو آج رات چند گھنٹے بعد وہ یہاں سے بمبئی اور وہاں سے علی الصبح بذریعہ جہاز لندن روانہ ہو جائے گا اور پھر یہ معاملہ مہینوں آگے جا پڑے گا- لاکھوں کی جائیداد کا مسئلہ ہے اور کرنا صرف اتنا ہے کہ اس شخص سے ایک دستاویز واپس لینی ہے جس پر اس نے دھوکے سے میرے دستخط کروا لیے تھے-"

"کون ہے وہ شخص؟" نرمل داس نے اب قدرے نرمی سے پوچھا-

"میں نے فون پر آپ کی بیگم کو بھی بتایا تھا- شاید انہوں نے آپ کو نہیں بتایا-" کیٹی نے نہایت مضطربانہ لہجے میں کہا- "رینالڈز اسٹیٹ ایجنسی کے نام سے کاروبار کرتا ہے- امیر شاہ نام ہے اس کا......"

"اوہ....." نرمل داس نے معنی خیز لہجے میں کہا-

"آپ جانتے ہیں اسے؟" کیٹی نے نہایت کامیابی سے اپنے لہجے میں امید کا تاثر پیدا کیا-

"کسی حد تک....." نرمل داس نے جواب دیا اور ایک مونچھ کو بے خیالی کے انداز میں بل دیتے ہوئے کیٹی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا- "تمہیں مدن نے بھیجا ہے..... دوست ہو اس کی؟"

"یہی سمجھ لیجیے....." کیٹی نے نظریں جھکا کر جواب دیا-

"تم اگر ذرا پہلے آ جاتیں تو بڑی آسانی رہتی-" نرمل داس نے گال کھجاتے ہوئے کہا "میں اب سرکاری گاڑی بھی کوتوالی واپس بھیج چکا ہوں اور وردی بھی اتار چکا ہوں-"

"گاڑی تو میرے پاس ہے-" کیٹی نے اس سمت میں اشارہ کیا جہاں گاڑی اندھیرے میں کھڑی تھی- "میں گاڑی سے اتر کر آپ کا گھر تلاش کر رہی تھی- باقی رہی وردی کی بات تو میرے خیال میں اس کی ضرورت نہیں پڑے گی- وردی کے بغیر بھی آخر آپ ڈی ایس پی رہیں گے..... اور پھر آپ امیر شاہ کو جانتے ہیں تو یقیناً وہ بھی آپ کو جانتا ہی ہو گا-"

"ہاں میری جان!" دفعتاً نرمل داس نے ٹھنڈی سانس لے کر بدلے ہوئے لہجے میں کہا- "امیر شاہ مجھے اچھی طرح جانتا ہے..... بلکہ آدھا شہر مجھے اچھی طرح جانتا ہے لیکن شاید تم مجھے بالکل نہیں جانتیں ورنہ اتنی بچکانہ کہانی لے کر کبھی میرے پاس نہ آتیں- میری بدقسمتی یا شاید خوش قسمتی یہ ہے کہ میں شکل سے بڑا بے وقوف لگتا ہوں لیکن ایسا ہے نہیں- میں نے پولیس کے محکمے میں چودہ سال بھاڑ جھونکتے نہیں گزارے....." یہ کہہ کر وہ خباثت بھرے انداز میں مسکرایا اور نہایت ہی غیر متوقع طور پر اس نے اپنے بھاری بھرکم جثے کی مناسبت سے قطعی ناقابل یقین پھرتی کے ساتھ کیٹی کو کلائی سے پکڑ کر اندر گھسیٹ

لیا۔

دروازہ ایک دھماکے سے بند ہو گیا۔ کیٹی کی بمشکل اضطراری سی چیخ مجھے ادھوری ہی سنائی دی کیونکہ اسی دوران دروازہ بند ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کی آواز معدوم ہو گئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میں جیسے خالی الذہن سا ہو گیا۔ مجھے یوں بازی پلٹنے کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ اپنی دانست میں' میں نے بڑا مضبوط جال پھیلایا تھا۔ مجھے مسلسل چند ایسی کامیابیاں نصیب ہوئی تھیں کہ شاید میں تصویر کا دوسرا رخ دیکھنا بھول گیا تھا۔

یک لخت گویا ہوش میں آکر میں دروازے کی طرف لپکا اور ہینڈل گھمایا لیکن میرے اندیشے کے عین مطابق دروازہ مقفل ہو چکا تھا۔ میں دیوانوں کی طرح تلاشتا پھرتا اس کھڑکی کی طرف واپس آیا جس سے میں اندر جھانک رہا تھا کہ شاید نرمل داس کیٹی کو وہیں لائے گا لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کمرے کی بھی بتی بجھ چکی تھی اور اندر نرمل داس کی بیوی کی موجودگی کے بھی آثار محسوس نہیں ہو رہے تھے۔

پوری کوٹھی پر اندھیرا اور سکوت چھایا ہوا تھا۔ صورتحال بالکل ایسی ہی تھی جیسے سمندر سے سر نکالنے والی کسی خونخوار مگرمچھ نے اچانک ہی اپنے شکار کو دبوچا ہو اور آن واحد میں دوبارہ سمندر کی تہہ میں اتر گیا ہو اور سمندر کی سطح بالکل پہلے ہی کی طرح پرسکون ہو گئی ہو۔ میرے جسم میں سرد سی لہریں دوڑنے لگیں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟

کھڑکی میں چونکہ سلاخیں لگی ہوئی تھیں' اس لیے میں ایک بار پھر دروازے کی طرف دوڑا۔ میں نے دروازے پر ہی طاقت آزمائی کا فیصلہ کیا۔

کرکٹ کے بولر کی طرح میں نے برآمدے کے کنارے پر پہنچ کر اسٹارٹ لیا اور بھپرے ہوئے سانڈ کی طرح اپنا بایاں کندھا پوری قوت سے دروازے سے ٹکرایا۔ ایک بار تو گویا سامنے کی دیوار سی لرز کر رہ گئی۔ دروازے کے قبضے بھی شاید ذرہ برابر ڈھیلے ہوئے تھے لیکن اس عمل میں "وہم" کی قاضی زوردار آواز پیدا ہوئی تھی۔

میں اس وقت چوتھی بار دروازے کو ٹکر لگانے کے لیے اسٹارٹ لے رہا تھا' جب میں نے محسوس کیا کہ اندر بتیاں روشن ہونے لگی تھیں۔ میں نے چوتھی ٹکر تو بہرحال رسید کر ہی دی اور ساتھ ہی ریوالور جیکٹ کی جیب سے نکال کر دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

"ڈیریج..... میری جان ڈیریج!" میں نے دروازے کے عقب سے کیٹی کی سرگوشی سنی۔ "پوری کالونی کو جگاؤ گے کیا؟"

دروازہ اب کھڑکھڑانے لگا تھا اور مجھے پوری امید تھی کہ پانچویں یا ساتویں ٹکر پر تالا اپنے فریم سے ہی نکل جائے گا۔ کیٹی کی سرگوشی سن کر میری جان میں جان آئی۔ دوسرے ہی لمحے دروازہ کھل گیا اور باہر تک روشنی پھیل گئی۔ کیٹی میرے سامنے کھڑی اطمینان سے مسکرا رہی تھی۔ حالانکہ میرے خیال میں اسے اپنی حالت کے پیش نظر تو مسکرانا نہیں چاہیے تھا۔

اس کے برقعے کا بالائی حصہ غائب تھا اور نچلے حصے کے بھی تمام بٹن ٹوٹے ہوئے تھے اور وہ کئی جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ کیٹی کے چہرے پر خون کے چھینٹے تھے اور وہ اپنا خون آلود خنجر پھٹے ہوئے برقعے سے صاف کرکے اپنی شلوار کا پائنچہ اٹھا کر ٹانگ پر بندھے ہوئے چمڑے سے چری نیام میں رکھنے لگی تھی۔

"کیا ہوا؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"آکر خود دیکھ لو....." وہ سیدھی کھڑی ہوتے ہوئے بولی اور میرا ہاتھ تھام کر ایک چھوٹے سے ڈربہ نما کمرے میں لے گئی جہاں کوئی کھڑکی' روشندان حتیٰ کہ کوئی روزن تک نہیں تھا۔ اس کمرے میں ایک طرف بستر لگا ہوا تھا اور دوسری طرف میز پر کچھ عجیب و غریب چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ ان میں مڑی تڑی ہوئی تاریں' ایک پلاس' ایک موٹا سا ڈنڈا' چمڑے کا ایک ہنٹر اور ایک ہیٹر شامل تھا۔ ہیٹر پر لکڑی کے دستے والی دو نوکیلی سلاخیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ کمرے کی چھت میں ایک کنڈے سے بندھی ہوئی سی رسی بھی جھول رہی تھی۔

اسی رسی کے عین نیچے نرمل داس اور اس کی بیوی کی لاشیں آڑھی ترچھی پڑی تھیں۔ دونوں کی آدھی سے زیادہ گردن عجیب انداز میں کٹی ہوئی تھی۔ کیٹی کو غالباً اس مخصوص انداز میں بڑی مہارت حاصل تھی کہ وہ خنجر گردن کے پار کرکے اسے آگے کو جھٹکا دیتی تھی اور شہ رگ نرخرے سمیت کٹ جاتی تھی۔ اس نے نرمل داس اور اس کی بیوی کا کام تمام کرنے میں غالباً چند سیکنڈ بھی نہیں لگائے تھے۔ ان کی گردنوں سے خون ابھی تک تھوڑا تھوڑا بہہ رہا تھا۔

میں نے سوالیہ نظروں سے کیٹی کی طرف دیکھا تو وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر معذرت خواہانہ سے لہجے میں بولی۔ "میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ نرمل داس مجھے سیدھا اس کمرے میں لاتے ہی بھوکے بھیڑیے کی طرح مجھ پر ٹوٹ پڑا! بلاوجہ نوچ کھسوٹ رہا تھا اور اول فول بک رہا تھا لیکن ساتھ ہی سچ بھی بول رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ میں اکثر جوان اور خوبصورت مشکوک لڑکیوں کو یہیں لا کر تفتیش کرتا ہوں۔ پھر ان چیزوں کی باری آتی ہے۔ یہ کہتے ہوئے نرمل داس نے چھت میں لٹکی ہوئی رسی اور میز پر رکھی ہوئی ان چیزوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔"

میں نے کیٹی کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور کمرے سے نکل آیا۔ کار میں بیٹھ کر ہم ہوٹل واپس آگئے۔ احتیاطاً ہم عقبی راستے سے اندر پہنچے اور سیڑھیاں چڑھ کر اپنے سوئٹ میں چلے گئے۔

اگلے روز ہم بیدار ہونے کے بہت دیر بعد بستر سے نکلے۔ غسل اور ناشتے سے فارغ ہو کر وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا بیٹھی اور بالوں میں برش کرنے لگی' پھر اس نے نہایت نفاست سے ہلکی سی لپ اسٹک لگائی۔ پھر اس نے سینے سے پرفیوم لگائی اور کمرے میں دھیمی اور خوابناک سی مہک پھیل گئی۔

پھر وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر میرے سامنے آکھڑی ہوئی اور ایک ادائے دلبری سے بولی۔ "میں اچھی لگ رہی ہوں ناں؟"

میں نے سرتاپا اس کا جائزہ لیا۔ بڑی دیر مجھے اس وقت بھی نہیں لگی تھی جب میں نے اسے پک کیا تھا لیکن اس وقت وہ مضمحل' تھکی تھکی اور کچھ میلی میلی تھی۔ اب وہ تازہ دم شگفتہ اور بے حد نکھری نکھری لگ رہی تھی۔ چینل نائنٹین کی خوشبو سے قطع نظر' دو دن میں اس کا اپنا وجود بھی خوشبو دینے لگا تھا اور یہ خوشبو جیسے میرے ہر مسام جاں میں بھی سرایت کر چکی تھی۔ اس لڑکی کی قربت میں مجھے جانے کیوں بار بار روپا یاد آنے لگی تھی۔

"تم نہ صرف اچھی لگ رہی ہو بلکہ اچھی ہو بھی....." میں نے اس کے بال مٹھیوں میں جکڑ کر دوبارہ خراب کرتے ہوئے کہا۔ حالانکہ وہ بڑی محنت سے انہیں سنوار کر آئی تھی۔ "تمہارا المیہ صرف یہ ہے کہ تمہیں تمہاری اچھائیوں کی قدر کرنے والا کوئی نہیں ملا۔ لوگ تمہاری اچھائیوں' برائیوں' جسم و ذہن' حسن و ہنر سب سے ہی کھیلتے رہے۔"

"جو گزر گئی' سو گزر گئی۔" اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے میرا ماضی مت یاد دلاؤ۔ میں اپنا ہر گزرا ہوا کل ساتھ کے ساتھ دفن کر دیتی ہوں۔ میرے گزرے ہوئے روز و شب کی قبریں مت کریدو۔ صرف وہی گھڑیاں میری ہیں جو گزر رہی ہیں۔ میں دنیا میں تہی دست آئی تھی' تہی دست چلی جاؤں گی لیکن مجھے اب کسی بھی بات کا کوئی دکھ نہیں البتہ یہ خوشی ضرور ہے کہ کچھ نہ کچھ دیر کے لیے تو ہمارے راستے ایک ہوئے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ تقدیر کی پٹاری میں میرے لیے کیا ہے لیکن مجھے پہلے بھی اس کی پروا نہیں تھی اور اب تو بالکل ہی نہیں رہی۔"

وہ جیسے عالم خواب میں بول رہی تھی۔ بمبئی سے چلتے وقت میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ اتنی پیاری اور کھری لڑکی مجھے اس سفر کے دوران مل جائے گی۔

"منصور!" دفعتاً اس نے خوابناک سے لہجے میں سرگوشی کی۔

"ہوں۔" میں نے قدرے چونکتے ہوئے ہنکارا بھرا۔

"آج مجھے اپنا وجود بے حد ہلکا پھلکا لگ رہا ہے۔" وہ گویا گنگناتے ہوئے بولی۔ "میں جیسے آسمانوں کے قریب کہیں پرواز کر رہی ہوں۔ میرا جی چاہ رہا ہے کہ تم مجھے کہیں سیر کرانے لے چلو..... میری اس معصوم سی خواہش پر ہنسنا نہیں۔ رانڈہ درگاہ قسم کی لڑکیاں اندر سے ایسی ہی معصوم اور شفاف ہوتی ہیں۔"

"کس جگہ چلنا پسند کرو گی؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔

"کسی ایسی جگہ جہاں سبک خرامی سے ندی بہہ رہی ہو..... ڈھلواں کنارے پر سرسبز گھاس ہو۔ کہیں کہیں درخت بھی سایہ کیے کھڑے ہوں اور ہوا کی سرسراہٹ کے ساتھ جھک جھک کر گویا ندی سے سرگوشیاں کر رہے ہوں..... کہیں کہیں زرد اور نیم زرد پتے بکھرے پڑے ہوں..... بولو لے چلو گے؟" وہ آنکھیں کھول کر مسکرائی۔

"کیوں نہیں۔" میں نے اس کے رخسار تھپتھپائے۔ پھر اس کا ہاتھ تھاما اور نیچے آ کر ہم کرائے کی اولڈ میں بیٹھ کر نہر کی طرف روانہ ہو گئے۔ موسم بے حد خوشگوار تھا۔ سردیوں کی مدھم سی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ہوا میں زیادہ خنکی نہیں تھی۔ میں نے کھڑکیوں کے شیشے اتارے ہوئے تھے اور چلتی کار میں ہوا سے اس کے کھلے بال ادھر ادھر لہرا رہے تھے۔ تبھی کبھی کوئی لٹ میرے رخسار پر بھی گدگدی سی کر جاتی تھی۔

نہر کے کنارے پہنچ کر میں پختہ سڑک پر بہ نسبت کم رفتار سے ڈرائیو کرنے لگا۔ بیٹھنے کے لیے مجھے کوئی موزوں جگہ نظر نہیں آ رہی تھی حتیٰ کہ ہم اس علاقے میں پہنچ گئے جہاں سڑک ایک کشادہ سی پگڈنڈی میں تبدیل ہو جاتی تھی۔ یہاں بالآخر مجھے ایک ایسی جگہ نظر آ ہی گئی جیسا کیتھی نے تصور باندھا تھا۔ کار کو نشیب میں روک کر ہم اتر آئے۔

کچھ دیر تک ہم ڈھلواں اور سرسبز کنارے پر درختوں اور پھولدار پودوں کے درمیان بچوں کی طرح ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے رہے حتیٰ کہ کیتھی ہنستے ہنستے بے دم ہو کر گھاس پر لیٹ گئی۔ ہنسی جیسے جھرنے کی طرح خود بخود اس کے اندر سے چھوٹ رہی تھی۔ میں بھی کہنی کے بل اس کے قریب نیم دراز ہو گیا۔

دفعتاً آسمان کی طرف دیکھتے دیکھتے اس کی ہنسی تھم گئی۔ وہ یکلخت ہی یوں خاموش ہو گئی جیسے آسمان پر اس نے کوئی دل دوز منظر دیکھ لیا ہو۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے

"منصور! اگر بنگال کے قحط میں میرے ماں باپ نے بارہ روپے میں مجھے فروخت نہ کر دیا ہوتا تو آج شاید میں ایک سیدھی سادی سی معصوم بنگالی لڑکی ہی ہوتی۔" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ "شاید اسی طرح نہر کا کوئی کنارہ ننھے ننھے سے کومل بچے اور تم سا کوئی ہمسفر میرا مقدر ہوتا لیکن آج میں کتنی تنہا ہوں۔"

"میری نظر میں تو تم آج بھی سیدھی سادی اور معصوم سی ہو۔" میں نے اس کی آنکھوں سے رخساروں پر ڈھلک آنے والے دو شفاف آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "باقی رہی یہ بات کہ کیا کچھ تمہارا مقدر ہوتا..... تو انسان کا المیہ یہی ہے کہ وہ اکثر یہی سوچتا رہتا ہے کہ یوں ہوتا تو کیسا ہوتا اور یوں نہ ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ یہ بھی تو ممکن ہوتا کہ اگر قحط نہ پڑتا اور تمہارے ماں باپ نے تمہیں نہ بیچا ہوتا تو جوان ہوتے ہی کسی مدقوق اور مجہول سے اجڈ نوجوان سے تمہارا بیاہ ہو جاتا۔ وہ روز تاڑی پی کر تمہیں دھما دھم پیٹا کرتا۔ تمہارے بچے

دیتے نہ ہوتے جیسے تم چشم تصور سے دیکھتی ہو۔ غربت و افلاس کی وجہ سے وہ محض مسخ شدہ تصویروں کی طرح ہوتے۔ بھوک سے پسلیاں نکلی ہوئی' ناک بہتی ہوئی' جسم میل او چکٹ سے اٹے ہوئے اور آنکھیں مجسم سوال۔۔۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ تمہارا مدقوق اور مجہول شوہر تمہیں طلاق تھما کر واپس بھیج دیتا۔ پھر تو تم اس سے بھی زیادہ تنہا ہوتیں۔۔۔ اس لیے ایسی باتیں سوچ کر دل دکھی مت کیا کرو اور پھر تم تو کہہ رہی تھیں کہ جو گزر گئی' سو گزر گئی۔ میں اپنی ہر گزری ہوئی کل کو دفن کر دیتی ہوں۔۔۔ بھول گئیں کیا؟"

"ہاں۔۔۔ میں کہتی تو یہی ہوں۔" وہ نم آلود آنکھیں بند کرکے پیشانی مسلتے ہوئے عجیب سے انداز میں مسکرائی۔ "لیکن کبھی کبھی خود فریبی کے لبادے کا کوئی نہ کوئی تار کہیں سے ٹوٹ جاتا ہے۔ کچھ زخم ہیں جن سے خون رستا تو کب کا بند ہو چکا ہے مگر کسک نہیں گئی۔ میرے ماں باپ نے جس وقت مجھے بیچا' میں چار پانچ سال کی تھی۔ مجھے اچھا خاصا شعور تھا۔۔۔ مجھے یاد ہے جب میری ماں مجھے اس بڑے سے مکان میں چھوڑ کر جانے لگی تو میں دہشت زدہ ہو کر رونے لگی تھی۔ میری ماں نے اپنی پھٹی ہوئی میلی کچیلی ساڑھی کے پلو سے اپنے اور میرے آنسو پونچھتے ہوئے کہا تھا۔ "بیٹا میں ذرا کام سے جا رہی ہوں۔۔۔ تو ذرا دیر تو یہاں بیٹھ۔۔۔ میں ابھی تجھے لینے آجاؤں گی۔" پھر وہ پلو میں منہ چھپا کر یوں پھاٹک کی طرف دوڑتی چلی گئی تھی جیسے اس کے قدموں تلے کسی نے انگارے بچھا دیے ہوں۔ اس بات کو کم از کم پچیس برس بیت گئے ہیں۔ مجھے کبھی دوبارہ اپنی ماں یا باپ کی شکل نظر نہیں آئی۔ میری ماں کی "ذرا دیر" ابھی ختم نہیں ہوئی۔ منصور! کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ ایک دو دھاری خنجر نکال کر ایک سرے سے اس دنیا کے سارے انسانوں کو قتل کرنا شروع کر دوں جہاں پارہ روپے کے لیے ماں باپ اپنی اولاد کو بیچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ جہاں ملکوں کا بٹوارہ شروع ہوتا ہے تو انسان' انسان کو گاجر مولی کی طرح کاٹنا شروع کر دیتا ہے۔۔۔ ماں باپ کے سامنے بچوں کو ذبح کر دیتا ہے۔۔۔ باپ کے سامنے بیٹی کی عزت لوٹتا ہے۔۔۔ کیا روئے زمین پر انسان سے بدتر بھی کوئی درندہ ہے؟"

"کیٹی ڈیئر!" میں نے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بوجھل لہجے میں کہا۔ "تم اچھے بھلے موڈ میں انسان کو افسردہ کر دیتی ہو۔" میں اٹھا اور جا کر نہر کے کنارے پر بیٹھ کر چہرے پر پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔ پانی زیادہ گہرا نہیں تھا البتہ ٹھنڈا غضب تھا اور اسی لیے مجھے بھلا لگ رہا تھا۔ میرا دوران خون جیسے یک لخت ہی بہت تیز ہو گیا تھا اور آنکھیں جلنے لگی تھیں۔ ان پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارنے سے مجھے سکون مل رہا تھا۔ کیٹی بھی اٹھ کر میرے قریب آبیٹھی اور وہ بھی چہرے پر چھینٹے مارنے لگی۔

"سوری منصور ڈیئر!" وہ قمیض کے دامن سے منہ پونچھتے ہوئے گویا سب کچھ ذہن سے جھٹک کر تازہ دم ہو کر بولی۔ "دراصل میرا دل بہت زخمی ہے اور ہر زخم میں بے پناہ زہر بھرا ہوا ہے۔۔۔ تم جیسا دوست زندگی میں پہلی بار ملا ہے' اس لیے ایک دم زخم چھیڑ بیٹھی تھی۔۔۔ اب ہم اچھی اچھی باتیں کریں گے۔۔۔ اردگرد کھلے ہوئے رنگا رنگ پھولوں کی۔۔۔ مہک فضا میں رچی ہوئی اس ندی کی۔۔۔ خوشگوار ہوا سے جھومتے ہوئے پودوں اور درختوں کی۔۔۔ اور مدت کے بعد سیراب محسوس کرنے والی پیاسی روح کی۔"

"کیٹی!" میں نے واپس گھاس پر آکر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اگر تم اس لائن پہ نہ پڑتیں جس میں پڑ چکی ہو تو یقیناً تم افسانہ نگار ہوتیں۔"

"نہیں۔۔۔ اگر میں اس لائن پر نہ ہوتی تو شاید میں کچھ بھی نہ ہوتی۔" وہ میرے قریب آتے ہوئے بولی۔ "باتیں تو مجھے اسی لائن کے تجربات نے سکھائی ہیں۔"

مزید کچھ وقت نہر کے کنارے گزارنے کے بعد واپس روانہ ہونے کے لیے ہم گاڑی میں آبیٹھے۔ ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کر میں نے جیکٹ اتار کر پھینک دی اور بستر پر ڈھیر ہو گیا۔

دوسرے روز بیدار ہونے کے بعد کیٹی نے پوچھا۔ "اب کیا پروگرام ہے؟"

"واپس بمبئی چلیں گے۔ یہاں ہمارا کام ختم ہو گیا۔ ایک مشن مکمل ہو گیا۔" میں نے جواب دیا۔

بمبئی پہنچ کر میں کیٹی کو پہلے اپنے دفتر لے جانا چاہتا تھا لیکن گاڑی پارکنگ لاٹ میں کھڑی کرکے ہم اوپر جانے ہی لگے تھے کہ نسواری سوٹ والا ایک دراز قد اور پختہ عمر شخص اچانک ہمارے سامنے آگیا۔ وہ کلین شیو تھا اور بظاہر اس کا حلیہ کسی معزز اور امن پسند تاجر کا سا تھا لیکن اس کی آنکھیں چیخ چیخ کر بتا رہی تھیں کہ وہ کسی اور طرح کا آدمی تھا۔

"ارے۔۔۔ شکنتلا۔۔۔! تم کہاں؟" وہ گرمجوشی سے بولا۔

کیٹی نے سرد نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔ "میں اب شکنتلا نہیں' کیٹی ہوں۔۔۔"

"شکنتلا ہو یا کیٹی۔۔۔ نام سے کیا فرق پڑتا ہے۔۔۔ ہم تو اب بھی تمہارے خادم ہیں۔ پہلے بھی تم ہماری باس تھیں' آج بھی ہمیں اپنے حکم کا غلام سمجھو۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکا۔

"احسان مرزا نے سن لیا تو تمہاری گردن کاٹ کر تمہاری کھوپڑی چڑیا گھر کے بندروں کو کھیلنے کے لیے بھجوا دے گا۔" کیٹی بولی۔

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔" وہ شخص ہنسا۔۔۔ "وہ اب تم سے خفا نہیں ہے۔ حالات بہت بدل گئے ہیں۔ باس کافی بدل گیا ہے۔ اندر سے وہ بہت پریشان ہے بلکہ اگر تم میری ایک درخواست مانو۔۔۔ اور چل کر اسے مل تو چاہے وہ ظاہر نہ کرے مگر دل میں بہت خوش ہوگا۔۔۔"

www.paksociety.com

"آپ کی تعریف؟" میں نے اس شخص کی طرف اشارہ کرتے کیٹی سے پوچھا۔
"یہ بگا ہے... احسان مرزا کے خاص آدمیوں میں سے ایک ہے۔" کیٹی نے بے اعتنائی سے بتایا۔

میرے ذہن میں یادوں کی ایک تیز رفتار سی فلم چل پڑی۔ اس دوران کیٹی اس شخص سے مخاطب ہوئی۔ "مجھے احسان مرزا سے ملنے کا کوئی شوق نہیں لیکن میرے ساتھ یہ جو منصور مغل صاحب ہیں... اگر یہ مجھے اجازت دیں گے اور تم انہیں ساتھ لے کر چلنے کی ہامی بھرو گے تو ہم چلیں گے۔"

کیٹی نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے رضامندی کے سے اظہار کے لیے کندھے اچکا دیئے۔ میں اس وقت اس سے مل لینے میں کوئی حرج نہیں سمجھ رہا تھا۔ ذہن میں دلچسپی ہی ذرا اس شخص کو دیکھنے کو جی چاہ رہا تھا کہ اتنے برسوں میں اس میں کیا تبدیلیاں آئی ہوں گی۔

"کیوں نہیں... کیوں نہیں..." بگا خوشی سے بولا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں گویا مجھے تول لیا تھا اور فیصلہ کر لیا تھا کہ میں بھی کام کا آدمی تھا۔
پھر وہ بولا... "مگر تم دونوں کو میرے ساتھ میری گاڑی میں چلنا پڑے گا۔"
میں نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ ہم اس کے پیچھے چل دیئے۔ سڑک کے پرلی طرف سیاہ رنگ کی ایک کیڈلک کھڑی تھی۔

میں اور کیٹی پچھلے دروازے کھول کر عقبی سیٹ پر پاس پاس بیٹھ گئے۔ بگا نے گاڑی اسٹارٹ کی اور چند لمحے بعد گاڑی سڑک پر فرّاٹے بھرنے لگی۔

بگا نہایت مشاق ڈرائیور تھا اور گاڑی بھی بہت عمدہ تھی... تھوڑی ہی دیر میں ہم میلوں کا فاصلہ طے کر گئے۔ چند منٹ کے لیے ہم شہر کی نواحی سڑکوں سے پرشور ٹریفک کے درمیان سے بھی گزرے لیکن ایک بار پھر ساحلی علاقے میں آ گئے۔ کئی چھوٹی چھوٹی پرپیچ اور ویران سڑکوں پر سے گزرنے کے بعد گاڑی ایک قدرے کشادہ اور ہموار سڑک پر مڑ گئی جس کے آغاز پر ہی "پرائیویٹ" کا سائن بورڈ لگا ہوا تھا۔ اس سڑک کے دونوں طرف کھجور کے درختوں کی قطاریں تھیں۔

چند لمحے بعد ہی مجھے ایک پیلس دکھائی دے گیا۔ وہ عرب، مغل اور مغربی طرز تعمیر کا ایک عجیب و غریب امتزاج تھا۔ اس کی تعمیر میں ماربل بے تحاشا استعمال کیا گیا تھا۔ پیلس دو منزلہ تھا۔ اصل عمارت زیادہ بڑی نہیں تھی لیکن پرشکوہ تھی البتہ اس کے اردگرد چار دیواری کے اندر بہت وسیع رقبہ چھوڑا گیا تھا۔

عظیم الشان آہنی گیٹ کھلا ہی تھا۔ گاڑی ڈرائیو وے میں داخل ہو گئی لیکن فوراً ہی رک گئی۔ ایک ننھی آہنی رکاوٹ سامنے آ گئی تھی جیسی عموماً ریلوے کراسنگ پر ہوتی

ہے۔ گیٹ کے قریب واقع ایک کیبن سے جو ایک غیر رسمی سا واچ ہاؤس ہی معلوم ہوتا تھا، ایک شخص نکل کر گاڑی کی طرف لپکا۔ اس کا حلیہ چوکیداروں یا اس قبیل کے دیگر ملازموں جیسا نہیں تھا۔

وہ نہایت عمدہ تراش کے سوٹ میں تھا۔ ٹائی کی جگہ اس نے بو لگا رکھی تھی اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے چند منٹ بعد ہی وہ کسی ڈنر میں شرکت کرنے والا ہے۔ بال سلیقے سے بنے ہوئے تھے، سانولا چہرہ دھوپ میں چمک رہا تھا اور پالش کی طرح اس کے بوٹ بھی چمک رہے تھے۔

تاہم تمام تر مہذبانہ وضع قطع اور اجلے پن کے باوجود اس کے چہرے سے اس کی اصلیت کا اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا۔ اس کے اندر ایک نفیس، سفاک اور شقی القلب انسان چھپا ہوا تھا۔ قریب آ کر اس نے ذرا جھک کر بگا کی طرف جھانک کر دیکھا، مسکرایا اور ایک لفظ کہے بغیر واپس کیبن میں چلا گیا۔ آہنی رکاوٹ ہٹ گئی اور گاڑی آگے بڑھتی گئی۔

اصل عمارت کے قریب فرنٹ پورچ میں گاڑی سے اتر کر ہم ماربل کی چند سیڑھیاں چڑھ کر محرابی دروازوں سے گزر کر دروازے تک پہنچے۔ ایک باوردی ملازم نے بگا کو دیکھ کر جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ یہ دروازہ ایک ایسے طویل و عریض ہال کا تھا جس میں ایک طرف باقاعدہ ریسپشن بنا ہوا تھا۔ ایک طرف لاؤنج تھا۔ ہال کے وسط میں ایک قیمتی قالین بچھا ہوا تھا، دور سے کسی سفید جھاگ کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ چھت میں بڑے خوبصورت فانوس آویزاں تھے۔ فرش کا جو تھوڑا بہت حصہ قالین سے ڈھکا ہوا نہیں تھا، پالش شدہ تھا اور مدھم روشنی میں بھی چمک رہا تھا۔

لاؤنج میں سینٹر ٹیبل پر اخبارات، رسالے حتیٰ کہ شیشوں میں تازہ تحائف موجود تھیں۔ اس جگہ کی ترتیب و آرائش نہایت عمدہ تھی۔ ریسپشن پر ایک خوبصورت اور مستعد سی لڑکی بھی موجود تھی جس کے اردگرد اور سامنے کاؤنٹر پر وہ تمام لوازمات موجود تھے جو ایک ریسپشنسٹ کے پاس ہونے چاہئیں۔ وہ بگا کی طرف دیکھ کر مسکرائی لیکن اس نے انٹرکام یا سوئچ بورڈ کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔ بگا کو غالباً رسمیات کی ضرورت نہیں تھی۔

تاہم لڑکی نے پنسل اٹھا کر ایک رجسٹر میں کچھ لکھا تھا۔ بگا اس کے قریب سے گزرا تو اس نے سرگوشی نما لہجے میں بتایا۔ "باس تو سوئمنگ پول پر ہے۔ تم باہر سے ہی گھوم کر چلے جاتے۔"

"اب تو اندر آ گیا ہوں، اندر ہی سے جاؤں گا۔" بگا نے بھی مدھم لہجے میں جواب دیا اور ہمیں ساتھ لیے بڑھتا چلا گیا۔ اس ہال سے گزر کر ہم ایک راہداری میں پہنچے۔ بگا نے کسی اور کمرے کا رخ نہیں کیا، سیدھا چلتا رہا۔ راہداری کے اختتام پر ہمیں ایک بٹلر ملا۔ بگا کو دیکھ کر وہ بھی مسکرایا۔

"انہیں اپنی ذمہ داری پر لے جا رہے ہو نا؟" بٹلر نے ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے بگا سے پوچھا۔ "تمہیں معلوم ہے نا باس کن کن مقامات پر نئے آدمیوں کی آمد کو پسند نہیں کرتا۔"

"یہ نئے آدمی نہیں ہیں گدھے!" بگا نے اسے ایک طرف ہٹایا اور بڑھتا چلا گیا۔

پچھلے دروازے سے نکل کر ماربل کی چند سیڑھیاں اتر کر ہم کھلے لان میں پہنچ گئے۔ سامنے ہی نہایت خوبصورت بیضوی سوئمنگ پول تھا جس کے کناروں پر دو طرف ڈائیونگ بورڈ اور رنگین چھتریاں نصب تھیں۔ ایک طرف کئی ریڈ بیڈ اور آرام دہ کرسیاں بکھری ہوئی تھیں۔ سوئمنگ پول کے پرلے کنارے پر ایک ریڈ بیڈ پر احسان مرزا نیم دراز تھا۔

وہ ذرا بھی تو نہیں بدلا تھا۔ گزرے برسوں نے اس کے سراپا پر اپنا کوئی نقش نہیں چھوڑا تھا۔ وہی مختصر سا جسم، وہی بندر کی شکل اور وہی چھوٹے چھوٹے چھدرے بال جو پانی میں بھیگے ہونے کے باوجود سیدھے کھڑے تھے۔

چار نہایت کم عمر اور نوخیز لڑکیاں تیراکی کے لباس میں اس کے گرد موجود تھیں۔ ان میں سے دو کسی لوشن سے اس کی مالش اور مساج کر رہی تھیں۔ ایسے مناظر دیکھ کر مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا کرتا تھا۔ کیا عورت اتنی ہی سستی تھی کہ صرف دولت سے خریدی جا سکے؟

بگا نے ہمیں وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور خود پول کے گرد گھوم کر دوسری طرف چلا گیا۔ احسان مرزا نے ہماری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا، وہ صرف بگا کو دیکھ رہا تھا۔ ہم جیسے وہاں موجود ہی نہیں تھے۔

"سوّر کا بچہ...!" کبنی اس کی طرف دیکھتے ہوئے غیر محسوس طور پر بڑبڑائی۔ "میں نے اپنی زندگی کے سنہری سال اس شخص کی بھینٹ چڑھا دیے... جس نے کتنی مرتبہ اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر اسے کروڑوں کا فائدہ پہنچایا اور آج یہ میری طرف دیکھ بھی نہیں رہا۔"

میں خاموشی سے کھڑا بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا اور گرد و پیش کا جائزہ لیتا رہا۔ بگا کئی منٹ تک احسان مرزا سے مصروف گفتگو رہا، پھر اس نے ہماری طرف بھی اشارہ کیا۔ احسان مرزا نے صرف ایک نظر ہماری طرف دیکھا اور دوبارہ بگا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ پھر بگا نے ایک چھوٹا بیگ اس کے حوالے کیا۔ وہ غالباً کسی مہم سے کامیاب واپس آیا تھا اور اس کی تفصیل احسان مرزا کے گوش گزار کر رہا تھا۔ احسان مرزا نے بیگ کھول کر دیکھا اور دوسرے ہی لمحے اس کے حلق سے ایک پتلی لیکن تیکھی اور تیز مجنونانہ سی آواز نکلی۔

نہایت ہی غیر متوقع طور پر وہ بیٹھے بیٹھے یکلخت ہی ہوا میں کئی فٹ اونچا اچھلا اور غڑاپ سے سوئمنگ پول میں جا گرا۔ وہ مچھلی کی سی تیزی و مشاقی سے سوئمنگ پول میں چکر کاٹ رہا تھا اور ہاتھ پیروں کو بڑے تام جھام جنبش دے کر نہایت تیزی سے تیر رہا تھا۔ کئی بار اس

نے پانی سے سر نکالا اور نیم دیوانی سا قہقہہ لگایا۔

خوشی کے اظہار کا یہ عجیب ہی طریقہ تھا۔ میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ بگا بھی اپنی جگہ کھڑا مسکرا رہا تھا اور چاروں لڑکیاں کافی آمیز سی نظروں سے سوئمنگ پول کی طرف دیکھ رہی تھیں جیسے ان کا بس چلے تو وہیں لیٹ کر سو جائیں۔ بالآخر احسان مرزا سوئمنگ پول سے نکل آیا۔

لڑکیوں نے اس کا اشارہ پا کر اسے گاؤن اور سلیپر پہنائے۔ وہ بگا کے ساتھ ہماری طرف آیا۔ جب وہ میرے سامنے کھڑا ہوا تو بالکل بونا معلوم ہو رہا تھا۔ میری طرف اس نے اب بھی نہ دیکھا اور کبنی کو سرتاپا گھورنے کے بعد سوں سوں کرتے ہوئے بولا۔ "تمہاری صورت دیکھنا میں صرف اس لیے گوارا کر رہا ہوں کہ تم اس وقت ایک خوشخبری کے ساتھ آئی ہو......"

"اور ہم دونوں تمہاری صورت دیکھنا اس لیے گوارا کر رہے ہیں کہ بگا ہمیں بصد اصرار ساتھ لے آیا ہے۔" میں نے گویا کبنی کی طرف سے جواب دیا۔ "ورنہ ہم میں سے کسی کو تمہارا یہ حسین چہرہ دیکھنے کا اشتیاق نہیں تھا۔"

بگا کا رنگ فق ہو گیا اور ایک لمحے کے لیے تو کبنی کی رنگت بھی متغیر ہو گئی۔ احسان مرزا بندر کی طرح خوخیایا۔ پھر اس نے براہ راست میری طرف دیکھا۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹ نیم وا تھے اور ان پر ایک نیم دیوانی سا کھنچاؤ تھا۔ ان کے عقب سے اس کے چھوٹے چھوٹے چھدرے لیکن نوکیلے سے دانت یوں جھانک رہے تھے جیسے کسی بھیڑیئے نے شکار کی بو سونگھ لی ہو۔

اس نے مجھے یوں سرتاپا دیکھا جیسے فیصلہ کر رہا ہو کہ میرے پارچے بنوانے کے لیے کونسا طریقہ موزوں رہے گا۔

"مرزا جی!" کبنی جلدی سے بول اٹھی۔ "شاید آپ کو یہ جان کر خوشی ہو کہ یہ نوجوان کون ہے...... یہ وہی ہے جس کا آپ نے اسٹیج پر تلوار کرانے کا مقابلہ دیکھا تھا اور اسے تنظیم میں شامل ہونے کی دعوت بھی دی تھی۔ آج کل یہ بہت جا برنس مین ہے۔"

"منصور مغل......؟" احسان مرزا اپنی پلکوں سے محروم آنکھیں جھپکائے بغیر ایک ٹک میری طرف دیکھتے ہوئے خودکلامی کے سے لہجے میں بڑبڑایا اور میں اس کی یادداشت پر دنگ رہ گیا۔ پھر اس نے یہ کہتے ہوئے اور بھی حیران کر دیا۔ "لیکن مجھے اس میں کچھ ایسی تبدیلیاں نظر آ رہی ہیں جو نہیں ہونی چاہیے تھیں۔ بے شک یہ اس وقت کمسن تھا، اب جوان ہو گیا ہے لیکن اب ایسی بھی کیا تبدیلی۔ اس وقت اس کے بال بھورے تھے، اب سیاہ نظر آ رہے ہیں۔ اس وقت اس کی ناک کے قریب مسّہ نہیں تھا۔"

"بالوں میں نے ڈائی کیے ہیں۔ مسّا مصنوعی ہے۔" میں نے اپنے لہجے میں قدرے

بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"تو.... تو گویا تم واقعی منصور مغل ہو....." احسان مرزا مسرت سے چلایا۔ وہ اپنی توہین کو یکدم بھول گیا۔ "میں تو یہی سوچ رہا تھا کہ احسان مرزا سے اس لہجے میں گفتگو کرنے کی جرات کون کر سکتا ہے؟ بہت خوب.... بہت خوب.... میں بتا نہیں سکتا کہ تمہیں دوبارہ دیکھ کر مجھے کس قدر خوشی ہو رہی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی دیہاتی باپ کا بیٹا ولایت پاس کر آیا ہو۔ معلوم نہیں کیوں مجھے تم سے اتنی انسیت سی کیوں ہوتی ہے.... اگر شکنتلا اپنے لیے تمہاری سفارش لے کر آئے تو میں اسے تنظیم میں نہایت عزت سے دوبارہ رکھنے کو تیار ہوں....."

"نہیں.... اسے رکھنے کی ضرورت نہیں....." میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اسے میں نے رکھ لیا ہے۔"

"اوہ...." احسان مرزا نے شریر نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "تم نے اس جوانی ہی میں عورتیں رکھنی شروع کر دیں؟ پھر تم نے کوئی تنظیم بنائی ہے؟"

"نہیں.... مجھے نہ تو عورتیں رکھنے کا شوق ابھی پیدا ہوا ہے اور نہ ہی میں گروہ بازی میں پڑا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "میں ایک شریف اور جائز کاروبار میں یقین رکھنے والا بزنس مین ہوں۔"

"لیکن یہ لڑکی جائز اور شریفانہ کام تو کوئی نہیں کر سکتی۔" احسان نے ہونٹ سکیڑ کر مصنوعی سنجیدگی سے شکنتلا کی طرف دیکھا۔ شکنتلا کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے خجالت کے آثار ابھرے تھے لیکن فوراً ہی اس کا چہرہ تاثر سے عاری ہو گیا تھا۔

"یہ تو اپنا اپنا سمجھ کا پھیر ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا.... چلو.... چلو اندر چلو۔" احسان مرزا نے میری کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ پھر وہ بگا کی طرف مڑا۔ "ماں کو ٹھکانے پر پہنچا دو۔ تمہیں معلوم ہے میں اپنی رہائش گاہ پر اس قسم کی چیزوں کی چند منٹ سے زیادہ موجودگی پسند نہیں کرتا۔ شکنتلا کو گیسٹ روم میں لے جاؤ اور اس کے آرام و آسائش کے لیے خصوصی ہدایات دے دو۔ یہ دونوں کم از کم آج تو یہیں رہیں گے.... اور منصور! تم میرے ساتھ اندر چلو۔ میں تم سے تخلیے میں بہت ساری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

بگا شکنتلا کو ساتھ لیے ایک طرف چل گیا اور میں احسان مرزا کے ہمراہ اندر آ گیا۔ راہداری میں چند قدم چل کر اس نے بائیں ہاتھ پر ایک دروازہ کھولا۔ یہ ایک طویل و عریض آراستہ و پیراستہ کمرہ تھا۔

میں ایک نرم صوفے میں دھنس چکا تو احسان مرزا دیوار گیر بار کی طرف بڑھ گیا اور اپنے لیے جام تیار کرتے ہوئے بولا۔ "تمہارے لیے کیا بناؤں؟"

"شکریہ.... میں پیتا نہیں ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"بہت خوب!" وہ بولا۔ "تم میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو میں اپنے کسی پسندیدہ ترین آدمی میں دیکھنا چاہتا ہوں اور جو مجھے ابھی تک نہیں ملا۔"

جام، بوتل، آئس ٹرے، سوڈا اور سائفن وغیرہ ٹرالی پر سجائے وہ میرے مقابل آ بیٹھا۔ چند گھونٹ بھرنے کے بعد وہ بولا۔ "تمہیں اندازہ ہوگا میرے پاس بے پناہ بہادر، تجربے کار اور وفادار ساتھیوں کی کمی نہیں لیکن ایک ایسے ساتھی کی کمی مجھے ہمیشہ محسوس ہوتی رہتی ہے جو محض اسلحے اور گروہی طاقت کے بل پر ہی نہ چلتا رہے، وہ خود بھی اپنی ذات میں ایک تنظیم، ایک گروہ ہو۔ اس کے پاس بے پناہ ذہانت بھی ہو اور ایک ایسا ہمہ صفت انسان ہو جو وقت پڑنے پر کسی بحران سے نکل سکے۔ کسی یلغار کا مقابلہ کر سکے۔ ایسے ساتھی کی مجھے عارضی ضرورت نہیں۔ میرے بعد شاید میرا جانشین بھی وہی ہو کیونکہ میری کوئی اولاد تو ہے نہیں اور میں صاحب اولاد بننے کا کوئی ارادہ بھی نہیں رکھتا۔ یہ ضرورت مجھے بہت عرصے سے ہے لیکن کچھ عرصے سے تو یہ ضرورت بہت شدید ہو گئی ہے.... بالکل اسی طرح جیسے کسی جاں بہ لب مریض کو خون کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"اگر تمہاری نگاہ انتخاب مجھ پر ہے تو مجھے افسوس ہے کہ تمہیں مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔" میں نے کہا.....

○

میرا خیال تھا کہ میرا کورا سا جواب سن کر احسان مرزا کی خوش مزاجی جواب دے جائے گی لیکن یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ اس کے تاثرات بدلے نہیں تھے۔

"آخر کیوں؟ تمہیں اعتراض کیا ہے؟" وہ تحمل سے بولا اور جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے مزید کہا۔ "کئی کی زبانی میں نے سن لیا ہے کہ تم بہت بڑے بزنس مین بن گئے ہو لیکن میں تمہیں ماضی کی طرح کسی نوکری وغیرہ کی پیشکش نہیں کر رہا۔ میں تو تمہیں اپنا ساتھی بنانا چاہتا ہوں اور وہ بھی اس طرح نہیں کہ تم اپنا کاروبار چھوڑ کر مجھ سے آن ملو۔ نہیں..... تم اپنا کاروبار حسب معمول چلاتے رہو گے' زندگی حسب معمول گزارتے رہو گے۔ مجھ سے تمہارا صرف خفیہ رابطہ ہوگا۔ ضرورت پڑنے پر تم مجھے مشورہ دو گے۔ کبھی کبھی میری کسی خاص الخاص مہم کی قیادت کرو گے۔ کبھی صرف مہم کے انتظامات تمہاری زیرِ ہدایت ہوں گے۔ بس یہ سلسلہ ہوگا۔ اسے بڑا یوں نہ سمجھنا اور نہ میں تمہیں متاثر کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کیونکہ تم متاثر ہونے والی چیز نہیں ہو۔ محض تمہاری معلومات کے لیے بتا رہا ہوں کہ بمبئی کے تجانے کتنے بڑے بڑے بزنس مین احسان مرزا کی دوستی اور تعاون حاصل کرنے کے لیے اس کے پاؤں چاٹنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔"

"رہتے ہوں گے۔" میں نے لاپروائی سے کہا۔ "طاقت کی پوجا ازل سے ہوتی آئی ہے۔"

"منصور! تمام تر ذہانت و چالاکی کے باوجود دراصل تم اپنی کم عمری کی وجہ سے بعض معاملوں میں غیر ضروری حد تک بے نیاز ہو۔" احسان مرزا نے اپنا جام دوبارہ بھرتے ہوئے کہا۔ "تمہیں صحیح طور پر اندازہ نہیں کہ احسان مرزا کی رفاقت کا مطلب کیا ہے یا اس کی جانشینی کیا معنی رکھتی ہے۔ جب میں کسی کو جانشین بنانے کی بات کرتا ہوں تو یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی بادشاہ ایک بہت بڑی سلطنت کسی کے سپرد کرنے کی بات کر رہا ہو۔ میری رفاقت کا مطلب کئی صوبوں کا غیر رسمی اقتدار حاصل ہو جاتا ہے۔"

"مجھے بخوبی اندازہ ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ دراصل میں بالکل صاف ستھری لائن پر چل رہا ہوں۔ میرا جتنا بھی بزنس ہے' قانونی اور جائز ہے۔ مجھے بے شک تمہارے مقابلے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ محض چند ایک حکام سے میری

شناسائی ہے لیکن وہ سب میری عزت کرتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میرا نام ایک اسمگلر کے نام سے منسوب ہونے کی افواہیں کسی کے کانوں تک پہنچیں' خواہ یہ افواہیں زیرِ زمین حلقوں تک ہی محدود ہوں۔ برا مت ماننا..... تمہیں خواہ کتنی ہی طاقت حاصل ہے لیکن تمہاری شہرت تو ایک بہت بڑے اسمگلر کی ہے نا.....؟"

میری بات اس نے نہایت تحمل سے سنی اور مسکرایا۔ "بات تمہاری درست ہے لیکن تمہاری معلومات میں اضافے کے لیے بتاتا چلوں کہ مجھ پر آج تک نہ اسمگلنگ کے الزام میں کیس چلا ہے اور نہ ہی مجھے کبھی گرفتار کیا گیا ہے۔" اس نے کہا۔ "البتہ میرے خلاف دو چار کیس چلے ہیں۔ میرے جائز کاروباروں میں ٹیکس کے معاملات میں محکمے سے اختلافات ہوئے اور کیس بنے۔ جائیداد اور لین دین کے معاملوں میں کبھی کبھار براہ راست میرے خلاف مقدمہ بنا۔ تیز رفتاری سے کار چلانے میں میرا چالان ہوا۔ اس طرح کے زمینی معاملات میں مجھے قانونی کارروائیوں سے واسطہ پڑا لیکن مجھ پر اسمگلنگ کے الزام میں کبھی مقدمہ قائم نہیں ہوا۔ اس معاملے میں کبھی میرے خلاف ذرہ برابر ثبوت حاصل نہیں کیا جا سکا اور اگر کسی بہت ہی بیٹے افسر نے بغیر ٹھوس بنیادوں کے میرے پیچھے پڑنے کی کوشش کی تو قانونی یا غیر قانونی کسی نہ کسی طریقے سے اس کا پتا صاف ہو گیا۔"

وہ ایک بڑا سا گھونٹ بھر کر یوں مسکرایا گویا اپنی گفتگو سے خود ہی لطف اندوز ہو رہا ہو۔ پھر وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "ایک بار مجھے پتا چلا کہ میرے خلاف وفاقی سطح پر تحقیقات ہو رہی ہے اور مجھے کسی نہ کسی طرح گھیرنے کا پروگرام بنایا جا رہا ہے۔ وہ کپاس کی چنائی کا سیزن تھا۔ میں نے کئی صوبوں کی منڈیوں میں اپنے آدمی پھیلا دیے۔ کپاس منڈیوں سے نکلنے ہی نہیں پائی۔ وہیں چند روپے زیادہ کے ریٹ پر خرید لی گئی اور کرائے کے گوداموں میں پہنچا کر مقفل کر دی گئی۔ ٹیکسٹائل وغیرہ کی صنعت سے وابستہ افراد نے جب منڈیوں کا رخ کیا تو روئی کا پھایا تک کہیں موجود نہیں تھا۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ کیا طوفان مچا تھا۔ ٹیکسٹائل کی صنعت ٹھپ ہو گئی۔ ملوں کو تالے لگ گئے۔ مزدوروں کی طرف سے ہنگاموں کا سیلاب امڈ آیا۔ صوبائی سیکرٹری بھاگے بھاگے میرے پاس آئے۔ میں نے بڑے تحمل سے ان کی تقریریں سنیں اور صرف اتنا کہا کہ وفاقی سیکرٹریٹ میں میرے متعلق ایک فائل پڑی ہے۔ وہ دلوا دیجئے' اس سے اگلے دن کپاس منڈیوں میں آ جائے گی۔ صوبائی سیکرٹریوں نے مرکز میں جا کر رونا پیٹنا مچایا کہ صوبوں کی معیشت کا معاملہ ہے اور صرف معیشت ہی نہیں امن و امان بھی تباہ ہو کر رہ جائے گا۔ قصہ مختصر یہ کہ فائل مجھے مل گئی اور تحقیقات دھری کی دھری رہ گئیں۔ مجھے صرف ایک ڈیڑھ کروڑ کا خسارہ اٹھانا پڑا تھا لیکن اس کے بعد سے ابھی تک تو کسی کو کچھ کرنے کی جرات نہیں ہوئی البتہ ذخیرہ اندوزی کے خلاف پارلیمنٹ میں ایک نیا بل ضرور پاس ہوا جس کے بعد ذخیرہ اندوزی کے خلاف

قوانین مزید سخت کیے گئے لیکن میرے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں اب بھی چاہوں تو ایک اشارے سے معیشت اور امن و امان درہم برہم کر سکتا ہوں۔ مثلاً نمک ایک ایسی چیز ہے جسے اگر میں کچھ نقصان برداشت کرتے ہوئے صرف ایک صوبے کی منڈیوں سے بھی اٹھوا کر سمندر میں پھینکوا دوں تو میرے یا میرے ایجنٹوں کے خلاف ذخیرہ اندوزی کا کوئی ثبوت نہیں ہوگا اور ہاہاکار مچ جائے گی..... تو میری جان..... یہ بادشاہت یونہی نہیں چل رہی۔"

"مجھے یہ سب کچھ سن کر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔" میں نے قدرے مبالغے سے کام لیا۔ "البتہ اپنی معلومات میں مزید اضافے کے لیے میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اپنی اس بے پناہ طاقت اور جاہ و جلال کے باوجود تمھیں اپنی بادشاہت میں مجھ جیسے ایک حقیر آدمی کی ضرورت کیوں ہے؟"

"ہاں.... میں تمھیں یہی بتانے جا رہا تھا۔" وہ جام ہاتھ میں اٹھائے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ "مسائل بہت پھیل گئے ہیں۔ بادشاہت جتنی وسیع ہو چکی ہے' مسائل بھی اتنے ہی وسیع ہیں۔ کچھ عرصے سے صورتحال کچھ ایسی ہے کہ فیصلوں اور انتظامات کے معاملے میں تنہا اپنی ذات کو ناکافی محسوس کر رہا ہوں اور پھر یہ لائن کچھ ایسی ہے کہ ادھر آپ سے ذرا سی چوک ہوئی' کسی ساتھی یا کسی عہدیدار کے انتخاب میں ذرا سی غلطی ہوئی اور آپ گئے....." اس نے ہاتھ سے گردن کٹنے کا اشارہ کیا۔ "بہرحال یہ حالات تو جوں توں کر کے چلتے ہی رہتے ہیں لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ میری بادشاہت کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ میری سلطنت کی دیواریں لرز رہی ہیں۔"

اس کے چہرے پر فکرمندی جھلک آئی تھی اور وہ کھڑکی کے قریب کھڑا جام کو دھیرے دھیرے انگلیوں میں گھما رہا تھا۔

"کیا کوئی دوسرا گروہ تمھارے مال پر ہاتھ ڈالنے لگا ہے؟" میں نے کہا۔

"یہی تو اصل مسئلہ ہے۔" وہ میری طرف دیکھ کر مربیانہ انداز میں مسکرایا۔ "اگر وہ محض ایک گروہ ہوتا تو احسان مرزا کب سے اس کا شیرازہ بکھیر چکا ہوتا۔ مسئلہ اس سے کہیں زیادہ سنگین ہے.... تم نے کبھی مافیا کے بارے میں کچھ سنا ہے؟"

"سنا تو نہیں.... میں نے اس کے بارے میں پڑھا بہت ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"بہت خوب....." اس نے ایک گھونٹ بھر کر کہا۔ "تو پھر تمھیں اس تنظیم کی طاقت' ہیبت اور وسعت کا بھی اندازہ ہوگا لیکن وہ محض اندازہ ہی ہوگا' حقیقت سے آگاہی نہیں۔ اٹلی سے یہ تنظیم اٹھی تھی اور جس طرح اس نے امریکہ' انگلینڈ' فرانس اور چند ایک یورپی ممالک میں پنجے گاڑے ہیں' اس کا کچھ کچھ تمھیں علم ہی ہوگا اور یہ بھی تم پڑھ چکے ہوگے کہ ترقی یافتہ ممالک اس نظام کے سامنے کس طرح بے بس ہو چکے ہیں۔ تمھیں معلوم ہی ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں قانون کی بالادستی کا نظام ہی اس تنظیم کے لیے امرت بن گیا۔ ترقی یافتہ ممالک میں کسی جرم کے ثبوت کے بغیر تو بڑے سے بڑا زنٹ صاحب بھی کسی غریب سے غریب آدمی کو نہیں پکڑ سکتے۔ اپنے ہندوستان والا حساب تو ہے نہیں کہ غریب آدمی دیکھا تو سپاہی نے بھی چار چھاپے رسید کر دیے یا تفتیش کی زد میں آیا تو تھانے سے ہاتھ پاؤں تڑوا کر نکلا۔ وہاں تو پولیس ربڑ کے پائپ سے کسی نہایت ہی خطرناک اور سخت جان مجرم سے کچھ اگلوانے کے لیے دو چار ضربیں لگا دیتی تھی تو اب اسے بھی وحشیانہ اور غیر انسانی تشدد قرار دے کر ختم کروا دیا گیا ہے۔ قانون کی اس بالادستی سے جہاں ان ملکوں نے بے پناہ ترقی کی ہے وہیں اس قسم کی لچک کی آڑ میں ہی درحقیقت مافیا پروان چڑھی ہے۔"

وہ جام سے گھونٹ بھرنے کے لیے خاموش ہو گیا۔

"یہ سب کچھ تو مجھے معلوم ہے۔" میں نے کہا۔

"میں محض یاددہانی کے طور پر بتا رہا ہوں۔" وہ مسکرایا۔ "اور ابتداء سے اصل موضوع پر آ رہا ہوں۔ تمھیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ اس تنظیم کا نظام بالکل اسی طرح چلتا ہے جس طرح حکومت برطانیہ کا نظام اس وقت چلتا تھا جب اس کی سلطنت پر سورج غروب نہیں ہوتا تھا یعنی دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نہ جانے کتنے ملکوں پر اس کی عملداری تھی۔ مافیا کی بھی جہاں جہاں عملداری ہے' وہاں اس کے ہاتھوں بکے ہوئے پولیس افسروں' ججوں' سیاستدانوں اور انتظامیہ کے عہدیداروں کا تو کچھ شمار ہی نہیں ہے۔ باقاعدہ کارکنوں کے علاوہ ہر علاقے کا انتظام چلانے کے لیے ایک بہت ہی سربرآوردہ قسم کا خاندان مقرر ہوتا ہے جس کا کوئی خاص نام نہیں ہوتا۔ اسے بس "فیملی" کہا جاتا ہے۔ فیملی ہی میں سے ایک شخص مافیا کو علاقائی طور پر قانونی حکمت عملی کے مطابق چلاتا ہے۔ اس شخص کا بھی بظاہر کوئی خاص عہدہ نہیں ہوتا۔ اسے بس "قونصلر" کہا جاتا ہے۔ بظاہر فیملی بڑی عزت و آبرو کی زندگی بسر کرتی ہے اور ان سے زیادہ حلیم الطبع اور پابند قانون شہری بڑی مشکل سے دیکھنے کو ملتے ہیں۔"

"یہ بھی مجھے معلوم ہے۔" میں نے کہا۔

"نئی بات میں تمھیں اب بتانے لگا ہوں۔" احسان مرزا نے کہا اور تپائی کے قریب آ کر اپنے لیے نیا جام تیار کرنے لگا۔ "نئی بات یہ ہے کہ ہندوستان میں بھی "فیملی" کا تقرر ہو گیا ہے۔"

"نہیں....." میں اچھل پڑا۔ "یہ کیسے ممکن ہے.... سات سمندر پار...."

"برطانوی سرکار بھی سات سمندر پار اور نہ جانے کن کن صحراؤں کے پار اور تاریک براعظم افریقہ کے بھی نہ جانے کن کن دور افتادہ گوشوں میں اپنے زیر نگین ملکوں کا نظام چلایا کرتی تھی۔" احسان مرزا نے میری بات کاٹ کر کہا اور جام تیار کر کے ایک بار پھر ٹہلنے

لگا۔ "اس لیے مافیا جیسی تنظیم کے لیے بھی یہاں فیملی کا تقرر کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ جس طرح انگریز ہندوستان کو سونے کی چڑیا سمجھ کر دوڑا آیا تھا، اسی طرح مافیا کو بھی اپنے مخصوص نظر سے یہ ملک سونے کی چڑیا ہی لگا ہوگا اور اس نے دیکھا ہوگا کہ جرم کے فروغ کے لیے یہاں کی فضا بڑی سازگار اور زمین بڑی زرخیز ہے، اس لیے اس کے پنجے یہاں تک پہنچ گئے ہیں۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ فیملی کا سب سے پہلا کام ہوتا ہے کہ سب سے پہلے وہ ان لوگوں کو تباہ کر کے رکھ دے جو جرائم کی دنیا میں اس کی برابری کر سکتے ہوں یا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑے ہو سکتے ہوں۔ قانونی اداروں کو ہموار کرنے کی طرف وہ بعد میں توجہ دیتی ہے....."

"اس حکمت عملی کے مطابق فیملی کی نظر سب سے پہلے تم پر پڑی ہے۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"تم بالکل صحیح سمجھے۔" احسان مرزا بولا۔ "میری سلطنت پر بڑے بھرپور انداز میں چاروں طرف سے حملے کیے جا رہے ہیں۔ میرے بہترین آدمیوں کو چن چن کر مارا جا رہا ہے۔ میرا مال لوٹا جا رہا ہے۔ میری پولیس ڈیوٹی جا رہی ہیں۔ میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو مافیا کی دہشت سے ہی ملک چھوڑ کر بھاگ چکا ہوتا لیکن میں ڈٹا ہوا ہوں اور آخری دم تک ڈٹا رہوں گا۔ اس مخاصمت کے سلسلے میں تصادم کے جو واقعات قانونی اداروں کے علم میں ہیں، ان میں ان کا کردار کسی قدر لاتعلقی کا سا ہے۔ حکومت کو یہ تو معلوم نہیں کہ دوسری قوت کو درحقیقت مافیا کی پشت پناہی حاصل ہے۔ وہ اسے محض کوئی دوسرا گروہ سمجھتی ہے اور اندر ہی اندر خوش ہے کہ چلو اس طرح دو بڑے گروہ آپس میں ٹکرا ٹکرا کر ختم ہو جائیں گے۔ میرے مسائل بہت بری طرح الجھ گئے ہیں.....مالی اور جانی نقصان تو جو ہو رہا ہے، ہو رہا ہے لیکن اس سے بھی بڑا مسئلہ یہ ہے کہ کارکنوں میں خوف و ہراس اور بددلی پھیل رہی ہے۔"

"لیکن تم اپنی جس طاقت و ہیبت کا نقشہ کھینچ رہے تھے، اس کی مناسبت سے تو یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔" میں نے کہا۔ "تم فیملی پر براہ راست چڑھ دوڑو۔ اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دو۔ مروا دو سب کو....."

"یہاں آکر تو مسئلے کی شان نرالی ہے۔" احسان مرزا نے ایک طویل آہ بھر کر کہا۔ "ایک تو مافیا نے فیملی کا تقرر اتنا سوچ سمجھ کر کیا ہے کہ داد دینے کو جی چاہتا ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے اس فیملی کو پیدا ہی شاید اس مقصد کے لیے کیا تھا۔ کسی زمانے میں وہ بے پناہ طاقتور و مضبوط فیملی رہی ہے۔ پوری ایک ریاست کا نظام اس کے سربراہ کے ہاتھ میں رہا ہے اور کردار کے اعتبار سے وہ پوری طرح مافیا کے مطلب کا آدمی تھا۔ میں بھی بہت برا آدمی ہوں لیکن اس کی تو شاید پچھلی سات پشتوں میں بھی کوئی اچھائی

کسی کو چھو کر نہیں گزری۔ بہرحال..... میرے لیے یہ بھی کوئی اتنا اہم مسئلہ نہیں تھا کہ فیملی بہت طاقتور ہے اور اس کے پیچھے مافیا ہے۔ میں اس کے باوجود چڑھ کر شاید کچھ نہ کچھ کر گزرتا لیکن فیملی صرف طاقتور ہی نہیں چالاک و مکار بھی ہے۔ اسے میری قوت کا اندازہ تھا، لہٰذا عملی طور پر میدان جنگ گرم کرنے سے پہلے اس نے بعض ضروری انتظامات مکمل کیے اور ترقی یافتہ ملکوں میں سرگرم عمل مافیا کی ٹیموں کے برعکس یہ فیملی ایک طرح سے انڈر گراؤنڈ چلی گئی۔ کہلانے کو تو یہ فیملی ہی کہلاتی ہے لیکن درحقیقت یہ صرف دو باپ بیٹا ہیں۔ میں ان دونوں کو اس وقت سے اچھی طرح جانتا ہوں جب انہیں فیملی کا "اعزاز" نہیں ملا تھا لیکن کچھ عرصہ پہلے یہ دونوں میری نظروں سے یوں اوجھل ہو گئے ہیں گویا کبھی دنیا میں تھے ہی نہیں۔ اب مجھے یہ سب کچھ معلوم ہے کہ مافیا کی فیملی کون سی ہے لیکن مجھے یہ نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے۔ میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ان کا جو آدمی بھی ہمارے ہاتھ لگا ہے، اس پر تشدد کر کے کچھ معلوم کرنے کی کوششیں اب تک بے سود رہی ہیں۔ مافیا کے نظام میں اس قسم کے سقم کی گنجائش نہیں ہوتی البتہ مافیا کی طرف سے مجھے پیغام مل چکا ہے کہ مجھے تباہ و برباد کر کے ایک روز سیمنٹ کے پائپ میں لٹا کر دونوں طرف کنکریٹ بھر کے سمندر میں پھینک دیا جائے گا۔ اگر میں امریکہ میں ہوتا تو اب تک ایسا کیا بھی جا چکا ہوتا۔ بہرحال مجھے اپنے انجام کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ میری سلطنت بکھرنے اور میرے ٹھکانے لگ جانے کے بعد فیملی منظرعام پر آجائے گی، اطمینان سے حکومت کرے گی اور مافیا کے پاؤں ہندوستان میں اور خوب مضبوط کر لے گی۔"

"آخر وہ فیملی ہے کون سی؟" میں نے پوچھا۔

"نواب شرافت علی خان اور اس کا سب سے بڑا بیٹا۔" احسان مرزا نے ہوا میں کسی غیر مرئی چیز کو دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔

"نواب شرافت علی خان.....!" میرے حلق سے سرسراتی ہوئی سی آواز نکلی اور میں بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا۔

مجھے احساس ہوا کہ احسان مرزا مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ ظاہر ہے اسے مجھ سے اس قسم کے ردعمل کی توقع نہیں تھی کیونکہ اس کے خیال میں، میں کسی بھی بات پر حیران یا خوفزدہ ہونے والا انسان نہیں تھا اور پھر اس کی توقع کے مطابق تو نواب شرافت علی کا نام میرے لیے اجنبی ہی ہونا چاہیے تھا لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ یہ نام میرے لیے کیا معنی رکھتا ہے۔

تاہم میں نے حتی الامکان پھرتی سے دوبارہ بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا نام بتایا تم نے؟"

"نواب شرافت علی....." احسان مرزا نے جواب دیا۔

"اوہ....." میں نے مصنوعی اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے ایک گہری سانس لی۔ "میں

سمجھا تھا کہ تم نے نواب سلامت علی کا کہا ہے' اسی لیے مجھے حیرت ہوئی تھی کیونکہ نواب سلامت علی میرے ایک دوست کے والد تھے لیکن وہ تو بے حد شریف آدمی تھے اور ویسے بھی وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔"

"اوہ....." احسان مرزا خوشدلی سے مسکرایا۔ میں نے اپنے تاثرات پر بہت جلد قابو پایا تھا ورنہ وہ چونک ہی گیا تھا۔ جب سے میں نے اپنے جذبات و احساسات پر قابو رکھنے کی مشق شروع کی تھی' یہ پہلا موقع تھا کہ میرا ردعمل اتنا واضح ہو گیا تھا۔ بہرحال بات بن ہی گئی تھی۔

میں نے ذہن پر زور دینے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ "ویسے میں غائبانہ طور پر نواب شرافت علی کو بھی جانتا ہوں لیکن میری معلومات کے مطابق تو وہ بہت بڑا نواب ہے۔ بہت بڑی جاگیر کا مالک ہے......بے پناہ دولت ہے اس کے پاس۔ اسے بھلا مافیا کا آلۂ کار بننے کی کیا ضرورت تھی؟"

"تمہارا یہ سوال بڑا اہم ہے اور مجھے قدرے تفصیل سے اس کا جواب دینا ہوگا تاکہ پس منظر تمہارے ذہن میں محفوظ رہے۔" احسان مرزا نے جام سے ایک بڑا سا گھونٹ بھرنے کے بعد گلاس رکھتے ہوئے کہا۔ "سب سے پہلی بات تو یہ کہ نواب شرافت علی جتنا بڑا زمیندار ہے یا یوں کہو کہ جتنا بڑا زمیندار تھا' اتنا ہی بڑا اس کا خاندان ہے۔ اس کی غیر شرعی بیویوں کا تو کوئی شمار ہی نہیں تھا' تاہم اس کی شرعی بیویوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں تھی جن میں سے بہت سی بیویوں کو وہ تیس روپے آٹھ آنے حق مہر دے کر طلاق بھی دے چکا تھا لیکن بہت سی عورتیں نرتکیاں یا بڑے خاندانوں سے بھی تھیں یا بعض ویسے ہی اچھی شرائط پر نواب سے بیاہی گئی تھیں۔ غرضیکہ اس طرح نواب کی اولاد کا سلسلہ بھی گویا لامحدود سا ہی ہے۔

"ادھر سرکار نے جب زرعی اصلاحات کا شوشا چھایا اور بڑی جاگیریں ضبط ہونے کی افواہ گرم ہوئی تو نواب نے جاگیریں اور جائیداد تقسیم کرکے بقدر حصہ اپنی اولادوں کے نام کرنی شروع کر دیں۔ اس سلسلے میں اس کے بعض سرکش بیٹوں اور بیگمات کا دباؤ بھی اس پر کافی عرصے سے بڑھ رہا تھا۔ جاگیر وغیرہ تقسیم ہونے کے بعد نواب کی حالت کچھ ایسی ہی ہو گئی تھی جیسے ہاتھی سکڑ کر چوہا بن گیا ہو۔ حالانکہ روپے پیسے کی اب بھی اس کے پاس کوئی کمی نہیں آئی تھی لیکن وہ تو ایک ہوس ہوتی ہے نا..... بڑے بڑے خطوں پر حکومت کرنے کی' بڑے بڑے علاقوں کا حاکم کہلانے کی..... وہ انسان کو قناعت نہیں کرنے دیتی۔ یہی ہوس تھی جو تاریخ کے دور سے بادشاہوں کو دوسرے ملکوں پر چڑھائی کرنے پر اکساتی رہتی ہے اور یہی ہوس درجہ بدرجہ نچلی سے نچلی سطح تک کسی نہ کسی روپ میں موجود رہتی ہے۔ ایک تو اس ہوس نے نواب شرافت علی کو بے چین رکھا ہوگا اور مافیا کی "فیملی" کے طور پر

تقرر کی پیشکش سن کر اس کی رال ٹپک پڑی ہوگی کیونکہ فیملی بننے کا مطلب بھی ایک الگ ہی انداز سے اقتدار حاصل ہونا ہے اور اس کے ساتھ ہی بے اندازہ دولت کا دریا بھی بہتا چلا آتا ہے۔ فیملی کے اشارے پر بڑے بڑے کام ہونے لگتے ہیں۔ وہ سیاست پر بھی اثرانداز ہوتی ہے.....اور یہ میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں کہ شرافت علی مزاجاً مافیا کا آدمی ہے۔

اس سے شاید زندگی میں کبھی بھول کر بھی کوئی اچھا کام سرزد نہیں ہوا۔ مثلاً اس کے مقابلے میں خود میں بھی بہت برا آدمی ہوں۔ میں جو کچھ بھی بنا ہوں' بہت برے پیشے سے بنا ہوں لیکن کبھی کبھی جیسے خودبخود ہی اندر سے کوئی نیکی پھوٹ پڑتی ہے۔ خوشنامی سے قطع نظر بتا رہا ہوں کہ میرا ہر بڑے شہر میں کسی نہ کسی نام سے کوئی ٹرسٹ قائم ہے جس کی آمدنی سے بیواؤں کو وظیفے ملتے ہیں۔ غریب طالب علموں کی فیس ادا ہوتی ہیں۔

ویسے ہی ایک ٹرسٹ کی "آڑ" میں' میں نے بمبئی میں کئی سال پہلے آٹھ سو نہایت سستے فلیٹس ان لوگوں کے لیے بنوائے تھے جو فٹ پاتھوں پر رہائش پذیر تھے۔ یہ خیال شاید مجھے اس لیے آیا تھا کہ میں بھی فٹ پاتھ پر پیدا ہوا تھا۔ بہرحال حکومت نے سب سے پہلا کام یہ کیا تھا کہ اس پروجیکٹ کے رفاہی پہلو کی طرف دھیان دیئے بغیر اس پر تمام مروجہ ٹیکس لگا دیئے تھے۔ بہرحال میں یہ مثال اس لیے دے رہا ہوں کہ مجھ جیسے گنہگاروں سے بھی کوئی نہ کوئی اچھا کام سرزد ہو ہی جاتا ہے لیکن میں نہایت وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ نواب شرافت علی سے کوئی اچھائی غلطی کے طور پر بھی سرزد نہیں ہو سکی۔

نواب کی شریف اولادیں اپنے حصے لے کر ادھر ادھر بکھر چکی ہیں۔ اس کے کچھ بیٹے' بیٹیاں دوسرے ملکوں میں رہائش اختیار کر چکے ہیں۔ بہرحال ہمیں شریف اولادوں سے کوئی غرض نہیں' فساد کی جڑ نواب اور اس کا بڑا بیٹا ہے۔

وہ تمام دھندے جو مافیا میں کرتی ہیں' ان کی سربراہی میں ہو رہے ہیں۔ ان کے بہت سے آدمی میرے آدمیوں کے ہاتھوں اور ہمارے بہت سے آدمی ان کے آدمیوں کے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں۔ گینگ وار چلتی رہتی ہے۔

"ہندوستان میں اب زیرزمین دنیا میں ہم دو ہی بڑی طاقتیں ہیں اور ہم میں جوڑ اتحاد نہیں ہو سکتا' اس لیے ہم میں سے کوئی ایک ہی باقی رہے گا۔ میرا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ میرے پاس لڑاکے تو بہت اچھے درجے کے موجود ہیں لیکن ذہین آدمیوں کی میرے پاس سخت کمی ہے۔ ایسے لوگ جو سربراہی کر سکیں' سربراہی صرف مجھے ہی کرنا پڑتی ہے۔ شروع ہی سے میں نے اپنا نظام کچھ ایسا بنایا تھا کہ چھوٹے سے چھوٹا معاملہ بھی میری نظر سے گزرے بغیر سرانجام نہ پائے۔

یہی نظام اب میرے لیے تکلیف دہ ثابت ہو رہا ہے۔ تنہا میری ذات اب تمام محاذوں

پر لڑنے کے لیے ناکافی ثابت ہو رہی ہے۔ دوسری بات یہ کہ اگر اسی رفتار سے میرے آدمی مرتے رہے تو میرے پاس جو کام کے آدمی ہیں' وہ بھی رفتہ رفتہ میرا ساتھ چھوڑ کر فرار ہونے لگیں گے۔ ان مسائل میں گھرا ہوا ہوں میں....." وہ میری طرف دیکھ کر عجیب مجبور سے انداز میں مسکرایا۔ "اس لیے مجھے تم جیسے ایک ساتھی کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔"

وہ خاموش ہو گیا اور اپنے لیے نیا جام تیار کرنے لگا۔ "کیا تمہارے خیال میں محض میرا ساتھ مل جانے کے بعد تمہارے حالات میں انقلاب آجائے گا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں اتنا مجھے یقین ہے۔" اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "میرے وجدان نے مجھے کبھی دھوکا نہیں دیا۔"

میں ہنس دیا لیکن وہ بدستور سنجیدہ رہا۔ پھر اس نے جام اٹھاتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ "کیا کہتے ہو؟" وہ اپنی آنکھوں کو ہر جذبے سے عاری رکھنے کی پوری پوری کوشش کر رہا تھا لیکن آنکھیں بڑی چغل خور ہوتی ہیں' اس کی آنکھیں بھی چغلی کھا رہی تھیں کہ وہ امید و بیم کی کیفیت میں مبتلا ہے۔

"چاہو تو چند دن غور و خوض کر کے جواب دے دینا۔" اس نے کہا

"میں دنوں کے حساب سے غور و خوض نہیں کرتا' منٹوں کے حساب سے کرتا ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بلکہ بعض اوقات تو فیصلے پر پہنچنے میں چند سیکنڈ ہی لگاتا ہوں۔ احسان مرزا! تم نے دوسری مرتبہ اتنے خلوص سے دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے کہ اسے قبول نہ کرنے کی ہمت نہیں پڑ رہی۔ آج سے تم مجھے اپنے دوستوں میں شمار کر سکتے ہو۔"

"کیا واقعی؟" اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور اس نے جام شیشے کی تپائی پر تقریباً پٹخ دیا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ چیخ مار کر اچھلا اور کمرے کے وسط میں جا کودا۔ انداز ویسا ہی تھا جیسا میں نے سرکس والوں پر دیکھا تھا۔ اس کی چیخ قطعی غیر انسانی لگتی تھی اور چھلانگ وہ بندر ہی کی سی پھرتی سے لگاتا تھا۔ پھر وہ محو رقص نہیں' حقیقتاً ناچنے لگا۔ یہ عجیب سا رقص تھا۔ افریقی قبائلیوں جیسا۔ سختی سے مٹھیاں بھینچے' وہ بازوؤں کو مجنونانہ انداز میں جھٹکے دے رہا تھا اور اچھل اچھل کر دونوں پاؤں زور زور سے زمین پر مار کر نیم دائرے میں گھوم رہا تھا۔

بلاشبہ وہ ایک عجیب آدمی تھا۔ جذبات کا اظہار یا تو سرے سے کرتا ہی نہیں تھا اور کرتا تھا تو اتنا بے ساختہ اور بھرپور کہ دیکھنے والے کا خون بھی گرما جاتا تھا۔ پھر وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو گیا اور قالین پر لوٹنے لگا۔ اس کے مختصر سے چہرے پر نسیں یوں ابھر آئی تھیں [illegible] نہ پھٹ ہی نہ پڑے۔

بالآخر میں اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکا' میں اٹھ کر اس کے قریب پہنچا' اسے کمر سے پکڑ کر کسی گڈے کی طرح اٹھایا' ہوا میں دو چار چکر دیئے اور ایک جھٹکے سے فرش پر کھڑا کر دیا۔ اس کی ہنسی تھم چکی تھی۔

"شکریہ۔" اس نے ناک رگڑ کر سوں سوں کرتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے کہا اور کاؤچ پر آبیٹھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بڑے فکرمندانہ لہجے میں بولا۔ "کہ اپنی زندگی کے اس نہایت پرمسرت موقع پر کس قسم کے جشن کا اہتمام کروں؟ تم ہی کچھ بتاؤ۔ کسی قسم کی فرمائش کرو' کچھ تو کہو۔"

"کسی جشن وغیرہ کی ضرورت نہیں۔" میں نے ہاتھ اٹھا کر حتمی لہجے میں کہا۔ "یہ کوئی فلمی سچوایشن نہیں ہے۔ ہمیں صرف کام کی بات کرنی چاہیے۔ یہ بتاؤ کیا تمہارے پاس دشمنوں کا کوئی بھی سراغ نہیں؟"

"ایک سراغ ہے تو سہی۔" وہ گاؤن کی جیبوں میں ہاتھ ٹھونستے ہوئے بولا۔ "لیکن پوری طرح یقین نہیں کہ وہ کوئی سراغ ہے بھی یا نہیں۔"

"پھر بھی.....بتاؤ تو سہی۔" میں نے کہا

"بتانے سے پہلے تمہیں کچھ دکھانا پڑے گا۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "میرے ساتھ آؤ۔"

اس کمرے سے نکل کر اس کی رہنمائی میں' میں ایک اور کمرے تک پہنچا۔ کمرے میں داخل ہو کر احسان مرزا نے دروازہ بند کر دیا۔ یہاں گھپ اندھیرا تھا اور ایک ہلکی سی خاص بو بتا رہی تھی کہ یہ کمرہ یا تو سرے سے استعمال ہی نہیں ہوتا یا پھر کبھی کبھار کھولا جاتا ہے۔

احسان مرزا نے نہایت مدھم سے کھٹکے سے کوئی سوئچ دبایا اور کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ تب میں نے دیکھا کہ وہ مستطیل کمرہ ایک باقاعدہ پروجیکشن روم تھا۔ اس کی ایک دیوار کے آگے بلندی پر ایک کاؤنٹر سا لگا ہوا تھا جس پر تین مختلف سائزوں کے پروجیکٹر نصب تھے۔ دائیں بائیں دونوں دیواروں پر نیچے سے چھت تک شیلف بنے ہوئے تھے جن میں غالباً ترتیب سے چھوٹے بڑے اسپول اور فلموں کے ڈبے رکھے ہوئے تھے۔

اس کاؤنٹر سے آگے چار قطاروں میں کچھ آرام دہ کرسیاں بھی نصب تھیں اور فرش بتدریج نیچے ہوتا جارہا تھا۔ سامنے والی دیوار پر ایک باقاعدہ اسٹیج سا تھا جس پر اسکرین تھی۔ اسکرین کے گرد ایک خاص قسم کا سیاہ فریم نظر آرہا تھا۔ یہ ایڈجسٹ ایبل فریم تھا۔ غالباً اس کے ذریعے خودکار نظام کے تحت اسکرین چھوٹی بڑی کی جا سکتی تھی۔

وہ مجھے ساتھ لیے کاؤنٹر کے پیچھے ہی جا کھڑا ہوا۔ کاؤنٹر کے نیچے ہاتھ ڈال کر اس نے

کوئی خاص دراز کھولی اور اس میں سے ایک ڈبہ نکالا۔ ڈبے میں دو چھوٹی چھوٹی فلمیں تھیں۔ اس نے ایک فلم آٹھ ایم ایم کے پروجیکٹر میں لگائی۔ پروجیکٹر کا سوئچ آن کرکے اس نے کمرے کی لائٹ بجھا دی۔

چند لمحے بعد ہلکی سی سرسراہٹ کے ساتھ پروجیکٹر چلنے لگا اور اسکرین روشن ہو گئی۔ چند سیکنڈ اسکرین سادہ رہی' پھر اچانک ہی اس پر ایک منظر ابھر آیا۔ فلم رنگین تھی اور یہ منظر کسی کلب کا بھی ہو سکتا تھا اور کسی گھر میں منعقد ہونے والی رقص و سرود کی محفل کا بھی۔ اس میں صرف چند جوڑے پرجوش انداز میں رقص کرتے نظر آ رہے تھے۔ ان کے چہرے تمتما رہے تھے۔ فلم کے ساتھ ساؤنڈ نہیں تھی' تاہم صاف نظر آ رہا تھا کہ رقص مغربی موسیقی کی دھن پر تھا مگر کہ بیشتر جوڑے ہندوستانی تھے' دو تین سفید فام لڑکیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔

کیمرہ ہجوم پر چند لمحے ادھر ادھر چکراتا رہا' پھر جیسے خاص طور پر چند جوڑوں پر ساکت ہو گیا۔ پھر میرے قریب ہی احسان مرزا کی آواز ابھری۔ "یہ بمبئی ہی کے ایک کلب کا منظر ہے۔ ان جوڑوں کے وسط میں نیلے سوٹ میں جو نوجوان پیلے اسکرٹ والی ایک دیسی لڑکی کے ساتھ رقص کر رہا ہے' اسے غور سے دیکھنا۔"

اس نوجوان کا چہرہ کبھی کبھار ہی کیمرے کی طرف ہو رہا تھا۔ پھر جیسے کیمرہ اس کے کچھ قریب پہنچ گیا اور دیگر دو ایک جوڑوں کے ساتھ وہ مجھے واضح نظر آنے لگا۔ وہ نیلی آنکھوں اور بھورے بالوں والا ایک دراز قد خوش وجیہہ نوجوان تھا۔ لڑکیاں بلاشبہ اس پر مرتی ہوں گی۔ اس کی ہم رقص قد میں اس سے نہیں چھوٹی تھی لیکن شاید اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کے گلے میں جھول ہی جائے۔ وہ پارے کی طرح متحرک رہی تھی۔

سب جوڑے رقص اور اپنے ہم رقص میں مگن تھے۔ دفعتاً اس نوجوان نے دزدیدہ سی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنی ہم رقص کو کوئی اشارہ کیا۔ وہ مخمور سے انداز میں مسکرائی۔ پھر وہ دونوں رقص کرتے ہوئے جوڑوں کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے غیر محسوس طور پر بھیڑ سے نکل گئے۔

وہ سیڑھیوں کی طرف جا رہے تھے اور کیمرہ ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ پھر فلم میں چند سیکنڈ کا وقفہ آیا۔ پھر جیسے کیمرے کے سامنے کوئی جالی سی آئی جو جلد ہی ہٹ گئی۔ وہ دونوں ایک بار پھر کیمرہ کے سامنے تھے اور دونوں ہی پر گویا شیطان سوار تھا مگر پھر وہ ایک طرف کو مڑے اور کیمرے کی زد سے نکل گئے۔ کیمرے نے ادھر ادھر تھوڑی سی حرکت کی۔ چند چیزیں اس کی زد میں آئیں جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کہیں بلندی سے کسی کمرے کا منظر گرفت میں لینے کی کوشش کر رہا تھا مگر کوئی رکاوٹ درمیان میں حائل تھی' بالآخر اسکرین تاریک ہو گئی۔

اس نوجوان کی صورت ذہن نشین ہو گئی ہے ناں؟" احسان مرزا نے پوچھا۔

"ہمیشہ کے لیے۔" میں نے جواب دیا۔

"اب ذرا یہ دوسری فلم دیکھو۔" اس نے پروجیکٹر کے بلب کی مدھم روشنی میں ہی فلم تبدیل کی۔

اس بار آٹھ ایم ایم کی چھوٹی سی اسکرین پر جو فلم شروع ہوئی' وہ بلیک اینڈ وائٹ تھی۔ پہلے چند لمحے منڈ درخت دکھائی دیے جن پر برف جمی ہوئی تھی۔ پھر اچانک ہی کیمرہ کسی لمبے اور نیم تاریک سے ہال میں پہنچ گیا۔ یہ ہال کسی خانقاہ سے مشابہ تھا۔ اس کی دیواروں پر مشعلیں روشن تھیں۔

یہ ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کچھ دو زانوں بیٹھے تھے اور کچھ آلتی پالتی مارے۔ ان کے سروں پر مختلف بناوٹ کی اونی یا فر کی ٹوپیاں تھیں۔ ان کے لباسوں کا کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ مجموعی طور پر وہ حلیے سے پٹھان معلوم ہوتے تھے لیکن پٹھان نہیں تھے۔ ان میں سے جتنی بھی شکلیں واضح نظر آئیں' وہ نیپالی صورتیں معلوم ہوتی تھیں۔ کیمرہ ان پر سے ہوتا ہوا ایک بہت بڑے اسٹیج نما چبوترے پر جا ٹھہرا۔

اسٹیج پر دو بڑی بڑی انگیٹھیاں روشن تھیں جن سے کثیف سا دھواں اٹھ رہا تھا۔ ان کے درمیان دو پستہ قد لیکن تناسب اور خوبصورتی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی دو لڑکیاں ہاتھوں میں تھال اٹھائے سر جھکائے کھڑی تھیں۔ ان کے جسموں پر منی اسکرٹ سے مشابہ سفید لبادے تھے جو بظاہر بغیر سے ہی معلوم ہوتے تھے۔ ان کے گھنے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔

ان کے درمیان ایک مخنی زمانہ غار کے سے انسانوں کا ریچھ کی کھال کا مختصر سا لباس پہنے آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس کا سر اور شاید بھنویں بھی منڈی ہوئی تھیں اور اس کے گول مٹول چہرے پر بڑی بڑی سرخ آنکھیں کچھ زیادہ ہی نمایاں نظر آ رہی تھیں۔ بالوں سے بے نیاز اس کا بڑا سا گھٹا ہوا سر اور سفید سفید سا چہرہ کسی بہت بڑے انڈے سے مشابہ نظر آ رہا تھا۔

اس کا جسم کسرتی اور چوڑا چکلا تھا۔ وہ ہاتھ گود میں ٹکائے بیٹھا تھا اور اس کے بازوؤں کی مچھلیاں نمایاں نظر آ رہی تھیں۔ اس کے گلے میں موٹے موٹے منکوں والی کئی مالائیں تھیں۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ دھیرے دھیرے اس کے ہونٹوں کی حرکت میں تیزی آتی گئی اور ان کے گوشوں سے کف سا بہنے لگا۔ پھر اس نے جیسے جوشیلے انداز میں بازو پر کر سوالیہ نظروں سے حاضرین کے ہجوم کی طرف دیکھا۔

کیمرہ ہجوم کی طرف مڑا۔ لوگ جوش و خروش سے بازو ہلا کر کچھ کہہ رہے تھے۔ انداز کسی کی تائید میں نعرے لگانے کا سا تھا۔ ان میں سے کچھ اٹھ بھی کھڑے ہوئے تھے۔ کیمرہ

ایک بار پھر اسٹیج کی طرف مڑ گیا۔ وہ شخص مشفقانہ انداز میں دونوں بازو ہلا ہلا کر انہیں بیٹھ جانے کا اشارہ کر رہا تھا۔

پھر غالباً اس خاقان نما ہال میں سکوت چھا گیا اور وہ سر منڈا آنکھیں بند کر کے یوں دائیں بائیں سر ہلانے لگا جیسے وجد میں آ رہا ہو۔ اس کے دائیں بائیں دونوں لڑکیاں جو بتوں کی طرح ساکت کھڑی تھیں' دھیرے دھیرے جیسے ان میں جان پڑنے لگی۔

پہلے انہوں نے تھرکنا شروع کیا' پھر وہ باقاعدہ رقص کرنے لگیں۔ اس دھندلی سی بلیک اینڈ وائٹ فلم کی صورت میں بھی یہ رقص دیکھ کر میرے جسم میں چیونٹیاں سی دوڑنے لگیں تھیں۔ تھال اب بھی لڑکیوں کے ہاتھ میں تھے۔ کبھی وہ اسے دائیں ہاتھ پر ٹکا لیتی تھیں اور کبھی بائیں ہاتھ پر۔ ان میں سے بار بار کسی چیز کی مٹھی بھر بھر کر وہ حاضرین کی طرف اچھالتی جا رہی تھیں' نہ جانے کیا چیز تھی۔ اسکرین پر جگنوؤں سے مشابہ نظر آ رہی تھی۔ فلم یکلخت ختم ہو گئی۔

احسان مرزا نے پروجیکٹر بند کیا۔ لائٹ آن کی اور میرا ہاتھ تھام کر کاؤنٹر کے عقب سے نکل آیا۔ چند لمحے بعد ہم دوبارہ اسی کمرے میں آ گئے جہاں پہلے بیٹھے تھے۔ احسان مرزا نے اپنا وہی جام اٹھا لیا جو اس نے خوشی میں میز پر پٹخ دیا تھا اور جو آدھے سے زیادہ چھلک چکا تھا۔ میں بیٹھ چکا تو اس نے ایک گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے پوچھا۔ "ان دونوں فلموں میں تمہیں سب سے خاص بات کیا نظر آئی؟"

"یہی کہ بمبئی کے ایک ماڈرن کلب میں تھری پیس سوٹ پہن کر رقص کرنے والا اور زمانہ غار کے انسانوں کی طرح کھال لپیٹ کر اسٹیج پر بیٹھا ہوا وہ شخص ایک ہی ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"بہت خوب۔" وہ اپنی ران پر ہاتھ مار کر تقریباً چلا اٹھا۔ "تم بلاشبہ ایک بے مثال انسان ہو۔ اس حقیقت کو شاید ہی کوئی محسوس کر پاتا۔ رنگین فلم تقریباً چار سال پہلے کی ہے اور بلیک اینڈ وائٹ فلم ایک سال سے زیادہ پرانی نہیں۔ صحیح عرصے کا تعین بہرحال نہیں کیا جا سکتا۔ یہ فلمیں مجھ تک کیسے پہنچیں یا کیوں اور کیسے بنائی گئی تھیں' یہ ایک علیحدہ اور طویل کہانی ہے جسے ہم فی الحال نہیں چھیڑیں گے۔

رنگین فلم میں تم نے جس سوٹڈ بوٹڈ نوجوان کو دیکھا ہے' اس کا نام حشمت علی خان ہے۔ یہ نواب شرافت علی کی سب سے بڑی بیوی کا سب سے بڑا بیٹا ہے۔ میں بھی تقریباً پر یقین ہوں کہ دوسری فلم میں نظر آنے والا شخص بے پناہ مختلف نظر آنے کے باوجود درحقیقت یہی ہے لیکن جب میں یہ غور کرتا ہوں کہ تین سال یا اس سے بھی کم عرصے میں یہ کایا کیسے پلٹی' وہ اس مقام پر کیسے پہنچا جہاں کی وہ تصویر ہے اور وہاں اس نے اپنے جھنڈے کیونکر گاڑے تو پھر میرا یقین متزلزل ہونے لگتا ہے کہ وہ نواب زادہ حشمت علی ہی ہے۔

دوسری فلم میں تم نے جو ہال سا دیکھا ہے' وہ ایک عبادت گاہ ہے۔ اتنا تو تمہیں اندازہ ہو ہی گیا ہوگا۔ یہ عبادت گاہ ایک ایسی چھوٹی سی وادی میں واقع ہے جسے آباد ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ نیپال کی سرحد کے قریب واقع یہ وادی ایک پیالے کی سی شکل کی ہے۔ اس کے تینوں اطراف میں بلند و بالا پہاڑوں کی دیواریں ہیں۔

اندر جانے اور باہر آنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے۔ پتھروں کو تراش کر بنائی گئی یہ سڑک صرف چودہ پندرہ میل لمبی ہے اور ویرانوں اور دشوار گزار راستوں سے گزر کر اس تک پہنچا جا سکتا ہے۔ ہندوستانی نقشے کے مطابق تو یہ علاقہ ہندوستان ہی کی ملکیت ہے لیکن درحقیقت یہ تبت' نیپال اور ہندوستان کے درمیان پھیلی ہوئی اس کئی چھٹی سی پٹی میں ہی شامل ہے جہاں ان تینوں علاقوں کے مجذوب بلکہ کبھی کبھی ریڈ جانا کے باغی بھی آ گھستے ہیں اور برسوں یہاں کے پر پیچ پہاڑوں یا وادیوں میں روپوش رہتے ہیں۔

عملاً یہ علاقہ آزاد ہی ہے۔ اب اس پٹی پر کئی بستیاں تو مستقلاً آباد ہو چکی ہیں اور ان کا اپنا اپنا ہی نظام ہے۔ یہ وادی جس کا میں ذکر کر رہا ہوں' انہی بستیوں میں سے ایک ہے۔ اس کی آبادی تقریباً پانچ ہزار ہے۔ اس کے باشندے نسلی طور پر تبتی ہیں لیکن سب کے سب نہیں..... ان میں دوغلے نیپالی بھی شامل ہیں۔ ان کے مذہبی نظریات اور معاشرتی نظام بھی نہ تو نیپالیوں سے ملتا ہے اور نہ تبتیوں سے۔

نیپال کے بیشتر قبیلوں میں سانپ کی پوجا کی جاتی ہے۔ یہ لوگ سانپ کے سخت دشمن ہیں۔ تبت والوں کا مذہبی پیشوا لامہ اور سب سے بڑا پیشوا دلائی لامہ ہوتا ہے لیکن یہ لوگ اپنے مذہبی پیشوا کو منوچی کہتے ہیں۔ اس کا مفہوم وہی ہے جو ہمارے ہاں پیر سائیں کا ہوتا ہے۔

ان کا ایک حکمران بھی ہوتا ہے جو صرف ایک سال کے لیے منتخب ہوتا ہے۔ وہ انہی میں سے کوئی معتبر اور عمر رسیدہ شخص ہوتا ہے۔ اسے "پالی" کہا جاتا ہے اور اسے ہمارے قبائلی جرگوں سے مشابہ ایک کونسل منتخب کرتی ہے لیکن وہ برطانیہ کی ملکہ کی طرح محض دکھاوے کا سردار ہوتا ہے۔ اصل اقتدار جرگے اور منوچی کے پاس ہی ہوتا ہے۔ خاص خاص فیصلے انہی کے اشاروں پر ہوتے ہیں۔

"یہ تو تم سمجھ ہی چکے ہو گے کہ حشمت علی ان کا "منوچی" بنا بیٹھا ہے اور اسکا باپ نواب شرافت علی ان لوگوں کا "پالی" بنا بیٹھا ہے۔ انہوں نے یہ مقام کیسے حاصل کیا اور زبان پر عبور کیسے حاصل کیا' یہ سوچ کر مجھے حیرانی ہوتی ہے۔ بے شک وہ لوگ بیوقوفی کی حد تک سادہ لوح اور بھیڑ چال کے عادی ہیں' پھر بھی اجتماعی طور پر ان کی لگام ہاتھ میں لے لینا بہت ہی چالاکی کی بات ہے۔

اس کا ایک جواز تو میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ وادی ایک طرح سے بسائی ہی حشمت علی نے تھی۔ دو تین سال پہلے تک یہاں صرف پانچ سات سو افراد تھے۔ دوسری بات یہ کہ اس نے تمام مذاہب کے پیروں فقیروں کے برعکس شروع شروع میں لوگوں سے نذرانے وغیرہ لینے کے بجائے ان میں اشیائے ضرورت تقسیم کیں۔ انھیں مختلف کاموں کا ڈھنگ سکھایا۔

"اس کے یہاں جا بسنے کی وجوہات سمجھنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ یہ حکمت عملی خواہ ان لوگوں کی اپنی تھی یا مافیہ کی تجویز کردہ لیکن بہرحال تھی بہت خوب۔ میں اب بھی اس پر غور کرتا ہوں تو عش عش کر بیٹھتا ہوں۔ اتنی بڑی پلاننگ ہم شہری قسم کے مجرم کبھی نہیں کر سکتے اور نہ ہی متمدن زندگی سے دور ہونے کا تصور کر سکتے ہیں۔

ہمیں اس طرح کے دور دراز علاقے میں ایسی وحشیانہ زندگی گزارنا شاید بہت تکلیف دہ معلوم ہو حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر ایسے علاقوں میں انسان کو پانچ سات ہزار انسانوں پر بھی اقتدار حاصل ہو جائے تو کہیں زیادہ نعمتیں اور قدرت کی نہ جانے کتنی خوبصورتیاں اس کی غلام ہوتی ہیں۔

اب تم اس حشمت علی کو ہی دیکھ لو۔ تم نے اس کی تین چار سال پہلے کی شہری زندگی کی فلم بھی دیکھی ہے۔ ٹھیک ہے کہ اس وقت بھی وہ صحت مند اور وجیہہ تھا لیکن اسے دیکھ کر پھر بھی پھیکے پن اور نزاکت کا احساس سا ہوتا تھا۔ پھر تم نے دوسری فلم میں اسے دیکھا۔ فلم بہت ناقص سی تھی لیکن تم نے دیکھا وہ کتنا تنومند کڑیل اور سخت جان نظر آ رہا تھا؟ ٹارزن کی اولاد بن گیا ہے۔

"اسے وہاں کمی کس چیز کی ہے؟ فطرت کے تمام مظاہر اور تمام نعمتیں اپنے اصل روپ میں اسے افراط سے میسر ہیں۔ بہترین جانوروں کا گوشت وہ کھاتا ہے۔ بہترین شرابیں وہ پیتا ہے۔ شہر کی گھاگ لڑکیوں کی جگہ اچھوتی، کنواری اور حقیقی معنوں میں حسین لڑکیاں اس کے ایک اشارے پر قربان ہونے کے لیے دست بستہ کھڑی رہتی ہیں۔ ہزاروں بیوقوف اس کے لیے سر کٹانے کو تیار رہتے ہیں۔ آلائشوں سے پاک، مصفا اور فولاد کی آمیزش والا پہاڑی پانی اسے پینے کے لیے میسر ہے۔ گرد اور دھوئیں سے پاک تازہ ہوا میں وہ سانس لیتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ ہم سے کہیں بہتر زندگی گزار رہا ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ لوٹ کر کبھی آئے تو چار دن میں بیمار پڑ جائے۔"

اس کے لہجے میں رشک نہیں، غصہ اور دبی دبی جھنجلاہٹ تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اصل موضوع سے ہٹ رہا تھا، تاہم میں خاموش رہا۔

○

[illegible]

[illegible]

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ خود ہی اصل موضوع پر آ گیا۔ گہری سانس لے کر بولا۔ "اب میں اس معاملے کے دوسرے اور اصل پہلو کی طرف آتا ہوں۔ جیسا کہ میں نے کہا کہ اس خبیث نے خوب تاڑ کر یہ جگہ منتخب کی ہے۔ تم ذرا چشم تصور سے اس چھوٹی سی وادی کی بناوٹ ذہن میں لاؤ۔ تقریباً چاروں ہی طرف بلند و بالا پہاڑوں کی دیواریں ہیں۔ صرف ایک ہی راستے سے وادی میں داخل ہونا ممکن ہے اور وہ بھی گاڑیوں پر نہیں کسی بڑے ہجوم کی صورت میں نہیں یعنی اس وادی میں رہتے ہوئے اگر صرف سو دو سو مسلح اور جانباز اس علاقے کے بھیدی اور آپ کے اشارے پر سر کٹانے والے آپ کے ساتھ ہوں تو آپ اچھی بھلی فوج کو بھی اندر آنے سے نہ صرف روک سکتے ہیں بلکہ اگر وہ زیادہ ہی جرات مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پیش قدمی جاری رکھیں تو قسطوں میں انہیں بھون بھی سکتے ہیں۔

"یہ تو ہوئی دفاعی نقطہ نظر سے اس کی اہمیت..... اب آؤ دوسرے معاملوں کی طرف۔ ان لوگوں کا کوئی خاص ذریعہ معاش نہیں ہے۔ جہاں تک میں معلومات جمع کر سکا ہوں، یہاں لوگ کچھ برفانی لومڑیوں اور ریچھوں کا شکار کرتے ہیں اور ان کی چربی اور کھالیں وغیرہ نیپال یا کسی قریبی علاقے کی طرف بھجوا دیتے ہیں مگر یہ کام ایک طرح سے برائے نام ہی کا ہے۔

"اصل معاملہ یہ ہے کہ وادی کے پچھلے حصے میں نشیب ہیں اور خارجی راستے کے دائیں بائیں ڈھلانوں میں جو نرم اور بھربھری زمین ہے، وہ سب کی سب قدرتی طور پر ہی جنگل، افیون اور ان تمام جڑی بوٹیوں کے پودوں سے اٹی پڑی ہے جن سے منشیات تیار ہو سکتی ہیں۔

حشمت علی یعنی منوچی صاحب نے یہ کیا ہوا ہے کہ بیشتر باشندوں کو باقاعدہ کھیتی باڑی میں لگا کر روزگار فراہم کیا ہے اور کھیتی باڑی انہی منشیات کے پودوں کی ہوتی ہے۔ سادہ لوح باشندوں کو اس سے غرض نہیں کہ منوچی صاحب فصلوں کا کیا کرتے ہیں۔ انھیں تو اس بات سے مطلب ہے کہ انہیں ضروریات زندگی اور راشنلیں ملی ہوئی ہیں۔

"ویسے بھی ان علاقوں میں منشیات کوئی اتنی معیوب چیزیں نہیں ہیں۔ گو کہ وہ لوگ

خود منشیات برائے نام ہی استعمال کرتے ہیں لیکن ان کو دیگر عام چیزوں ہی کی طرح سمجھتے ہیں۔ ادھر نیپال قریب ہی ہے جہاں سے منشیات کی نقل و حرکت یا مقامی طور پر فروخت قطعاً دشوار نہیں۔ میں نے سنا ہے کہ اسی وادی سے منشیات کچی شکل میں کھٹمنڈو کی ایک بہت بڑی لیبارٹری میں جاتی ہیں جو معقول معاوضے پر ان سے ہیروئن تیار کر کے دیتی ہے۔

"لیبارٹری ویسے تو دوائیاں تیار کرتی ہے اور اس کا جائز اور قانونی بزنس بہت بڑا ہے لیکن یہ کام گویا وہ "اوور ٹائم" کے طور پر کرتی ہے۔ یبارٹری والوں کو یہ نہیں معلوم ہونے پاتا کہ عجیب مال کہاں سے آتی ہے اور کہاں جاتی ہے...... ممکن ہے اس کے مالکان میں سے کسی کو معلوم ہو لیکن میرے لوگوں کو اس کا پتا نہیں چل سکا۔

بظاہر یہ بڑا حقیر اور فرسودہ دوسری سے مقابلے میں کم آمدنی کا سلسلہ معلوم ہوتا ہے لیکن تمہیں سن کر حیرت ہوگی کہ معاملہ کروڑوں کی سالانہ آمدنی تک پہنچا ہوا ہے اور دن بدنا پھل پھول رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ حشمت علی اور شرافت علی کے دائرہ اقتدار اور قوت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ وہیں بیٹھ کر یہ دوسرے جرائم کو کنٹرول کر رہے ہیں۔ ہندوستان کی زیرزمین دنیا کے بہت بڑے حصے کا کنٹرول ان کے پاس ہے۔ مین پاور بھی ان کے پاس موجود ہے۔ کھٹمنڈو کے راستے ان کا رابطہ بمبئی دہلی سے قائم ہے۔ دونوں باپ بیٹا ایک محفوظ جگہ بیٹھ کر وہاں بھی اور یہاں بھی حکومت کر رہے ہیں۔

مزے کی بات یہ ہے کہ نیپال یا ہندوستان دونوں میں سے کوئی بھی حکومت اس طرف متوجہ نہیں ہو رہی ہے۔ میں نے ادھر توجہ دلانے کے لیے دو ایک ڈوریاں ہلائیں مگر ایک تو ہر حکومت کو اس سے کہیں زیادہ بڑے اور اہم مسئلے درپیش ہیں جن میں وہ ہمہ وقت الجھی رہتی ہے' دوسری بات یہ کہ نازک سرحدی علاقوں اور خونخوار مسلح قبائلیوں کو کوئی بھی حکومت نہیں چھیڑتی۔

کوئی پتا نہیں ہوتا کہ یہ قبائلی جب بپھر گئیں تو کس ملک کے ہمدرد کار بن جائیں۔ جس وحشی قبیلے کا میں نے تمہیں بتایا ہے' وہ بھی بظاہر پرامن' سادہ لوح اور بے ضرر ہے لیکن اس کے باوجود اٹھنے اور لڑنے کے معاملے میں وہ بہت خطرناک نکلیں۔ اگر کوئی حکومت اس قسم کے قبیلوں سے ٹکرائے بھی تو خونریزی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس کا کوئی نتیجہ تو کبھی نکل سکتا ہے کہ ہندوستان جیسی کوئی بڑی حکومت یہ تہیہ ہی کر لے کہ اسے اس پٹی پر اپنی حکمرانی ہر حال میں قائم کرنی ہے۔

"عالم یہ ہے کہ ایک بار حکومت نے کچھ قبائلیوں پر سختی کی تو وہ ایک آتش فشاں پہاڑ پر چڑھ کر اس کے دہانے کے اندر گھس کر بیٹھ گئے۔ کئی ماہ کی کوششوں کے بعد بالآخر جب فوج انہیں نکالنے میں کامیاب ہوئی اور انہیں نیچے لایا گیا تو وہ زمانہ غار کے انسانوں سے بھی بدتر نظر آرہے تھے۔"

ان کے بال اور داڑھیاں جھاڑ جھنکاڑ کی طرح بڑھی ہوئی تھیں۔ جسموں پر میل کی تہیں تھیں اور جگہ جگہ جوئیں قطار در قطار چل رہی تھیں۔ ان کے وجود سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ پہاڑوں پر انہوں نے اس عالم میں دن گزارے کہ جو بھی جانور یا پرندہ ہاتھ لگتا تھا' اسے کاٹ کر کچا کھا جاتے تھے۔ تقریباً سب کے سب ٹی بی کا شکار تھے اور خون تھوک رہے تھے مگر انہیں جیسے کسی بھی بات کی کوئی پروا نہیں تھی۔

ان کی رائفلیں اور مشین گنیں گوکہ خالی ہو چکی تھیں مگر وہ انہیں ایک لمحے کے لیے بھی اپنے سے جدا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے اور بار بار متوقع نظروں سے اپنے سردار کی طرف دیکھتے تھے کہ اگر وہ اب بھی لڑنے کا حکم دے تو وہ خالی بندوقوں سے ہی لڑنا شروع کر دیں۔ میرے ایک دوست سرکاری افسر نے بہت سے اس قسم کے واقعات مجھے سنائے تھے۔

یہ مثال میں اس لیے تمہارے گوش گزار کر رہا ہوں کہ تمہیں صحیح طور پر اندازہ ہو سکے کہ حشمت علی اور شرافت علی اپنی عملداری میں کتنے محفوظ ہیں۔ میرے پاس "مافیا فیملی" کا یہی ایک سراغ ہے اور اس کے پیچھے بھی کئی جانیں ضائع کر چکا ہوں۔ میں نے موت کے کئی ہرکارے اس وادی کی طرف بھیجے لیکن کوئی زندہ واپس نہیں آسکا حتیٰ کہ کوئی وادی میں داخل تک نہیں ہو سکا۔

مجھے صحیح طور پر علم تو نہیں لیکن میرا اندازہ یہی ہے کہ حشمت علی نے لوگوں کی شناخت اور واقفے کا کوئی ایسا انتظام ضرور وضع کر رکھا ہے جس سے گزر کر کسی مشکوک اجنبی کا وادی میں داخل ہونا ممکن نہیں اور اس قسم کا انتظام کرنا اس کے لیے کوئی بڑی بات نہیں تھی کیونکہ وادی میں داخل ہونے کا تو ایک ہی راستہ ہے...... اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ شاید تقدیر بھی اس کے ساتھ ہے۔ اپنی ایک اور کمزوری بھی میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میرے پاس ایسے ذہین آدمیوں کی سخت کمی ہے جو تنہا اپنی ذات میں ایک گروہ ہوں۔ کسی مہم کو اپنے طور پر سر کر سکتے ہوں۔ ضروری نہیں کہ تم وہاں پہنچنے کے بعد بھی انہیں ختم کر سکو۔

"اس لحاظ سے یہ ایک طرح کا جوا بھی ہے...... لیکن ایک بات تو بہرحال طے ہے کہ اگر میرا یہ اندازہ بھی کسے درست ہونے کا قوی امکان ہے' درست ہی ہوا تو اس ایک سراغ سے سراغ ملتا چلا جائے گا اور ہم اس پوری سلطنت کی بساط لپیٹ دیں گے جو دن بدن پھیلتی اور مضبوط ہوتی جا رہی ہے۔ اب بولو...... کیا تم یہ جوا کھیلنے کے لیے تیار ہو؟"

احسان مرزا خاموش ہو گیا لیکن ساتھ ہی مضطربانہ انداز میں ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ اس کی نظر مجھ پر ہی جمی ہوئی تھی۔ میں نے نہایت توجہ اور خاموشی سے اس کی طویل گفتگو کا ایک ایک لفظ سنا تھا اور میرا ذہن اس وقت اتنا مستعد تھا کہ ٹیپ ریکارڈر کی طرح ہر لفظ کو

گویا ریکارڈ کرتا جا رہا تھا...

میں نے گہری سانس لی، بالوں میں انگلیاں پھیریں اور سر جھٹک کر بغور اس کی طرف دیکھا۔ معلوم نہیں کیوں بے پناہ طاقت کا مالک یہ مختصر سا شخص مجھے بھی اسی طرح اچھا لگنے لگا تھا جس طرح بقول اس کے، میں اسے اچھا لگا تھا۔ مجھے بھی اس سے انسیت سی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس کی پشرتی برائیاں اپنی جگہ سہی لیکن مجھے اس کی سچائی اور کھرا پن بہت پسند آیا تھا۔ کم از کم مجھے جب سے اس نے دوست کہا تھا، تب سے میں محسوس کر رہا تھا کہ میں اس پر انحصار کر سکتا ہوں۔ میرے لیے وہ دنیا کا ہر وہ کام کر سکتا ہے جو اس کے بس میں تھا۔ اس کے انداز میں کچھ شفقت اور بزرگی سی بھی تھی۔ وہ میری طرف دیکھتا تو اس کی نظروں میں کچھ ایسا تفاخر اور مان نظر آتا تھا جیسے واقعی بقول اس کے کسی دیہاتی کا بیٹا ولایت پاس کر کے آگیا ہو۔ ایسے ساتھی، دوست اور... پشت پناہی کرنے والے کی مجھے ضرورت تھی۔

"احسان مرزا!؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تمہاری دوستی کا ہاتھ تھام کر بھی تو میں نے جوا ہی کھیلا ہے، اب مزید خطرات کی کیا پروا کرنا۔ وہ جو ایک محاورہ ہے نا کہ اونٹوں والوں سے دوستی ہو تو گھر کے دروازے اونچے رکھنے پڑتے ہیں، لہٰذا جناب! جب دوستی احسان مرزا سے ہو تو پھر خطرات سے کیا گھبرانا۔ اگر یہ جوا ہے تو جوا ہی سہی، تمہاری خاطر کھیلیں گے ضرور..."

"جیو پیارے۔" اس نے جام رکھ کر قریب آ کر دونوں ہاتھوں سے میرے کندھے زور زور سے تھپتھپائے۔ "ایک طویل عرصے بعد کسی طرف سے قلب کو اطمینان دینے والی ہوا کا جھونکا آیا ہے۔"

مجھے اپنے آپ پر قدرے حیرت بھی ہوئی۔ حالات نے مجھے ڈپلومیسی سکھا دی تھی۔ جوا مجھے اس کی خاطر نہیں، اپنی خاطر، اپنی ماں اور اپنے گم شدہ وقار کی خاطر کھیلنا تھا لیکن احسان مرزا اسے اپنی گردن پر احسان شمار کر رہا تھا۔

"تو پھر کتنے عرصے تک جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟" چند لمحے بعد اس نے پوچھا۔

"عرصے کا کیا سوال ہے۔" جتنی جلدی بھی ممکن ہوا، میں چلا جاؤں گا۔ اس نوعیت کے کاموں میں تاخیر قطعی مناسب نہیں ہوتی۔ میں پرسوں یا زیادہ سے زیادہ اس سے اگلے روز روانہ ہونے کا ارادہ رکھتا ہوں..."

"بہت خوب..." اس کی آنکھوں میں دنیا جہان کی ستائش سمٹ آئی۔ "تمہاری تیاریاں کیا کیا ہوں گی؟"

"کچھ نہیں..." میں نے جواب دیا۔ "مجھے صرف ایک چھوٹی سی چیز کی ضرورت ہوگی۔ اس کی تمہیں زحمت دوں گا۔ وہ ابھی اس لیے کہ وہ چیز مجھے جلدی چاہیے اور اس

وادی میں میری کوئی خاص واقفیت نہیں۔"

میں نے اپنے گلے سے اپنا طلائی لاکٹ نکالا اور احسان مرزا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اس میں مجھے مختصر ترین حجم کی کوئی ایسی ڈیوائس فٹ کروا دو کہ اس لاکٹ کے ارد گرد چند سو گز کے دائرے میں ہونے والی گفتگو میں کسی ریسیونگ سیٹ پر سن سکوں۔ ریسیور کا دائرہ عمل جتنا زیادہ ہو، اتنا ہی بہتر ہے۔"

لاکٹ اس نے میرے ہاتھ سے لے لیا اور سرسری نظروں سے دیکھ کر مسکرایا۔ "بس تمہیں صرف اسی چیز کی ضرورت ہوگی!؟"

"بس..." میں نے حتمی لہجے میں کہا۔ "اور کسی چیز کی ضرورت ہوئی بھی تو اس کا میں خود ہی انتظام کر لوں گا۔"

"یہ تو خیر کوئی مشکل کام نہیں... یہ تمہیں صبح تک مل جائے گا۔ کیا اکیلے ہی جاؤ گے؟"

"نہیں۔ شکنتلا عرف شیتی میرے ساتھ ہوگی۔" میں نے جواب دیا اور اگر ضروری ہوا تو میرے ساتھ کچھ ساتھی بھی ہوں گے۔"

"میں دراصل یہ بتا رہا تھا کہ اصل مرحلہ وادی میں داخل ہوتے وقت ہی شروع نہیں ہوتا۔" وہ اصل موضوع پر آتے ہوئے بولا۔ پھر وہ بچوں کی طرح شریر انداز میں مسکرایا۔ "اس سے پہلے ہی راہِ وفا میں امتحان شروع ہو جاتے ہیں۔" انداز ایسا تھا جیسے کوئی نوآموز اپنا پہلا شعر موزوں کر کے خوش ہو رہا ہو۔

"کچھ پتا نہیں چلتا کہ جال کہاں تک پھیلا ہوا ہے۔" اس نے سنجیدگی سے سلسلہ کلام جوڑا۔ "مافیا" کا ہاتھ کہاں تک ہے اور "فیلی" کے اپنے وسائل کہاں تک کام کر رہے ہیں۔ میرے وہ جوت کے ہرکارے جن کے ریکارڈ پر مجھے فخر تھا، جو جہاں بھی گئے، اپنے شکار کو پیغامِ اجل پہنچا کر ہی آئے، ہمیشہ کامیاب اور کامران ہی لوٹے۔ ان میں سے کوئی تو جوتاان تک بھی پہنچنے نہیں پایا۔ کوئی وادی کے نواح میں ہی مارا گیا۔ کوئی کسی پہاڑ پہ پہنچ کر لڑھک گیا۔ صرف ایک تھا جو وادی میں داخل ہونے میں کامیاب ہوا لیکن رات وہاں نہیں گزار سکا۔ رات اس کی عالمِ بالا میں ہی گزری، اس لیے میں کہتا ہوں کہ تم اپنی طرف سے آنا۔ کھٹمنڈو میں ہر رنگ و نسل کے لوگوں کا ہجوم رہتا ہے۔ مجھے اس امر کا امکان بہت کم نظر آتا ہے کہ موت وہاں سے تمہارا تعاقب شروع کر دے گی... بہرحال فیصلہ تمہیں خود کرنا ہے۔ رات کو ہم نقشے سامنے رکھ کر تفصیل سے پروگرام طے کریں گے... فی الحال تم آرام کرو۔"

اس کے ٹھیک چار دن بعد میں اور کنھی جاپان ایئر لائنز کے ایک طیارے میں نیپال کی طرف محوِ پرواز تھے لیکن ہم دونوں ساتھ نہیں تھے اور نہ ہی ہم میں کوئی تعلق نظر آتا

تھا- وہ مجھ سے کئی نشستیں آگے گزرگاہ کے قریب تھی- اس کے قریب ایک انگریز جوڑا اور ایک جاپانی نوجوان بیٹھا تھا- میں فرسٹ کلاس کی نشستوں کی آخری قطار میں کھڑکی کے قریب تھا جہاں دو جڑواں نشستیں ہوتی ہیں- میرے قریب ایک ادھیڑ عمر مارواڑی سیٹھ فولڈنگ ٹیبل کھولے حساب کتاب میں مصروف تھا-

کیٹی اس وقت کوئی آسودہ حال اور لا ابالی یوریشین لڑکی دکھائی دے رہی تھی اور میں ایک نودولتیا نوجوان..... سامان ہمارے پاس برائے نام تھا- محض ایک ایک بیگ اور وہ بھی اتنا چھوٹا کہ اسے لگیج میں بھیجنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی-

میں نے احسان مرزا کی ہدایات سے بھی زیادہ احتیاط سے کام لیا تھا اور سفر کا آغاز ہی ایک غیر ضروری اور طویل چکر سے کیا تھا- پہلے ہم انڈین ایئر لائنز کی ایک پرواز سے بمبئی سے دہلی آئے تھے اور وہاں سے کھٹمنڈو جانے کے لیے جاپان ایئر لائن کی وہ پرواز پکڑی تھی جو ایمسٹرڈیم سے آرہی تھی- یہ پرواز کراچی اور راولپنڈی سے ہوتی ہوئی کھٹمنڈو جاتی تھی-

پورے سفر کے دوران میں نے ایک بے پروا امیر زادے کا رول ادا کرنے کی کوشش کی تھی- کئی لڑکیوں کو ندیدے پن سے گھورا بھی تھا لیکن پھر گویا ان سے متعارف ہونے کی جرأت محسوس نہ کرتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا- بظاہر گویا مجھے گرد و پیش کا کوئی ہوش نہیں تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ میں نے اس امر کا پورا پورا خیال رکھا تھا کہ ہمارا تعاقب تو نہیں کیا جا رہا لیکن ایسے کوئی آثار نظر نہیں آئے تھے-

کیٹی نے نیلم اور سنگ مرمر سے بنی ہوئی آنکھ والا لاکٹ پہن رکھا تھا- اس میں ڈیوائس فٹ تھی- میرے کوٹ کی بریسٹ پاکٹ میں ماچس کی ڈبیا کے برابر ایک آلہ تھا جو بظاہر آلۂ سماعت معلوم ہوتا تھا اور اس کا ننھا سا ایئرفون بھی میرے کان میں لگا ہوا تھا- درحقیقت یہ صرف اس ڈیوائس کا ریسیور تھا جو کیٹی کے لاکٹ میں فٹ تھی- کیٹی کے آس پاس ہونے والی گفتگو میں بہ آسانی سن رہا تھا- لاکٹ کیٹی نے اس طرح پہنا ہوا تھا کہ آسانی سے نظر آتا رہے-

وہ لاکٹ میرا ہی تھا لیکن اسے اس شکل میں احسان مرزا نے ہی ڈھلوایا تھا- اس کا کہنا تھا کہ مافیا کے کارندے یہ نشان اپنی شناخت آپس میں واضح کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے- اسے امید تھی کہ یہ نشان دیکھ کر مافیا کا کوئی آدمی کیٹی کی طرف متوجہ ہوگا اور وہاں سے سرا میرے ہاتھ آجائے گا-

کھٹمنڈو کے ایئرپورٹ پر اترتے ہی مجھے سردی کا احساس ہوا- طیارے کی حرارت آمیز فضا سے نکل کر لاؤنج تک آتے آتے بہرحال میرا جسم اس خنکی سے قدرے مانوس ہو گیا- مسافروں میں صرف میں اور کیٹی ہی ایسے تھے جن کے پاس صرف ایک ایک بیگ تھا اور ہمیں متحرک بیلٹ کے قریب کھڑے ہو کر سامان کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں تھی-

چنانچہ ہم دونوں سیدھے باہر آگئے لیکن پہلے ہی کی طرح ایک دوسرے سے لاتعلق انداز میں-

الگ الگ ٹیکسیوں میں بیٹھ کر ہم کیمپ ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے- احسان مرزا کے ایک ایجنٹ نے ہمارے لیے ایک ہی فلور پر دو کمرے ریزرو کروا رکھے تھے لیکن یہ کمرے ساتھ ساتھ نہیں تھے- ان کے درمیان اور بھی کئی کمرے تھے- یہ ہدایت میں نے ہی کر دی تھی کہ کمرے ساتھ ساتھ نہیں ہونے چاہئیں-

میں اپنی ٹیکسی کو ذرا فاضل چکر دے کر ایک دکان سے کوئی چیز خریدنے کے بہانے قدرے تاخیر سے ہوٹل تک لایا تاکہ اس دوران کیٹی اپنے کمرے میں جا چکے- میں جب ہوٹل میں پہنچا تو کاؤنٹر کلرک نے میرا نام سنتے ہی ایک چابی میرے حوالے کر دی اور دستخط کرنے کے لیے اندراجات کا کارڈ میری طرف کھسکا دیا-

دستخط کرکے میں مڑا تو پورٹر کی وردی میں ایک نوعمر نیپالی لڑکا دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا میرے بیگ کو بغور دیکھ رہا تھا جو فرش پر رکھا تھا- اس کی نظر درحقیقت بیگ پر چسپاں ایک اسٹیکر پر تھی- مجھے مڑتے دیکھ کر وہ مسکرایا اور بیگ اٹھانے کے لیے آگے بڑھا- بیگ اٹھا کر وہ لفٹ کی طرف چل دیا- میں اس کے پیچھے تھا-

کمرے میں پہنچ کر وہ بیگ رکھ چکا تو میں نے اسے ٹپ دی- وہ سلام کرکے جانے کے لیے مڑا لیکن جاتے جاتے اپنے بش کوٹ کی جیب سے ایک چھوٹا سا سفید کارڈ نکال کر مجھے تھما گیا- اس کے جانے کے بعد میں نے کارڈ پر نظر ڈالی- اس پر انگریزی میں مختصر سا ٹائپ شدہ مضمون تھا-

”ڈیکن ریستوران..... آج ہی..... شام چار بجے..... آپ کی جیب میں سفید رومال نظر آنا چاہیے-“

بھیجنے والے کی ذات کی طرف کوئی اشارہ موجود نہیں تھا' تاہم مجھے معلوم تھا کہ یہ پیغام دوستوں کی طرف سے تھا- احسان مرزا نے مجھ سے کہا تھا کہ کھٹمنڈو پہنچ کر جو ابتدائی مسائل مجھے پیش آسکتے ہیں' انہیں حل کرنے کا انتظام خود بخود ہی ہوتا چلا جائے گا' مجھے اس سلسلے میں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں-

میرا سب سے پہلا مسئلہ تو یہ تھا کہ میں ہندوستان سے آتے وقت کم از کم دو بیریٹا گنیں ساتھ لانا چاہتا تھا مگر میں ایک بھی نہیں لا سکتا تھا کیونکہ سکیورٹی چیکنگ بہت سخت تھی- سامان میں ساتھ لانا نہیں چاہتا تھا ورنہ گنیں سوٹ کیسوں میں پرزے علیحدہ کرکے بھی رکھی جا سکتی تھیں- سوٹ کیس تو سیدھے لگیج میں چلے جاتے لیکن پھر بھی خطرہ موجود تھا کہ ان کے غیر معمولی وزن پر کوئی شبہ نہ کر بیٹھے

بیریٹا گنیں میری نظر میں ویسے بھی کوئی خاص کام کی چیز نہیں تھیں لیکن محض اس

لیے ساتھ رکھنا چاہتا تھا کہ اگر سب تدبیریں ناکام ہو جائیں تو آمنے سامنے باقاعدہ میدان جنگ کی سی کیفیت پیدا کر کے دہشت پھیلائی جا سکے۔ بہرحال احسان مرزا نے اس سلسلے میں میری تشویش دور کر دی تھی اور کہہ دیا تھا کہ کھٹمنڈو یا نیپال کے کسی اور مقام پر بھی مجھے جس قسم کے اسلحے کی بھی ضرورت ہوگی مل جائے گا اور اس کے آدمی مختلف مراحل پر خود ہی مجھ سے رابطہ قائم کرتے رہیں گے۔ اسی طرح مجھے کسی بھی ملک کی کرنسی اور سواری کے لیے کار یا جیپ بھی مل سکتی تھی۔

اس طرح میرے کافی تفکرات ختم ہو گئے تھے۔

دروازہ مقفل کرنے کے بعد میں نے کپڑے بھی نہیں بدلے اور سب کچھ ذہن سے جھٹک کر سو گیا۔ جب میری آنکھ کھلی تو میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا کیونکہ کھڑکیوں کے بالکل کھلے ہونے کے باوجود کمرے میں اندھیرا سا پھیلا ہوا محسوس ہو رہا تھا لیکن گھڑی دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا۔ ابھی تین ہی بجے تھے البتہ آسمان پر بادلوں نے سورج کو یوں ڈھانپ لیا تھا جیسے زمانہ دولت مندوں کے گناہوں کو چھپا لیتا ہے۔ اسی لیے کمرے میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔

تیار ہو کر میں نے ایک بار پھر وہ کارڈ دیکھا۔ اس کے مطابق مجھے کیمبن ریستوران میں پہنچنا تھا جو آسن ٹول کے علاقے میں واقع تھا۔ کمرے سے نکلنے سے پہلے میں نے کارڈ پرزے پرزے کر کے فلش کر دیا۔

کیتھی کے کمرے کے سامنے سے گزرتے وقت میں نے دروازے کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور لفٹ سے نیچے آ گیا۔ ہوٹل کے صدر دروازے کے قریب ہی کئی ٹیکسیاں کھڑی تھیں لیکن میں پیدل ہی ایک طرف کو روانہ ہو گیا۔ ہوٹل سے تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر "اہوان دیو" کا ایک بہت بڑا بت نصب تھا۔ اس کے عقب میں ہمالائی کا مندر سر اٹھائے کھڑا تھا۔ یہاں سڑک کافی چوڑی تھی اور خوب چہل پہل نظر آ رہی تھی۔

چلتے چلتے میں نے اچانک ہی ایک ٹیکسی کو ہاتھ دے کر روکا اور اس میں بیٹھتے ہی ڈرائیور کو ایک بغلی گلی کی طرف مڑنے کا حکم دیا۔ کئی گلیوں میں چکرانے کے بعد میں نے اسے آسن ٹول کی طرف چلنے کو کہا۔ مجھے تقریباً یقین تھا کہ کوئی میرا تعاقب نہیں کر رہا تھا لیکن میں حتی الامکان احتیاط برت رہا تھا۔

ٹیکسی جب کیمبن ریستوران کے سامنے رکی تو ایک لمحے کے لیے مجھے شبہ سا ہوا کہ کیا واقعی مجھے اسی جگہ پہنچنے کے لیے کہا گیا ہے؟ کیمبن ریستوران میری توقعات سے بہت ہی مختلف تھا۔

دراصل یہ ایک پانچ منزلہ عمارت کا تہہ خانہ سا تھا لیکن اس کی حالت ایک بڑے چھپر سے مشابہ تھی جس کی دیواریں، ستون اور چھت سیل کیچل اور داغ دھبوں کے علاوہ

دھوئیں کی سیاہی سے بھی اٹی ہوئی تھی۔ بے ہنگم میز اور کرسیاں بے ترتیبی سے ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں اور صرف یہی نہیں، دیواروں کے چاروں طرف بنچیں بھی لگی ہوئی تھیں۔

ریستوران کی پیشانی پر بہت لمبا چوڑا رنگ برنگا بورڈ آویزاں تھا۔ ریستوران کا مینو بھی اسی بورڈ پر درج تھا اور اس مینو میں بھنگ کے پکوڑوں سے لے کر حشیش سے بھرے ہوئے سگریٹ اور افیون والا سالن تک شامل تھا۔

اندر نیم تاریک چھپر نما ہال میں ہر رنگ و نسل کے افراد موجود تھے جن میں مرد اور عورتیں ہی نہیں، تیسری جنس کے نمائندے بھی شامل تھے۔ دیواروں پر جا بجا ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں درج نوٹسوں میں آوارہ گردوں کو نوید سنائی گئی تھی کہ وہ بے شک دن بھر یہاں بیٹھے رہیں، کھڑے رہیں اور دل چاہے تو لیٹے رہیں اور جو جی چاہے کریں لیکن رات گزارنے کے لیے کوئی اور ٹھکانہ تلاش کر لیں۔

ہال میں حشیش کا دھواں بکھرا ہوا تھا۔ اس جگہ کی ایک خوبی میں نے جلد ہی محسوس کر لی کہ ہر گاہک خواہ وہ مرد تھا یا عورت، اگر وہ تنہا تھا تب بھی اپنے آپ میں مگن تھا اور اگر کسی کا ساتھی موجود تھا تو وہ ایک دوسرے ہی میں گم تھے، کسی اور کی طرف کسی کا دھیان نہیں تھا۔

ایک چھوٹی سی میز خالی پا کر میں ایک کرسی سنبھال کر بیٹھ گیا اور گھڑی دیکھی چار بجکر چند منٹ ہو چکے تھے۔ ذرا ہی دور ایک میز پر مجھے کیتھی بھی نظر آ گئی، اسے بھی یقیناً میرے ہی جیسا پیغام ملا تھا۔ وہ بالکل صحیح وقت پر یا چند منٹ پہلے ہی یہاں پہنچ گئی تھی۔ اس کی انگلیوں میں ایک سگریٹ سلگ رہا تھا، وہ دھیرے دھیرے اس کے کش لے رہی تھی اور اس کی نیم وا آنکھوں میں تیرتی ہوئی نمی بتا رہی تھی کہ سگریٹ میں حشیش بھری ہوئی تھی۔

ابھی میں نے اسے کچھ خاص ہدایات دینی شروع نہیں کی تھیں شاید اس لیے کام کو سنجیدگی سے نبھانے کے ساتھ ساتھ اپنی طبیعت کی آوارگی کی تسکین کا بھی ہلکا پھلکا سامان کر رہی تھی۔

ایک ویٹر نما ہستی ایک خالی پیتوی ڈرم گھٹنے پر بجاتا میرے قریب آیا۔ وہ ویٹر کم اور بن مانس زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ ایسا بن مانس جس کی صحت معمول سے کچھ کمزور ہو گئی ہو۔ اس نے جھک کر اپنے چوڑے چوڑے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے مجھ سے کچھ پوچھا۔

میں نے ایک کان پر ہاتھ رکھ کر آگے کو ہوتے ہوئے کچھ یوں ظاہر کیا کہ جیسے مجھے اونچا سنائی دیتا ہے۔ اس نے دوبارہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں پوچھا کہ میں کیا کھانا پسند کروں گا۔ میں نے یہی ظاہر کیا کہ میں اس کی بات نہیں سن سکا ہوں، پھر میں نے اپنا ننھا سا آلہ

ساعت جیکٹ کی اندرونی جیب سے نکال کر سامنے والی جیب میں رکھا اور ایئرفون لگاتے ہوئے مسکرا کر ویٹر سے انگریزی میں کہا کہ اب وہ بات کرے۔

اس نے تیسری مرتبہ پھر وہی سوال کیا تو میں نے کہا۔ "اگر ہو سکے تو ایک ایسا سینڈ وچ لے آؤ جس میں کوئی نشہ آور چیز شامل نہ ہو اور گوشت بھی اگر ہو تو مچھلی' مرغی یا گائے کے سوا کسی اور جانور کا نہ ہو اور اس کے ساتھ اورنج جوس کا ایک ڈبہ لے آؤ۔"

ویٹر نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا' پھر اثبات میں سر ہلا کر چلا گیا۔ مجھے احساس تھا کہ اگر میں ایسی جگہ تک آ گیا ہوں تو مجھے اپنے آپ کو اس ماحول کا عادی ظاہر کرنا چاہیے لیکن میں اپنے آپ کو اس پر آمادہ نہیں کر سکا تھا نتیجہ خواہ کچھ بھی ہوتا۔

معلوم نہیں یہ ریستوران کی انتظامیہ کی نوازش تھی یا ویٹر کی ذاتی کوشش کا نتیجہ کہ جلد ہی میرے شریفانہ آرڈر کی تعمیل ہو گئی۔ میں نے اورنج جوس کے ڈبے کی سیل کھولی اور جوس کے ایک گھونٹ کے ساتھ نیم دلی سے سینڈوچ چبانا شروع کیا جو خاصا بدمزا تھا مگر جوس کے ساتھ آسانی سے نگلا جا رہا تھا۔

ابھی میں نے چند ہی لقمے حلق سے اتارے تھے کہ دو آدمیوں کو کیتھی کی میز کی طرف بڑھتے دیکھا' وہ اس وقت تک سگریٹ ختم کر چکی تھی اور ایک بیئر کے بڑے سے گلاس سے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھر رہی تھی۔

ان میں سے ایک دراز قد سفید فام تھا جو ڈھیلی ڈھالی سیاہ پتلون اور ڈھیلا سا چیک کا کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کی ٹائی ڈھیلے ڈھالے انداز میں گردن میں جھول رہی تھی۔ دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں تھے اور ایک جیب کا ابھار معمول سے زیادہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے موٹے موٹے ہونٹ بھی لٹکے ہوئے تھے اور دانتوں میں سگار دبا ہوا تھا۔ اس کے پپوٹے بھاری تھے اور وہ شکل ہی سے بدطینت اور جرائم پیشہ نظر آتا تھا۔

دوسرا ہندوستانی معلوم ہوتا تھا۔ وہ درمیانہ قد اور کسرتی جسم کا نوجوان تھا۔ اس کا رنگ سانولا اور چمکیلے سیاہ بال تیل میں چپڑے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ کے جوڑ پر پیشہ ور پہلوانوں کی طرح چمڑے کی چوڑی سی پٹی لپٹی ہوئی تھی۔ مجھے امید نہیں تھی کہ احسان مرزا کے آدمیوں کا حلیہ ظاہری طور پر ہی اتنے منتخب پن کا مظہر ہوگا۔

میں ایک لمحے ہی میں ان کا سراپا جانچ لے چکا تھا اور یہ بھی دیکھ چکا تھا کہ وہ بے تکلفی سے کرسیاں گھسیٹ کر کیتھی کے سامنے بیٹھ رہے تھے اور کیتھی نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے تیکھی نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔

"......ہاں تو......اور سناؤ جان من! کیا حال چال ہے؟" کسرتی جسم والے نوجوان نے اردو میں کہا۔ میرا اندازہ غالباً درست ہی تھا......وہ ہندوستانی ہی معلوم ہوتے تھے۔ اس نے گفتگو یوں شروع کی تھی جیسے وہ کافی دیر سے کیتھی کے پاس ہی بیٹھا تھا اور اس دوران ذرا

دیر کے لیے کسی اور طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ وہ مجھ سے اتنے فاصلے پر تھے کہ عام لب و لہجے میں ان کے درمیان ہونے والی گفتگو میں نہیں سن سکتا تھا لیکن جیکٹ کے لاکٹ اور اپنے آلۂ سماعت کی وجہ سے میں ان کی آوازیں صاف طور پر سن رہا تھا' تاہم بظاہر میں انہماک سے اپنا سینڈوچ کھانے میں مصروف تھا۔

"کیا تم اجنبی عورتوں کے سامنے یونہی اچانک تقواس شروع کر دینے کے عادی ہو؟" کیتھی نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"خواہ مخواہ یورپین بننے کی کوشش نہ کرو......" ہندوستانی بولا۔ "ہمیں معلوم ہے کہ تم خالصتاً انڈین ہو۔"

"اگر میں انڈین بھی ہوں تو اس سے تمہیں کیوں پریشانی ہو گئی ہے جو بلبلاتے ہوئے یہاں آن بیٹھے ہو؟" کیتھی نے بدستور سخت لہجے میں اور انگریزی ہی میں کہا۔

"لیکن نہیں! بادل گرجتے ہیں' بجلی کڑکتی ہے اور بارش ہوتی ہے اور مینڈک اور مینڈکی کی شادی ہو جاتی ہے......" ہندوستانی نوجوان کا جملہ معنی خیز معلوم ہوتا تھا جواباً خاموشی رہی' میں نے غیر محسوس طور پر کن انکھیوں سے ان کی طرف دیکھا۔

کیتھی ایک ٹک سانولے نوجوان کو گھور رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نشے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ معلوم نہیں کیوں نوجوان کا بے تکا اور بے سرپا سا جملہ مجھے کھٹکا تھا......اچانک مجھے احساس ہوا کہ وہ کوڈ ورڈز میں بات کر رہے تھے۔ کیتھی کوڈ ورڈ سمجھ نہیں پائی تھی جس سے وہ شک میں پڑ گئے تھے۔

"میرے خیال میں تو اس وقت مینڈکی کو زکام ہو رہا ہے اور اس کا علاج میں جانتی ہوں......" بالآخر کیتھی نے بے رخی سے کہا۔ "اب تم چلتے پھرتے نظر آؤ ورنہ میں کسی پولیس والے کو بلاتی ہوں اور اگر اس کا موقع نہ ملا تو پھر مجبوراً مجھے تمہاری آنتیں نکالنی پڑیں گی۔"

"بھلا! تم بلاوجہ وقت ضائع کر رہے ہو......" یہ سفید فام کی بھدی آواز تھی اور وہ اپنے ساتھی سے مخاطب تھا......"نشانہ غلط ہے......آؤ گڑیا کو اٹھا کر ادھر لے چلتے ہیں......" یہ جملہ بھی معنی خیز انداز میں کہا گیا تھا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو گورے!" سانولا نوجوان جسے بھلو کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا' شہدوں والے انداز میں بولا۔ مجھے اب یقین ہو چکا تھا کہ وہ احسان مرزا کے آدمی نہیں تھے' گویا جس امید پر میں نے کیتھی کو نیلو آئی والا لاکٹ نمایاں طور پر پہننے کی ہدایت کی تھی' اس کے نتائج ظاہر ہونے لگے تھے مگر اتنی جلدی یہ نتائج ظاہر ہونے کی مجھے امید نہیں تھی۔ ابھی تو ہم کھٹمنڈو میں ٹھیک سے سنبھلنے بھی نہ پائے تھے اور پھر یہ نتائج بھی کچھ ہمارے حق میں نظر نہیں آ رہے تھے۔

سفید فام شخص اب براہ راست کیتھی سے مخاطب تھا......"میری جیب میں جو ریوالور

ہے' اس کا نام جیپٹا ہے۔ قریب سے اس کی گولی بے حد خطرناک ثابت ہوتی ہے' اٹھو اور باہر چلو۔"

"آخر تم مجھے بھگا کر میرے ہی پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟" کیتی نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہاں اور بھی لڑکیاں موجود ہیں' کئی تو مجھ سے بھی زیادہ خوبصورت ہیں' آخر تم چاہتے کیا ہو؟"

"ہم تمہاری کچھ خدمت کرنا چاہتے ہیں۔" سفید فام نے بدستور بھاری آواز میں کہا....."یہاں کئی ایسے امیر زادوں سے ہماری شناسائی ہے جو چند راتوں کے عوض ہندوستانی لڑکیوں کی جھولیاں دولت سے بھر دیتے ہیں۔ ہم ان میں سے ایک آدھ کو تم سے ملوا دیں گے۔"

"بہت خوب!" کیتی نے طنزیہ لہجے میں کہا....."بڑا معززانہ دھندا اختیار کر رکھا ہے تم لوگوں نے.....ویسے کیا تمہارے خیال میں تمام ہندوستانی لڑکیاں اسی طرح دولت سے جھولیاں بھرنے کے لیے بے تاب پھر رہی ہوتی ہیں؟ جسم فروشی کے سوا ان کے پاس دولت کمانے کا کوئی اور ذریعہ نہیں۔"

"میں سب کی باتیں نہیں کر رہا۔" سفید فام نے سگار کو دانتوں ہی دانتوں میں ادھر سے ادھر منتقل کرتے ہوئے کہا....."میں تو تمہاری اور صرف تمہاری بات کر رہا ہوں اور تم یقیناً اسی ٹائپ سے تعلق رکھتی ہو جس کی میں بات کر رہا ہوں۔"

"فرض کرو میں اسی ٹائپ سے تعلق رکھتی ہوں۔" کیتی نے گویا تحمل مزاجی سے کام لیتے ہوئے کہا....."لیکن میں تمہارے ساتھ نہیں جانا چاہتی' تب تم کیا کرو گے؟"

"میں نے ابھی جیپٹا ریوالور کا ذکر کیا تھا۔" سفید فام نے مختصراً کہا.....

"آخر تمہیں میری دلالی کرنے کی اتنی اشد ضرورت کیوں آن پڑی ہے۔ اب کیتی کا لہجہ تمسخرانہ ہو گیا۔

"دلالی کی بات تو یونہی بیچ میں آ گئی تھی۔" سفید فام نے کھسیائے بغیر کہا....."دراصل میں تو ہمیں تمہاری ضرورت ہے' تمہاری دلالی کی نہیں۔"

"میں نے کہہ جو دیا کہ میں اس وقت کہیں نہیں جاؤں گی۔" کیتی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔۔۔اور اگر پندرہ سیکنڈ تم دونوں یہاں سے نہ اٹھے تو میں شور مچاؤں گی۔"

"تمہاری مرضی ہے' ہم تمہارا یہ شور مچانے کا شوق بھی پورا کروا دیں گے۔" سفید فام نے لاپرواہی سے کہا....."ہم چاہیں تو ریوالور کی بھی ضرورت نہ پڑے۔ ہم یونہی تمہیں دونوں بازوؤں سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے یہاں سے لے چلیں۔ جتنا دل چاہے چیختی رہنا' کوئی نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ اس معاملے میں اس ریستوران کا ماحول امریکہ کے کسی دیرینہ کلب سے زیادہ سازگار ہے۔ یہاں سب لوگ اپنے کام سے کچھ زیادہ ہی کام رکھتے ہیں۔ سب کو معلوم ہے یہاں چیخنے چلانے والی لڑکیاں نہیں آتیں اور اگر کبھی کبھار

چیختی نظر آ بھی جائے تو سب اس خیال پر پہلے سے متفق ہوتے ہیں کہ یہ اس لڑکی کی غلطی تھی جو یہاں آن گھسی' اسے کسی شریفانہ جگہ پر جانا چاہیے تھا....."

"اتنی لاقانونیت ہے یہاں؟" کیتی نے قدرے حیرت سے پوچھا....."کہ تم اتنے لوگوں کے درمیان سے مجھے کھینچتے ہوئے لے جاؤ گے اور کوئی دخل اندازی نہیں کرے گا۔"

"قانون کمزوروں کے لیے ہوتا ہے....." سفید فام نے میرا مقولہ دہرایا۔ "یا پھر ان کے لیے جو اس کی پروا کرتے ہیں' ہم تو پیدائشی طور پر ہی اس خانے میں فٹ نہیں ہیں۔"

میں نے گھڑی دیکھی' چار بج کر چھپن منٹ ہو رہے تھے۔ مجھے حیرت یہ تھی کہ اگر یہ دونوں احسان مرزا کے آدمی نہیں تھے تو پھر احسان مرزا کا آدمی کہاں مر گیا تھا؟ اس نے کیوں اب تک مجھ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں تو سفید رومال بھی جیکٹ کے سامنے والی جیب میں تمغے کے پھندنے کی طرح سجائے بیٹھا تھا۔ کسی کی میز پر بھی مجھے ایک سفید رومال پڑا نظر آ رہا تھا۔

"اچھا تو بہت طاقتور ہو تم لوگ؟" کیتی نے آنکھیں پھیلا کر پوچھا۔ میں بار بار کن انکھیوں سے غیر محسوس طور پر ادھر دیکھ رہا تھا لیکن بقیہ ہر شخص کو گویا اپنے سینڈوچ کو کترنے کے علاوہ دنیا کی کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ایئر فون پر مجھے ان کی مکالمے بازی کسی کھیل کی کمنٹری کی طرح سنائی دے رہی تھی۔

"ابھی کیا بکواس ہے؟" سفید فام نے بیزاری سے کہا۔ "لڑکی! اب اٹھ بھی چکو کیوں خواہ مخواہ یہاں وحشت پھیلا کر ان بیچارے امن پسند نشے بازوں کا سکون درہم برہم کرنا چاہتی ہو؟ ان کے لیے یہ لمحے بڑے قیمتی ہوتے ہیں....."

"میرے لیے بھی یہ لمحے بڑے قیمتی ہیں۔" یہ کہتے ہی کیتی نے یکلخت میز الٹ دی' میز نہ تو زیادہ بڑی تھی اور نہ ہی بھاری۔ سانولا نوجوان تو نہایت پھرتی سے اچھل کر ایک طرف ہٹ گیا۔ سفید فام کرسی سمیت الٹ گیا اور میز اس کی ٹانگ پر گری لیکن وہ اسے ایک طرف دھکیل کر تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ریوالور اب اس کی جیب سے نکل آیا تھا لیکن وہ فائر کرنے کے معاملے میں تذبذب میں رہا اور اس دوران سانولے نوجوان نے کیتی کے بال مٹھی میں جکڑنے کے لیے اس کے سر پر ہاتھ مارا مگر کیتی نے نہایت پھرتی سے اس کی ٹھوڑی پر گھونسا رسید کیا اور وہ لڑکھڑا گیا۔

ہال میں کچھ ہیجان پھیل گیا تھا لیکن یہ ہیجان بھی بڑا پرسکون قسم کا تھا۔ بعض لوگ بمشکل تمام آنکھیں پوری کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے مسکرا رہے تھے اور کچھ خوفزدہ ہو کر میزوں کے نیچے گھسنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بیرے دیواروں سے لگے بڑی دلچسپی سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ان کی باچھیں کھلی پڑی تھیں گویا انہیں ایک مدت بعد کوئی دلچسپ فلم دیکھنے کو ملی ہو۔ ان میں سے ایک تو کچن کی طرف منہ کر کے غالباً خانساماں وغیرہ کو بھی باہر

…نے کی دعوت دے رہا تھا۔ سانولے نوجوان نے گھبرا کر پہلے اپنے سر پر دو ہتڑ مارا' پھر مٹھیاں بھینچ کر اور دانت کچکچا کر کیٹی پر جھپٹا لیکن کیٹی نے پیچھے ہٹ کر اسے بجلی کی اڑنگی لگا دی جس کی اسے توقع ہی نہیں تھی اور وہ اپنے ہی زور میں اوندھا گر پڑا۔

کیٹی سینڈلوں' کرسیوں اور لوگوں سے بچتی بچاتی دروازے کی طرف دوڑی۔ دروازہ کیا بس لکڑی کا ایک کھلا راستہ تھا جس میں کوئی پٹ وغیرہ نہیں تھا۔ سانولا نوجوان نہایت پھرتی سے اٹھ کر اس کے تعاقب میں چھلانگ لگا چکا تھا لیکن اس وقت تک کیٹی کا خنجر اس کے شکوک کی آستین سے اس کے ہاتھ میں منتقل ہو چکا تھا۔ وہ سانولے نوجوان پر وار کرنے کے لیے رکی نہیں' تاہم اس نے جاتے جاتے نوجوان کو اس کی جھلک دکھا دی تھی اور وہ راستے ہی میں رک گیا تھا۔ اس کے پاس یا تو کوئی ہتھیار تھا ہی نہیں یا پھر وہ اسے نکالنے سے گریز کر رہا تھا۔

"رک جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا......" سفید فام چلایا مگر کیٹی رکی نہیں۔ وہ اب تک یہ سب کچھ میری ہدایات کے بغیر آزادانہ طور پر کر رہی تھی اور میں سرعت فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ وہ صحیح کر رہی ہے یا غلط۔

سفید فام نے واقعی فائر کر دیا لیکن یہ فائر اس نے چھت کی طرف کیا تھا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ کیٹی پر فائر کرنے کی صورت میں گولی اسے جا لگتی یا نہ لگتی لیکن راستے میں موجود کئی افراد کے زخمی ہونے یا کسی نہ کسی کے ہلاک ہونے کا قوی امکان تھا۔ ویسے بھی میرا اندازہ یہی تھا کہ وہ کیٹی کو کوئی گزند پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی چلائی ہوئی گولی سے چھت سے کچھ پلستر اکھڑ کر ایک میز پر آ گرا تھا۔

کیٹی دروازے پر پہنچی تو وہ کچھ بلندی پر آ گئی اور ایک لمحے کے لیے کھلے دروازے میں اس کا وجود ہیولے کی طرح نظر آیا جو صاف طور پر نشانے پر تھا۔ سفید فام نے اس کے پاؤں کے قریب فائر کیا۔ چوکھٹ کی جگہ سے اینٹ یا سیمنٹ کے کچھ ٹکڑے اچھلتے دکھائی دیئے لیکن اس وقت تک کیٹی غائب ہو چکی تھی۔

سفید فام اپنے راستے میں آنے والی ہر چیز کو پھلانگتا اس کے تعاقب میں چل پڑا تھا۔ میں بھی اپنی جگہ سے اٹھا اور پرسکون انداز میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا دروازے کی طرف چل دیا۔ دروازے کے قریب ہی مالکن تھا ویٹرس نے جو دیوار سے یوں چپکا کھڑا تھا کہ مجھے نظر ہی نہیں آیا تھا' اچانک بازو پھیلا کر مجھے روک لیا اور پرسکون لہجے میں کہا...... "مانا کہ یہاں گولیاں چل رہی ہیں مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ آپ پیسے دیئے بغیر چلے جائیں۔"

میں نے جیب سے ایک نوٹ کھینچ کر دیکھے بغیر اس کے ہاتھ پر رکھا کہ یہ اس کا حق تھا اور ساتھ ہی میں نے اس کے منہ پر الٹے ہاتھ کا ایک تھپڑ بھی رسید کیا کیونکہ اس کے روکنے پر مجھے غصہ بھی آیا تھا۔

دروازے پر پہنچتے ہی میں نے دائیں طرف دیکھا جدھر کیٹی مڑتی نظر آئی تھی۔ وہ گلی

ہی گلی کے سرے پر پہنچ چکی تھی۔ سانولا نوجوان کسی ایتھلیٹ کی طرح اس کے پیچھے دوڑتے ہوئے بس اسے پکڑنے ہی والا تھا۔ سفید فام ریوالور لہراتا اس کے پیچھے تھا۔ گلی سنسان پڑی تھی اور شام کا دھندلکا سا پھیل رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ کیٹی کسی دوسری گلی میں داخل ہوتی' بائیں طرف سے قدیم طرز کے ایک مکان کی اوٹ سے بجلی کی سی سرعت سے ایک ہاتھ اٹھا اور کلہاڑی کی طرح کیٹی کے بازو پر پڑا۔ خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر پتھریلی سڑک پر گرنے کی کھنک مجھے سنائی دی۔ اسی لمحے وہ شخص بھی مکان کی اوٹ سے نکل آیا اور اس سے پہلے کہ کیٹی کا دایاں بازو دوبارہ حرکت میں آتا' وہ شخص اس کے بازو کو مروڑ کر اس کی پشت پر لے گیا۔

بائیں طرف سے ایک اور مکان کی اوٹ سے بھی اسی پھرتی سے ایک شخص نکلا تھا اور اس نے کیٹی کا دوسرا بازو قابو میں کر لیا تھا۔ اب وہ بالکل بے بس ہو چکی تھی۔ اس کے بازو بڑی غلط پوزیشن میں تھے۔ معمولی جھٹکے سے اس کے کندھوں کے جوڑ الگ ہو سکتے تھے۔ میں نے آلہ سماعت کے ایئرفون پر اس کی کراہ سنی' اسے قابو میں کرنے والوں میں سے ایک کی آواز میں نے سنی۔

"میرا اندازہ ٹھیک ہی تھا سے لی!" وہ کہہ رہا تھا...... "مجھے پتا تھا کہ تم اگر وہاں سے نکل بھاگیں تو سیدھی ادھر کا رخ کرو گی' دوسری طرف گلی بند جو ہے۔"

سانولا نوجوان اور سفید فام بھی اس کے قریب پہنچ چکے تھے۔ سانولے نے کیٹی کی پشت پر گھونسا رسید کیا۔ وہ چیخ اٹھی لیکن میں اس کی مدد کے لیے جانے کے بجائے ایک مکان کی بڑھی ہوئی دیوار سے چپک گیا۔ اب میں بھی اوٹ میں تھا اور اس وقت تک ان کی نظر میں نہیں آ سکتا تھا جب تک وہ واپس آ کر باقاعدہ اس طرف معائنہ نہ کرتے۔

میرا خیال تھا کہ وہ کیٹی کو آگے لے جائیں گے لیکن یہ دیکھ کر مجھے قدرے تشویش ہوئی کہ وہ اسے واپس لا رہے تھے لیکن وہ زیادہ آگے نہیں آئے۔ جہاں وہ رکے تھے' وہاں دو مکانوں کے درمیان کچھ جگہ خالی تھی۔ چند سیکنڈ بعد ہی میں نے کسی کار کا انجن بیدار ہونے کی آواز سنی۔ اس دوران سانولے نے کیٹی پر وار کرنے کی کوشش کی تھی لیکن سفید فام نے چلا کر اسے منع کیا تھا۔

مکانوں کے درمیان خالی جگہ سے گاڑی گلی میں رینگ آئی۔ اسٹیئرنگ پر سفید فام ہی تھا۔ کار کا رخ اس نے اسی طرف کر دیا تھا جدھر چند لمحے پہلے کیٹی قلانچیں بھرتی جا رہی تھی۔

[illegible]

[illegible]

میرے پاس بھی اس وقت ہتھیار صرف اپنا وفادار خنجر ہی تھا اور ابھی میں نے اسے بھی نہیں نکالا تھا۔ اس وقت مجھے ہتھیار سے زیادہ گاڑی کی ضرورت تھی جو مجھے میسر نہیں تھی اور چند لمحے کے لیے تو میں پریشان ہو گیا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ ابھی کار روانہ نہیں ہوئی تھی۔ میں چاہتا تو ان سے الجھ سکتا تھا مگر اس طرح شاید میں ان کا ٹھکانا دیکھنے اور جزین تلاش کرنے سے محروم ہو جاتا۔ وہ بدستور کینی کو قابو کیے ہوئے تھے۔

سانولا نوجوان جسے سفید فام نے ہنل کے نام سے مخاطب کیا تھا، آگے اسی کے برابر بیٹھ گیا تھا اور وہ دونوں نئے حملہ آور بدستور کینی کو قابو میں رکھتے ہوئے بڑی مشاقی سے ایک ہی دروازے سے کار کے پچھلے حصے میں پہنچے تھے۔

"اس کے حسین چہرے پر نقاب چڑھا دو۔" میں نے سفید فام کی آواز سنی۔ "کہیں یہ راستے میں اپنے حسن کی بجلیاں گراتی چلے اور یہ بھی خیال رکھنا کہ کوئی احمق ہمارے تعاقب میں نہ چل پڑے۔"

"تم فکر نہ کرو شوار" یہ غالباً ان میں سے ایک کی آواز تھی، جنہوں نے کینی کو قابو میں کیا ہوا تھا۔ "بس تم ایکسیلیٹر پر پاؤں رکھ کر بھول جاؤ۔"

"تمہیں معلوم ہے میں بھڑکنے بھلانے کا قائل نہیں۔" سفید فام نے ہلکے سے قہقہے کے ساتھ کہا۔ "اور جلدبازی کی بھی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ جب کام صبر وسکون سے صحیح طریقے سے ہو رہا ہو تو جھگڑے اور افراتفری سے کیا فائدہ؟ سوائے اپنے آپ کو تھکانے کے۔"

کار اب چل پڑی تھی۔ تاہم میں نے عقبی شیشے سے اتنا ضرور دیکھ لیا تھا کہ کینی کو ایک لمبا سا ٹوپ پہنایا جا رہا تھا، جس میں چہرہ بھی چھپ جاتا ہے، پھر اس کا سر یوں نیچے کر دیا گیا کہ عقبی شیشے سے اسے نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔

کار نے جیسے ہی موڑ کاٹا اور میری نظروں سے اوجھل ہوئی۔ میں دیوار کی اوٹ سے نکل کر دوڑا۔ گلی کے سرے کی طرف جاتے وقت مجھے کینی کا خنجر وہیں پڑا نظر آیا، جہاں گرا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر جیکٹ کی جیب میں ڈال لیا۔

میں گلی کے سرے پر پہنچا تو گاڑی دوسری گلی کو بھی عبور کر کے مین روڈ کی طرف مڑ

چکی تھی لیکن میری خوش قسمتی یہ رہی کہ فوراً ہی مجھے ٹیکسی مل گئی۔

"فاصلہ تو اتنا ہی رہنے دو لیکن وہ جو کالی روز کریم کلر کی ایک فورڈ جا رہی ہے، اس کا تعاقب کرو۔" میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو ہدایت کی۔ "لیکن ہوشیاری سے، میں تمہیں ٹپ دوں گا۔"

"وہ ٹپ میرے کفن دفن پر تو استعمال نہیں ہو گی نا؟"

اگنیشن میں چابی گھماتے ہوئے اس ڈرائیور نے خوشدلی سے پوچھا۔

"نہیں، معاملہ اتنا بھی خطرناک نہیں۔" میں نے بھی نیم سنجیدگی سے ہی اسے تسلی دی۔ وہ باریک باریک سی بھوری مونچھوں والا ایک خوش شکل نوجوان تھا اور خاصا خوش مزاج بھی معلوم ہوتا تھا۔ جس مین روڈ پر اس نے فورڈ کا تعاقب شروع کیا تھا، وہ خاصی طویل تھی اور اس پر ٹریفک بھی جنت تھا، اس لیے ان لوگوں کو یہ شبہ نہیں ہو سکتا تھا کہ ان کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔

البتہ کچھ دیر بعد فورڈ ایک سڑک پر مڑی جو آگے چل کر ایک ایسی سڑک پر نکلی جس پر اکا دکا ہی گاڑیاں یا سائیکل رکشا رواں تھے۔ میرے آلۂ سماعت نے ایک بار پھر میری مدد کی۔ میں نے سفید فام کی آواز سنی۔ "ایک بار پھر دیکھ لو۔ ہمارا تعاقب تو نہیں کیا جا رہا نا؟"

چند لمحے بعد ایک آواز ابھری۔ "ایک ٹیکسی کافی فاصلے پر آ رہی ہے، لیکن یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ہمارے پیچھے آ رہی ہے۔ اس میں کوئی نظر بھی نہیں آ رہا۔"

میں نے فوراً ڈرائیور سے کہا "بغیر محسوس طور پر رفتار بڑھاتے ہوئے اس گاڑی سے آگے نکل کے جاؤ۔" ساتھ ہی میں سیٹ پر کچھ اور سیدھا ہو کر لیٹ سا گیا تاکہ فورڈ والوں کو نظر نہ آ سکوں۔ ڈرائیور میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے نہایت عمدگی سے انہیں اوورٹیک کرتا ہوا گزر گیا۔

دوسرے ہی لمحے میں نے سفید فام کی اطمینان بھری آواز سنی۔ "اوہ، یہ تو خالی تھی۔ ڈرائیور اپنی راہ جا رہا ہے۔"

وہ لوگ غالباً ایک بار پھر کینی کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ کیونکہ کافی دیر کی خاموشی کے بعد میں نے کینی کی آواز سنی۔ وہ غصیلے لہجے میں کسی سے کہہ رہی تھی "اگر تم نے ہاتھ نہ ہٹایا تو میں جان کی پروا کیے بغیر چیخنا شروع کر دوں گی۔" ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ بات وہ متعلقہ شخص کے بجائے درحقیقت مجھے سنا رہی تھی۔

"اب تم بڑے شوق سے چیخو میری جان!" اس کے قریب ہی سے کسی نے کہا۔ "تمہاری چیخوں میں تمہارے بازوؤں کی ہڈیاں ٹوٹنے کی صدا بھی شامل ہو گی۔"

کینی کراہ کر خاموش ہو گئی۔

چند لمحے بعد ایک دوراہا آ گیا۔ میں نے ڈرائیور کو بائیں طرف مڑنے کی ہدایت کی' لیکن چند لمحے بعد میں نے مڑ کر دیکھا' فورڈ دائیں طرف مڑ چکی تھی۔ ہم مخالف سمتوں میں بڑھتے چلے گئے۔ اب اندھیرا چھٹنے لگا تھا اور ہیڈ لائٹس روشن کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔ ایئر فون سے مجھے سفید فام کی آواز سنائی دے رہی تھی جو دھیرے دھیرے ناقابل فہم سی بھنبھناہٹ میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔

پھر یہ بھنبھناہٹ بھی معدوم ہو گئی۔ گویا وہ میرے ٹرانسیٹر کی رسائی سے نکل چکے تھے۔ میں نے ڈرائیور کو یو ٹرن لینے کی ہدایت کی۔ چند لمحے بعد ٹیکسی اس سمت میں فراٹے بھرنے لگی' جدھر فورڈ گئی تھی۔ اب ٹیکسی کی ہیڈ لائٹس روشن ہو چکی تھیں اور عنوان سائن نما وہ لائٹ بند تھی جس پر ٹیکسی لفظ دور ہی سے چمکتا نظر آتا ہے۔ اس لیے اگر فورڈ والے عقب نما آئینے میں دیکھتے بھی تو انہیں فقط وہ ہیڈ لائٹس ہی نظر آتیں جو کسی بھی کار کی ہو سکتی تھیں۔

فورڈ کی ٹیل لائٹس بہت دور نظر آ رہی تھیں لیکن ٹرانسیٹر پر مجھے پہلے بھنبھناہٹ اور پھر سفید فام کی آواز صاف سنائی دینے لگی۔ وہ بڑے شگفتہ لہجے میں غالباً کیٹی ہی سے کہہ رہا تھا "کیا واقعی کھٹمنڈو میں تمہارا کوئی ساتھی موجود نہیں؟"

"یہی تو افسوس ہے۔" کیٹی نے جلے کٹے انداز میں کہا۔ "میرا ساتھی یہاں موجود ہوتا تو وہ تم سب کو درمیان سے چیر دیتا۔"

سفید فام نے بلند آہنگ قہقہہ لگایا جس کے دوران اسے کھانسی آ گئی۔ "ایک تو تم ہندوستانیوں کو یہ درمیان سے چیرنے کی بات کرنے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔ گویا انسان نہ ہوا پیڑ کا درخت ہو گیا۔"

اس کے بعد کوئی کچھ نہ بولا۔ ٹیل لائٹس مجھے بائیں طرف میدانی سے حصے کی طرف مڑتی دکھائی دی تھیں۔ یہ علاقہ غالباً نیا نیا آباد ہو رہا تھا۔ کہیں کہیں مکمل اور کہیں نامکمل مکانات پھیلے ہوئے تھے۔ بیشتر پلاٹ خالی تھے اور ان کے درمیان کہیں کہیں پلے گراؤنڈ بھی تھے۔ فورڈ ایسے ہی ایک گراؤنڈ کے کنارے کنارے کچی سی سڑک پر جا رہی تھی۔ وہاں روشنی بہت کم تھی اور اونچے نیچے مکانات محض ہیولوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔

میری ٹیکسی جب اس پگڈنڈی نما سڑک پر مڑی اس وقت تک فورڈ بہت آگے ایک گلی میں مڑ چکی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور گاڑی کو سیدھا لے گیا۔ میں نے دیکھ لیا کہ بائیں ہاتھ کی گلی میں فورڈ ایک بنگلے کے سامنے رک چکی تھی۔ ٹیکسی نے مزید کچھ فاصلہ طے کیا تو سامنے پھر ایک پلے گراؤنڈ آ گیا۔ میں نے ایک مناسب جگہ دیکھ کر ٹیکسی رکوائی اور ڈرائیور سے پوچھا کہ کیا وہ میرا انتظار کر سکتا ہے۔ اس نے بڑا عقلمندانہ جواب دیا کہ اسے اگر خطرے کے کوئی آثار دکھائی نہ دیئے تو وہ انتظار کرے گا لیکن اگر ذرا بھی گڑبڑ دکھائی دی تو بھاگ

لے گا۔ میں نے اسے چند نوٹ دیے اور واپس اس گلی کی طرف چل دیا' جہاں میں نے فورڈ کو رکتے دیکھا تھا۔

ٹرانسیٹر پر میں نے کیٹی کی آواز سنی۔ "آخر تم لوگ چاہتے کیا ہو؟ کیوں لے آئے ہو مجھے یہاں؟"

"ابھی معلوم ہو جائے گا جان من!" یہ سانولے نوجوان کی آواز تھی۔ میں جب مکانوں کی دیواروں سے چپکا گلی میں داخل ہوا تو وہ لوگ گلی میں نظر نہیں آ رہے تھے۔ بنگلے میں داخل ہو چکے تھے۔ گاڑی بھی بنگلے کے پورچ میں داخل ہو چکی تھی لیکن پورچ میں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔

میں اس وقت محتاط انداز میں اندر کا جائزہ لینے کے بعد کمپاؤنڈ وال سے کود رہا تھا۔ جب میں نے سانولے نوجوان کی آواز سنی معلوم نہیں وہ کس سے کہہ رہا تھا "ہاں! ہمیں غلط ٹپ نہیں ملی تھی لیکن میں اس لڑکی کے گلے میں لاکٹ دیکھ کر چونکا گیا تھا' پھر میں نے لوز ورڈ بولا لیکن اس نے کوئی جواب ہی نہیں دیا۔ تب ہم نے اس پر ہاتھ ڈال دیا۔"

"ہوں" میں نے ایک بوجھل ہنکارا سنا۔ اس کے ساتھ ہی کیٹی کی آواز سنائی دی۔ "اگر تم لوگ اس لاکٹ کی وجہ سے کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو تو میں بتا دوں کہ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی مجھے اس کے بارے میں کچھ علم ہے۔ مجھے یہ تو یونہی ایک نہر کے کنارے پڑا ملا تھا۔ مجھے اچھا لگا' میں نے اٹھا کر پہن لیا۔"

کئی افراد کا ہم آہنگ سا قہقہہ گونجا جسے میں ٹرانسیٹر کی مدد کے بغیر بھی سن سکتا تھا۔ اسی آواز نے میری رہنمائی کی اور میں اس کمرے کی کھڑکی تک جا پہنچا جہاں وہ لوگ موجود تھے۔ اسی دوران میں نے سانولے نوجوان بھل کی آواز سنی۔ "اب اتنی بھولی نہ بنو۔ ابھی میں وہ گھونسا نہیں بھولا جو تم نے میری ٹھوڑی پر رسید کیا تھا اور تمہارا خنجر گھمانا تو کسی ماہر فن ہی کی تربیت کا نتیجہ معلوم ہوتا تھا۔"

"میں یہ تو نہیں کہہ رہی کہ میں کوئی شریف زادی ہوں۔" کیٹی نے بدمزگی سے کہا۔ "میں تو صرف یہ سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ تم لوگ مجھے نہ جانے کس معاملے سے متعلق سمجھ رہے ہو' جب کہ میں بس ایک عام سی آوارہ گرد ہوں۔"

میں جس کھڑکی پر پہنچا وہ بند تھی۔ اس کے پٹ شیشے کے تھے لیکن ان کے عقب میں جوبے کی گرل بھی' تاہم اس میں اتنی درز موجود تھی کہ میں اندر کا منظر کھڑکی کو چھیڑے بغیر دیکھ سکتا تھا۔ نو تعمیر شدہ اس بنگلے کے اس طویل و عریض کمرے میں برائے نام فرنیچر تھا۔ دیواروں پر رنگ و روغن' فرش پر قالین یا کھڑکیوں پر پردے نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ بنگلے میں ابھی فنشنگ کا کام باقی تھا۔

وہ لوگ جس شخص کے سامنے پیش ہوئے تھے وہ ایک پھولے پھولے سے صوفے پر

بیٹھا تھا۔ وہ مضبوط جسم کا ایک ناٹا لیکن چوڑا چکلا جوان تھا۔ اس کی ناک نیپالیوں کی طرح قدرے بیٹھی ہوئی تھی۔ لیکن اس ناک کے نیچے موٹی موٹی سیاہ مونچھیں عجیب لگ رہی تھیں۔ اس کی ٹانگ کے قریب ہی ایک ٹامی گن صوفے کے ساتھ ٹکی ہوئی تھی۔ وہ سفاک اور پھرتیلا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے نہایت اونچی ایڑھی کے فل بوٹ پہنے ہوئے تھے۔

سفید فام قدرے ہٹ کر کھڑا تھا اور لاپروائی سے سگار کے کش لے رہا تھا۔ باقی تینوں مونچھوں والے کے سامنے مودب نظر آرہے تھے۔ مونچھوں والا سرخ سرخ آنکھوں سے کیتھی کو گھور رہا تھا۔ کیتھی کے ہاتھ اس کی پشت پر بندھے ہوئے تھے اور اس مقصد کے لیے غالباً سفید فام کی ٹائی استعمال کی گئی تھی۔

"لڑکی!" دفعتاً" مونچھوں والا انگریزی میں دھاڑا۔ اس نے کیتھی کے لیے ایک غلط لفظ استعمال کیا تھا۔ "سچ سچ بتاؤ تمہیں یہ لانٹ دے کر بھیجے جانے کا مقصد کیا ہے؟ یہ تو ہمیں معلوم ہے کہ تمہیں بھیجنے والا احسان مرزا ہے، لیکن اس نے تمہیں یہ بلیو آئی لاکٹ کیوں دیا تھا' یہ تم ہمیں بتاؤ گی۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ایک نوجوان بھی تمہارے ساتھ آیا تھا۔ ہمارے ایک آدمی کی ذرا سی سستی سے وہ ہماری نظر سے اوجھل ہو گیا ہے۔ خیر پریشانی والی کوئی بات نہیں۔ جلد ہی وہ بھی ہمارے سامنے پہنچ جائے گا۔ تم اس کے بھروسے پر زیادہ اکڑفوں نہ دکھاؤ۔ وہ تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکے گا۔ اس لیے ابھی سے زبان کھول دو تو بہتر ہو گا۔ جتنی تاخیر کرو گی اتنی ہی زیادہ تکلیفیں اٹھاؤ گی۔"

میں کھڑکی کے قریب کھڑے کھڑے گویا سن ہو گیا۔ ان کی معلومات نے مجھے ششدر کر کے رکھ دیا تھا۔ میں تو اپنی دانست میں بڑا گرسین لوپن بنا ہوا تھا اور بڑی بین الاقوامی جاسوسوں والی ٹیکنیک استعمال کر رہا تھا۔ لیکن مجھے کیا خبر تھی کہ میری احتیاطوں کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ جنہیں میرے خیال میں کچھ نہیں معلوم نہیں ہونا چاہیے تھا وہ سب کچھ معلوم تھا اور مجھے صحیح طور پر یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ تھے کون؟ وہ مافیا کے اصل آدمی تھے؟ فیلی سے ان کا تعلق تھا یا یہ کوئی تیسری ہی پارٹی تھی؟ میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ میں یہ سمجھنے سے بھی قاصر تھا کہ ان کی معلومات کے ذرائع کیا ہو سکتے تھے؟

ایک لمحے کے لیے تو مجھے محسوس ہوا جیسے مونچھوں والے کو یہ بھی علم ہے کہ میں اس وقت کھڑکی میں کھڑا تماشا دیکھ رہا ہوں اور کسی بھی لمحے وہ تمسخرانہ انداز میں کھڑکی کی طرف رخ کر کے کہے گا "اندر آجاؤ برخوردار! وہاں کھڑے کھڑے کون سا تیر مار لو گے۔"

لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس کی شعلہ بار نگاہیں بدستور کیتھی پر مرکوز رہیں۔ "آخر کیوں نہیں؟" وہ اسے خاموش پا کر پہلے سے زیادہ بلند آواز سے دھاڑا۔ وہ بہت جلد اور خطرناک حد تک اشتعال میں آجانے والا آدمی معلوم ہوتا تھا۔

"میں کہہ تو چکی ہوں کہ مجھے کچھ نہیں معلوم۔"

کیتھی نے بیزاری سے کہا "اب تم اپنی ہی ہانکے جاؤ تو میں کیا کر سکتی ہوں۔" اس نے لاپروائی سے کندھے اچکا دیے۔ اور اس کے اس انداز نے گویا مونچھوں والے کے رہے سہے صبر و ضبط کے لچھے میں آگ لگا دی۔ وہ بھڑک کر اٹھا اور شکاری کتے کی طرح کیتھی پر جھپٹا۔ اس کا ہاتھ درندے کی طرح کیتھی کے گریبان پر پڑا تھا اور کیتھی کا اسکرٹ نیچے تک چاک ہو گیا تھا۔

کیتھی اس دوران اپنی جگہ سے ہل تک نہیں تھی لیکن پھر اس مونچھوں والے شیطان نے نہ جانے کیا کیا کہ وہ یوں بلبلا کر چیخی کہ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میرے خیال میں اب مصلحت کی حدود ختم ہو چکی تھیں اور نتائج کی پروا کیے بغیر میرا میدان عمل میں کود پڑنا ضروری ہو گیا تھا۔

ابھی میں کھڑکی سے ہٹنے بھی نہیں پایا تھا کہ مونچھوں والے نے ایک جھٹکے سے کیتھی کو نیچے گرا دیا اور بے رحمانہ انداز میں اس کے گلے پر پاؤں رکھ دیا۔ اور شاید وہ سانس بھی نہیں لے پا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں ابل آئی تھیں۔

میرے سینے میں وہی آتش فشاں پھٹ پڑا جو کبھی کبھار ہی مجھے مغلوب الغضب ہو کر اور فرشتہ اجل بن کر مخالفین کی تعداد کی پروا کیے بغیر ان پر ٹوٹ پڑنے پر مجبور کر دیا کرتا تھا۔ شاید میرے پلٹنے کی رفتار بہت تیز تھی جو میں اس خنجر سے بچ گیا جو عقب سے میرے پہلو میں گھونپنے کے لیے گھمایا گیا تھا۔

وہ شخص نہ جانے کب اور کس طرح میرے پیچھے آن پہنچا تھا کہ میری چھٹی حس نے مجھے ذرا بھی چوکنا نہیں کیا تھا۔ حالانکہ اب شاید ہی کبھی ہوا ہو۔ اکثر اوقات تو میری چھٹی حس یوں کام کرتی تھی جیسے میری گدی پر بھی آنکھیں ہوں۔

گویا میرا یہ اندیشہ کسی حد تک درست ہی تھا کہ وہ لوگ شاید کھڑکی پر میری موجودگی سے بھی باخبر ہوں۔ اگر وہ نہیں تو ان کا یہ ساتھی بہرحال ضرور باخبر ہو چکا تھا۔ وہ میرا تعاقب کرتے ہوئے ہی وہاں تک پہنچا ہو۔

میں تعاقب میں اتنا محو تھا کہ اپنے تعاقب کا مجھے خیال ہی نہیں آیا تھا۔

خنجر میرے پہلو میں گھسنے کے بجائے دیوار سے ٹکرایا تھا۔ سب سے پہلا خیال تو اس وقت مجھے یہ آیا تھا کہ اب کوئی آواز اندر نہیں پہنچنی چاہیے کیونکہ اگر اندر والے پانچوں کے پانچ بیک وقت باہر کو لپک پڑتے تو میں مصیبت میں پھنس جاتا بلکہ شاید میری منصوبوں اور مسرتوں سب ہی کا خاتمہ ہو جاتا کیونکہ مونچھوں والے کے پاس ٹامی گن بھی موجود تھی۔

میری خوابیدہ قوتیں تو بیدار ہو ہی چکی تھیں، میں بھی بجلی بن گیا تھا۔ میں نے حملہ آور کے بازو پر کراٹے کا وار کیا۔ خنجر اس کے ہاتھ سے گر گیا اور بازو کی ہڈی ٹوٹنے کی وجہ

سے اس کا بازو دھیلے ڈھالے انداز میں جھول گیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ اس کے حلق سے کوئی آواز نکل پاتی' میرا ایک ہاتھ سختی سے اس کے منہ پر جم چکا تھا اور چشم زدن میں دوسرے ہاتھ میں اس کی پیشانی دبا کر میں نے مخصوص جھٹکا دیا اور اسے آرام سے فرش پر لٹا دیا۔ وہ مر چکا تھا۔ گردن ٹوٹنے کی وجہ سے۔

میں کمرے کے دروازے کی طرف دوڑا۔ دروازہ بند نہیں تھا۔ میں نے ٹھوکر سے اسے کھولا۔ میرا خنجر اس وقت نوک کی طرف سے میرے انگوٹھے اور انگلی کے درمیان دبا ہوا تھا۔ مونچھوں والے کے دونوں ساتھی بڑبڑا کر پلٹے۔ خود مونچھوں والے کا رخ تو دروازے ہی کی طرف تھا اور اس وقت بھی اس کا پاؤں کیتی کے گلے ہی پر تھا اور دباؤ غالباً کچھ اور بڑھ چکا تھا۔ کیونکہ کیتی بری طرح پاؤں پٹخ رہی تھی۔

مونچھوں والا میرے اندازے کے مطابق واقعی بے حد پھرتیلا تھا اور صرف پھرتیلا ہی نہیں ذہین بھی۔ اس نے پلٹ کر صوفے کے سہارے کھڑی ہوئی ٹامی گن اٹھانے کے بجائے بیلٹ میں اڑسا ہوا ریوالور اتنی پھرتی سے نکالا کہ مجھے اس پر انسان کے بجائے کسی مشین کا گمان گزرا۔ لیکن خنجر ایک بار آپ کی دو انگلیوں کے درمیان سے ایک خاص انداز میں نکل جائے تو پھر انسان خواہ کتنا ہی پھرتیلا ہو اس کی رفتار کو مات نہیں دے سکتا۔

مونچھوں والے کو غالباً یقین ہی نہیں آیا تھا کہ خنجر اس کے حلقوم میں دستے تک پیوست ہو چکا ہے اور فرش پر گرنے تک تو وہ یقین اور بے یقینی محسوس کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو ہی چکا تھا۔ وہ چت گرا تھا اور اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔

میرے پاس کیتی کا خنجر بھی موجود تھا اور وہ میرے ہاتھ میں بھی منتقل ہو چکا تھا۔ لیکن اسے استعمال کرنے کی مجھے مہلت نہیں مل سکی۔ کیونکہ سفید فام اور ایک دوسرے بدمعاش کا ریوالور نکل آیا تھا۔ جب تک انہوں نے فائر کیا تب تک میں گیند کی طرح ان کے درمیان سے گزر کر صوفے کے سہارے کھڑی ٹامی گن اٹھا چکا تھا۔ کیتی کا خنجر میں نے صوفے پر پھینک دیا تھا۔

اس سے پہلے کہ فائر کرنے والے میری طرف گھوم سکتے' میں نے انہیں ہی نہیں' ان کے باقی دو ساتھیوں کو بھی چھلنی کر دیا تھا۔ جو ابھی تک سمجھ ہی نہیں پا سکے تھے کہ ہوا کیا ہے۔ یہ سب کچھ شاید تین یا چار سیکنڈ میں ہو گیا تھا۔ پانچ لاشیں میرے سامنے پڑی تھیں اور فرش پر خون یوں پھیلتا جا رہا تھا جیسے فرش ہی سے ابل رہا ہو۔

ٹامی گن بغل میں دبا کر میں نے صوفے سے کیتی کا خنجر اٹھایا اور اس سے کیتی کے ہاتھوں کی بندشیں کاٹیں۔

وہ بری طرح اپنا سینہ اور گلا مسلنے لگی' پھر اس نے نفرت سے مونچھوں والے کی لاش کو ٹھوکر ماری اور پھنسی پھنسی سی آواز میں بولی۔ "یہ اور دو ٹکے کے بدمعاش کسی کو مجبور یا

کر خود ہی قہر و غضب کے دیوتا بن جاتے ہیں۔"

میں اس کے حلقوم سے اپنا خنجر نکال کر اسے صوفے کی پوشش سے صاف کرنے لگا۔ کیتی کا خنجر میں نے اس کو تھما دیا تھا۔ زنجتا" دروازے کی طرف سے ایک آواز سن کر میں تیزی سے گھوما۔

"مسٹر اب وقت ضائع نہ کیجئے اور جلد از جلد یہاں سے نکل چلئے۔" بڑے مودبانہ لیکن پروقار لہجے میں کہا گیا تھا۔

میں نے دیکھا وہ بے داغ سفید سوٹ میں ملبوس ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ وہ کلین شیو تھا اور بال سلیقے سے سنورے ہوئے تھے۔ جوتے تک یوں چمک رہے تھے جیسے وہ برابر والے کمرے سے یہاں کسی تقریب میں آیا ہو۔ اس کے ہونٹوں پر دوستانہ مسکراہٹ تھی اور ہاتھ میں کوئی ہتھیار بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ تاہم میں نے فوراً ٹامی گن بغل سے ہاتھ میں منتقل کر لی۔ وہ ہاتھ اٹھا کر مسکراتے ہوئے بولا "دیکھئے مجھے بھی چھلنی مت کر دیجئے گا۔ جتنی فائرنگ ہو چکی ہے اتنی ہی کافی ہے۔ یہ علاقہ نیم ویران ضرور ہے مگر پولیس پارٹیاں عموماً یہاں گشت کرتی رہتی ہیں' کیونکہ یہاں مار دھاڑ اور دیگر ہنگامے کچھ زیادہ ہی ہوتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ کوئی پارٹی اس طرف آ نکلے یا کوئی اسے یہاں تک لے آئے' آپ میرے ساتھ چلئے۔"

"تمہاری تعریف۔" میں نے سخت نگاہوں سے اسے گھورا۔

"میں وہی ہوں جسے چین ریسٹوران میں آپ سے ملنا تھا۔" وہ مربیانہ انداز میں مسکرا دیا۔ "لیکن افسوس کہ میں حادثاتی طور پر کچھ لیٹ ہو گیا اور آپ کو یہ ساری تکلیف اٹھانی پڑی۔ میں نے آپ کو اس وقت دیکھا اور سفید رومال کی وجہ سے پہچانا جب آپ ٹیکسی میں سوار ہو رہے تھے۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں گاڑی موڑ کر ون وے کی پابندی کرتے ہوئے آپ کے پیچھے لاتا آپ بہت دور جا چکے تھے۔ بہرحال میں آپ کا تعاقب کرتا رہا لیکن اس علاقے میں پہنچ کر ایک گلی کے قریب میں نے آپ کا سراغ کھو دیا۔ اب فائرنگ کی آواز سے متوجہ ہو کر یہاں پہنچا ہوں۔ آئیے' اب وقت ضائع نہ کیجئے۔"

وہ چلنے کے لئے مڑ گیا۔ میں نے کیتی کی طرف دیکھا۔ وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے کندھے اچکائے اور سفید پوش اجنبی کے پیچھے چل پڑا۔ کیتی میرے ساتھ ہو لی۔ وہ دونوں ہاتھ بغلوں میں دبائے اپنی چال کی روانی کا مداوا کر رہی تھی۔

چلتے وقت اجنبی کے کندھے عجیب سے انداز میں اٹھے ہوئے تھے۔ میرے لیے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ اس کی دونوں بغلوں میں ہولسٹر اور ان میں ریوالور موجود تھے۔ وہ کمپاؤنڈ وال کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ہمیں بنگلے کے عقبی حصے کی طرف لے جا رہا تھا۔

"تم نے اپنا نام نہیں بتایا؟" میں نے مدھم آواز میں کہا۔

"رام پرشاد" اس نے مڑ کر دیکھے بغیر شگفتہ لہجے میں جواب دیا۔

کسا گلی میں کچھ دور رام پرشاد کی کار دیوار کے قریب ہی کھڑی تھی میں اور کیلی عقبی نشست پر بیٹھ چکے تو اس نے اسٹیئرنگ وہیل سنبھالتے ہوئے کہا "اپنی گن سیٹ کے نیچے ڈال دیجئے۔ ہمیں جہاں سے گزرنا ہے وہاں کافی ٹریفک ہوگا۔ اور ابھی حقیقتاً رات بھی نہیں ہوئی۔

میں نے گھڑی دیکھی جسے میں نیپال کے وقت سے ملا چکا تھا۔ ابھی صرف ساڑھے چھ بجے تھے لیکن گہرے سیاہ بادلوں اور سردی کی وجہ سے یوں لگ رہا تھا جیسے رات آدھی سے زیادہ بیت چکی ہے۔

میں نے اپنی گن سیٹ کے نیچے گھسیڑ دی لیکن تل ہاتھ ہی میں تھامے رکھی۔ رام پرشاد گاڑی ریورس کرنے لگا تو مجھے یاد آیا "ادھر میدان کے قریب ایک ٹیکسی والا میرے انتظار میں کھڑا ہوگا۔ میں اسے رخصت کر دیتا تو بہتر تھا۔"

"وہ کب کا رخصت ہو چکا ہے۔" رام پرشاد نے بتایا "میں نے اتفاق سے اس کی جیس برفست کی اوٹ میں کھڑے دیکھ لی تھی اور اس سے آپ کے متعلق پوچھا تھا۔ لیکن اس نے انکی میں گردن ہلا دی تھی اور اس سے پہلے کہ میں اس کی کھڑکی کا شیشہ توڑ کر اس کی گردن پکڑتا وہ گاڑی اسٹارٹ کر کے چل دیا تھا۔ اگر رکا بھی رہتا تو فائرنگ کی آواز سن کر تو بہرحال رفو چکر ہو ہی جاتا۔"

"بے شک" میں نے اس سے اتفاق کیا اور سیٹ کے پچھلے سے ٹیک لگا لی۔ کیلی دونوں ہاتھ بدستور بغلوں میں دبائے دروازے کے قریب سکڑی سمٹی بیٹھی تھی۔ وہ خاصی مضمحل نظر آ رہی تھی۔

"کیا چپ چاپ کیوں ہو؟" میں نے پوچھا۔

"اس مونچھوں والے مردود نے گویا گردن ہی توڑ کر رکھ دی ہے۔" وہ بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولی۔

"میں نے اسے اس کے کیے کی سزا بھی تو دے دی" میں نے کہا۔

"ہاں مجھی تو دل کچھ ٹھنڈا ہوا ہے" وہ گہری سانس لے کر بولی۔ "ویسے میں اسے اتنی جلدی اور اتنی کم تکلیف کے ساتھ مرتے دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔"

"معاف کرنا اس وقت جلدی میں یہی کچھ بن پڑا" میں نے یوں کہا گویا کوئی میزبان بے وقت آنے والے مہمان سے معذرت کر رہا ہو کہ معاف کیجئے گا اس وقت آمیلہ ہی پیش کر سکتا ہوں۔ گھر میں پکانے کے لیے کچھ ہے نہیں اور بازار بند ہو چکا ہے۔

"بہرحال" میں نے تسلی دینے والے انداز میں کہا "ان کے مزید ساتھی ہاتھ لگے تو انہیں تمہاری مرضی کے عین مطابق کیفر کردار تک پہنچاؤں گا۔ خواہ مجھے جوانا خواہ سالم ہی

قربانی کروالیں۔"

وہ دھیرے سے ہنسی اور اس کے پژمردہ چہرے پر زندگی کے کچھ آثار لوٹ آئے۔ میں نے رام پرشاد کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "کون تھے یہ لوگ؟"

"دشمن ہی رہے ہوں گے۔" اس نے محتاط لہجے میں کہا۔

"واہ' بڑا عمدہ انکشاف کیا ہے تم نے۔" میں نے چٹخنے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں تو انہیں اپنا جاں نثار دوست ہی سمجھ رہا تھا اور کیلی بھی یہی سمجھ رہی تھی کہ وہ اسے گدگدی کر کے ہنسانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"آپ تو برا مان گئے؟" رام پرشاد جلدی سے بولا۔

"میرا مطلب تھا کہ میں ان کے بارے میں صحیح طور پر کچھ نہیں جانتا۔ میں تو خود آج انہی لوگوں کی کارروائی کا شکار ہو گیا تھا۔ اسی وجہ سے مجھے آپ تک پہنچنے میں تاخیر ہوئی۔ کسی نے نہ جانے کب میری گاڑی کے ایک وہیل کے نٹ ہی بالکل ڈھیلے کر دیئے تھے۔ میں نہ جانے کس خیال میں تھا کہ ڈرائیونگ کے دوران میں نے کوئی فرق محسوس نہیں کیا۔ پتا تو اس وقت چلا جب وہ پہیہ عین ایک چوراہے پر نکل کر لڑھکتا ہوا سیدھا ٹریفک سارجنٹ سے جا ٹکرایا۔"

اس نے قہقہہ لگایا لیکن میں نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔

"بنگلہ تو تم نے دیکھ ہی لیا ہے" میں نے کہا "اس کی مدد سے کوئی سراغ نہیں لگ سکتا؟"

"بنگلہ" اس بار اس نے گویا میرے بچکانہ پن پر قہقہہ لگایا۔ "ارے صاحب بنگلہ تو کسی شریف آدمی کا ہوگا۔ اسے تو علم بھی نہیں ہوگا کہ جو بنگلہ وہ چاؤ سے بنوا رہا ہے اس میں آج رات کیا ہوا ہے۔ اسے تو اب پولیس ہی جا کر سب کچھ بتائے گی اور اسے بھی شامل تفتیش کر لے گی۔ ان کے بارے میں کچھ جاننا آسان نہیں۔ میں بہت کوشش کر چکا ہوں۔

مزید چند منٹ کے سفر کے بعد ہم ایک کشادہ گلی میں داخل ہوئے اور ایک بلند و بالا اپارٹمنٹ ہاؤس کے قریب رام پرشاد نے گاڑی روک لی۔ گلی میں سناٹا تھا۔ میں اسٹین گن لے کر اترنے لگا تو رام پرشاد جلدی سے بولا "اوہ' براہ کرم اسے گاڑی ہی میں رہنے دیجئے اس عمارت میں بڑے ہی نرم دل قسم کے شرفاء رہتے ہیں۔ کوئی راستے میں ٹکرا گیا تو تامی گن دیکھ کر ہی بے ہوش نہ ہو جائے۔"

میں نے گن سیٹ ہی کے نیچے چھوڑ دی۔

رام پرشاد کی رہنمائی میں ہم لفٹ کے ذریعے پانچویں منزل پر ایک اپارٹمنٹ میں پہنچے۔ یہ ایک لگژری اپارٹمنٹ تھا اور اس کی آرائش شاہانہ اور ستھری تھی۔ قرائن بتاتے تھے کہ یہاں وہ تنہا ہی رہتا تھا۔ اس نے ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور پرتکلف میزبانوں کی طرح

پوچھنے لگا کہ ہم کیا پینا پسند کریں گے۔

میں نے کافی اور سیتی نے برانڈی طلب کی جو اس نے چند منٹ میں حاضر کر دی۔ اپنے لیے وہ برین کا ایک گلاس تیار کرنے لگا۔ جام تیار کر کے وہ کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ اب میں نے پہلی بار اسے گہری نظروں سے سیتی کا جائزہ لیتے دیکھا۔ لیکن اس کی نظروں میں لفنگاپن نہیں تھا۔ وہ مکمل طور پر ایک مہذب اور شائستہ آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اسے اور اس کے انداز و اطوار کو دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جرم کی دنیا سے اس کا کوئی تعلق ہو گا۔

"میں اب تک نہیں سمجھ سکا۔" میں نے کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "چینی ریستوران میں ہماری جو ملاقات ہوئی تھی، اس کا مقصد کیا تھا؟"

"مقصد تو آپ سے رابطہ پیدا کرنا اور آپ کی ضروریات سے آگاہی حاصل کرنا ہی تھا۔" اس نے گلاس کو پر خیال انداز میں انگلیوں میں گھماتے ہوئے کہا "مجھے یہ احکامات ملے ہیں کہ میں آپ کی ضرورت کی ہر چیز مہیا کروں۔ لیکن تمام تر احتیاط صرف آپ کی آمد کو خفیہ رکھنے کے سلسلے کی جا رہی تھی۔ بدقسمتی سے یہ احتیاط کچھ زیادہ کارآمد نہیں رہی۔ آثار بتاتے ہیں کہ دشمنوں کو نہ صرف آپ کی آمد کا علم ہے بلکہ شاید وہ آپ کے مشن سے بھی آگاہ ہیں حالانکہ میں اس سے بے خبر ہوں۔"

وہ مسکرایا اور گلاس خالی کر کے کھڑکی ہی میں رکھ کر ٹہلنے لگا۔ ایک سائیڈ ٹیبل پر ایک بارعب اور شاندار جرمن ریوالور یوں رکھا تھا جیسے وہ بھی سجاوٹ کی کوئی چیز ہو۔ اس کا چیمبر مجھے خالی ہی معلوم ہوتا تھا۔ رام پرشاد نے ٹہلتے ٹہلتے بے توجہی کے عالم میں اسے اٹھا لیا اور ہتھیلی پر رکھ کر اس کی چرخی کو گھماتے ہوئے بولا "آپ دونوں چاہیں تو ہوٹل سے اب یہیں اٹھ آئیں۔ آج رات ساڑھے سات اور آٹھ کے درمیان احسان مرزا صاحب کی کال آنے کی توقع ہے۔ میری براہ راست انہی سے بات ہو گی۔ میں انہیں حالات سے مطلع کر دوں گا۔"

"اس سلسلے میں میں صبح کوئی جواب دوں گا۔" میں نے کہا "میرے خیال میں اب زیادہ احتیاط کی بھی ایسی ضرورت نہیں رہی۔ اس لیے اگر تم برا محسوس نہ کرو تو مرزا صاحب سے میں بھی بات کر لوں۔"

"میں تو خود آپ سے یہی درخواست کرنے والا تھا۔"

رام پرشاد جلدی سے بولا۔ "بہرحال اب آپ یہ بتا دیجیے کہ آپ کو کس کس چیز کی ضرورت ہے؟"

"نہ جانے کیوں اب میں کسی بھی چیز کی کوئی خاص ضرورت نہیں محسوس کر رہا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کافی کا کپ تپائی پر رکھتے ہوئے کہا۔ "اور اگر کسی چیز کی ضرورت پڑی بھی تو شاید میں اپنے ہی طور پر حاصل کر لوں۔ البتہ ایک سوال کا جواب حاصل کرنے میں سخت ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔"

"وہ کیا سر؟" اس نے ٹہلتے ٹہلتے رک کر پوچھا۔

"وہ سوال یہ ہے کہ دشمنوں کے ہاتھ تم کتنی قیمت میں بکے ہوئے ہو؟" میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

"کیا؟" اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ریوالور اس کے ہاتھ میں ساکت تھا مگر اس کی چرخی اب بھی گھوم رہی تھی۔

"میں نے ایک سیدھا سادا سوال کیا ہے رام پرشاد۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "میں کم عمر بھی ہوں اور بعض معاملات میں اناڑی بھی۔ لیکن میں احمق ہرگز نہیں ہوں۔ تم نے ہمیں مروانے کا بڑا عمدہ بندوبست کیا تھا۔ لیکن جب بازی پلٹ گئی تو معصوم بن کر سامنے آ گئے۔ بڑے کھلاڑی ہو تم۔"

"تمہیں یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے۔" وہ سنبھل کر بولا۔ "تمہیں مروا کر مجھے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟"

"یہ تو تم ہی بہتر بتا سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ "تاہم تھوڑا بہت اندازہ مجھے ضرور ہے۔ ہماری آمد سے تمہارے کچھ مفادات متاثر ہونے کا خطرہ پیدا ہو چلا ہو گا۔ احسان مرزا کی نظروں سے دور بیٹھ کر یقیناً تمہاری پانچوں گھی میں ہوں گی اور پھر ہمارا سودا تو تم نے ویسے بھی سستے داموں نہیں کیا ہو گا۔"

"تم دیکھنے میں تو بچے نہیں تمہاری باتیں بھی بچکانہ ہیں۔" وہ کھوکھلے انداز میں ہنسا۔ "میں بارہ سال سے احسان مرزا کے ساتھ ہوں۔"

"پہلے تم یقیناً اس سے مخلص رہے ہو گے۔" میں نے تسلیم کیا۔ "اسی سال کی وجہ سے وہ تم پر شبہ نہیں کر سکتا ہو گا۔ بہرحال اب تم جلدی سے بتا دو کہ تمہیں ہمارے متعلق کیا کچھ معلوم ہے؟ تم نے ان لوگوں کو کس حد تک بتایا تھا۔ جو میرے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں؟ اور یہ کہ تمہاری مخبری کی وجہ سے ہمیں مزید کیا خطرات درپیش ہو سکتے ہیں۔"

"تم نے تو میرے سامنے پورا ایک امتحانی پرچہ رکھ دیا ہے۔" وہ مسکرایا۔ "کیا تم کو یقین ہو گا۔"

"گفتگو کو طول مت دو رام پرشاد۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "میں اس وقت تک فیصلے کرنے کے معاملے میں سخت عجلت پسند ہو چکا ہوں۔ تم یہ مت سمجھنا کہ میں کوئی انتہائی قدم اٹھانے کے لیے احسان مرزا سے اجازت یا مشورہ طلب کروں گا۔"

رام پرشاد بدستور مسکرا رہا تھا۔ اور اسی طرح مسکراتے مسکراتے اچانک اس نے خالی ریوالور مجھ پر کھینچ مارا۔ مجھے اس کی طرف سے حملے کی توقع تو تھی مگر میرا خیال تھا کہ وہ

بغلی ہولسٹر سے ریوالور نکالنے کی کوشش کرے گا اور اس کے لیے میں تیار تھا لیکن مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ خالی ریوالور مجھ پر کھینچ مارے گا۔ تاہم اضطراری طور پر میں ایک طرف ہو گیا تھا اور اسی جبلی سے ردعمل نے مجھے بچا لیا۔

کاؤنٹر جس دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ ریوالور اس سے یوں ٹکرایا جیسے کوئی وزنی ہتھوڑا اس پر دے مارا گیا ہو۔ اگر ریوالور میرے چہرے پر پڑا ہوتا تو یقیناً عمر بھر کے لیے میرے نقوش ہی تبدیل ہو جاتے۔

رام پرشاد کا ہاتھ بغلی ہولسٹر تک پہنچ چکا تھا لیکن اس وقت تک میں اس پر چھلانگ لگا چکا تھا۔ ہاتھا پائی کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ میں نے اس کی گردن پر کراٹے کا فیصلہ کن ہاتھ رسید کیا۔ اس نے ایک ہچکی سی لی اور قالین پر چت گر کر ساکت ہو گیا۔ اس کی گردن ٹوٹ چکی تھی۔

"تم تو واقعی بہت عجلت پسند نظر آ رہے ہو۔" کیتھی نے برانڈی کا چھوٹا سا گلاس تپائی پر رکھ کر سرسری سے لہجے میں کہا اور بیزاری سے رام پرشاد کی لاش کی طرف دیکھا جیسے وہ محض کاٹھ کباڑ کا ایک ڈھیر ہو۔

"میں جنگل کے درندوں کو تو کچھ چھوٹ دے سکتا ہوں۔ آستین کے سانپوں کو نہیں۔" میں نے ٹہلتے ہوئے کہا "ایک بار اگر معلوم ہو جائے کہ آستین میں سانپ موجود ہے تو پھر اس کو مارنے میں تاخیر کرنا خودکشی کے مترادف ہے اور فی الحال میں خودکشی کے موڈ میں نہیں ہوں۔"

دفعتاً فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

چند لمحے تک میں الجھن میں رہا لیکن جب گھنٹی اضافہ بجی تو میں نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھا لیا۔

"تو تھری نائن ٹو سکس؟" ایک مترنم نسوانی آواز نے پوچھا۔ میں نے ٹیلی فون پر نمبر دیکھتے ہوئے کہا "یس"

"ہولڈ کیجئے۔ بمبئی سے آپ کی کال ہے" آپریٹر نے کہا اور دوسرے ہی لمحے کلک کلک شروع ہو گئی۔ میں نے گہری سانس لی۔ چند لمحے بعد ہی جس آواز نے ہیلو کہا اسے میں ہزاروں میں بھی پہچان سکتا تھا۔ "کیا خبر ہے؟" اس نے پوچھا۔

"خبر کچھ اچھی نہیں۔" میں نے بھاری لہجے سے کہا۔

"اوہ! تو تم یہاں موجود ہو۔" احسان مرزا نے بھی گہری سانس لے کر کہا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ جس طرح میں اس کی آواز ہزاروں میں پہچان سکتا ہوں اس طرح وہ بھی میری آواز سے بخوبی آشنا ہو چکا ہے۔

"پروگرام کے مطابق تو اس وقت تمہیں یہاں نہیں ہونا چاہیے تھا۔" اس نے کہا۔

"اس سے تم اندازہ کر سکتے ہو کہ پروگرام کس حد تک خراب ہو چکا ہے۔" میں نے کہا۔

"رام پرشاد کہاں ہے؟" اس نے پوچھا۔

"افق کے پار۔" میں نے جواب دیا "وہ بک چکا تھا بلکہ نہ جانے کب سے بکا ہوا تھا۔ اسے طویل سفر پر بھیجنا بہت ضروری ہو گیا تھا۔"

"اوہ!" احسان مرزا نے ہولے سے کہا اور چند لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔

"تاسف کا شکار ہو گئے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں نہیں" وہ جلدی سے بولا۔ "میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ مجھے بڑی تاخیر سے پتا چلا۔ اور اب اپنی ناکامیوں کی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی۔ پھر قدرے توقف سے بولا۔ "بہرحال تمہیں اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو اس کے لیے ایک ایڈریس اور نوٹ کر لو۔" اس نے مجھے ایک شخص کا نام و پتا نوٹ کرایا۔

"اور کچھ۔" آخر میں اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے کہا "زبانی ہی باتیں ہوں گی۔ بشرط زندگی۔"

"گڈ لک۔" اس نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا کیتھی اپنے گلاس میں کچھ اور برانڈی انڈیل رہی تھی۔

"فی الحال تم اس کا پیچھا چھوڑ دو۔" میں نے گلاس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "جتنی جلد ہم یہاں سے نکل چلیں اتنا ہی بہتر ہے۔ ہم اب دونوں واپس چلتے ہیں۔ راستے میں البتہ اس شخص سے ملتے چلیں گے جس کا ایڈریس احسان مرزا نے نوٹ کرایا ہے۔ یہ ایک دکان کا پتا ہے کہیں بند ہی نہ ہو چکی ہو۔"

کیتھی گلاس چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے تپائی پر سے رام پرشاد کی گاڑی کی چابی اٹھائی اور دروازے کی طرف بڑھا۔ کیتھی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"اس کا کیا بنے گا؟"

"اسے پولیس کے لیے چھوڑ دو۔" میں نے کہا۔ "پولیس اگر لاشیں بھی ٹھکانے نہیں لگائے گی تو آخر کیا کرے گی؟"

"یہ بھی درست ہے۔" کیتھی مسکراتے ہوئے بولی اور میرے ساتھ چل دی۔

نیچے آ کر رام پرشاد کی شاندار گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ میں نے سنبھالی۔ پوچھتے پاچھتے ہم جس علاقے میں پہنچے اس کا نام چاندنی چوک تھا۔ یہاں کی گلیاں تنگ و تاریک اور اینٹوں سے بنی ہوئی تھیں۔ ایک مقام پر پہنچ کر ہمیں کار چھوڑ دینی پڑی کیونکہ پر پیچ گلیوں سے اس کا گزرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ ان گلیوں میں کوئی شخص آتا جاتا نظر نہیں آ رہا تھا جس سے ہم مزید آگے راستہ دریافت کر سکتے۔ اس لیے ہم محض اندازے سے ہی آگے بڑھتے جا

www.paksociety.com

رہے تھے۔

گلیاں بے شک تنگ و تاریک تھیں لیکن مکانات کئی کئی منزلہ تھے اور اوپر کی منزلیں آمنے سامنے گویا ایک دوسرے سے بغلگیر ہو رہی تھیں۔ کہیں کہیں کسی کونے پر کمزور سی روشنی کا کوئی گرد آلود بلب آویزاں تھا ورنہ کہنہ سال دیواریں گویا تاریکی کا لبادہ اوڑھے کھڑی تھیں۔ گلی بازیوں کی بدبو کے علاوہ در و دیوار سے بھی سیلن کی بو پھوٹ رہی تھی۔ قدم قدم پر ایک عجیب سی دہشت کا احساس ہوتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ابھی کہیں تاریکی سے کوئی ہاتھ برآمد ہوگا اور پہلو میں خنجر گھونپ دے گا۔

ہم شاید کسی کی مدد کے بغیر مطلوبہ ایڈریس پر نہ پہنچ پاتے لیکن یہ اتفاق ہی تھا کہ سطح زمین سے کافی نشیب میں ایک مکان کے تہہ خانہ نما حصے کے دروازے پر ہمیں ایک جاپانی لالٹین جلتی نظر آئی۔ یہ لالٹین دراصل ایک سائن بورڈ پر آویزاں تھی۔

گرد آلود سائن بورڈ پر اوپر سے نیچے کی سطروں میں چینی میں نہ جانے کیا تحریر تھا۔ لیکن ایک طرف انگریزی میں ٹیڑھے میڑھے حروف میں لیو ٹانگ کی نوادرات کی دکان بھی لکھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میں نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی۔ مجھے اسی جگہ کی تلاش تھی۔

تین سیڑھیاں اتر کر ہم دروازے تک پہنچے۔ دروازہ خود نوادرات میں شمار ہو سکتا تھا۔ یوں تو اس میں شیشہ بھی لگا ہوا تھا مگر گرد اور میل کی موٹی تہہ کے باعث اس کے پار دیکھنا ممکن نہیں تھا اور نہ ہی اس پر کوئی ایسی تختی آویزاں تھی جس سے علم ہو سکتا کہ دکان بند ہے یا کھلی۔ تاہم جب میں نے دروازے پر ہاتھ رکھ کر ہلکا سا دباؤ ڈالا تو وہ مسلسل چرچراہٹ کے ساتھ یوں کھلتا چلا گیا جیسے اندر موجود کسی شخص کو خبردار کر رہا ہو۔

باہر سے اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ دکان اتنی طویل و عریض ہو گی۔ چھت کو کئی بھدے سے ستون سہارا دیے کھڑے تھے۔ جو مدھم سی روشنی میں جناتی ہیولے معلوم ہو رہے تھے۔ دیواروں کے ساتھ کہیں کہیں گرد آلود شوکیس اور چند ایک شیلف بھی موجود تھے جن میں مختلف بناوٹ کی کچھ زنگ آلود چھریاں، مٹی کے کچھ بھدے چھوٹے کھلونے اور فن آرائش کا مذاق اڑانے والی کچھ آرائشی اشیاء اور بھٹی ہوئی سالخوردہ کتب اور کاغذات موجود تھے۔ کچھ نوادرات اس اعتبار سے واقعی نادر تھے کہ ان کے بارے میں یہ اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا کہ وہ کیا چیز تھیں۔ دکان میں تمباکو کی بو پھیلی ہوئی تھی لیکن اس کا مخرج کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

ٹہلنے کے سے انداز میں ہم نے تقریباً پوری دکان کا چکر لگا لیا۔ کہیں کوئی شخص دکھائی نہ دیا۔ میں نے ہانک لگائی۔ ”کوئی ہے؟“ میں نے سوال انگریزی میں کیا تھا۔

”میں یہاں ہوں۔“ ایک شوکیس کے عقب سے منمناتی ہوئی سی آواز سنائی دی۔

ہم وہاں پہنچے تو تخت پر ایک عجیب الخلقت سا انسان گاؤ تکیے کے سہارے لیٹا نظر آیا۔ وہ

ایک سوکھا سڑا سا چینی تھا مگر پیٹ یوں پھولا ہوا تھا جیسے سانپ نے مینڈک نگل رکھا ہو۔

اس گھڑا دینے والی سردی میں وہ صرف ایک تہمد لپیٹے، حقے کی نے منہ میں دبائے لیٹا تھا۔ اس کے پیٹ کی جلد چکنی چپٹی سی تھی اور اس پر نیلی رگیں پھیلی نظر آ رہی تھیں اور صرف اسی کی وجہ سے وہ چت پڑے ہوئے کسی بھدے سے مینڈک سے مشابہ نظر آ رہا تھا۔

اس کی لمبی سی نوکیلی اور کھچڑی داڑھی اٹھلے ڈھانچے انداز میں ایک طرف کو ڈھلکی ہوئی تھی اور گدلی گدلی سی آنکھیں گویا بینائی سے محروم تھیں۔ میں اندازہ نہیں کر سکا کہ اس نے ہمیں دیکھ لیا تھا یا نہیں، بہرحال اس نے اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

”مجھے احسان مرزا نے بھیجا ہے۔“ میں نے کسی قسم کے کوڈ ورڈ کا تکلف کیے بغیر براہ راست کہا۔ وہ یک لخت یوں اٹھ بیٹھا جیسے کسی طاقتور اسپرنگ نے اسے اچھال دیا ہو۔ ”کیا حکم ہے میرے آقا؟“ اس نے چراغ الٰہ دین کے جن والے سٹائل میں پوچھا۔ حلیے کے اعتبار سے بھی وہ چراغ الٰہ دین کے جن کا چھوٹا بھائی معلوم ہوتا تھا۔ مجھے ہنسی آتے آتے رہ گئی۔

○

میں ایک لمحے خاموش رہا۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ مجھے جو کچھ درکار تھا' وہ اس سے مل بھی سکتا ہے یا نہیں؟ پھر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ مقصد بیان تو کر دینا چاہیے۔

"مجھے دو تین خاص ہتھیار چاہئیں۔" میں نے مدھم لہجے میں کہا۔

اس نے بنچ سے پاؤں لٹکا کر جوتے بچے سے سیپیوں میں پھنسائے اور اٹھ کر ہمیں پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے دکان کی عقبی دیوار کی طرف چل پڑا۔ دیوار کے عین قریب پہنچ کر مجھے اندازہ ہوا کہ اس میں ایک دروازہ موجود تھا۔ بوڑھے نے جس کا نام غالباً لیو تانگ تھا' تب دبا کر دروازہ کھولا اور ہم اونچی چھت والے نیم تاریک ہال میں داخل ہوئے۔ دائیں طرف ایک راہداری میں کچھ دور چلنے کے بعد ہم جس کمرے میں پہنچے' وہ قدیم لیکن شاہانہ طرز کی ایک نشست گاہ تھی۔ اس کمرے کا قالین اور فانوس بلاشبہ بے حد بیش قیمت تھے۔

قالین کے ساتھ ہی گویا لیو تانگ بھی ہمارے قدموں میں بچھا جا رہا تھا۔ کاؤچ نما ایک مخملیں نشست پر ہمیں بٹھانے کے بعد اس نے خالصتاً شاہانہ انداز میں تالی بجائی۔ چند لمحے بعد متصل کمرے کا دروازہ کھلا اور جو لڑکی اندر آئی' اسے دیکھ کر میں چند لمحے کے لیے آنکھ جھپکنا ہی بھول گیا۔ اسے بلاجھجک چین کی ملکۂ حسن قرار دیا جا سکتا تھا۔

بوٹا سا قد' پھول سے رخسار' ریشم سے بال اور سانچے میں ڈھلا ہوا جسم' جس کے نشیب و فراز سادہ سے چینی لباس میں بھی قیامت ڈھا رہے تھے۔ آنکھیں چھوٹی اور ناک قدرے چپٹی ہونے کے باوجود ہندوستانی معیار سے بھی اس کے حسن بلاخیز اور کشش میں کوئی کمی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ہماری طرف دیکھ کر مسکرائی تو گویا کمرے میں آویزاں فانوسوں کی جگمگاہٹ کچھ اور بڑھ گئی۔

"یہ میری بیٹی لی چن ہے۔" لیو تانگ نے سر خم کرتے ہوئے بتایا۔ پھر لی چن کی طرف مڑ کر بولا۔ "اور یہ ہمارے آقا کے بھیجے ہوئے مہمان ہیں۔" اس نے ہمارے نام جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"خوش آمدید...." لڑکی نے بھی قدرے خم ہو کر ایک بار پھر اپنی مسکراہٹ سے کمرے کو مزید منور کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ کیٹی بھی اسے ایک ٹک گھور رہی تھی۔ معلوم

نہیں وہ بھی اس کے بے پناہ حسن سے متاثر تھی یا مجھے متاثر دیکھ کر رشک و حسد کے ملے جلے جذبات کا شکار تھی۔ میں تو بہرحال اس تصور پر بھی حیران تھا کہ چپکلی نما ایک شخص کی بیٹی اس قدر حسین ہو سکتی تھی۔

لیو تانگ نے چینی میں لڑکی سے کچھ کہا اور وہ اثبات میں سر ہلا کر کمرے سے نکل گئی۔ لیو تانگ ہمارے سامنے ایک نشست پر مودبانہ انداز میں یوں جھک گیا گویا مراقبے میں چلا گیا ہو۔ کیٹی اور میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا دیئے۔

چند لمحے بعد لی چن ایک نہایت خوبصورت نقرئی ٹرے پر تراشیدہ ہیرے کی طرز پر بنے ہوئے تین بلوری گلاس رکھے واپس آئی۔ جن میں ارغوانی رنگ کا کوئی مشروب موجود تھا۔ قریب آ کر وہ گلاس تپائی پر رکھنے کے لیے جھکی تو اس کے وجود سے اٹھتی ہوئی مہک نے مجھے مسحور سا کر دیا۔

لیو تانگ نے مراقبے سے سر اٹھا کر ہمیں گلاس اٹھانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "بلا تکلف پیجیے۔ یہ شراب نہیں ہے' تاہم اگر کسی بھی قسم کی شراب یا وہسکی وغیرہ کی ضرورت ہو تو بلاجھجک حکم دیجیے گا' حاضر کر دی جائے گی۔"

"مشکریہ! ابھی جو کچھ ہے' یہی ٹھیک ہے۔" میں نے مسکرا کر گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔

"یہ قدیم چین کے امراء کا مشروب خاص ہے۔" اس نے ایک گلاس خود اٹھاتے ہوئے کہا۔

مجھے نہیں معلوم کہ مشروب پینے کے بعد کیٹی کی کیا حالت ہوئی تھی' تاہم میری اپنی تو چند لمحے بعد یہ حالت تھی کہ رگوں میں دوڑتا ہوا خون جیسے آتش سیال بن گیا تھا۔ کانوں کی لوئیں بری طرح تپنے لگی تھیں اور جی چاہنے لگا تھا کہ میں اپنے جسم پر کوئی گرم کپڑا باقی نہ رہنے دوں۔

"کھانے میں آپ کیا پسند فرمائیں گے؟" لیو تانگ نے پوچھا۔

"ان تکلفات کی ضرورت نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "بس ہمیں دو ٹائم گنیں غیر استعمال شدہ حالت میں اور ایک موزر ریوالور استعمال شدہ حالت میں عنایت کر دیجیے۔"

لیو تانگ نے چینی زبان میں لی چن سے کچھ کہا اور وہ ایک بار پھر متصل کمرے کے دروازے میں لہراتا ہوا پردہ اٹھا کر اس کے پیچھے غائب ہو گئی۔ چند لمحے بعد وہ کئی ڈبے بازوؤں پر اٹھائے ہوئے واپس آئی۔ ان ڈبوں پر مختلف کھلونوں کی تصویریں چھپی ہوئی تھیں۔ لی چن نے ڈبے تپائی پر رکھ دیئے۔

لیو تانگ نے ان میں سے دو ڈبے منتخب کر کے کھولے۔ ان میں دو ٹائم گنیں غیر استعمال شدہ حالت میں رکھی تھیں۔ ایک ڈبے سے اس نے تمام پارٹس نکال دیئے اور علیحدہ علیحدہ رکھتے ہوئے ایک چھوٹے سے ڈبے سے دو مختلف سائزوں کے اسکریو ڈرائیور نکالتے ہوئے

بولا- "یہ تانی گنیں جرمنی کی بنی ہوئی ہیں اور جدید ترین ساخت کی ہیں- شاید آپ کو استعمال کرنے میں کوئی دشواری پیش آئے- ایک گن میں استعمال کر کے دکھا دیتا ہوں- اس کے بعد آپ کو کوئی دقت پیش نہیں آئے گی-"

اس کی انگلیاں گن کے پارٹس سے اس مشاقی سے کھیلنے میں مصروف تھیں گویا کوئی ماہر فن استاد ستار کے تاروں پر کوئی نغمہ چھیڑ رہا ہو- دیکھتے دیکھتے ہی اس نے دو اسکریو ڈرائیورز کی مدد سے ان پارٹس کو جوڑ کر گن تیار کر دی جو ایک چھوٹے سے ڈبے میں سمائے ہوئے تھے- طریقہ ذہن نشین کرنے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی، تاہم اطمینان کی خاطر لیو تنگ نے دوسری گن مجھ سے استعمال کروا کے دیکھی- مطمئن ہو کر اس نے محض چند سیکنڈ میں دونوں گنیں کھول کر پارٹس کی صورت میں ڈبوں میں بند کر دیں- پھر ایک ڈبے سے ریوالور نکال کر مجھے دکھایا-

یہ لمبی نال والا اور نو گولیوں والا ایک سیاہ رنگ ریوالور تھا- اس کا دستہ نہایت چھوٹا اور چپٹا تھا اور اسے نہایت آسانی سے کلائی یا ٹانگ کے ساتھ فیتے کی مدد سے باندھ کر چھپایا جا سکتا تھا-

"اگر آپ ضرورت محسوس کریں تو میں ایک اور ننھا سا لیکن نہایت کارآمد ہتھیار آپ کی خدمت میں پیش کروں-" لیو تنگ نے معنی خیز انداز میں کہا- "ایک قدیم فارمولے کو جدید ہتھیار کی شکل دی گئی ہے- نازک اور خاص حالات میں نہایت کام کی چیز ہے-"

"ضرور دکھائیے-" میں نے اشتیاق سے کہا-

اس نے ایک چھوٹا سا ڈبہ کھول کر کھلونا نما ایک چمکیلا پستول نکالا- سائز میں یہ ایک عام سگریٹ لائٹر کے برابر تھا اور اس کی نال لمبائی اور موٹائی میں سگریٹ سے بھی کہیں چھوٹی تھی اور تقریباً ٹھوس تھی- اس کے درمیان صرف اتنا ہی سوراخ تھا کہ قدرے پرانی ساخت کے گراموفون کی سوئی تنہا اس سے گزر سکتی تھی، جو اب بھی کہیں کہیں مستعمل ہے-

"یہ نہایت جدید ڈارٹ گن ہے-" لیو تنگ نے بتایا- "اس کی مار بیس گز ہے اور ایک وقت میں اس میں زہر میں بجھی ہوئی بیس سوئیاں لوڈ ہوتی ہیں اور سوئی کسی بھی جاندار کی کھال میں اتر جائے تو اس کی موت یقینی ہے، اور پھر آواز بھی قطعی پیدا نہیں ہوتی-"

"واقعی بڑے کام کی چیز ہے-" میں نے کہا- "یہ بھی میرے لیے رکھ دیجئے-"

اس نے ایک اور چھوٹی سی ڈبیا کھولی- یہ گراموفون ہی کی سوئیوں جیسی چھوٹی چھوٹی سوئیوں سے بھری ہوئی تھی، لیکن یہ سوئیاں چپٹی سیاہ تھیں- "یہ پانچ سو سوئیوں کی ڈبیا ہے-" لیو تنگ نے بتایا- پھر ڈارٹ گن کو لوڈ اور ان لوڈ کرنے کے علاوہ بے خطا نشانہ

لگانے کے سلسلے میں مزید ضروری ہدایات دینے لگا-

مزید چند ضروری معاملات پر گفتگو کرنے کے بعد ہم نے اس سے اجازت طلب کی- لیو تنگ اور اس کی بیٹی ہمیں دروازے تک چھوڑنے آئے- رخصت ہوتے وقت میری نظریں ایک بار پھر لی چن سے ملیں اور میں نے اس کی آنکھوں میں ایک سوال کا ستارہ جھلملاتے دیکھا- میں کوئی فلمی یا افسانوی ہیرو نہیں تھا جو یقین کر لیتا کہ اس مختصر سی پہلی ملاقات میں وہ مجھ پر عاشق ہو چکی ہے لیکن اس سوال کے مفہوم میں بہرحال کوئی شبہ نہیں تھا- "کیا پھر بھی کبھی آؤ گے اجنبی؟"

میں نے اس خاموش سوال کی چبھن محسوس کی لیکن جبراً اسے اپنا وہم اور خوش فہمی قرار دے کر منہ پھیر لیا اور باپ بیٹی کو الوداع کہہ کر مرزا کا ہاتھ تھام کر چل دیا-

میرا خیال تھا کہ راستے میں مرزا لی چن پر کوئی تبصرہ کرے گا، اس کے بارے میں میرے محسوسات جاننے کی کوشش کرے گا، لیکن اس کے بجائے کافی دیر کی خاموشی کے بعد اس نے پوچھا- "اور اس تانی گن کا کیا کرو گے جو رام پرشاد کی گاڑی میں موجود ہے؟"

"میں اسے گاڑی ہی میں چھوڑ کر گاڑی رام پرشاد کے اپارٹمنٹ ہاؤس کے قریب ہی چھوڑ دوں گا-" میں نے جواب دیا-

دوسرے روز ہم برانچ لائن کی ایک ٹرین کے ذریعے ٹھٹاور سے ایک سرحدی گاؤں موتیالا کی طرف روانہ ہوئے- اب ہم دونوں ہی حلیے کے اعتبار سے اینگلو انڈین سیاح معلوم ہو رہے تھے- ہم دونوں ہی کی کمر پر کینوس کے تھیلے بندھے ہوئے تھے-

موتیالا پہنچتے پہنچتے ہمیں شام ہو گئی- وہ رات ہمیں گاؤں ہی میں ایک شخص میگھنا کے گھر گزارنی پڑی- یہ بھی احسان مرزا کا ایجنٹ تھا- دوسری صبح اس نے آٹھ سو سی سی کی ایک طاقتور اور مضبوط موٹر سائیکل ہمارے حوالے کی جس کے ساتھ فاضل پرزوں کا ایک بڑا ڈبہ بھی منسلک تھا-

پروگرام اور روٹ تو پہلے ہی سے طے تھا لیکن میں نے ایک بار پھر نقشہ کھول کر میگھنا سے تفصیلی طور پر تبادلہ خیال کر لیا- میگھنا نے واضح نشانیوں کے ساتھ اس پٹی کے بارے میں بتایا جس پر سفر کرتے وقت سرحد عبور کرنا بقول اس کے ایسا ہی تھا جیسے آدمی اپنے گھر کا صحن عبور کر کے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں چلا جائے-

ابتدا میں چالیس پچاس میل کے سفر میں ہمیں کچھ دشواری پیش آئی کیونکہ کافی راستہ ہمیں پہاڑی علاقوں میں طے کرنا پڑا جہاں کہیں کہیں برف بھی ہوئی تھی اور بعض مقامات پر تو راستے کی چوڑائی ایک گز سے بھی کم تھی- ان راستوں پر واقعی طاقتور موٹر سائیکل کے علاوہ کسی سواری کا چلنا ناممکن ہی تھا-

مزید پچاس میل کے سفر میں ہم پہاڑوں کی بلندیوں سے نشیب میں آ گئے۔ کہیں چٹیل میدان، کہیں جنگل اور کہیں ریتلا علاقہ بھی آیا۔ ایک جگہ تو ہماری موٹرسائیکل ریت میں اترتے اترتے ہی بچی۔ چند میل ناہموار راستے پر کیٹی نے بھی موٹرسائیکل چلائی لیکن دشوار گزار راستوں پر چلانا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

اس وقت دھوپ ڈھلنے لگی تھی، جب ہم ایک ایسے ناہموار میدانی سے علاقے میں پہنچے جہاں جابجا چھوٹے بڑے ٹیلے سر اٹھائے کھڑے تھے اور مٹی نارنجی سے رنگ کی تھی۔ یہاں ایک ٹیلے کی اوٹ میں بیٹھ کر ہم نے ڈبوں میں بند خوراک سے پیٹ کی آگ بجھائی۔ پانی پیا اور کچھ دیر ستانے اور گپ شپ کرنے کے بعد ہم نے ایک بار پھر سلسلہ سفر جوڑا۔

ہم بمشکل تین چار میل ہی فاصلہ طے کر پائے تھے کہ ایک ٹیلے کی اوٹ سے نکلتے ہی اچانک ایک وردی پوش ہمارے سامنے آ گیا۔ میں شاید موٹرسائیکل کو لہرا کر اس سے بچتا ہوا نکل جاتا لیکن میں نے اس کے ہاتھ میں اور ماؤزر رائفل دیکھ لی تھی۔ یوں تو میرے پیچھے بیٹھی ہوئی کیٹی کی بیلٹ میں ریوالور اڑسا ہوا تھا جو جیکٹ کی آڑ میں تھا لیکن فوری طور پر نکالا جاسکتا تھا مگر میں نے کیٹی کو ٹھوکا دے کر ریوالور نکالنے اور وردی پوش کو گولی مارنے سے باز رکھا۔ کیونکہ میں نے قریب ہی دور ایک نیم پختہ کوٹھڑی اور ایک خیمے پر مشتمل سرحدی چوکی کی ایک جھلک دیکھ لی تھی۔

میکفنا نے ایسا کوئی امکان ظاہر نہیں کیا تھا کہ راستے پر میرا سامنا سرحدی فوجیوں سے بھی ہو سکتا ہے اور میں راستے سے بھٹکا بھی نہیں تھا۔ کچھ دیر پیشتر پڑاؤ کے دوران بھی میں نے نقشہ کھول کر قطب نما کی مدد سے بھی دیکھا تھا کہ ہم صحیح راستے پر جا رہے تھے۔

بہرحال میں نے اسے بچاتے ہوئے موٹرسائیکل روکی اور ہر ہنگامی قدم اٹھانے کے لیے تیار ہو گیا۔

سرحدی فوجی جس کے جسم پر بھارتی وردی اور کندھے پر دو ستارے بھی سجے ہوئے تھے، ماؤزر رائفل کو لاپروائی سے ہلاتا اور میرے بجائے کیٹی کو پرتجسس نظروں سے دیکھتے قریب آ گیا۔ اس کی مونچھیں گلہری کی دم کی طرح پھولی پھولی اور اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔

"یہ کس قسم کا مال لیے جا رہے ہو؟" اس نے رائفل کی نال سے کیٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے استہزائیہ سے لہجے میں پوچھا۔ کیٹی گو کہ جینز جیکٹ میں تھی بال کٹے ہوئے تھے، سر پر شکاریوں والی ٹوپی تھی لیکن یہ دیکھنا بہرحال زیادہ مشکل نہیں تھا کہ وہ لڑکی تھی۔

"بڑا عمدہ قسم کا مال ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "ہاتھ لگا کر دیکھو کرنٹ مارے گا۔"

اس نے کھل کر قہقہہ لگایا۔ گویا میں نے اسے لطیفہ سنا دیا ہو اور وہ اس سے خوب محظوظ ہوا ہو۔ پھر اس نے چاروں طرف گھوم کر ہمارا اور موٹرسائیکل کا اوپر نیچے سے اچھی طرح جائزہ لیا اور سامنے آ کر قدرے حیرت زدہ سے لہجے میں بولا۔ "تمہارے پاس تو واقعی کوئی مال نظر نہیں آ رہا..... پھر سرحد پار کیا کرنے جا رہے ہو؟ یہ لڑکی اس موٹیا ہی کو ایکسپورٹ کرنے جا رہے ہو؟"

"ہاں تو واقعی میرے پاس کوئی نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "مال لے کر جاؤ یا خالی ہاتھ جاؤ، ہمارا خرچہ تو دے کر ہی جانا پڑے گا۔ اگر مال لے کر نہیں جا رہے تو یہ تمہاری بے وقوفی ہے، ہماری نہیں۔"

"کون سی کرنسی میں خرچہ چاہیے اور کتنا؟" میں نے ادھر ادھر کی باتوں میں مزید وقت ضائع کیے بغیر فوراً پوچھا "ہمارے پاس امریکی ڈالر بھی ہیں اور بھارتی روپیہ بھی۔"

"انڈین کرنسی میں ہی دے دو..... پانچ سو روپے۔"

اس نے سوچ کر جواب دیا۔ "تم خالی ہاتھ جا رہے ہو اس لیے تم سے خاص رعایت ہے..."

میں نے کیٹی کو اشارہ کیا۔ اس نے کندھے سے لٹکے ہوئے چھوٹے سے بیگ سے سو سو کے پانچ نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے جو اس نے لے کر اطمینان سے اپنی جیب میں رکھ لیے اور چوکی کی طرف چل دیا جس کے دروازے پر ایک اور وردی پوش کھڑا تھا۔ میرے سامنے ہی انہوں نے ہمارے نوٹوں کو بانٹ لیا اور ہاتھ ہلا کر ہمیں الوداع کہا۔

میں نے موٹرسائیکل کو گیئر لگایا۔ راستہ ایسا زیادہ دشوار گزار نہیں تھا اس لیے ہم خاصی تیز رفتاری سے فاصلہ طے کرنے لگے۔ تیز ہوا اور موٹرسائیکل کے شور کی وجہ سے ہمیں جو بھی بات کرنی ہوتی تھی چلا کر کرنی پڑتی تھی۔ کیٹی میرے کان میں چلائی۔ "اب تمہاری سمجھ میں آ گیا ہو گا کہ اسمگلنگ اتنی چھوٹی چھوٹی کیوں جا رہی ہے۔"

"میری سمجھ میں بہت عرصہ پہلے ہی آ چکا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

تقریباً بیس میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم ایک ایسے راستے پر پہنچے جو بڑے بڑے تودوں کو تراش کر اس طرح بنایا گیا تھا کہ بار بار چوڑی اور اونچی دیوار سے مشابہ نظر آتا تھا۔ اس کے دونوں طرف نشیب میں کوئی زرخیز زمین تھی اور کہیں کہیں خودرو جھاڑیوں کے جھنڈ نظر آ رہے تھے۔ جن کے درمیان کوئی کوئی جنگلی خرگوش پھدکتا نظر آ رہا تھا۔ یہ دیوار نما سڑک اس بات کی بھی نشانی تھی کہ وہ وادی اب زیادہ دور نہیں جو ہماری منزل تھی اور جس کا نام احسان مرزا نے جو بتایا تھا اس کا اردو میں مطلب "تاریک وادی" بنتا تھا۔ حالانکہ بقول اس کے وہاں روشنی کی کوئی کمی نہیں تھی۔ دیوار نما سڑک بڑے عجیب و غریب طریقے سے آگے بڑھ رہی تھی۔ کبھی اس میں کوئی ایسا موڑ آ جاتا جہاں دونوں طرف

www.paksociety.com

جیسا خرچ بڑے بڑے کھیتوں پر ہوتا ہے۔

تقریباً پون گھنٹہ گزارنے کے بعد بالا کھووا جو رہا تھا کہیں گوڈی کی جا رہی تھی اور کہیں تیار فصلوں سے ڈوڈی اتاری جا رہی تھی۔ کہیں پودوں کو سنوارا جا رہا تھا۔ کہیں کچھ بیج نما چیزوں یا ڈوڈیوں کے ٹوکرے بھر بھر کر کچھ لوگوں کے سروں پر لادے جا رہے تھے جو انہیں دور ایک بڑی نیم پختہ سی عمارت کی طرف لے جا رہے تھے۔ دور سے وہ عمارت فلور ملز یا پھر کولڈ اسٹوریج سے مشابہ نظر آتی تھی۔ گویا کہ یہاں کچھ ایسی جدید قسم کی مشینری بھی نظر آ رہی تھی جو باقاعدہ جائز قسم کی کھیتی باڑی کرنے والوں کو بھی میسر نہیں تھی۔

ایک جگہ پر ٹیوب ویل اور ایک جگہ نشیب میں اس سے ملتی جلتی کوئی اور مشین بھی نظر آ رہی تھی۔ ٹیوب ویل غالباً بجلی سے چلتا تھا یا پھر اس کے لیے کوئی طاقتور جنریٹر موجود تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ یہ سب مشینری یہاں تک پہنچی کس طرح تھی؟ میری معلومات کے مطابق بھی اور مشاہدے و اندازے کے مطابق بھی یہاں تک پہنچنے کا راستہ تو وہی ایک نظر آتا تھا جس سے ہم آئے تھے اور وہ مشینری یا کسی بھی قسم کی وزنی اشیاء کی نقل و حمل کے لیے قابل استعمال نہیں تھی۔ گویا یہ تاریک وادی تو نہیں البتہ وادی عجائبات ضرور تھی۔ ابھی میری آنکھوں کو اور نہ جانے کیا کیا دیکھنا تھا۔

میں اور کینی ایک بڑے سے پتھر کے پیچھے چھپے ہوئے تھے اور اس قسم کے تودے ڈھلان پر جا بجا موجود تھے، لیکن ان کے درمیان عموماً خاصا فاصلہ تھا۔ اگر ہم ڈھلان کی طرف سفر کرتے وقت ایک تودے سے دوسرے تودے کی طرف بڑھتے اور اسی دوران منشیات کے کھیتوں میں کام کرنے والوں میں سے کسی کی نظر بلندی کی طرف اٹھ جاتی تو ہمیں نہایت آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا۔

کھیتوں میں صرف مرد ہی نہیں عورتیں بھی مصروف کار تھیں۔ ان سب کے لباس ڈھیلے ڈھالے، موسم کی مناسبت سے بھاری بھرکم اور گہرے رنگوں کے تھے۔ ان کی تراش خراش پٹھانوں کے ملبوسات سے بہت ملتی جلتی تھی۔ میں نے ایک مرد اور ایک عورت کو تاڑا۔ گو کہ ان دونوں کے درمیان کافی فاصلہ تھا اور وہ ایک دوسرے سے لاتعلق نظر آ رہے تھے تاہم وہ ایک دورافتادہ سے گوشے میں پودوں پر جھکے جھکے کچھ کر رہے تھے۔ میں نے کینی کی توجہ بھی ان کی طرف دلائی پھر کہا۔ "ہمارے شکار کے طور پر مجھے یہی موزوں ترین نظر آ رہے ہیں۔ یہ دونوں باقی لوگوں سے کافی فاصلے پر ہیں۔ ان کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہے اور ان سے چند گز کے فاصلے پر ہی چند درختوں کی اوٹ بھی میسر ہے۔"

"بے شک!" کینی نے ان کا جائزہ لیتے ہوئے تائید کی۔

"میرا خیال ہے ہم الگ الگ اور اپنا اپنا طریقہ کار اختیار کرتے ہوئے نیچے پہنچتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تم عورت کو قابو میں کرنا میں اس مرد کو قابو میں کروں گا۔ ہمارا

مقصد صرف انہیں بے ہوش کر کے ان کا لباس وغیرہ حاصل کرنا ہے تاکہ ہم ان کا روپ دھار کر انہیں لوگوں میں گھل مل سکیں۔ بہرحال اگر خنجر وغیرہ کے استعمال کی ضرورت پڑ جائے تو ہچکچانے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ کوئی اتنی معصوم روحیں تو ہیں نہیں۔"

کینی نے اثبات میں سر ہلایا اور مجھ سے کافی دور چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں نے پتھروں کی آڑ لیتے ہوئے اور کہیں کہیں چوپائے کی طرح چلتے ہوئے نشیب میں اترنا شروع کیا۔

میں نشیب میں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ نیچے پہنچ کر میرے دیکھ لیے جانے کا خطرہ بہت حد تک کم ہو گیا لیکن سیدھا کھڑا ہوتا اب بھی خطرے سے خالی نہیں تھا کیونکہ پودے زیادہ اونچے نہیں تھے۔ البتہ کہیں کہیں بعض چیزوں کے انبار وغیرہ موجود تھے۔ ان کے پاس درختوں کے عقب میں پہنچ کر سیدھا کھڑا ہوا جا سکتا تھا۔ تاہم اپنے مطلوبہ شخص کے عقب میں مجھے چاروں ہاتھوں پیروں کے بل ہی پہنچنا پڑا اور عین اس وقت جبکہ میں توقع کر رہا تھا کہ وہ جھکنے لگا ہے اور میں اس کی چٹیا پر وار کر سکوں گا، اس لمحے اچانک ہی وہ نہ جانے کیوں گھوم گیا۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ یوں دم بخود رہ گیا جیسے کسی بھرے پرے شہر کے بیچوں بیچ رہنے والے مہذب و شائستہ انسان نے اپنے آراستہ و پیراستہ ڈرائنگ روم میں کسی برفانی ریچھ کو داخل ہوتے دیکھ لیا ہو۔ ایک لمحے کے لیے تو میں بھی گڑبڑا کر رہ گیا تھا اور چاروں ہاتھ پیروں کے بل یوں کھڑا رہ گیا تھا جیسے کوئی پہاڑی بکرا سوالیہ نظروں سے کسی اجنبی کی طرف دیکھ رہا ہو۔ لیکن اس سے پہلے کہ اس شخص کے ہونٹ حرکت میں آتے میں نے بجلی کی سی تیزی سے اس کی ٹانگ کھینچ لی اور جیسے ہی وہ گرا، اس کی کنپٹی پر "چماپ" رسید کر دی۔ اسی لمحے وہ ساکت ہو گیا۔

اس غریب کو شاید یہ سمجھنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی کہ اس کے ساتھ ہوا کیا تھا اور اس پر حملہ آور ہونے والا "جانور" کون سا تھا!! میں اسے تیزی سے گھسیٹ کر درختوں کے جھنڈ میں لے گیا۔ وہ کچھ گہری گہری سی سانسیں لے رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ جلدی میں شاید اس کی کنپٹی پر چوٹ کچھ زیادہ ہی زوردار پڑ گئی تھی۔ بہرحال میں نے اپنی کمر پر بندھا ہوا چھوٹا سا بیگ اتارا اور اس کے کپڑوں وغیرہ سے اپنا لباس کا تبادلہ شروع کر دیا۔ مجھے اس کام میں اور اپنے حلیے کو مکمل طور پر شک و شبے سے بالاتر بنانے میں خاصی دیر لگ گئی۔

جب میں اپنے تبدیلی حلیے سے مطمئن ہو کر جھنڈ سے نکلنے کا ارادہ کر رہا تھا تو اپنے عقب میں ایک نسوانی آواز سن کر مجھے تیزی سے گھومنا پڑا۔ اس نے کسی ناقابل فہم زبان میں کچھ کہا تھا۔ میں نے دیکھا وہ کھیتوں کی عورتوں میں سے کوئی ایک تھی۔ شاید میرے

شکار کی بجائی ہی رہی ہو۔ وہ چادر میں تقریباً پورا چہرہ چھپائے کھڑی تھی۔ صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ میں ایک "چانپ" اسے بھی رہبر کرنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ وہ غالباً میرا ارادہ بھانپتے ہوئے میرا ہاتھ حرکت میں آنے سے پہلے ہی اچھل کر دور ہٹ گئی۔ اس کی آنکھیں اصلی حالت پر آ گئیں اور جب ان آنکھوں کو میں نے پہچان لیا۔ ساتھ ہی اس نے چہرے سے چادر ہٹا دی اور بے آواز طریقے سے ہنسنے لگی۔

میں بھی دھیرے سے ہنس پڑا۔ وہ بنی تھی۔ جو مجھ سے پہلے ہی اور مجھ سے کچھ بہتر حود پر جلیہ تبدیل کرکے آن پہنچی تھی۔

"اس عورت کا تم نے کیا کیا؟" میں نے پوچھا۔

"وہی جو تم نے اپنے شکار کا کیا۔" اس نے جواب دیا۔

سورج تقریباً غروب ہو چکا تھا اور کام کرنے والے مرد اور عورتیں بڑی بڑی ٹولیوں کی صورت میں ایک طرف کو چل پڑے تھے۔ ہم بھی ایک ٹولی کے پیچھے پیچھے چل دیئے۔ ہم نے اپنے درمیان تھوڑا سا فاصلہ رکھا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کوئی شخص ہم دونوں میں سے کسی کو مخاطب نہ کر بیٹھے۔ لیکن جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کا امکان بے حد کم تھا۔ ایک تو وہ سب تھکے ہارے نظر آ رہے تھے۔ اس عالم میں ویسے ہی انسان ایک دوسرے سے بات کرنے سے بیزار ہوتا ہے۔ بس جلد از جلد گھر پہنچ کر تھکن اتارنے اور حسب حیثیت آسائشوں سے محظوظ ہونے کا خیال ذہن میں جاگزیں ہوتا ہے۔ کچھ ویسے بھی یہ لوگ تھکے ہوئے، فلسفیانہ اور یاس زدہ سے انداز میں خاموش رہنے کے عادی معلوم ہوتے تھے لیکن اپنی زندگی سے عدم دلچسپی یا اپنے معمولات سے بیزاری بھی ان کے چہروں سے عیاں نہیں تھی۔

وہ مطمئن، مسرور اور آسودہ حال بھی نظر آتے تھے۔ ان میں سے بہت کم لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ہم ایک نہایت طویل و عریض سبزہ زار سے گزرے جو غالباً مویشیوں کے لیے چراگاہ کا کام دیتا تھا۔ اس کے ایک حصے میں بہت بڑا باڑہ بھی نظر آ رہا تھا جہاں کئی آدمی مختلف کاموں میں مصروف تھے۔ یہ لوگ غالباً رکھوالے اور گوالے تھے۔

سبزہ زار سے گزرنے کے بعد ایک مختصر سا چٹیل میدان آیا پھر تھوڑی سی چڑھائی چڑھنے کے بعد لوگ ایک نسبتاً بھی کر چوڑی اس سڑک پر پہنچ گئے جس پر ہم اور کیتھی سفر کرتے رہے تھے اور پھر نشیب میں اتر گئے تھے۔ اس سڑک پر لوگوں نے چڑھنا شروع کر دیا تو خود بخود ہی قطار بنتی چلی گئی جو کافی طویل تھی۔ بنی میرے آگے تھی اور ہم اس قطار کے تقریباً وسط میں تھے۔

سڑک آگے چل کر تقریباً گھوڑی سی چٹانوں کے ایک دائرے میں گویا غائب ہو رہی تھی۔ قطار کا اگلا سرا اس موڑ پر پہنچا تو قطار کے آگے کھسکنے کی رفتار کچھ کم ہو گئی۔ لیکن

مجھے چونکہ موڑ سے آگے کا منظر نظر نہیں آ رہا تھا اس لیے میں اس کی وجہ جاننے سے قاصر تھا۔ شام کے سائے بھی گہرے ہو چکے تھے۔

جب بنی اور میں موڑ سے ذرا آگے پہنچے تو سامنے کا منظر دیکھ کر میں ایک لمحے کے لیے ٹھٹک سا گیا۔ چند گز آگے وہ تنگ سی سڑک چٹانوں کے درمیان تراشے گئے ایک بہت بڑے مسطح چبوترے سے مل گئی تھی اور اس چبوترے پر نہایت بلند و بالا آہنی پھاٹک نصب تھا۔

اس قسم کے پھاٹک عموماً زمانہ قدیم کی یادگاروں اور قلعوں وغیرہ میں نصب نظر آتے تھے۔ دائیں بائیں دونوں طرف سے یہ پھاٹک گویا چٹانوں ہی میں نصب تھا اور دوسری طرف پہنچنے کے لیے اسی میں سے گزرنا ضروری تھا۔

پھاٹک اس وقت کھلا ہی تھا اور اس کے پار نشیب میں اونچے نیچے جھونپڑی نما اور کچھ جاپانی طرز کے مکانوں کے ہیولے نظر آ رہے تھے۔ پھاٹک پر دونوں طرف دو محافظ اسٹین گن لیے کھڑے تھے۔

ایک محافظ کے قریب ہی بجلی کے واٹر کولر سے مشابہ ایک مشین چھریلے فرش پر کھڑی تھی۔ دراصل اس مشین ہی کا استعمال دیکھ کر میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی اور ایک لمحے کے لیے میں پریشان سا ہو گیا تھا۔

صورت حال یہ تھی کہ قطار میں موجود ہر شخص اس مشین کے قریب سے گزرتے وقت اس پر بنے ہوئے ایک خانے پر انگوٹھا رکھتا تھا اور آگے بڑھ جاتا تھا۔ اس کے انگوٹھا رکھتے ہی مشین کی پیشانی پر سبز روشنی جھلملا اٹھتی تھی۔ انگوٹھا ہٹتے ہی یہ روشنی غائب ہو جاتی تھی پھر دوسرا شخص انگوٹھا رکھتا تو دوبارہ جھلملا اٹھتی تھی۔

ظاہر ہے یہ روز کا معمول تھا اور اس وقت بھی یہ عمل اتنے تسلسل سے جاری تھا کہ مسلح محافظ بھی قدرے بے نیازی کے عالم میں تھے۔ کن انکھیوں سے ایک نظر سبز روشنی کی جھلملاہٹ دیکھتے تھے اور دوسرے ہی لمحے وہ شخص جس نے مشین پر انگوٹھا رکھا ہوتا تھا اس کے درمیان سے گزرتا چلا جاتا تھا۔ اس کے چہرے کی طرف محافظ نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔

مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ بجلی کے واٹر کولر سے مشابہ وہ مشین دراصل کمپیوٹر تھا جس میں ان تمام لوگوں کے انگوٹھوں کے نشانات محفوظ تھے جو کھیتوں پر کام کرنے جاتے تھے۔ کمپیوٹر اس وقت ان میں سے ہر ایک انگوٹھے کے نشان کی تصدیق کر رہا تھا۔

خطرے کے احساس سے تو میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی تھی لیکن ساتھ ہی شدید حیرت کا حملہ بھی ہوا تھا۔ کمپیوٹر کا استعمال تو ابھی صحیح طور پر سمجھنے میں بھی شروع نہیں ہوا تھا جبکہ یہ تو ایک دور افتادہ گوشہ، کوہستان تھا جہاں شاید کوئی تہذیب، تمدن کی رسائی کا

www.paksociety.com

بھی گمان نہ کر سکتا۔ چھ جاتا۔ کمپیوٹر کی موجودگی۔ یہ سب کچھ اس قدر عجیب و غریب تھا کہ تقریباً مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔

کیتی نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور غیر محسوس انداز میں مسکرائی۔ صورت حال کو یقیناً وہ بھی سمجھ چکی تھی لیکن اس لڑکی کی دیگر خوبیوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ وہ غیر ضروری طور پر خوفزدہ نہیں ہوتی تھی۔ وہ اس حقیقت کو سمجھ چکی تھی کہ خوفزدہ ہونے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اس حقیقت کو سمجھتے تو بہت سے لوگ ہیں لیکن اس فطری ردعمل پر قابو پانا بہت کم لوگوں کے بس کی بات ہوتی ہے۔

وہ دوبارہ سامنے دیکھتے ہوئے ست روی سے آگے بڑھنے لگی۔ اس سے آگے اب صرف تین قدم رہ گئے تھے۔ وہ بھی بیٹے بعد بڑے اطمینان سے کمپیوٹر پر انگوٹھا لگاتے ہوئے گیٹ عبور کر گئے۔ کیتی نے بھی اپنی باری آنے پر بلاتامل انگوٹھا کمپیوٹر کی مخصوص پلیٹ پر رکھ دیا۔ پلیٹ کھٹ سے کسی کے سینے کی طرح اندر چلی گئی اور دوسرے ہی لمحے گویا ماحول پر چھائی تمام خاموشی ایک دھماکے سے فضا میں تحلیل ہو گئی۔

کمپیوٹر کی چھوٹی سی سکرین پر سبز کے بجائے سرخ روشنی جھلملا اٹھی تھی اور اس کے ساتھ ہی ناخوشگوار حد تک محسوس ہونے والا ایک سائرن بھی چیخ اٹھا۔ محسوس یہی ہوا تھا جیسے کمپیوٹر کا ایک ایک تار ان کے جسموں سے بھی منسلک تھا۔

انھوں نے اٹھیں گنیں۔ مشینی انداز میں سیدھی کرتے ہوئے پوری قطار کو کور کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس سے بھی زیادہ تشویشناک بات یہ تھی کہ اب گیٹ کا وہ عظیم الشان آہنی پٹ بلکی سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ تیز رفتار سے بند ہونے لگا تھا۔

میں نے دیگر تمام عزائم ارادے اور تدابیر بالائے طاق رکھ دیں اور پہلا کام یہ کیا کہ کیتی کو ایک طرف دھکیل کر اپنی تمام تر صلاحیتوں کو مجتمع کرتے ہوئے اس شیر کی طرح چھلانگ لگائی جس کی زندگی کا دارومدار ہی ایک چھلانگ پر رہ گیا ہو۔

میں کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح آہنی گیٹ کے دونوں پٹوں کے درمیان سے گزرا اور اس حقیقت سے روشناس ہوا کہ اگر مجھے چھلانگ لگانے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو پھر یہ کام ناممکن ہی تھا کیونکہ میرے گزرتے ہی دونوں پٹ آپس میں مل گئے تھے اور دوسرے ہی لمحے وہ گولیوں کی بوچھاڑ سے جھنجھنا اٹھے تھے۔ محافظوں کو برسٹ مارنے میں ایک لمحے کی تاخیر ہو گئی تھی۔

میں نے اپنے آپ کو ایک ہموار پہاڑی راستے پر پایا جو بتدریج نشیب میں جا رہا تھا۔ شام کے دھندلکے میں دو چار گز کے فاصلے کی چیزیں بھی کسی ہیولے کی طرح دکھائی دے رہی تھیں۔ راستہ صرف وہی نہیں تھا جس پر میں دوڑ پڑا تھا کچھ اور پگڈنڈیاں بھی مختلف سمتوں میں پھیلی ہوئی تھیں اور کچھ آگے چل کر ان کے دونوں طرف نیم پختہ اور جھونپڑی نما مکانات بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ وہ لوگ مجھ سے پہلے یہاں سے

گزر رہے تھے ان میں سے کچھ تو انہی پگڈنڈیوں پر پیچ چکے تھے اور کچھ مجھ سے پیچھے رہ گئے تھے۔ کچھ یقیناً اپنے گھروں میں بھی پہنچ چکے ہوں گے۔

جو لوگ سائرن اور آہنی گیٹ پر گولیوں کی جھنکار میں پیچھے تھے وہ گھبرا گئے تھے لیکن غالباً وہ نہ تو یہ سمجھ پائے تھے کہ کس کی وجہ سے سائرن بجا ہے ان میں سے ایک پھاٹک کے پار پہنچ چکا ہے اور نہ ہی غالباً انھیں معلوم تھا کہ ان حالات میں انھیں کیا کرنا چاہیے۔ وہ بے چارے محض مزدور یا دوسرے لفظوں میں "غلام" بنائے رہتے تھے جن کا کام بس بندھائے ہوئے مویشیوں کی طرح محنت کرنا اور اپنے "آقاؤں" کے لیے دولت پیدا کرنا تھا۔

سائرن صرف چند سیکنڈ اور بجا اور پھر خاموش ہو گیا۔ میں نے دوڑتے دوڑتے پلٹ کر دیکھا۔ گیٹ کھل چکا تھا اور کچھ متحرک روشنیاں اور انسانی ہیولے اندر چلا گئیں لگاتے اور میری سمت میں دوڑتے نظر آ رہے تھے۔ جس سڑک پر میں دوڑ رہا تھا وہ گویا ایک قسم کی "سرکلر روڈ" تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ بستی کے گرد احاطہ کیے ہوئے تھی۔ اس کے دونوں طرف درختوں کا گھنا سلسلہ تھا۔

میں نے اندر آنے کے لیے ایک گریبے سے کیتی کو چارے کے طور پر استعمال کیا تھا تاہم اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ مجھے اس کی زندگی کی کوئی پروا نہیں تھی۔ میرے کان جو فر کی ٹوپی سے ڈھکے ہوئے تھے ان میں سے ایک میں جو "آلہ سماعت" لگا ہوا تھا اس پر مجھے کیتی کی خیریت کی اطلاع مل رہی تھی۔ مختلف آوازوں کے بے ہنگم شور کے درمیان اس کی تیز تیز آواز مجھے سنائی دے رہی تھی جیسے وہ خاص طور پر مجھے ہی سنانے کے لیے کہہ رہی ہو۔ "میں کہہ تو رہی ہوں...... مجھے کچھ نہیں معلوم...... اس نے مجھے گھنٹوں میں اپنے جال میں پھنسا دیا تھا...... کہہ رہا تھا کہ ایک بہت بڑا خزانہ حاصل کرنے کا چکر ہے اور اگر میں اس کا ساتھ دوں تو ہم دونوں کروڑپتی ہو جائیں گے...... سنو...... دیکھو...... آؤ......"

وہ انگریزی میں بات کر رہی تھی اور غالباً کسی نے تھپڑ مار کر اسے چپ کرایا تھا۔ پھر انگریزی میں ہی اسے ڈانٹا گیا۔ "جب تمھیں لے جائے تب منطق پیش کرنا۔ یہ لیکچر تمھیں منوچی صاحب کے حضور پیش کرنے کے بعد ہی ہوگی۔ تم جھوٹ بول رہی ہو یا سچ......"

مجھے اطمینان ہو گیا کہ ابھی خاصی دیر تک کیتی کی جان کو بہرحال کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔ میں اس وقت جس رفتار سے دوڑ رہا تھا اس سے میں دنیا کے کسی بھی حصے میں منعقد ہونے والا دوڑ کا مقابلہ یقینی طور پر جیت سکتا تھا۔ بستی کے مکانات وغیرہ غالباً مربع صورت میں پھیلے ہوئے تھے کیونکہ میں اچانک ہی ایک موڑ پر جا پہنچا تھا اور ابھی تک اپنی جگہ تھا میں اپنے آپ کو درختوں میں جا چھپنے سے بچانے کے لیے ہی کوشاں تھا کہ میری نظر کونے پر کھڑی ہوئی ایک عجیب و غریب عمارت پر پڑی۔

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ شاید یہ خدمت واچ ٹاور کا کام رہی ہوگی کہ اسی لمحے اس کے بالائی حصے سے جیسے روشنی کا آبشار پھوٹ پڑا۔ بستی پر چھائی ہوئی تاریکی اور کسی کسی مکان کی کھڑکی یا روشن دان میں جھلملاتی ہوئی مدھم سی روشنی بتاتی تھی کہ بستی میں بجلی نہیں ہے اور وہاں چراغوں یا لالٹینوں وغیرہ سے ہی کام چلایا جاتا ہے۔ لیکن اس واچ ٹاور کی بلندی پر فلڈ لائٹس روشن ہوئی تھیں۔

یقیناً اس مینار نما عمارت میں طاقتور جنریٹر اور واچ ٹاور کے دیگر لوازمات بھی موجود تھے۔ میری خوش قسمتی یہ تھی کہ میں فلڈ لائٹس کی رسائی سے چند گز آگے نکل آیا تھا۔ لائٹس آن ہوتے وقت ان کا رخ کچھ اس طرح تھا کہ انہوں نے اس راستے کا بیشتر حصہ منور کر دیا تھا جس پر میں دوڑتا ہوا آیا تھا۔

دوسرے ہی لمحے موڑ سے آگے سڑک کا وہ حصہ بھی روشنی میں نہا گیا جس پر میں جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ صرف موڑ پر چند گز کا ٹکڑا روشنی سے محروم رہ گیا تھا لیکن دونوں زاویوں پر روشنی ہونے والی فلڈ لائٹس ساکت نہیں، متحرک تھیں اور وہ اس انداز میں حرکت شروع کر چکی تھیں کہ یہ حصہ بھی کسی بھی لمحے روشنی میں نہانے والا تھا۔

میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ میں درختوں کے جھنڈ میں جا گھسوں۔ میں نے یہی کیا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ جنگل میں زمین ناہموار ہوگی۔ ایک جگہ میں ...... ٹھوکر کھا کر گرا، چوٹ تو مجھے کم ہی لگی لیکن ایک بار گویا دماغ ہل کر رہ گیا۔ تاہم میں فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا اور زیادہ گھنے درختوں کی طرف دوڑ پڑا۔

ایک جگہ رک کر میں نے سڑک کی جھلک دیکھنے کی کوشش کی لیکن درخت بہت گھنے تھے اور میں جنگل میں اتنا اندر گھس گیا تھا کہ سڑک کی جھلک دیکھنا بھی ممکن نہیں تھا۔ تاہم فلڈ لائٹس کی حرکت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ پھر کچھ آوازوں سے یہ اندازہ بھی ہوا کہ جو لوگ گیٹ کی طرف سے میرے تعاقب میں دوڑے تھے وہ موڑ تک آ پہنچے تھے۔ وہ تعداد میں زیادہ معلوم نہیں ہوتے تھے لیکن مجھے توقع تھی کہ جلد ہی ان کی تعداد میں اضافہ ہو جائے گا۔

میرا خیال تھا کہ وہ پہلے "سرکل" کر کے پاس پہنچ آئے ممکن ضرور جائیں گے اس کے بعد مختلف سمتوں میں پھیل کر کسی باقاعدہ حکمت عملی کے تحت تلاش شروع کریں گے۔ اسی لمحے گولیوں کی تڑتڑاہٹ سنائی دی۔ غالباً کسی غلط فہمی کی بنا پر واچ ٹاور سے مشین گن کے ذریعے باڑھ ماری گئی تھی۔ پھر کچھ لوگوں نے چلا چلا کر ایک دوسرے سے کچھ کہا۔ پہلے میں چونکہ کافی دور نکل آیا تھا اس لیے مجھے یہ آوازیں مدھم سی سنائی دیں اور چند لمحے بعد خاموشی چھا گئی۔ وہ لوگ شاید آگے نکل گئے تھے۔

اسی دوران ایک بار پھر ایئرفون پر مجھے کینی کی آواز سنائی دی۔ "او خبیث! رسیاں تو آہستہ باندھو ...... اور یہ اتنی سخت گرہیں لگانے کی کیا ضرورت ہے ...... میرے ہاتھ پاؤں توڑنے ہیں کیا؟"

"دیکھتی جاؤ تمہارا کیا کچھ ٹوٹے گا ...... ذرا اس بندے کے بچے کو ہاتھ آ لینے دو جو تمہارے ساتھ تھا۔" کسی نے غرا کر کہا۔ "جائے گا کہاں؟" اس وادی میں تو ہم کھوئی سوئی بھی ڈھونڈ نکالتے ہیں۔"

"اس احمق کو معلوم نہیں کس نے خرانٹ کی پٹی پڑھا رکھی تھی۔" کینی نے جھلائی ہوئی آواز میں کہا۔ "ورنہ میں بھی اس کی باتوں میں آ کر اس کے ساتھ ماری جاتی ...... حالانکہ اب مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ اگر یہاں کوئی خزانہ موجود بھی ہے تو ہمیں کم از کم دو تین سو ساتھیوں کے ہمراہ اس وادی پر باقاعدہ حملہ کرنا چاہیے تھا۔"

"اس صورت میں بھی تمہارا زیادہ سے زیادہ ایک ہی آدمی اندر پہنچ پاتا۔ بشرطیکہ وہ بھی اتنا ہی پھرتیلا ہوتا جتنا یہ تھا۔" مردانہ آواز نے جواب دیا۔ "باقی سب کے سب گولیوں سے چھلنی ہوتے۔ حتیٰ کہ تم نے بھی اگر فوری طور پر ہاتھ نہ اٹھا دیے ہوتے تو موت تمہارا بھی مقدر تھی۔"

کینی ہوالے سے کراہ دی۔ اسی لمحے بہت سی ملی جلی ناقابل فہم آوازوں کی بھنبھناہٹ سنائی دینے لگی۔ گویا ابھی میں کینی کے گلے میں موجود لاکٹ میں چھپے ہوئے ٹرانسمیٹر کے حلقہ عمل سے نکلا نہیں تھا۔ ایک اندازہ مجھے یہ بھی ہوا کہ جس وقت میں نے گیٹ سے اندر چھلانگ لگائی تھی اس وقت وہاں صرف وہی دو محافظ موجود نہیں تھے جو مجھے نظر آئے تھے۔ کہیں نہ کہیں کچھ اور لوگ بھی موجود تھے کیونکہ کچھ محافظ میرے تعاقب میں دوڑے تھے اور کچھ وہیں کینی کے پاس موجود تھے۔ یہ محافظ بھی یقیناً عام سے آدمی نہیں تھے جو انگریزی بولتے تھے۔ وہ یقیناً حشمت علی خان کے خاص آدمیوں میں سے تھے۔ جن لوگوں کو میں نے کھیتوں سے آتے دیکھا تھا۔ وہ انگریزی سے نابلد ہی نظر آتے تھے۔

جب آوازیں تقریباً معدوم ہو گئیں تو میں نے اپنے ڈھیلے ڈھالے کپڑوں کی بہت سی جیبوں میں سے ایک جیب کو ٹٹولا۔ اس سے ایک مخصوص ساخت کی چھوٹی سی فلیش لائٹ نکال کر میں نے روشن کر کے ایک مخصوص جگہ پر رکھی۔ اس کی روشنی دائرے کی صورت میں ایک محدود سی جگہ پر پڑ رہی تھی۔ میں نے اپنے لباس کے نیچے سینے پر بندھا ہوا ایک چپٹا سا ڈبا نکال کر روشنی کے اس دائرے میں لا کر کھولا ......

ذہانت کا امتحان ۔ گن ماسٹر

محمود احمد ۔۔۔ مودی

اس قصبے میں اشٹین گن کے پرزے اور ایک مخصوص ساخت کا اسکریو ڈرائیور موجود تھا۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہی تھا کہ جیسے ہی میں نے گن اسمبل کرنا شروع کی' اپنے ایئرفون پر بھی مجھے گن کا ہی تذکرہ سنائی دیا۔ کوئی دوسرا محافظ کیٹی سے کہہ رہا تھا...... "بڑی زبردست گن سینے سے لگا رکھی ہے اور وہ بھی پرزوں کی صورت میں۔ ویسے تو بڑی معصوم بن رہی تھیں......"

"بس سنے کب معصومیت کا دعویٰ کیا ہے۔" کیٹی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "تمیں یہاں خزانے کی تلاش میں آئی تھی' کسی کی سالگرہ کی تقریب میں شرکت کرنے کے لیے نہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ میں پھولوں کے ہار ساتھ لے کر آتی۔"

میں نے اس گفتگو سے دھیان ہٹا لیا اور گن اسمبل کرنا شروع کردی۔ گن اسمبل کرنے میں مجھے صرف ایک منٹ اور لگا۔ اسے قمیص کے نیچے پیٹی میں اڑس کر میں نے اپنے دیگر ہتھیار چیک کیے۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ پر موجود تھے۔ فلیش لائٹ بجھا کر میں نے جیب میں ڈالی اور ایک سمت کا تعین کرنے دوڑ پڑا۔ جنگل کی تاریکی میں یوں بھاگتے ہوئے میں اپنے آپ کو زمانہ قدیم کا کوئی وحشی محسوس کر رہا تھا۔

وادی کی طرف سے وقفے وقفے اور مختلف فاصلوں سے سنائی دینے والی کچھ آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ سکوت اب درہم برہم ہو چکا ہے اور میری تلاش کی مہم زور پکڑتی جا رہی ہے۔ دوڑتے دوڑتے میں واپس جنگل کے اس حصے میں آگیا جہاں سے سڑک اور سڑک کے پرلی طرف بکھرے ہوئے مکانات نے قریب تر دکھائی دیتے تھے۔ مجھے لگتا تھا کہ ادھر آیا ہو رہا ہے۔

میرا اندازہ درست ہی تھا۔ بستی کے چاروں کونوں پر ہی واچ ٹاور موجود تھے اور ان سب سے جس طرح روشنی پھیلتی جا رہی تھی اس سے گویا بستی کے گرد روشنی کا ایک متحرک ہالہ سا قائم تھا۔ میں ایک درخت کے عقب سے کچھ دیر سڑک کا جائزہ لیتا رہا۔ اندر بستی میں یقیناً ہلچل شروع ہو چکی تھی۔ میں سڑک کے متوازی کچھ اور آگے چلا گیا۔ مجھے کسی ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں داخل ہونا بے حد دشوار نظر آئے تاکہ وہاں میری موجودگی کا شبہ نہ کیا جاسکے اور اس جگہ کا تعلق اسی شخصیت سے ہوتا جس کے بارے میں میں سوچ رہا تھا تو پھر سونے پر سہاگے والی بات ہوتی۔

مجھے مزید کئی فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ صرف ایک جگہ مجھے کچھ فاصلے پر ایک ٹولی آتی دکھائی دی۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں اور وہ متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے جا رہے تھے۔ کبھی کبھی وہ گپ شپ کے سے انداز میں باتیں بھی کرنے لگتے تھے۔ ان میں سے چند کو میں نے قہقہہ بھی لگاتے سنا۔ میرے لیے باعث حیرت یہ تھا کہ ان میں سے کوئی بھی جنگل کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ رہا تھا جو چھپنے کے لیے بہترین جگہ تھی۔

پھر میں نے ان میں سے چند ایک کو گزرتے دیکھا۔ وہ لوگ مختلف مکانوں پر دروازوں پر دستکیں دینے لگے تھے۔ باقی آگے بڑھ گئے تھے میں جنگل میں کچھ اندر چلا گیا اور اندازاً سڑک کے متوازی چلنے لگا۔ میں جب دوبارہ سڑک کے قریب نکلا تو مجھے ان میں سے کوئی نظر نہ آیا۔ البتہ کچھ فاصلے پر مجھے ایک مکان نظر آیا جو اپنے مقصد کے لیے مجھے بے حد موزوں معلوم ہوا۔

یہ مکان دیگر تمام مکانوں کی قطاروں سے کچھ ہٹ کر تھا اور صرف یہ ہی نہیں خاصا طویل و عریض بھی تھا۔ ابھی تک پوری بستی میں مجھے یہی مکان ممتاز نظر آیا تھا۔ صرف اس لیے نہیں کہ وسعت یا طرز تعمیر کے لحاظ سے اس کے مکینوں کی آسودہ حالی عیاں تھی بلکہ کئی اور پہلوؤں سے بھی اس کی اہمیت میرے پیش نظر تھی۔

اس مکان کی چار دیواری زیادہ اونچی نہ تھی مگر اس پر خاردار تار لگا کر اسے اونچا کیا گیا تھا۔ چار دیواری کے اندر خاصا وسیع چو طرفہ لان نما حصہ تھا۔ اصل عمارت اس کے وسط میں تھی جو زیادہ بڑی نہیں تھی۔ اگر اس کے گرد وپیش سے قطع نظر اسے دیکھا جاتا تو وہ اوسط درجے کا ایک چھوٹا سا دو منزلہ مکان تھا۔ طرز تعمیر کچھ جاپانی سا تھا۔ اصل عمارت تو اندھیرے میں ہی ڈوبی نظر آرہی تھی۔ لیکن اس کے اردگرد لان نما حصے پر خوب روشنی پھیلی ہوئی تھی اور یہ روشنی برقی جنریٹروں کی پیداوار تھی یہاں تو میں نے رات کے سکوت میں نہایت مدھم سی گھرگھراہٹ بھی سنی جو غالباً کسی بیس میں بند جنریٹر کی تھی۔

سب سے خاص بات یہ تھی کہ اس مکان کے گیٹ پر دو مسلح محافظ موجود تھے۔ جہاں میں موجود تھا وہاں سے مجھے لان کے بیشتر حصے اور اندرونی دروازہ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ اس پر بھی دو محافظ موجود تھے۔ میں چند منٹ وہاں کھڑا صورت حال کا جائزہ لیتا رہا۔ مکان کے عقب سے مجھے دو اور محافظ بھی گشت لگاتے دکھائی دیئے۔ ان کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اصل عمارت کے گرد چکر لگا رہے ہیں۔

اندرونی دروازے پر تعینات محافظوں نے قریب جا کر انہوں نے رازدارانہ انداز میں کچھ باتیں کیں پھر آگے بڑھے۔ سب سے پہلا مسئلہ گیٹ پر موجود محافظوں کا صفایا تھا۔ بہرحال اس فیصلے پر تو میں پہنچ ہی چکا تھا کہ میری مہم کا پہلا مرحلہ اسی مکان میں داخل ہونا

تھا۔ غالباً یہی وہ کان تھا جس کی مجھے تلاش تھی۔

گھنٹی کی آواز وقفے وقفے سے مجھے اب بھی ایئرفون پر سنائی دے جاتی تھی۔ وہ جان بوجھ کر اس طرح مکالمہ کرا رہی تھی کہ مجھے صورت حال کا کسی حد تک اندازہ ہوتا رہے۔ اس وقت تک مجھے یہی اندازہ ہو پایا تھا کہ اسے کہیں سے جانے کے لیے فی الحال باندھ کر کسی کیبن نما کمرے میں ڈال دیا گیا تھا۔

میں نے گیٹ پر موجود محافظوں اور اپنے درمیان حائل فاصلے کا جائزہ لیا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ اتنے فاصلے پر میری ڈارٹ گن کی سوئیاں انہیں ہلاک کر سکیں گی۔ البتہ اگر میں اس درخت کے عقب میں پہنچ جاتا جو عین سڑک کے درمیان ہی موجود تھا تو سوئیوں کا موثر طاقت کے ساتھ ان تک پہنچنا اور جسم میں پیوست ہونا ممکن تھا۔

میں چونکہ سڑک سے قدرے بلندی پر تھا اور محافظ اس طرف نہیں دیکھ رہے تھے' اس لیے مجھے مذکورہ درخت تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ سینے کے بل لیٹ کر میں نے ڈارٹ گن سے پہلے ایک محافظ کے رخسار کا نشانہ لیا۔ اس کے گال خوب پھولے پھولے نظر آ رہے تھے۔

ڈارٹ گن فائر کرتے وقت ہلکی سی "ٹھک" کی آواز پیدا کرتی تھی کیونکہ اس میں ہر بار ٹریگر دبانے پر ایک چھوٹے سلنڈر میں ہوا بھرتی تھی اور اس کے دباؤ سے سوئی نشانے پر جا لگتی تھی۔ معلوم نہیں یہ اس آواز کا اثر تھا یا رخسار میں سوئی پیوست ہونے کا کہ وہ محافظ بری طرح اچھل پڑا اور اس کا ہاتھ رخسار پر آن جما۔ دوسرا محافظ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا مگر اس سے پہلے کہ وہ حرکت میں آتا خود اس کا اپنا ہاتھ بھی رخسار پر پہنچ گیا۔

رخسار سے ہاتھ ملتے ہی وہ دونوں ڈھیر ہو گئے۔ بمشکل تین یا چار سیکنڈ بعد وہ ساکت ہو چکے تھے۔ میں نے چند سیکنڈ مزید انتظار کیا۔ پھر ادھر ادھر کا جائزہ لے کر سڑک عبور کرکے گیٹ کے قریب چار دیواری تک پہنچا۔ گیٹ کے ستونوں اور دیوار کے درمیان اتنا خلا موجود تھا کہ میں اس سے نہ صرف اندرونی دروازے کو جائزہ لے سکتا تھا بلکہ ڈارٹ گن کی نالی بھی اس میں داخل کر سکتا تھا۔

وہ دونوں محافظ اس وقت سرگوشیوں میں آپس میں باتیں کر رہے تھے اور بار بار گیٹ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شاید انہوں نے باہر والے محافظوں کے گرنے کی آواز سن لی تھی یا ان کی چھٹی حس انہیں کسی خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔ میں نے انہیں بھی ٹھکانے لگانے میں تاخیر مناسب نہ سمجھی اور موت کا پیغام لے کر چلنے والی دو سوئیاں ان پر بھی پھینک دیں۔

عین اس وقت جب وہ اپنے اپنے گلے سے سوئیاں نکالنے کی کوشش کرتے ہوئے اور

کسی خوابیدہ بلی کی طرح خرخر کی سی آوازیں نکالتے ہوئے ڈھیر ہو رہے تھے' مکان کے کونے پر وہ دو محافظ بھی نمودار ہو گئے جو گشت پر تھے اور انہوں نے ان کو گرتے ہوئے دیکھ لیا۔ انہیں فوراً کسی گڑبڑ کا احساس ہو گیا لیکن اضطراری کیفیت کا شکار ہونے کی وجہ سے وہ کوئی صحیح قدم نہیں اٹھا سکے۔

انہیں سب سے پہلے پوزیشن سنبھالنی چاہیے تھی۔ اس کے بجائے وہ رائفلیں سیدھی کرکے محافظوں کی طرف دوڑ پڑے' جو دروازے کے آگے پختہ روش پر ڈھیر ہو چکے تھے۔ عین ممکن تھا کہ وہ احمق شور بھی مچانا شروع کر دیتے۔ میں نے ان کی پشت اور گردنوں پر کئی کئی سوئیاں داغ دیں۔ وہ اپنے ساتھیوں تک پہنچ تو گئے لیکن ان کی کوئی مدد کرنے یا حقیقت کا سراغ لگانے کے بجائے خود بھی ان پر ڈھیر ہو گئے۔ میں بے حد مسکرایا۔

اب میں گیٹ کی طرف متوجہ ہوا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس پر باہر کی طرف سے تالا پڑا ہوا ہے۔ اس کی چابی مجھے قریب ہی پڑے محافظوں میں سے ایک کی جیب سے مل گئی اور میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر تالا کھول کر اندر پہنچ گیا۔ محافظوں کی لاشیں بھی اندر گھسیٹ کر میں نے گیٹ بند کر دیا۔ گیٹ کو بے آواز طریقے سے کھولنے اور بند کرنے میں ہی مجھے زیادہ وقت لگا۔ اس دوران میں مکان کی طرف بھی متوجہ رہا' لیکن اس پر سکوت ہی طاری تھا۔

ایک لمحے کے لیے تو میں الجھ گیا۔ کہیں میں ایک خالی مکان پر ہی تو وقت ضائع نہیں کر رہا؟ لیکن پھر میں نے یہ سوچ کر ذہن کو تسلی دی کہ محافظ خواہ کتنے ہی فرض شناس کیوں نہ ہوں لیکن جس وقت مکان خالی ہوتا ہے اس وقت وہ اتنی باقاعدگی سے پہرا نہیں دیتے اور نہ ہی اتنے مستعد نظر آتے ہیں' جتنے یہ بے چارے نظر آ رہے تھے۔

ان چھ لاشوں کو ایک جگہ دیوار کے ساتھ لگا کر میں دیوار ان کی وجہ سے پیدا ہونے والی اندھیرے کی پٹی پر چلتا مکان کے عقب میں پہنچا۔ ادھر میری توقع کے مطابق عقبی دروازہ تو موجود تھا' لیکن میری توقع کے برخلاف وہاں دو مزید محافظ بھی موجود تھے۔ میں شاید اچانک ہی ان کے سامنے جا پہنچتا' کیونکہ وہ دروازے کے قریب ہی بنی ہوئی ایک محراب کی میں کھڑے تھے۔

دفعتہً ان میں سے ایک محراب نما حصے سے نکل آیا۔ دوسرا کچھ کہتے ہوئے اس کے پیچھے لپکا اور میں بروقت دیوار سے چپک گیا۔ وہ مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھے۔ اگر میں دیوار سے مزید ایک انچ بھی آگے کھسکتا تو وہ مجھے دیکھ سکتے تھے۔ وہ میری ہی طرف آ رہے تھے۔ اس لیے مجھے ایک بار پھر اپنی ڈارٹ گن کو زحمت دینا پڑی۔ ورنہ میں عین دیوار کے زیر سایہ کھڑے ہو کر ذرا سی بھی آواز پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔

ان میں سے ایک نے کچھ اس قسم کی آواز نکالی جیسے اپنے ساتھی سے کہنا چاہتا ہو۔

"دیکھ ...... میں نہ کہتا تھا کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔" اس نے اپنے کندھے سے رائفل بھی اتارنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کا یہ عمل ادھورا رہ گیا۔ گولیاں واقعی اتنی سریع اثر تھیں جیسے سائنائیڈ کسی چیز میں ملائے بغیر براہ راست زبان پر رکھ لیا گیا ہو۔

میں دل ہی دل میں وارث گن کے موجد کو داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ تقریباً تین منٹ میں اس مکان کی حدود میں آٹھ لاشیں گر چکی تھیں مگر سکون ذرا بھی متاثر نہ ہوا تھا۔ اس لحاظ سے یہ چیز مجھے اس اسٹین گن سے بھی زیادہ فائدہ مند محسوس ہوئی تھی جو میں نے شلوار میں اڑس رکھی تھی اور جو چلتے وقت مجھے خاصی تکلیف دہ حد تک چبھ رہی تھی۔ بہرحال اسٹین گن کا یہ فائدہ ضرور تھا کہ وہ مارتی بھی تھی اور دہشت زدہ بھی کرتی تھی۔

وارث گن کا استعمال بہرحال محدود تھا۔ ہر جگہ وہ کام نہیں دے سکتی تھی۔ ان دونوں لاشوں کو بھی دیوار کے ساتھ لگانے کے بعد میں عقبی دروازے پر پہنچا۔ اب میں نے وارث گن جیب میں رکھ لی اور اس ہاتھ میں سوئچ نکال کر تھام لیا تھا۔ جو اب تک میری پنڈلی سے بندھا ہوا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں میں نے اپنا وفادار خنجر سنبھال لیا۔ اس کے بعد میں نے محتاط انداز میں ایک طرف کو ہٹتے ہوئے جوتے کی نوک سے دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔

دروازہ کھلا تھا۔ اندر بلا کا اندھیرا تھا، جیسے موت منہ کھولے کھڑی ہو۔ دروازہ کافی حد تک وا کرنے کے بعد بھی میں دیوار سے چپکا کھڑا رہا، لیکن کوئی رد عمل ظاہر نہ ہوا۔ تب میں نے اندر قدم رکھ دیا اور دروازے کے قریب ہی دروازے سے چپک گیا۔ مزید چند لمحے انتظار کے بعد میں نے دروازہ آہستگی سے بند کر دیا۔

میری حسیات مجھے بتا رہی تھیں کہ اس کمرے میں کوئی نہیں ہے۔ فرنیچر نام کی بھی کوئی چیز وہاں نہیں تھی۔ میں دیوار ہی کے ساتھ رینگتا ہوا ایک اور دروازے تک پہنچا۔ یہ بھی مجھے کھلا ہی ملا لیکن جیسے ہی میں اس کمرے میں داخل ہوا ...... لائٹ آن ہو گئی۔

مجھے کمرے میں قدم رکھتے ہی احساس ہو گیا تھا کہ یہاں کچھ ہو گا لیکن اس وقت تک بہرحال میں قدم رکھ چکا تھا۔ فوری طور پر میں گھٹنوں کے بل گر گیا لیکن اسی لمحے ایک مدھم آواز سنائی دی جسے سرگوشی بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہوا کہ اسے میرے علاوہ کوئی اور بھی نہیں سن سکتا تھا۔

یہ آواز تضادات کا مجموعہ تھی۔ اس میں موسیقیت بھی تھی اور کچھ کھردراپن بھی، التجا بھی تھی اور اندیشہ بھی۔ نہایت شستہ انگریزی میں کہا گیا تھا۔ "جلد بازی میں کچھ مت کر بیٹھنا۔"

مجھے ہتھیار پھینکنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ اس لیے میں نے اندھا دھند کچھ کر گزرنے کے بجائے ذرا بہتر طور پر اس شخصیت کا جائزہ لینے کو ترجیح دی جس کی زبان سے یہ الفاظ

نکلے تھے۔ وہ ایک عجیب و غریب عورت تھی۔

عجیب و غریب اس لحاظ سے کہ آواز کی طرح اس کی شخصیت بھی تضادات کا مجموعہ تھی۔ کہنے کو تو وہ عورت ہی تھی مگر اس کا قد شاید چھ فٹ سے کسی طرح بھی کم نہیں تھا۔ اس کے ہاتھ پیروں سے بیک وقت مضبوطی بھی عیاں تھی اور نزاکت بھی۔ اس کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں شفقت اور مہربانیوں کے سائے بھی تھے اور سنگدلی و نامہربانی کی کرختگی بھی۔ تاہم اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ مجموعی طور پر وہ ایک بے پناہ خوبصورت عورت تھی۔ صبیح رنگت، کتابی چہرہ، رخساروں کی ہڈیاں کچھ ابھری ہوئی تھیں لیکن لمبی پلکوں سے مزین بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کی وجہ سے ہڈیوں کا ابھار بے حد خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔

اس کے ترشے ہوئے رسیلے ہونٹوں کے گوشوں پر خفیف سا کھنچاؤ تھا جو اس کی طبیعت میں چھپی ہوئی سفاکی کی نشاندہی کرتا تھا۔ اس کے بال کٹے ہوئے تھے ...... اور بے ترتیبی سے اس کی پیشانی پر جھکے ہوئے تھے، لیکن اس بے ترتیبی نے اس کے حسن اور دلکشی میں اضافہ کیا ہوا تھا۔

وہ تقریباً پوری چست سوتی کپڑے کی ایک ڈھیلی ڈھالی شرٹ اور اسی سے ملتے جلتے لیکن مختلف رنگ کے کپڑے کی پتلون پہنے ہوئے تھی۔ پتلون کے پائنچے اور شرٹ کی آستین چڑھی ہوئی تھی اور اس کی مضبوط اور پرکشش کلائیاں اس بھاری بھرکم وکٹورین اسٹائل کی کرسی کے ہتھوں پر ٹکی ہوئی تھیں، جس پر اس وقت وہ نیم دراز تھی ...... اس کے ایک پاؤں میں موزے کا جوتا تھا۔ دوسرا جوتا کرسی سے کچھ دور پڑا تھا۔

اس کی عمر پینتیس سال سے کم تو نہیں رہی ہوگی لیکن اس کے خدوخال پر نوخیزی و کم عمری کی شگفتگی تھی۔ صرف اس کی آنکھوں کی پختگی اور جسمانی انحنا اس شگفتگی کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ ورنہ وہ بے حد کم عمر لڑکی معلوم ہوتی، لیکن خصوصیات کا تضاداتی ملاپ بھی بے حد خوبصورت اور حیران کن تھا۔ اس سے مجھے کوئی تعجب نہیں ہوا بھی سوائے اس کے کہ وہ اس بڑی کی طرح تھی جو خود ہی اپنی ماں بھی معلوم ہوتی ہو۔

"دروازہ بند کر دو اور اطمینان سے اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔" اس کا سرگوشی نما مکالمہ سن کر ایک بار پھر نہ جانے کیوں میرا دل اور محسوسات کچھ الجھن میں پڑنے لگے۔

میں نے لات مار کر دروازہ تو بند کر دیا لیکن اٹھ کھڑے ہونے والی ہدایت پر عمل نہیں کیا۔ اس کے بجائے میں دیوار سے ٹیک لگا کر قالین پر بیٹھ گیا۔ خنجر اور ریوالور بدستور میرے ہاتھ ہی میں تھے... کیونکہ میں یہ دیکھ چکا تھا کہ عورت کے پاس نہ تو کوئی ہتھیار وغیرہ نظر آ رہا تھا اور نہ ہی جیب وغیرہ میں موجودگی کے آثار نظر آ رہے تھے۔

وہ کمرہ جس میں ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا، کچھ عجیب سے انداز میں سجا ہوا تھا۔

جیسے کسی دولت مند نے دنیا کے کسی دور دراز گوشے میں گھر بنوایا ہو اور وہیں جو کچھ بھی اچھی سے اچھی چیز دستیاب ہو سکی ہو اس سے گھر کو آراستہ کر لیا ہو۔ قالین نہایت دبیز اور کھڑکیوں پر پڑے ہوئے پردے موٹے موٹے اور کچھ شاہانہ قسم کے تھے لیکن فرنیچر کچھ ایسا تھا جیسے نہایت پرانی اشیاء فروخت کرنے والی کسی دکان سے خریدا گیا ہو۔ ایک بات میں نے خاص طور پر محسوس کی کہ پردے وغیرہ کھڑکیوں پر اس انداز سے کھینچے تھے اور روشن دانوں کو اس انداز میں بنایا گیا تھا کہ روشنی باہر نہ جانے پائے۔

مجھے کمرے کا جائزہ لیتے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی محض ایک رمق ابھری۔ سرگوشی نما مکالمے نے ایک بار پھر میری سماعت کو نوازا۔ "مجھے معلوم تھا کہ تم نہیں آؤ گے ...... میں اس وقت ایک کھڑکی کی درز سے تمہیں دیکھ رہی تھی جب تم محافظوں کی لاشیں ٹھکانے لگا رہے تھے۔ اس وقت میں چاہتی تو ان لاشوں میں تمہاری لاش بھی شامل ہو سکتی تھی' لیکن مجھے فوراً ہی احساس ہوا کہ یہ تو میری بہت بڑی غلطی ہو گی ......"

اس نے مکالمے کو تشنہ چھوڑ کر شرٹ کی سامنے والی جیب میں ایک ہاتھ ڈالا اور دوسرا ہاتھ اٹھا کر گویا مجھے خبردار کرتے ہوئے بولی۔ "گن وغیرہ مت چلانا۔ میں جیب سے کوئی ہتھیار نہیں' سگار نکالنے لگی ہوں۔"

اس نے ایک چھوٹا لیکن موٹا سا سگار نکالا۔ اس کا سرا دانتوں سے توڑ کر قالین پر پھینکا اور دوسری جیب سے لائٹر نکال کر اسے سلگایا۔ اس نے اتنا طویل کش لے کر دھواں اگلا کہ ایک لمحے کے لیے تو مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ پورا کمرہ ہی دھویں سے بھر جائے گا۔ کسی عورت کو سگار پیتے میں نے پہلی بار دیکھا تھا اور وہ بھی اتنی لگن سے گویا ایک ہی کش میں سگار ختم کر دینا مقصود ہو۔

اس کی باتیں الجھی الجھی سی تھیں۔ میں نے بولنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ وہ دوبارہ خبردار کرنے کے سے انداز میں ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولی۔ "میری ہی طرح نیچی آواز میں بولنا۔ برابر کے کمرے میں میرا شوہر موجود ہے گو کہ وہ کچھ سننے یا سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں ہے لیکن احتیاط بہرحال اچھی چیز ہے۔"

میں نے سردست کچھ کہنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور متوقع نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"حلیہ تو تم نے یہیں والوں جیسا بنا رکھا ہے۔" وہ بولی۔ "لیکن آئے بہرحال کہیں اور سے ہو۔ کیا نام ہے تمہارا؟"

"کیا میری صورت پر لکھا ہے کہ میں کہیں اور سے آیا ہوں؟" میں نے پہلی بار زبان کھولی۔

اس نے ایک طویل سانس لیا اور گہری نظر سے میری طرف دیکھا۔ اس نظر میں میرے لیے ایک خاص دلچسپی کی جھلک موجود تھی اور اس بات کو محسوس کرتے ہوئے نہ جانے کیوں میری دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ دل کی یہ خفیف سی اتھل پتھل میرے لیے باعث حیرت تھی۔

"یہ ٹھیک ہے کہ مجھے ایک طویل عرصے سے اپنی بستی میں آزادانہ پھرنے کا موقع نہیں ملا۔" وہ بولی۔ "اور مجھے بستی کے ہر فرد کی صورت بھی یاد نہیں رہ سکتی' لیکن مجھے اتنا ضرور معلوم ہے کہ صورتیں اگر یہ نہیں بتا سکتیں کہ ان کا تعلق کس جگہ سے ہے تو کم از کم یہ ضرور بتا سکتی ہیں کہ ان کا تعلق اس جگہ سے نہیں ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہو؟"

"سمجھ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اب اتنا نا سمجھ بھی نہیں ہوں۔"

"ہاں ..... اب یہ میں تم سے متفق ہوں۔" وہ ایک بار پھر مسکرائی۔ "کم عمر ضرور ہو لیکن نا سمجھ نہیں۔ تم نے بڑی صفائی سے میرا سوال گول کر دیا ہے۔ بہرحال ......"

اس نے نہایت ہی خوبصورت انداز میں کندھوں کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔ "اگر تم نہیں بتانا چاہتے تو مت بتاؤ۔ لیکن میں تمہیں اس سرزمین پر خوش آمدید کہتی ہوں۔ تم تازہ ہوا کے ایک جھونکے کی طرح آئے ہو۔ اب تو میرا بہت ہی دم گھٹنے لگا تھا اور میں اس زندگی پر موت کو ترجیح دینے کے بارے میں سوچنے لگی تھی ..... زندگی بہت ہی گراں گزرنے لگی تھی۔ حالانکہ بظاہر کوئی تکلیف بھی نہیں ......"

میری الجھن دوچند ہو گئی۔ وہ مجھے خوش آمدید کہہ رہی تھی۔ ویسے تو خیر یہ کچھ ایسا بعید از امکان بھی نہیں تھا۔ شوہر کی اپنی ایک شخصیت ہوتی ہے اور بیوی کی اپنی۔ بعض اوقات بیوی شوہر کی بداعمالیوں اور مجرمانہ سرگرمیوں میں ایک عرصے تک شریک رہتی ہے' مگر زندگی کے کسی موڑ پر اس کا ضمیر بیدار ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے اسی طرح یہ عورت بھی خواہ مخواہ اپنی مرضی سے حشمت علی خان کا ساتھ دیتی رہی ہو' لیکن اب یہ سب کچھ اس کی برداشت سے باہر ہو گیا ہو۔

"...... لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ یہ عورت مجھے جال میں پھانس رہی ہو!" میں نے سوچا۔ وہ بھی بھی ایسی چیز۔ بڑے بڑے پتھر کے صنم بھی اس کی ایک جنبش ابرو سے موم کی طرح پگھل سکتے تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس کے بارے میں یقین سے کچھ کہنا مشکل تھا۔ میرے جیسے انسان کے لیے بھی اس کی تہہ میں اترنا مشکل تھا۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ اندر سے وہ کیا تھی' کیا سوچ رہی تھی اور کیا کرنا چاہتی تھی۔

میں نے محتاط لہجے میں کہا۔ "تم بہت ذہین نظر آتی ہو لیکن کیا حشمت علی خان سے شادی کرتے وقت تمہاری ذہانت نے تمہیں خبردار نہیں کیا تھا کہ تمہاری زندگی میں بھی ایسا

مورا بھی آسکتا ہے؟"

"حشمت علی خان سے شادی؟" اس کی روشن پیشانی پہ بھی نی شکنیں ابھر آئیں۔ پھر وہ دھیرے سے ہنس دی اور میرے اعصاب میں جیسے گدگدی سی ہونے لگی۔

"شاید تم مجھے حشمت علی خان کی بیوی سمجھ رہے ہو؟" وہ بولی۔ "اس خبیث کی بیوی نہیں ہوں۔ ویسے بھی کسی ایک باضابطہ اور باقاعدہ بیوی کی کیا ضرورت ہے۔"

مجھے حیرت کا جھٹکا سا لگا۔ وہ حشمت کی بیوی نہیں تھی تو کون تھی؟ لیکن اس سے پہلے کہ میں اس سے کوئی سوال کرتا اس نے مجھ سے پوچھ لیا۔ "تو تم اس گھر کو حشمت علی خان کی رہائش گاہ سمجھ کر گھسے تھے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ جیسے کسی بچے کی معصومانہ شرارت پہ مسکرا دی اور بولی۔ "درامست قدم اٹھانے سے کچھ زیادہ ہی عادی معلوم ہوتے ہو۔ حیرت ہے کہ اس قدر کم معلومات کے باوجود تم یوں اس وادی میں گھس پڑے۔ تمہاری اس جرات پہ تمہیں سلام کرنے کو بھی جی چاہتا ہے اور اس امر پہ دیوتاؤں کا شکریہ بھی ادا کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تم کسی غلط جگہ نہیں گھس گئے۔ تمہاری اطلاع کے لیے بتائے دیتی ہوں کہ حشمت علی خان کے گھر میں گھسنا اس سے کہیں زیادہ مشکل کام ہے۔ اس کے تمام محافظوں کو ہلاک کرنے کے بعد بھی تم اندر نہیں جاسکتے۔ جب تک وہ خود تمہیں اندر نہ بلانا چاہے اور پھر وہ اپنے مکان کی اصل عمارت میں بھی نہیں رہتا' تہہ خانے میں رہتا ہے......"

میری الجھن بڑھ رہی تھی۔ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "خیر..... اب حشمت علی خان کو گولی مارو۔ یہ بتاؤ کہ تم کون ہو؟"

"حشمت علی خان اس بستی کا متوجی ہے۔ شاید تمہیں علم نہ ہو کہ متوجی......"

"مجھے معلوم ہے کہ متوجی کیا ہوتا ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"تو پھر تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ پائی کیا ہوتا ہے۔" وہ پہلو بدلتے ہوئے بولی۔ گفتگو کے وقفہ پاتے ہی وہ سگار کا کش لینا نہیں بھولتی تھی۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولی۔ "میں اسی بستی کے سابق پائی کی بیوی ہوں۔ سینڈریلا میرا نام ہے۔ میں یورپین ہوں۔" وہ مسکرائی۔ لیکن اس بار اس کی مسکراہٹ میں حزن و یاس کا پرتو تھا۔ "ایک تو وہ بچوں کی کہانیوں والی سینڈریلا تھی' جس کی جوتی کھو گئی تھی۔ میں وہ سینڈریلا ہوں جس کا سب کچھ ہی کھو گیا ہے۔"

"اوہ....." میں نے ایک طویل سانس لیا۔ اب بات صاف ہو گئی تھی۔ یہ سابق پائی کی بیوی تھی۔ جسے غالباً زبردستی "سابق" بنا دیا گیا تھا۔ "میرے خیال میں تو پائی کی بیوی کو کوئی سیدھی سادی ان پڑھ پہاڑی عورت ہونا چاہیے تھا۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔ "تم تو بہت ہی اونچی مخلوق ہو۔ انگریزی بھی نہایت عمدہ بولتی ہو۔"

"میں آکسفورڈ کی پڑھی ہوئی ہوں۔" وہ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ "میں تو تمہیں پائی بھی آکسفورڈ کا پڑھا ہوا ہے۔ وہ کوئی معمولی آدمی نہیں۔ اس کا خاندان صدیوں سے اس قبیلے کا سردار چلا آرہا تھا۔ بس کا بہت قلیل سا حصہ اس وادی میں آکر آباد ہوا تھا۔ بعد میں معلوم نہیں یہاں کون کون آکر گھس گیا۔ بہت گند پڑ گیا یہاں۔ ہماری پرسکون زندگی میں زہر گھل گیا۔"

"کچھ تفصیل سے بتاؤ۔" میں نے فرمائش کی۔

"تفصیل میں کیا رکھا ہے۔" وہ سر کو خفیف سا جھٹکا دے کر بولی۔ "اختصار میں بھی بات وہی ہے۔ تین سال پہلے تک پائی ہی بستی کا سردار تھا۔ متوجی کی حیثیت رسمی سی ہوتی تھی۔ وہ ایک طرح کا مذہبی رہنما ہوتا تھا۔ پائی اگر ضروری سمجھتا تو کسی معاملے میں اس سے مشورہ کر لیتا تھا' لیکن اس کے مشوروں پہ عمل کرنے کا پابند نہیں ہوتا تھا۔ تاہم وہ اپنی ہر دلعزیزی اور مقبولیت ثابت کرنے کے لیے سال میں ایک مرتبہ رائے شماری کروا لیتا تھا' تاہم وہ رائے شماری کے نتائج کو بھی تسلیم کرنے کا پابند نہیں ہوتا تھا۔ اس سے اسے صرف اپنی مقبولیت کا اندازہ کرنے میں مدد ملتی تھی۔ اگر وہ محسوس کرتا تھا کہ اس کی مقبولیت کم ہو رہی ہے تو وہ اپنی اصلاح کے لیے ضروری اقدامات کرتا تھا۔ مشیروں کی خدمات حاصل کرتا تھا لیکن ....."

اس نے متفکرانہ سی نظروں سے اپنے سگار کو دیکھا جو کافی مختصر ہو چکا تھا' لیکن ابھی وہ اس کا پیچھا چھوڑنے پہ قطعی تیار نظر نہیں آتی تھی۔ حسب عادت ایک طویل کش لے کر اس نے جملہ مکمل کیا۔ "لیکن پھر نہ جانے کس طرح حشمت علی خان یہاں آیا اور متوجی بن بیٹھا اور پھر ہر چیز الٹ ہو گئی۔ وادی کی آبادی بہت بڑھ گئی۔ پھر یہاں حشمت علی کا باپ شرافت علی بھی آگیا۔ انہوں نے طاقت کے ذریعے پائی کو ایک طرف بٹھا دیا۔ صرف طاقت ہی نہیں' انہوں نے کچھ اور حربے بھی استعمال کیے۔ پائی کے اصل اختیارات شرافت علی کے پاس چلے گئے۔ یہاں عجیب عجیب دھندے ہونے لگے۔ عجیب عجیب ساز و سامان آنے لگا۔ اقتدار اعلیٰ متوجی کے پاس چلا گیا اور پائی کی حیثیت رسمی سی ہو کر رہ گئی۔ رائے شماری کی رسم بھی ختم ہو گئی۔ پائی کا وجود بھی شاید محض اس لیے باقی رکھا گیا کہ وہ مقامی پہاڑی لوگ جو قدامت پسند سمجھے جاتے ہیں' روایت پرست ہیں اور قدیم اقدار کو سینے سے لگائے رکھتے ہیں' کوئی شورش برپا نہ کریں۔ بغاوت خواہ تھوڑے سے ہی آدمی کریں' بہرحال خطرناک ہوتی ہے۔"

وہ کش لینے کے لیے خاموش ہوئی تو میں نے کہا۔ "پائی کو اپنی ذات اور اپنے قبیلے کو اس شر سے بچانے کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے تھی۔"

"جدوجہد؟" وہ ایک بار پھر قدرے مغموم سے انداز میں مسکرائی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

اب اس کا حسن اور دلکشی کچھ اور نمایاں ہو گئی۔ اس کا لباس عمدہ نہیں تھا مگر اس کا جسم دلکشی کے سبب گویا کسی بھی لباس کا محتاج نہیں تھا۔ اس کے نقوش کا اگر الگ الگ جائزہ لیا جاتا تو شاید وہ کوئی ایسے بے مثال محسوس نہ ہوتے لیکن انھوں نے مل جل کر گویا اسے لاکھوں میں ایک بنا دیا تھا۔ اس کا چہرہ میک اپ سے بے نیاز تھا، لیکن اس کی رنگت کی ملاحت، ہونٹوں کا رسیلا پن اور آنکھوں کے قدرتی ڈورے ہزار آرائشوں پر بھاری تھے۔

"میرے ساتھ آؤ۔" وہ سگار کے ٹوٹے کو انگلی اور انگوٹھے کے درمیان گھماتے ہوئے بولی۔ "لیکن تم دروازے کے پیچھے ہی رہنا اور ذرا دور سے علی بی کا دیدار کرنا۔"

اس نے پچھلی دیوار میں موجود ایک دروازہ کھولا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ اس کے تراشیدہ بالوں یا پھر شاید اس کے جسم سے ایک عجیب سی مہک اٹھ رہی تھی۔ اس نے مجھے دروازے ہی پر رکنے کا اشارہ کیا اور اسے تھوڑا سا کھلا چھوڑ کر کمرے میں چلی گئی۔ اس کمرے میں مدھم اور خوابناک سی روشنی پھیلی ہوئی تھی جو جلد ہی تیز روشنی میں تبدیل ہو گئی اور تب میں نے دیکھا کہ وہ بیڈ روم تھا، جس میں سینڈریلا داخل ہوئی تھی۔

اس کمرے میں آرائش بھی کچھ جدید تھی اور کچھ قدیم۔ کسی چیز کو دیکھ کر امارت اور خوشحالی کا اور کسی چیز کو دیکھ کر غربت و افلاس کا احساس ہوتا تھا۔ کچھ عجیب تضادات کا سا مجموعہ تھا وہ کمرہ۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ پرانی طرز کا ایک ڈبل بیڈ لگا ہوا تھا جس پر شب خوابی کے لباس میں گاؤ تکیے کے سہارے ایک شخص دراز تھا۔

اس نے غالباً تیز روشنی محسوس کرتے ہوئے آنکھیں کھولی تھیں یا یوں کہنا چاہیے کہ کھولنے کی کوشش کی تھی لیکن اس میں کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہو رہا تھا۔ عجیب گدلائی لیے ہوئی سی آنکھیں تھیں اس کی۔ ان میں کچھ زیادہ ہی نمی تیر رہی تھی۔

وہ شخص گویا ایک عالیشان عمارت کا کھنڈر تھا۔ اس کا زوال بتا رہا تھا کہ کبھی وہ قابلِ رشک شخصیت کا مالک رہا ہو گا۔

اس کے دیکھنے کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے سینڈریلا کی صورت صاف نظر نہیں آ رہی، تاہم اس نے ایک مجبوری کی سی مسکراہٹ کے ساتھ کچھ کہنے کی کوشش کی تھی، لیکن ناقابلِ فہم انداز میں منمنا کر رہ گیا۔ سینڈریلا نے اسے سینے تک کمبل سے ڈھانپ دیا اور ہتھیلی سے یوں اس کی آنکھیں بند کر دیں جیسے اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی ہو۔ اس شخص نے دوبارہ آنکھیں کھولنے کی کوشش نہیں کی۔

اور سینڈریلا واپس اس کمرے میں آ گئی جہاں کچھ دیر پہلے تک ہم باتیں کر رہے تھے۔

اس نے درمیانی دروازہ بند کر دیا اور مجھے ایک دیوان پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے نیفے میں اڑسی ہوئی اسٹین گن کھینچی اور دیوار سے ٹکائی اور بیٹھ گیا۔ خنجر اور ہارنٹ گن میں نے پہلے ہی اپنے ٹھکانوں پر رکھ لیے تھے۔

سینڈریلا دوبارہ اپنی کرسی پر جا بیٹھی۔ سگار کا ایک آخری اور نہایت طویل کش لینے کے بعد جب اس کی انگلیاں جلنے کو ہو گئیں تو اس نے ٹوٹا دور کونے میں رکھے ہوئے ایک اگالدان کی طرف اس مہارت سے پھینکا کہ وہ سیدھا اندر جا گرا۔ دونوں ہاتھ بغلوں میں دبا کر اس نے دھیرے دھیرے دھواں اگلا اور میری طرف دیکھتے ہوئے عجیب سے انداز میں مسکرائی۔ اس مسکراہٹ میں بے بسی بھی تھی اور اس شیر کی سی متانت بھی جو مدتوں سے پنجرے میں بند ہو مگر اس کی روح شکست قبول کرنے کے لیے آمادہ نہ ہو سکی ہو۔ اس مسکراہٹ میں التجا بھی تھی اور زخمی انا کا کھنچاؤ بھی۔ دوستی بھی تھی اور تکلف بھی، طلب بھی تھی اور گریز بھی۔ احتیاط بھی تھی اور اعتماد بھی۔

"تم جدوجہد کی بات کر رہے تھے۔" وہ تھکے سے لہجے میں بولی۔ "اب تم نے دیکھ ہی لیا ہو گا۔ زندہ لاشیں بھلا کیا جدوجہد کر سکتی ہیں۔"

میرے دل میں تاسف کی ایک لہر سی ابھری، لیکن میں نے کوشش کی کہ میں جذباتیت کی کسی لہر کی زد میں نہ آنے پاؤں۔ کمرے میں چند لمحے بوجھل سا سناٹا طاری رہا۔

"حشمت علی جب یہاں آ کر سابق منوچی کی رضامندی سے اسے سبکدوش کر کے خود منوچی بنا تو ظاہر ہے اس کا میرے شوہر سے بہت زیادہ رابطہ رہا۔ یانی اور منوچی کا ہمیشہ ہی رابطہ رہتا تھا لیکن مجھے نہیں معلوم کہ کب اور کس طرح یانی ہیروئن کے انجکشنوں کا عادی ہوا۔ مجھے جب علم ہوا تو پانی سر سے گزر چکا تھا۔ ایک انجکشن کے لیے وہ گڑگڑاتا تھا، بلبلاتا تھا اور تڑپتا تھا۔ حشمت نے زبردستی یہ خوفناک لت چھڑانے کی کوشش کی تو اندیشہ محسوس ہوا کہ وہ مر ہی نہ جائے۔ یہ نشہ جب ایک خاص سٹیج پر پہنچ جائے تو اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے ایک خاص ماحول اور کچھ دواؤں کی ضرورت ہوتی ہے جو مجھے یہاں میسر نہیں تھیں۔ اس لیے میں مجبور ہو گئی۔ خاموش تماشائی بن گئی۔"

اس نے ہاتھ بغلوں سے نکال کر کرسی کے ہتھوں پر رکھ لیے اور ایک لمحے کے توقف سے بولی۔ "میں سوچتی تھی کہ چلو وہ زندہ تو ہے۔ شاید کبھی رہائی اور چھٹکارے کی کوئی صورت نکل آئے۔ اس وقت تک صورت حال یہی ہو چکی تھی۔ جو تم نے خود دیکھی تھی کہ ہماری حیثیت قیدیوں کی سی ہو چکی تھی۔ میں چونکہ چالاک تھی اس لیے مجھ پر خاص نظر رکھی گئی اور مجھے اس طرح گھیر گھار کر گویا مجبور کر دیا گیا کہ میں کسی سے رابطہ قائم نہ کر سکوں۔ کسی کو معلوم نہ ہونے پائے کہ ہم پر کیا گزر رہی ہے اور خود یانی کے لوگوں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ انھیں کس طرح آلۂ کار بنایا جا رہا ہے۔ اس لیے ہم ان مسلح محافظوں کے نرغے میں ایک طرح سے قید تھے۔ یہ محافظ ہماری حفاظت کے لیے نہیں، ہمیں یہاں قید رکھنے کے لیے تھے۔

"اس خبیث حشمت کو معلوم تھا کہ مجھے اگر ایک بار بھی کسی اجتماع سے خطاب کرنے

کا موقع مل گیا تو میں اگر بازی الٹ نہ بھی سکی تب بھی ایک ہلچل ضرور پیدا کردوں گی جو پھیل سکتی ہے۔ اس کے لیے مہلک ثابت ہو سکتی ہے۔ یہ درست ہے کہ اس کے اپنے خاصے قابل اعتماد موجود ہیں جو شاید تادم آخر اس کے ساتھ رہیں اور جن کے پاس بہ کثرت اسلحہ موجود ہے لیکن اگر ایک بار بستی کے عام لوگ اس کے خلاف ہو جائیں' ان کے غیظ و غضب کا رخ اس کی اور اس کے ساتھیوں کی طرف مڑ جائے تو وہ خاصی خونریزی کے بعد ما سکیں لیکن بہرحال مارے جائیں گے۔ اس پر مجھے بے وقت وار کرنے پر پوری کوشش صرف کی گئی۔

"مجھے قتل کرنے یا علی الاعلان زہر دلانے کی کوشش اس لیے نہیں کی گئی کہ ہم میاں بیوی کا بہرحال بستی کے لوگوں میں کچھ نہ کچھ احترام باقی ہے۔ ہم میں سے کسی ایک کے اچانک اور اعلانیہ قتل سے شکوک و شبہات اور لوگوں میں بغاوت پیدا ہو سکتی تھی۔ تاہم میں ایک عرصے سے موت کا انتظار کر رہی ہوں جو شاید بظاہر حادثہ معلوم ہوگی۔ ہو سکتا ہے کسی روز اس مکان سے کسی کمرے کی چھت گر پڑے۔ ممکن ہے کسی روز کچن میں آگ لگ جائے۔ میری احتیاط کا یہ عالم ہے کہ میں نے حشمت کی طرف سے بھیجے گئے ہر ملازم اور ملازمہ کو نکال دیا ہے۔ معلوم نہیں ان میں سے کون کب مجھے زہر دے دیتا۔ میں اپنا ہر کام اپنے ہاتھ سے کرتی ہوں۔"

دفعتاً میں اضطراری طور پر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اپنے ایئرفون پر کسی کی چیخ سنی تھی۔ یہ ایک غیر معمولی چیخ تھی۔ میرے اعصاب میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ میں کوئی انتہائی قدم اٹھانے کے ارادے سے دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ میں نے ایئرفون پر ایک زنانہ آواز سنی جو اس سے پہلے مجھے سنائی نہیں دی تھی۔ "نہیں ...... نہیں ...... لڑکی پر تشدد مت کرو ...... باس نے کہا تھا کہ اسے کوئی گزند پہنچانے کی ضرورت نہیں ...... وہ خود ہی واپس آ کر اس بارے میں جو مناسب سمجھیں گے کریں گے ...... وہ ڈیتھ اسکواڈ کے ساتھ اس شخص کی تلاش میں بستی سے نکلے ہوئے ہیں ...... ہمارا کام تو صرف اتنا ہے کہ اسے قید خانے میں پہنچا دیں ......"

اس دوران بھی مجھے کسی کے ہولے ہولے کراہنے کی آواز سنائی دیتی رہی تھی۔ پھر اس نے با آواز بلند ان سب کو چند گندی گندی گالیاں دیں جس سے مجھے یہ اطمینان ہوا کہ ابھی وہ خطرے کی حالت میں نہیں تھی اور اس کا حوصلہ بھی بدستور بلند تھا۔ میں اس وقت تک اس کی طرف سے بے فکر رہ سکتا تھا جب تک اس کا حوصلہ برقرار تھا۔

"کیا ہوا؟" تم اتنی محویت سے کیا سن رہے تھے۔ مجھے تو کچھ سنائی نہیں دے رہا۔" سینڈریلا کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"کیا اس آلہ سماعت کی وجہ سے تمہیں مجھ سے زیادہ سنائی دے رہا ہے؟"

میری نظر گو کہ بدستور اسی پر تھی لیکن ان گزشتہ چند لمحوں میں جیسے اس کا وجود میری نظر سے اوجھل ہی ہو رہا تھا۔ اب میں نے دیکھا کہ وہ بھی کرسی سے اٹھ چکی تھی اور اس کی پیشانی پر شکنیں تھیں۔ وہ بھی جیسے کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اسے اس حد تک حقیقت سے آگاہ کرنے میں کوئی حرج نہ سمجھا کہ کس طرح میں وادی میں داخل ہوا تھا اور کس طرح کیتی ٹیٹ پکڑی گئی تھی اور یہ کہ کس طرح میں ابھی تک اس کی آواز سن رہا تھا۔

"وہ تو قید خانے میں پہنچ چکی ہوگی۔" سینڈریلا بولی۔

"قید خانے کا صحیح علم تو مجھے بھی نہیں لیکن میرا اندازہ ہے کہ وہ حشمت علی کی رہائش گاہ کے تہہ خانے میں ہی کہیں واقع ہے۔ تم نے اپنا مقصد ابھی تک نہیں بتایا۔" وہ اپنی مسکراہٹ کو سمیٹتے ہوئے بولی۔ "ظاہر ہے تم یونہی منہ اٹھا کر تو یہاں نہیں چلے آئے ہو گے۔ کسی بڑے مقصد کے لیے ہی جان کی بازی لگائی جاتی ہے۔"

"بے شک!" میں نے تائید کی۔ "میرا مقصد چند ذاتی اور چند انسانی وجوہات کی بنا پر صرف حشمت علی' شرافت علی اور ان کے جاں نثاروں کو قتل کرنا تھا لیکن اب یہ بات بھی میرے مقاصد میں شامل ہو گئی ہے کہ صرف انہیں قتل کرنا ہی کافی نہ سمجھا جائے بلکہ اس انداز میں ان کا اور ان کے ساتھیوں کا صفایا کیا جائے کہ آئندہ کوئی اس کی جگہ نہ لے سکے اور نہ ہی کوئی دوسرا حشمت اس طرح پنجے جما سکے۔ یہ وادی اس کے چنگل سے نکل آئے۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ اس کے اپنے آدمیوں کے علاوہ بستی کے عام آدمیوں کا اس کے بارے میں کیا رویہ ہے؟ کیا عام لوگ اس کی آواز پر لبیک کہتے ہیں؟ اس کے کہنے پر عمل کرتے ہیں؟"

"صورت حال کچھ یوں ہے کہ اس نے انہیں اپنی عیاری اور مکاری کے شیشے میں اتارا ہوا ہے کہ وہ اس کے احکامات پر عمل درآمد کرنا عبادت سمجھتے ہیں لیکن اگر مجھے اتنا موقع مل سکے کہ میں لوگوں کا ایک بڑا اجتماع بلا سکوں' اپنے شوہر کو لے کر ان کے سامنے جا سکوں اور اس کی حالت دکھا کر ایک ولولہ انگیز تقریر میں سارے حقائق بیان کر سکوں اور بستی والوں کو احساس دلا سکوں کہ وہ کس طرح بے وقوف بن رہے ہیں تب بازی پلٹ سکتی ہے لیکن ظاہر ہے یہ ممکن نہیں۔ یہ طویل عمل بغیر کسی مداخلت کے تو انجام نہیں پا سکتا۔ فی الوقت اگر میں باہر پہنچ بھی جاؤں اور لوگوں کو جمع کرنا شروع کردوں تو چار جملے بولنے سے پہلے ہی حشمت تمام تر خطرہ مول لیتے ہوئے مجھے گولی مروا دے گا۔ بعد میں وہ کسی نہ کسی طرح تاویلوں سے بستی والوں کو مطمئن کر لے گا۔"

"اگر تمہیں کوئی ایسا موقع مل جائے ......" میں نے کہا۔ "کہ بہت دیر کے لیے حشمت اور اس کے ساتھی اپنی ہی مصیبت میں پھنس جائیں اور تمہیں بھی باہر جانے سے روکنے

ٹوکنے والا کوئی نہ ہو تب تو تم اپنا کام دکھا سکتی ہو نا؟"

"یقیناً...... میں کوشش تو کر ہی سکتی ہوں جس میں کامیابی کی مجھے زیادہ توقع ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"حشمت اور اس کے ساتھیوں سے تو میں ہر طریقے سے نمٹ لوں گا۔" میں نے کہا۔ "میں کبھی چاہتا تھا کہ عام لوگوں کا ریلا میری طرف نہ بہنے پڑے۔ خوفزدہ تو میں ان سے بھی نہیں ہوں لیکن میں نہیں چاہتا کہ بے گناہوں اور سیدھے سادے لوگوں کا خون بہے۔"

وہ مسکرائی۔ "بات تو اس طرح کر رہے ہو گویا تنہا نہیں بلکہ پوری رجمنٹ لے کر آئے ہو اور کوئی توپخانہ بھی ساتھ ہے۔"

"اس وادی جیسی جگہ پر اگر اوسان بحال رکھے جائیں تو تنہا آدمی رجمنٹ کے برابر ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور چند دور مار رائفلیں.. توپ خانے کا کام دے سکتی ہیں۔"

وہ کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ دور سے کچھ شور سنائی دیا۔

○

وہ ایک لمحے کے لیے کان لگا کر سننے کے بعد بولی۔ "کچھ لوگ یقیناً اس طرف آ رہے ہیں...... یہ بات طے ہے کہ تمہیں میرے گھر میں ضرور تلاش کیا جائے گا...... یہ بتاؤ کہ تم سانس کتنی دیر کے لیے روک سکتے ہو؟"

"تمہارے اندازوں سے نہیں زیادہ دیر کے لیے۔" میں نے جواب دیا۔

"میرے اندازوں کو حقیقت سے اتنا دور بھی مت سمجھو۔" وہ معمولی سی گھبراہٹ اور بہت زیادہ عجلت کے باوجود مسکرائی۔ "مجھے پہلے ہی اندازہ ہو چکا ہے کہ تم نے یوگا میں بہت محنت کر رکھی ہے۔" اس دوران اس نے قدیم طرز کی لکڑی کی ایک وارڈ روب میں سے ایک پرانا سا آلا ڈھونڈ کر نکال لیا تھا اور وارڈ روب ہی کو لگا دیا تھا۔

"نفسیاتی چال چلنے کی کوشش کر رہی ہوں۔" اس نے خود ہی وضاحت کی۔ "ہر دیکھنے والے کا خیال سب سے پہلے اسی الماری کی طرف جائے گا، خصوصاً اسے آلا دیکھ کر شک قوی تر ہو گا جبکہ میں تمہیں جس جگہ چھپاؤں گی وہ بالکل کھلی ہو گی......"

اس نے مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور اس دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے ہی بجھا دی جس سے میں اندر آیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دائیں ہاتھ پر ایک اور دروازہ تھا۔ دروازہ کیا بس لوہے کی ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی جو کھلی ہوئی تھی۔ اندر پہنچ کر مجھے اندازہ ہوا کہ یہ ایک طویل و عریض کچن تھا جس کی دو دیواریں ان دونوں کمروں سے ملتی تھیں جو میں اب تک دیکھ چکا تھا۔ اس کچن کے ایک کونے میں مٹی کے تیل سے جلنے والے چولہوں پر مشتمل وہ نظام موجود تھا جس سے برفباری کے دنوں میں مکان کو گرم رکھا جا سکتا تھا۔

کچن میں ایک دیوار کے ساتھ جست کی چادر کی ایک بہت بڑی تابوت نما پیٹی رکھی تھی جس کا ڈھکن اس وقت اٹھا ہوا تھا۔ قریب پہنچ کر میں نے دیکھا کہ وہ پیٹی آدھی سے زیادہ گندم سے بھری ہوئی تھی۔ میں سینڈریلا کا مقصد سمجھ گیا اور جب وہ جھک کر دونوں ہاتھوں سے پیٹی کے درمیان سے گندم کناروں کی طرف ہٹانے لگی تو میں بھی اس کا ہاتھ بٹانے لگا۔

چند سیکنڈ میں ہی گندم کی قبر تیار ہو گئی تو سینڈریلا نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور میں پیٹی میں داخل ہو کر اس قبر میں لیٹ گیا۔ اس نے جلدی میں ہاتھ آنے والا چتا سا

www.paksociety.com

ایک سانی نما کپڑا میرے چہرے پر ڈال دیا اور گندم کی سطح برابر کرنے لگی۔ اس دوران باہر سے گیٹ دھڑ دھڑائے جانے کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ جلد ہی گندم نے مجھے ڈھانپ لیا تو آواز خاصی مدھم ہو گئی' تاہم گندم کی قبر سے باہر کی دنیا سے میرا سماعت کا رشتہ یکسر نہیں ٹوٹا تھا کیونکہ میں نے سینڈریلا کے دوڑ کر چن سے باہر جانے تک کی آواز سنی۔

چند لمحے بعد مجھے کہیں قریب ہی سے کچھ افراد کے بولنے کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ یقیناً کافی تیز و تند آوازوں میں باتیں کر رہے تھے مگر مجھے مدھم سنائی دے رہی تھیں۔ پھر ان میں ایک واضح تحکمانہ اور گرجدار آواز سنائی دی..."ادھر ادھر ہانکنے کی ضرورت نہیں.....ہم نے بستی کے تقریباً ہر گھر سے پتہ کروا لیا ہے اور مجھے یہ بھی معلوم ہے اس بستی کے سب میرے ماننے اور چاہنے والے ہیں۔ میری اجازت کے بغیر کوئی کسی اجنبی کو پناہ نہیں دے سکتا۔ صرف تم ہی ہو جو کسی اجنبی کو خوش آمدید کہہ سکتی ہو اور یہاں اس کی آمد کا ثبوت بھی موجود ہے۔ تمام محافظ مرے پڑے ہیں....."

"میں نے کب کہا ہے کہ وہ یہاں نہیں آیا۔" سینڈریلا کی جارحانہ آواز سنائی دی۔ "تم کسی اور کی بات تو سنتے ہی نہیں ہو....اپنی ہی بکواس شروع کر دیتے ہو۔"

"تمیز سے بات کرو سینڈریلا!" گرجدار آواز نے اس کی بات کاٹ دی۔ "یہاں تو صرف میرے خاص آدمی ہی موجود ہیں جو میرے اشارے کے بغیر حرکت نہیں کرتے لیکن اگر تم باہر بستی کے عام لوگوں میں' میرے عقیدت مندوں میں کھڑے ہو کر اس طرح مجھ سے بات کرو تو وہ تمہاری بوٹیاں نوچ ڈالیں گے....."

"حشمت خان!" سینڈریلا کی آواز میں بھی بلا کی تندی آ گئی۔ "اگر تمہیں اتنا ہی زعم ہے تو مجھے باہر کیوں نہیں نکلنے دیتے.....؟ ایک بار عام لوگوں میں جانے دو' پھر دیکھو وہ تمہاری بوٹیاں نوچتے ہیں یا میری۔"

"لگتا ہے تمہارا تکبر ابھی نہیں گیا۔" وہی آواز جو یقیناً حشمت خان کی تھی گویا زہر میں بجھ کر نکلی تھی۔ "اب یہ خیال دل سے نکال دو کہ باہر کے لوگوں کے دلوں میں تمہارے لیے کچھ عقیدت باقی رہ گئی ہے' لوگ تو تمہارا نام بھی بھول گئے ہیں۔"

"جبھی تم نے اتنے محافظوں کے گھیرے میں اتنے عرصے سے مجھے محبوس کر رکھا ہے۔" سینڈریلا گرجی۔

"اچھا اس بکواس کو چھوڑو۔ میں تمہارا باہر آنے کا ارمان بھی پورا کر دوں گا۔" حشمت خان غرایا۔ "فی الحال صرف اس اجنبی کی بابت بتاؤ' کہاں چھپایا ہے اسے تم نے؟"

"گھر تمہارے سامنے ہے' تلاشی لے لو۔" سینڈریلا نے لاپروائی سے کہا۔ "میں نے اسے پناہ دینے اور چھپانے کی کوشش کی تھی لیکن اس بدبخت نے مجھ پر بھروسہ نہیں کیا۔ میرے سامنے سے ہی گیا تھا۔ چھلاوے کی طرح آیا' محافظوں کو مارا' مجھ سے چند منٹ بات کی اور پچھلی دیوار پھلانگ کر نکل گیا۔ میری جان بھی اس لیے بخش گیا کہ میں نے اسے ہر طرح کے تعاون کی پیشکش کر دی تھی جو اس نے احتیاطاً قبول نہیں کی بہرحال وہ قائل ضرور ہو گیا تھا کہ میں تمہارے ہی خواب میں سے نہیں ہوں۔ ایسے تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ وہ اس گھر کو تمہارا گھر سمجھ کر گھسا تھا۔"

ایک لمحے کے لیے سکوت چھا گیا۔ سینڈریلا انسانی نفسیات کے پیچ و خم سے بخوبی واقف تھی اور گفتگو سے دوسروں کو قائل کرنے کا فن بھی جانتی تھی۔

"باتوں سے متاثر کرنے کی تمہاری صلاحیت سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔" حشمت خان کی آواز نے سکوت توڑا۔ "لیکن میں خود چونکہ اس فن میں تمہارا حریف ہوں' اس لیے آنکھیں بند کر کے یقین کرنے سے تو رہا۔"

"تو پھر باتوں میں اپنا اور میرا وقت کیوں ضائع کیے جا رہے ہو۔" سینڈریلا نے غصے اور بیزاری سے کہا۔ "میں سونے جا رہی ہوں۔ تمہارا جو جی چاہے کرو۔ جہاں جی چاہے' اسے تلاش کرو۔" میں نے محسوس کیا کہ وہ شاید سونے کے لیے سچ مچ خواب گاہ کی طرف چلی گئی تھی۔

دفعتاً ایک دھماکے نے مجھے جھرجھری سی لینے پر مجبور کر دیا۔ دھماکہ گو کہ مجھے زیادہ زوردار محسوس نہیں ہوا تھا لیکن دھمک سے گویا زمین بھی ہل کر رہ گئی تھی لیکن ساتھ ہی میں نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ یہ دھماکہ بم یا بندوق کا نہیں تھا۔

"اب اسے الٹ کر دیکھو.....اگر وہ مردود اندر ہے تو بے ہوش ہو چکا ہوگا ورنہ تم دروازہ کھلتے ہی اسے چھلنی کر دینا۔" یہ حشمت خان ہی کی آواز تھی اور تب ہی میں سمجھ گیا تھا کہ دھماکہ کس چیز کا تھا۔ دراصل ان لوگوں نے دیوار کے ساتھ کھڑی بھاری بھرکم الماری کو فرش پر گرا دیا تھا۔ اگر اس کے اندر کوئی موجود ہوتا تو یقیناً ایک بار تو اس کا کچوملا نکل جاتا۔ گویا سینڈریلا کا نفسیاتی حربہ کامیاب رہا تھا۔ سب سے پہلے اس کی توجہ الماری ہی کی طرف گئی تھی۔

کھٹر پٹر کی کچھ اور آوازیں سنائی دیں' پھر کسی نے کہا۔ "اس میں تو بیکار کپڑوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔"

"بہرحال مکان کی تلاشی لو۔ کوئی گوشہ نظرانداز نہ کیا جائے۔" حشمت خان نے حکم دیا۔ اس کے بعد وقفے وقفے سے کوئی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ لوگ کچن میں بھی آئے' کسی نے چیخ پر زور سے کوئی چیز بھی ماری جو غالباً بندوق کا کندہ تھا۔ اس کی یہ حرکت مجھے تلاش کرنے کی خواہش سے زیادہ جھنجھلاہٹ کی آئینہ دار معلوم ہوتی تھی۔

"اس میں تو گندم بھری ہوئی ہے۔" ایک آواز آئی۔

"گندم میں کسی چھری وغیرہ مار کر دیکھ لو۔" دوسری آواز نے مشورہ دیا۔

"تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے راج!" کسی آواز میں بیزاری در آئی۔ "ہم کسی لاش کو نہیں' زندہ انسان کو تلاش کر رہے ہیں۔ جب سے ہم آئے ہیں تب سے کیا کوئی شخص گندم میں دب کر زندہ رہ سکتا تھا؟"

اس کے بعد کوئی آواز سنائی نہ دی' سوائے دھب دھب کے۔ یہ ان کے بھاری جوتوں کی آواز تھی جو دور ہوتی چلی گئی۔ میں نے آواز معدوم ہونے کے بعد بھی تقریباً ایک منٹ انتظار کیا اور اس دوران میں نے یوگا کی مشق سے بھی مکمل طور پر کام نہیں لیا۔ میں نے محسوس کیا کہ گندم میں جتنی گہرائی میں' میں دبا ہوا تھا' وہاں سانس تو باقاعدہ طور پر نہیں لی جا سکتی تھی لیکن کوئی ایمرجنسی دبے کی سی کیفیت نہیں تھی۔ عام آدمی بھی چار پانچ منٹ تو گزار ہی سکتا تھا۔

میں نے اپنے آپ کو مزید زیر مشق نہ رکھا اور سر گندم کی قبر سے نکال لیا۔ کچن میں بدستور مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی اور کوئی شخص موجود نہ تھا' تاہم میں نے باہر آنے کی کوشش نہیں کی۔ گندم سے سر نکالے وہیں لیٹا رہا۔

کچھ دیر بعد مجھے آوازوں سے اندازہ ہوا کہ وہ لوگ ملحقہ کمرے میں ایک بار پھر جمع ہو چکے تھے۔ پھر کسی نے رپورٹ دی۔ "مکان میں پولی اور سینڈریلا کے سوا کوئی موجود نہیں باس! ہم نے چپے چپے کو......"

حشمت خان نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میں نے تمہیں کتنی بار منع کیا ہے' مجھے میرے گھر سے باہر کہیں بھی باس کہہ کر مخاطب نہ کیا کرو۔ معمولی سی بات ہے مگر تمہاری سمجھ میں بات ہی نہیں آتی۔"

"یہاں کونسا کوئی غیر موجود ہے باس... میرا مطلب ہے سوری!" کسی آواز نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "سب اپنے ہی ہیں اور پھر ہم تو بات بھی انگریزی میں کر رہے ہیں۔ مقامیوں میں سے تو کوئی کوئی ہی تھوڑا بہت انگریزی سمجھ سکتا ہے۔"

"تمہاری سمجھ میں آج تک یہ نہیں آیا کہ حکم بہرحال حکم ہی ہوتا ہے۔ میرے حکم کے سامنے منطق جھاڑنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔" حشمت خان نے ناگواری سے کہا' تاہم اس کی آواز میں چھپا سا دبدبہ اور طنطنہ نہیں تھا۔ "اور اگر بات منطق اور جواز ہی کی ہے تب بھی تمہیں یہ دھیان رکھنا چاہیے کہ اس وقت ہم اپنے سب سے بڑے دشمن کے گھر میں کھڑے ہیں۔ تمہیں کیا معلوم کہ اس سانپ کے بچن پر میں نے کس چالاکی سے پاؤں رکھا ہوا ہے۔ ذرا یاد کم ہو تو ہمارا راز اب نہیں کھل سکتا ہے۔"

"سانپ تو تم ہو حشمت خان!" کچھ فاصلے سے سینڈریلا کی غصیلی آواز سنائی دی۔ "جس نے اس وادی کے حقیقی وارثوں کو ڈس لیا ہے۔ کاش ہم نے اسی وقت تمہارا سر کچل دیا ہوتا' جب تم محلے سے نکل کر اس گھر میں آیا کرتے تھے۔ ہم میاں بیوی اس وقت

تم پر ترس کھایا کرتے تھے۔"

"اگر تم نے ہندوستان کی تاریخ پڑھی ہوتی تو تم کبھی ایسی حماقت نہ کرتیں۔" حشمت خان نے کھسیانے کے بجائے استہزائیہ سا قہقہہ لگا کر کہا۔ "انگریزوں نے اسی طرح تو مغلوں سے پورا ہندوستان چھیا لیا تھا۔"

"تم بھی مجھے کسی انگریز ہی کا پلا لگتے ہو اور وہ بھی کسی کمینے قسم کے انگریز کا۔" سینڈریلا نے جل کر کہا۔

حشمت خان حالات کی تمام تر ناگواری کے باوجود شاید فی الحال کوئی شدید رد عمل ظاہر کرنے کے موڈ میں نہیں تھا کیونکہ اس کی طرف سے کوئی سخت جواب سنائی نہیں دیا۔

"تمہارے اندازے کے مطابق وہ کہاں چھپا ہو گا؟ کوئی غلط اندازہ ہی ظاہر کر دو" اس نے کہا۔

"ہو سکتا ہے وہ جنگل میں جا چھپا ہو۔" سینڈریلا نے ایک لمحے کے توقف سے جواب دیا۔

"جنگل میں؟" حشمت خان نے ایک بار پھر استہزائیہ سا قہقہہ لگایا۔ "تمہیں شاید علم نہیں ہے کہ جنگل میں ہمارے سدھائے ہوئے چند درندے بالکل اسی طرح گھومتے رہتے ہیں جس طرح کسی علاقے کے چوکیدار گشت پر ہوتے ہیں۔ مشکوک انداز میں گھومتا ہوا کوئی بھی شخص ان کے غضب سے نہیں بچ سکتا۔"

"تب تو شاید وہ اب تک اگلے جہان کو سدھار بھی چکا ہو۔ تم خوامخواہ ہی پریشان ہوتے پھر رہے ہو۔" سینڈریلا نے کہا۔

"تمہارے گھر کی تلاشی لینے کے بعد میں بھی تقریباً اسی نتیجے پر پہنچا ہوں۔" حشمت خان بولا۔ اب اس کی طمانیت کی وجہ میری سمجھ میں آئی۔ وہ میرے معاملے میں کافی حد تک بے فکر ہو چکا تھا اور یہی میں چاہتا تھا۔ وہ مزید بولا۔ "لیکن اپنی تسلی کے لیے میں ایک بار پھر بستی میں اعلان کروا دیتا ہوں کہ جو بھی اس اجنبی کو پناہ دے گا' وہ دیوتاؤں کے رحم و کرم اور میری دعاؤں کے اثر سے محروم ہو جائے گا۔"

اس بار سینڈریلا نے کچھ نہیں کہا۔ صرف ایک قہقہہ لگایا جس میں دنیا بھر کی نفرت طنز اور زہر بھرا ہوا تھا۔ حشمت خان کی چہچہاتی ہوئی سی آواز سنائی دی۔ "کچھ عرصہ اور رک کر قہقہہ لگا لو میری جان! تمہارا یہ لنگور نما شوہر ملک عدم کو سدھار جائے گا اور میرا بھی شعلہ صفت جوان حسیناؤں سے دل بھر جائے گا تو میں تمہیں بھی اٹھا کر اپنی کنیزوں کی ٹولی میں ڈال لوں گا۔ پنچایت بڑی خوش ہو گی کہ میں نے پالی کی بیوہ کو سہارا دیا ہے۔"

"یہ امید پوری ہونے تک تمہاری اپنی ہڈیاں تک گل سڑ چکی ہوں۔" سینڈریلا نے جواب دیا۔

حشمت خان نے غالباً اس کی طرف سے توجہ اب ہٹا لی تھی اور اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا تھا۔ "تم چاروں اب اس مکان کے گرد گشت پر رہو گے اور بہت ہوشیاری سے نگرانی کے فرائض انجام دو گے۔ صبح تک میں کچھ اور آدمی بھیج دوں گا۔ ڈیوٹی بدلتے رہنا اور سنو......" اس کے بعد اس کی آواز بہت مدھم ہو گئی۔ غالباً وہ کچھ اور ضروری ہدایات دے رہا تھا۔

میں اب لیٹے لیٹے بے حد بور ہو رہا تھا۔ دشمن برابر والے کمرے میں موجود تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ خنجر یا اسٹین گن لے کر ادھر گھس پڑوں اور لاشوں کے ڈھیر لگا دوں لیکن نہ جانے کیوں فی الحال ذہن اس پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔ ایسا کرنا خلاف مصلحت سا لگ رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کسی ایسی جگہ حشمت خان سے معرکہ آرائی ہو جہاں صرف اس سے اور اس کے ساتھیوں سے سامنا ہو دیگر لوگ نہ الجھنے پائیں۔

بالآخر کچھ دیر بعد مکمل سکوت چھا گیا لیکن میں گندم کی پیٹی سے نہیں نکلا۔ کچھ دیر بعد مجھے دروازے کی طرف سے کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دی۔ پھر سینڈریلا نے پیٹی میں جھانکا اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "سرگوشی میں ہی بات کرنا۔ وہ لوگ کمروں کی دیواروں کے پاس ہی ٹہل رہے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے سرگوشی کی۔

"گویا تم کافی دیر سے یونہی گردن نکالے پڑے ہو اور میں خوامخواہ تمہاری فکر میں مری جا رہی تھی۔" میں نے مدھم روشنی میں بھی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھ لی۔ وہ بن رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا وہ فکر میں مرنے والی عورت نہیں تھی۔ اگر وہ فکر میں مر سکتی تو شاید کبھی کی مر چکی ہوتی۔ وہ تو پتھر کے کتّے کی طرح تھی۔ جتنی زیادہ گہرائی میں جتنے زیادہ وزن تلے جتنے زیادہ عرصے دبی رہی تھی، اس کی سخت جانی میں اتنا ہی اضافہ ہو گیا تھا۔ مطلب یہ اب وہ اتنی ہی زیادہ تاؤ دے سکتی تھی۔

میں نے پہلے ایک بازو گندم سے نکالا جسے تھام کر سینڈریلا نے مجھے سہارا دیا کیونکہ میرا اوپر وقت میں اپنے وزن سے بار بار گندم میں دھنستا جا رہا تھا۔ باہر آ کر میں نے اس کا ہاتھ چھوڑا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا ہاتھ کسی ننگے تار سے چپک گیا ہو جس میں خاصی طاقتور برقی رو دوڑ رہی تھی۔

میں نے اپنے کپڑے جھاڑے۔ میرے ایک کان میں گندم کے کچھ دانے گھس گئے تھے، وہ نکالے۔ پھر سرگوشی میں اس سے پوچھا۔ "چار آدمی تو یہاں چھوڑ گیا ہے، اس کے ساتھ مزید کتنے آدمی تھے؟"

"چودہ آدمی اور تھے۔" سینڈریلا نے جواب دیا۔ "ویسے میری معلومات اور اندازے کے مطابق اس کے جانثاروں کی کل تعداد تیس بتیس سے زیادہ نہیں مگر پھر بھی اس وادی پر اس کی گرفت بہت مضبوط ہے۔ اس کی حکمت عملی نہ جانے کن کن چالاکیوں پر مبنی ہے کہ ان تیس بتیس آدمیوں سے وہ ایک بہت بڑی اور خوفناک تنظیم کا سا کام لیتا ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ ان لوگوں کے پاس دولت اور اسلحہ بہت ہے۔"

"خیر...... میں دیکھتا ہوں کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔" میں نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"کہاں چلے؟" اس نے پوچھا۔

"میں کوشش کروں گا کہ اس کے تعاقب میں جا سکوں۔" میں نے کہا۔

"پاگل ہو گئے ہو؟" وہ آگے بڑھ کر میرا بازو پکڑتے ہوئے بولی۔ "ابھی راستے میں جگہ جگہ لوگوں کی ٹولیاں کھڑی ہوں گی۔ حشمت خان کے باقی ساتھی بھی بستی میں بکھرے ہوئے ہیں۔ ذرا صبر کرو۔ میں تمہیں اس کے گھر پہنچنے کا ایک محفوظ راستہ بتا دوں گی۔ اس کا گھر ایک چھوٹا سا قلعہ ہے۔ اگر تم اس کے محافظوں کو ہلاک کر کے اندر پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤ تو پھر اندر خواہ کچھ بھی ہوتا رہے کسی کو علم نہیں ہوگا اور عام لوگ مداخلت کے لیے نہیں پہنچ سکیں گے...... اور یوں جنگل کا تو بھول کر بھی رخ نہ کرنا۔ تم نے سن ہی لیا ہوگا کہ وہاں درندے پھرتے رہتے ہیں۔"

اس نے مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور ہم ایک بار پھر اس کمرے میں آ بیٹھے جہاں پہلے بیٹھے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس بار کمرے میں روشنی نہیں تھی اور وہ میرے سامنے بیٹھنے کے بجائے میرے قریب ہی دیوان پر بیٹھی تھی۔ میں اس کے وجود کی خوشبو محسوس کر سکتا تھا۔ پھر اس خوشبو پر سگار کی خوشبو غالب آ گئی۔ اس نے بھڑکتے شعلے کو ہاتھوں کے حلقے میں رکھتے ہوئے سگار سلگا لیا تھا اور فوراً ہی تاثر بجھا لیا تھا۔ میں نے تاریک پس منظر میں نارنجی روشنی میں اس کا چہرہ چند لمحے کے لیے دیکھا تو یوں محسوس ہوا جیسے وہ ایک حسین یاد تھی جو ذہن کے تاریک افق پر جگمگائی تھی اور پھر معدوم ہو گئی تھی۔ اس کی پیشانی پر فکرمندی کی لکیریں تھیں۔

"تمہارے شوہر کی کیا کیفیت ہے؟" میں نے پوچھا۔ "اس سارے ہنگامے میں مجھے اس کی ذرا سی بھی آواز سنائی نہیں دی۔"

"اس کی آواز تو شاید تم یہاں بمباری شروع ہونے کے بعد بھی نہ سن سکتے۔" وہ مجروح سے لہجے میں بولی۔ "کبھی کبھی تو میری قوت برداشت جواب دینے لگتی ہے...... ایسے مرد کا ساتھ بھی کوئی ساتھ ہے کہ جس کی حفاظت عورت کو کرنی پڑے۔ لیکن بس پھر یہی سوچ کر ترس آ جاتا ہے کہ اس کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے...... بیماروں کے ساتھ چلنے کا تمنائی تو سارا زمانہ ہی ہوتا ہے لیکن مرے ہوئے کا ہاتھ تھامنے کی روایت بھی تو کسی کو قائم رکھنی چاہیے۔ وہ جو زندگی بھر کا ساتھ نبھانے کا وعدہ ہوتا ہے، اسے ان حالات میں بھی

نبھایا نہ جائے' تب بات ہے..... میں یوریشین ہوں اور میری آدھی سے زیادہ عمر یورپ اور انگلینڈ میں گزری ہے مگر مجھ میں عہد نبھانے والی روح شاید مشرق کی کسی ہیروئن رومانی داستان سے نکل کر گھس گئی ہے مگر اب میرے اور شوہر کے درمیان صرف رواداری اور ترحم کا رشتہ رہ گیا ہے اور یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ اچھی علامت نہیں ہے۔"

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے اندھیرے میں اس کا کندھا تھپکا۔ "حالات اتنے خراب بھی نہیں جتنے تم سمجھ رہی ہو۔ صرف احساسِ تنہائی نے تمہارے حوصلے کو کمزور کیا ہے اور کوئی بھی خاص بات نہیں۔ میں تو بہت زیادہ مشکلات اور خطرات کی توقع لے کر اس وادی میں داخل ہوا تھا لیکن اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میرا مشن خواہ مخواہ ہی میرے لیے ہوا بنا ہوا تھا۔ تم سے ملنے کے بعد مجھے اپنا کام بہت آسان لگنے لگا ہے۔ شاید میری بدولت بھی تمہیں بہت سے کام آسان محسوس ہونے لگیں۔"

مجھے نہیں معلوم تھا کہ ایک مدت سے اس کے سینے میں مقید آنسوؤں کا غبار یکدم ہی پھوٹ پڑے گا۔ اس نے ایک بازو میری گردن میں حمائل کر دیا اور میرے کندھے پر سر رکھ کر خاموش سسکیاں لینے لگی۔ رونا بھی اس کی مجبوری تھی اور آواز کو باہر جانے سے روکنا بھی۔

"تم سے مل کر میرے محسوسات عجیب سے ہو گئے ہیں۔" اس نے آنسوؤں میں بھیگی سرگوشی میں کہا۔ "بیک وقت تمہیں اپنا بھی محسوس کر رہی ہوں اور غیر بھی۔ تم مجھے دوست بھی لگ رہے ہو اور محبوب بھی۔ حالانکہ محبت میں نے زندگی میں اس شخص کے سوا کسی سے نہیں کی جو آج بھی میرا شوہر ہے۔ میرا تمہیں خوش آمدید کہنے کو جی بھی چاہتا تھا اور ساتھ ہی ہر معاملے میں اتنی سرد مہری بھی محسوس ہو رہی تھی کہ سوچ رہی تھی بس خاموش تماشائی بنی بیٹھی رہوں۔ صحیح طور پر میری اب بھی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں؟"

"تم کچھ بھی مت کرو۔" میں نے اس کے آنسو پونچھے۔ "تم جیسی بلند و بالا چٹانوں کو یکلخت ہی یوں شکستہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ اپنے شوہر کے سلسلے میں بھی تم ابتداء ہی سے غلطی کر گئیں۔ سال دو سال تک کسی بھی نشے کی عادت ایسی نہیں ہوتی جو چھڑائی نہ جا سکے۔ مجھے ایلما ایب وہاں کا ایک رسیا لگتا تھا۔ ایک وہ تہ خانے میں بند رکھا' معمولی سی تدابیر اختیار کیں' ٹھیک ہو گیا۔ آج بڑا نام کا آدمی بنا ہوا ہے۔ بس اس میں کچھ دن محنت کرنے کی ضرورت تھی۔ اذیت اسے بے شک بہت اٹھانی پڑتی لیکن بہرحال وہ مر نہیں سکتا تھا۔ اب بھی تمہیں یہی کرنا پڑے گا۔ ایک ماہ یا زیادہ سے زیادہ دو ماہ اس پر اور اس کے ساتھ ساتھ خود پر جبر کرنا پڑے گا اور سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"تمہاری باتوں نے مجھے ایک بار پھر وہی پرانی سینڈریلا بنا دیا ہے۔" اس کی آواز گو کر

اب بھی سرگوشی سے بلند نہیں تھی مگر اب اس میں ایک عزمِ نو کی آمیزش تھی حتیٰ کہ اب تو میں اپنے اندر اتنی ہمت محسوس کر رہی ہوں کہ اگر تم مجھے کوئی ہتھیار دے دو تو میں باہر فائرنگ کرتے ہوئے چاروں آدمیوں کو ٹھکانے لگا کر بڑے میدان میں پہنچ جاؤں جہاں عموماً دہشت خان بستی کے لوگوں کو خطاب کرتا ہے۔ میں بستی کے لوگوں کو ایک آواز دوں گی تو چند منٹوں کے اندر اندر ایک سرے سے دوسرے سرے تک خبر پہنچ جائے گی....."

"فی الحال اس کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "بہرصورت، شاید میں اکیلا تمہاری حفاظت نہ کر سکوں اور کسی سمت سے آنے والی گولی تمہیں خاموش کر جائے تو شاید میں بچی ہوئی بازی کو بھی نہ سنبھال سکوں۔ تم صرف صبح تک انتظار کر لو۔ صبح بہرحال تمہیں یہی کرنا ہوگا۔ آج رات کے اندر اندر میں اس فتنے کا سر کچل دوں گا۔ اس کے بعد عام لوگوں کے سیلِ رواں کے عتاب سے مجھے بچانا تمہارا کام ہوگا۔"

"اس کی تم فکر نہ کرو۔" وہ بولی۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "فی الحال میں صرف ان چار بدبختوں کی فکر کر رہا ہوں جو باہر ٹہل رہے ہیں۔"

ہم دونوں دوبارہ کمرے میں آ گئے جس کے راستے میں اندر آیا تھا۔ ایک کھڑکی سے ذرا سا پردہ ہٹا کر اس نے ایک پٹ میں مجھے چھوٹا سا گول سوراخ دکھایا اور سرگوشی میں بولی۔

"یہاں سے میں تمہیں دیکھ رہی تھی۔"

کمرے میں چونکہ اندھیرا تھا اور باہر لان پر تیز روشنی اس لیے میں نے کسی خاص احتیاط کی ضرورت محسوس کیے بغیر اس روزن سے آنکھ لگا دی۔ لان پر کئی قدم کے فاصلے پر اس وقت ایک محافظ دونوں ہاتھوں سے اسٹین گن سنبھالے اس طرح گزر رہا تھا جیسے دشمن بس اس کے سامنے ہی ہے اور وہ اگلے قدم پر اس کا جسم چھلنی کرنے جا رہا ہے۔

مجھے اس کے انداز پر ہنسی آتے آتے رہ گئی لیکن دوسرے ہی لمحے میں یہ دیکھ کر تشویش زدہ ہو گیا کہ آنکھوں کے سوا اس کے جسم کا کوئی حصہ اس وقت مجھے نظر نہیں آ رہا تھا کہ اس پر ذارت گن کی سوئی اثر انداز ہو سکتی۔ اس کا لباس تو تھا ہی موٹا اور دبیز لیکن اس نے چہرے پر بھی برفانی موسم میں پہنی جانے والی موٹی فر کی وہ نقاب نما ٹوپی پہنی ہوئی تھی جو سر سے لے کر گردن تک آنکھوں کے سوا ہر چیز کو ڈھانپ لیتی ہے' آنکھوں پر چشمے چڑھائے تھے۔

اس کا مطلب تھا کہ انہوں نے محافظوں کی لاشوں کا اچھی طرح معائنہ کیا تھا اور وہ ان کی موت کے سبب سے آگاہ ہو چکے تھے۔ انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ ان محافظوں کو ذارت گن سے ہلاک کیا گیا تھا' اس لیے انہوں نے اپنے بچاؤ کا انتظام کر لیا تھا اور اب اندر مستعد نظر آ رہے تھے۔

میرے خیال کی جلد ہی تصدیق ہو گئی جب باقی تین محافظ بھی یکے بعد دیگرے میرے سامنے سے گزرے۔ ان کے بھی چہروں پر فرکی نقاب اور ہاتھوں پر چرمی دستانے نظر آ رہے تھے بلکہ ایک محافظ کو غالباً فرکی ٹوپی میسر نہیں تھی تو اس نے کمبل کا کوئی ٹکڑا چہرے اور گردن کے گرد لپیٹا ہوا تھا۔ ان میں سے ایک تو یوں کھڑکی کی طرف دیکھتا ہوا گزرا جیسے اسے معلوم ہو کہ اس کے ایک روزن سے کسی کی آنکھ اسے دیکھ رہی ہے۔ وہ آگے بڑھ چکا تو میں ایک طویل سانس لے کر سینڈریلا کی طرف مڑا۔

"کیا حشمت اور اس کے ساتھی محافظوں کی لاشیں لے گئے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔" سینڈریلا نے جواب دیا۔ "جس گاڑی میں وہ آئے تھے، اس میں لاشیں ڈال کر لے گئے ہیں۔ حشمت خان اور اس کے دو خاص محافظوں کے سوا باقی سب پیدل گئے ہیں۔ بہرحال اب تو سب حشمت کے ٹھکانے پر پہنچ گئے ہوں گے۔"

دفعتاً میں نے اپنے ایئرفون پر ٹینی کی سرگوشی سنی۔ "منصور، منصور۔ اگر میری آواز تم تک پہنچ رہی ہے تو غور سے سنو۔ ابھی ابھی مسلح محافظ میری کوٹھڑی کے دروازے سے ہٹ کر کسی کام سے گیا ہے تو میں اپنی آواز تم تک پہنچانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ مجھے حشمت خان کے مکان کے تہ خانے میں پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ اس کا ذاتی عقوبت خانہ معلوم ہوتا ہے۔ میرے اردگرد کی کوٹھڑیوں میں بہت سے مرد اور عورتیں ناگفتہ بہ حالت میں قید ہیں۔ مجھے جیسے ہی یہاں پہنچایا گیا، ویسے ہی حشمت خان اپنے ساتھیوں کو لے کر تمہاری تلاش میں نکل گیا تھا اور میرے بارے میں کہہ گیا تھا کہ مجھ سے وہ واپس آ کر خود ہی نمٹے گا۔ مجھے لگتا ہے منصور کہ مجھ پر بہت زیادہ تشدد کیا جائے گا۔ اگر پہنچ سکتے ہو تو میری مدد کو پہنچو اور اگر اب اس دنیا میں ہماری ملاقات نہ ہو سکے تو میری کوتاہیوں کے لیے مجھے معاف کر دینا اور اگر مجھ سے کچھ اچھائیاں سرزد ہوئی ہوں تو ان کے حوالے سے مجھے اچھے الفاظ سے یاد رکھنا۔"

یہ سب کچھ سننے کے دوران میرے اعصاب پر تناؤ سا طاری رہا۔ ٹینی اس قسم کی باتیں کرنے والی لڑکی نہیں تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ مایوسی نے اس پر غلبہ پا لیا تھا جبکہ میں پہلے کی نسبت زیادہ پرامید ہو چکا تھا۔ اپنا کام مجھے زیادہ آسان محسوس ہونے لگا تھا لیکن یہ بات میں اسے نہیں بتا سکتا تھا۔ اسے تسلی نہیں دے سکتا تھا کیونکہ میرے پاس ٹرانسمیٹر کا صرف ریسیونگ سیٹ تھا۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ کاش شیبا نے محض چند پونڈوں کا اضافہ کر کے اپنے سیٹ کو پیغام پہنچانے کے قابل بھی بنوا لیا ہوتا لیکن اس وقت میرا خیال تھا کہ اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ صرف ٹینی کی آواز سنتے رہنا ہی میرے لیے کافی ہوگا۔

دفعتاً میں نے دوبارہ ٹینی کی آواز سنی۔ "یہ لو... وہ آ گئے..."

ساتھ ہی ایک کرخت آواز سنائی دی۔ "اے لڑکی...! یہ تم لاکٹ ہونٹوں سے لگائے کیا باتیں کر رہی تھیں؟ ادھر لاؤ... ذرا دکھاؤ مجھے..." یہ آواز حشمت خان کی بہرحال نہیں تھی۔

"نہیں... نہیں۔" ٹینی کی خوفزدہ سی آواز سنائی دی۔ "یہ لاکٹ مجھ سے مت چھینو۔ یہ میرے ایک پیارے دوست کی نشانی ہے۔"

"لیکن بستی کے گیٹ پر محافظوں کو تم نے بتایا تھا کہ یہ تمہیں خضدار کی ایک گلی میں پڑا ملا تھا۔ تیسری بار پوچھا جائے تو شاید تم کچھ اور سناؤ۔ ویسے تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ہم اس لاکٹ کو پہچانتے ہیں۔"

اس پر ایک قہقہہ سنائی دیا جو یقیناً حشمت خان نے لگایا تھا۔ اس کے بعد ٹینی کی آواز سنائی نہیں دی البتہ کھٹ پٹ کی چند آوازوں کے بعد وہی کرخت آواز ابھری۔ "دیکھا باس یہ اندازہ درست ہی تھا۔ اس میں ٹرانسمیٹر پوشیدہ ہے۔"

"لاؤ ذرا اسے ہم بھی استعمال کر کے دیکھیں۔" حشمت خان نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "بیچارے اپنی دانست میں بڑی جدید چیز لے کر آئے ہیں۔" پھر وہ کھنکار کر بولا۔ "اس لڑکی کے ساتھ آنے والے اجنبی! اگر تمہیں اس لڑکی سے ذرا بھی لگاؤ ہے یا اس کی جان کی پروا ہے تو دس منٹ کے اندر اندر اپنے آپ کو میرے حضور پیش کر دو ورنہ اس لڑکی کی شہ رگ کاٹ دی جائے گی۔ میرے ہاں پہنچنے کے لیے تم بستی میں نظر آنے والے کسی بھی فرد سے کہہ دینا کہ تمہیں موتی کے گھر پہنچا دیا جائے۔ وہ تمہیں میرے دروازے تک چھوڑ جائے گا۔ یاد رکھنا... ٹھیک دس منٹ۔" اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔

"کیا بات ہے، تم یکلخت خاموش ہو گئے ہو؟" سینڈریلا نے اندھیرے میں سرگوشی کی۔ "میں تمہاری صورت نہیں دیکھ پا رہی مگر محسوس کر رہی ہوں کہ تم یکلخت مضطرب ہو گئے ہو؟ کیا ٹرانسمیٹر پر کوئی بری خبر سنائی دی ہے؟"

"تمہارے خیال میں کیا ہم اس وقت اچھی خبریں سننے کی پوزیشن میں ہیں؟"

میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ میری مسکراہٹ نہیں دیکھ سکے گی۔ پھر میں نے اسے تیزی سے بتایا کہ میں نے ٹرانسمیٹر پر کیا سنا ہے۔ اس کے بعد میں نے کہا، "اب شیر کو کچھار سے باہر آنا پڑے گا۔ سینڈریلا! میری ماں نے مجھے وصیت کی تھی کہ میں بیک وقت شیر کی طرح بہادر بننے کی بھی کوشش کروں اور لومڑی کی طرح مکار بھی۔ میں اب ان دونوں خصوصیات کو ساتھ لے کر چلنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن حشمت خان کا پیغام سننے کے بعد میرے اندر کی لومڑی کسی کھوہ میں جا سوئی ہے اور صرف شیر باہر رہ گیا ہے۔ حشمت خان کے چھپے ہوئے مسخرے جیسے میرے اندر بیٹھے ہوئے کسی آتش فشاں کا دہانہ کھول دیا ہے۔ اس کے للکارنے کا انداز بتاتا ہے کہ وہ مجھے بہت ہی حقیر

انسان سمجھ رہا ہے۔ وہ خود دنیا کا ایجنٹ ہے اور شاید اس نے مجھے بھی مافیا کے کسی گھٹیا ایجنٹ کی طرح کوئی موقع پرست' اچکا اور بدمعاش سمجھا ہے۔ میں اسے بتانے جا رہا ہوں کہ میں کون ہوں' کیا ہوں۔ لہٰذا میں اسے لڑکی سے بدسلوکی کرنے' تمہارے شوہر کی زندگی سے کھیلنے اور اس بستی کے معصوم لوگوں کو آلۂ کار بنانے کی بڑی بھیانک سزا دوں گا۔"

"تم جذباتی ہو رہے ہو۔" وہ مضطربانہ انداز میں میرے ساتھ ہی اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کی انگلیاں سختی سے میرے بازوؤں پر جم گئیں۔ اس کی گرفت میں مردانہ سختی تھی۔

"ایک عرصے بعد تو مجھ پر جذباتیت غالب آئی ہے۔" میں نے آہستگی سے اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔ "اب شعلہ بھڑک ہی اٹھا ہے تو اس سے کوئی کام لینے دو۔"

"تمہیں شاید احساس نہیں کہ وہ تمہارے لیے جال پھینک رہا ہے۔ وہ لڑکی کو اتنی جلدی ہلاک نہیں کرے گا۔" سینڈریلا نے گویا مجھے سمجھایا۔

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "میں اس کے باوجود اس کے جال میں جا رہا ہوں۔ اسے یہ بتانے کے لیے کہ گیدڑ خواہ تعداد میں کتنے ہی کیوں نہ ہوں' شیر کو قابو میں نہیں کر سکتے۔"

"وہی جذباتی اور افسانوی باتیں....." سینڈریلا قدرے بیزاری سے بولی۔ "میں کہتی ہوں....."

"تم کچھ بھی مت کہو۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "مجھے صرف حشمت کے گھر تک پہنچنے کا محفوظ راستہ بتا دو' پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔" وہ ایک لمحے تک خاموش رہی' پھر گہری سانس لے کر بولی۔ "تمہارے گیٹ کے عین سامنے پتھریلی سڑک کے وسط میں پتھر کا ایک بلاک تمہیں علیحدہ سا رکھا نظر آئے گا۔ اس میں آہنی کنڈا بھی لگا نظر آئے گا۔ اس بلاک کو اٹھا کر اطمینان سے نیچے اتر جانا۔ وہ سرنگ نما ایک پائپ ہوگا لیکن بالکل صاف ستھرا اور خشک۔ اس میں تمہیں ذرا جھک کر چلنا پڑے گا اور اترتے وقت ذرا سمت کا خیال رکھنا کہ تمہارے گیٹ کی عین مخالف سمت میں چلو۔ دائیں ہاتھ کی طرف نہیں۔ جہاں پہنچ کر پائپ لائن نما یہ چوکور سرنگ ختم ہو جائے' وہیں تمہیں ایک اور بلاک ہٹانا پڑے گا۔ تم جہاں نکلو گے' وہاں تمہارے سامنے ہی حشمت خان کے مکان کی عقبی دیوار ہوگی۔ شرافت بھی وہیں رہتا ہے۔"

"یہ سرنگ جس کے متعلق تم بتا رہی ہو' درحقیقت ہے کیا؟" میں نے پوچھا۔

"درحقیقت یہ پتھر کی سلوں سے بنی ہوئی ایک نالی ہے جو کئی گلیوں میں پھیلی ہوئی ہے۔"

سینڈریلا نے بتایا۔ "برفباری کے دنوں میں اس میں پانی ذخیرہ کیا جاتا ہے کیونکہ جب درجہ حرارت نقطہ انجماد سے بھی گر جاتا ہے تو پانی کہیں بھی رکھا جائے' جم جاتا ہے اور اس

زمین دوز نالی میں نہیں جمتا۔ افغانستان وغیرہ میں تو اسے کاریز کہتے ہیں' یہاں اسے ڈبلائی کہا جاتا ہے۔"

میں نے تھیلے میں اڑی ہوئی اسٹین گن نکال کر دیوان کے نیچے رکھی اور سینڈریلا کو ہدایت کی۔ "اس کا استعمال مت شروع کرو۔ فی الحال شور شرابے کی ضرورت نہیں۔"

گن رکھ دینے کے بعد میں نے اپنے آپ کو کافی ہلکا پھلکا سا محسوس کیا۔ وہ اب تک میری آزادانہ نقل و حرکت میں رکاوٹ بن رہی تھیں۔ میں نے اپنا مخصوص ساخت کا خنجر نکالا اور ایک بار پھر کھڑکی کے روزن سے آنکھ لگا کر دیکھا۔ ایک نگران مکان کے کونے تک پہنچ چکا تھا اور دوسرا میرے اندازے کے مطابق دوسرے کونے سے نمودار ہونے والا تھا۔

میں نے آہستگی سے دروازہ کھولا اور تاریکی کی چادر ہی میں رینگتے ہوئے کونے کے قریب دیوار سے چپک گیا۔ میں یہاں کچھ ایسی محفوظ پوزیشن میں نہیں تھا۔ مسلح محافظ اگر موڑ عبور کرنے کے بعد دیوار کی طرف دیکھتا تو نہایت آسانی سے مجھے بھی دیکھ سکتا تھا اور میرے خنجر کی جھلملاہٹ کو بھی لیکن دوسرا نگران جیسے ہی مکان کے کونے سے ایک قدم آگے آیا' میں نے اسے دیوار کی طرف دیکھنے کی مہلت دیئے بغیر روشنی ہی میں اس پر جھپٹ کر بائیں ہاتھ سے خنجر اس کے دل میں اتارا اور ساتھ ہی دائیں ہاتھ سے اس کی گردن پر کراٹے کا وار کیا۔ میرے خیال میں بیک وقت ان دونوں کارروائیوں کا نشانہ بننے والا نہ تو یہ اندازہ کر سکتا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے اور نہ اسے یہ سوچنے کی مہلت مل سکی کہ وہ مر رہا ہے۔ یہ عمل بس ایسے ہی تھا جیسے آپ اچانک جھٹکے سے کوئی ڈوری توڑ دیں' زندگی کی ڈوری۔

اس سے پہلے کہ اس کا بے جان جسم لاش کی طرح زمین کو چھوتا' میں نے اسے اندھیرے میں گھسیٹ لیا اور دیوار کے ساتھ لٹا دیا۔ اس دیوار کے سائے میں آج نہ جانے کتنے بے جان جسموں کو پناہ گزین ہونا تھا۔ اگر میں اسے فوراً نہ گھسیٹتا تو شاید پیچھے سے مکان کے دوسرے کونے سے نمودار ہونے والا نگران اسے دیکھ لیتا۔ چند سیکنڈ بعد وہ میرے سامنے نمودار ہوا اور اس کا بھی چشم زدن میں یہی حشر ہوا۔

تین چار منٹ کے اندر اندر وہ چاروں ذبح مرغیوں کی طرح دیوار کے سائے میں پڑے تھے۔ میں نے ان کی صورتیں تک دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔ میرے جسم میں دوڑتا ہوا خون جیسے آتشی سیال بن گیا تھا۔ نس نس میں جیسے بجلیاں کوند رہی تھیں۔ میں نے ان میں سے دو کی اسٹین گنیں اٹھا کر کندھوں پر لٹکائیں۔ یہ جدید ساخت کی نہایت عمدہ جرمن اسٹین گنیں تھیں لیکن مجھے جو گن تحفے میں ملی تھی' وہ ان سے بھی عمدہ تھی۔ وہ اتنی بھاری اور سائز میں بڑی نہیں تھی لیکن محض دیکھنے میں ہی ان سے کہیں بہتر لگتی تھی۔ کچھ ایمونیشن بھی میں نے کمر سے باندھ لیا۔ پلٹ کر واپس میں کمرے میں آیا'

اس وقت تک سینڈریلا نے چیخ چلانا بند کر دیا تھا۔ وہ یقیناً دیکھ چکی تھی کہ چاروں نگراں مر چکے تھے۔ میں نے سینڈریلا کی طرف دیکھے بغیر دیوان کے نیچے سے اپنی اسٹین گن نکالی' اسے دوبارہ نیفے میں اڑسا اور ایک بار پھر دروازے کی طرف لپکا۔

"میری بات تو سنو......" سینڈریلا نے میرا بازو تھامنے کی کوشش کی' میں نے رک کر اس کی طرف دیکھا تو اس نے گویا گھبرا کر ہاتھ کھینچ لیا۔

میں دوبارہ دروازے کی طرف لپکا اور اس سے نکل کر اس درندے کی طرح گیٹ کی طرف بھاگا جسے کئی دن بھوکا رہنے کے بعد شکار نظر آیا ہو۔ کاریز کے دہانے پر رکھی ہوئی موٹی سی پتھر کی سل مجھے فوراً ہی نظر آ گئی۔ میں نے اس کا آہنی کنڈا پکڑ کر اسے اٹھایا تو وہ مجھے بے حد ہلکی پھلکی معلوم ہوئی۔ میرے اندازے کے مطابق عام طور پر اسے کم از کم چار افراد مل کر اٹھاتے ہوں گے۔

میں کاریز میں اترا اور سینڈریلا کی بتائی ہوئی سمت میں دوڑتا چلا گیا۔ کاریز میں پانی بے شک نہیں تھا لیکن نمی اور پھسلن کافی تھی۔ دو ایک مرتبہ پتھریلی دیواروں سے ٹکرانے کے بعد مجھے سنبھل کر چلنا پڑا۔

گھپ تاریکی میں مجھے زیادہ دیر نہیں چلنا پڑا۔ جلد ہی میرے سامنے دیوار آ گئی۔ اس مقام پر میں نے بازو بلند کرتے اوپر کو زور لگایا تو پتھر کا ایک مستطیل ٹکڑا اوپر کو اٹھتا چلا گیا۔ میں نے ایک جھٹکے سے اسے دور اچھال دیا۔ اس کے الٹ کر گرنے سے کافی آواز پیدا ہوئی لیکن اب جیسے میری زندگی میں احتیاط کا عمل دخل تو ختم ہی ہو گیا تھا۔

شاید اس آواز کا ردعمل تھا کہ میں جیسے ہی اچھل کر مستطیل دہانے سے باہر آیا میرا استقبال گولیوں سے ہوا۔ یہ میری خوش قسمتی یا پھر شاید میرے اچھل کر نکلنے کا نتیجہ تھا کہ میں گولیوں کی بوچھاڑ سے بچ گیا تھا۔ اگر میں نے اطمینان سے نکلنے کی کوشش کی ہوتی تو شاید میری کھوپڑی کے پرخچے اڑ جاتے کیونکہ گولیوں کی باڑ عین کاریز کے دہانے پر پڑی تھی۔

میں زمین پر لوٹتا ہوا کچھ دور چلا گیا۔ اتنا میں نے دیکھ لیا تھا کہ گولیوں کی یہ باڑ سامنے ہی نظر آنے والی ایک دیوار کی طرف سے آئی تھی جو غالباً ایک قلعہ نما مکان کی عقبی دیوار تھی۔ اس پر باقاعدہ قلعے کی دیوار کی طرح کنگورے بھی بنے ہوئے تھے۔ اس دیوار کے عقب میں تھوڑی سی روشنی بھی تھی اور دیوار سے باہر کو جھانکتے ہوئے کچھ انسانوں کے ادھورے دھڑ تاریک پرچھائیوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ اس منظر سے قدیم زمانے کے ان شاہی قلعوں کا تصور ذہن میں ابھرا تھا جن کے گرد دشمنوں کی فوجیں محاصرہ ڈال لیتی تھیں اور محصور فوجی کبھی کبھی دیواروں کے عقب سے نقلی چوکیوں سے سر نکال کر ان پر تیر برسانے لگتے تھے۔

ابھی میں سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ روشنی کا ایک سیلاب سا امڈ پڑا جس نے اس سرنگ اور اس کے دونوں اطراف کے نشیبی حصوں کو منور کر دیا جس پر میں نے دوڑ لگائی تھی۔ اسٹین گن اس وقت میرے ہاتھ میں تھی لیکن میں جوابی فائر کرنے سے پہلے اپنی جگہ سے ہٹ جانا بہتر سمجھا۔ نشیب میں کچھ ہی فاصلے پر مجھے ایک تناور درخت نظر آیا تھا۔ میں نے اس کے عقب میں پناہ لینے کے لیے چھلانگ لگائی تھی اور اسی چھلانگ نے ایک بار پھر مجھے بچا لیا۔ میں نے جو جگہ چھوڑی تھی' دوسرے ہی لمحے اس جگہ گولیوں نے زمین کے خاصے بڑے ٹکڑے کو ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ گویا صرف ایک ایک لمحے کی تاخیر سے میرا تعاقب کر رہی تھیں اور یہ ایک ایک لمحہ ہی میرے لیے زندگی کا پیغام بن رہا تھا۔

درخت کے تنے کی آڑ لیتے ہوئے میں نے سب سے پہلے روشنی کے ماخذ ختم کرنے کے لیے گولیاں برسائیں۔ وہ صرف تین عدد لائٹس تھیں جو دیوار پر مجھے ڈوبتے سورج کی طرح دمکتی نظر آئی تھیں۔ میری پہلی کوشش میں تینوں لائٹس چکنا چور ہو گئیں اور ساتھ ہی دیوار سے جھانکتی ہوئی پرچھائیاں بھی کچھ کم ہو گئیں۔ اس سے پہلے کہ باقی لوگ اپنے بچاؤ کے لیے کچھ کر پاتے یا کم از کم سر نیچے کرکے دیوار کے پیچھے پناہ......لے پاتے' میں نے ان کا بھی صفایا کر دیا۔

فائرنگ ختم ہوئی تو میں مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے درخت پر چڑھ گیا۔ اس کے سوا مجھے کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آ رہی تھی جس پر چڑھ کر میں چار دیواری کے اندر کا منظر دیکھ سکتا۔ فی الحال دیوار کے قریب جانے کا خطرہ میں مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ درخت پر گویا میں بروقت ہی چڑھا تھا کیونکہ ابھی دو شاخوں پر پاؤں جما کر اور اسٹین گن صحیح طور پر تھام کر سنبھلا ہی تھا کہ چار دیواری کے اندر مجھے کئی افراد رائفلیں وغیرہ اٹھائے اس عقبی دیوار کی طرف دوڑتے نظر آئے۔ یہ غالباً وہ محافظ تھے جو مکان کے سامنے والے حصے کی طرف تعینات تھے۔ وہ اندھا دھند دوڑتے چلے آ رہے تھے۔

میں بے شک درندگی اور جوش سے تقریباً بے قابو ہو کر یہاں تک آیا تھا لیکن اس عالم میں بھی میری ایک حکمت عملی تھی اور وہ یہ کہ ان لوگوں میں بھگدڑ مچا دی جائے' انہیں اندھا دھند ہر قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا جائے اور خود حتی الامکان پرسکون رہتے ہوئے ان کی بدنظمی اور افراتفری سے فائدہ اٹھایا جائے۔

اس سے پہلے کہ وہ سب دیوار تک پہنچ پاتے' میں نے انہیں چھلنی کرنا شروع کر دیا۔ کھلے لان نما حصے پر وہ صاف نظر آ رہے تھے لیکن وہ بوکھلاہٹ میں اندازہ نہیں کر پا رہے تھے کہ گولیاں کدھر سے آ رہی ہیں اور غالباً وہ اس غلط فہمی میں بھی مبتلا ہو گئے تھے کہ ان پر فائرنگ کرنے والے ایک سے زیادہ ہیں کیونکہ انہوں نے جوابی فائرنگ کی کوشش کی تو ان میں سے ہر ایک کی فائرنگ کا رخ مختلف تھا۔

سینڈریلا کی آواز بھی ہجوم کے قریب ہی کہیں سے آئی تھی اور یہ شاید میری کسی نامعلوم حس کا ہی کمال تھا کہ میں نے اس آواز کو پہچان لیا تھا ورنہ یہ اس آواز سے تو قطعی مختلف تھی جو میں نے سینڈریلا کے گھر میں سنی تھی۔ جو آواز اب میں سن رہا تھا وہ گرجدار اور خطیبانہ تھی۔ نسوانیت کے باوجود اس میں زبردست رعب اور دبدبہ تھا۔ الفاظ میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے لیکن انداز سے میں سمجھ سکتا تھا کہ وہ لوگوں کو اپنی طرف بلا رہی تھی۔ اس کی آواز بلند ہوتے ہی دیگر آوازوں کا شور یکلخت ختم ہو گیا تھا۔

سینڈریلا خاموش ہوئی تو ایک گونجدار مردانہ آواز سنائی دی۔ سینڈریلا نے جو کچھ کہا تھا یہ آواز غالباً اس کا انگریزی میں ترجمہ کر رہی تھی۔ وہ یہ ترجمہ شاید گنتی کے چند افراد یا پھر صرف مجھے ہی سنانے کے لیے کیا جا رہا تھا۔ وہ شخص اعلان کر رہا تھا۔

"بستی کے لوگو! تمہارے لیے آسمانوں سے خوشخبری آئی ہے۔ دھماکوں اور گولیوں کی آواز سے خوف یا پریشانی میں مبتلا ہونے کی کوئی ضرورت نہیں...... دراصل یہ ایک بہت بڑے فریب کا پردہ چاک ہو رہا ہے۔ جھوٹ اور دھوکہ بازی کا ایک خوفناک ڈرامہ اپنے انجام کو پہنچ رہا ہے...... یہ ساری حقیقت تم لوگوں کے سامنے مقدس پانی کی اپنی زبان سے بیان کرے گی۔ سب لوگ فوراً میدان میں جمع ہو جائیں۔ کوئی شخص سنوچی کے مکان کے قریب نہ جائے...... ورنہ آسمانی بلائیں اسے اپنی گرفت میں لے لیں گی...... کیونکہ اس وقت دیوتا سنوچی سے ان تمام دھوکوں کا حساب لے رہے ہیں جو اس نے گزشتہ تین برسوں میں اس بستی کے معصوم لوگوں کو دیئے ہیں۔ مقدس پانی کی اپنی ڈھائی سال کی قید تنہائی سے آزاد ہو کر بڑے میدان کی طرف جا رہی ہیں۔ وہاں تم لوگ مقدس پانی کا دیدار بھی کر سکو گے اور اپنی آنکھوں سے دیکھ سکو گے کہ گزشتہ ڈھائی برسوں میں تم نے ان کی خبر نہ لی تو اس دوران ان پر کیا بیتا...... سب لوگ جلد از جلد بڑے میدان میں پہنچیں۔ جو شخص سنوچی کے مکان کی طرف جائے گا اس کی زندگی کی ضمانت نہیں دی جا سکے گی۔ آسمانی بلاؤں کے غیظ و غضب کا رخ اس کی طرف بھی ہو جائے گا۔"

میں نے یہ سب کچھ سن کر بے آواز طریقے سے اطمینان بھری سانس لی۔ حشمت خان اور شرافت خان نے تو اس وادی میں ڈھائی تین سال اپنا ڈرامہ بڑی کامیابی سے چلایا تھا

لیکن سینڈریلا کو بھی جیسے ہی موقع ملا تھا اس نے ہنگامی ڈرامہ بڑی عمدگی سے شروع کیا تھا اور صورتحال کو سنبھال لیا تھا۔ اس نے گویا مجھے موقع فراہم کر دیا تھا کہ "لو میاں منصور! عام آدمیوں کے ہجوم کو تو میں ایک طرف لے جا رہی ہوں، اب تم جو تیر چلا سکتے ہو، چلا لو۔"

میں نے ایک بار پھر لوگوں کا شور بلند ہوتے سنا لیکن یہ شور بتدریج مدھم پڑتا جا رہا تھا۔ جیسے ہجوم کا رخ کسی اور طرف کو ہو گیا ہو۔ اس سے میرے حوصلے بلند ہو گئے۔ میں نے ایک بار پھر مکان کی کھڑکیوں اور دروازوں پر فائرنگ شروع کر دی۔ میں ایک بار چوہے کو بل سے نکال لینا چاہتا تھا لیکن چوہا بھی بڑا مکار تھا۔ معلوم نہیں کہاں دم سادھے بیٹھا ہوا تھا۔

میں اب اس بلند و بالا دروازے کی سیدھ میں تاریکی میں زمین سے چپکا ہوا تھا جو اس عمارت کا واحد دروازہ معلوم ہوتا تھا۔ میں نے چند منٹ اس دروازے پر گولیاں برسائیں لیکن دروازہ یقیناً ٹھوس لوہے کا تھا کیونکہ اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا اور گولیوں کے ٹکرانے سے بے تحاشا چنگاریاں بھی اڑی تھیں۔

میں اس وقت تقریباً پوری عمارت کے گرد چکر کاٹ چکا تھا اور مجھے کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آئی تھی جس سے میں اندر گھسنے کی کوشش کر سکتا اور یہ بات میرے لیے بے حد پریشان کن تھی...... آخر میں تنہا انسان کب تک اس عمارت کے چاروں طرف نظر رکھ سکتا تھا۔ جیسے اس وقت میں اس کے سامنے والے حصے کی طرف موجود تھا تو عقبی حصے کی طرف سے کوئی بھی کھڑکی کے راستے فرار ہو سکتا تھا۔ مجھے اس کا علم کافی دیر بعد ہوتا یا شاید نہ ہوتا۔

میرے پاس سامان کی تھیلی کے علاوہ ایک بم موجود تھا جو میرے جیلے سے بندھا ہوا تھا۔ یہ اپنے سائز سے قطع نظر نہایت خطرناک اور تباہ کن بم تھا لیکن اسے میں نے کسی انتہائی آڑے وقت کے لیے بچایا ہوا تھا۔ ایک طرح سے وہ میرا آخری حربہ تھا۔ تاہم میں نے اس کی دھمکی دینے میں...... کوئی حرج نہ سمجھا۔

میں نے آہنی دروازے پر مزید کچھ گولیاں ضائع کیں۔ پھر للکارنے والے انداز میں کہا۔ "شرافت اور حشمت خان! یہ عمارت اس وقت چاروں طرف میرے ساتھیوں کے نرغے میں ہے۔ اگر تم ہتھیار ڈال کر باہر آ جاؤ تو شاید وہ معاملہ مذاکرات سے طے پا جائے۔ اس کی خاطر میں تم پر حملہ روکے ہوا ہوں...... میں تمہیں صرف پانچ منٹ دوں گا۔ اس کے بعد ہم عمارت پر بم برسانے شروع کر دیں گے اور تم اپنے بچے کھچے ساتھیوں سمیت ملبے میں دفن ہو جاؤ گے۔"

میں نے محض دھمکی ہی دی تھی لیکن دوسری طرف سے سچ مچ ہی بم پھینک دیا گیا۔

میں نے اپنے حق میں اچھا کام یہ کیا تھا کہ بات ختم کرتے ہی اپنی جگہ چھوڑ دی تھی اور کافی آگے کھسک کر جھاڑی کی ایک باڑھ کی اوٹ میں جا لیا تھا۔ اسی لمحے میں نے دروازے کے قریب ہی ایک کھڑکی کا شٹر بے آواز طریقے سے ذرا اوپر اٹھتے دیکھا۔ شٹر زیادہ نہیں کھلا اور میں نے قدرے لمبوتری ایک گیند سی ہوا میں اچھلتے دیکھی۔

یہ ایک چھوٹا ہینڈ گرینیڈ تھا جو عین اس جگہ پر جا کر گرا جہاں لیٹے لیٹے میں نے باپ بیٹے کو للکارا تھا۔ لان کی مٹی اچھلی اور نہ جانے کس کس چیز کے ٹکڑے اڑتے ہوئے میرے اوپر سے گزر کر خاصی دور تک جا گرے۔ اگر میں اپنی موجودہ پوزیشن پر پہنچ کے لیٹا ہونے کے بجائے کھڑا ہوتا تو یقیناً زخمی ہوتا اور اگر سابق پوزیشن پر ہی ہوتا تو یقیناً میرے اعضاء بکھر چکے ہوتے۔

بہرحال اس سے ایک بات ظاہر تھی کہ اندر موجود افراد اگر مجھے دیکھ نہیں پا رہے تھے تو میری آواز ان تک ضرور پہنچ رہی تھی اور آواز ہی سے انہوں نے میری پوزیشن کا اندازہ کیا تھا۔ اس دوران کھڑکی کا جو شٹر گر چکا تھا' مجھے دوبارہ اٹھتا نظر آیا لیکن اس سے پہلے کہ کھڑکی سے کچھ باہر آتا' میں نے اس مختصر سے خلا میں گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ کھڑکی کا شٹر تو فوراً ہی گر گیا لیکن میں نے گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے ہم آہنگ ہو جانے والی ایک چیخ ضرور سن لی تھی۔

معاملہ طول پکڑتا جا رہا تھا۔ کچھ کر گزرنا ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے سینے سے چپکا ہوا تباہ کن بم علیحدہ کیا' اس پر لپٹا ہوا ایک خاص ٹیپ کھولا' سیفٹی پن ہٹائی اور اسے کھڑکی پر دے مارا۔

احسان مرزا نے جب یہ بم عام سے پیکٹ کی شکل میں میرے حوالے کیا تھا تو اس کی تباہ کاری کے متعلق اشارۃً بتایا تھا لیکن مجھے امید نہیں تھی کہ اتنا مختصر سا سادہ بم ایک بہت بڑی بکتر بند گاڑی سے مشابہ اس عمارت کو اتنا نقصان پہنچائے گا اور اس طرح اس علاقے میں چند لمحے کے لیے زلزلہ سا برپا کر دے گا۔

دھماکے سے ایک بار تو میں بھی سٹپٹا گیا اور فوراً سانپ کی طرح رخ بدل کر پیچھے کو بھاگا۔ محفوظ فاصلے پر رک کر میں نے مڑ کر دیکھا۔ سامنے والی دیوار جو بلاشبہ کچھ دیر پہلے تک سیسہ پلائی ہوئی دیوار سے زیادہ مضبوط اور ٹھوس نظر آ رہی تھی' اس کا بیشتر حصہ اور اس کے ساتھ چھت کا بھی کچھ حصہ ملبے کا ڈھیر بن چکا تھا اور ایک طویل و عریض بھیانک خلاء منہ کھول چکا تھا۔

میرے خیال میں یہ پیش قدمی کے لیے موزوں ترین وقت تھا۔ اس خلا کے عقب سے کچھ کمروں کی نیم شکستہ دیواریں اور ایک آدھ دروازہ دکھائی دے رہا تھا لیکن جہاں تک میری نظر کام کر رہی تھی' کسی انسان کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔

میں اٹھ کر جھکا جھکا اس طرف دوڑا۔ دیوار کے ملبے پر چڑھتے وقت میں نے اردگرد فائرنگ کر کے کچھ گولیاں ضائع کیں لیکن ان کا کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا۔ ملبے کے دوسری طرف اتر کر میں نے دیکھا کہ دو مردوں کی مسخ شدہ لاشیں تو آدھی ملبے تلے دبی پڑی تھیں اور دو کی ان سے کچھ فاصلے پر پڑی تھیں جنہیں بظاہر کچھ زیادہ چوٹیں وغیرہ تو نہیں آئی تھیں جتنی آئی تھیں' وہ ان کی ہلاکت کے لیے کافی ثابت ہوئی تھیں۔

ان سے ذرا پیچھے نیم شکستہ کمرے کی پچھلی دیوار کے قریب ایک لڑکی برائے نام لباس میں پڑی زخمی حالت میں آخری سانسیں لے رہی تھی۔ اس کی گردن میں نہ جانے کس چیز کا ٹکڑا پیوست تھا۔ اس کا جسم ...... ادھ مری بطخ کی طرح پھڑک رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد یہ جسم سرد ہونے والا تھا۔ اتنا مجھے اندازہ تھا۔ میں اس کے قریب رکا نہیں' تاہم میں نے مردوں کی لاشوں کو ایک نظر دیکھا مگر ان میں کوئی بھی حشمت یا شرافت نہیں تھا۔

میں نیم شکستہ کمرے کے عقبی دروازے کی طرف دوڑا جو مجھے نظر آ رہا تھا۔ کسی ممکنہ شکنجے سے بچنے کے لیے میں نے دروازہ لات مار کر کھولا اور ساتھ ہی ایک طرف ہٹتے ہوئے اندھا دھند کمرے میں چاروں طرف گولیاں برسائیں۔ یہاں بھی کسی کی موجودگی کے آثار نظر نہ آئے۔ میں اس کمرے میں گھس پڑا' اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ فرنیچر بھی جوں کا توں تھا۔

میں اس سے گزر کر ایک ہال میں پہنچا۔ وہ بھی خالی تھا' ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عمارت سے زندگی کے آثار ہی مفقود ہو چکے ہیں لیکن ہال کے ایک کونے میں مجھے تنگ سی سیڑھیاں نیچے جاتی نظر آ گئیں۔ میں نے جھانک کر دیکھا' ان کے اختتام پر لکڑی کا ایک دروازہ تھا جو نہ صرف بند تھا بلکہ مجھے یقین تھا کہ وہ مقفل بھی تھا...... میں واپس وہاں آیا جہاں میں نے لاشیں دیوار کے ملبے تلے دبی دیکھی تھیں۔ میری توقع کے مطابق یہاں مجھے ایک ہینڈ گرینیڈ محفوظ حالت میں پڑا مل گیا۔ یہ گرینیڈ اٹھا کر میں واپس اس ہال کی طرف دوڑا۔ مجھے معلوم تھا کہ میرا اصل دشمن بھی تہہ خانے میں محفوظ ہے اور وہاں شاید کچھ دشواریاں بھی میری منتظر ہیں لیکن اب منزل مجھے سامنے ہی نظر آ رہی تھی۔

راستہ وہی تھا ...... جس سے میں پہلے بھی گزر کر اندر آیا تھا اور دوبارہ منہدم شدہ دیواروں کی طرف گیا تھا لیکن اس بار جیسے ہی میں واپس ہال میں پہنچا تو دو قدم چلتے ہی یکلخت نیچے میرے پیروں کے نیچے سے فرش کا کچھ حصہ غائب ہو گیا۔ میں نے سنبھلنے کی بہت کوشش کی لیکن جب انسان کے پیروں تلے زمین ہی نہ رہے تو وہ کیسے سنبھل سکتا ہے؟

اسٹین گن' بم سب کچھ میرے ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔ غنیمت تھا کہ ابھی میں نے اس کی سیفٹی پن نہیں ہٹائی تھی ورنہ شاید میرے چیتھڑے اسی کی بدولت اڑتے۔ میں ایک تاریک خلاء میں نیچے کی طرف جا رہا تھا اور سب سے زیادہ تشویش کی بات یہ تھی کہ میں

بال کے فرش کی سطح سے نیچے آتے ہی الٹا ہو گیا تھا لیکن اب میں سر کے بل نیچے جا رہا تھا اور کسی بھی لمحے میرا سر اس خلا کی تہہ سے ٹکرا کر پاش پاش ہو سکتا تھا۔ میں نے قلابازی لگا کر سیدھا ہونے کی کوشش کی لیکن مجھے قدرے تاخیر ہو گئی۔ کافی حد تک بچاؤ ہو جانے کے باوجود میرا سر بجونڈی فرش سے ٹکرا ہی گیا اور میرے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے' مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

مجھے ہوش از خود نہیں آیا۔ پہلا احساس مجھے یہی ہوا کہ کوئی مجھے بالوں سے پکڑ کے میرے سر کو جھٹکے دے رہا تھا اور میرے چہرے پر پانی کے چھینٹے مار رہا تھا۔ میں نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی لیکن پپوٹے جیسے بے حد وزنی ہو گئے تھے۔ پھر میں نے ہاتھوں کو حرکت دینے کی کوشش کی تو احساس ہوا کہ وہ میری پشت پر بندھے ہوئے تھے۔

میں سر اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ یوں جھکا جا رہا تھا جیسے گردن کا منکا ہی سلامت نہ رہا ہو۔ بمشکل تمام آنکھیں ذرا کھلیں اور گردن کچھ سیدھی ہوئی تو احساس ہوا کہ میں دوزانو بیٹھا ہوا تھا۔ جسم پر صرف ایک بنیان اور شلوار نما پاجامہ رہ گیا تھا' شاید اسی لیے مجھے خنکی محسوس ہو رہی تھی۔

میرا اٹھائے جانے کا انداز ایسا تھا جیسے میں کسی رومن شہنشاہ کا قیدی ہوں اور شہنشاہ کے بار فرمانے پر مجھے گھسیٹ کر دربار میں لے گیا ہو۔ میری گردن میں کئی من وزنی زنجیریں ہیں جن کے بوجھ سے گردن جھکی جا رہی ہے اور آداب شاہی کے مطابق مجھے دوزانو بٹھایا گیا ہے۔

تب کہیں جب میری نظر کچھ بہتر ہوئی تو مجھے اپنے سامنے ایک شہنشاہ بھی بیٹھا نظر آ گیا۔ پہلے تو یہ سب کچھ مجھے ایک واہمہ یا خواب محسوس ہوا لیکن میں نے سر کو جھٹکا دیا تو درد کی ایک شدید لہر اٹھنے اور معدوم ہونے کے بعد مجھے اس شہنشاہ کی صورت کچھ مانوس معلوم ہوئی۔

پھر اچانک ہی میرے ذہن نے کام کرنا شروع کر دیا۔ جیسے کسی برقی مشین کا سوئچ اتفاق آن ہو گیا ہو۔ میں نے اس شہنشاہ کو پہچان لیا۔ وہ حشمت خان تھا جو انتہائی رعونت سے ایک سجے سجائے تخت نما دیوان پر مخملیں گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا..... اس کے جسم پر ایک زرق برق شاہانہ لبادہ تھا۔ میں نے فلم کی صورت میں اس کے جو دو روپ دیکھے تھے' ان میں سے ایک میں اس کا سر صفاچٹ تھا اور دوسرے میں بال تھے لیکن اس وقت اس کے سر پر ایک خوبصورت تاج تھا جس میں ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے پر صرف رعونت ہی نہیں آنکھوں سے بھی گویا خون ٹپک رہا تھا۔ وہ بڑے غیظ و غضب میں نظر آ رہا تھا اور وجہ غضب غالباً میں ہی تھا کیونکہ اس کی نظر مجھ پر ہی جمی ہوئی تھی۔

وہ شخص جو میرے بالوں کو پکڑ کر جھٹکے دیتے ہوئے ایک ہاتھ سے رہا تھا' اسی طرح اس کے پیچھے ذرا ہٹ کر جا رہا تھا' مجھے سنبھلتے دیکھ کر قدرے پیچھے ہٹ گیا۔ میرے دائیں بائیں دو آدمی کھڑے تھے جن کے ہاتھوں میں ٹامی گن تھیں' ان کا رخ بھی میری ہی طرف تھا۔ ان دونوں آدمیوں کے چہرے ہر قسم کے تاثرات سے بے نیاز تھے۔ اس وقت وہاں کل چھ افراد موجود تھے اور ان میں سے صرف وہ دو ہی مسلح ہو کر فرائض انجام دے رہے تھے۔ مجھے ہوش میں لانے والا اور حشمت خان نہتا ہی معلوم ہوتا تھا۔

میں غالباً زیادہ دیر سے بے ہوش نہیں رہا تھا اور اسی تہہ خانہ میں تھا جس میں داخل ہونے کی غرض سے میں اس کا دروازہ دھماکے سے اڑانے کے لیے گرنیڈ اٹھائے دوڑا آ رہا تھا۔ تہہ خانے کا دروازہ بھی شاید کھلا ہی تھا یا کسی اور راستے سے ہوا یہاں تک پہنچ رہی تھی کیونکہ فضا میں بارود کی ہلکی سی بو محسوس ہو رہی تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ حشمت خان مجھ سے بات کرنے کے لیے اپنے غیظ و غضب پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بالآخر وہ سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "تمہیں کوئی خوفناک سزا دینے سے قبل میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آخر تم ہو کون اور تمہیں ایسا کیا دورہ پڑا تھا کہ تم نے پاگلوں کی طرح گھس کر میرا بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا؟"

میرا ذہن اس وقت کچھ زیادہ مستعد تو نہیں تھا لیکن رفتہ رفتہ کئی پہلوؤں پر بیک وقت سوچنے کی میری صلاحیت بحال ہو رہی تھی۔ سر میں اٹھتی ہوئی درد کی ٹیسیں اس بحالی کے راستے میں کسی حد تک رکاوٹ بن رہی تھیں ورنہ یہ عمل شاید اس مختصر سے وقفے میں ہی مکمل ہو چکا ہوتا۔

"میرے خیال میں اب تمہارے سوال کا جواب دینے میں کوئی حرج نہیں۔" میں نے لاپروائی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "اس لیے بتا دیتا ہوں کہ مجھے انسان مرزا نے تمہیں تمہارے ساتھیوں سمیت نیست و نابود کرنے کا کام سونپا تھا اور بہت بھاری معاوضہ دیا تھا۔"

"بکواس کرتے ہو تم۔" وہ غرایا۔ "معاوضہ خواہ کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو لیکن معاوضے پر کام کرنے والے اتنی بے جگری سے موت کے منہ میں نہیں کودتے۔ وہ صرف محفوظ کام کرتے ہیں۔ وہی بازی کھیلتے ہیں جس کے جیتنے کا یقین ہوتا ہے۔"

"کسی حد تک تمہارا نظریہ درست ہے۔" میں نے تسلیم کیا۔ "میں نے اس کام کو صرف بھاری معاوضے کے لالچ میں ہی نہیں' ایک چیلنج سمجھ کر ہی قبول کیا تھا کیونکہ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ تم نوابزادہ شرافت علی خان کے بیٹے ہو۔"

میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر کسی قدر تناؤ آ گیا تھا۔

"کس نے بتایا تمہیں؟" وہ غرایا۔

ہے۔" وہ مسکرایا۔ "اور پھر آزاد حالت میں تم اتنی آسانی سے مرنے والی چیز نہیں ہو...... میں نے تمہیں تول لیا ہے۔"

میں نے ایک لمحے توقف کیا پھر ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "بالفرض میں تمہارے ساتھ مل جاتا ہوں اور بازی بھی پلٹ جاتی ہے تو مجھے جان بچ جانے کے زبانی وعدے کے علاوہ کیا حاصل ہوگا؟"

"بڑے چیمپئن میں کچے ہو۔" وہ مسکرایا۔ "جان کو اتنی اہمیت نہیں دے رہے جتنی مال کو دے رہے ہو۔ بہرحال...... مال کے سلسلے میں تو یہی کہہ سکتا ہوں کہ احسان مرزا سے بھی معاوضہ تم نے پیشگی ہی لے لیا ہوگا اور تمہاری ہی باتوں سے ظاہر ہے کہ وہ کچھ کم نہیں رہا ہوگا...... لیکن یہاں تم جتنی دولت لے جا سکتے ہو اتنی تم نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی ہوگی۔ یہ خطہ نہ جانے کتنی شکلوں میں دولت اگلتا ہے اور شکر ہے کہ مہذب دنیا کے قدم ابھی یہاں تک نہیں پہنچے...... میں کھلے دل کا آدمی ہوں۔ تمہیں جو کچھ اٹھا کر لے جانے کی اجازت دوں گا اسے دیکھ کر تمہاری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔"

"مجھے منظور ہے۔" بالآخر میں نے گویا فیصلے پر پہنچتے ہوئے کہا۔

"بہت خوب......" اس نے جوشیلے سے انداز میں چٹکی بجائی۔ "اب یہ بھی بتا دو کہ وہ لڑکی کون ہے جو وادی کے گیٹ پر پکڑی گئی تھی؟"

"اسے احسان مرزا ہی نے میرے ساتھ کیا تھا۔ اس کے خیال میں وہ بہت کام کی لڑکی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"معلوم نہیں اس کا اشارہ کس کام کی طرف تھا۔" حشمت خان اس سنگین صورتحال میں بھی خباثت بھرے انداز میں مسکرایا۔ "بہرحال تمہارا اس سے کوئی دلی تعلق تو نہیں ہے نا؟"

"دلی تعلق؟" میں استہزائیہ انداز میں ہنس دیا۔ "کیا ہم لوگ دلی تعلق رکھنے کے متحمل ہو سکتے ہیں؟"

"بڑے کام کی بات کی ہے تم نے۔" وہ دوستانہ لہجے میں بولا۔ "گویا میرا اندازہ درست ہی تھا۔ تمہارا اس سے ذرا سا بھی قلبی تعلق ہوتا تو تم کبھی بھی اسے ڈھال بنا کر بستی میں داخل نہ ہوتے۔" پھر اس نے اس شخص کو اشارہ کیا جو مجھے ہوش میں لایا تھا۔

اس شخص نے بائیں ہاتھ کی دیوار میں موجود ایک نفیس سا دروازہ کھولا اور میں نے چوکھٹ کے پار بتی کو کھڑے دیکھا۔ وہ ایک ٹک مجھے گھور رہی تھی۔ اس نے اب تک کی گفتگو یقیناً لفظ بہ لفظ سنی تھی۔ اسکے ہاتھ بھی پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ کپڑے تار تار تھے۔ ایک آنکھ سوج کر تقریباً بند ہو چکی تھی اور متورم حصہ نیلا پڑ چکا تھا۔ رخساروں کی ہڈیوں والے ابھاروں پر بھی نیل تھے۔ نچلا ہونٹ پھٹ چکا تھا اور اس سے خون کی ایک لکیر

رخسار تک آ کر خشک ہو چکی تھی۔ پیشانی پر ایک گومڑ صاف نظر آ رہا تھا اور بال جھاڑ جھنکاڑ کی طرح الجھے ہوئے تھے۔

اسے یقیناً بری طرح مارا پیٹا گیا تھا اور اس کی حالت بتا رہی تھی کہ اس کی جگہ کوئی عام لڑکی ہوتی تو شاید اس وقت اس میں اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی سکت نہ ہوتی۔ میری رگوں میں سست روی سے گردش کرتا ہوا خون یکلخت سنسنانے لگا لیکن میرے ہاتھ جکڑے ہوئے تھے اور وہ بھی رسیوں سے نہیں، زنجیروں سے۔ دو نالی گنوں کی نالیں میری جانب ساکت تھیں اور ان کے ٹریگرز پر جمی ہوئی انگلیاں گویا میری کسی خفیف سی غلط حرکت کی منتظر تھیں اور حشمت خان کی سانپ جیسی آنکھیں بھی ایک لمحے کے لیے میری طرف سے غافل نہیں ہو رہی تھیں۔

بتی شخص کا اشارہ پا کر کسی مشینی سے انداز میں قدم اٹھاتی آگے آئی اور مجھ سے کچھ فاصلے پر رک گئی۔ وہ اب بھی ایک ٹک میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سوال کی چبھن، مایوسی کا اندھیرا اور شکوک کے سائے لرزاں تھے۔ اس کے متورم اور زخمی ہونٹ کپکپائے جیسے اس نے کچھ کہنا چاہا ہو مگر اس کے حلق سے کوئی آواز نہ نکلی۔

"طاہر شاہ کے ہاتھ پاؤں کھول دو۔" حشمت خان نے اسی شخص کو حکم دیا۔ اس نے حکم کی تعمیل کی اور میں نے سیدھے کھڑے ہو کر ہاتھ پیروں کے جوڑوں پر ذرا سی مالش کرنے کے بعد حشمت خان کی طرف دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کی تاکہ میری اندرونی کیفیات کا کوئی سراغ نہ مل سکے۔ پوزیشن اب بھی ایسی نہیں تھی کہ میں حرکت میں آ سکتا۔ میں قطعی طور پر اسٹین گنوں کی زد پر تھا اور جن آدمیوں کے ہاتھوں میں یہ گنیں تھیں، میرے اندازے کے مطابق اس قسم کی صورتحال میں ان کی یکسوئی، مستعدی اور سرد مہری کی نظیر ملنی مشکل تھی۔ وہ کمبخت آنکھ تک نہیں جھپک رہے تھے اور مجھے یقین تھا کہ میری ذرا سی بھی خلاف توقع حرکت پر وہ مشینی انداز میں فائر کر دیں گے۔

"طاہر شاہ!" حشمت خان نے نہایت ملائمت سے مجھے مخاطب کیا۔ "مزید گفتگو سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ تم گولی مار کر اس لڑکی کا قصہ پاک کر دو۔"

بتی نے گردن کو جھٹکے جھٹکے سے انداز میں حرکت دیتے ہوئے ایک نظر حشمت خان کو پھر ایک نظر میری طرف دیکھا۔ انداز میں شکستگی تھی۔ اس کے وجود میں گویا زندگی کی امنگ مر چکی تھی۔

حشمت خان نے اپنے دیوان کے موٹے گدے کے نیچے سے ایک ریوالور نکالا اور میری طرف اچھالتے ہوئے کہا۔ "میں نے تم پر اعتماد تو شروع کر دیا ہے لیکن اتنا بھی نہیں کہ تم اس ریوالور کا غلط استعمال کر سکو۔ نہایت محتاط رہنا اور ریوالور کو غلط سمت میں ذرا بھی حرکت دینے کی کوشش مت کرنا ورنہ خواہ مخواہ ہی تمہاری قیمتی زندگی آن کی آن میں ضائع

یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ جان بچانے کے لیے اندھا دھند بھاگا جا رہا ہے اور دروازہ مقفل ہونے کے بعد جلد از جلد یہاں سے زیادہ سے زیادہ دور نکل جانے کی کوشش کرے گا' اس وقت وہ دیوان کے بالائی حصے پر چھپ میرے نکلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ تو شاید اس کے ہاتھ کی خفیف سی حرکت تھی جس نے میری غیر معمولی چھٹی حس کو بروقت مرتعش کر دیا تھا۔

حشمت خان نے دوسرا فائر نہیں کیا اور میں نے اس کے قدموں کی دھمک دور تک جاتے محسوس کی۔ تب میں اٹھا اور ایک بار پھر اس کے تعاقب میں دوڑا۔ سیڑھیاں چڑھ کر میں اوپر آیا تو میں نے اپنے آپ کو ایک طویل و عریض ہال میں پایا۔ اس کا فرش کسی چکنے پتھر کا بنا ہوا معلوم ہوتا تھا اور مدھم سی روشنی میں جھلملا رہا تھا۔ اس ہال میں فرنیچر وغیرہ کچھ نہیں تھا لیکن چاروں طرف بھاری بھاری پردے لٹکے ہوئے تھے۔ غنیمت تھا کہ یہ پردے فرش سے کافی اونچے تھے' اس لیے میں کسی قدر نظر میں یہ جائزہ لینے میں کامیاب ہو گیا کہ ان کے پیچھے حشمت خان نے پناہ نہیں لی تھی۔

اس ہال سے گزر کر میں دوسرے کمرے میں پہنچا تو یک لخت ہی جیسے کم کمرے تالاب میں ڈوب گیا اور میرے جوتوں تلے کچھ نرم نرم چیزیں کچلی گئیں۔ غیر ارادی طور پر میں اچھل کر واپس دہلیز پر چڑھ گیا اور غور سے مدھم سی روشنی میں دیکھنے لگا۔ اس گہرے اور طویل و عریض کمرے کے وسط میں گویا ایک اور کمرہ کھڑا تھا جس کی دیواروں اور چھت کا بیشتر حصہ شیشے اور لکڑی کے تختوں پر مشتمل تھا۔

اس حصے کے اندر کا منظر انسان کی جلد تلے سرسراہٹ پیدا کر دینے کے لیے کافی تھا۔ شیشے اور لکڑی کے اس کمرے نما صندوق میں لاتعداد چھوٹے بڑے سانپ' بچھو اور دیگر زہریلے کیڑے مکوڑے ایک دوسرے کے اوپر نیچے رینگ رہے تھے۔ مکین ایک طرف کچھ انسانی کھوپڑیاں اور ہڈیاں بھی پڑی نظر آ رہی تھیں۔ کوئی لاش شاید ابھی گلنے سڑنے کے عمل سے گزر رہی تھی کیونکہ تعفن کا احساس ہو رہا تھا۔ حالانکہ صندوق نما حصے کا دروازہ کھلا نہیں تھا' صرف اس کا ایک کونا ٹوٹا ہوا نظر آ رہا تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ چھت سے سیمنٹ کے کچھ بڑے بڑے ٹکڑے علیحدہ ہو کر اس پر گر پڑے تھے۔

اس شکستہ گوشے ہی سے کچھ سانپ وغیرہ نکل کر اردگرد کے حصے میں بھی پھیل گئے اور اسی دروازے کی طرف کو ہی آ رہے تھے جس سے میں کمرے میں داخل ہوا تھا۔ وہ اپنے شیشہ گھر نما کمرے میں گھسنے کے لیے کوشاں تھے مگر فی الحال انہیں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

اس کمرے سے گرے ہوئے سیمنٹ سے میں نے اندازہ لگایا کہ میں مکان کے اس حصے کے قریب ہی تھا جس پر میں نے بم پھینکا تھا۔ اس کمرے میں کوئی اور دروازہ نظر نہیں آ رہا تھا تو پھر حشمت خان کدھر گیا تھا؟ میں نے قدرے حیرت سے سوچا اور واپس ہال میں آیا۔

میں نے تیزی سے پردے ہٹا ہٹا کر دیکھا۔ ایک پردے کے عقب میں بڑی سی کھڑکی کھلی تھی اور یہ کھڑکی ایک منہدم شدہ کمرے میں کھلتی تھی جس کا ملبے کا ڈھیر کچھ آگے تک پھیلا ہوا تھا۔ میں نے نیچے چھلانگ لگائی اور ملبے کے انبار پر پہنچ کر چاروں طرف دیکھا۔

دھندلی چاندنی میں بہت دور ایک ہیولا مجھے تیزی سے حرکت کرتا نظر آیا۔ ویسے تو اسے پہچاننا شاید ممکن نہ ہوتا لیکن اس کا لمبا چوڑا لبادہ جس طرح ہوا میں لہرا رہا تھا' اس کی وجہ سے میں نے بہ آسانی پہچان لیا کہ وہ حشمت خان ہی تھا۔ اس کی رفتار حیران کن تھی کہ زمین پر تو اس کے قدم گویا چھو ہی نہیں رہے تھے اور وہ کچھ اوپر ہی اوپر اڑتا جا رہا تھا۔

اس کا رخ جنگل کی طرف تھا جس کی لمبائی' چوڑائی کا مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا اور اگر ایک بار حشمت خان جنگل میں داخل ہو جاتا تو پھر میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں اکیلا اسے تلاش کر لوں گا۔ جیبی کی سمت میں کہیں دور سے ہوا کے دوش پر مجھے اجتماعی نعرے بازی کی آوازیں رکتے رکتے سنائی دے رہی تھیں۔ سینڈریلا اپنی عقلیت عملی کے مطابق اپنی بگڑی ہوئی بازی سنوارنے میں مصروف تھی یا شاید وہ اپنا کام مکمل کر چکی تھی۔ حشمت خان کا معاملہ شاید اس نے کلی طور پر مجھ پر چھوڑ دیا تھا۔ شاید اس کا خیال یہی ہو کہ اس مشن میں مجھے کسی کمک کی ضرورت نہیں تھی۔ کمک کی ضرورت تو واقعی مجھے نہیں تھی لیکن اس علاقے میں اجنبی ہونا قدم قدم پر میرے آڑے آ رہا تھا۔

میں نے اپنی توانائی مجتمع کی اور حشمت خان کے پیچھے دوڑا۔ جنگل میں پہنچ کر مجھے قدرے اطمینان ہوا کہ اس مقام پر جنگل اس سے بھی کم گھنا تھا جہاں میں ایک مرتبہ داخل ہو چکا تھا' تاہم حشمت خان نہ جانے کس طرف کو نکل چکا تھا اور مجھے نظر نہیں آ رہا تھا لیکن ایک چیز میری رہنمائی کر رہی تھی اور وہ تھی پرندوں کی آواز۔

حشمت خان کو کہ پرندہ نہیں تھا' نہ ہی وہ کوئی آواز نکال رہا تھا اور نہ ہی درختوں پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر پرندے اپنے آرام کے وقت کسی کی بھی بھاگ دوڑ پسند نہیں کرتے اور فوراً ہی شور شرابا یا کم از کم چوں چاں ضرور شروع کر دیتے ہیں۔ یہی آوازیں مجھے بتا رہی تھیں کہ حشمت خان کدھر کدھر سے گزر رہا ہے اور میں ادھر ہی بڑھتا جا رہا تھا۔

ایک تناور درخت کے قریب سے گزرتے ہوئے اچانک ہی میں کسی سے بغل گیر ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اگر اچانک ہی میں نے کسی کی موجودگی کا احساس ہوتے ہی حتی الامکان میں اپنے آپ کو نہ روک لیا ہوتا تو میں یقیناً سیدھا اس کے پھیلے ہوئے بازوؤں میں پہنچ جاتا۔ وہ ایک نہایت جسیم ریچھ تھا جو موٹے تنے کے پیچھے نہایت مکارانہ انداز میں چھپا ہوا پچھلی دونوں ٹانگوں پر کھڑا تھا۔

یہ یقیناً انہیں درندوں میں سے ایک تھا جن کا ذکر میں نے سینڈریلا کے مکان پر حشمت

جان کی دشمنی بنا ہوا تھا اور جن میں سے ایک آدھ پہلے ہی میرے ہاتھوں مارا جا چکا تھا۔ ریچھ یقیناً یہ بھی سدھایا ہوا ہی تھا ورنہ حشمت خان بھی ادھر سے گزرا تھا، اسے بھی اس نے مارنے کی کوشش کی ہوتی۔

ریچھ نے دیکھا کہ میں اس کے بازوؤں کے حلقے میں پہنچنے سے بال بال بچ گیا ہوں تو فوراً مجھ پر جھپٹا لیکن اس کے مجھ تک پہنچنے سے پہلے اسٹین گن کی گولیاں اس کے جسم سے پار ہو چکی تھیں۔ وہ چاروں شانے چت گر پڑا۔ اس کے گرنے سے زمین میں خاصی دھمک پیدا ہوئی۔ اس کے چاروں ہاتھ پاؤں نزع کی کیفیت میں ایک دوسرے سے آن ملے اور وہ گٹھڑی کی بن گیا لیکن دوسرے ہی لمحے ڈھیلا پڑ گیا۔

گوشت کے اس چھوٹے سے پہاڑ کے نیچے خون کا تالاب بہنا شروع ہو گیا تھا۔ میں نے اسے پھلانگا اور آگے دوڑا لیکن یکلخت مجھے رک جانا پڑا۔ پرندوں کی آوازیں جو میری رہنمائی کر رہی تھیں، اچانک ہی منقطع ہو چکی تھیں۔ پورے جنگل میں ایسا اعصاب شکن سکوت چھا گیا جیسے میلوں دور تک کوئی ذی روح موجود ہی نہیں ہے۔ دراصل رات کے وقت اسٹین گن کی تڑتڑاہٹ اس مقام پر کچھ زیادہ ہی خوفناک محسوس ہوئی تھی اور پرندوں نے دم سادھ لیا تھا۔ اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کس طرف جانا چاہیے۔

حشمت خان نے فوراً ہی میری مشکل آسان کر دی۔ وہ کمبخت کچھ ہی آگے کسی درخت کے عقب میں چھپا ہوا تھا۔ اسے امید رہی ہوگی کہ میں ریچھ کے شکنجے میں ضرور آ جاؤں گا اور مجھے ہلاک کرنے میں ریچھ کو اگر کوئی دقت پیش آئی تو وہ اس کا ہاتھ تو بٹا سکے گا لیکن مجھے موت سے بچتے دیکھ کر اس نے ایک اور گولی داؤ پر لگا دی تھی۔ یہ گولی شاید زندگی مجھ سے چھین کر لے گئی ہوتی لیکن ایک تو شاید روشنی کی کمی اور دوسرے راہ میں کسی نہ کسی زاویے سے کوئی نہ کوئی درخت حائل ہونے کی وجہ سے میں بچ گیا۔ یا پھر شاید یہ وجہ بھی نہیں تھی، وجہ صرف اتنی ہی تھی کہ نیلی چھتری والے نے ابھی میری زندگی اپنی امان میں رکھنے سے ہاتھ نہیں کھینچا تھا۔

خشک پتوں اور ٹہنیوں کی چرچراہٹ نے مجھے بتا دیا کہ حشمت خان ایک بار پھر دوڑ پڑا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے پاس ریوالور کی فاضل گولیاں نہیں تھیں، اس لیے وہ انہیں بڑی احتیاط سے استعمال کر رہا تھا لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ وہ جانا کہاں چاہتا تھا۔ وہ اتنا احمق تو نہیں ہو سکتا کہ مجھے ٹھکانے لگانے کے ارادے سے دوڑتا رہتا۔ اگر وہ وادی سے فرار ہونے کا ارادہ رکھتا تھا تو اسے گیٹ کی طرف جانا چاہیے تھا کیونکہ میری معلومات کے مطابق وادی میں داخل ہونے یا نکلنے کا وہی ایک راستہ تھا یا پھر کوئی اور بھی خفیہ راستہ رہا ہوگا جس کا علم صرف حشمت خان کو ہی ہوگا۔

بہرحال اب میں اس کا سراغ پا چکا تھا۔ ایک جگہ رک کر میں نے اس پر فائرنگ بھی

کی لیکن درخت آڑے آئے۔ قریب پہنچے بغیر فائرنگ کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ پھر اچانک ہی درختوں کا سلسلہ ختم ہو گیا اور چاندنی بلارکاوٹ زمین تک پہنچتی دکھائی دینے لگی لیکن روشنی کا سلسلہ بند ہوتے ہی حشمت خان مجھے صاف نظر آنے کے بجائے الٹا میری نظروں سے غائب ہو گیا۔

میں جب اس مقام پر پہنچا جہاں وہ میری نظروں سے غائب ہوا تھا تو مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ دراصل نشیب میں اتر گیا تھا، وہاں سے ایک تنگ سا خشک نالا شروع ہو رہا تھا جو نہ جانے کہاں تک جا رہا تھا اور جس کی گہرائی بتدریج بڑھتی جا رہی تھی۔ میں بھی اس نالے میں اتر گیا اور چند ہی قدم چل کر پتہ چلا کہ وہ ابھی زیادہ گہرائی میں چلا گیا ہے تاہم میں حتی الامکان تیز رفتاری سے دوڑنے کے باوجود سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اچانک ہی کہیں کسی گڑھے یا کھائی میں نہ جا گروں۔

حشمت خان مجھے اب بھی کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا کیونکہ خندق نما اس نالے میں پیچ و خم بہت زیادہ تھے اور وہ مجھ سے کافی آگے تھا۔ اس کے راستے میں وہ پیچ و خم حائل تھے۔ اس نالے میں میرے اندازے کے مطابق میں تقریباً ایک میل کا فاصلہ طے کر چکا تھا۔ جب میں نے محسوس کیا کہ اس کی گہرائی بتدریج کم ہونے لگی تھی اور پھر اچانک ہی میں نالے سے نکل گیا۔

دور افتادہ مقام پر اس عالم میں کیوں رکھا ہوا تھا؟ کیا حشمت خان کو ان لوٹوں' ان ہیروں اور ان بیش قیمت زیورات کے لیے ڈھنگ کے صندوقچے وغیرہ بھی میسر نہیں تھے؟ آخر انہیں یونہی آنے' دال کی طرح رکھنے میں کیا مصلحت پوشیدہ تھی؟ جبکہ یہ کسی قسم کی دردمندی کا اظہار بھی نہیں تھا۔ حشمت خان کی تو زندگی ہی حصول زر کے لیے وقف تھی۔ دولت ہی اس کی زندگی کا محور و مرکز تھی۔

ایک حیران کن مسئلہ یہ بھی تھا کہ کرنسی امریکی تھی اور اسلحہ چینی۔ ان دنوں ان دونوں طاقتوں میں جغرافیائی طور پر ہی نہیں' تعلقات کے لحاظ سے بھی بعد المشرقین تھا۔

دفعتاً" میں نے ان سب سوچوں کو ذہن سے جھٹک دیا اور ایک بار حشمت خان کے متعلق سوچا۔ آخر وہ کہاں غائب ہو گیا تھا؟ اس کا یہاں آنے کا مقصد صرف اتنا ہی تو نہیں تھا کہ میں اس بیش بہا خزانے کو دیکھ کر ششدر رہ جاؤں' باقی ہر چیز کو بھول جاؤں اور وہ جس خفیہ راستے پر گامزن تھا' اس پر زیادہ سے زیادہ دور نکل جائے؟

میں نے بڑے کمرے میں پہنچ کر تیزی سے وہاں موجود گھاس پھوس کو بھی الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس کے نیچے کچھ موجود نہیں تھا۔ میں متوحش و پریشان تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ وہ حشمت خان جس کے لیے ساری صعوبتیں برداشت کی تھیں اور بیچاری کیزی کو اتنی اذیتوں میں ڈالا تھا۔ جس بیچاری کا اس معاملے سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا' وہی حشمت خان اب یوں آخری مرحلے میں چکنی مچھلی کی طرح میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔

مجھ پر دیوانگی سی طاری ہونے لگی۔ میں ایک بار پھر صحن نما حصے میں جانے کے ارادے سے چھوٹے کمرے میں آیا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ یہاں کی ہر چیز کو تہس نہس کر دوں مگر وہاں تھا ہی کیا؟ لکڑی کا ایک تخت اور گرد آلود تکیہ۔ میں نے لات مار کر گاؤ تکیے کو دور پھینک دیا اور تخت کے نیچے جوتے کی نوک لگا کر اسے بھی الٹ کر دور پھینک دیا۔

پھر میں مجنونانہ سے انداز میں عقبی دروازے کی طرف بڑھا اور فرش کے اس حصے پر سے گزرا جس پر ایک لمبے پہلے تک تخت بچھا ہوا تھا اور جہاں فرش کے بیشتر حصے کی طرح خشک گھاس کی تہہ سی بچھی ہوئی تھی۔ اس لمحے مجھے احساس ہوا کہ وہ تہہ کچھ اکھڑی اکھڑی سی نظر آ رہی تھی لیکن جب تک مجھے احساس ہوا' تب تک تاخیر ہو چکی تھی۔ مجھ پر گویا پاتال کا دروازہ کھل چکا تھا اور میں تیزی سے نیچے جا رہا تھا۔

گھاس کی وہ تہہ بتا رہی تھی کہ یقیناً مجھ سے پہلے بھی کوئی نیچے چھلانگ لگا چکا تھا جو یقیناً حشمت خان ہی تھا مگر وہ اس راستے کی حقیقت سے واقف تھا' دیکھ بھال کر سیدھے' طریقے سے کودا ہوگا۔ میں تو انجانے میں ہی گہرے گڑھے میں آ گرا تھا۔ بہرحال اب یہ سوچنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

خلاف توقع میں زیادہ گہرائی میں نہیں گرا۔ جلد ہی میرے پاؤں زمین سے ٹکے لیکن زمین نرم اور بھربھری تھی۔ میں تقریباً گھٹنوں تک دھنس گیا۔ اٹیچی کیس میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی لیکن میں نے ہڑبڑا کر فوراً ہی ادھر ادھر ہاتھ مار کر اسے تلاش کر لیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ وہاں حشمت خان میری گھات میں نہ بیٹھا ہو لیکن کئی لمحے تک کسی بھی طرف سے کوئی مجھ پر حملہ آور نہ ہوا اور نہ ہی کوئی چلنے کا دھماکہ گونجا۔ تب میں نے قدرے زور آزمائی کے بعد پاؤں مٹی سے نکالے اور سنبھل کر کچھ آگے بڑھا۔

اب پاؤں مٹی میں نہیں دھنس رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ سرنگ نما ایک راستہ تھا لیکن وہاں اتنا گہرا اندھیرا بھی نہیں تھا جتنا مجھے محسوس ہوا تھا شاید اوپر کمرے کی طرف سے روشنی کا کچھ انعکاس ہو رہا تھا۔ آس پاس جب مجھے کسی کی موجودگی کے آثار نظر نہ آئے تو میں نے دوڑنا شروع کر دیا۔ آگے یہ سرنگ بالکل کنزلائن سے مشابہ ہو گئی تھی اور میں ہاتھ بلند کر کے اس کی چھت کو چھو سکتا تھا۔

شاید یہ کوئی طویل غار تھا جس کے سرے پر غالباً کسی طرح نکاسی کا راستہ بنا ہوا تھا اور شاید اس غار ہی کی خصوصی اہمیت کے پیش نظر اس کے دہانے پر جھونپڑی نما مکان بنایا گیا تھا۔ جوں جوں میں بڑھتا گیا' اندھیرا گہرا ہوتا گیا حتیٰ کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی دینا ممکن نہ رہا۔ میں حیران تھا کہ حشمت خان نے اب تک فرشتہ اجل بن کر میرا استقبال کیوں نہیں کیا تھا۔ یہ تاریک سرنگ اس کی تو زیلی ہالی تھی۔ یہاں چھپ کر کسی اجنبی کو گولی کا نشانہ بنانا تو بے حد آسان تھا لیکن شاید اس وقت اس کے سر میں صرف فرار کا سودا سمایا ہوا تھا اور شاید وہ مجھ سے اس حد تک خوفزدہ بھی ہو چکا تھا کہ اب مزید خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

اس سرنگ میں سفر دیر تک جاری رہا۔ سمت کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ بس سرنگ کی طوالت کا احساس تھا اور مجھے بلا مبالغہ یہ اندیشہ محسوس ہو رہا تھا کہ اگر میں اسی طرح چلتا رہا تو کسی دوسرے ہی ملک میں نہ جا نکلوں۔

خدا خدا کر کے اس سرنگ کا دہانہ نظر آیا اور تب احساس ہوا کہ سپیدہ سحر نمودار ہو چکا تھا۔ چاند نجانے کہاں جا چھپا تھا لیکن صبح کی روشنی دھیرے دھیرے کائنات کو آغوش میں لے رہی تھی۔ میں جب عین سرنگ کے دہانے کے قریب پہنچا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں صدیوں بحر ظلمات کی تہہ میں پڑا رہنے کے بعد اپنی دنیا کی طرف لوٹنے لگا ہوں۔

میں دہانے سے دو تین قدم ہی کے فاصلے پر تھا جب اچانک ہی میرے دائیں ٹخنے پر جیسے قیامت ٹوٹ پڑی۔ میں اس وقت جوش مسرت میں زمین کی طرف تو دیکھ ہی نہیں رہا تھا۔ میرے ٹخنے پر دونوں طرف سے بہت شدید چوٹ لگی تھی اور اگر میں اس وقت موٹے چمڑے اور فوجی پوشش والے ٹخنوں سے اونچے جوتے نہ پہنے ہوتا تو شاید میرا ٹخنہ علیحدہ ہی

ہو جاتا یا پھر ہڈی ٹوٹ جاتی۔ ایک لمحے کے لیے تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ سرنگ کے دہانے سے جس چاند کی مجھے جھلک نظر آئی تھی وہ ان گنت ننھے پیلے دھبوں میں تبدیل ہو گیا۔

عافیت ہی رہی کہ وہ میرے اسی لمحے میں سنبھل گیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میرا پاؤں ایک نہایت مضبوط آہنی شکنجے میں پھنس چکا تھا۔ میں نے بہت زور لگایا لیکن سوائے ٹانگ کی ہڈی کو تکلیف پہنچانے کے کچھ حاصل نہ ہوا۔ تب اچانک ہی حشمت خان کے زوردار قہقہے نے فضا کے سکوت کو مرتعش کر دیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ میرے قدموں ہی میں کہیں موجود تھا۔ میں نے قدرے وحشت زدہ ہو کر اپنے پیروں کی طرف دیکھا۔ میں جہاں پہنچ چکا تھا وہاں اب اندھیرا اتنا گہرا نہیں تھا کہ میں نیچے کا منظر نہ دیکھ سکتا۔

میرے قدموں میں سوائے شکنجے کے کچھ نہیں تھا۔ شکنجہ نہایت سادہ سا لیکن بے حد مضبوط اور سخت تھا۔ سرنگ کی زمین جو ابتداء میں بالکل کچی تھی بتدریج سخت ہوتی گئی تھی اور یہاں پہنچتے تک تقریباً پتھریلی ہو چلی تھی۔ شکنجہ دراصل اسی زمین میں پیوست تھا۔

"اس شکنجے میں زور آزمائی بے کار ہے طاہر شاہ!" حشمت خان کی آواز آئی۔ "یہ ایک شیر کو بھی قابو میں رکھنے کے لیے کافی ہے اور اس کی چابی صرف میرے پاس ہے۔ اب تم اسٹین گن سرنگ سے باہر پھینک دو کیونکہ اس وقت تم میرے ریوالور کی زد پر ہو گو کہ تم مجھے نہیں دیکھ سکتے۔"

جواباً میں نے سکوت اختیار کیے رکھا تو ایک دھماکہ ہوا اور گولی میرے کندھے پر سے میری اس بیزاری جیکٹ کو چھوتی ہوئی گزر گئی جو میں نے ڈھیلی ڈھالی شلوار قمیض کے اوپر پہن رکھی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ میں اب بھی دھماکے کی سمت متعین نہیں کر پایا تھا۔ سرنگ میں دھماکے سے پیدا ہونے والی گونج نے میرے لیے کوئی اندازہ قائم کرنا ناممکن بنا دیا تھا۔

"یہ گولی تمہاری گردن سے بھی گزر سکتی تھی۔" حشمت خان کی آواز آئی۔ "مگر میں تمہیں اتنی آسان موت مارنا نہیں چاہتا۔ ایسا میں صرف انتہائی مجبوری کی حالت میں کروں گا۔ اسٹین گن پھینک دو۔"

میں نے ایک لمحے رکے بے سوچا اور بالآخر اسٹین گن سرنگ سے باہر اپنی دسترس سے دور پھینک دی۔ میں نے روشنی میں اسے زمین پر گرتے اور پھر نشیب کی طرف پھسلتے ہوئے دیکھا جہاں آخر وہ میری نظر کی رسائی سے دور ہو گئی کیونکہ سرنگ کا یہ حصہ بتدریج اونچا ہو رہا تھا جبکہ دہانے سے آگے زمین غالباً نشیبی تھی۔ تاہم میں نے کسی کو اسٹین گن اٹھانے کے لیے بڑھتے نہیں دیکھا۔

"بہت خوب۔" میں نے حشمت خان کی آواز سنی۔ "مجھے تمہاری اسٹین گن کی

ضرورت نہیں تھی طاہر شاہ..... اور ہاں..... فی الحال میں تمہیں طاہر شاہ ہی کے نام سے مخاطب کر رہا ہوں گو کہ مجھے یقین ہے کہ یہ تمہارا اصل نام نہیں ہے..... اسٹین گن میں نے تم سے اس لیے پھنکوا دی ہے کہ کہیں پھنسے رہ کر جب تم دو تین دن تک بھوک پیاس میں بسر کر لو گے تو تم خودکشی کرنے کو بھی چاہنے لگو گے لیکن میں نہیں چاہتا کہ تم اسٹین گن کی مدد سے اپنی موت کو آسان بنا لو۔ میری خواہش ہے کہ تم جتنا زیادہ طاقت کے زعم میں مبتلا ہو اتنا ہی بے بسی سے سسک سسک کر اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرو۔ طاقتور آدمی کو گولی مار دینا اس کے لیے بہت بڑی سزا نہیں ہے۔ کاش میں تمہیں چوہے دان میں پھنسے ہوئے چوہے کی سی موت مرتے دیکھ سکتا لیکن افسوس کہ تم نے وادی میں میرا رہنا ممکن نہیں رہنے دیا..... میں اپنا خزانہ بھی جلد ہی اپنے اصل ٹھکانے پر منتقل کرنے والا تھا لیکن تم نے میرے تمام پروگرام تہ و بالا کر دیے۔ بہرحال..... وادی والوں کو تو وہ خزانہ نہیں مل سکتا۔ میں تین چار دن بعد پھر آؤں گا اور اسی خفیہ راستے سے گزر کر وادی کے حالات کا جائزہ لیتے جاؤں گا۔ ممکن ہے میں وادی پر دوبارہ قبضہ کر لوں ورنہ واپسی پر اپنا خزانہ تو لیتا ہی جاؤں گا۔ اس وقت تک تو امید ہے کہ میں تمہاری لاش ہی پھلانگ کر گزروں گا اور اگر اس وقت تک تم زندہ رہے' تب بھی تمہاری حالت لاش سے بدتر ہی ہو گی اور تمہیں ٹھوکر مار کر گزرنا پر لطف عمل ہو گا..... اچھا خدا حافظ!"

تب مجھے معلوم ہوا کہ وہ کہاں چھپا ہوا تھا۔ مجھ سے چند ہی فٹ آگے سرنگ کی چھت میں غالباً کوئی کھوہ سی موجود تھی جس میں وہ سمایا ہوا تھا۔ وہاں سے اس نے چھلانگ لگائی تو عین سرنگ کے دہانے پر جا پہنچا۔ وہ میرے سامنے کھڑا تھا مگر میں اسے چھو نہیں سکتا تھا۔

وہ ایک بار پھر استہزائیہ سے انداز میں ہنسا اور مڑ کر اطمینان سے چل دیا۔ کچھ دیر تک وہ مجھے نظر آتا رہا لیکن چونکہ وہ بتدریج نشیب کی طرف جا رہا تھا' اس لیے رفتہ رفتہ غائب ہو گیا۔ میں بیٹھے کے بل لیٹ گیا۔ اس طرح میرا سر دہانے کے بے حد قریب پہنچ گیا اور میں باہر دور تک کا منظر دیکھنے کے قابل ہو گیا۔

نشیب میں ایک بیضوی مسطح میدان نظر آ رہا تھا جس کے اردگرد نہایت خوبصورت درخت گھیرا ڈالے کھڑے تھے اور جس چیز کو دیکھ کر میں دم بخود رہ گیا' وہ سرخ اور سفید پھولوں والا ایک نہایت خوبصورت ہیلی کاپٹر تھا جو اس میدان میں کھڑا تھا۔ یہ مقام گویا ایک الگ ہی چھوٹی سی وادی سے مشابہ تھا۔ چاروں طرف چھوٹی چھوٹی چٹانیں سر اٹھائے کھڑی تھیں اور ہیلی کاپٹر گویا ایک پیالے کے پیندے میں کھڑا تھا۔

حشمت خان نہایت اطمینان سے اس ہیلی کاپٹر کی طرف جا رہا تھا اور اس قدر مطمئن اور بے فکر نظر آ رہا تھا کہ اس نے راستے میں رک کر اسٹین گن بھی اٹھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ میری کمند گویا سب بام آ کر ٹوٹ گئی تھی۔ شکار تقریباً ہاتھ میں آنے

کے بعد نکلا جا رہا تھا اور میں زندہ سلامت لینا اسے جاتے دیکھ رہا تھا۔ یہ منزل کے سلسلے میں میری پہلی کامیابی ہو سکتی تھی مگر یہ کوشش ہی ادھوری رہ گئی تھی۔ منزل تو ابھی بہت دور تھی۔

یہ سوچتے ہوئے پہلے تو ناامیدی و مایوسی نے مجھے مغلوب کیا مگر پھر جیسے رگ و پے میں ایک آگ سی بھڑک اٹھی جس نے مجھ اور خفیہ قوتوں کو بھی شعلوں میں بدل دیا۔ میری مٹھیاں بھنچ گئیں کہ ناخن گوشت میں اترنے لگے اور کنپٹیاں پھٹنے لگیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں نے اپنے اندر ابل پڑنے والی اس قوت کو کہیں استعمال نہ کیا تو میرا سارا جسم یا کم از کم کنپٹیوں کی نسیں ضرور پھٹ جائیں گی۔

میں نے اس قوت کو سمیٹ دینے کے لیے یوگا کے ایک خاص انداز میں سانس کو بھی جسم میں مقید کر لیا اور پھر اچھل کر شکنجے کو کھینچنا شروع کیا۔ وہ پتھریلی سی زمین میں یقیناً کافی گہرائی میں پیوست تھا۔ پہلی کوشش میں تو اس نے جنبش تک نہ کی۔ تب میں نے جھک کر اس کی سلاخوں میں ہاتھ پھنسائے اور سانس لیے بغیر اس مرحلے کو زندگی کا آخری مرحلہ سمجھتے ہوئے تمام تر قوت صرف کرنا شروع کر دی اور پھر چند سیکنڈ کے اندر اندر وہ شکنجہ جو بقول حشمت خان کے ایک شیر کو بھی قابو میں رکھنے کے لیے کافی تھا' زمین سے اکھڑتا چلا آیا۔

شکنجے کا جو حصہ پتھریلی زمین میں پیوست تھا' وہ تقریباً چار فٹ لمبی موٹی سی پیچدار سلاخ پر مشتمل تھا اور اسکرو کی طرح زمین میں فٹ کیا گیا تھا۔ یہ اس قسم کا شکنجہ نہیں تھا جو ویسے ہی زمین پر رکھ دیا جاتا بلکہ یہ انتہائی طاقتور جانوروں کو بے بس کرنے والا شکنجہ تھا۔

زمین میں ایک گڑھا سا پڑ گیا تھا اور بہت سے پتھریلے ٹکڑے ادھر ادھر بکھر گئے تھے۔

میرا پاؤں اب بھی شکنجے کی گرفت میں تھا' تاہم میں شکنجے کو پاؤں کے ساتھ ساتھ گھسیٹتے ہوئے چل سکتا تھا گو کہ شکنجے کا وزن کچھ کم نہیں تھا۔ میرے دل میں مسرت سے گدگدی سی ہونے لگی تھی۔ حشمت خان کے خیال میں جو کام ناممکن تھا اور جسے میں بھی تقریباً ناممکن ہی سمجھتا تھا' وہ بالآخر ہو گیا تھا مگر جب میں نے سرنگ کے دہانے پر پہنچ کر میدان کی طرف دیکھا تو میری خوشی ماند پڑ گئی۔

حشمت خان نیلی کاپٹر تک پہنچ چکا تھا اور اوپر چڑھ کر کاک پٹ کا دروازہ کھول رہا تھا۔

میں شکنجے کو گھسیٹتا لنگڑے انسانوں کے سے انداز میں حتی الامکان تیزی سے اس کے تعاقب میں بڑھا۔ راستے میں رک کر میں نے اسٹین گن اٹھائی۔ جب میں نے دوبارہ ہیلی کاپٹر کی طرف دیکھا تو اس کے پر گھومنے لگے تھے اور انجن کی گڑگڑاہٹ سے فضا میں ارتعاش پیدا ہو چکا تھا۔

ہیلی کاپٹر کسی بھی لمحے فضا میں بلند ہونے والا تھا۔ میں نے اضطراری طور پر اسٹین گن

سے اس پر برسٹ مارا لیکن یہ اسٹین گن سے نکلنے والی گولیوں کی آخری بوچھاڑ تھی کیونکہ اس کا میگزین ختم ہو چکا تھا۔ میں نے کئی بار ٹریگر دبانے کے بعد جھنجھلا کر اسے ایک طرف پھینک دیا۔

چند گولیاں شاید ہیلی کاپٹر کے پچھلے حصے پر لگی تھیں لیکن اسے کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا تھا۔ کاک پٹ میں بیٹھا ہوا حشمت خان مجھے نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اس نے شاید مجھے دیکھ لیا تھا۔ مجھے شیشے کے بلبلہ نما حصے میں اس کا سر گھومتا نظر آیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے ہیلی کاپٹر ہوا میں بلند ہو گیا۔

کچھ بلندی پر پہنچ کر اس نے ہچکولا سا لیا' نیم دائرے میں گھوما اور مزید بلندی پر پہنچ کر ایک طرف کو پرواز کرنے لگا۔ میں وہیں ہاتھ مل رہا تھا' جب میں نے محسوس کیا کہ گڑگڑاہٹ کی ایک اور آواز جسے میں حشمت خان ہی کے ہیلی کاپٹر کی آواز سمجھ رہا تھا' اب الگ سنائی دینے لگی تھی اور قریب آتی جا رہی تھی۔

میں نے آواز کی سمت سر گھمایا۔ ایک اور چھوٹا سا سفید ہیلی کاپٹر جس کے پہلو پر بڑا سا نیلا دائرہ چمک رہا تھا' تیزی سے اسی طرف آ رہا تھا۔ میں تذبذب کے عالم میں اسے قریب آتے اور پھر میدان میں اترتے دیکھنے لگا۔ قسمت میرے ساتھ عجیب آنکھ مچولی سی کر رہی تھی۔ ایک لمحے میرا ساتھ دینے لگتی تھی تو دوسرے لمحے دغا دے جاتی تھی۔

اب یہ ہیلی کاپٹر نہ جانے میرے کسی ہمدرد کا تھا یا دشمن کا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ شاید یہ ہیلی کاپٹر بستی میں موجود تھا اور جینڈریلا نے اسے میری مدد کے لیے روانہ کیا تھا۔ اسی امید پر میں ہیلی کاپٹر کی طرف دوڑا جو اب زمین پر ٹکنے لگا تھا۔

اس ہیلی کاپٹر کا شیشے کا ڈھکن اوپر کو کھلتا تھا۔ میں جب اس کے قریب پہنچا تو وہ کھل چکا تھا اور پائلٹ اپنی سیٹ سے اٹھ کر نیچے جھانک رہا تھا۔ اس کا سر اور چہرہ ہیلمٹ میں چھپا ہوا تھا' اس لیے میں اسے پہچاننے سے قاصر تھا' تاہم ہیلمٹ کے شفاف نیلے نقاب میں سے مجھے اس کی آنکھیں دھندلی دھندلی سی نظر آئی تھیں اور وہ نہ صرف حسین بلکہ کچھ شناسا بھی محسوس ہوئی تھیں۔ وہ چھوٹی پھولی سی سیاہ جیکٹ پہنے ہوئے تھا' ہاتھوں پر بھی دستانے تھے۔ وہ ہاتھ ہلا ہلا کر مجھے بلا رہا تھا۔

میں ہیلی کاپٹر کے پنکھے کی ہوا سے لڑتا لپکتا کر اس کے قریب پہنچا اور بلا توقف پائیدان پر چڑھ گیا۔ تب اس نے ایک لمحے کے لیے ہیلمٹ کا ڈھکن اٹھایا اور شناسائی کی روشنی یوں میرے سامنے ابھری کہ ایک لمحے کے لیے تو میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ وہ لیو آنگ کی بیٹی لی چن تھی جس سے میں گنگڈو میں صرف ایک بار ملا تھا بلکہ ملا بھی کیا تھا' ہماری صرف نظریں ہی ملی تھیں اور نہیں ایک دوسرے کا نام معلوم ہوا تھا۔ اس نے ہتھیاروں کے ڈبے میرے سامنے لا کر رکھے تھے۔

اس وقت اس کے حسین بانکپن نے مجھے مبہوت کر دیا تھا اور اب اس کی آمد مجھے ششدر کر دینے کے لیے کافی تھی۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں جب اس کے ہاں سے رخصت ہوا تھا تو اس کی حسین آنکھوں میں یاسیت میں لپٹا ہوا ایک مبہم سا سوال محسوس کیا تھا جیسے اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھ سے پوچھا ہو...... "پھر کب آؤ گے اجنبی؟" لیکن اس سوال کو میں نے اپنی لاشعوری خوش فہمی پر محمول کیا تھا۔

میں تو اس کے پاس نہیں جا سکا تھا لیکن وہ نجانے کس طرح اس نازک گھڑی میں میرے پاس آن پہنچی تھی۔

اس نے ہینڈل کا بٹن کھینچ کر لیا اور مجھے اوپر آنے کا اشارہ کرتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ میں نے جلدی سے سیٹ پر بیٹھنے کی کوشش کی لیکن میرے پاؤں کے ساتھ جو شکنجہ سختی ہو چکا تھا وہ اس موقع پر بھی آڑے آیا اور دروازے میں پھنسنے لگا لیکن میں نے جلدی سے کسی نہ کسی طرح پاؤں اوپر اٹھا کر اسے بھی اندر کر لیا کیونکہ میں سامنے بھی دیکھ رہا تھا حشمت خان کا ہیلی کاپٹر لمحہ بہ لمحہ دور ہوتا جا رہا تھا۔

میرے بیٹھتے ہی پی جین نے ہڑبڑا دیا اور تھروٹل کھینچنے لگی۔ چند لمحے بعد ہی ہمارا ہیلی کاپٹر بلندی پر پہنچ چکا تھا اور ہم حشمت خان کے تعاقب میں روانہ ہو چکے تھے۔ میں نے جب پی جین کو پہلی بار دیکھا تو مجھے گمان بھی نہیں گزرا تھا کہ وہ اس قسم کے معاملات میں اتنی مستعد اور ہیلی کاپٹر اڑانے میں اتنی مشاق ہو گی۔ حالانکہ میں خود بمبئی فلائنگ کلب میں مختلف قسم کے طیارے اڑانے کی تربیت کے دوران تین ٹرافی ایوارڈ اور ایک سپر فلائر ایوارڈ جیت چکا تھا لیکن اس نرم و نازک لڑکی کی مشاقی و مہارت دیکھ کر حیران تھا جو اس وقت بھاری بھرکم اور ڈھیلے ڈھالے لباس میں قطعاً نرم و نازک نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہیلی کاپٹر سدھائے ہوئے پرندے کی طرح گویا اس کے اشاروں کا تابع تھا۔ اس کی آمد صحیح معنوں میں میرے لیے امداد غیبی تھی۔

ہیلی کاپٹر چونکہ اوپر سے کھلا نہیں تھا اس لیے ہمیں گفتگو کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ گفتگو کا آغاز پی جین نے کیا۔ "میں پہلے وادی میں اتری تھی۔" وہ بولی پھر بتانے لگی۔ "لوگ منوچی کے منہدم شدہ گھر کے سامنے جمع ہو رہے تھے۔ میں نے ان سے تمہارے بارے میں پوچھا تو پالی نی جوہی میندرا نے بتایا کہ وہ لوگ خود تمہاری تلاش میں نکلے ہوئے ہیں۔ پھر میں نے اتفاقاً ادھر سے ہیلی کاپٹر ہوا میں بلند ہوتے دیکھ لیا اور میں ادھر آ گئی۔"

"گویا تمہیں اس وادی اور یہاں کے لوگوں سے متعلق خاصی حد تک معلومات حاصل ہیں۔" میں نے کہا۔ "احسان مرزا نے تو ایسا کوئی اشارہ نہیں دیا تھا۔"

"احسان مرزا کو تو خود اچھی طرح معلوم نہیں کہ ہم کیا کچھ جانتے ہیں۔ اس سے ہمارا

صرف چند معاملات میں تعاون کا معاہدہ تھا۔ ہمارے اپنے بھی اس کے علاوہ بہت سے معاملات ہیں۔" وہ قدرے لاپروائی سے بولی۔ "تمہارے جانے کے بعد میں نے فون پر اس سے رابطہ قائم کر کے پوچھا تھا کہ اس نے تمہیں کہاں بھیجا ہے اور جب مجھے معلوم ہوا کہ تمہاری منزل تاریک وادی ہے تو کم از کم مجھے بے حد خوشی ہوئی کیونکہ مجھے بھی یہاں تقریباً وہی کام درپیش تھا جس کے لیے تم آئے ہو لیکن مجھے اس کے لیے مدد کی ضرورت تھی۔ مجھے کسی آدمی کی۔" وہ ایک نظر میری طرف دیکھ کر مسحور کن انداز میں مسکرائی۔

میں دم بخود سا رہ گیا۔ "تمہیں کیوں آن پڑا یہ کام؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"کس نے تمہارے سپرد کیا یہ کام؟"

"میری قوم نے۔" وہ بڑے اطمینان سے بولی۔ "حشمت خان کے ذمے میری قوم کا بہت سا ادھار نکلتا ہے۔ اس نے چینی قوم کو بھی بہت سے نقصانات پہنچائے ہیں۔ اس کا باپ شرافت علی ہمارے خلاف ایجنٹ کے طور پر کام کرتا رہا ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اس وقت ہیلی کاپٹر میں اس کا باپ بھی موجود ہے۔"

"اس ہیلی کاپٹر میں شرافت علی بھی موجود ہے؟" میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

"ہاں......" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"پھر تو جلد از جلد اس تک پہنچنے کی کوشش کرو۔" میں نے کہا۔

پی جین نے ہیلی کاپٹر کی رفتار بڑھائی۔ درمیانی فاصلہ کم ہو گیا تو میں نے پی جین کے اشارے پر سیٹ کے نیچے سے ٹامی گن اٹھائی، لوڈ کیا اور دوسرے ہیلی کاپٹر پر برسٹ مارا۔ اس کے شکم سے دھواں خارج ہونے لگا۔ میں نے دوسرا برسٹ مارا۔ ہیلی کاپٹر فضا میں ڈولنے لگا۔ پھر وہ نیچے اترنے لگا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ گر نہیں رہا تھا۔ حشمت خان اسے خود نیچے اتار رہا تھا۔ شاید اس نے سوچا تھا ہیلی کاپٹر گرنے کی صورت میں تو پاش پاش ہو جاتا اور اس کا مطلب یقینی موت تھا۔ شاید نیچے اتر کر وہ اپنی قسمت آزمائی کرنا چاہتا تھا۔ لگتا یہی تھا کہ ان کے پاس اب کوئی خودکار ہتھیار نہیں تھا۔ اس لیے جواباً ادھر سے کوئی گولی نہیں آئی تھی۔

وہ ہیلی کاپٹر کو بحفاظت اتارنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے دروازہ کھلتے اور حشمت خان کو چھلانگ لگا کر اترتے دیکھا۔ پھر میں نے دیکھا وہ ایک نہایت عمر رسیدہ آدمی کو سہارا دے کر ہیلی کاپٹر سے اتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے بال برف کی طرح سفید مگر صورت الٹے توے کی طرح سیاہ تھی۔ اس کی کمر جھکی ہوئی تھی۔

حشمت خان کے سہارے وہ بڑی مشکل سے ہیلی کاپٹر سے اترنے میں کامیاب ہوا اور وہ دونوں گرتے پڑتے پہاڑی راستے پر بھاگنے لگے۔ نواب شرافت کی وجہ سے اس کے بیٹے کو بھاگنے میں دقت پیش آ رہی تھی کیونکہ نواب سے بھاگا نہیں جا رہا تھا۔ اس کے بڑھاپے

جسم میں طاقت ہی کہاں تھی۔

میں اس گھنڈر ہوتے انسان کو دیکھ کر دم بخود سا رہ گیا۔ میں اس سے انتقام لینے آیا تھا؟ وہ تو میرا ایک تھپڑ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اسے دہشت کے عالم میں گڑگڑاتے اور مرتے ہوئے اپنے بیٹے کے ساتھ گھسٹتے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے تو مجھے ترس آیا مگر پھر مجھے امی کی ڈائری کے مندرجات یاد آ گئے اور میرے جسم میں گویا انگارے بھر گئے۔ ہر مسام جاں سے شعلے پھوٹنے لگے۔

اس وقت تک پی چن نے بھی نیلی کاپر نیچے اتار لیا تھا۔ اس نے اپنا ہیلمٹ وغیرہ ہٹا لیا تھا۔ حشمت اور شرافت کے پاس یقیناً کوئی دوسرا ہتھیار نہیں تھا ورنہ وہ رک کر ہم پر فائر کرنے کی کوشش ضرور کرتے۔

پی چن تھوڑے حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "تم ان پر برسٹ مار کر ان کا قصہ ختم کیوں نہیں کر دیتے؟"

میں نے گویا کسی خواب سے چونکتے ہوئے کہا۔ "میں انھیں اتنی آسان موت مارنا نہیں چاہتا۔"

تاہم میں نے اس طرح فائر کیا کہ حشمت خان کی صرف ایک ٹانگ میں گولی لگی وہ گر پڑا۔ اس کا باپ گولی کھائے بغیر ہی اس کے ساتھ گر پڑا۔ انھوں نے اٹھ کر دوبارہ بھاگنے کی کوشش کی مگر ان سے دو قدم بھی نہ چلا گیا۔

تب میں نیلی کاپر سے اتر کر ایک پاؤں گھسیٹتا ان کے قریب پہنچا۔ گن میں نے پی چن کو تھما دی تھی۔ میں خالی ہاتھ تھا۔ میں نے ایک ایک ہاتھ سے ان دونوں کو بالوں سے پکڑ کر اٹھایا۔ نواب شرافت علی کی شکل واقعی اس کے اعمال کی طرح کریہہ تھی لیکن بیٹا وجیہہ تھا۔ نہ جانے وہ اس کا بیٹا تھا بھی یا نہیں؟ لیکن اعمال تو یہی بتاتے تھے کہ اس کی رگوں میں ایسے ہی باپ کا خون دوڑ رہا تھا۔

"بس..... اتنی ہی طاقت تھی بھاگنے کی؟" میں نے پوچھا' مجھے خود اپنی آواز سانپ کی پھنکار سے مشابہ محسوس ہوئی۔

نواب شرافت علی خوف' مشقت اور نقاہت کے باعث تھر تھر کانپ رہا تھا۔ کوئی وقت ہو گا کہ اسے دیکھ کر نہ جانے کتنے لوگ کانپتے ہوں گے مگر آج اس کی کیفیت خزاں رسیدہ پتے کی سی تھی۔ میں نے ان دونوں کے منہ پر تھوک دیا۔

حشمت خان نے مجھے ہٹتا دیکھ کر گھونسہ رسید کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے ایک ہی بازو سے اسے پتھریلی زمین پر پٹخ دیا۔ پھر میں نے انھیں ایک پاؤں کی ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ میرے مضبوط جوتے ٹوٹ چکے تھے لیکن اب بھی ان کی ٹھوکریں تکلیف دہ تھیں۔ وہ تڑپنے اور بلبلانے لگے۔ شرافت علی کو میں تم ٹھوکریں رسید کر رہا تھا کہ وہ کہیں جلدی نہ

مر جائے۔

کچھ ہی دیر میں وہ لہو میں لتھڑے ہوئے گوشت کی گٹھڑیاں سی بن کر رہ گئے۔ اس دوران وہ تڑپتے رہے' سسکتے رہے' معافیاں مانگتے رہے مگر ان کے الفاظ میری سماعت کے گنبدوں سے ٹکرا کر لوٹتے رہے۔ آخرکار ان میں چیخنے چلانے کی بھی سکت نہ رہی۔ وہ اب صرف ہچکیاں اور سسکیاں سی لے رہے تھے۔ ان کے وجود گویا پلپلے ہو چکے تھے اور تشنجی سے انداز میں جھٹکے کھا رہے تھے۔

میں نے شرافت علی کے خون میں لتھڑے ہوئے سفید بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر اس کا چہرہ اوپر کیا اور اس پر جھکتے ہوئے کہا۔ "مجھے پہچاننے کی کوشش کرو نواب شرافت علی خان! میں عزیزہ خانم کا بیٹا ہوں..... تمھیں یاد ہے عزیزہ خانم کون تھی اور تم نے اس کے ساتھ کیا کچھ کیا تھا؟"

اس کے خون آلود چہرے کے عضلات پھڑپھڑائے اور اس نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی مگر خون اس کی آنکھوں میں پھنس آیا۔ میں چاہتا تھا' وہ کچھ بولے' کوئی جواب دے مگر وہ کچھ بھی نہیں بول رہا تھا۔

پی چن میرے قریب آئی' وہ گویا مقصد سمجھتے ہوئے بولی۔ "تم انھیں کسی عبرت انگیز طریقے سے مارنا چاہتے ہو ناں"

میں صرف اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ شدت غیظ و غضب سے میرے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ چہرے ان دونوں کے لہولہان تھے لیکن خون درحقیقت مجھ پر سوار تھا

"ذرا نیچے دیکھو....." اس نے پہاڑی کے نشیب میں اشارہ کیا۔

میں نے جھک کر دیکھا' نشیب میں ایک گدلی نہر سی بہ رہی تھی۔ پاٹ خاصا چوڑا تھا۔ اسے چھوٹا سا دریا کہا جا سکتا تھا۔ پی چن بولی۔ "انھیں اس میں پھینک دو۔"

"ڈوب کر مرنا کوئی ایسی عبرت انگیز موت تو نہیں ہے۔" میں نے گھٹی گھٹی آواز میں بڑی مشکل سے کہا۔

"ان کے ڈوب مرنے کی نوبت نہیں آئے گی۔" پی چن بولی۔ "اس ندی میں مگرمچھ پائے جاتے ہیں.....اور تمھیں معلوم ہے مگرمچھ اپنے شکار کو کیسے کھاتا ہے؟"

"شاید وہ انھیں نگل جاتا ہے۔" میں نے کہا۔

پی چن نے نفی میں سر ہلایا۔ "انسان جتنے بڑے شکار کو وہ نہ تو نگل پاتا ہے اور نہ ہی اس کے دانت چبانے کے کام آتے ہیں۔ وہ انسان کو جبڑے میں نوکیلے دانتوں کی مدد سے پھنسا کر کسی درخت پر مارتا ہے اور اس وقت تک مارتا رہتا ہے جب تک اس کا جسم ملغوبہ نہیں بن جاتا۔ اس ملغوبے کو وہ نگلتا ہے۔"

میں نے طمانیت سے سر ہلایا اور دونوں باپ بیٹوں کو گھسیٹ کر نشیب میں پھینک دیا۔

ان میں بولنے اور حرکت کرنے کی سکت نہیں تھی مگر اس وقت ان کی چیخیں فضا میں گونج رہی تھیں۔ پانی میں ان کے گرنے کا زوردار چھپاکا سنائی دیا۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔

چند لمحے بعد وہ دونوں سطح آب پر نمودار ہوئے مگر اس طرح کہ حشمت خان کا سر اور کندھے ایک دیو پیکر مگرمچھ کے جبڑوں میں تھے اور نواب شرافت علی خان کی ٹانگیں۔

مگرمچھ اس طرح انہیں دبوچے بڑے سست اور کاہلی آمیز انداز میں کنارے پر آ گئے۔ درخت خاصے دور تھے مگر وہ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے ان کے پھڑکتے جسموں کو منہ میں دبائے ان تک پہنچ ہی گئے۔ پھر وہ انہیں اس طرح درختوں پر مارنے لگے جیسے دھوبی کپڑوں کو سل پر پٹختا ہے۔ وہ میری زندگی کا ایک حیرت انگیز اور ناقابل فراموش منظر تھا۔ چند لمحے بعد خون کے چھینٹے اڑ اڑ کر دور تک جانے لگے۔ کچھ دیر دیکھتے رہنے کے بعد مجھے ابکائی سی آئی اور میں پیچھے ہٹ آیا۔ میرے وجود میں ٹھنڈک سی اتر گئی تھی مگر میرے اعصاب اب بھی مرتعش تھے۔

آخرکار نیچے سے دھمک کی سی آوازیں سنائی دینا بند ہو گئیں۔ اس کے چند لمحے بعد ہی میں نے نیچے جھانک کر دیکھا تو وہاں نہ حشمت خان تھا اور نہ ہی اس کا باپ شرافت خان۔ مگرمچھ بھی واپس پانی میں چلے گئے تھے۔ بس درختوں کے تنے گوشت اور خون کے ملغوبے سے لتھڑے رہ گئے تھے۔

ایک طرف صرف ایک جوتا پڑا رہ گیا تھا اور اس میں پنڈلی کی ہڈی اٹکی رہ گئی تھی۔ اس ہڈی پر ذرا بھی گوشت نہیں تھا۔ جوتے سے نکلی ہوئی وہ لمبی سی ہڈی نہ جانے کیوں کچھ مضحکہ خیز سی لگ رہی تھی۔ میں جھرجھری سی لے کر اور کراہیت سی محسوس کرتے ہوئے پیچھے ہٹ آیا۔

چند لمحے تک میں وہیں کھڑا گہری گہری سانسیں لیتا رہا۔ پی چن نے بھی مجھ سے واپس چلنے کے لیے نہیں کہا۔ وہ بغور میری کیفیت کا جائزہ لے رہی تھی۔ میرے دل میں اس وقت ایک عجیب سناٹا چھایا ہوا تھا جبکہ میرے ذہن میں خیالات کا ایک ہجوم تھا۔ اپنی ساری جدوجہد کی ایک فلم سی میری نگاہوں میں گھوم رہی تھی۔ ایک عمر کی تلاش اور ایک طویل جان گسل جدوجہد کے بعد اصل دشمن چند سیکنڈ میں ٹھکانے پر لگ گیا تھا۔ انتقام کی ایک طویل اور اذیت ناک کہانی کو چند لمحوں میں اختتام مل گیا تھا۔

جب یہ منزلیں سر نہیں ہوئی تھیں تو میں ان کے بارے میں سوچتا تھا، نہ جانے کیا کیا تیاریاں کرتا تھا، کیا کیا پروگرام بناتا تھا۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ مجھے صدیوں کا سفر درپیش تھا لیکن اب جبکہ سفر طے ہو گیا تھا تو جیسے رگ و پے میں ایک بے کلی سی پھیل گئی تھی اور میں اپنے آپ سے پوچھ رہا تھا۔ "بس......! اتنی سی بات تھی۔"

میں نے اس عفریت کو نیست و نابود کر دیا تھا اور میں اب محسوس کر رہا تھا کہ یہ تو

فقط ایک ہوا تھا جو وقت نے میرے سامنے کھڑا کر دیا تھا۔ ویسے بھی جب انتہائی دشوار مہمیں تکمیل پا جاتی ہیں تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ تو کچھ ایسا مشکل کام نہیں تھا۔ گو دہ جان گھنے جنگلے تک مجھے اپنی زندگی کا بھروسہ نہیں تھا۔ ہر قدم پر میں یہی محسوس کر رہا تھا کہ موت مجھے نگلنے کی منتظر ہے..... لیکن میں موت سے بچتا چلا گیا تھا اور اس خبیث سے بدلے موت بن گیا تھا جس کا ایک خبیث جانشین بھی اس سے زیادہ طاقت پکڑ رہا تھا۔

آخر پی چن میرا ہاتھ تھامتے ہوئے آہستہ سے بولی۔ "چلو..... اب واپس چلتے ہیں۔"

میں اپنے پاؤں میں پھنسے شکنجے کو گھسیٹتا اس کے ساتھ واپس ہیلی کاپٹر میں آ بیٹھا۔ اب وہاں رکنا فضول تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ جذبات کی آندھیاں تو نہ جانے کب تک میرے وجود میں چلتی رہیں گی لیکن مجھے کچھ ضروری کام نمٹانے تھے۔ ہیلی کاپٹر فضا میں بلند ہو چکا تو میں نے نیچے چٹانوں کے لامتناہی سلسلے پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔ "اب تم واپس وادی کی طرف جا رہی ہو ناں؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا تو میں نے کہا۔ "پرواز ذرا نیچی ہی رکھو تو میں راستے میں وہ مقام بھی دیکھ لوں جہاں میں کچھ دیر کے لیے اترنا چاہتا ہوں۔"

"وہی جگہ تو نہیں جہاں سے تم میرے ساتھ روانہ ہوئے تھے۔" اس نے ہیلی کاپٹر کو بتدریج نیچے لاتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں..... میرا خیال ہے، وہ جگہ اس سے کافی آگے ہو گی۔ صحیح محل وقوع کا مجھے اندازہ نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "بہرحال وہاں چوبی تختوں اور گھاس پھوس سے بنا ہوا ایک مکان موجود ہے جو دور سے ہی نظر آ جائے گا۔"

اب ہم چٹانوں کی چوٹیوں کو تقریباً چھوتے ہوئے گزر رہے تھے۔ وہ میدان ہمیں نظر آ چکا تھا جہاں سے ہم حشمت خان کے تعاقب میں روانہ ہوئے تھے۔ اس کے بعد کا وہ راستہ جو میں نے سرنگ میں طے کیا تھا اور مجھے میلوں طویل محسوس ہوا تھا، اب بے حد مختصر لگا۔ سرنگ تو نہ جانے کہاں تھی، وہ مکان البتہ مجھے جلد ہی نظر آ گیا۔

ایک مناسب سی جگہ دیکھ کر پی چن نے ہیلی کاپٹر اتارا۔ میں ہیلی کاپٹر سے اترنے لگا تو میرے پاؤں میں پھنسا ہوا شکنجہ ایک بار پھر دروازے میں پھنس گیا۔

"اوہ..... اس کو تو میں بھول ہی گئی تھی۔" پی چن چونک کر بولی۔ "پہلے تو اس کا علاج کرنا چاہیے۔" اس نے کنٹرول بورڈ کے نیچے بنا ہوا ایک خانہ کھولا۔ اس میں طرح طرح کے چھوٹے چھوٹے اوزار بھرے ہوئے تھے۔ اس نے دھات کاٹنے والی ایک پتلی سی آری نکالی اور مسکراتے ہوئے بولی۔ "یہ جہاتی ہیلی کاپٹر ہے۔ اس میں بڑی بڑی عجیب چیزیں ہیں بلکہ یوں سمجھو کہ بے شمار الجھنوں کے حل موجود ہیں۔"

وہ آری سیدھی کر کے میرے پاؤں کی طرف جھکنے لگی تھی لیکن میں نے آری اس کے ہاتھ

سہنا تھا حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اس نے ذہنی اور جسمانی طور پر اتنی تکلیف اٹھائی تھی کہ اس کی آنکھوں میں یہ تاثر جھلک آیا تھا ورنہ وہ گلہ شکوہ کرنے والی عورت نہیں تھی۔

میں نے اسے کندھوں سے تھام لیا۔ اس کی متورم آنکھوں میں جھانکا اور صرف اتنا کہا۔ "کیٹی! میں ہمیشہ تمہارا شکرگزار رہوں گا کہ میری خاطر تم نے اتنی تکلیف برداشت کی۔"

وہ جیسے اپنی ساری تکلیف بھول کر میری باہوں میں سمٹ آئی اور سوجے ہوئے ہونٹوں کو بمشکل حرکت دے کر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ "اس مجھے بسے میں کئی چند افغاغ درکار تھے۔"

مجھے اس وقت وہ دنیا کی حسین ترین عورت معلوم ہو رہی تھی۔ "بس کچھ دیر اور بے زاری برداشت کر لو کیٹی! پھر ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے اور میں جلد از جلد تمہارے آرام و آسائش اور علاج کا انتظام کروں گا۔"

"تم میری فکر نہ کرو۔" اس نے ایک بار پھر مسکرانے کی کوشش کی اور مجھ سے قدم ملا کر چلنے لگی۔ "میں اتنی بری حالت میں نہیں ہوں' جتنی تم نظر آرہی ہوں۔"
بلا کا حوصلہ تھا اس میں!

سینڈریلا اور لی چن ہم سے آن ملی تھیں۔ میں نے ان کا تعارف کرانے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور سینڈریلا نے بھی لی چن کے متعلق کچھ نہیں پوچھا۔
"اب کیا پروگرام ہے؟" لی چن نے یوں پوچھا جیسے اسے واپس جانے کی جلدی ہو۔ "کیا تم میرے ساتھ واپس فلشنور چلنا پسند کرو گے؟"
"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن ذرا ٹھہر کر......"
"کچھ دیر نہیں' تمہیں بہت دن یہاں ٹھہرنا پڑے گا۔" سینڈریلا جلدی سے بولی۔ "میں بستی والوں سے خطاب کرتے وقت تمہارا تفصیلی ذکر کر چکی ہوں۔ تمہیں اپنا اور اس بستی کا نجات دہندہ قرار دے چکی ہوں۔ ابھی تو تمہیں بستی والوں سے خطاب بھی کرنا پڑے گا۔"

"مجھے بخش دو سینڈریلا!" میں نے جلدی سے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ "تقریر وغیرہ میرے بس کی بات نہیں۔ مستقبل میں بھی میرا لیڈر بننے کا کوئی ارادہ نہیں۔ اس لیے تمہیں بستی والوں سے جو کچھ کہنا ہے' خود ہی کہتی رہو۔ ویسے بھی مجھے ان کی زبان نہیں آتی اور انگریزی سب ہی تو نہیں سمجھتے ہوں گے۔"
"تمہاری تقریر کا ترجمہ ساتھ ساتھ سنوایا جائے گا۔" سینڈریلا بولی۔
"میں اس کے باوجود تیار نہیں۔" میں نے دوبارہ ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "البتہ بستی

والوں کی ایک امانت میرے پاس ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ تم بستی والوں میں فوراً تقسیم کر دو۔ یہ سب تمہارے عقیدت مند تو ہیں ہی لیکن یوں وہ ہمیشہ کے لیے تمہارے بے دام غلام بن کر رہ جائیں گے کیونکہ میں جہاں تک سمجھ پایا ہوں' دنیا کے بیشتر انسانوں کی طرح ان کا مسئلہ بھی معاشی ہے۔"

ہم اس وقت میدان سے قدرے فاصلے پر ایک چھپر کے نیچے قدرے کم روشنی میں کھڑے تھے۔ لوگ جو غالباً میدان ہی سے گئے ہوئے تھے' تیزی سے آرہے تھے اور میدان بھرتا جا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تھوڑی دیر بعد وہاں تل دھرنے کو جگہ نہیں رہے گی۔
سینڈریلا کی سمجھ میں شاید میری بات نہیں آسکی تھی لیکن جب میں نے اسے ساتھ لے جا کر ہیلی کاپٹر سے ہیروں' موتیوں اور زیورات کے بڑے بڑے تھیلے اتار کر دکھائے تو وہ بھی لی چن کی طرح خاصی حیران نظر آئی لیکن اس کی حیرت اس وقت دوچند ہو گئی۔ جب میں نے کہا۔ "وہ تین آدمیوں کو بلا کر یہ تھیلے اسٹیج پر پہنچاؤ اور انہیں اس رعایا میں تقسیم کر دو۔"

"کس طرح تقسیم ہوگی؟ یہ مختلف مالیتوں کی چیزیں ہیں۔" وہ قدرے پریشانی سے بولی۔
"لنگر کی طرح۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "تم مالیت کی فکر میں نہ پڑو۔ بس یہ دیکھنا کہ ہر ایک کو کچھ نہ کچھ مل جائے۔ کسی کو ہیرا' کسی کو نقدی' کسی کو زیور اور کوئی محروم نہ رہ جائے۔"
پھر میں نے تھیلے ہیلی کاپٹر سے اتار کر زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔ "اور میری تعریف میں بستی والوں کے سامنے زمین و آسمان کے قلابے ملانے کی ضرورت نہیں۔ میں تو ایک بہت حقیر سا انسان ہوں اور پھر میں بستی والوں پر کوئی احسان کر کے نہیں جا رہا۔ میں یہاں اپنے ایک کام سے آیا تھا' وہ پورا کر کے جا رہا ہوں۔"
میں نے لی چن کو پائلٹ سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود کیٹی کو سہارا دے کر اوپر چڑھایا۔ ہم دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ہیلی کاپٹر میں پائلٹ سمیت چار افراد کی گنجائش تھی۔ ہم بیٹھ چکے تھے تو میں نے جھک کر کہا۔ "بس...... ہم تو اب جا رہے ہیں' تم اپنا کام کرو۔"

سینڈریلا ہم بجود سی کھڑی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں نمی کی جھلملاہٹ بھی محسوس کی۔ اس جھلملاہٹ کے ساتھ ساتھ ایک بے عنوان سی حیرت بھی اس کی آنکھوں میں جاگزیں تھی جیسے اسے یقین نہ آرہا ہو کہ میں یہ سب کچھ کر کے اس طرح اچانک رخصت بھی ہو سکتا ہوں۔ ان گنت' ان کہی باتیں گویا اس کے ہونٹوں پر ہی دم توڑ کر رہ گئی تھیں۔ وہ نہ جانے کیا کچھ سوچ بیٹھی تھی لیکن میں اب کئی وجوہات کی بنا پر یہاں ایک سٹ بھی فاضل گزارنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ میرا مشن ختم ہو چکا تھا اور

محض جذباتیت کے مظاہروں' فضول کاموں یا ستانے میں وقت ضائع کرنے کا میں خواہش مند نہیں تھا۔

دوسری بات جو زیادہ اہم تھی' وہ یہ کہ سینڈریلا انہی عورتوں میں سے تھی جنہیں میں اصطلاح میں ساحر عورتیں کہا کرتا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ میں جتنا زیادہ وقت اس کے ساتھ گزاروں گا' اتنا ہی وہ مجھے مسحور کر لے گی' اپنی ذات کا اسیر بنا لے گی اور میری زندگی میں کسی کی بھی ذات کا اسیر بننے کی گنجائش نہیں تھی۔ گو کہ مجھے اپنی ذات پر اعتماد بھی تھا کہ جب تک میں خود نہ چاہوں' مجھ پر کسی کا سحر اثر انداز نہیں ہو سکتا لیکن میں پھر بھی ایسے معاملات میں فی الحال خود پر بھی بھروسہ نہیں کرتا تھا۔

ہیلی کاپٹر کے پر تیزی سے گھومنے لگے تو سینڈریلا اور بھی گئی۔ اب دن کی روشنی پوری طرح اس پر پڑ رہی تھی۔ وہ اب بھی دم بخود سی نظر آ رہی تھی گویا جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ رہی ہو جس نے اسے حیرتوں کے جنگل میں دھکیل دیا ہو۔ اب بھی ہماری طرف متوجہ ہو چکے تھے۔ کچھ لوگ سینڈریلا کے گرد جمع ہو چکے تھے۔ وہ بستی کے معززین معلوم ہوتے تھے جو ہیلی کاپٹر کی طرف اشارہ کر کے سینڈریلا سے غالباً ہمارے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ وہ کافی پرجوش نظر آ رہے تھے لیکن سینڈریلا جیسے ان کی آوازیں سن ہی نہیں رہی تھی۔ کچھ لوگ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں ہیلی کاپٹر کی طرف بھی بڑھے لیکن لی چن نے اسی وقت تھروٹل کھینچا اور ہیلی کاپٹر ہوا میں بلند ہونے لگا۔

کچھ دیر بعد وادی' اس کے مکین' سینڈریلا سب نیچے اور بہت پیچھے رہ گئے۔ میں اتنی پھیلی لنگڑی دھوپ کو دیکھ رہا تھا اور اب مجھے بھی گزری ہوئی شب محض ایک خواب محسوس ہونے لگی تھی۔ ایک پرہنگامہ خواب مگر جسم و جان میں اب جو تھکن اور سستی محسوس ہونے لگی' وہ گواہی دے رہی تھی کہ گزشتہ شب کے ہنگامے خواب نہیں حقیقت تھے۔

لی چن نے جب سے پرواز شروع کی تھی' وہ بالکل چپ چاپ اور لاتعلق سی نظر آ رہی تھی۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ میری آنکھیں غنودگی میں بند نہ ہو جائیں۔ میں نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کنگی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی خلاء میں نہ جانے کس چیز کو گھور رہی تھی' چونک کر میری طرف متوجہ ہوئی' پھر جھرجھری سی لے کر میرے کچھ اور قریب کھسک آئی جیسے اب بھی کچھ غیر مرئی عفریت اسے ڈرا رہے ہوں۔

کھٹمنڈو پہنچ کر کنگی کو ایک پرائیویٹ ہسپتال میں داخل کرنا پڑا جہاں کے ڈاکٹروں نے بتایا کہ اسے مکمل طور پر صحت یاب ہونے میں کئی دن لگیں گے اور اگر اس کے علاج میں مزید ذرا بھی تاخیر کی گئی تو اس کی چوٹیں اور زخم وغیرہ بگڑتے چلے جائیں گے۔ لی چن اور اس کے باپ لیو آنگ نے اسے داخل کرانے کا بندوبست کیا تھا اور مجھے اپنے ساتھ گھر لے آئے تھے۔ چائنا ٹاؤن میں واقع وہ پراسرار سا گھر بس کے بیرونی حصے میں نام نہاد

نوادرات کی وہ عسرت زدہ سی دکان تھی۔

اندر سے لیو آنگ کا گھر آراستہ و پیراستہ' نہایت شاندار اور پرآسائش تھا۔ پہلے دن تو میں لمبی تان کر سوتا رہا۔ اپنی پیشانی اور رخساروں پر نرم و گداز ہاتھوں کا لمس محسوس کر کے میں بیدار ہوا۔ طویل و عریض اور اونچی چھت والی خوابگاہ جس کی کھڑکیوں اور دروازوں پر قدیم طرز کے ریشمی پردے۔ سرسراتے تھے' ملگجے اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ خوابناک نیلگوں روشنی والے نائٹ لیمپ نے اندھیرا ہلکا کر رکھا تھا اور میں اپنے بیڈ کے کنارے بیٹھی ہوئی لی چن کے دلکش سراپا کو خاصی حد تک صاف طور پر دیکھ سکتا تھا۔ وہ مجھے نہ بھی نظر آتی تب بھی میں اس کی موجودگی محسوس کر سکتا تھا۔ اب مجھے اس کے وجود کی خوشبو کی پہچان ہو چکی تھی۔

"رات کے نو بج رہے ہیں۔" وہ مجھے آنکھیں کھولتے دیکھ کر سرگوشی میں بولی۔ "اٹھ کر کم از کم کھانا ضرور کھا لو۔ اس کے بعد خواہ دوبارہ سوتے رہنا۔"

اس نے کھانے کا نام لیا تو جیسے میرے معدے میں یک لخت ٹیس سی اٹھی اور مجھے احساس ہوا کہ میں نے گزشتہ چھتیس گھنٹوں میں صرف آج دوپہر لی چن کے گھر پہنچنے کے بعد سوپ کا ایک پیالہ پیا تھا۔

لی چن کی قربت شاید میرے اعصاب میں آگ لگا دیتی' اس لیے میں فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ روم میں جا گھسا۔ کچھ دیر بعد میں نہا دھو کر کھانے کی میز پر پہنچا تو وہاں لی چن اور اس کے باپ لیو آنگ کے علاوہ ایک نوجوان بھی موجود تھا۔ اس کی عمر غالباً انیس بیس سال سے زیادہ نہیں تھی لیکن اس کا جسم ایک سانڈ کی طرح مضبوط اور پھیلا پھیلا نظر آ رہا تھا۔ قد اس کا چھوٹا ہی تھا' اس لیے جسم کا پھیلاؤ کچھ زیادہ ہی نمایاں معلوم ہوتا تھا۔

اس کا چہرہ خاصا چوڑا' رنگت سرخ اور ناک عام چینیوں کی طرح چپٹی تھی لیکن اس کی آنکھیں عام چینیوں کی طرح زردی مائل یا دھندلی ہوئی سی نہیں تھیں بلکہ شعلوں کی طرح دہک رہی تھیں اور ان سے خونخواری عیاں تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہر وقت ہی ایسا کسی نہ کسی بات پر خار کھاتا رہتا ہے حتیٰ کہ اس نے میری آہٹ سن کر میری طرف بھی دیکھا تو اس طرح دیکھا جیسے میں نے اس کا کچھ بگاڑ دیا ہو۔

لی چن تو جیسے ماحول سے لاتعلق سی سر جھکائے بیٹھی رہی البتہ لیو آنگ نے اس نوجوان سے میرا تعارف کرایا۔ اس کا نام لی ین تھا اور یہ سن کر مجھے نہ جانے کیوں کچھ حیرت سی ہوئی کہ وہ لی چن کا منگیتر تھا۔ اس نے میز کے دوسری طرف سے مصافحے کے لیے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس کا ہاتھ شکنجے کی طرح مضبوط تھا۔ میرے تعارف کے جواب میں اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ میں بھی خاموشی سے اس کے مقابل بیٹھ گیا۔ لیو آنگ نے بتایا کہ لی ین اسی گھر میں اوپر کی منزل پر رہتا ہے۔

کھانا بالکل خاموشی سے کھایا گیا جیسے کوئی تعزیتی اجلاس منعقد ہو رہا ہو اور میرے خیال میں یہ لی ین کی موجودگی کا اثر تھا۔ مجھے کچھ بدمزگی سی محسوس ہوئی اور میں کھانے سے فارغ ہوتے ہی دوبارہ اس خوابگاہ میں آ گیا جو میرے لیے مخصوص کی گئی تھی۔ وہ اسپتال جس میں کینٹی کو داخل کرایا گیا تھا گو کہ پرائیویٹ تھا لیکن رات کے وقت ملاقاتوں کی آمد پر وہاں بھی سخت پابندی تھی ورنہ شاید اس وقت میں وہیں چلا جاتا۔ بہرحال کچھ دیر کروٹیں بدلنے کے بعد میں سو گیا۔

رات کے نہ جانے کس پہر ایک حسین خواب شروع ہوا جس کا محور و مرکز پی چن تھی اور جب وہ طویل خواب اختتام پذیر سا ہونے لگا تو نہ جانے کیوں مجھے احساس ہوا کہ درحقیقت وہ خواب نہیں تھا، پی چن کا گرم و گداز وجود حقیقتاً میری گرفت میں تھا۔ خاصے طویل وقفے کی خاموشی کے بعد میں نے اس کے سنہرے ریشمی بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ "تمہارے منگیتر سے مل کر قطعاً خوشی نہیں ہوئی۔"

"میں بھی اس کی منگیتر بن کر قطعاً خوش نہیں ہوں۔" اس نے سرگوشی میں جواب دیا۔

"پھر کیا مجبوری ہے؟ تم کوئی ریاست کی پروردہ ان پڑھ اور مجبور لڑکی تو نہیں ہو۔" میں نے کہا۔

"بعض معاملات میں ہم لوگ ان پڑھ دیہاتیوں اور بلا کے رجعت پسندوں سے بھی بدتر ہیں۔" وہ گہری سانس لے کر بولی۔ "بغاوت نہیں کر سکتے...... عہد نہیں توڑ سکتے......" اس کے لہجے میں دکھ، تاسف اور محرومی تھی۔ "مجھے معلوم ہے کہ تم محض ایک خواب ہو، نسیم سحری کا ایک جھونکا ہو، آج یہاں ہو، کل نجانے کہاں ہو گے...... اور میری طلب محض جسم کی طلب نہیں...... دنیا بھی تنہا ہے ایک جسم ہی کا نام ہے...... سب کچھ جانتے بوجھتے بھی نجانے کیوں میں تمہارے پہلو میں سمٹ آئی ہوں...... مجھے اپنے آپ پر اختیار نہیں رہا۔ شاید میری مثال تپتے صحرا میں سفر کرتے اس مسافر کی سی ہے جسے کوئی شجر سایہ دار نظر آ جائے تو بے اختیار اس کی پناہوں میں جا بیٹھے، محض سستانے کے لیے...... یہ تو اسے بھی معلوم ہوتا ہے کہ چھاؤں میں وہ سدا نہیں بیٹھ سکتا اور نہ ہی درخت کو یا چھاؤں کو ساتھ لے کر چل سکتا ہے۔ شاید تم یقین نہ کرو کہ میں اس قسم کی لڑکیوں میں نہیں ہوں جو ہر ایک مرد کو دیکھتے ہی دل ہاتھ سے چھوڑ بیٹھیں لیکن تمہیں پہلی بار ہی دیکھ کر دل کو نجانے کیا ہونے لگا تھا......"

"میں اسے اپنی خوش قسمتی پر محمول کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔

کچھ دیر بعد وہ چلی گئی۔ بالکل اسی طرح جیسے گلشن کے تمام پھولوں سے خوشبو چلی جائے۔ میرے دل میں وہ ایک عجیب سی خلش چھوڑ گئی تھی۔ میں دیر تک ملگجی روشنی میں

آنکھیں کھولے پڑا رہا اور اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ کچھ دیر پہلے تک وہ میرے اتنے قریب موجود تھی۔ کچھ دیر بعد بالآخر میں ایک بار پھر بے سدھ سو گیا۔

دوسری صبح پی چن نے میری ہدایت کے مطابق مجھے علی الصبح ہی جگا دیا۔ میں جلد از جلد کینٹی کی خبرگیری کے لیے جانا چاہتا تھا اور میرا دن بھر اسپتال میں رہنے کا ارادہ تھا۔ پی چن اور لیو تانگ تو پہلے ہی صبح جلد اٹھنے کے عادی معلوم ہوتے تھے۔ میں جب ناشتے کی میز پر پہنچا تو وہ دونوں ہی نہیں بلکہ لی ین بھی میز پر موجود تھا اور وہی گزشتہ رات کی سی بوجھل خاموشی میری منتظر تھی۔

ایک خاموش طبع ملازمہ نے ہم چاروں کو اپنی اپنی پسند کا ناشتہ دیا۔ ناشتہ کرنے کے بعد میں نے لباس تبدیل کیا۔ پی چن نے نجانے کہاں سے میرے لیے ایک معقول قسم کے سوٹ کا بندوبست کر دیا تھا جو میرے جسم پر خاصا فٹ آیا تھا۔ تیار ہو کر میں گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ چائنا ٹاؤن کی گلیاں اتنی تنگ تھیں کہ چھوٹی سے چھوٹی کار بھی ان میں آسانی سے نہیں گزر سکتی تھی۔ لیو تانگ یا پی چن کو کہیں دور جانا ہوتا تھا تو وہ گیراج تک پیدل جاتے تھے۔ گیراج میں دیکھ چکا تھا اور اس وقت ان کی کار کی چابی میرے ہی پاس تھی۔

میں نے ناشتے میں بلیک کافی بھی پی تھی۔ اس کے باوجود گھر سے نکلتے ہی مجھے احساس ہو رہا تھا کہ مجھ پر کچھ سستی سی طاری ہے جو کم ہونے کے بجائے لحہ بہ لحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک گلی سے گزرنے کے بعد میں دوسری گلی میں داخل ہوا تو چند قدم چل کر میری پلکیں بوجھل ہونے لگیں اور دل چاہنے لگا کہ میں وہیں لیٹ کر سو جاؤں۔ تنگ گلیوں اور اینٹوں کا ناہموار فرش بھی اس وقت مجھے بھلا معلوم ہونے لگا تھا لیکن ان گلیوں میں دونوں طرف گندے پانی کے نکاس کی نالیاں تھیں۔ ایک بار تو مجھے اندیشہ ہوا کہ میں نالی ہی میں نہ گر پڑوں۔

میں نے سامنے کی اینٹوں پر ہاتھ رکھ کر قریبی دیوار کا سہارا لیا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاتا جا رہا تھا۔ جو بار بار سر جھٹکنے کے باوجود دور نہیں ہو رہا تھا۔ اس لمحے مجھے یقین ہو گیا کہ مجھے کافی یا ناشتے کی کسی اور چیز میں کوئی خواب آور دوا دی گئی تھی اور چونکہ میں پی چن کے گھر میں اس قسم کا گمان بھی دل میں نہیں لا سکتا تھا اس لیے میں نے کسی چیز کے ذائقے پر کوئی توجہ نہیں دی۔ حالانکہ مجھے ڈوز یقیناً خاصا طاقتور دیا گیا تھا جو اتنی تیزی سے میرے اعصاب شل ہوتے جا رہے تھے کہ واپسی کی ہمت میں اپنے اندر نہیں پا رہا تھا۔

میرا آخری احساس یہ تھا کہ گلی کا فرش جیسے تیزی سے میرے چہرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ شاید میں نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر فرش کو اپنے چہرے سے ٹکرانے سے باز رکھنے

مجھے اس لوٹے پنے پر بہت غصہ آیا۔ اگر اس نے پاپا چن کو بیرست کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور اس معاملے میں اتنا ہی غیرت مند تھا تو اسے اسی وقت کچھ کرنا چاہیے تھا۔ اس کے برعکس اس نے نہ صرف ٹھنڈے دل سے صبح کا انتظار کیا بلکہ یہاں تک پہنچانے کے لیے باقاعدہ سازش سے بھی کام لیا تھا۔

"میرے لیے کیا سزا تجویز کی گئی ہے؟" میں نے اپنے لہجے میں دکھ اور نقاہت سمو لی جیسے میں بالکل ہی ہمت ہار چکا ہوں۔

میرے سوال کا جواب لی ین نے دیا۔ وہ فخریہ انداز میں کڑاہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "اس کڑاہی میں موجود محلول میں تمہیں ابال کر ایک ایسا مرہم تیار کیا جائے گا جو کئی نوع انسان کے بہت سے شدید تکالیف کا علاج ہے۔ ایسی تکالیف جن میں سے بیشتر کو جدید دور کے ڈاکٹر اور سرجن ناقابل علاج سمجھتے ہیں۔"

لی ین کے چہرے پر خونخوار سی مسکراہٹ نمودار ہو چکی تھی۔ اس نے اپنی پتلون کی پھولی پھولی سی جیب سے آڑو کے برابر کوئی چیز نکالی اور میرے قریب آتے ہوئے بولا۔ "اور تمہاری کھوپڑی اس طرح محفوظ کر لی جائے گی......" وہ چیز اس نے میری آنکھوں کے سامنے کر دی اور تب میں نے محسوس کیا کہ وہ آڑو جتنی چیز دراصل ایک مکمل انسانی کھوپڑی تھی جسے گویا جادو کے زور سے چھوٹا کر دیا گیا تھا لیکن فوراً ہی مجھے یاد آ گیا کہ اس میں جادو والی کوئی بات نہیں تھی۔

کئی افریقی قبائل خصوصاً دریائے ایمزن کے کنارے بسنے والے وحشی قبائلی اپنے دشمن کو ہلاک کرنے کے بعد اسی طرح ان کی کھوپڑیاں محفوظ کر لیا کرتے تھے اور انہیں فتوحات کی نشانیاں شمار کرتے تھے۔ دراصل یہ عمل کھوپڑی نہیں ہوتی تھی۔ وہ دشمن کو ہلاک کرنے کے بعد اس کی کھوپڑی تن سے جدا کر کے کسی محلول میں ڈال کر گھنٹوں کو ابالتے تھے اور اس کے بعد کھوپڑی کی کھال اس طرح اتار لیتے تھے جیسے ابلے ہوئے چنے پر سے چھلکا۔ پھر اس خول کو کئی قسم کے مراحل سے گزارنے کے بعد چھوٹا کیا جاتا تھا اور اس میں روئی وغیرہ بھر کر اسے ٹھوس بنا دیا جاتا تھا۔ انسان کی شناخت جوں کی توں برقرار رہتی تھی۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ دور افتادہ جنگلوں میں جنم لینے والی رسوم اور وحشیانہ طور طریقے کی جڑیں نہ جانے کہاں کہاں تک پھیل ہوئی تھیں۔

اس دوران ترکی ٹوپی والے معمر چینی نے ایک شخص کو اشارہ کر دیا اور اس نے اٹھ کر چولہا روشن کر دیا تھا۔ کمرے میں قدرے حرارت کا احساس ہونے لگا تھا۔ میں نے ایک بار پھر غیر محسوس طور پر جسم کو حرکت دینے کی کوشش کی تھی اور اسی نتیجے پر پہنچا تھا کہ ابھی میری حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ تب میں نے بظاہر اسی طرح آنکھیں بند کر لیں جیسے مایوسی کی انتہا نے مجھے موت سے پہلے ہی مار ڈالا تھا لیکن درحقیقت میں نے یوگا کی

ایک مشق شروع کر دی تھی۔

کچھ دیر بعد میں نے بہت دور ہی سے سوال صوت کی آواز بھی ابھرتی محسوس کی۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ کڑاہی میں کچھ ابلنے لگا تھا لیکن میں نے اب بھی آنکھیں نہیں کھولی تھی تو کہ میری مشق مکمل ہو چکی تھی اور مجھے احساس ہو چکا تھا کہ میرا جسم حرکت کرنے کے قابل ہو چکا ہے لیکن میں نے مزید مشق جاری رکھی تاکہ اصل صلاحیتیں پوری طرح عود کر آئیں۔

میں نے اس وقت آنکھیں کھولیں جب مجھے ہاتھ پیروں سے پکڑ کر زمین سے اوپر اٹھایا جانے لگا۔ میں نے دیکھا کہ میرا ایک ایک پیر تو دو آدمیوں نے پکڑا ہوا تھا لیکن دونوں ہاتھ اکیلے لی ین نے پکڑے ہوئے تھے اور میرے وزن سے اس کے طاقتور اور کسرتی بازوؤں کی مچھلیاں پوری طرح ابھری ہوئی تھیں۔

میں نے جماری سائز کی کڑاہی کے زیادہ قریب جانے کا خطرہ مول نہیں لیا اور ٹانگوں سے پوری قوت سے جھٹکا دیا۔ جاروں آدمی دور جا گرے۔ جھٹکا کچھ اس انداز کا تھا کہ میرے بازو بھی لی ین کی گرفت سے چھوٹ جانے چاہیے تھے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ غالباً میری بے بسی کا یقین رکھنے کے باوجود غیر متوقع صورتحال کے لیے بھی تیار تھا۔ جیسے ہی میرے پیر زمین سے مس ہوئے اس نے میرے بازوؤں کو اس طرح جھٹکا دیا کہ اگر میں نے بروقت اپنے آپ کو سنبھال نہ لیا ہوتا تو میرے کندھے اتر چکے ہوتے۔

میں چیت زمین پر گرا۔ لی ین نے میرے بازو چھوڑے بغیر مجھ پر اوندھا گرنے کی کوشش کی لیکن میں نے دوہرا ہوتے ہوئے اس کا سر دونوں پیروں میں پھنسایا اور دوسرے ہی لمحے وہ میرے پیروں کی طرف آن گرا۔ اس کا سر بھی پتھر کے ٹھوس گولے کی طرح فرش سے ٹکرایا تھا لیکن اسے جیسے کوئی خاص اثر ہی نہیں ہوا تھا۔ بازو اس کی گرفت سے چھوٹ چکے تھے۔ وہ تیندوے کی طرح تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا اور میرے کھڑے ہوتے ہوتے اس نے ایڑی پر گھوم کر الٹے رخ مجھے چاپ سوئی رسید کرنے کی کوشش کی لیکن میں بچ گیا اور یہ جان کر ضرورت سے زیادہ محتاط بھی ہو گیا کہ وہ نوجوان گینڈے کی طرح مضبوط ہی نہیں تھا بلکہ جوڈو اور شاید کراٹے سے بھی واقف تھا۔

اس دوران باقی سب لوگ ہمارے گرد گھیرا تنگ کر چکے تھے اور غالباً مجھ پر جھپٹنے ہی والے تھے۔ جب میں نے ترکی ٹوپی والے معمر چینی کی آواز سنی۔ اس نے چینی میں غالباً ان سب کو اس لڑائی میں غیر جانبدار رہنے کو کہہ دیا تھا کیونکہ وہ سب پیچھے ہٹ گئے تھے اور واپس بنچوں پر جا بیٹھے تھے اور معمر چینی خود بھی انہی میں شامل ہو گیا تھا۔ پھر اس نے جیسے مجھے سنانے کے لیے انگریزی میں کہا۔ "آگر صاحب تم مقابلے کی ہمت ہے اور وہ مقابلہ کرنے کا خواہش مند بھی ہے تو لی ین کو اسے شکست دینا ہی پڑے گی ورنہ ہمارا لڑکی

ناصب ای کی ملکیت ہو جائے گی۔"

یوں اس نے گویا میرا کام آسان کر دیا۔ ٹی ین بے شک سانڈ کی طرح مضبوط تھا لیکن اس اکیلے سے نمٹنا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ میں نے دو مار میں اس کا بھرکس نکال دیا اور جب وہ فرش پر گر پڑا تو میں نے اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ اس کی کئی پسلیاں ٹوٹ گئیں تھیں کہ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ ٹوٹی ہوئی پسلیاں اس کے پھیپھڑوں میں نہ جا گھسیں۔ ویسے بھی وہ گوشت کی ایک چھوٹی سی چٹان کی طرح بے حس و حرکت ہو چکا تھا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

سو چینگ نے دونوں ہاتھ اٹھا کر گویا مقابلہ ختم کرنے کا اعلان کیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر برابر والے کمرے میں لے گیا۔ وہاں صاف ستھری چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ ایک طرف گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے اور ایک طرف چھوٹے چھوٹے پایوں والی ویسی ہی تپائی رکھی تھی جس پر پرانے دور کے پٹواری، پیر یا آڑھتیوں کے منشی بہی کھاتے لکھتے تھے۔

چینگ نے مجھے ایک گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں بیٹھ چکا تو چینگ بھی تپائی کے قریب آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور یوں مسکرا کر میری طرف دیکھنے لگا جیسے چند لمحے پہلے کچھ ہوا ہی نہیں تھا اور میں تو درحقیقت اس کا مہمان ہوں جو ابھی ابھی پہنچا ہے۔

پھر اس نے جھک کر تپائی کا ڈھکن اٹھایا اور دراز سے ایک سفید کاغذ اور قلم دوات نکالی۔ دراز کا ڈھکن گرا کر وہ کاغذ اور دوات اسی پر رکھ کر نہایت اطمینان سے کاغذ پر کچھ لکھنے لگا اور جب میں نے دیکھا کہ وہ جس چیز سے لکھ رہا تھا وہ دراصل قلم نہیں نہایت باریک سا برش تھا جس سے وہ اوپر سے نیچے کے رخ لکھ رہا تھا۔ اسی طرح تین چار سطریں لکھ کر اس نے کاغذ میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "یہ لے جا کر لیو آنگ کو دے دینا۔"

کاغذ پر چینی میں جانے کیا لکھا ہوا تھا۔ "یہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"لیو آنگ کے نام خط ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "میں نے اس کے نام حکم لکھ دیا ہے کہ وہ متنازعہ لڑکی یا چن کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دے دے کیونکہ تم نے ٹی ین کو شکست دے دی ہے۔ ٹی ین نے بھی طاقت ہی کے بل پر لڑکی کو حاصل کیا تھا اور اس کا دعویٰ تھا کہ جو بھی اسے شکست دے دے گا وہ لڑکی کو جیت لے گا بشرطیکہ لڑکی بھی راضی ہو.....اور لڑکی چونکہ تمہارے کمرے میں رات گزار کر نکلی تھی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تمہیں چاہتی ہے۔"

"لیکن مجھے نہیں چاہیے لڑکی!" میں نے اس کا حکم نامہ پرزے پرزے کر کے ایک طرف پھینک دیا۔ "ٹی ین کو ہوش آجائے تو اس سے کہہ دینا کہ لڑکی کو اپنی ملکیت میں رکھے۔ ذرا اس کا اچار ڈال کر کھائے یا مربہ بنا کر لیکن دوسروں کے لیے بلاوجہ پریشانیاں پیدا نہ کرتا پھرے۔ وہ دوسروں سے تو زندگی اور موت کی بازی لگاتا پھرتا ہے لیکن اس

نرم و نازک سی لڑکی پر اس کا بس نہیں چلتا کہ اسے اپنے سے وفاداری پر مجبور کر سکے ......اب آپ براہ کرم صرف اتنی تکلیف کریں کہ میرے باقی کپڑے اور ہتھیار اگر یہاں موجود ہیں تو مجھے عنایت فرما دیں۔" سو چینگ چند لمحے بغور میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ترکی ٹوپی اتار کر چندیا کھجائی۔ اس کی چندیا کے وسط میں ہندوؤں کی طرح چوٹی تھی۔ ٹوپی دوبارہ سر پر رکھ کر اس نے لاپروائی سے کندھے اچکائے اور ایک بار پھر تالی بجائی۔ خادم کے آنے پر اس نے چینی میں اسے کوئی حکم دیا اور چند ہی لمحے بعد میری تمام چیزیں میرے سامنے پیش کر دی گئیں۔

کچھ دیر بعد میں اس پراسرار مکان سے ایک ایسی گلی میں نکلا جس میں دن چڑھے بھی نیم تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ میرا حلیہ اب بالکل درست تھا۔ ہاتھوں پر اور ٹھوڑی کے نیچے چند معمولی خراشوں کے سوا بظاہر ایسی کوئی علامت دکھائی نہیں دے رہی تھی جس سے کوئی سمجھتا کہ میں کسی خوفناک معرکے سے گزر کر آ رہا ہوں۔

سو چینگ نے مجھے مین روڈ پر پہنچنے کے لیے راستہ سمجھا دیا تھا لیکن ان گلیوں میں کھڑے ہو کر پتا چلتا تھا کہ راستہ سمجھنے کا کوئی بھی فائدہ نہیں۔ میں بہرحال لمبے لمبے ڈگ بھرتا ایک طرف سے آتی ہوئی لڑکی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ سنبھل کر میں اس کی طرف متوجہ ہوا تو دیکھا وہ یان چی تھی۔

"شکر ہے......" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "میں تو سخت پریشان تھی کہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچ گیا ہو۔ تم کسی مصیبت میں نہ پھنس گئے ہو۔ میں نے تقریباً تمہارے پیچھے پیچھے ہی لی ین کو بھی گھر سے نکلتے دیکھا تو میرا ماتھا ٹھنکا تھا کہ کوئی گڑبڑ نہ ہو لیکن میں نے فیصلے پر پہنچنے اور گھر سے نکلنے میں دیر کر دی۔ باہر آئی تو مجھے ایک گلی میں تمہاری گھڑی پڑی ملی۔ میں پہلے لی ین کے دو ایک اور ٹھکانوں پر گئی لیکن اچانک مجھے خیال آیا کہ کہیں لی ین تمہیں مقدس چیتوا کے ہاں نہ لے گیا ہو......کیا بات ہے تم مجھے اس طرح کیوں گھور رہے ہو۔ تمہارا منہ کیوں پھولا ہوا ہے؟" وہ قدرے شرارت آمیز لہجے میں بولی۔ "لگتا ہے کسی ناخوشگوار تجربے سے گزر رہے ہو۔"

مجھے اس وقت معلوم نہیں کیوں دنیا کی ہر چیز پر غصہ آ رہا تھا۔ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "یہ تو تمہیں لی ین ہی زیادہ بہتر طور پر بتا سکے گا۔ ویسے میرا دوستانہ مشورہ یہی ہے کہ چند ماہ اسپتال میں گزار کر جیسے ہی لی ین واپس آئے اس سے شادی کر ڈالو ورنہ وہ نرا بھینسا نہ جانے کس کس کا خون کرتا پھرے گا۔"

وہ چند لمحے خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی۔ پھر مسکراتی ہوئی سی آواز میں بولی۔ "تو تم نے اسے کئی ماہ کے لیے اسپتال جانے کے قابل کر دیا ہے؟ جان سے ہی مار دیا ہوتا۔"

"تمہاری وجہ سے چھوڑ دیا۔" میں نے کہا۔ "اگر وہ تمہیں اتنا ہی ناپسند ہے تو خود ہی مار ڈالنا۔ اتنا مشکل نہیں اسے مارنا۔ عقل نام کی تو کوئی چیز ہے ہی نہیں ان میں۔"

میں اسے وہیں چھوڑ کر آگے بڑھنے لگا تو وہ کچھ ہکابکا ہو کر بولی۔ "کہاں جا رہے ہو؟"

"میرا انتظار مت کرنا۔ میں اب ہوٹل میں قیام کروں گا۔" میں نے سردمہری سے کہا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا آگے چل دیا۔ آخری بار میں نے اس کی آنکھیں دیکھیں تو ان میں حیرت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ لاانتہا حیرت۔

وہاں سے میں سیدھا اسی اسپتال پہنچا جہاں گیتی داخل تھی۔ ڈاکٹر مجھے پرائیویٹ وارڈ کے دروازے پر مل گیا۔ اس نے بتایا کہ مکمل چیک اپ اور نہ جانے کتنے قسم کے ایکسرے اور ٹیسٹوں کے بعد گیتی کی ذہنی حالت کی جو مفصل رپورٹ مرتب ہوئی اسے پڑھ کر وہ خود بھی لرز اٹھا تھا۔ حالانکہ اس کا کام ہی دن بھر اسی قسم کی یا اس سے بھی زیادہ خوفناک رپورٹیں پڑھنا تھا لیکن گیتی کے معاملے میں یہ احساس اس کے لیے لرزہ خیز تھا کہ اس کی یہ حالت کسی حادثے یا لڑائی جھگڑے میں نہیں' تشدد برداشت کرتے ہوئے ہوئی تھی۔ اگر اسپتال سرکاری ہوتا تو اس تشدد کی وضاحت ایک الگ مسئلہ ہوتی۔

اس رپورٹ کے مطابق گیتی کے ہاتھوں کی بیشتر انگلیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ کئی نازک مقامات پر گوشت پھٹا ہوا تھا۔ کئی جگہوں سے جسم داغدار تھا' بال نوچے گئے تھے۔ تو کیلی چیزیں چبھوئی گئی تھیں۔ کئی جگہ سے جلد تیز دھار چاقو سے چیری گئی تھی۔ اس کے باوجود وہ اسپتال تک ہوش و حواس میں پہنچی تھی۔ اس پر ڈاکٹر کو بڑی حیرت تھی۔

میں وارڈ میں پہنچا تو گیتی کے چہرے اور جسم کے بیشتر حصوں پر پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں' مگر وہ جاگ رہی تھی اور پٹیوں کے درمیان سے مجھے دیکھ سکتی تھی۔ میں اس کے تاثرات نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن جب وہ بولی تو اس کی سرگوشی نما آواز سے بھی مجھے اس کے جذبات کا اندازہ کرنے میں دشواری پیش نہیں آئی۔

"میں تو مایوس ہی ہو چلی تھی منصور کہ شاید تم نہیں آؤ گے۔" وہ گہری سانس لے کر بولی۔ "زندگی میں پہلی بار میں اپنے آپ کو بے حد تنہا اور شکست خوردہ محسوس کر رہی تھی۔"

"میں بہت پہلے پہنچ جاتا گیتی لیکن ..... " میں نے پٹیوں میں لپٹے ہوئے اس کے ہاتھ پر نہایت آہستگی سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا لیکن جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"کوئی بات نہیں' اللہ بڑا غنی ہے۔" اس نے جملہ مکمل کر دیا۔ "میں تمہاری ٹھوڑی کے نیچے خراشیں دیکھ رہی ہوں اور بایاں رخسار بھی کچھ ابھرا ابھرا سا ہے؟"

میں مسکرا دیا لیکن میں نے اس کی بات کی تائید یا تردید نہیں کی۔ میں شام تک وہاں رہا۔ اس دوران ہم نے ان گنت باتیں کیں۔ ادھر ادھر کی بے مقصد اور لایعنی سی باتیں۔

میں نے اپنے ہاتھوں سے اسے دو پیالی کھانا کھلایا۔ پھل چھیل کر دیے۔ کافی پلائی اور اس سارے عمل میں مجھے ایک عجیب ناقابل بیان سی مسرت محسوس ہوئی۔ اس کی کیفیت بھی شاید یہی تھی۔ خواب ناک سے لہجے میں بولی

"میری تکلیف گویا آدھی رہ گئی ہے۔"

اسپتال چونکہ پرائیویٹ تھا مگر اس کا معیار نہایت بلند اور ڈسپلن بے حد سخت تھا۔ شام سات بجے کے بعد متعلقہ عملے کے سوا مریض کے قریب کوئی شخص نہیں رہ سکتا تھا' اس لیے بادل نخواستہ مجھے بھی وہاں سے رخصت ہونا پڑا۔

اس شاندار اسپتال میں ڈاکٹروں کی خصوصی توجہ اور نگہداشت سے گیتی جلد صحت یاب ہو گئی اور ہم جمبئی واپس آ گئے۔ واپسی کے سفر میں کوئی خاص قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا اور جمبئی پہنچنے کے بعد کے واقعات میں بھی کوئی ایسا خاص سنسنی خیز پہلو پنہاں نہیں ہے۔

مختصراً بس اتنا جان لیجیے کہ من موہن کو شیکھر نے ایک طویل عرصے تک بالکل مندر والے پجاری میں ڈھل کر واقعی ڈیف اینڈ ڈمب میں تبدیل کر رکھا تھا۔ وہ انسانوں کی خصوصیات کھو بیٹھا تھا اور تقریباً حیوان نظر آنے لگا تھا۔ تب ایک رات ہم نے اسے چپکے سے جمبئی کی ایک سڑک پر لا چھوڑا تھا۔

دن میں لوگوں نے دیکھا کہ ایک بن مانس ٹریفک کے درمیان ادھر ادھر بھاگتا پھر رہا تھا' تاہم اس میں کسی حد تک انسان کی جھلک نظر آتی تھی اور کبھی کبھی وہ انسانوں جیسی آوازیں بھی نکالتا تھا۔ دو چار الفاظ بھی بولتا تھا لیکن وہ انسانوں کے سائے سے بھی بھڑکتا تھا۔

پولیس اور دوسرے دو تین محکموں کے لوگوں نے اسے پکڑنے اور قابو میں کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ان کے ہاتھ نہ آیا اور ادھر ادھر بھاگتا پھرتا رہا۔ ان کی کوششوں کے دوران ہی ایک بس اسے کچلتی ہوئی گزر گئی۔ اخبارات نے اس پراسرار واقعے پر کئی دن حاشیہ آرائی کی۔

احسان مرزا میری ناقابل یقین کامیابی سے بہت خوش تھا۔ وہ زیادہ عرصے زندہ نہیں رہ سکا۔ اس نے واقعی مجھے بیٹوں کی طرح سمجھا اور مرنے سے پہلے تمام دولت و جائیداد میرے نام کر گیا لیکن بہت سے سرکاری ادارے تو دم مرگ اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ اس کی بیشتر دولت و جائیداد پر حکومت نے مختلف حیلے بہانوں سے قبضہ کر لیا اور طویل مقدمے بازی سے بھی مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ احسان مرزا خواہ کیسا بھی تھا لیکن حکومت اس کے ایک احسان سے آج تک لاعلم ہے کہ اس نے انڈیا میں مافیا کا راستہ روکا تھا۔

ماہتاب لندن سے اس دوران واپس آ گئی تھی لیکن اس کی کیمیکل سرجری کچھ زیادہ

کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ اس کی صورت میں کچھ نقص برقرار رہے۔ اسے بہرحال خوبصورت لڑکیوں میں شمار نہیں کیا جا سکتا تھا اور اس نے اسی چیز کو آڑ بنا کر مجھ سے شادی سے انکار کر دیا۔ میں کئی برس تک اس سے شادی کے لیے اصرار کرتا رہا لیکن اس کی یہی ضد رہی کہ وہ اپنے آپ کو میرے قابل نہیں سمجھتی۔

شادی اس نے کسی اور سے بھی نہیں کی اور میں بھی اپنے آپ کو کسی اور سے شادی کے لیے آمادہ نہیں کر سکا..... اسی عالم میں کچھ پتا نہ چلا کہ کب بڑھاپے نے ہمارے وجود میں پنجے گاڑ لیے۔ اب ہم دونوں کے بال سفید ہیں۔ وہ اپنے گھر میں رہتی ہے۔ میں اپنے گھر میں.....

کچھ لوگوں کا یہ خیال شاید درست ہی ہے کہ آپ پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہلا سکتے ہیں، دریاؤں کا رخ بدل سکتے ہیں، فضاؤں کو مسخر کر سکتے ہیں لیکن اگر عورت کسی بات پر اڑ جائے تو پھر آپ اسے قائل نہیں کر سکتے۔

ختم شد